شبیہ شناسی

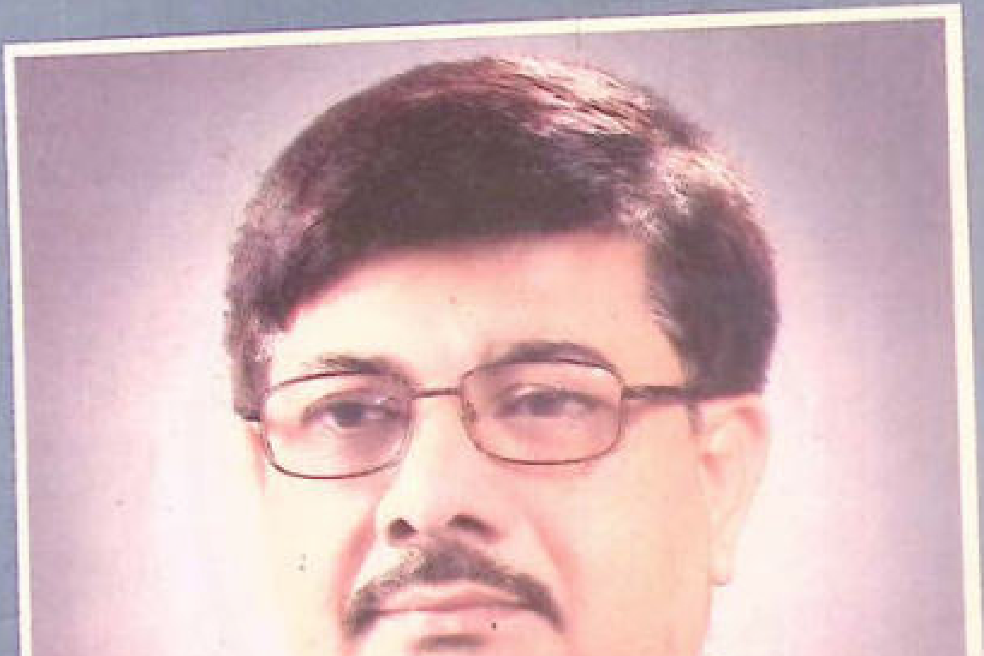

مجلسِ ادارت

• ڈاکٹر اختر ہاشمی

• ڈاکٹر عبدالکریم خالد
• سید محمد علی انجم رضوی

• سید شریف الحسن ہاشمی
• سید محمد فضل حسن (عرفی ہاشمی)

شبیه شناسی

❖

اپنے گھر میں بھی اجنبی ہوں مَیں
جُرم یہ ہے کہ روشنی ہوں مَیں

❖

شیعہ شناسی

﴿مجلسِ ادارت﴾

ڈاکٹر اختر ہاشمی

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

سیّد محمد علی انجم رضوی

سیّد شریف الحسن (ایس۔ایچ ہاشمی)

سیّد محمد فضل حسن (عرفی ہاشمی)

اظہار سنز

۱۹۔اُردو بازار لاہور

حقوق اشاعت محفوظ

۲۰۱۳ء

شیعہ شناسی

ناشر

سید محمد علی انجم رضوی

طابع

سیّد اظہار الحسن رضوی

مطبع

اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور

کمپوزنگ

تصور کمپوزنگ سنٹر

قیمت -/۱۸۹۵ روپے

یکے از مطبوعات

اظہار سنز ۱۹۔ اُردو بازار، لاہور (فون: ۷۲۳۰۱۵۰۔۰۴۲)

انتساب

استادالشعراء، وحیدِعصر، وحیدِسخن

محترم سیّد وحیدالحسن ہاشمی صاحب قبلہ (مرحوم)

اور

محترمہ سرفراز فاطمہ صاحبہ

کے نام

maablib.org

مندرجات

- شبیہ الحسن — ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ۱۷
- قطعہ تاریخ وفات — ڈاکٹر محمد فخرالحق نوری — ۱۹
- قطعہ تاریخ وفات — عبدالکریم قدسی — ۲۰

آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی

- آلِ رضا کا روحانی فیض اور سید شبیہ الحسن — ڈاکٹر سجاد باقر رضوی — ۲۱
- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی اور سید شبیہ الحسن — ہاشم رضا — ۲۷
- آلِ رضا کی غزل گوئی — علامہ انوار ظہوری — ۳۹
- آل رضا کی غزل گوئی کے بارے میں چند معروضات — علامہ انوار ظہوری — ۴۳
- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی — پروفیسر امجد علی شاکر — ۵۵
- روشنی کا سفر۔ آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی — ڈاکٹر عارف ثاقب — ۶۵

آیاتِ آمنہؑ

- آیاتِ آمنہ — ایک مطالعہ — مظہر نیازی — ۷۳

آغا صاحب

- آغا صاحب — پروفیسر ذوالفقار علی — ۷۵
- آغا صاحب کے محاسن — سعدیہ انور — ۹۰
- ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور ڈاکٹر آغا سہیل — پروفیسر صفدر نعیم — ۹۷

❖ العطش

◆ العطش۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا مجموعہ	ڈاکٹر سلیم اختر	۱۰۶

❖ جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ

◆ جدید غزل اور اسلم کولسری	انور سدید	۱۱۳
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا ایک وقیع کارنامہ...... جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ	ڈاکٹر نواز حسن زیدی	۱۱۵
◆ جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ	صفدر نعیم	۱۱۹
◆ اسلم کولسری کی شاعری اور...... ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی جوہر شناسی	پروفیسر وحید عزیز	۱۲۵
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیقی اور تنقیدی کاوش	پروفیسر آصف وٹو	۱۲۹

❖ باقیاتِ آلِ رضاؔ

◆ باقیاتِ آلِ رضاؔ...... ایک یادگار کتاب	تاج سعید	۱۴۰
◆ باقیاتِ آلِ رضاؔ...... شبیہ الحسن کا کارنامۂ خاص	ڈاکٹر عبدالکریم خالد	۱۴۵
◆ باقیاتِ آلِ رضاؔ...... تحقیقی و تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر ریاض قدیر	۱۵۰
◆ ''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' کے حوالے سے	امتیاز حسین	۱۵۴
◆ باقیاتِ آلِ رضاؔ	فرح ناز	۱۶۵

❖ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفیؔ

◆ سوچ کی چھاؤں کا شاعر، سیف زلفیؔ	ڈاکٹر معراج نیر	۱۶۷
◆ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفیؔ...... بڑے شاعر کے بارے میں بڑی کتاب	سرفراز سیّد	۱۷۱
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا گراں قدر کارنامہ...... جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفیؔ	اظہر غوری	۱۷۴
◆ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفیؔ	پروفیسر ظفر الحق چشتی	۱۷۷

- جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی — اعجاز ثقلین بخاری — ۱۸۱
- جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی — پروفیسر سیّد ندیم جعفر — ۱۸۴
- جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت و فن) — محمد ہارون عثمانی — ۱۸۸

❖ کلیاتِ حبیبؔ

- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تدوین کا مظہر۔ ''کلیاتِ حبیبؔ'' — ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ۱۹۰
- کلیاتِ حبیبؔ پر ایک نظر — پروفیسر آفاق صدیقی — ۱۹۸
- کلیاتِ حبیبؔ۔ ایک جائزہ — سیّد نواز حسن زیدی — ۲۰۴
- کلیاتِ حبیبؔ (ایک تحقیقی اور تنقیدی دستاویز) — پروفیسر ذوالفقار علی — ۲۱۰
- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کارمسیحائی۔ کلیاتِ حبیبؔ کی تدوین — شفیق الرحمٰن الہ آبادی — ۲۱۴

❖ مفاہیم

- مفاہیم۔ ایک مطالعہ — ڈاکٹر ہارون قادر — ۲۱۶
- مفاہیم۔ چند معروضات — پروفیسر باقر علی شاہ — ۲۲۱

❖ مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی

- جدید مختصر مرثیہ اور وحیدِ مودّت — ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی — ۲۲۳
- مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی — سیّد اختر ہاشمی — ۲۲۶
- رثائی اَدب میں ارفع تحقیق — علی حسین جاوید — ۲۲۹
- مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی — عابد منہاس — ۲۳۴
- جن کا سخن ہے فکر و عمل کے لیے مہمیز — عاطف خالد بٹ — ۲۳۹

❖ قیصر بارھوی کے مرثیے

- قیصر بارھوی کے مرثیے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا کارنامہ — ڈاکٹر انور سدید — ۲۴۱
- قیصر بارھوی کے مرثیے۔ تدوینی تحقیق کی نادر مثال — ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ۲۴۵
- قیصر بارھوی کے مرثیے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا بے مثال کارنامہ — عمران نقوی — ۲۴۸
- قیصر بارھوی کے مرثیے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی اَدبی شبیہ — ڈاکٹر نواز حسن زیدی — ۲۵۰
- ڈاکٹر شبیہ الحسن کا تحقیقی کارنامہ۔ قیصر بارھوی کے مرثیے — ڈاکٹر عباس رضا — ۲۵۵

❖ قیصرِ اقلیم مرثیہ

◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی گراں قدر تخلیق۔ قیصرِ اقلیم مرثیہ	رابعہ عرفان	۲۶۲
◆ ایک مرثیہ گو کا نثری مرثیہ	پروفیسر انیقہ سلیم	۲۶۵

❖ سیف زلفیؔ کے مرثیے

◆ سیف زلفیؔ کے مرثیے اور شبیہ الحسن کا اختصاص	سیّد وحید الحسن ہاشمی	۲۶۹
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور سیف زلفیؔ کے مراثی	شہزاد احمد	۲۸۱
◆ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا نیا کارنامہ۔ سیف زلفیؔ کے مرثیے	ڈاکٹر سلیم اختر	۲۸۳
◆ سیف زلفیؔ۔ روشنیٔ فکر کا استعارہ	پروفیسر حسن عسکری کاظمی	۲۸۹
◆ سیف زلفیؔ کے مرثیوں کی دستک	ڈاکٹر اجمل نیازی	۲۹۵
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا منفرد کارنامہ ''سیف زلفیؔ کے مرثیے''	ڈاکٹر عبدالکریم خالد	۲۹۷
◆ سیف زلفیؔ کے مرثیے اور شبیہ الحسن کا لمحۂ خیر	ڈاکٹر عبدالکریم خالد	۳۰۰
◆ سیف زلفیؔ کے مرثیے۔ شبیہ الحسن کی محنتوں کا ثمر	پروفیسر محمد رضا زیدی	۳۰۵
◆ سیف زلفیؔ کے جدید مرثیوں کی تدوین	ڈاکٹر ریاض قدیر	۳۱۶
◆ سیف زلفیؔ کے مرثیے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا اَدبی کارنامہ	ڈاکٹر نواز حسن زیدی	۳۲۰

❖ 'شام و سحر' کی باتیں

◆ 'شام وسحر' کی حکیمانہ باتیں	میرزا ادیب	۳۲۴
◆ 'شام وسحر' کے فکری اداریے	ڈاکٹر آغا سہیل	۳۲۶
◆ اندھیرے کے جگنو	ڈاکٹر انور سدید	۳۲۷
◆ حقیقت پسندانہ باتیں	پروفیسر سجاد مرزا	۳۳۰
◆ 'شام وسحر' کی باتیں اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن	ڈاکٹر افتخار بیگ	۳۳۴
◆ شبیہ الحسن کی باتیں	اسد عباس خان	۳۴۱

❖ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور شعری جہتیں

◆ سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں	پروفیسر حسن عسکری کاظمی	۳۴۳
◆ سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں	محمد فیروز شاہ	۳۴۷

- ڈاکٹر شبیہ الحسن اور سیّد وحید الحسن کی شعری جہتیں — ڈاکٹر محمد ہارون قادر — ۳۴۹
- وحید الحسن ہاشمی۔نعت، منقبت اور سلام — مختار علی نیّر — ۳۵۷
- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں — مصطفےٰ کمال — ۳۶۰
- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں پر ایک تنقیدی نظر — روبینہ شاہین — ۳۶۳

❖ طاھرین

- طاہرین پر ایک طائرانہ نظر — پروفیسر حسن عسکری کاظمی — ۳۶۷
- صد جلوہ روبرو ہے! — پروفیسر سیف اللہ خالد — ۳۷۲
- ''طاہرین'' تعارف و تجزیہ — ڈاکٹر سیّد قاسم جلال — ۳۷۵
- ''طاہرین'' کا تنقیدی مطالعہ — رفعت مالک — ۳۸۳

❖ ترجیحات

- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ''ترجیحات'' — ڈاکٹر آغا سہیل — ۳۹۲
- ''ترجیحات'' کی حیرت سامانیاں — ڈاکٹر عاصی کرنالی — ۴۰۲

❖ تصریحات

- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی 'تصریحات' فن کے آئینے میں — ڈاکٹر عبدالستار نیازی — ۴۰۷
- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی 'تصریحات' — رابعہ سرفراز — ۴۱۹
- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن 'تصریحات' کے آئینے میں — سعید احمد سعید — ۴۲۳
- کارنامۂ خاص ''تصریحات''۔ڈاکٹر شبیہ الحسن — پروفیسر وحید عزیز — ۴۲۶
- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ''تصریحات'' — نعیم فاطمہ علوی — ۴۲۹
- تصریحات......ایک جائزہ — پروفیسر آصف وٹو — ۴۳۳
- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی نئی تخلیقی کاوش 'تصریحات' — میر حماد الرحمٰن میر — ۴۳۶

❖ اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار

- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی نئی تخلیق ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار''...... مختصر تاثر — ڈاکٹر سلیم اختر — ۴۳۹

- اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار — پروفیسر حسن عسکری کاظمی — ۴۴۲
- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مرثیہ فہمی کا مظہر۔اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار — ڈاکٹر نواز حسن زیدی — ۴۴۵

❖ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت

- صراطِ مستقیم پر چلنے والا — ڈاکٹر سلیم اختر — ۴۴۹
- سمندر کی طرح کشادہ شبیہ الحسن — ڈاکٹر اجمل نیازی — ۴۵۲
- شبیہ الحسن کی شبیہ — ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ۴۵۵
- سُنو میرے بندھو رے — ڈاکٹر طارق عزیز — ۴۵۹
- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے لیے چند تحسینی کلمات — ڈاکٹر علی شیر طور — ۴۶۴
- ایک نابغۂ روزگار شخصیت۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن — پروفیسر فرقان احمد قریشی — ۴۶۶
- ادب کا تابندہ چراغ۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن — حماد الرحمٰن میر — ۴۶۹
- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی متنوع شخصیت — مشتاق احمد — ۴۷۲
- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ایک ہمہ جہت اُدبی شخصیت — شفیق الرحمٰن الٰہ آبادی — ۴۷۳

❖ آراء

- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے بارے میں ناقدین ، دانشوروں اور اکابرین کی آراء — ۴۷۶
- ماہ نامہ 'شام وسحر' کے حوالے سے دانش وروں کی آراء — ۵۰۴

❖ کالم نگاری

- عہدِ جدید کا منفرد کالم نگار۔ڈاکٹر شبیہ الحسن — پروفیسر صدیق اظہر — ۵۱۷
- میزان فکر ونظر — شبیر احمد قادری — ۵۲۹
- ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک معتبر کالم نگار — شفیق الرحمٰن الٰہ آبادی — ۵۳۵

❖ کالم

- آلِ رضا سے اہلِ وفا تک......ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیق اور تنقید — پروفیسر حسن عسکری کاظمی — ۵۴۲

◆ شاعرِ حسینیت......قیصر بارھوی کے مرثیے......
تجزیہ وتدوین ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن
پروفیسر حسن عسکری کاظمی ۵۴۶

◆ موازنۂ انیس ودبیر اور ڈاکٹر سلیم اختر — ناصر زیدی ۵۵۰

◆ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی اَدبی فتوحات — جمیل احمد عدیل ۵۵۴

◆ آسمانِ اَدب کا درخشندہ ستارہ......ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن — ڈاکٹر ندیم گیلانی ۵۵۸

◆ عالمی مجلسِ اَدب اور مرزا دبیر — مختار علی نیّر ۵۶۱

◆ حق بہ حق دار رشید — جاوید صدیق بھٹی ۵۶۴

◆ مردہ پرستوں میں روشنی کی لکیر — جاوید صدیق بھٹی ۵۶۶

◆ نظر انداز کیے گئے ادیبوں کا نقاد — ڈاکٹر جواز جعفری ۵۶۸

◆ میں کائنات کے پیکر میں...... — پروفیسر وحید عزیز ۵۷۱

◆ اَدب کی شمع جلاؤ بڑا اندھیرا ہے — پروفیسر وحید عزیز ۵۷۳

◆ اَدب کا رہبر ورہنما......ڈاکٹر شبیہ — پروفیسر وحید عزیز ۵۷۶

◆ قیصر شناسی کی کلیدِ اوّل — پروفیسر وحید عزیز ۵۷۹

❖ انٹرویوز

◆ معروف شاعر اور محقق۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے گفت گو — انٹرویو: اختر سعیدی ۵۸۳

◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے بات چیت — انٹرویو: سلیم احسن شیخ ۵۸۸

◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی باتیں — نوائے وقت ۵۹۴

❖ پذیرائی

◆ محقق اعظم ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن — ڈاکٹر خیال امروھوی ۵۹۸

◆ محمد آصف وٹو کا اَدبی کارنامہ — خورشید بیگ میلسوی ۶۰۰

◆ پروفیسر آصف وٹو کی منفرد تخلیق — صفدر ظہیر ۶۰۳

◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات — غضنفر کاظمی ۶۰۵

◆ شبیہ الحسن کے لیے حرفِ آغاز — ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی ۶۰۷

◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات — شفیق الرحمٰن الہ آبادی ۶۰۹

◆ فیسر آصف وٹو کا یادگار کارنامہ — فسر فرقان احمد قریشی ۶۱۶

◆ پروفیسر آصف وٹو کا تخلیقی کارنامہ	ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی	۶۱۸
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات۔ چند تاثرات	اقبال کاظمی	۶۲۰
◆ اُردو تحقیق و تنقید کے بحر مواج ...... ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن	آفتاب احمد ملک	۶۲۲
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی پذیرائی کا سنگ میل	پروفیسر وحید عزیز	۶۲۵
◆ پروفیسر آصف وٹو کی شبیہ فہمی	پروفیسر انیقہ سلیم	۶۲۸
◆ پروفیسر آصف وٹو کی گراں قدر تصنیف	پروفیسر انیقہ سلیم	۶۳۱

❖ شام و سحر (رسالہ)

◆ ماہ نامہ ''شام و سحر'' کی اکیسویں سال گرہ	تاج سعید	۶۳۴
◆ ڈاکٹر شبیہ الحسن اور ماہ نامہ ''شام و سحر'' فنی اور تنقیدی جائزہ	شوکت زریں چغتائی	۶۳۷
◆ ڈاکٹر شبیہ الحسن بہ حیثیت مدیر ''شام و سحر'' لاہور	ڈاکٹر غلام یٰسین	۶۳۹
◆ شبیہ الحسن کے تخلیقی کارنامے	کرامت بخاری	۶۴۹
◆ ''شام و سحر'' ...... ایک تحریک ایک دبستان	ڈاکٹر عباس رضا	۶۵۱
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور ماہ نامہ ''شام و سحر''	محمد افضل ثاقب	۶۵۲

❖ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا فنی مطالعہ

◆ ایک نظریہ ساز نقاد۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن	ڈاکٹر آغا سہیل	۶۵۵
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ محقق اور نقاد	پروفیسر حسن عسکری کاظمی	۶۵۷
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ ایک سلجھا ہوا نقاد	خالد اقبال یاسر	۶۶۱
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر	پروفیسر حسین سحر	۶۶۴
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا جہانِ فن	ڈاکٹر طاہر تونسوی	۶۶۹
◆ رثائی اُدب کا ابن خلدون ...... ڈاکٹر شبیہ الحسن	محمد شفیع بلوچ	۶۷۴
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ اُردو کا ایک کثیر الجہات محقق و نقاد	محمد شفیع بلوچ	۶۸۰
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ ایک عظیم نقاد	پروفیسر خورشید بیگ میلسوی	۶۸۶
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مضمون نگاری	ڈاکٹر سیّد قاسم جلال	۶۸۹
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ...... اُردو مرثیہ کے ایک اہم نقاد	ڈاکٹر ضیا الحسن	۶۹۴
◆ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بطور محقق	فسر کلثوم طارق برنی	

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے نعتیہ افکار	شبیر احمد قادری	۷۰۷
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی مزاج	سیّد تحسین گیلانی	۷۱۱
ڈاکٹر شبیہ الحسن بطور محقق و نقاد	پروفیسر ڈاکٹر سیّد زوار حسین	۷۱۶
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ آسمانِ اَدب کا ایک درخشاں ستارہ	یعقوب تصور	۷۲۵
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی کارِ مسیحائی	نجم الحسن رضوی	۷۲۸
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ ایک باشعور نقاد	مظہر حسین مظہر	۷۳۱
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی فکر کے محرکات	مرید عباس خاور	۷۳۴
شبیہ الحسن کی شخصیت و فن کا منظوم اعتراف	شفیق الرحمٰن الہ آبادی	۷۳۷
ڈاکٹر شبیہ الحسن کی فکری جولانیاں	مصدق لاکھانی	۷۴۴
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی رثائی خدمات	محمد اصغر انیس	۷۴۷

❖ خراجِ تحسین (منظوم)

◆ قسیم ابن نسیم امروہوی، سیّد ناصر زیدی، جعفر بلوچ، اختر ہاشمی، ریحان اعظمی، ڈاکٹر مولانا سیّد محمد باقر زیدی، سیّد عرفی ہاشمی، پروفیسر ظفر چشتی، رضا عباس رضا، طاہر ناصر علی، نشاط واسطی، صادق جمیل، مظفر نقوی، ڈاکٹر منظور حسین اسد، مراتب علی شاد، واجد امیر، تحسین یزدانی، نذیر اذفر، حشمت علی قیصر، مشتاق شبنم، سلطان محمود، ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی، علی ضیغم ہمدانی، سیّد اعجاز ثقلین بخاری، عثمان قیصر، سیّد افتخار امام، زرتاج جمیل، سیّد قمر حسنین، ظفر عابد، جاوید صدیق بھٹی ۷۵۷ — ۷۸۷

❖ تعزیتی مضامین

شہید شبیہ الحسن کے بعد!	سیّد تقی عابدی	۷۸۸
صاحبِ خیر۔ سیّد شبیہ الحسن	ڈاکٹر سلیم اختر	۷۹۱
ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اَدبی جہتیں	مظفر عباس	۷۹۵
کیا خبر کون کسے مار دے..... کافر کہہ کر	ڈاکٹر اسد اریب	۷۹۷
ڈاکٹر شبیہ الحسن تخلیقی ناقد اور ہمہ جہت صلاحیتوں سے مالا مال دانش ور	پروفیسر حسن عسکری کاظمی	۷۹۹

◆ شبیہ الحسن ہاشمی میرا دوست میرا استاد زادہ	ڈاکٹر آغا سلمان باقر	۸۰۳
◆ عاشق علم و ادب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی یاد میں	اعتبار ساجد	۸۰۹
◆ پروفیسر صاحب میری نظر میں	سید فدا حسین امتیاز گیلانی	۸۱۲
◆ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی	خورشید بیگ میلسوی	۸۱۴
◆ استادِ مکرم	سید فخر حسین بخاری	۸۱۶
◆ ایک روشن دماغ تھا نہ رہا	شفیق الرحمٰن الہ آبادی	۸۱۸
◆ منفرد نقاد اور مخلص انسان	گلشن آراء طارق	۸۲۲
◆ اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	جاوید صدیق بھٹی	۸۲۳
◆ اک روشن چراغ تھا نہ رہا	پروفیسر راشد طفیل	۸۲۵
◆ بارور	پروفیسر ناصر علی رضا	۸۲۸
◆ جرم یہ ہے کہ روشنی ہوں میں	طاہر ناصر علی	۸۳۱

❖ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف ۸۳۶

◆ شبیہ شناسی	محیط اسماعیل	۸۸۳

❖ اشاریہ ۸۸۵

◆◆◆

شبیہ الحسن

شبیہ الحسن کے گھائل جسم کو مٹی دینے والے ابھی تک دم بخود ہیں کہ وہ کون شقی تھے جو آن کی آن میں اس نرم خو اور سراپا خوشبو کو بارود میں نہلا گئے۔ گولی اور گالی کی زبان بولنے والے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ وہ تاک تاک کر نشانہ لگاتے اور گھروں کو ہی نہیں شہروں کے شہروں کو ماتم کدہ بنائے دیتے ہیں۔ شبیہ الحسن ایک گھرانے کا فرد کہاں تھا وہ تو شہر کی آبرو تھا اور اَب تو وہ اپنی اَن تھک محنت کے ذریعے ملکی سطح پر معروف ہو چلا تھا۔ شہر شہر اَدبی حلقوں میں اُس کا چرچا تھا۔ اُس کی تحریریں اور ایک تسلسل کے ساتھ چھپنے والی کتابیں ہر پڑھنے لکھنے والے تک پہنچتی تھیں اور اہلِ قلم میں اکثر اُسے داد دینے میں کسی بخل سے کام نہ لیتے تھے۔ جنھیں کچھ لکھنے کی توفیق نہیں وہ تیوریاں بھی چڑھاتے تھے مگر اُن کے ساتھ بھی اس کا معاملہ محبت آمیز رہا۔ وہ تنقید نہ صرف سُنتا تھا بل کہ سہتا بھی تھا۔ وہ ایک ہی بات کہتا تھا کہ اَدب ہم سب کا مشترکہ اَثاثہ ہے۔ اِس میں دشمنیاں پالنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا فائدہ اَدب دشمنوں کو پہنچتا ہے۔ اَدب قبیلے کو ایک دوسرے کی ہمت افزائی کرنی چاہیے، مزید لکھنے اور لکھتے رہنے پر اُکسانا چاہیے۔ اچھی اور صاف ستھری تنقید لکھنی چاہیے اور تنقیص و تعریض سے حتی المقدور بچنا چاہیے۔ اس نے زندگی بھر اس اصول کو اپنائے رکھا اور کسی کے خلاف ایک جملہ تک نہیں لکھا۔ جرأتِ اظہار کی اس کے ہاں کمی نہیں تھی۔ وہ اپنی بات کہہ جاتا تھا مگر اس سلیقے اور صفائی کے ساتھ، جیسے کوئی نرم پوروں سے بدن سہلاتا ہے۔ اس نے ملک کے سینئر ادیبوں اور شاعروں سے ہمیشہ براہِ راست رابطہ رکھا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں محافلِ پذیرائی کے انعقاد کی رسم ڈالی۔ عمر رسیدہ اور بزرگ ادیبوں کو خود اُن کے گھروں سے لیتا اور ان کی عزلت نشینی کو محفل آرائی میں بدل دیتا۔ وہ کہتا تھا کہ اِن لوگوں کو کون یاد کرے گا اگر اس طرح سے ان کو چند لمحے کی آسودگی مل جائے تو اس سے بڑھ کر خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ نو آموز اور نئے لکھنے والوں کو اس نے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔ جن میں زندگی کی کچھ رمق تھی وہ چل نکلے اور بہت اچھا لکھنے لگے۔ ایسے نو آموزوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو شبیہ الحسن کے احسانات تلے دبی ہوئی ہے، بہت سے لوگوں کی پہچان ہی اس کے رسالے 'شام و سحر' کے ذریعے ہوئی، کوئی اگر یاد رکھے تو......

شبیہ الحسن نے تنقیدی، تحقیقی، تدوینی اور تخلیقی حوالے سے جو کچھ لکھا وہ ضخیم کتابوں کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس نے اپنی مختصر زندگی میں ہی بیشتر کام نمٹا لیا تھا۔ اس کی کتابوں اور مضامین کے حوالے سے ناقدوں

اور اہلِ فن نے جو تحریریں لکھیں، وہ اس نے اپنی زندگی ہی میں ترتیب دے لی تھیں بل کہ اکثر تحریروں کی کمپوزنگ بھی کروالی تھی۔ یہ تمام تحریریں آپ کو اس کتاب میں ملیں گی۔ اس کی شہادت کے بعد لکھے گئے تعزیتی مضامین نظم و نثر بھی اس کتاب کے ایک گوشے میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ یہ مضامین شبیہ الحسن کے چاہنے والوں کے دلی جذبات کے آئینہ دار ہیں اور اس محبت کے عکاس ہیں جو وہ پس ماندگان کے دلوں میں چھوڑ گیا ہے۔

شبیہ الحسن کی جدائی ہر اس شخص کا سانحہ ہے جو اس معاشرے میں محبت اور امن کو سر بلند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے کئی دوستوں کی طرح مجھے بھی اس سے قریبی تعلق کا شرف حاصل تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اِکا دُکا دوست جو رہ گئے ہیں اُن کے دیکھنے کو بھی آنکھیں ترستیاں ہیں۔ کہاں شبیہ الحسن جو حال احوال پوچھنے کے لیے ہر دوسرے تیسرے روز آ دروازے پر دستک دیتا تھا اور بآوازِ بلند یوں پکارتا تھا کہ پورا محلّہ اس کی آواز سنتا تھا۔ یہ آواز خاموش ہو چکی مگر میرے احساس میں یہ آواز آج بھی زندہ ہے۔ میں شبیہ الحسن کا نوحہ نہیں لکھنا چاہتا، مگر نوحہ لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

اے عبدالکریم خالد! شبیہ الحسن کی اچھی باتیں یاد کرو اور اس کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے ہاتھ اُٹھاؤ اور ان پیاروں کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھو جو اس کی یادوں کی شمع فروزاں رکھنے کے جتن میں ہیں۔ ڈاکٹر اختر ہاشمی، محمد علی انجم، شریف الحسن اور عرفی ہاشمی کو اللہ سلامت رکھے کہ اِس کتاب کو شائع کر کے انھوں نے شبیہ الحسن کے احسانات کا کچھ نہ کچھ حق ضرور ادا کیا ہے اور وہ لوگ بھی اللہ کی امان میں رہیں جن کے رشحاتِ قلم اِس کتاب کے صفحات کو زینت بخشے ہوئے ہیں۔

(ڈاکٹر) عبدالکریم خالد

۱۵؍ اپریل ۲۰۱۳ء

◆◆◆

maablib.org

قطعہ تاریخِ وفات

پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن، متوفی ١٨ر مئی ٢٠١٢ء

وہ جس کی موت پہ دل ہو گئے ملول و حزیں
ہے اس پہ خاص عطائے رسولؐ و بنتِ رسول
علیؑ نے کھول کے بازو کیا ہے استقبال
اسے حسینؑ و حسنؑ نے کیا ہے دل سے قبول
نہیں ہے نوریؔ کوئی اس میں دخل کاوش کا
کہ دل پہ غیب سے تاریخ کا ہوا ہے نزول
خدا گواہ ''شبیہ الحسن ہے خلد نشیں''
وہ بامراد ہے سرشارِ ''دیدِ آلِ بتولؑ''

[''شبیہ الحسن ہے خلد نشیں'' کے اعداد = ١٥٢٥
''دیدِ آلِ بتول'' کے اعداد برائے تدخلہ = ٤٨٧
کل اعداد = ٢٠١٢ء]

(محمد فخر الحق نوری)

محترم ڈاکٹر شبیہ الحسن سیّد کی شہادت پر

جہل و تعصبات کے تیروں کی زد میں تھا
پھر بھی وہ کر رہا تھا محبت کی مے کشید
پہنایا اپنے خون سے الفاظ کو لباس
بھولیں گے کیسے قدسیؔ "غمِ سیدِ شہید"

۱۴۳۳ھ

غم گسار......عبدالکریم قدسیؔ

۱۲-۵-۳۴

◆◆◆

maablib.org

آلِ رضا کا روحانی فیض اور سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

◆◆

فنِ شعر میں آلِ رضاؔ کی دو حیثیتیں تھیں، ایک حیثیت غزل گوئی اور دوسری مرثیہ گوئی۔ کہتے ہیں کہ میر انیسؔ نے آغاز غزل سے کیا مگر جلد ہی اس فن کو ترک کر کے مرثیہ گوئی کی طرف راغب ہو گئے۔ مرزا غالبؔ نے مرثیہ کہنے کی کوشش کی، مگر تین چار بند سے آگے نہ بڑھے اور ارادہ ترک کر دیا۔ ایک بات بہر حال طے ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں فن، شاعری کی دو مختلف جہتوں کے متقاضی ہیں اور بہ اعتبارِ فن، میلان و مزاج، شعر سے مختلف شخصیتوں، تربیت اور تہذیب کا تقاضا کرتے ہیں۔ غزل داخلیت، ایجاز و ایما، اختصار اور تجرید چاہتی ہے، جب کہ مرثیہ خارجیت، تفصیل، موجود واقعات کی کھپت اور زورِ بیان کا حامل ہوتا ہے۔ مختصراً بات یوں کہہ لیجیے کہ یہ دونوں فنّی لحاظ سے دو مختلف قسم کے شاعروں، دو مختلف شخصیتوں اور مزاجوں کے معاملے ہیں لیکن اگر کوئی شاعر ان ہر دو اصناف پر عبور رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شخصیت میں تنوع زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ وہ بعض متضاد صلاحیتوں پر قدرت رکھتا ہے۔ غالبؔ اور انیسؔ اپنے اپنے فن میں منتہی ہیں۔ آلِ رضاؔ دونوں فنون کو اپنی ذات میں یکجا کرنے والوں میں سے ہیں اور اب۔

اس وقت آلِ رضاؔ کی مرثیہ گوئی زیرِ بحث نہیں ہے۔ ہمیں ان کی غزل سے سروکار ہے۔ تاہم ان کی غزل کی تفہیم کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ان کے فن کارانہ امکانات کی وسعت کو سمجھ لیا جائے۔ دوسری اہم بات ان کی شاعری کے متعلق یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر لکھنوی دبستانِ شعر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں بھی تخصیص اس بات کی ہے کہ ان کا عہدِ شعر گوئی عزیزؔ، صفیؔ اور ثاقبؔ کے بعد کا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب اِن شعرا نے لکھنؤ کی بنیادی خصوصیاتِ فن کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں کے تحت بڑی حد تک اس کی قلب ماہیت کر دی تھی۔ اس سلسلے کی تیسری اہم بات یہ ہے کہ آلِ رضاؔ حضرت آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آرزوؔ لکھنوی کی خاص دین یہ ہے کہ انھوں نے اُردو غزل کو خالص اُردو کی لطافت، لوچ اور ایک خاص آہنگ عطا کیا ہے۔

لکھنوی شاعری کے ابتذال کی طرف تو اُردو کے کم و بیش تمام نقادوں نے توجہ کی ہے۔ البتہ جس بات کی طرف توجہ کم دی گئی ہے وہ اس کے محاسن ہیں۔ اب تک کی عمومی صورتِ حال یہ ہے کہ اگر لکھنؤ کے کسی شاعر کے یہاں کوئی خوبی دریافت ہوئی تو فوراً اسے دلی کے کھاتے میں منتقل کر دیا گیا اور لکھنؤ کو تصنع، رعایتِ لفظی، بے جا آرائش، رکیک موضوعات کا حامل ثابت کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں کم تر درجے کی شاعری بھی ہوئی، لیکن کم تر درجے کی شاعری کو معیار بنا کر کسی دبستانِ شعر کا اندازہ لگانا کہاں کا انصاف ہے؟

زندگی کے سفر کی طرح شاعری کا سفر بھی فطرت سے معاشرت کی طرف ہوتا ہے۔ معاشرتی اوصاف زندگی کو فنی سطح پر برتنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی میں فنی قوانین تہذیب و معاشرت کو اعلیٰ سطح پر بلند کرتے ہیں۔ اسی قسم کے فنی قوانین شاعری میں بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ شعر میں صنعت گری اور فنِ فطرت اور تخیل کے قائم مقام نہیں ہوتے، ان کا اظہار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں میکانکی سطح پر برتا جائے تو یہی صنعت تصنع کا روپ دھار سکتی ہے۔ متشاعر اور نقال یہی کرتے ہیں، تاہم تصنع کی موجودگی، صنعت اور فن کاری کی ضرورت کو کالعدم نہیں کر سکتی۔ حُسن کی زیبائش کے لیے میک اَپ کیا جاتا ہے، تاہم بدصورت اور بوڑھی عورتوں سے میک اَپ کرنے کا حق چھینا نہیں جا سکتا۔ ہاں ان کی ہیئت کذائی کا مذاق ضرور اُڑایا جا سکتا ہے۔

لکھنوی دبستانِ شعر پر اعتراض کرنے والے بیشتر وہ لوگ ہیں جن کی بنیادی تربیت رومانی طرزِ فکر سے ہوئی۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ شاعری کے بارے میں ہمارا عام مفروضہ یہ ہے کہ وہ ''شدید جذبات کا شدید اظہار ہے۔'' یا پھر یہ کہ ''وہ شخصیت کا اظہار ہے۔'' اس کا جواب ٹی۔ ایس ایلیٹ نے یہ دیا کہ ''شاعری نہ شخصیت کا اظہار ہے اور نہ جذبات کا۔ وہ تو شخصیت اور جذبات سے فرار ہے اور محض وہ لوگ، جن کے پاس جذبہ بھی ہو اور شخصیت بھی، یہ جان سکتے ہیں کہ اس فرار کے کیا معنی ہیں۔''

جذبات اور شخصیت سے فرار کا ایک طریقہ تو یہی فن کاری ہے، جو لکھنوی دبستان کی خصوصیت ہے۔ شاعر جب لفظوں سے اپنا تعلق استوار کرتا ہے تو وہ جذبات اور شخصیت کو معروضی طور پر دیکھنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ یہی معروضیت پختہ کار شاعر اور نابالغ شاعر میں حدِ فاصل کھینچتی ہے۔ شاعری میں ایک لفظ اور دوسرے لفظ کا تعلق معاشرے میں ایک فرد اور دوسرے فرد کے تعلق کے مماثل ہوتا ہے۔ حُسنِ کلام، رعایتیں، صنعتیں اسی معاشرت کی شعری فضا میں جنم لے سکتی ہیں، جہاں یہ ساری باتیں زندگی میں بھی موجود ہوں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زندگی اور شاعری دونوں میں یہ تمام باتیں زندگی کے ایک خاص قسم کے برتاؤ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی معنی میں شاعری زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ زندگی شاعری کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اسی معنی میں لکھنؤ کے آدابِ معاشرت اور آدابِ شاعری دونوں ایک دوسرے کی تمثال ہیں۔

آلِ رضا جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے باعث شاعری میں فطرت کے تقاضوں کو سمجھنے کے اہل تھے۔

اس کے ساتھ ہی وہ لکھنوی شاعری کی روایت سے کماحقہٗ آگاہ تھے۔ زبان کی لطافت، لوچ اور نزاکتوں سے بھی واقف تھے۔ حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد ہونے کے ناطے ان کے یہاں سلیس پیرایۂ بیان اور پُر تاثیر لہجہ اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ سادگی پورے بانکپن سے نمایاں ہوتی ہے اور لطافت دلوں پر مؤثر گرفت کرتی ہے۔

آلِ رضاؔ کی غزل کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ انسانی تعلقات کو اپنا موضوع بناتی ہے۔ انسان اور انسان کے رشتے میں سب سے مضبوط رشتہ محبت کا ہے۔ آلِ رضاؔ نے اس موضوع پر بہت خوب صورت شعر نکالے ہیں۔ ایسے شعروں میں انھوں نے نازک اور لطیف نفسی کیفیتوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

رضاؔ کتنی حسیں اور مختصر شرحِ محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے جو راس آئے تو جنت ہے

خدا رکھے، خدا رکھے ان اجزائے محبت کو
بہت کم ہیں، مگر جتنے ہیں دنیا کو سنبھالے ہیں

خیالِ حُسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی

یہ اپنے ذکر میں کیوں آ رہا ہے نام اُن کا
یہ کس زمین پہ کس آسماں کی باتیں ہیں

اس امتزاجِ حُسن کے قربان جایئے
بے انتہا غرور بڑی سادگی کے ساتھ

اُٹھا کے بزمِ محبت سے لے گئے جن کو
عجب مزاج کی شمعیں تھیں جل سکیں نہ کہیں

آلِ رضاؔ کی غزل اُن کے سچے تجربات کی عکاس ہے۔ مجرد افکار، خیالات اور تصورات ان کی غزلوں میں نہیں سماتے۔ اُردو غزل کی روایت میں اشعار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ایسے استعاروں اور علامتوں پر مشتمل ہے، جن کا تعلق مے خانے اور اس کے لوازم سے ہے۔ بعض شعرا کے یہاں تو شعر گوئی کے لیے اور شعر میں بعض خاص قسم کے مضامین کے ادا کرنے کے لیے یہ اصطلاحیں لازم ہو جاتی ہیں۔ مرزا غالب نے کہا تھا:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اب آپ اسے آلِ رضاؔ کے یہاں مذہبی عقائد کی پختگی کہہ لیں یا پھر ان کا یہ ایمان کہ شعر کے پیچھے سچا تجربہ ہونا چاہیے۔ ان کے یہاں شراب خانے اور اس کے مضمرات سے متعلق اشیا بطور استعارہ نظر نہیں آتیں۔

اس طرح ہو سکتا ہے کہ آلِ رضا نے بہت سے شعری امکانات کھو دیے ہوں، لیکن تجربے کی سچائی پر زور دے کر انھوں نے خلوصِ اظہار کے ذریعے جو پُر اثر اشعار دنیا کو دیے اور جذبوں کی صداقت کے حوالے سے جو قوت اور توانائی اپنی شاعری کو بخشی، وہ شاید دوسری صورت میں ممکن ہی نہ ہوتی۔

ہجرت کا تجربہ پاکستانی غزل کا ایک اہم موضوعِ سخن رہا ہے، لیکن جن لوگوں کا اپنی سرزمین سے رشتہ فطری اور تہذیبی دونوں حوالوں سے استوار ہو، ان کے لیے اپنی مٹی کو خود ہی خیرباد کر کے دوسری فضاؤں میں غرب الوطنی اختیار کرنا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر یہ جدائی گوشت سے ناخن کی جدائی کے مماثل ہوتی ہے۔ آلِ رضا جیسے حسّاس اور محبت کرنے والے شخص کے لیے تو یہ یقیناً ایک قیامت ہوگی۔ آپ خود دیکھیے:

یوں تو بے تابی میں اس محفل سے اٹھ جانا پڑا
کیا کہوں پھر کیا ہوا، جب دل کو سمجھانا پڑا
وہ وداعی مرحلے، وہ عمر بھر کے سلسلے
دھوکے دے دے کر نگاہ و دل کو سمجھانا پڑا

....

وطن دیار محبت ہے آدمی کے لیے
کہیں قبول غریب الدیار ہو نہ سکا

دوسری مٹی میں بہ آسانی جڑ پکڑنا مشکل ہوتا ہے۔ بعض درختوں کی طرح بہت سے انسان بھی ہر فضا میں پنپ نہیں سکتے۔ اپنی تہذیب سے مکمل طور پر ہم آہنگ مہذب انسانوں کا دل اس شہر کی تمثال ہوتا ہے، جس میں وہ رہتے ہیں۔ دِلّی میر صاحب کا دل بن گیا تھا اور لکھنؤ آلِ رضا کا، جن کے یہاں شہر سے منقطع ہونا ہی دل کی ویرانی کے مماثل ہے۔ دل ویران ہو گیا تو غزل کب تک چلتی، لہٰذا بقول سیّد ہاشم رضا چند سال بزمِ آرزو کے مشاعرے ان کے گھر پر ہوتے رہے، پھر ساری توجہ مرثیے پر مرکوز ہوگئی:

دل والو یہی آن ہے آبادیٔ دل کی
یہ شہر جو اُجڑا تو بسایا نہیں جاتا

....

مسافر تھک گیا، دن ڈھل گیا، اب شام ہوتی ہے
نظر آئے گا اس عالم میں رستے کا نشان کب تک
قفس کے منتظم نے کس محبت سے یہ پوچھا ہے
اسیرو بھول جاؤ گے فضائے آشیاں کب تک

آخری شمع جھلملاتی ہے
اور نمودِ سحر، خدا معلوم
نیند میں اُٹھ کے جیسے کوئی چلے
جا رہا ہوں کدھر، خدا معلوم

فطرت اور تہذیب کے درمیان بہت سے رابطوں میں سے ایک رابطہ "پھول" بھی ہیں۔ "پھول" انسانی زندگی میں حُسن، لطافت، کشادگی اور خوشبو کی علامت ہے۔ تاہم اس کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ انسانی "خودغرضی" فطرت کے حُسن کو تباہ کر دیتی ہے۔ فطرت اور تہذیب کا یہ تضاد آلِ رضا کے یہاں دیکھیے ؎

کھلتے پھولوں کی یہ کہانی دل کو نہ کیوں تڑپائے بہت
شاخوں پر کم کھلنے پائے، ہاتھوں میں کمہلائے بہت
کچی کلیاں توڑ کے رکھ دیں پانی میں کھِل اُٹھنے کو
یوں جو تمناؤں سے کھیلے، کھیل کے ہم پچھتائے بہت

اَب کچھ آلِ رضا کی زبان اور اُسلوبِ شعر سے متعلق: آلِ رضا حضرت آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ اُردو شاعری میں آرزو لکھنوی کی تخصیص یہ تھی کہ وہ اُسے عام بول چال کی زبان سے قریب لے آئے۔ عام بول چال کی زبان اپنی قوت اور توانائیوں کے سوتوں سے قریب ہوتی ہے۔ انسانی جذبات واحساسات اور زندگی کے ٹھوس تجربات سے بھی قریب ہوتی ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ انسانی تہذیب کے ذہنی و مادری اصولوں سے مُسلک ہوتی ہے۔ یہ زبان فلسفیانہ اور تجریدی محرکات کے کام تو نہیں آتی، لیکن محبت، شفقت اور پُرخلوص جذبات کے کام آتی ہے اور ماں کی مدھر لوریوں کی طرح میٹھی ہوتی ہے۔

آلِ رضا نے اُستاد کی پیروی میں اپنی شعری زبان بھی اُن ہی کے پیرایۂ بیان کے مطابق ڈھالی۔ ان کی زبان بھی عام بول چال کی زبان سے قریب ہے۔ اس سے وہ زبان مراد نہ لیجیے جو فی زمانہ کراچی میں استعمال ہوتی ہے۔ ایسی زبان تو محض مزاحیہ اسالیب کے لیے ہی استعمال ہو سکتی ہے۔ آلِ رضا نے بھی آرزو صاحب کی طرح زبان سے بھاری بھرکم الفاظ، بوجھل ترکیبیں خارج کر دیں اور محض وہ لفظیات استعمال کیں، جو اُن کے دل کی دھڑکنوں کو زبان دے سکیں۔ اس چھان پھٹک میں آلِ رضا نے کچھ کھویا بھی، لیکن جو پایا وہ یقیناً بہت قیمتی ہے۔ ان کی زبان میں لوچ، نرمی، گھلاوٹ اور لطافت اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ان کی شاعری میں لطفِ زبان کا ایک علاحدہ باب قائم کیا جا سکتا ہے۔

سید شبیہ الحسن نے اپنی تعلیم کے دوران ایم۔ اے اُردو کے مقالے کے لیے آلِ رضا کی غزل گوئی کو بحیثیت موضوع منتخب کیا۔ اب جب کہ وہ خود استاد بن گئے ہیں اور ایف۔ سی کالج لاہور میں ایم۔ اے اُردو کی

تدریس سے وابستہ ہیں، لکھنوی دبستان کے آخری دور کے شعرا پر پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ اسے آلِ رضا کا روحانی فیض کہیے کہ شبیہ الحسن ان کے حوالے سے ایک وسیع تر تناظر کے حامل ہو گئے ہیں۔

اب یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ ہی کو اس کے حُسن وقبح کا فیصلہ کرنا ہے۔ کتاب لکھنے والا تو اپنے طور پر محنت کرتا ہی ہے چوں کہ اس کی نوعیت بنیادی طور پر ایک تحقیقی مقالے کی ہے۔ فی الحال صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے خاطر خواہ جاں فشانی سے کام لیا ہے تاہم چھوٹے دائرے سے نکل کر بڑے دائرے تک پہنچے تو انسانوں کی طرف کتاب کی قدر کا بھی بار دیگر تعین ہوتا ہے، اب یہ کام آپ کیجیے اور مجھے اجازت دیجیے۔

(مشمولہ 'آل رضا کا فن غزل گوئی' ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)

◆◆◆

آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی اور سیّد شبیہ الحسن

سیّد ہاشم رضا

◆◆

سیّد شبیہ الحسن نے میرے برادرِ محترم و مرحوم سیّد آلِ رضا کے فنِ غزل گوئی کے بارے میں جو کچھ اور جس طرح لکھا ہے، اسے میں Labour of Love سمجھتا ہوں، میں ان کی ادبی کاوش اور شعری ذوق کی داد دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ان کی تصنیف ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' کے پڑھنے والے میری طرح ان کے تخیلات اور نتائج سے متفق ہوں گے۔

ان کی فرمائش پر اور ان کے تجویز کردہ عنوان پر میں یہ سطریں قلم بند کر رہا ہوں، میرے بھائی نے ۱۹۲۲ء سے غزلیں کہنا شروع کیں، ۷ برس میں جتنی غزلیں کہیں انھیں میرے برادرِ محترم اور مرحوم سیّد کاظم رضا نے ''نوائے رضا'' کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے شائع کیا، اس مجموعہ کا پیش لفظ بھی انھوں نے لکھا جس پر ۲۴ راگست ۱۹۲۹ء کی تاریخ درج ہے۔ مولانا صفیؔ نے ''نوائے رضا'' پر ایک والہانہ نظم لکھی جس کا عنوان تھا ''نوائے صفی بر نوائے رضا'' اور پروفیسر سیّد مسعود حسن ادیبؔ کی تصنیف ''ہماری شاعری'' کے پیش لفظ میں یہ شعر لکھا:

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے

فطرت نے آلِ رضا کو ایک بڑا حساس دل عطا کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ دلی جذبات کی ترجمانی کی دولت بھی عطا کی۔ ان کی فکر کا محور محبت تھی، جس کے بارے میں انھوں نے کہا:

زندگی دل کے لیے، دل ہے محبت کے لیے
ایک تم یاد ہو اور اک یہ سبق یاد مجھے
پوچھتے کیا ہو محبت کی ضرورت کیا ہے
جب سمجھتے ہی نہیں تم کہ محبت کیا ہے

رضا کتنی حسین اور مختصر شرح محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے جوراس آئے تو جنت ہے
اسی میں پھول چننا ہے اسی میں خاک اُڑانا ہے
گلستاں یا بیاباں اب تو جو کچھ ہے محبت ہے

....

جو مجھ پہ گزری محبت میں کوئی کچھ نہ کہے
بُری بھلی یہ بضاعت ہے زندگی بھر کی

....

خدا رکھے خدا رکھے ان اجزائے محبت کو
بہت کم ہیں مگر جتنے ہیں دنیا کو سنبھالے ہیں
غمِ دل سے پیدا خوشی ہو تو جانو
محبت کبھی تم نے کی ہو تو جانو
قضا کس ادب سے کھڑی ہے سرہانے
محبت کا سجدہ ادا ہو رہا ہے

(بہ فیضِ سیدالشہداء امام حسینؑ)

سیّد آلِ رضا کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ مکتبۂ افکار کراچی سے ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا۔ غزل میں ان کا مقام انھیں دو مجموعوں سے متعین ہوگا۔ ان کے بیس مرثیے شائع ہوئے۔ وہ اپنے مرثیوں کو غزل سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور انھیں وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ میں نے ان کی غزل سے مرثیہ کی جانب گریز کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے:

صحنِ غزل سے گلشنِ فردوس مرثیہ
ہر ایک کے نصیب میں یہ راستہ نہیں

سیّد آلِ رضا کو مذہب سے انہماک اور ادب اور شاعری سے لگاؤ، ہمارے والد ماجد جسٹس سیّد محمد رضا اور والدۂ محترمہ سیّدہ آلِ فاطمہ سے ورثے میں ملا تھا۔ ہمارے والدین پابندِ صوم وصلوٰۃ تھے اور ہر سال عشرۂ محرم نیوتنی ضلع اناؤ میں گزارتے تھے۔ عزاداری کے لیے انھوں نے اپنے گھر کو امام باڑہ اور اپنی جائیداد کو وقفِ فاطمی میں تبدیل کردیا۔ مجلس پڑھنے کے لیے لکھنؤ سے ذاکر اور مرثیہ گو بلائے جاتے تھے۔ میری والدہ صاحب بیاض تھیں، انھیں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں کے بے شمار بند یاد تھے۔ میرے والد فارسی شعرا کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک مقدمے میں انھوں نے شہزادی زیب النسا کے ایک مصرعے کو اس طرح استعمال کیا کہ وہ

فیصلہ کن ثابت ہوا، اس مقدمے میں مدّعی باپ تھا اور مدّعا علیہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ کی عمر تقریباً ۷۵ برس تھی اور بیٹا چالیس برس کا تھا۔ باپ نے اپنے بیٹے کا نام اپنا آبائی مکان گفٹ کے ذریعے سے منتقل کر دیا تھا، گفٹ کی شرط یہ ہے کہ متعلقہ جائیداد پر قبضہ دے دیا جائے۔ بیٹے نے یہ دعوا کیا تھا کہ باپ مکان کا قبضہ دے کر کسی دوسرے مکان میں چلا جائے۔ قصہ دراصل ساس اور بہو کے جھگڑے کا تھا۔ معمر باپ نے میرے والد کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اس بڑھاپے میں اپنی شریکِ حیات کو لے کر کہاں جاؤں اور پھر اکبرالہ آبادی کا یہ شعر پڑھا :

بوڑھوں سے سچ ہے لوگ کہاں تک وفا کریں
لیکن نہ موت آئے تو بوڑھے بھی کیا کریں

میرے والد نے بیٹے کی جانب مخاطب ہوکر کہا کہ ذرا اپنے ضعیف باپ کی طرف دیکھو، جو اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں ہے اور پھر یہ مصرعہ پڑھا :

اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند

بیٹے نے میرے والد سے کہا:

''جج صاحب آپ نے میری آنکھیں کھول دیں ، میں اپنے دعوے سے دست بردار ہوتا ہوں۔''

پھر اس نے اپنے باپ سے دست بستہ معافی مانگ کر گھر چلنے کو کہا۔

میرے والد نے Simple Living And High Thinking کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ انھوں نے عہدِ جوانی سے لے کر عہدِ پیری تک انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا۔ وہ شیروانی چیف کورٹ کے اجلاس پر بھی پہنتے تھے۔ سرلوئی اسٹیورٹ نے جو اودھ چیف کورٹ کے پہلے چیف جج تھے مجھ سے لندن میں ۱۹۳۲ء میں اُردو زبان میں کہا تھا:

''میں تمھارے والد کی ایمان داری اور وضع داری سے بہت متاثر ہوا تھا۔''

میرے عمِ محترم پروفیسر سیّد نواب علی مرحوم وزیرِ تعلیم ریاست جونا گڑھ نے جو علی گڑھ کے طالب علم اور کئی مستند کتابوں کے مصنف تھے، ہمارے پشت نامے کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے:

''اس قطعہ کو ہمارے خاندان والے یاد رکھیں:

گدائے شاہِ خراساں ہیں ہند میں آئے
شعار صبر و رضا اپنا اور لقب رضوی

ستایا گو فلکِ کج مدار نے ہم کو
مٹا سکا نہ مٹے گا یہ رنگِ مرتضوی''

سیّد آلِ رضا کے غم آشنا دل کو ہماری دو بہنوں کی وفات حسرت آیات نے ہلا کر رکھ دیا۔ سعید فاطمہ کی عمر ۱۷ برس اور لئیق فاطمہ کی عمر ۱۴ برس کی تھی کہ پیغامِ اجل آ گیا۔ سعید فاطمہ کی شادی طے ہو چکی تھی اور جہیز تیار ہو چکا تھا۔ میرے والد نے میری والدہ سے کہا تھا کہ ہمیں کیا خبر تھی کہ جہیز کے بجائے ہمیں اپنی بچی کو کفن دینا پڑے گا اور میر تقی میرؔ کا یہ شعر پڑھا تھا:

نہ تھا معلوم اے آرامِ جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمھیں بھولیں گے ہم اسبابِ شادی میں

اور جب لئیق فاطمہ نے ۲۱ روز میعادی بخار میں مبتلا رہ کر آنکھیں بند کیں تو میرے والد نے تعزیّت کرنے والوں کو میر انیسؔ کا یہ شعر پڑھ کر سنایا تھا:

کچھ دن جو اپنے پاس رہے، مستعار تھے
یہ لال سب امانتِ پروردگار تھے

محبت کے بعد سیّد آلِ رضا کا سب سے محبوب موضوع ''حُسن'' تھا۔ یہ وہ موضوع ہے، جس پر ہر شاعر طبع آزمائی کرتا ہے، لیکن ہر شاعر کا مطمحِ نظر مختلف ہوتا ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے فرمایا تھا:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس کے برعکس میر انیسؔ کا نقطۂ نظر یہ تھا:

پڑھیں دُرود نہ کیوں دیکھ کر حسِینوں کو
خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بِینوں کو

حُسن کے معاملے میں سیّد آلِ رضا، میر انیسؔ کے مقلّد تھے، جس کی چند مثالیں یہ ہیں:

حسن کو محدود کب کرتا ہوں لیکن ہر حسیں
اتنا ہی دلکش ہے جتنا تجھ سے ہے ملتا ہوا

....

خیالِ حُسن میں یوں زندگی تمام ہوئی
حسین صبح ہوئی اور حسین شام ہوئی

حُسن نے دل کو آنکھیں دیں
حُسن نے دل کو اور سنوارا

....

خلاقِ حسن و عشق بڑا دل نواز ہے
تخلیقِ شمع ہوتے ہی پروانہ بن گیا

میرے بڑے بھائی کی غزل گوئی اور میرا اور میرے چھوٹے بھائی مسعودؔ کی طالب علمی کا زرّیں دور لکھنؤ میں گزرا۔ مسعود مرحوم کا ذوقِ شعری بہت بلند تھا۔ انھوں نے پہلی غزل ۱۴ ربرس کی عمر میں کہی۔ لکھنؤ کرسچن کالج اور کیننگ کالج لکھنؤ کے مشاعروں میں چھ برس متواتر ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۲ء تک انھیں گولڈ میڈل ملتے رہے۔ سیّد آلِ رضا کی طرح وہ بھی حضرتِ آرزؔو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جن مشاعروں میں میرے بڑے بھائی غزل پڑھتے تھے، ہم دونوں ان کے ہم راہ ہوتے تھے۔ جب شمع گردش کرتے ہوئے ان کے سامنے رکھ دی جاتی تھی تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شمع کا اُجالا بڑھ گیا ہے، سامعین بڑی فراخ دلی سے انھیں داد دیتے تھے۔ ایک ایسے ہی مشاعرے کا منظر میری آنکھوں میں اب تک گھوم رہا ہے۔ مشاعرے کی صدارت جنابِ ناصری فرما رہے تھے۔ بھائی جان نے جو غزل پڑھی، اس کا مطلع تھا :

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی
اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی

ان کے بعد صدرِ مشاعرہ کی باری آئی تو جنابِ ناصری نے فرمایا:

”آلِ رضاؔ کی غزل کے بعد لطفِ مشاعرہ ختم ہوگیا۔“

اور اپنی غزل شمع کی لو کی نذر کر دی۔ میرے بھائی نے کہا حضرت یہ میری داد نہیں ہے، بل کہ میرے اور حاضرین کے ساتھ بیداد ہے، مگر جنابِ ناصرؔی صاحب نے صدر مشاعرہ کی حیثیت سے مشاعرے کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ جنابِ ناصری بڑے خوش گو شاعر تھے اور ان کا یہ شعر ان کی قبر پر کندہ ہے :

ناصرؔی قبر پہ عبرت کے لیے لکھوا لو
طول کھینچا ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے

لکھنؤ کے مشاعروں میں جن شعروں پر سیّد آلِ رضاؔ کو جی بھر کے داد ملی وہ یہ تھے:

اک راز ہے شہادتِ حق کے فدائیوں کی
فطرت ہی ممتحن تھی، فطرت ہی نوحہ خواں ہے

....

جو سُن سکو تو مری داستاں ختم نہ ہو
نہ سُن سکو تو کوئی حدِ اختصار نہیں

....

کچھ میری نظر نے اُٹھ کے کہا، کچھ اس کی نظر نے جھک کے کہا
جھگڑا جو نہ برسوں میں چکتا، طے ہو گیا باتوں باتوں میں

....

جلا جاتا ہے دل ہم کو رضاؔ یہ سیر سوجھی ہے
کہاں سے اٹھ چکے شعلے کہاں سے اٹھنے والے ہیں

....

واہ ذکرِ حبیب کیا کہنا
آہ کس بے وفا کا نام لیا
جیسے پہلے کبھی ملی ہی نہ تھی
ان نگاہوں نے یوں سلام لیا

....

بس اتنی بات پہ طوفانِ برق و باد آیا
یہ کون چمن سے بیٹھا ہے آشیانے میں

....

یہ لطف ان کے تغافل میں پھر کہاں ہوتا
جو اک لطیف تبسم نہ درمیاں ہوتا

....

آپ کے ہار میں یہ پھول جو ہے دل کے قریب
اُس سے کہیے کہ جب اُترے تو مرا دل بن جائے

....

پاؤں رکھتے نہیں ہے زمین پہ ہم
اور کس کو شباب کہتے ہیں؟

....

قیدیوں نے درِ زنداں کو جو ہنس کر دیکھا
اور بگڑے ہوئے تیور ہیں نگہبانوں کے

....

کام بُرے بنائے دن، بن نہ سکیں خدا کرے
توبہ، کہیں شک آ نہ جائے قدرتِ کارساز میں

....

یہ اپنے ذکر میں کیوں آ رہا ہے نام ان کا
یہ کس زمین پہ، کس آسماں کی باتیں ہیں

....

رچ رچ کے کیسے کیسے کھلاتی تھی روز پھول
جانے لگی تو مڑ کے نہ دیکھا بہار نے

....

جہاں میں چپ ہُوا پھر دیکھ لینا خود ہی چھیڑیں گے
یہ ساری ضد نہ سننے کی مرے شوقِ بیاں تک ہے

....

رُکے تو پاؤں پکڑ لے یہی زمین نہ کہیں
چلے چلو کہ وہ مل جائیں گے کہیں نہ کہیں
اُٹھا کے بزمِ محبت سے لے گئے جن کو
عجب مزاج کی شمعیں تھیں جل سکیں نہ کہیں
ہمارے منھ پہ رضاؔ تذکرے محبت کے
کہ جیسے ہم نے یہ باتیں کبھی سنیں نہ کہیں

....

کشتِ بے آب نے دیکھے ہیں وہ کالے بادل
جو کہیں اور برسنے کو اِدھر سے گزرے
سامنا ہو گیا رستے میں ہمارا اُن کا
یہ بھی پُرلطف رہا کون کدھر سے گزرے

غرض رات، دن، شام پچھلے سویرے
محبت کی گلیاں اُدھار دھند پھیرے
دعائیں جو لینا ہوں، لے لو رضاؔ سے
فقیروں کے ہوتے نہیں روز پھیرے

قائدِاعظمؒ نے آل انڈیا سروسز کے مسلم ممبروں کو نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کی خدمت کرنے کا موقع عطا فرمایا۔ ہم تین بھائیوں نے ہندستان چھوڑ کر پاکستان کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں سیّد کاظم رضا انڈین پولیس سروس، سیّد مسعود رضا انڈین ریلوے اکاؤنٹس سروس اور مَیں انڈین سول سروس میں تھا۔ ہم تینوں پاکستان کی متبادل سروسز میں شامل ہو گئے۔ سیّد آلِ رضاؔ اگر چاہتے تو لکھنؤ نہ چھوڑتے، جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ لکھنؤ چھوڑنے پر اس لیے مجبور ہوئے کہ ہندوؤں نے آزادی کے بعد اس شہر میں اُردو کی درگت بنادی، جہاں وہ شاہانِ اودھ کے دور میں پروان چڑھی تھی۔ دکانوں سے اُردو کے بورڈ ہٹا دیے گئے اور ہندی کے بورڈ لگا دیے گئے۔ سڑکوں کے بورڈوں سے اُردو مٹا دی گئی اور روڈ کی جگہ ''مارگ'' نے لے لی۔ ہر طرف مرگِ اُردو کے آثار دیکھ کر سیّد آلِ رضاؔ نے لکھنؤ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا صفیؔ نے آل انڈیا ریڈیو کی بدلی ہوئی زبان پر یہ تبصرہ کیا تھا :

زباں بگڑی ہے بھارت ریڈیو کی
ہنسی آتی ہے جب منھ کھولتا ہے
جہاں پہلے عنادل تھے غزل خواں
وہاں اس وقت اُلّو بولتا ہے

مولانا حالیؔ نے ایک نظم کہی تھی، جس کا پہلا مصرعہ تھا :

''اے وطن، اے مرے بہشت بریں''

اور ایک شعر یہ تھا :

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جس ذہنی کشمکش میں پڑ کر سیّد آلِ رضاؔ نے اپنا آبائی وطن چھوڑا، اس کا تذکرہ انھوں نے ان اشعار میں کیا :

یوں تو بے تابی میں اس محفل سے اُٹھ جانا پڑا
کیا کہوں، پھر کیا ہوا، جب دل کو سمجھانا پڑا
موت ہی جس کو چھڑا سکتی تھی وہ دلکش دیار
یوں چُھٹا ہم سے کہ ہم کو خود ہی چھوڑ آنا پڑا

وہ وداعی مرحلے، وہ عمر بھر کے سلسلے
دھوکے دے دے کر نگاہ و دل کو بہلانا پڑا
وقت نازک رشتہ اُلفت کے پھندے جا بہ جا
گتھیوں کو کانپتے ہاتھوں سے سُلجھانا پڑا
گھر چُھٹا، گھر کی فضاؤں کی جمی محفل چھٹی
اپنے بیگانے ہوئے، غیروں کو اپنانا پڑا
زندگی کی تلخی بے چارگی کو کیا کہوں
لذتیں کتنی تھیں جن کو بھول ہی جانا پڑا
سلسلہ جھوٹی اُمیدوں کا ہے کتنا دل فریب
ایک ٹوٹی، دوسری کی رو میں بہہ جانا پڑا
کیا عجب کچھ بے کھلی کلیوں نے سوچا ہو رضؔا
کھل کے کیا ہو گا اگر کھلتے ہی مرجھانا پڑا

کراچی میں میرے بھائی نے غزل گوئی پر کم اور مرثیہ گوئی پر زیادہ توجہ دی۔ میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہ نے صرف ایک غزل کہی تھی، جس کے بعد غزل کو خیر باد کہہ کر فقید المثال مرثیوں میں مضامینِ نو کے وہ انبار لگائے، جن کے اب تک ہر مرثیہ گو خوشہ چیں ہے۔ میرے بھائی نے اپنے آخری دور میں میر انیسؔ کی طرح غزل گوئی ترک تو نہیں کی، لیکن اسے محدود کر دیا۔ انھوں نے کراچی میں بزمِ آرزوؔ قائم کی تھی، جس کے مشاعرے ان ہی کے گھر پر منعقد ہوا کرتے تھے۔ چند سال تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر اس کے بعد ان کی تمام تر توجہ مرثیے پر مرکوز ہو گئی۔ بزمِ آرزوؔ کے مشاعروں میں جو اشعار انھوں نے سُنائے ان میں سے چند یہ تھے :

وہ رضؔا جس کو غزل گوئی سے تھا کچھ واسطہ
واقعہ تھا اک زمانے میں اب افسانہ ہوا
وطن دیارِ محبت ہے آدمی کے لیے
کہیں قبول غریب الدیار ہو نہ سکا
ملی ہے ایسی طبیعت وقارِ دل کی قسم
مزاج دہر کبھی سازگار ہو نہ سکا

....

ساتھ پھرتے ہیں غریب الوطنی کے سائے
اپنی گنتی ہے نہ اپنوں میں نہ بیگانوں میں

....

اے ہم نفسو آؤ کہ اب ہم سے اکیلے
جشن اپنی تباہی کا منایا نہیں جاتا

....

رہیں نہ دل کی اُمنگیں حواس باقی ہیں
یہ قافلہ بھی اسی قافلے سے جا ملتا

....

جان جاتی ہے آشیانے پر
اور کم بخت یہ جلا ہے بہت

....

آؤ کچھ دیر اندھیرے سے یوں ہی جی بہلے
رنگ پھیکا ہے چراغوں کا سحر ہو شاید
بے اثر لاکھ محبت ہو، یہ رہتا ہے گماں
آج اثر، آج اثر، آج اثر ہو شاید

....

مسافر تھک گیا، دن ڈھل گیا، اب شام ہوتی ہے
نظر آئے گا اس عالم میں رستے کا نشاں کب تک
دیارِ غیر میں یہ پوچھنا ہی پڑ گیا آخر
بلا کر بے وطن کو رہنے دیتے ہیں یہاں کب تک
رضاؔ کا خاتمہ بالخیر ہو جانا مبارک ہو
چراغاں آپ کے گھر میں رہے گا مہرباں کب تک

....

آخری شمع جھلملاتی ہے
اور نمودِ سحر خدا معلوم

نیند میں اُٹھ کے جیسے کوئی چلے
جا رہا ہوں کدھر خدا معلوم

....

اندھیری قبر میں جب داغِ دل چمک اُٹھے
ہے کس غضب کی سجاوٹ مرے نئے گھر میں

....

دم اگر آنکھوں میں پھر جائے تو اے شوقِ نگاہ
دیکھ لوں منظر میں اپنی آخری پوشاک کا

....

مہمان بن کے تم بھی کہاں آ گئے رضاؔ
ہر میزبان بے سروساماں ہے اور ہم

....

جہاں بدلتے ہوں قسمت مٹا کے خودداری
زمانہ جائے تو جائے، رضاؔ نہیں جاتا

....

کھلتے پھولوں کی یہ کہانی دل کو نہ کیوں تڑپائے بہت
شاخوں پر کم کھلنے پائے، ہاتھوں میں کمہلائے بہت
دردِ محبت کیا کیا بخشے، پاسِ محبت کچھ بھی نہیں
ایک ستم کا اس سے گلہ کیا، جس نے کرم فرمائے بہت
قسمت کا یہ پھیر بھی دیکھا، بجھنے والی پیاس بڑھی
مٹی ترسی، بوند نہ برسی، بادل گھر کے آئے بہت
کچی کلیاں توڑ کے رکھ دیں پانی میں کھِل اُٹھنے کو
یوں جو تمناؤں سے کھیلے، کھیل کے ہم پچھتائے بہت
انسانوں کا عجائب خانہ ہے تو رضاؔ دلچسپ مقام
جس کو دیکھو، جس سے پوچھو، سمجھے کم، سمجھائے بہت

....

برائے نام سہی منصفی سے کام تو لو
کسی ہم ایسے قتیلِ جفا کا نام تو لو

....

پیار آ نہ جائے کیوں کر ان کی ''نہیں نہیں'' پر
آنکھوں کا اک اشارہ دُہری شکن جبیں پر
تصویرِ عشق میں بھی اک حُسن پھوٹ نِکلا
یہ خاک کس کے در سے لائے رضاؔ جبیں پر

....

نہ سہی علاجِ غمِ رضاؔ تو ملے مزاج ہی کم سے کم
یہ ہے دل کے درد کا رنگ کیا؟ نہ ستم سے کم نہ کرم سے کم
یہ خطا کا عجز کہ ہر کرم بری حدِّ عذر سے بھی سوا
یہ کرم کا زور کہ ہر خطا تری حدِّ شانِ کرم سے کم
جو انھیں غرورِ وفا ملا تو ہمیں بھی نازِ وفا ملا
ہے برابری کا معاملہ، نہ ہم ان سے کم نہ وہ ہم سے کم

جس طرح میرے بھائی کی غزل لکھنؤ میں پروان چڑھی، اُسی طرح اُن کے مرثیے کا عروج کراچی میں ہوا، جہاں برصغیر کے اہلِ دل اور اہلِ قلم، سخن دان اور سخن شناس بہ فیضِ پاکستان جمع ہو گئے اور انھیں خوب سے خوب تر کہنے کا حوصلہ دیتے رہے۔

ان کے انتقال پر میرے دوست سیّد فضل احمد کریم فضلی نے مجھے بھائی جان کا ایک شعر سنایا اور کہا کہ یہ شعر انھوں نے مسلم ہاسٹل الٰہ آباد کے سالانہ مشاعرے میں ۱۹۲۶ء میں پڑھا تھا:

غم کا ہے یارو ماتم کیا، بدلو گے نظامِ عالم کیا؟
مرنا تھا رضاؔ کو مرتا ہے، یہ کاہے کا رونا دھونا ہے

خدا کرے کہ عالمِ بالا میں میرے مرحوم بھائی کی یہ آرزو پوری ہوئی ہو۔

خدایا تیری رحمت کے تصدّق اک تمنا ہے
تری جنت اگر کوئے محمدؐ ہو تو کیا کہنا

(مشمولہ 'آل رضا کا فنِ غزل گوئی' ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن، لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)

◆◆◆

جدید تنقید میں اضافہ۔ آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی

علامہ سیّد انوار ظہوری

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تنقیدی و تحقیقی مقالہ ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' ایک ہمہ صفت کتاب کی صورت میں نظر نواز ہوا جہاں مصنف نے اپنی باتوں میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اس کی ترتیب و تہذیب کے مراحل کس طرح طے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کی نشان دہی بھی کر دی کہ بنیادی طور پر اس کتاب کو ایم۔اے اُردو کے تھیسز (Thesis) کی صورت میں تالیف کیا گیا۔

سیّد شبیہ الحسن اب ادبی دنیا کے لیے اجنبی نہیں، موصوف نے بڑی سرعت و عجلت کے ساتھ اُدبی فتوحات کے میدان میں پیش رفت کی ہے۔ اُن کی دیگر کتب اور ''شام و سحر'' کے ادارتی کاوشوں نے انھیں سورج کی پھیلتی بڑھتی ہوئی کرنوں کی طرح بڑی زود رفتار شہرت عطا کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہمارے دَور کے ادبی مستقبل کی ایک قد آور شخصیت ہیں۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک دانش ور ایک عمر گزارنے کے بعد بھی شہرت عام و بقائے دوام سے محروم گزر جاتا ہے اور اُس کا فن اپنے قبولیت کے ذائقوں سے بھی آشنا ہونے نہیں پاتا۔ اس کے برعکس یوں بھی ہوتا ہے بل کہ ہمارے دور میں زیادہ تر ایسا ہی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ایک صاحبِ حیثیت اپنے وسائل سے کام لے کر اپنے اور اپنے فکر و فن کے حوالے سے نہ صرف اپنی جلد پہچان کا بندوبست کرتا ہے بل کہ اپنے مذاقِ فن کے عصری اعتراف پر بھی اہلِ دانش کو مجبور کر دیتا ہے۔

اپنے مقالے ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' میں شبیہ الحسن نے اپنے قارئین کو بے ساختہ اعتراف نگارش پر مجبور کرتے ہوئے اس یقین کا حامل بنا دیا کہ شبیہ الحسن کا تنقیدی شعور تنقید کے مسلمہ اُصولوں سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہمارے کانوں تک ایک تازہ خوشگوار تنقیدی آواز پہنچ رہی ہے اور ایک ایسا تنقیدی لہجہ متعارف ہوا ہے جو روایت کے اعلیٰ اوصاف کے ساتھ عصری مزاج کے فنی تقاضوں سے ہم آہنگی

کا اہتمام لازم گردانتا ہے۔ موصوف نے سیّد آلِ رضا کو پوری آب و تاب کے ساتھ ہماری فنّی تاریخ کے شعری منظر کا ایک مستقل حصہ بنادیا۔

سیّد آلِ رضا کوئی گم نام یا نوآموز شخصیت نہیں لیکن اُن کے تعارف کا غالب تر حصہ بالخصوص پاکستان میں اُن کی مرثیہ نگاری سے منسوب ہو کر رہ گیا حالاں کہ سیّد آلِ رضا کے منی بہ غزل دو مجموعے ایک ہندستان میں اور ایک پاکستان میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکے ہیں لیکن عوامی حلقوں تک اُن کی غزل کا چرچا اتنا عام نہ ہونے پایا جتنا مرثیوں کو نصیب ہوا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ خود سیّد آلِ رضا نے آخری دور میں اپنی غزل پر مرثیہ نگاری کو ترجیح دی۔ شبیہ الحسن نے اپنی زیرِ نظر تحقیقی و تنقیدی کاوش سے کام لیتے ہوئے اپنے قارئین کی آنکھوں سے وہ پردہ ہٹادیا جس نے اُن کی غزل اور غزل کو رنگ روپ دے کر نکھارنے والے فن سے بیگانہ بنا دیا تھا۔ جو لوگ سیّد آلِ رضا کو قریب سے جانتے تھے وہ اُن کی غزل کے اچھوتے فن اور مسکراتے لہجے سے آشنا ضرور تھے لیکن اُن کے معاصرانہ تعارف کے لیے کوئی موزوں ناقد یا تو دانستہ سامنے نہیں آیا یا پھر اس خدمت کے لیے فرصتِ نگارش نہ پیدا کر سکا۔ زیرِ نظر کتاب میں سیّد آلِ رضا کے تنقیدی تعارف کا حق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے حالاتِ زندگی سے بھی اُن قارئین کو آگاہ کر دیا جو اتنی تفصیل کے ساتھ اُن سے واقف نہ تھے۔

سیّد ہاشم رضا خود بھی ایک اچھے شاعر، مقرر اور صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ موصوف نے سیّد آلِ رضا کا شخصی و فنی مطالعہ کرنے والوں پر یہ بڑا احسان کیا کہ بعض ایسی باتیں سامنے لے آئے جن سے عام لوگوں کی سماعت محروم تھی اور بعض ایسے گوشے دکھا دیے جو ہر نظر پر منکشف نہ تھے۔ اس طرح زیرِ نظر کتاب کی اہمیت میں دو چند اضافہ ہو گیا اُن پر آگے چل کر تنقیدی کام کرنے والوں کے لیے سیرت و کردار کے مستند وقوف کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی کے اُن تمام نفسیاتی پہلوؤں کو سمجھنے میں بھی سہولت میسّر آئے گی جن کے سبب اُن کی معقولانہ شاعری نفسیاتی محرکات کا ایک دل چسپ مرقع دکھائی دیتی ہے۔

پروفیسر سیّد شبیہ الحسن نے کتاب کو مختلف ایسے ابواب میں تقسیم کیا ہے جن سے مطالعاتی مذاق کو سلسلہ وار تنقیدی ارتقا کا لطف آجاتا ہے اس کتاب کی ایک اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ ناقد نے تنقید و تحقیق دونوں کو شانہ بہ شانہ رکھا۔ تحقیق کی صورت میں اُن کے سامنے وہ سارا مواد موجود رہا جو سیّد آلِ رضا کی زندگی یا وفات کے بعد مختلف کتب، جرائد یا اخبارات میں شائع ہوتا رہا۔ مرحوم کی غیر مطبوعہ تخلیقات اور اُن کے نام، نامی گرامی اہلِ قلم حضرات کے خطوط بھی زیرِ مطالعہ رہے۔ اس طرح ایک ایسی عمدہ بنیاد فراہم ہو گئی جس پر آگے چل کر سیّد آلِ رضا کے متعلق کوئی مزید تحقیق یا تنقید کا شائق اپنی کاوش و محنت میں مناسب سہولت محسوس کر سکتا ہے۔ مصنف کے پیش کردہ حواشی نے جن سے کتابیات کے پہلو کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے کتاب کو مزید وقیع تر بنا دیا۔ یوں ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' سیّد آلِ رضا پر بیک وقت تنقیدی و تحقیقی حوالہ بن گئی۔

مصنف نے جا بجا دیگر اربابِ دانش کی تحریروں سے اُن آراء کا انتخاب کیا، جو سیّد آلِ رضا کی شخصیت وفن کا تجزیہ کرنے والوں کے لیے موضوعاتی مناسبت سے خاصہ وزن رکھتی ہیں۔ اس رُخ سے بھی کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

پروفیسر شبیہ الحسن نے جہاں سیّد آلِ رضا کے خاندانی اور وطنی ماحول کا تفصیلی تعارف کرایا وہیں اپنے تنقیدی تبصروں سے اپنا ذاتی موقف بھی نمایاں کر دیا۔ ہمیں لکھنؤ کی علمی و تہذیبی مرکزیت سے روشناس کرانے کے لیے وہ اپنے خوب صورت دلائل سے کام لیتے ہوئے لکھنوی تہذیب کی مدافعت کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح جہاں سیّد آلِ رضا کا ماحول اور اُن کی ذہنی فضا کا اندازہ لگانے میں آسانی ہو جاتی ہے وہیں صاحبِ کتاب کے اپنے مزاج سے بھی قاری کو آگاہی میسّر آ جاتی ہے۔

لکھنؤ کے شعری ماحول کے حوالے سے ہمیں نہ صرف وہاں کے مقتدر اساتذہ کی لسانی و فنی خدمات کا اندازہ ہو جاتا ہے بل کہ لکھنؤ کی علمی و فنی مرکزیت کے حوالے سے اربابِ فن کی سرپرستی اور موجودہ صدی کی تیسری دہائی سے تبدیل شدہ افکار و نظریات اور جدید فنی رویوں کی خبر بھی مل جاتی ہے۔

مصنف نے ایک باب سیّد آلِ رضا کی غزل کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے کے لیے مختص کر دیا ہے۔ اسباب کے ذریعے ہمیں سیّد آلِ رضا اور اُن کی غزل کے رشتوں کی تمام لطافتیں اور نزاکتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ اُن کی خدمتِ غزل کے ساتھ ہی تحفظِ غزل کی اُن کوششوں کا بھی علم ہو جاتا ہے جن کے ذریعے جلالؔ لکھنوی اور آرزوؔ لکھنوی کی روایت کو تازہ رکھنے اور اُسے اپنے دور تک پہنچا کر نئی نسلوں کے لیے ایک خوب صورت لسانی ورثہ بنانے کا مخلصانہ رویہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں ہمیں شبیہ الحسن بیک وقت ایک کامیاب ناقد اور ایک کامیاب محقق دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں موصوف نے اپنا تنقیدی ماحصل پیش کیا ہے وہیں اپنے موقف کی حمایت میں دیگر ناقدوں کی آراء بھی یک جا کر دی ہیں۔ اس طرح اُن کی تنقید اپنی ذاتی تنقید کے علاوہ دیگر ناقدوں کی آراء کا تنقیدی تجزیہ بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح ہمیں رضا شناسی کا ایک معتبر حوالہ دستیاب ہو جاتا ہے۔

موصوف نے لکھنؤ کے تہذیبی تناظر میں سیّد آلِ رضا کے اُستاد آرزوؔ لکھنوی اور اُن کے اُستاد جلالؔ لکھنوی کی رعایت سے جس لہجے کو خصوصیت کے ساتھ اپنا تنقیدی موضوع بنایا ہے اور اُن کی رومانی فکر کو اُجاگر کیا ہے وہی بجا طور پر ایک اشکال بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایک عام قاری آلِ رضا کو غزل کا محدود الفکر شاعر نہ سمجھ لے جب کہ آلِ رضا رومانویت کے ناتے نفسیاتی محرکات کی ترجمانی پر ہی اکتفا نہیں کرتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ سہلِ ممتنع غزل کہنے والوں میں شامل ہیں لیکن وہ اپنی غزل میں صرف جذباتی رویوں اور محبت کے معاملاتی لہجوں میں ہی قید نہیں، مختلف نوعیت کے عصری مسائل پر محیط فکر بھی اُن کی غزل سے بہ آسانی مترشح ہوتی ہے۔

چوں کہ زیرِ نظر کتاب ایم۔اے کی مقالاتی ضرورت کے پیشِ نظر مکمل کی گئی تھی اس لیے ممکن ہے کہ مصنف نے اختصار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری جانا ہو لیکن عام قاری کے لیے شبیہ الحسن ہاشمی کی پیش کش ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی''، معلوماتی حیثیت سے مکتفی ہے بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تا حال آلِ رضا کی غزل گوئی پر یہ پہلی جامع پیش کش ہے۔

موصوف نے بڑی تحقیق و محنت سے آلِ رضا کی تاریخِ پیدائش کے تعین کا مرحلہ طے کیا ہے اُن کی یہ تحقیقی محنت فی الواقعہ تحسین و داد کی مستحق ہے۔

آخری باب میں قاری کی ذہنی تواضع کے لیے سیّد آلِ رضا کی غیر مطبوعہ غزلیں بھی یک جا کر دی گئی ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعہ سے جہاں جلالؔ اور آرزوؔ کی روایت کا حسنِ احترام نمایاں ہے وہیں شاد عارفی مرحوم کے حشر لانہ لہجے کی مسلسل گونج بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان غزلوں میں عام بول چال کا فنی رویّہ بھی نمایاں ہے اور سادگی و شستگی بھی چہرہ نما ہے۔ مختصراً اتنا کہہ دینا شاید کافی ہو کہ آلِ رضا نے لکھنوی تہذیب کے دورِ آخر کی غزل، اس کے مزاج اور جدید لب و لہجے کی چاشنی کو لکھنؤ سے کراچی منتقل کر دیا جس کے سبب کراچی میں لکھنوی اقدار کی پاس داری کے ساتھ ساتھ دبستانِ لکھنؤ کی مرکزیت کو حیاتِ نو میسر آئی اور وہ غزل زندہ رہی جو روایت و جدیدیت کا مشترکہ حوالہ بنی۔ یوں پاکستان کی اُردو زبان میں لکھنوی لہجے کی ابدیت یقینی ہو گئی۔ شبیہ الحسن ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی''، جیسی پیش کش پر اہلِ نظر کی جانب سے یقیناً مستحقِ داد ہیں۔ یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ آلِ رضا شناسی کے علاوہ بھی دبستانِ لکھنؤ کے فکری میلانات کا مطالعہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گا۔

(ماہنامہ ''جدید ادب'' لاہور، دسمبر ۱۹۸۹ء)

◆◆◆

آلِ رضا کی غزل گوئی کے بارے میں چند معروضات

علامہ سیّد انوار ظہوری

◆◆

انسان خلائی دور کا مسافر بن چکا ہے۔ اس میں خلانوردی کے باوجود زمینی رشتوں سے دست بردار ہونے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ زمین کی ثقلی کشش اسے پھر اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔ زمینی رشتوں کے حوالے سے وہ اپنے معیارِ شعور و بلوغ کی مناسبت سے کتابوں میں حرف و لفظ کا زندانی اور مستقل نخچیر ہے۔ صحفِ سماوی سے پہلے بھی حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے علم و خبر کی نعمتوں سے بہرہ مند فرما دیا تھا۔ صحفِ سماوی کا مطالعہ بھی انسانوں کو بالائے آسماں بُلا کر نہیں کرایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں انبیاؑ کی وساطت سے خود اہلِ زمین تک پہنچادیں یعنی مصنفِ اوّل یا مصنفِ حقیقی خود اللہ تعالیٰ کی ذاتِ احد و صمد ہے۔ اس پر مستزاد اس کی مخفی تصنیف لوحِ محفوظ اپنی الگ شان رکھتی ہے، یعنی انسانی دُنیا میں تصنیف و تالیف یا تخلیق و تہذیب کا عمل سنّتِ الٰہیہ کے تتبع کی حیثیت رکھتا ہے۔

بعض کتب اپنے زمانے کے لیے تصنیف کی جاتی ہیں اور اپنے عہد میں حکمت و آگہی کی توانا لہر دوڑا دیتی ہیں۔ بعض کُتب وقت سے بہت پہلے اور بسا اوقات صدیوں پہلے بندشِ تحریر میں آجاتی ہیں اور کسی آنے والے دَور کا معیارِ شعور و بلوغ ان کے مندرجات کا معانی آشنا ثابت ہوتا ہے۔ بعض کُتب اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے تو کتابوں کے زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں، لیکن مطالعاتی مواد کے اعتبار سے کسی دور کا حوالہ قرار پانے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔ ایسی کتابوں سے البتہ کتب خانوں کی فہرستِ کتب تو اپنی ضخامت میں اضافہ کر لیتی ہے، لیکن ان میں کوئی توانا ذہنی غذا سر بند نہیں ہوتی۔ بعض کتابیں اس لیے تحریر میں لائی جاتی ہیں کہ وہ آنے والی نسلوں کا علمی ورثہ بن جاتی ہیں۔ ایسی کتب کے مصنفین کو ان کے اپنے عہد کے قارئین تو کجا پڑوسی بھی جاننے، پہچاننے اور سمجھنے سے عاری ہوتے ہیں۔ ایسی شخصیتیں ہمیشہ اگلی نسلوں کے ذہنی ارتقا کی آرزومند رہتی ہیں۔

بعض اربابِ دانش زندگی بھر تصنیف و تالیف کے رت جگے اپنائے خاموشی سے گزر جاتے ہیں۔ ان کے معاصرین اپنے علمی احساسِ کمتری کے سبب انھیں زندگی میں کبھی منظر کا حصہ بننے نہیں دیتے۔ بعض ایسے خوش نصیب، زیرک اور چالاک دانش ور بھی کسی نہ کسی راہ سے اپنے لیے گنجائش پیدا کر کے تصنیف و تالیف کی دنیا میں اپنی اصل حیثیت کے برعکس نام وری کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کی محنت سے فائدہ اٹھانے یا دوسروں کی محنت کو اپنا لینے کی وہ صلاحیت رکھتے ہیں جو اصل اہلِ قلم کو پسِ پشت ڈلوا کر انھیں علمی دنیا کے منظر کا حصہ بنوا دیتی ہے۔ یہاں ان کتب سے کوئی بحث نہیں جن کے اقتباسات کو امتحانی ضرورتوں کے لیے استعمال کرنا آج کل کے بیش تر طالبِ علموں کا عمومی خاصہ ہے۔

زندگی صرف تاریخی نوعیت سے ہی نہیں بل کہ جملہ متعلقاتِ حیات کے رُخ سے مشاہداتی مطالعاتی اور تجرباتی زاویوں کے تواتر و تسلسل کی ایک محیر العقول علامت ہے۔ مطالعاتی نوعیتیں مختلف شعابِ علوم و فنون میں تقسیم در تقسیم کے لامتناہی عمل سے گزر کر اتنی وسعت اور پہنائی اختیار کر چکی ہیں کہ انسان کے لیے بیک وقت ان سب سے موضوعاتی نوعیت کا بھرپور تعارف بھی ناممکنات میں شامل ہو چکا ہے۔

اس حقیقت میں کسی بھی گمان واشتباہ کی سرے سے کوئی گنجائش موجود نہیں کہ جہاں مادّی تحقیق و تجسس نے مشاہدات و تجربات کے مراحل سے گزار کر سائنس دانوں کو نتائج کے استخراج پر آمادہ کیا اور دنیا سائنسی علوم و فنون پر مبنی کتب خانوں میں دفن ہوتی نظر آنے لگی، وہیں عالمِ حیوانی اور عالمِ انسانی کا ہر وجودِ حیات اپنی ایک جداگانہ تصنیفی (کتابی) حیثیت رکھتا ہے۔ ہر زندگی اپنے شب و روز کی مناسبت سے ایک مکمل کتاب ہے، جسے بھی اس کی جس قدر ورق گردانی کا موقع میسر آئے، وہ اتنا ہی اس کا حقائق آشنا ہو سکتا ہے۔

بات اَدب کی ہے، اَدب کی تمام اصناف معروف ہیں۔ جب کوئی تخلیق کار اپنی تخلیق پیش کرتا ہے، اس نظریے کو طے شدہ کلیے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے کہ وہ اپنی ذات اور شخصیت کی اصل ماہیت اپنی تخلیق میں بھی منعکس کر دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم کسی تخلیقی فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے خالقِ فن کی تمام خارجی اور داخلی کیفیات اس کے جذبات و احساسات، اس کے ذہنی و قلبی تجربات، اس کے نظری مشاہدات، اس کی سوچ اور دروں وجودی مخفی نفسیات کے تمام گوشوں تک پہنچنے کی ہر ممکن سعیِ تامہ سے کام لیتے ہیں۔ بطورِ خاص جب ہم کسی شاعر کی تخلیق اور اس کی شخصیت کا مشترکہ جائزہ لینا چاہتے ہیں، تو بجا طور پر یہ حقیقت دل و ذہن پر مرتسم ہو چکی ہوتی ہے کہ شاعر خواہ کسی دور کا ہو اور خواہ اس کی ذاتیات کے کتنے ہی کثیر حوالے فنی تخلیق کا حصہ بن چکے ہوں، وہ نہ اپنے لیے جیتا ہے، نہ اپنے لیے مرتا ہے۔ معاشرتی اکائی کی صورت میں بسا اوقات اس کی شخصیت و فن کا مطالعہ نہ صرف اس کے دَور کا مطالعہ ثابت ہوتا ہے بل کہ ہم اسی کے حوالے سے ایک طرف تو ماضی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف مستقبل کے امکانات سے واقفیت کے مراحل

بھی طے کر لیتے ہیں، جس کا رشتہ نہ ماضی کی امین روایات سے قائم ہو اور جو نہ مستقبل کے لیے تعمیری فضا میں تخم ریزی کر سکے۔ بلاشبہ کسی طور بھی اس کا تعلق شعور و بلوغ کی دنیا سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔

میں اسے اپنی مطالعاتی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ عزیز مکرم شبیہ الحسن کی وساطت سے یکا یک میرے سامنے ایک چمکتی دمکتی نو تصنیف تحقیقی و تنقیدی لوازمے پر منحصر ایسی کتاب ہاتھ آئی، جو میرے لیے اس نوعیت سے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی کہ برسوں موضوعِ تصنیف سے نہایت ارادت مندی کے ساتھ مجلسی، فکری، فنی اور علمی فیضان سمیٹنے کے خوشگوار مواقع میسّر آئے۔ تقریباً ربع صدی سے میری دلی خواہش تھی کہ پروفیسر شبیہ الحسن کے اس بیدار و توانا موضوعِ تصنیف کو اپنا موضوعِ تعارف و تنقید بناؤں، بس میری وہی جانی پہچانی خامی آڑے آئی۔ مدتوں سے کسی املا نویس کے بغیر میری حیثیت کسی عضوِ معطل جیسی رہ جاتی ہے۔

کتاب کا نام ہے ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' ع اس کی تکمیلِ نگارش کے سلسلے میں عرق ریزی کی ہے۔ پروفیسر شبیہ الحسن جیسے زود متعارف، محقق و ناقد نے۔ لطیفہ یہ ہے کہ یہ تعارف، یہ تنقید اور یہ تحقیق (دراصل بنیادی طور پر کتاب ان ہی گوشوں سے متعلق ہے)، کئی برس قبل ایم۔ اے کی تحصیل کے لیے بطور مقالہ تحریر کرنا پڑی، جو تا حال ان کی زندگی کا بہترین تحقیقی و تنقیدی لوازمہ تھا، وہ اسی کو الگ باندھ کر برسوں کے لیے بے نیاز ہو گئے اور یوں کتاب اس وقت ہمارے سامنے آئی جب خود ممدوحِ مصنف اپنے وجودِ معنوی کا عکس چھوڑ کر منظر سے ہٹ گیا۔

ہم آج کے بظاہر ترقی یافتہ اور ارتقا آشنا دور میں نہایت اندوہ ناک حقائق سے دوچار ہیں۔ میرؔ سے فیضؔ تک لکھنے والوں کی صفیں آراستہ ہیں۔ ان میں یا تو پیشہ ورانہ ضرورتوں کے تحت قلم اٹھانے والوں کی اکثریت ہے، یا بازارِ کتب کا منفعت بخش شعبہ جان کر لوگوں نے قلم اٹھایا اور پھر قینچی مار کہ مقالات اور مضامین و کتب کے انبار یک جا ہو گئے۔ بعض کتابیں نظریاتی مفاہمت کی بنیاد پر لکھی جاتی ہیں۔ بعض مذہبی، گروہی اور سیاسی لابی کے حوالے سے لکھی یا لکھوائی جاتی ہیں۔ پہلے صرف مرنے والے اربابِ دانش پر ازراہِ ترحم کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ کچھ ستم ظریف مصنف تو کتاب لکھ کر اپنے ممدوح کی موت کا انتظار شروع کر دیتے تھے کہ زندگی میں کتاب کی قدر و قیمت مضر ثابت ہو گی اور مرنے کے بعد یہی ایک حوالہ بن کر اُبھرے گی۔

دلہنوں کی رُونمائی انسانی معاشرے کی قدیم ترین روایت ہے۔ اب تو کتابوں کی اور بسا اوقات مصنفین کی رُونمائیوں کا چرچا عام ہے۔ جو مصنف جتنے حواری جمع کر سکے اور جس معیار کے فائیو سٹار ہوٹل میں لذتِ کام و دہن کا بندوبست کر سکے اور جس بڑے سے بڑے شخص کو صدرِ مجلس بنانے کے لیے پاپڑ بیل سکے، اس کی تصنیف کو بطورِ خاص اخبارات کے ادبی صفحات میں ایک نو بیاہی دُلہن کی طرح بڑی جان دار، شان دار اور خوش گوار پذیرائی میسّر آ جاتی ہے۔

تصنیف کتنی ہی عظیم ہو، اگر بد قسمتی سے اُس کا مصنف صاحبانِ کیہ وزر یا خاندانِ عہدہ و منصب کی ہم سری سے عاری ہو اور کسی لابی میں لابی کے سرخیل کی اُنگلی پکڑ کر چلنے والا بالک بھی نہ ہو، تو پھر یہ سمجھ لیجیے کہ اس بے چارے کی تصنیف و تخلیق نے معاشرے میں کوئی لہر پیدا نہیں کی۔

میری یہ معروضات نہ برسبیلِ تفنن ہیں اور نہ طنز و مزاح کا پہلو اُجاگر کرنے کی سعیِ ناتواں۔ یہ اقدار ہمارے عصری دانش وروں کے نام سے متعارف حلقوں میں سرایت کردہ ایسی روایت کا رنگ رُوپ اختیار کر چکی ہیں، جن سے اچھے بُرے کی تمیز بھی ختم ہو گئی۔ علمی و ادبی اور شعری و فنی معیار کو بھی ناقابلِ اصلاح مرحلوں تک پہنچا کر حکمت و آگہی کی اعلیٰ قدروں کو نقصان پہنچایا جا چکا ہے۔

آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی میرے لیے پروفیسر شبیہ الحسن کا ایک نہایت مخلصانہ ذاتی عطیہ ہے جیسے موصوف نے انجانے میں کھینچی ہوئی میری ہی کوئی تصویر مجھے پیش کر دی ہو۔ کتاب کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے نوجوان محقق شبیہ الحسن اپنے ممکنہ وسائل سے کام لے کر ایک جاذبِ نظر شکل دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کتاب ایسے وقت میرے سامنے آئی، جب خود ممدوح اپنے خالقِ حقیقی کے دربار میں حاضری دے بیٹھا۔ یعنی اس کتاب کی اشاعت سے جو پہلی بات سامنے آئی، وہ یہ کہ قریب العصر ہونے کے باوجود مصنف و محقق کے دل میں بذاتِ خود اپنے ممدوح سے کسی تحسین و داد کی خواہش و طلب کا خفیف سا شائبہ تک نہیں گزرتا کہ موصوف اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ سیّد آلِ رضا کو بہت سے لوگ جانتے ہوں گے، میں بھی ان سے نیاز مندانہ روابط کا حامل رہ چکا ہوں اور بلا خوف تردید اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی عام اَدبی اور تخلیقی زندگی ہر گرو ہی زلفِ گرہ گیر کی اسیری کے بغیر گزری۔ وہ اپنی ذات میں تنہا بھی تھے اور انجمن در انجمن توانا و تابناک رونقوں کے امینِ صادق بھی بڑے نامور اور معزز خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے چھوٹوں نے بھی بڑائی کے زینے طے کیے، لیکن وہ تمام عمر اپنے دم خم کے ساتھ اپنے خاندان یا اپنے مداحوں میں سے کسی کو اپنی فنی ترقی یا اَدبی تعارف کا زینہ بنائے بغیر نہایت خاموشی اور یک سوئی سے اپنے شعری و فکری سفر کی منزلیں طے کرتے رہے۔ اگر وہ چاہتے اپنی زندگی میں ہی جوش نمبر، حفیظ نمبر، عبدالعزیز خالد نمبر، فیض نمبر اور ندیم نمبر جیسی کئی خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کروانے پر قادر تھے۔ ان کے برادرِ خورد سیّد ہاشم رضا خود بھی شاعر ہیں، مقرر ہیں۔ اپنی تقریروں میں تکلم و خطابت کا حسن سمونے کے عادی ہیں۔ کراچی کی بے تاج بادشاہی کے دور سے مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر ہونے تک مختلف اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے، لیکن یہ سیّد آلِ رضا مرحوم کی بے نیازانہ اور درویشانہ طبیعت کی سادگی اور سادہ مزاجی کا ہی نتیجہ تھا کہ موصوف نے ایسے کسی امکان کو تکمیل تک نہ پہنچنے دیا۔ غزلِ معلّی شائع ہوئی یا ان کے مرثیوں کا مجموعہ سامنے آیا تو اس میں بھی ان کی ذاتی کوشش یا مزاجی تگ و دو کا سرے سے کوئی اَتہ پتہ نہیں ملتا۔ یہ تو اُن کے مداحوں کا اسرار تھا اور بطورِ خاص جناب صہبا لکھنوی جیسے برق فطرت اَدیب،

شاعر، مدیر اور ناشر کا حُسنِ کم بنگی جو غزل معلی سے ہمیں سیّد آلِ رضا مرحوم کی زندگی میں ہی متعارف کرایا گیا۔
اس مجموعے کی اشاعت کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ لاتعداد مداحوں اور ہزاروں واقفانِ حال کے باوجود اپنے مجموعے کے تنقیدی تعارف کے لیے موصوف نے کسی کا مرہونِ منت ہونا پسند نہیں کیا، اور بذاتِ خود غزل کے مطالعاتی اور تہذیبی تناظر میں ذاتی خیالات سے آگاہ کرنا کافی سمجھ لیا تاکہ ان کی نشان دہی کے ذریعے ان کی غزل کے قارئین بہ آسانی ان کی غزل کے دروں معنوی زاویوں تک پہنچ سکیں۔ اس حقیقتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے عزیزِ گرامی پروفیسر سیّد شبیہ الحسن کی زیرِ نظر تنقیدی کتاب ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی' ع میں نہ صرف سیّد آلِ رضا مرحوم کی غزل پر پہلا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے بل کہ اس پر مستزاد ان کی شخصیت کو متعارف کرانے میں ایسا گراں قدر تحقیقی لوازمہ بھی نہایت خوب صورتی سے یک جا کر دیا، جس کی اساس پر آئندہ سیّد آلِ رضا پر تنقیدی اور تحقیقی کام کرنے والے ناقدین کسی دشواری کے بغیر اپنی روانی قلم تیز تر کر سکیں۔

ایک بات بطورِ خاص محلِ نظر ہے کہ سیّد شبیہ الحسن سیّد آلِ رضا کے شریکِ مجلس رہے نہ ہم صحبت۔ ان دونوں میں تفاوتِ عمر کا مسئلہ بھی قلم اٹھاتے ہوئے فطرتاً خاصی دشواریوں کا باعث بنا، لیکن ان کے مذاقِ تحقیق اور محنت شاقہ نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ یہ مرحلہ طے کروا دیا۔ اپنے ذہن میں جن شخصیتوں پر میں نے بھرپور تنقیدی خاکے تیار کیے تھے، اُن میں سیّد آلِ رضا کی غزل گوئی کا فنی تعارف بھی شامل رہا۔ ان سے میرے نیاز مندانہ روابط کا خاصہ طویل حصہ شخصی حوالوں سے مشاہداتی نقاطِ نظر کے تحت قابلِ تحریر ہے۔ میں نے انھیں بارہا شعر سنتے، شعر سُناتے، اچھے بُرے اشعار پر اپنے کھلے اور دبے دبے ردِ عمل کے ساتھ بھی دیکھا اور اپنے اشعار کی معنوی باریکیوں کو شعر سُناتے ہوئے نہایت خوب صورتی کے ساتھ واضح کرتے بھی دیکھا، تاکہ قارئین اصل معنی و مفاہیم تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ ان کے فیضانِ صحبت سے متواتر لطف اندوز ہونے والا راقم الحروف اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ کر پایا اور اس کا جگمگاتا، مہکتا سہرا پروفیسر شبیہ الحسن جیسے نوجوان مفکر و ناقد کے سر بندھا۔ میری موجودہ سعی تحریر دراصل سیّد آلِ رضا کے حوالے سے پروفیسر شبیہ الحسن کی تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی کامیاب کاوشوں کے جائزے پر مبنی ہے۔ شبیہ الحسن ہمارے دَور میں بساطِ نقد و نظر کے ان تازہ واردانِ شوق میں شامل ہیں، جن کی پختہ کاری، دقتِ فن اور محنتِ شاقہ نہایت سُرعت کے ساتھ اُدبی حلقوں میں اپنے لیے قابلِ تحسین گنجائش پیدا کر لیتی ہے۔ سیّد آلِ رضا پاکستان آنے کے بعد خاصی محتاط اور گوشہ گیر حیثیت اختیار کر گئے۔ شعرا کی عام روایت کے برعکس وہ سفر در سفر مشاعروں میں گھومنے پھرنے والی شخصیت نہ تھے۔ کراچی میں آباد ہوئے تو وہاں کی ہمہ جہتی پہنائیوں میں بھی ان کی شعری زندگی مخصوص محدود اور ممتاز مجالس و محافل کے دائروں میں قید رہی۔ وہ جن تہذیبی آداب کے ساتھ پاکستان آئے، اپنے حلقوں میں انھیں کے خوشگوار نقوش مرتسم کرتے چلے گئے۔ کراچی کی وہ آزادانہ روش ان کے دامنِ تہذیب کو نہ چھو سکی،

جو نیک و بد کی ہر تمیز بہ عجلت اُٹھا دینے کی عادی ہو چکی ہے۔ وہ عوامی حلقوں کے شاعر تھے نہ عوامی کہلانے والے
شاعروں کے قبیلے سے کوئی دُور کا تعلق ہی رکھتے تھے۔ جب کہ ان کے اپنے برادرِ خورد اپنی فراخ دلی، کشادہ جبینی
اور وسیع النظری کے علاوہ مختلف سرکاری مناصب کی رواجی ضرورتوں کے تحت بڑی کثرت سے مختلف النوع
تقاریب کی صدارت کے فرائض انجام دینے پر مجبور ہو جاتے۔ اپنی ٹھہری ٹھہری متبسم اور دلوں میں اتر جانے والی
خطابت کے جوہر چمکاتے لطائف سے حُسنِ کلام کو جاندار بناتے اور کسی نہ کسی حیلے حوالے سے غالبؔ کی فنی
عظمتوں کے ذکر سے اپنی بات بڑھاتے ہیں۔ ان کی چٹخارے دار زبان کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ لفظ
لفظ ان کا علم اور ان کا مطالعہ بے ساختگی کے ساتھ جھلکتا چلا جاتا۔ ایسے ہمہ صفت موصوف چھوٹے بھائی کا بڑا
بھائی ہونا سیّد آلِ رضا کی ایک مزید بڑائی تھی، جس کا مرحوم نے اپنی زندگی میں کبھی اظہار نہ ہونے دیا اور اپنے
بھائی کی تقریباتی شرکتوں کو ذریعہ بنا کر اپنے تعارف کے لیے کوئی سطحی یا اضافی سبیل قائم نہ ہونے دی۔ یہ اُن کی
بزرگی، بڑائی اور علو سیرتی کا ایک جداگانہ خاصہ تھا۔ سیّد ہاشم رضا بھی شعر کہتے ہیں۔ اگر ان کے جستہ جستہ اشعار
یا منظومات کو یک جا کر دیا جائے تو خاصا جاذبِ نظر دیوان ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک الگ حیران کن صورت
حال ہے کہ اپنی شاعری کو خود موصوف نے سرے سے کوئی خاص اہمیت ہی نہ دی، جب کہ بذاتِ خود بارہا میں
اُن کا سامع رہ چکا ہوں۔ موصوف نے ہمیشہ اپنی شاعری کو اپنے مذاقِ شعر کا سادہ و بے ساختہ اظہار قرار دینے پر
اکتفا کیا۔ غالبؔ سے ان کا فطری لگاؤ اتنا شدید ہے کہ ایک مرتبہ راول پنڈی کی ایک اَدبی تقریب سے خطاب
کرتے ہوئے یہاں تک فرما گئے کہ غالبؔ کی شاعری کے بعد جیسے کسی مزید شاعری کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔
میں نے عصرانے پر گزارش کی، آپ تو سیّد آلِ رضا صاحب کو بھی فراموش کر گئے، ہنس پڑے اور فرمانے لگے:

"بھئی! وہ تو کسی اور مزاج کے شاعر ہیں، میں نے وسیع شعری تناظر میں یہ بات اس لیے نہیں کہی کہ اس پر گرفت کی جائے۔"

میرا اندازہ یہی ہے کہ سیّد آلِ رضا مرحوم نے اندرونِ خانہ بھی غالبؔ کی فکری حکمرانی کا تماشا دیکھا تو
رفتہ رفتہ غزل سے تائب ہو کر خود کو مرثیہ نگاری کے ایک جداگانہ اُسلوب کے لیے وقف کر دیا۔
جوشؔ ملیح آبادی کے متعلق خود ان ہی کے پیدا کردہ شور و غوغا کے سبب ان کی غزل "دشمنی" کو خاصی
شہرت میسر آئی یا ان کی نظموں کے پرستاروں نے اس کا بے جا ڈھنڈورا پیٹا۔ میں نے بذاتِ خود جوشؔ ملیح آبادی
کے بعض دیگر شاعروں کے ساتھ نہایت مخصوص و محدود نجی محفلوں میں اپنی بے شمار غزلیں سنائیں اور ماہر القادری،
سیّد آلِ رضا، شان الحق حقی، رئیس امروہوی جیسی شخصیتوں کے متغزلانہ اشعار پر بے اختیارانہ تحسین و داد کے
مناظر دیکھے ہیں۔ فضل احمد کریم فضلی صاحب کو تو غالباً وہ صرف تالیفِ قلب کے لیے داد سے نوازتے۔ لیکن بابا
ذہین شاہ تاجی، سیّد آلِ رضا اور استاد قمرؔ جلالوی کے اشعار پر ان کی داد خارجی نوعیت کی نہ ہوتی۔ دروں جذباتی

ہلچل کی ترجمان بن جاتی۔ یہ ایک لطیفہ ہی بن جاتا کہ ایسی محفلوں میں کبھی کبھی میں نے سید باقر حسین جعفری کی فرمائش پر نظمیں سُنا دیں یا مولانا ماہر القادری سے کوئی قدیم رومان پرور نظم بالاصرار سنی گئی۔ اسی طرح سب غزلیں سناتے اور جوش ملیح آبادی آخر میں اپنی طبیعت کی سیری تک نظمیں سُناتے چلے جاتے۔ رباعیات فرمائش پر اور آخر میں شوخ طبع سامعین کے شریر اصرار پر ہزل سُنا کر مجلس برخواست کرتے۔

اس ایک رنگِ محفل سے ہم نہایت آسانی کے ساتھ جوش ملیح آبادی اور سید آلِ رضا کی قوتِ برداشت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آلِ رضا غزل کی لطافتوں اور نزاکتوں کے امین صادق لکھنوی زبان کی جذباتی و تاثراتی خوبیوں کے پرچارک اور جوش ملیح آبادی لفظی طمطراق کے عادی، لیکن دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے ایک دوسرے کے لیے کوئی داد کا موقع ضایع نہ جانے دیتے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ جوش کے اُستاد حضرت عزیز لکھنوی شاعری کے ناتے میرے بھی دادا اُستاد ہیں۔ ان کی فیض رسانیوں کا سلسلہ بہت زیادہ پھیلا ہوا نہیں۔ آرزو لکھنوی کے حوالے سے دیکھا جائے تو صاف وصریح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے روایتی ماحول میں قطعاً ایک مختلف المزاج شاعر تھے۔ شاعروں کی ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ اپنے مزاج وطبع کے خلاف بھی انھیں ہر شاعر کی تخلیقاتِ فن کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ شاعری کلاسیکل ہو یا اپنے عہد کی، اس کے مطالعاتی سفر سے گزرے بغیر کسی بھی شاعر کے لیے اپنی تخلیقات کو سامنے لانا یا ان کے لیے کوئی صورتِ گریز پیدا کرنا ممکن ہی نہیں۔ تخلیقات کی وافر حیثیت اور مطالعاتی کثرت کے ذریعے اپنی شناخت کا اہتمام کرانا کوئی کھیل نہیں۔

یہی وہ پس منظر ہے جس کے سبب ہمیں صدیوں پر محیط قریب المعانی مضامین کا تسلسل نظر آتا ہے۔ اسی کو سرقہ یا توارد کا نام دے کر شاعر کی تنقیدی گرفت کی جاتی ہے یا اس کے ہمدردوں کی جانب سے جواز کے لیے کوئی مناسب چھوٹ دے دی جاتی ہے۔ ہر نئے خالقِ فن کی ایک فطری دشواری اس کے مطالعاتی لوازمے کی معتدبہ کثرت بھی ہے۔ کسی بھی زبان میں کسی بھی صنفِ سخن کا تخلیقی دور جتنا طویل ہو، بعد کے خلاقانِ فن کے لیے اظہار وابلاغ کی مشکلات میں اتنا ہی اضافہ بھی ہوتا چلا جائے گا۔

ان حقائق پر نگاہ رکھتے ہوئے شبیہ الحسن اپنی تعریف وتوصیف اور تحقیق وتنقید کو بڑی احتیاط کے ساتھ متوازن انداز میں آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ نوجوانی میں اسے ان کی ذاتی خوبی کے علاوہ موروثی اوصاف کا ایک فطری نتیجہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ بنیادی حیثیت میں شبیہ الحسن کا اصل تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی کارنامہ پانچ ابواب کا حسنِ ترتیب رکھتا ہے۔ پہلا باب حالاتِ زندگی اور شعری ماحول کا عکاس ہے جسے "حالاتِ زندگی"، "سیرت وکردار" اور "شعری ماحول" کے الگ الگ عنوانات سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس باب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی غیر معمولی محنت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سید آلِ رضا اپنی ذات اور شخصیت کے حوالے سے ادب وفن کی یادگارِ زمانہ شخصیات میں خاصی انفرادی نوعیت کی شہرت کے حامل رہے۔ وہ میرے

لیے تو قطعاً اجنبی نہ تھے لیکن میرے معاصر ناقدین کے لیےبھی ان کی شخصیت کسی طور اجنبیت کی حامل نہ تھی یعنی وہ اپنے دور کے نہایت جانے پہچانے معروف اور عمومی رُخ سے اپنے تمام شاعرانہ محاسن کے ساتھ متعارف تھے۔ صرف ایک فرق ان کے مزاج وطبع کی قلندرانہ روش کے سبب نمایاں تھا کہ وہ عوامل شہرت کے رسیا تھے نہ اُن کے لیے زندگی میں سیّد آلِ رضا کی طرف سے کوئی سعی وکوشش یا تگ ودو سامنے آئی۔ انتہائی معروف حیثیت رکھنے اور ایک اعلیٰ خاندان کی نمائندگی کا شاندار ماضی وحال رکھنے کے باوجود اپنے ماحول کے بہت سے ناخوشگوار اور غیر دل چسپ رویوں سے گریز وپرہیز ان کی طبیعت میں شامل ہو چکا تھا۔ چند روایتی مجلسوں اور مخصوص احباب کی محفلوں کے علاوہ کسی بھی تقریب یا مشاعرے میں شرکت کے لیے ان کی اچھی خاصی منت کرنا پڑتی۔ ان کی فنی اور شعری پسند وناپسند کا معیار اپنے معاصرین سے یک سر مختلف تھا۔ زبان وفن کی حسین روایات سے انھیں شدید جذباتی وابستگی رہی۔ موجودہ عہد کی ابہام گزیدہ جدیدیت سے وہ اچھے خاصے بے زار ہی نہیں متنفر بھی تھے۔ یہی روش دورِ جدید کے حصولِ شہرت کی خاطر مصلحت اندیش فن کاروں سے ان کے روابط میں ایک ایسی مزاجی خلیج حائل ہو چکی تھی، جس کے سبب وہ قدر وقیمت کے اعتبار سے نہایت کمتر لیکن شہرت یافتہ شعرا کی صفوں سے ہمیشہ دُور ہی دُور نظر آئے۔

شبیہ الحسن تعارف رضا میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوصف اتنے محتاط ہیں کہ ہر عنوان کو حوالوں کے حواشی سے مزین کرنا ضروری جانتے ہیں۔ اس طرح ترتیب وتہذیب کا حُسن کچھ اس طرح نکھر سنور کر نمایاں ہوا کہ آئندہ کوئی محقق شبیہ الحسن کی تحقیقی کاوش کا حوالہ دیے بغیر سیّد آلِ رضاؔ پر قلم نہیں اُٹھا سکتا۔

سیرت وکردار کے پہلو سے بھی ہمیں اُن کے پیش کردہ زیبِ حواشی حقائق واقعاتی قدر وقیمت کا احساس دلاتے ہیں۔ سیّد آلِ رضا مرحوم کی زندگی، شخصیت یا فن پر جس نے جو کچھ لکھا شبیہ الحسن کسی تکلف کے بغیر اس کا حوالہ دے کر اپنی بات کے وزن میں اضافہ پیدا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالاتِ زندگی میں چوں کہ بیشتر واقعات معلومہ حیثیت رکھتے ہیں یا مختلف اربابِ قلم کی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے میرے نقطۂ نظر سے یہ پہلو تا حال خاصہ تشنۂ اظہار ہے تا آں کہ مرحوم کے قریب ترین ساتھیوں، عزیزوں یا دوستوں میں سے کوئی ان کی سیرت وکردار کا مکمل خاکہ مرتب نہ کر دے۔ ان کا چلنا، پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، ہنسنا بولنا، گفت گو میں طویل خاموشی اختیار کرنا اور کہیں کہیں بے اختیارانہ اظہارِ خیال پر آمادہ ہونا ان کے ایسے مزاجی عناصر تھے، جو ان کی ایک چلتی پھرتی ہمہ رنگ تصویر کے نقوش واضح کر سکتے ہیں۔ کئی اوصاف خاندانی شرافت کے اعتبار سے قدرِ مشترک سہی لیکن ان میں لیے دیے رہنے کا ایک ایسا فطری عنصر غالب تھا، جس نے ان کی ہر ادا کو ایک انفرادی رنگ بخش دیا اور وہ سب سے الگ تھلگ نہایت آسانی سے اپنی شناخت کا ایک مطلق العنان حوالہ بنے رہے۔ طبیعت کی انکساری ہو یا ذہن کی طباعی، دونوں پر یکساں نوعیت سے ان کا یہی مزاجی رویّہ غالب تھا۔ یہی وہ پہلو ہے جس کی

مکمل ترجمانی کے لیے تا حال کوئی مبسوط نگارش پروفیسر شبیہ الحسن کو دستیاب نہ ہو سکی۔ اساسی طور پر چوں کہ تحقیقی مقالے کی صورت میں کتاب تحریر کی گئی تھی، شاید اسی لیے موصوف نے ان اشاروں سے گریز کیا، جن کے حتمی حوالے انھیں میسّر نہ آ سکے۔ یہ احتیاط اپنی جگہ الگ، ان کے تحقیقی مذاق کی عکاس ہے۔ شاید اسی لیے صرف ایسی ہی باتوں پر اکتفا کیا جن کی صداقت کا بار وہ بذاتِ خود معتبر حوالوں کے ذریعے اُٹھا سکیں۔

میرے نقطۂ نظر سے سیّد آلِ رضا کے تحقیقی تعارف پر مبنی کتاب کی تدوین کے لیے پہلے کسی جریدے کی ایک ایسی خصوصی ادبی اشاعت کا اہتمام ضروری ہے، جس میں انھیں دیکھنے، سمجھنے اور جاننے پہچاننے والے تمام اربابِ قلم کا ذاتی مشاہدہ اور نفسیاتی مطالعہ پیش کیا جائے اور پھر نئے سرے سے ان کی فن کارانہ عظمتوں کو نمایاں کرنے کی خاطر ایک جامع ترین تالیف مکمل کی جائے۔

شعری ماحول کے حوالے سے بھی شبیہ الحسن مختلف اہلِ قلم دانشوروں کی آراء کا سہارا لیتے یا ان پر انحصار کرتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ بلا خوفِ تردید یہ دعوا کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں لکھنؤ کے آخری باقی ماندہ شعری مزاج کے اصل ترجمان صرف سیّد آلِ رضا مرحوم ہی تھے۔ دیگر شعرا کی مزاج و طبع میں حالات اور مابعد واقعات کے سبب خاصی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ سیّد جعفر علی خاں اثرؔ جیسے شاعر لکھنؤ میں ہی رہ گئے۔ ان کی زبان (پاکستان میں) لکھنوی غزل میں شرفا کی وضع دارانہ زبان کی نمائندگی کا فرض ادا نہ کر سکی۔ ہمیں پاکستان میں صرف دو شخصیتوں جسٹس ایس۔ اے رحمان (حالاں کہ وہ لکھنوی نہ تھے) اور سیّد فضل احمد کریم فضلی مرحوم کی زبان آلِ رضا مرحوم سے اپنی غزل کے شریفانہ رویّوں کے سبب نہایت قریب نظر آتی ہے، لیکن ان دونوں کی زبان کو بھی ہم کسی طور خالصتاً باقیاتِ لکھنؤ کی لسانی تہذیب کے نہایت محتاط آئینہ بردار تھے۔ اس رُخ سے نہ موصوف نے اپنا لسانی لہجہ تبدیل ہونے دیا اور نہ اپنی سوچ کے زاویوں کو زبان کے متبدلہ مزاج کا شکار ہونے دیا۔ سیّد آلِ رضا میرے نقطۂ نظر سے پاکستان میں لکھنوی غزل کے آخری مزاج کی آخری علامت بنے رہے۔ یہ ممکن ہے کہ آج کے جدیدیت پسند شعرا کے لیے ان کی شاعری میں سامانِ جذب و کشش کم ہو، لیکن جب کبھی پاکستان میں لکھنؤ کے لسانی اثرات کا جائزہ لیا جائے گا سیّد آلِ رضا مرحوم کا حوالہ دیئے بغیر ایسی کسی تحقیق میں نہ وزن پیدا ہوگا اور نہ اس کی صداقت غیر مشتبہ قرار پائے گی۔

دوسرا باب ''آلِ رضا کی مطبوعہ تخلیقات کا جائزہ'' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ باب سیّد آلِ رضا کی محیط العمر اَدبی و شعری خدمات کا ایک خوب صورت جائزہ ہے۔ اس باب کے بغیر سیّد آلِ رضا کے فن پر تعارفی قلم اٹھانا ممکنات میں سے نہیں۔ اس باب کے مطالعہ سے ہمیں سیّد آلِ رضا کی زندگی میں تین شعری ادوار کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

۱۔ وہ تمام شاعری جوان کی ابتدائی مشق و مداومت کے ابتدائی عہد پر مبنی ہے، اسے ہم ان کی موزونی طبع کا شاخسانہ قرار دے کر مستقبل کے آلِ رضا کا ابتدائی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۲۔ سیّد آلِ رضا کی وہ غزل، جواُن کے جذباتِ محبت کی شدید الاثر ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ شرفائے لکھنؤ کی لطیف روایات کی آخری ترجمان قرار دی جاسکتی ہے، دہلی۔ یوپی کے دیگر اضلاع بہار، پٹنہ، علی گڑھ، دکن، پنجاب اور جدید کراچی کی مروجہ غزل کے علاوہ لکھنؤ کی جدید متبدلہ غزل سے مختلف ایک متبرک و مقدس یادگار دکھائی دیتی ہے۔

آگے چل کر تیسرا باب دراصل اسی کی وضاحت میں ترتیب دیا گیا ہے۔اسی باب سے پروفیسر شبیہ الحسن کی اصل تنقیدی خدمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں بہ اعتبارِ تحقیق موصوف نے اپنی کتاب کو سیّد آلِ رضا مرحوم کے متعلق تا حال ایک جامع ترین حوالہ بنا دیا، وہیں ان کی غزل پر تعارفی تنقید سے قارئین کو لکھنؤ کے ایک متواتر و مسلسل تہذیبی عمل سے آشنا بھی کیا۔ اس پر آخر میں سیّد آلِ رضا کی غیر مطبوعہ غزلیات کی شمولیت مستزاد بھی ہے، جو اپنے مزاجی اور معنوی ماحول میں شبیہ الحسن کی تعارفی تنقید کا تائیدی حوالہ نظر آتی ہیں۔

۳۔ اپنے ذہنی رجحانات میں شدت اور ضعیف العمری کے سبب سیّد آلِ رضا نے غزل گوئی کے ذریعے لکھنؤ کی روایتی پاسداری کا لحاظ واحترام کافی سمجھ کر غزل گوئی سے یک سرگریز کا پہلو اختیار کیا اور غزل گوئی سے مرثیہ گوئی کی طرف مراجعت فرماتے ہوئے، ان دونوں اصناف کا مطالعہ کرتے ہوئے نفسیاتی صورت میں جو بات سب سے زیادہ نمایاں طور پر سامنے آتی ہے، وہ سیّد آلِ رضا کی شاعری میں غزل اور مرثیہ کا لسانی اور مزاجی فرق ہے۔اس موضوع پر نہایت مبسوط مقالہ سیّد آلِ رضا کی شخصیت اور شاعری کی تخلیقی نشان دہی کی جو وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے۔شبیہ الحسن اس موضوع کی تحقیقی وتنقیدی بنیادیں استوار کر چکے ہیں۔ دونوں میں ایک حدِ فاصل بھی متعین کر دی ہے۔اب خود اس موضوع پر کسی فرصت میں تفصیل سے قلم اٹھائیں یا کسی دوسرے بالغ نظر ناقد کو یہ توفیق نصیب ہو۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اُصولی طور پر سیّد آلِ رضا نے حصولِ اجر وثواب کی خاطر دانستہ شکل میں غزل سے گریز کرتے ہوئے مرثیہ کو اواخرِ عمر تک اپنا تخلیقی موضوع بنائے رکھا چوں کہ وہ مخصوص لکھنوی لب و لہجے کے ایک جاندار شاعر تھے اور غزل میں جذبوں کی سچی اور بے لاگ ترجمانی کو فرض جانتے تھے۔اس لیے اپنی زبان کو بھی غزل کا روایتی ومعاملاتی رنگ بخش دیا تھا۔

کسی بھی صنفِ سخن میں کوئی شاعر یقیناً عظیم شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جب تک وہ غزل کا ایک تسلیم شدہ قادر الکلام شاعر نہ بن جائے۔ پھسپھسی غزل کہنے والے تمام نظم گو شعرا خواہ انھیں کتنی ہی آسمان گرفت شہرت نصیب ہو، لسانی وفنی اعتبار سے گھٹیا شاعروں کے قبیلے میں ہی شمار ہوں گے۔ اس دعوے کو ہماری شعری تاریخ کے لاتعداد حوالوں سے بہ آسانی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ سیّد آلِ رضا کی غزل گوئی زبان اور لسانی معراج کے نمایاں فرق و امتیاز کے باوجود ہمیں ایک شستہ وشائستہ اور قادر الکلام وخوش گفتار مرثیہ گو سے متعارف کراتی ہے۔ سیّد آلِ رضا کی مرثیہ گوئی پر بہت زیادہ نہ سہی لیکن اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے، کہ اُن کی فن کارانہ حیثیت اب کسی

طور ڈھکی چھپی نہیں رہی لیکن اس پر بھی مزید کام کی وافر گنجائش موجود ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے حوالے سے فی الوقت سیّد آلِ رضا کی مرثیہ گوئی ہماری بحث کا حصہ نہیں، لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ہم غزل میں آلِ رضاؔ کی شخصیت کے جن پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں، مرثیہ میں وہ آلِ رضاؔ دکھائی نہیں دیتے اور قطعاً ایک جداگانہ شخصیت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ شبیہ الحسن اس باب کی تکمیل میں بھی اپنی احتیاط پسندی کے سبب حواشی کا سہارا لیتے اور مختلف حوالوں سے اپنی تنقید کا وزن بڑھاتے ہیں۔ مرثیہ گوئی چوں کہ شبیہ الحسن کے مقالے کا اصل موضوع نہیں، اس لیے آلِ رضاؔ کی مرثیہ گوئی پر خاص طول و بسط کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن عام قارئین کو اتنا فائدہ ضرور پہنچادیا کہ مرحوم کی مرثیہ گوئی پر جس قدر چھوٹا بڑا کام ہوسکا اس کے تمام حوالے یک جا ہوگئے۔ یوں آگے چل کر موضوعاتی رُخ سے اُن پر کام کرنے والوں کے لیے مزید اشاراتی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ اس طرح شبیہ الحسن اپنے قارئین کو دوہرا فائدہ پہنچا سکے۔

غزل کی ''لکھنوی روایت آلِ رضاؔ تک'' اور ''آلِ رضاؔ کی غزل گوئی کا تنقیدی مطالعہ'' کے تحت العنوان دونوں ابواب مولف نے تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی حوالوں سے ترتیب دیتے ہوئے اپنے موقف کی صداقت ثابت کی ہے، لیکن ''فکری وفنی تجزیہ'' پیش کرتے ہوئے ماقبل ابواب کے برعکس اپنے ذاتی مطالعہ سے نتائج کے استخراج کو ترجیح دی ہے۔ ضمناً دیگر اربابِ دانش کی آراء بھی اپنے تجزیے کی تائید وحمایت میں پیش کی ہیں۔ باب چہارم اور پھر پانچویں باب کے مطالعے سے ہی بذاتِ خود پروفیسر شبیہ الحسن کی تنقیدی فکر اور تجزیاتی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تنقیدی روش میں توازن واعتدال کا احترام کرتے ہوئے علمی دیانت کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اپنے تجزیاتی نتائج کو بھی تحریر کے عدم توازن سے بچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے اسی وصف نے دراصل مجھے بھی آمادۂ نگارش کیا۔ ان کا یہ کارنامہ یوں بھی دل و ذہن پر اپنے موزوں و متناسب نقوش مرتسم کرگیا کہ ایک ایسی شخصیت کو نئے سرے سے وہ خوش گوار تعارفی زندگی بخش دی جو آلِ رضاؔ کے جیتے جی یا تو ان سے چھین لی گئی تھی یا وہ خود مزاجاً اپنی حیاتِ فن کی بقاء کے تقاضوں سے دست کش ہوگئے تھے۔ اگر اس معیارِ تعارف کو حوالہ بنا کر ہم سنجیدگی کے ساتھ پاکستان کی شعری تاریخ کے اصل خدمت گزاروں پر توجہ مرکوز کریں تو کئی ایسی جاندار شخصیتیں سامنے آجائیں گی، جو کسی لابی کی بیساکھیوں کے بغیر بہت جلد منظر سے اوجھل ہوگئیں۔ اس رُخ سے شبیہ الحسن کا یہ علمی کارنامہ بجا طور پر تحسین وداد کا مستحق ہے۔

فکری وفنی تجزیہ پیش کرتے ہوئے شبیہ الحسن کو اختصار و اعجاز کا سہارا لینا پڑا۔ یہ ان کی تحقیقی حد بندی اور اشاعتی مجبوری تھی، لیکن آئندہ سید آلِ رضاؔ پر کام کرنے والوں کو ایک ٹھوس اور مستقل بنیاد فراہم کردی گئی ہے۔ اس طرح وسیع تناظر میں سید آلِ رضاؔ کی شاعری کا جائزہ لینے والوں کے لیے خاصی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

غیر مطبوعہ غزلیات سے قبل ضمیمہ شائع کیا گیا ہے، جس میں ''آلِ رضاؔ کے سنِ ولادت کا حتمی تعین''

موجود ہے۔ اس حصے کی تدوین کے لیے شبیہ الحسن غیر معمولی محنت سے کام لیتے ہوئے ۲۹ حواشی پیش کرتے ہیں۔ اس کے سبب کسی بھی محقق کے لیے شبیہ الحسن کا حوالہ دیئے بغیر سیّد آلِ رضا کی تاریخِ پیدائش کا تعیّن دشوار ہو جائے گا، بل کہ اس تعیّنِ تاریخ سے اختلاف وانحراف ناممکن ہو جائے گا۔

آخر میں سیّد آلِ رضا کی بارہ غیر مطبوعہ غزلیات بھی شائع کر دی گئی ہیں۔ اس اضافے نے کتاب کو آخری خوشگوار ذائقے پر ختم کیا۔ اگر ایک تعارفی محاکمہ ان غزلیات کے حوالے سے بھی شامل ہو جاتا تو نئے قارئین کی مطالعاتی لذت اور بڑھ جاتی، جب کہ یہ وہ حادثاتی غزلیں ہیں، جو مرثیہ گوئی کے زمانے میں وقتاً فوقتاً موزوں ہوئیں۔ میں ذاتی وقوف کی بنیاد پر یہ عرض کروں گا کہ یہ ساری غزلیں ایک ہی ورکی نہیں ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے ان کی اشاعت کا مرحلہ طے نہ ہو سکا۔ مرحوم نے بعض احباب شعرا کی ان زمینوں میں بھی غزلیں کہیں، جو انھیں پسند آتی ہیں۔ بعض غزلیات احباب کی تالیفِ قلب کے لیے بہ امرِ مجبوری طرح مصرعوں پر بھی موزوں کیں، جب کہ بالعموم وہ اس کے عادی نہ تھے۔ غزل میں ان کے موضوعات کا پھیلاؤ بھی تشنۂ اظہار محسوس ہوتا ہے۔ غالباً اس کا یہی سبب ہے کہ ان کے جذباتِ محبت کے متعلقہ مضامین خاصی غالب حیثیت رکھتے ہیں لیکن ہم قطعاً یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی شاعری تمام تر داخلی احساسات کی ترجمانی پر مبنی ہیں اور وہ اپنی زندگی، اپنے عہد اور اپنے تمدنی ماحول کی بدلتی ہوئی قدروں سے یک سر بے نیاز رہے۔

سیّد ہاشم رضا نے ''سیّد آلِ رضا کی غزل گوئی کے محرکات وماٰخذ'' پر ایک جائزہ پیش کیا ہے، جس کے مطالعے سے مجھ گناہ گار کی سیری نہ ہو سکی۔ جی چاہتا ہے کہ نقد ونظر پر مبنی مختلف تحریروں سے ہٹ کر جناب سیّد ہاشم رضا اپنے بھائی کی حیاتِ روز وشب کے معمولات اپنے مخصوص اور معروف دل چسپ انداز میں ترتیب دیں۔

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا تحریر کردہ دیباچہ مختصر لیکن اُصولِ تنقید کا پاسدار اور پر مغز ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سیّد آلِ رضا پر گویا ایک مکمل کتاب کی نہایت جامع تلخیص پیش کر دی ہے۔ جس میں ان کی شخصیت اور فن کے مکمل عناصر ایجاز واختصار کی جامعیت کے ساتھ سمٹ آئے ہیں۔ ان کی رائے ان روایتی آراء سے قطعاً مختلف ہے، جو گھسے پٹے انداز میں صرف دفع الوقتی کے لیے ایک ہی مضمون کو دہرانے والے ناقدوں کی طرف سے مولفین یا مصنفین کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی اپنے مزاج وذوق اور تنقیدی رویّوں کے مطابق اظہارِ خیال کرتے ہوئے مصنف کی تحقیق وتنقید کو حوصلہ افزا الفاظ میں تحسین وداد سے نوازا ہے۔

المختصر شبیہ الحسن ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' کے ذریعے، جہاں آلِ رضا کا تعارف کرانے میں ایک سچے ناقد کی طرح کامیابی کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئے ہیں، وہیں نئی صبح کے سورج کی طرح بقائے دوام کے اُفق پر آلِ رضا کا طلوع بھی ثابت کر گئے ہیں۔

◆◆◆

آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی۔ایک مطالعہ

پروفیسر امجد علی شاکر

◆◆

اُردواَدب کی شاہراہ پر بہت سی روشنیاں جگمگا رہی ہیں، جن سے آنکھیں چکا چوند ہوئی جاتی ہیں۔ بہت سے پھول مہک رہے ہیں، جن کی خوشبوئیں دماغوں میں بس گئی ہیں۔ روشنیوں کے اس جھرمٹ میں، پھولوں کی ان کنجوں میں تیز روشنیوں اور تیز خوشبوؤں والے پھولوں پر فوراً توجہ مبذول ہوئی۔ ہر شخص نے ان کی طرف دیکھا اور ان روشنیوں اور ان پھولوں نے ان کا من موہ لیا۔

کچھ روشنیاں ذرا مدھم تھیں...... کچھ خوشبوئیں ذرا ہلکی تھیں۔ جس نے انھیں غور سے دیکھا، اسے ان کی اہمیت کا احساس ہوا، وہ انھیں دیکھتا رہ گیا اور اس کا دل ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ان ہلکی خوشبوؤں میں، ان مدھم روشنیوں میں کئی نام آتے ہیں۔ جن کو تیز رو راہیوں نے تو محسوس نہ کیا مگر آہستہ گام مسافروں نے ان کی عظمت کو مانا۔ ان کی اہمیت کو پہچانا اور پھر انھی کے ہو رہے۔ اس راہ کی ان روشنیوں اور پھولوں میں کہیں سیّد آلِ رضا کا نام آتا ہے، اور کہیں ادیب سہارنپوری اور سید عابد علی عابدؔ کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ ان کی روشنی اور خوشبو کو محسوس نہ کرنے میں بعض تعصبات بھی حائل ہوئے۔ یہ تعصب لکھنؤ کے بارے میں ایک منفی رویہ اپنانے کا بھی ہے۔ اب جو کوئی بھی لکھنؤ سے تعلق رکھے یا لکھنویت کو اپنا لے، وہ گردن زدنی ٹھہرا۔ جس نے لکھنؤ کا نام اُبھارا، تعصب نے اس کی ناؤ ڈبونے کی سعی کی۔ حیرت ہوتی ہے کہ تعصب خوشبو کے رستے میں بھی حائل ہو گیا۔ نفرت نے روشنی کا چہرہ بھی دھندلا دیا۔ حیرت بالائے حیرت کہ تعصب جس بنا پر ہوا اور جس وجہ سے ہوا، اُنھی وجوہات نے کسی دوسری جگہ سر اٹھایا تو واہ واہ کا شور اٹھا۔ ان تعصب زدگان کے نامہ اعمال کی سیاہی دوسری جگہ خوبی اور حسن ٹھہری۔

سیّد آلِ رضا انھی تعصب زدگان کی صف کے نمایاں شاعر ہیں۔ وہ بیسویں صدی میں لکھنوی شاعری

کے ممتاز نمائندوں میں سے ہیں۔ لکھنؤ میں جو خارجیت انیسویں صدی کے نصف اول تک پہنچ کر خاصی بدنام ہو گئی تھی، آہستہ آہستہ اس لطافت کو چھونے لگی جو اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں خاصی نیک نام تھی۔ ان کے ہاں لکھنوی تہذیب زوال آمادہ ہونے کی وجہ سے حقیقت نہیں، مسئلہ بن گئی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ موضوع شاعری بن گیا۔ لکھنوی تہذیب زوال آمادہ سہی، بہر حال زندہ تو تھی۔ آلِ رضا اس کی ہواؤں میں سانس تو لیتے تھے۔ مگر اسے چھو نہ سکتے تھے، مگر اسے محسوس تو کر سکتے تھے۔

آلِ رضا کو جب لکھنؤ چھوڑنا پڑا، نئی بستیوں میں آباد ہونا پڑا، توڑ پھوڑ اور اکھاڑ پچھاڑ کے عجیب مناظر دکھائی دیے۔ ناجائز الاٹمنٹوں کی وبا پھیلی ہو تو وضعداری اور جمی جمائی تہذیب کی روایات کسے یاد رہتی ہیں۔ پھر تو یوم یفر المرءُ من اخیہ و امہ و ابیہ کا منظر ہوتا ہے۔ اس منظر نامے میں تہذیب میں رچی بسی شخصیت کے لیے تہذیب ایک زندہ مسئلہ بن جاتی ہے۔ آلِ رضا کا مسئلہ بھی یہی تھا۔ اس کا حل یہ ہوا کہ وہ گم شدہ تہذیب ان کی تخلیقی شخصیت کا حصہ بن گئی اور ان کے ہاں ایک مستقل استعارہ بن گئی، جس کے بارے میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

> ”دلی میر صاحب کا دل بن گیا تھا اور لکھنؤ آلِ رضا کا۔ جن کے یہاں شہر سے منقطع ہونا ہی دل کی ویرانی کے مماثل ہے۔“(۱)

ایسی شخصیت کو دریافت کرنا خود ایک تہذیبی عمل ہے، جو گہرے تہذیبی شعور کی دین ہے۔ شبیہ الحسن ہاشمی نے انھی آلِ رضا کی فنی شخصیت کو دریافت کرنے کے لیے ”آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی“ لکھی ہے۔ یہ بنیادی طور پر ان کا ایم۔ اے کا مقالہ ہے مگر اس میں کہیں بھی حصولِ سند کی ضرورت کے تحت لکھے گئے مقالے والی لاتعلقی نظر نہیں آتی ہے۔ بل کہ یہ موضوع خود شبیہ الحسن کا مسئلہ ہے۔ وہ دریافت کے سفر پر نکلے ہیں اور خالی ہاتھ نہیں آئے۔

مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب احوال پر مشتمل ہے اور تحقیقی لہجے کا حامل ہے۔ دوسرا باب تصانیف کے جائزے پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں غزل کی لکھنوی روایات کا سراغ لگایا گیا ہے۔ چوتھے باب میں آلِ رضا کی غزلیات کا فکری وفنی مطالعہ ملتا ہے۔ آخری باب میں اُردو غزل کے تناظر میں آلِ رضا کا مقام ومرتبہ تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس فہرست کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مقالے میں بیک وقت مصنف نے تحقیق بھی کی ہے اور تنقید سے کام بھی لیا ہے۔ یہاں مجھے اس سے بحث نہیں کہ تحقیق کس حد تک تنقید میں معاون ہے اور تنقید کس حد تک تحقیق کی راہ نمائی یا معاونت کرتی ہے۔ بہر حال یہ دونوں چیزیں اس مقالے میں یک جا ملتی ہیں۔

شبیہ الحسن نے آلِ رضا کے احوال کو تین ذیلی حصوں میں تقسیم کیا ہے:

ا۔ حالاتِ زندگی۔

ب۔ سیرت و کردار۔

ج۔ شعری ماحول۔

حالاتِ زندگی کے سلسلے میں مصنف نے آلِ رضا پر موجود مواد کو سلیقے سے ترتیب دیا ہے اور زندگی کی کہانی کو چند صفحات میں اس طرح سمیٹا ہے کہ زندگی کا ہر اہم سنگِ میل روشن ہو گیا ہے اور زندگی کے کسی سنگِ گراں کا بار اٹھانے کا واقعہ مخفی نہیں رہا۔ انھوں نے آلِ رضا کے ذکر میں ان کے خاندان اور بھائیوں کا تذکرہ بھی سمو دیا ہے۔ اس طرح ایک پورے گھرانے کا تذکرہ مرتب ہو گیا ہے۔ اس باب میں اختصار اور جامعیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ایک فقرہ ملاحظہ ہو:

''اس خاندان نے پاکستان کو کبھی اپنی شکارگاہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ قربان گاہ سمجھا۔'' (۲)

اس ایک فقرے میں ایک خاندان کی ہی نہیں پورے ملک کی تاریخ سمٹ آئی ہے۔ بے شمار گفتنی اور ناگفتنی حقائق اس فقرے کے اندر مخفی اشاروں کے مشارٌ الیہ ہونے کی وجہ سے سامنے آ گئے ہیں۔ سیرت و کردار کے بارے میں صرف خارجی شواہد پر ہی تکیہ نہیں کیا، داخلی شہادتوں کا بھی سہارا لیا ہے اور ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ کیا آلِ رضا کی خودداری کی گواہی ان کے اس شعر سے بہتر کہیں مل سکتی ہے:

وضع خودداری نبھائی تو، مگر
اے رضا دانتوں پسینہ آ گیا

سوچیے تو ایسا شعر کہتے ہوئے بھی دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسا کہنا کسی وضع دار اور خوددار بندے کا کام یا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ اسے شہرتِ عام ہو نہ ہو بقائے دوام ضرور مل کے رہے گا۔

شبیہ الحسن نے آلِ رضا کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''آلِ رضا کی سیرت و کردار کا احاطہ کرنا ایک دشوار عمل ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ لفظوں کے ذریعے ہم کسی تہذیب کو تو پیش کر سکتے ہیں، مگر متحرک تہذیبی نمونے کو پیش کرنا کارِ سہل نہیں ہے۔ ہر عہد کی اپنی ضروریات اور مقتضیات ہوتی ہیں اور ضروری نہیں کہ آنے والا دَور اس کو روایتی سطح پر قبول کر لے۔ آلِ رضا اگرچہ ایک گزشتہ...... تہذیب و ثقافت کی کڑی تھے، مگر کیا وہ ثقافت اب بے معنی ہو گئی ہے......؟ کیا وہ تہذیب اپنی وقعت کھو چکی ہے...... ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس اعتبار سے آلِ رضا کی شخصیت اور سیرت و کردار کے معنی وہی ہیں، جو آج سے پچاس برس پہلے تھے۔'' (۳)

اس باب کے تیسرے حصے میں مصنف نے آلِ رضا کی شاعری کی سرگزشت لکھی ہے اور جس طرح

ان کی شخصیت کا مفہوم دریافت کیا ہے، وہیں ان کی شاعری کے معنی اور معنویت تک بھی رسائی حاصل کی ہے۔ آلِ رضا کی شاعری کے بارے میں شبیہ الحسن نے بہت کچھ لکھا ہے۔

ان کی تحریروں میں عقیدت مندانہ غلو کی تہہ میں جھانکا جائے تو شبیہ الحسن بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ ان کے نزدیک آلِ رضا کی شاعری دریافت اور بازیافت کا عمل ہے۔ اس میں مرصع سازی بھی ہے اور نگین تلاش کرنے کی جدوجہد بھی۔ ان اصطلاحوں میں شاعری کا روایتی انداز جھانک رہا ہے۔ روایتی شاعری صرف روایتی انسان کے ہی بس کی بات ہے۔ آلِ رضا روایتی انسان تھے، لہٰذا انھوں نے روایتی شاعری کو آگے بڑھایا۔ رومانویوں کے ہاں روایتی شاعر کے الفاظ تنقیص کے لیے کہے جاتے ہیں۔ ویسے بھی روایت کو اسی طرح پیش کیا جائے تو یہ خوبی بھی نہیں۔ معاملہ وہی سیدھا سادا ہے، جیسا کہ ایلیٹ نے کہا تھا کہ فن تو کھرا سونا ہے، ہر ادیب شاعر اس میں اپنی کھوٹ شامل کرتا ہے۔ آلِ رضا نے روایتی شاعری میں اپنی انفرادیت شامل کی ہے۔ اس طرح وہ روایتی ہونے کی بجائے خود روایت بن گئے ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں آلِ رضا کی تصانیف کا تعارف ملتا ہے۔ یہ تعارف خاصا بھرپور ہے اور نہ جاننے والوں کے لیے تو تعارف بھی ضروری ہوتا ہے۔ یہ تعارف ہمہ جہت اور بھرپور ہونے کی وجہ سے آلِ رضا کی تخلیقی شخصیت کے پھیلاؤ کی عمدہ تصویر پیش کرتا ہے۔

تیسرے باب میں غزل کی لکھنوی روایت کے آغاز اور ارتقا پر دادِ تحقیق دی ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ لکھنو کے متعلق ایک تعصب برتا جاتا ہے۔ ایک نفرت کی عینک سے اسے دیکھا اور ناپسند کیا جاتا ہے۔ متعصب سوچ یک طرفہ، رومانوی اور موضوعی ہوتی ہے۔ اس سوچ کو لکھنؤ کی بھرپور اَدبی روایت سے انکار ممکن نہ نظر آیا تو اس کی اَدبی روایت کو کسی حادثاتی اتفاق کا نتیجہ قرار دے دیا۔ جس طرح ہمارے سیاسی تاریخوں کے مصنفین اپنی پسندیدہ شخصیات کی شکست کو حادثات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اگر زدہ فقروں سے اس کی شکست کو فتح میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی متعصب سوچ اگر زدہ فقرے کے ذریعے لکھنؤ میں اَدبی ماحول کے آغاز اور ارتقا کو مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چناں چہ یہ دعوا کیا گیا:

> ''اگر یہ شعرا (دہلی کے مہاجر شعرا) لکھنؤ وارد نہ ہوتے تو شاید لکھنؤ میں اعلیٰ تر شاعری ظہور ہی میں نہ آتی۔''

غور کریں تو یہاں ''اگر'' انگریزی گرامر کی رو سے Impossible Conditional ہے، جسے ماضی کی تاریخ کے لیے (اگر یہ حقائق کا مجموعہ ہو تو) استعمال کرنا اصولاً ہی غلط ہے، مگر تعصب کی پہلی زد ہی اصولوں پر پڑتی ہے۔ چناں چہ یہ دعوا کر دیا گیا اور اس طرح بزعمِ خود لکھنو کی ادبی تاریخ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا۔ شبیہ الحسن نے اس اعتراض کو جانچا پرکھا اور اس کی لایعنیت واضح کی ہے۔ ان کے استدلال کا مرکزی نقطہ اس سوال نما دلیل

میں ہے:

''لکھنؤ میں مہاجر شعرا کی آمد سے پہلے شعر و شاعری کی کوئی فضا موجود ہی نہیں تھی تو یہ مہاجر شعرا لکھنؤ ہی کیوں آئے؟'' (۴)

اس موقع پر ان کا نقطۂ نظر توازن کھو کر تعصب کے اندھیرے میں گم نہیں ہوتا۔ وہ دہلی کے مقابلے میں لکھنؤ کو لا کر موازنہ انیسؔ و دبیرؔ نہیں لکھتے بل کہ متوازن رائے اور نتیجے تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''یہاں کی مقامی شعری روایت اور دہلوی شعری روایت کے امتزاج سے ایک تیسری شعری روایت نے جنم لیا۔'' (۵)

یہ فقرہ اس تہذیب کی عطا ہے، جو اختلافات کو اُبھارنے پر نہیں تطبیق پر یقین رکھتا ہے۔ اس تہذیب نے ایک سطح پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں یکجہتی تلاش کی اور دوسری سطح پر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں نقطہ اتفاق دریافت کیا، جو علمی سطح پر معراج السالکین، سرِ اکبر اور مجمع البحرین کی شکل میں پیش کیا گیا اور تخلیقی سطح پر اس کی صورت یہ سامنے آئی:

میرؔ کے دین و مذہب کا احوال کیا تم پوچھو ہو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یہ فکر وحدت الوجود کے نام سے متعارف ہوئی۔ اس وحدت میں جلال اور جمال کا مرتبہ اور مقام ایک جیسا تھا۔ تخلیقی سطح پر جمال نے غزل اور مثنوی کا روپ دھارا تو جلال قصیدے اور مرثیے میں جلوہ گر ہوا۔ یہ فکر انسانوں میں یک جائی تو چاہتی تھی، مگر ظلم اور ظالم میں یک جائی نہیں چاہتی تھی، بل کہ یہ تہذیب تو جہاد کی علم بردار تھی۔ اس تہذیب میں زمین و آسمان، ارضی و سماوی حوالے، تخلیق اور تنظیم، مادری اور پدری اصول یک جا ہو گئے تھے۔ لکھنوی شاعری میں یہی سب کچھ ملتا ہے۔

لکھنؤ کی اُدبی انفرادیت اور اُدبی مرکزیت کی پہچان انشاؔ، مصحفیؔ اور جرأتؔ کے عہد میں ہونے لگی۔ آتشؔ اور ناسخؔ کے دَور میں اس کی پہچان واضح ہوئی۔ ناسخؔ بڑے شاعر نہ سہی، بعض حوالوں سے اپنی انفرادیت رکھتے ہیں، اور اُدب کا اہم موڑ تو ضرور ہیں۔ ان کے شاگرد علی اوسط رشکؔ تھے اور ان کے شاگرد تھے جلالؔ لکھنوی۔ جلالؔ کے شاگرد آرزوؔ لکھنوی نے شہرت پائی۔ ناسخؔ نے زبان کے سلسلے میں کئی اجتہادات کیے اور آرزوؔ نے بھی۔ آرزوؔ کی شاعری کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ:

''انھوں نے ایسی زبان میں شاعری کرنے کی کوشش کی، جسے خالص اُردو سے تعبیر کر سکتے ہیں، اس طرح انھوں نے اُردو زبان کو فارسی اور عربی کا مقروض نہ ہونے دیا۔'' (۶)

ایک مختصر فقرے میں آرزو کے کارنامۂ خاص کا محاکمہ شبیہ الحسن کا کارنامہ ہے۔

زبان و بیان کے سلسلے میں ناسخ اور آرزو کے کارناموں کا تقابل اور جائزہ زبان و اَدب کے کئی اہم گوشے سامنے لاسکتا ہے۔ بہر حال شبیہ الحسن نے اختصار سے غزل کی اُس روایت کا سراغ لگایا جو لکھنؤ میں پروان چڑھی، جس میں دلی کی شاعرانہ روایت، لکھنو کی فارغ البالی اور مخصوص تہذیبی ماحول، حالی کی ''مقدمہ شعروشاعری'' کا مثبت یا منفی ردِعمل انیسویں صدی کی سیاسی اور معاشی کروٹیں، سب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے...... یہی روایت آل رضا کو اپنے اُستاد آرزو لکھنوی سے ورثے میں ملی۔

مقالے کے چوتھے باب میں آل رضا کی غزل گوئی کا تنقیدی مطالعہ ملتا ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں آل رضا کے شعری نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں ان کے پیشِ نظر آل رضا کا کلام اور ان کے دیباچے رہے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاعر شاعری کرنے کے علاوہ اپنے نظریۂ شعر بھی پیش کرتا ہے؟ شبیہ الحسن اس کا جواب ہاں میں دیتے ہیں اور اپنی تائید میں میر اور حسرت کے دو شعر پیش کر کے اپنے جواب کو معروضی سطح دے دیتے ہیں۔ ویسے شبیہ اگر تاریخ میں اور پیچھے چلے جاتے تو انھیں مزید مثالیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔

شاعر کا نظریۂ شعر روایت، عہد کے سوالات اور ذاتی تجربات کے حوالوں سے ترتیب پاتا ہے۔ آل رضا کے نظریۂ شعر میں حالی کے مقدمے، مقدمے کے لکھنوی ردِعمل، اَدب برائے اَدب اور اَدب برائے زندگی کی تحریکات کے سیاق وسباق میں ترتیب پایا۔ آل رضا لکھنوی تھے، جہاں اُودھ پنچ نے اپنے حملوں سے حالی کا حال بزعم خود خاصا بُرا کر ڈالا تھا اور بقول خود، میدان کو پانی پت کے میدان کی طرح پائمال کر چھوڑا تھا۔ مگر آل رضا کی مہذب شخصیت اس انتہائی ردِعمل کو کیوں کر اپنا سکتی تھی۔

دوسرا ردِعمل مسعود حسین رضوی ادیب اور آرزو لکھنوی کا تھا۔ انھوں نے حالی سے اتفاق اور اختلاف کی کئی راہیں دریافت کیں۔ دراصل شعر سے تین بنیادی مطالبات کیے جاتے ہیں :

پہلا مطالبہ جو شاعری سے کیا جاتا ہے، وہ زبان کا درست اور اعلیٰ استعمال ہے۔ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اصلاحِ سخن کی روایت پروان چڑھی۔ اس روایت کا مرکزی نقطۂ زبان کا بہتر اور درست استعمال ہے۔ محمد حسین آزاد جب ذوق کو غالب پر فضیلت بخش رہے تھے تو ان کے مدِنظر تنقید کی یہی روایت تھی۔ آرزو لکھنوی (آل رضا کے اُستاد) بھی اسی روایت کے اہم شخص تھے۔ اُستادی اور شاگردی کی روایت، اسی روایت کے حوالے سے ہی پروان چڑھی۔ آل رضا بھی لفظ کی اہمیت کو جانتے تھے اور مانتے تھے۔ شبیہ الحسن نے آل رضا کے اس حوالے کو یوں پیش کیا ہے:

''انسانی تہذیب کی بنیاد لفظ پر ہے، لفظ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں...... آل رضا بھی لفظوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لفظوں کی معنوی گہرائیوں، پس منظروں اور وسعتوں کا خیال رکھنے پر مصر ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مترادف الفاظ میں بھی تمیز کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔'' (۷)

شعر سے دوسرا مطالبہ معنی کی سطح پر کیا جاتا ہے۔ یعنی بہتر اور بڑی بات۔ یہ انفس کے حوالے سے ہو، یا آفاق کے حوالے سے، اپنے اندر وسعت اور گہرائی رکھتی ہو...... پھر ایک اور حوالے سے بھی بات کا وزن کیا جاتا ہے، یعنی یہ بات پُرانی ہے یا نئی، پھر اس نئی بات کا کیا وزن ہے۔ اگر یہ پرانی بات ہے تو پھر اس کو بعینہٖ بیان کر دیا گیا ہے یا اس کی کوئی نئی سمت دریافت کی گئی ہے۔

غرض اس سلسلے میں کئی سوال سامنے آسکتے ہیں۔ شبیہ الحسن نے اس حوالے سے بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے آل رضا کے کلام اور نثری تحریروں سے اخذ اور اقتباس کے ذریعے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آل رضا نقالی کے نہیں، تخلیق کے قائل ہیں۔ پھر ان کے ہاں مضامین کی تحدید نہیں وسعت و تنوع کی اہمیت ہے۔ پھر ہر صنف میں ایک موضوع مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ آل رضا کے نزدیک یہ موضوع محبت ہے۔ آل رضا کس قسم کی محبت کے قائل ہیں۔ شبیہ الحسن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''انھوں (آل رضا) نے تنگ نظر صالحین کی طرح جنس سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کیا ہے بل کہ جنس کے حوالے سے تشکیل پانے والی محبت کو بھی انھوں نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔'' (۸)

مولانا حالی لفظ پر معنی کو فضیلت دینے کے قائل تھے، جب کہ لکھنو میں ایسا ممکن نہ تھا۔ ویسے دہلی میں بھی ایسا ممکن نہ تھا۔ عجیب لطیفہ ہے کہ آزاد کے اُستاد ذوق لفظوں کی شاعری کرتے تھے۔ وہ محاورے اور روزمرے کا خاص خیال کرتے۔ زبان کے حوالے سے نئے سے نئے مضامین نکالتے اور عجیب و غریب قافیے نکالتے۔ ان کا کارنامہ زبان کے حوالے سے ہے۔ حالی کے اُستاد غالب کی زبان کی خوبیوں سے انکار نہیں، مگر کسی لغات میں غالب کے شعر کو کم ہی سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ غالب کا بنیادی کارنامہ فکر و فلسفہ کا ہے یا معنی کا ہے۔ حالی اپنی تنقید میں بھی معنی کی فضیلت کے قائل تھے۔ آل رضا کی عظمت کا انکار کیے بغیر لفظ کی اہمیت کے قائل تھے۔

شعر سے تیسرا مطالبہ تاثیر ہے۔ تاثیر وارداتِ قلبی کے اظہار اور کیفیتِ خاص کے بیان میں مضمر ہے۔ مولانا حالی نے اسے جوش سے تعبیر کیا ہے، جب کہ قدماء نے اس کے لیے آہ اور واہ کے الفاظ وضع کیے ہیں۔ ہمارے ناراض نوجوان اس کا لاکھ انکار کریں، مگر اس کی اہمیت ختم نہیں ہو سکتی۔ آل رضا اس کیفیتِ خاص کے قائل تھے۔ چناں چہ شبیہ الحسن آل رضا کے خیالات کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

''آلِ رضاؔ غزل گوئی کے لیے ایک کیفیتِ خاص کے قائل ہیں اور ان کے خیال میں جب تک یہ کیفیت کسی شاعر پر شعر کہلوانے کے لیے طاری نہ ہو جائے، اس وقت تک شاعر کو شعر گوئی سے احتراز کرنا چاہیے۔''(۹)

اس باب میں شبیہ الحسن نے آلِ رضاؔ کے کلام اور تحریروں سے ان کے نظریۂ شعر کو بڑی خوبی سے اخذ کیا ہے۔

اس باب کے دوسرے حصے میں آلِ رضاؔ کی غزلیات کا فکری و فنی تجزیہ ملتا ہے۔ شبیہ الحسن نے اس باب میں آلِ رضاؔ کے عشق، وضع داری، ان کے محبوب...... لکھنوی وضع داری، خودنگری بل کہ نرگسیت کی خصوصیات کو ان کے کلام سے مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ اسے توضیحی تنقید کی ایک مثال کہا جا سکتا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے دو باتیں ایسی کہی ہیں، جو قابلِ ذکر ہیں:

پہلی بات تو آلِ رضاؔ کی غزل میں مرثیے کے اجزا کی آمیزش اور دوسری آلِ رضاؔ کے ہاں آرزوؔ لکھنوی والی ''خالص اُردو'' کا استعمال ہے۔ غزل میں مرثیے کے عناصر کی آمیزش نے غزل پر امیجری، موضوعات اور فکر کے نئے دَر وا کیے ہیں۔ آلِ رضاؔ نے کربلا کو ایک شعری استعارے کے طور پر غزل میں استعمال کیا ہے۔ افتخار عارفؔ نے اس استعارے کے کئی نئے امکانات واضح کیے ہیں...... کربلا کا استعارہ اُردو شاعری میں ترقی پسند تحریک نے خاصا عام کیا۔ ویسے میرؔ و غالبؔ کے بعض اشعار کے کچھ العاد سانحہ کربلا سے رشتہ استوار کرتے نظر آتے ہیں۔ آلِ رضاؔ نے غزل کی فضا میں بھی کربلا کا استعارہ استعمال کیا ہے اور غزل کی فضا میں مرثیے کی فضا بھی داخل کی ہے۔ اس حوالے سے شبیہ الحسن لکھتے ہیں:

''آلِ رضاؔ کی غزلوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں جا بجا ایسے اشعار بکھرے پڑے ہیں...... ان میں فکری عناصر کسی نہ کسی انداز میں مرثیے کے موضوعات سے مماثل دکھائی دیتے ہیں۔''(۱۰)

دوسری بات خالص اُردو کا استعمال، اس سلسلے میں آلِ رضاؔ نے آرزوؔ کے کام کو آگے بڑھایا۔ آرزوؔ کے اُستاد الاساتذہ ناسخؔ نے اُردو کو اشرافیائی مزاج بخشا تھا اور ہندی کو شاعری سے بارہ پتھر باہر کرنے یا نوکر چاکر کا رتبہ دینے کی کاوش کی تھی۔ اس لیے گیان چند جین نے دعوا کیا ہے:

''اُردو جملے میں اصل مفہوم کے حامل الفاظ عربی فارسی کے ہوتے ہیں۔ ہندی الاصل الفاظ محض امدادی حیثیت رکھتے ہیں۔ عربی فارسی پالکی نشین امیر ہیں، ہندی الفاظ پالکی بردار کہار۔''(۱۱)

آرزوؔ لکھنوی کے دور میں ترکی النسل امیر پالکی سے اُتر آئے تھے اور ہندی الاصل کہار کے ساتھ ایک ہی سواری میں سفر کرنے لگے تھے۔ اس لیے ہندی عروض، الفاظ اور مقامی علامتیں اور تمثالیں استعمال کرنا دور کا

عمرانی تقاضا بھی تھا اور فریضہ بھی۔ اس لیے تو آل رضا نے کہا :

چاہے جدھر کو آزادی سے کوئل جائے پپیہا آئے
کالی گھٹا آ کے قفس پر، آپ بھی روئے ہمیں بھی رلائے

شبیہ الحسن نے آل رضا کے اس پہلو کو یوں واضح کیا ہے:

''آل رضا نے اس روایت (آرزو لکھنوی کی روایت) کو آگے بڑھانے میں نمایاں کاوشیں کیں۔ انھوں نے فارسی عطف و اضافت کے بغیر غزلیں کہیں اور اُردو میں خالص اُردو کی تحریک کو فروغ دینے میں نمایاں کردار اُدا کیا۔''

آل رضا کے محولہ بالا شعر میں آزادی اور حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ جاگیرداری عہد کے روایتی اور پُر سکون معاشرے میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایسا شعر کہنا توڑ پھوڑ اور حرکت و عمل سے معمور معاشرے میں کہنا ہی ممکن تھا۔ یہ حرکت اور عمل جسے شبیہ الحسن نے ڈرامائی طرز نگارش کہا ہے، آل رضا کے ہاں عام ہے۔ اسی لیے تو شبیہ الحسن نے دعویٰ کیا ہے کہ:

''انھوں نے لفظی ڈراما نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔'' (۱۲)

الغرض شبیہ الحسن نے آل رضا کی غزل گوئی کے نمایاں عناصر کی خوبی سے نشان دہی کر دی ہے۔

آخری باب میں شبیہ الحسن نے غزل کی روایت میں آل رضا کا مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ شبیہ الحسن نے آل رضا کو جلال لکھنوی اور آرزو لکھنوی کی روایت کی آخری کڑی قرار دیا ہے اور سریلی بانسری سے غزل معلیٰ کا رشتہ استوار کیا ہے۔ آخر میں شبیہ الحسن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''آل رضا کی غزل مصلحین و محسنین کی شاعری اور ہمارے عہد کی جدید غزل کے مابین ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی اس کی اہمیت ہے اور یہی اس کا تاریخ ادبیات اُردو میں بطور سنگ میل ایک افادی پہلو ہے۔'' (۱۳)

یہ مقالے اسی اجمال کی تفسیر تھے، جسے شبیہ الحسن نے بڑی محنت اور دانش سے مرتب کرنے اور پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی شبیہ الحسن کا کارنامہ بھی ہے۔ اس مقالے میں بعض مقامات کھٹکتے ہیں۔ بعض جگہ زبان و بیان کی کمزوری نظر میں کھٹکتی ہے اور بعض جگہ کلیشے کا استعمال جھنجھلا بھی دیتا ہے، مگر میں زیادہ تر اسی کے مثبت پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، کیوں کہ تکمیل کا دعویٰ یا خامی سے مبرا ہونا تو ناممکن سی بات ہے، جس کا کسی محقق سے مطالبہ کرنا نامناسب سا لگتا ہے۔

بہر حال، کتاب شبیہ الحسن کا تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ہے، جو اس کے مستقبل کی طرف سفر کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۱۹۹۱ء)

حواشی

(۱) دیباچہ، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۱۷۔

(۲) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۳۷۔

(۳) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۴۷۔

(۴) ایضاً، ص:۶۲۔

(۵) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۸۵۔

(۶) ایضاً، ص:۸۵۔

(۷) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۱۰۰۔

(۸) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۱۱۷۔

(۹) ایضاً، ص:۱۱۵۔

(۱۰) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۱۱۶۔

(۱۱) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۱۳۹۔

(۱۲) گیان چند جین، کھوج، ص:۳۶۵۔

(۱۳) آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، ص:۱۳۵،۱۳۶۔

(۱۴) ایضاً، ص:۱۶۰،۱۶۱۔

◆◆◆

روشنی کا سفر۔ آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی

ڈاکٹر عارف ثاقب

◆◆

میرے سامنے پروفیسر شبیہ الحسن کی تازہ تصنیف ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' ہے، جسے ''سفینہ پبلی کیشنز لاہور'' نے شائع کیا ہے۔ مجھے اس کتاب پر تبصرہ کرنا ہے۔ سوچتا ہوں بات کہاں سے شروع کروں؟ مصنف کے حسنِ ترتیب سے یا حسنِ بیان سے۔ آلِ رضاؔ سے مصنف کی محبت سے یا ان پر کیے ہوئے کام کی محنت سے۔ میری اس مشکل کو میرے استادِ محترم ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی اس بات نے حل کردیا ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ:

''محبت اور محنت میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے، ہم اسی کو اُوپر نیچے کرتے رہتے ہیں۔''

پروفیسر شبیہ الحسن نے اپنی اس مذکورہ کتاب میں اسی نقطے کو اُوپر نیچے کیا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کیسے؟ اس کتاب کا پہلا باب ''حالاتِ زندگی اور شعری ماحول'' سے متعلق ہے۔ اس باب کو تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ یعنی: حالاتِ زندگی۔ سیرت و کردار اور شعری ماحول۔

ہر حصہ اپنے منظر میں آلِ رضاؔ کی سخن گوئی سے متعلق ایک پس منظر بناتا ہے۔ ابتدائی عمر کی وضع داری اور تہذیب جو لکھنوی معاشرے کا خاصا تھا، ان کے شعری تار و پود میں بکھری ہوئی ہے۔ گفت گو میں تاثراتی جملے، جن کے پیچھے مفاہیم کی ایک دنیا نظر آئے، ان کے اشعار کو بھی ایک جہانِ معنی سے ہم کنار کرتی ہے۔ سیرت و کردار ایسا کہ گم شدہ تہذیب کے آئینے میں خود تہذیب نظر آتے ہیں۔ کردار اور سیرت کی یہ وضع داری اور رکھ رکھاؤ جو والدین سے ہوتا ہوا لکھنوی معاشرے کے ذریعے آلِ رضاؔ تک پہنچا، ان کی شعری حیثیت کو متعین کرتا ہے۔ اسی لیے جب کتاب کا مصنف یہ کہتا ہے کہ:

''سید آلِ رضاؔ مشرقی تہذیب و ثقافت کا چلتا پھرتا نمونہ ہے...... آلِ رضا ایک مرتب و مسلسل

تہذیب کی کڑی تھے۔"

تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آلِ رضا ایک تہذیب تھے، کہ انسان تہذیب کے آئینے میں اپنی حیثیت متعین کرتا ہے۔ تہذیب ہی اس کے خدوخال واضح کرتی ہے اور نکھارتی ہے۔ تہذیب وثقافت کے یہ خدوخال انسان کی ذات سے بھی پنہاں ہوتے ہیں اور ذات کے اظہار یعنی اشعار میں بھی۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آلِ رضا کی سیرت وکردار کی جو تصویریں مصنف نے پہلے باب کے دوسرے حصے میں دکھائی ہیں، اس کا تخلیقی اظہار آلِ رضا کی شاعری میں موجود ہے۔ اس اظہار کی تفہیم بھی اس کتاب کی ایک خصوصیت ہے، مگر اس پر گفت گو کے لیے آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ آیئے میرے ساتھ ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ مَیں ابھی اس کتاب کے صفحہ نمبر ۴۲ پر ہوں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ:

"......ان کی نشست وبرخاست نستعلیق اور رہن سہن شریفانہ تھا۔ لب ولہجہ میں نرمی اور شائستگی بدرجہ اتم موجود تھی۔"

آلِ رضا کی سیرت وکردار میں یہی خصوصیات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ مَیں نے پہلے عرض کیا ہے کہ شاعری ذات کا اظہار ہے۔ انسان کے افعال واعمال اس کی زندگی کے مختلف رویے اس کے اظہار کو ایک سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرتے جائیں، آلِ رضا کی شاعری تک پہنچتے پہنچتے آپ کے ذہن میں ایک تاثر نقش ہو جائے گا۔ ان کی اوائل عمری کا، ان کی تہذیبی وضع داری کا، پھر یہی نقوش ابھر کر ایک واضح تصویر کی صورت اختیار کر جائیں گے۔ کیوں کہ شاعری لفظوں کے اندر ایک واضح تصویر رکھتی ہے۔ آلِ رضا کے ہاں الفاظ کی نشست وبرخاست میں بھی ایک وضع داری ہے۔ لب ولہجے میں نرمی اور شائستگی ہے۔ اب آپ میرے اس حوالے کو دوبارہ پڑھنے کی زحمت کیجیے، جو میں نے مصنف کے حوالے سے آلِ رضا کی سیرت وکردار کے بارے میں لکھا۔ آپ نے دیکھا! شاعری کے سانچے کس طرح شاعری کی ذات کے ساتھ مل کر ترتیب پاتے ہیں!

مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"آلِ رضا ایک گم شدہ تہذیب کے نمائندے ہیں۔"

میں نے تو پہلے عرض کیا کہ آلِ رضا خود ایک تہذیب تھے۔ اگر آپ اس گم شدہ تہذیب کے خدوخال دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر آلِ رضا کی شاعری کا مطالعہ کیجیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ تہذیبیں کبھی گم نہیں ہوتیں۔ وہ زندہ رہتی ہیں، آلِ رضا جیسے شاعروں کے ہاں۔ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ خود آلِ رضا سے سنیے:

وضع خود داری نباہی تو، مگر
اے رضا دانتوں پسینہ آ گیا

کسی بھی شاعر کی زندگی کا شعری ماحول اس کے تخلیقی اظہار کو جلا بخشتا ہے۔ اس کی سوچ کا ایک رُخ متعین کرتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے مصنف نے ''شعری ماحول'' کے حصے کو انتہائی محنت سے لکھا ہے اور اسے بڑی ترتیب کے ساتھ ایک سانچے میں ڈھالا ہے۔ مجھے تو یوں لگا، جیسے اس حصے کی اہمیت کا احساس مصنف کو پوری طرح تھا اور کیوں نہ ہوتا، وہ خود بھی شاعر ہے اور جانتا ہے کہ معاشرے کے مروّج رویے اور ماحول شاعر پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے ذرا پہلے مصنف کے لکھے ہوئے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

> ''نجم صاحب ایک خوش گو اور پُر گو شاعر ہونے کے علاوہ اچھے اَدیب تھے...... سید صاحب کے اشعار کی تعریف و توصیف کے علاوہ اس کے اَدبی پہلو اور لطافتِ شعری کا نجم احسن بار بار مختلف انداز سے اعادہ کرتے رہے۔ یہی حوصلہ افزائی سید صاحب کی شعر گوئی کے لیے محرک ثابت ہوئی۔''
>
> ''پرتاب گڑھ'' میں آلِ رضا کے ملنے جلنے والوں میں بیشتر اصحاب شاعر تھے۔ چناں چہ ان کی صحبت کے زیرِ اثر اور شاعرانہ خصائص کی موجودگی کے سبب وہ بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔''
>
> ''آلِ رضا کو لکھنؤ میں جو شعری ماحول میسر ہوا، وہ ان کی شاعری اس ماحول میں نکھرتی چلی گئی۔ انھوں نے اس دور کے تمام اساتذہ سے کسبِ فیض کیا اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی شاعرانہ کاوشوں کے چراغ روشن کیے۔''

آپ نے ان اقتباسات کی روشنی میں دیکھا کہ:

''شعری ماحول'' کیسے شاعری کے رویے متعین کرتا ہے؟ باقی باتیں مَیں آپ کے مطالعے کے لیے چھوڑتا ہوں۔

میں نے ''شعری ماحول'' کے اس حصے سے آلِ رضا کی غزل گوئی کا ایک نقش اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے۔ مصنف اس نقش کی واضح تصویر سے پہلے تھوڑا سا انتظار کروانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس کتاب کا دوسرا باب ''آلِ رضا کی مطبوعہ تخلیقات کا جائزہ'' ہے۔ بس یہی وہ انتظار ہے، یہی وہ تجسس ہے، جو آلِ رضا سے متعلق اس کتاب کو پڑھنے پر اُکسا رہا ہے۔ لیکن ٹھہریے! اگر آپ مزاج کے بطن نے کسی شدید صورتِ حال کو چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو ان اشعار کو پڑھیے۔ جو کتاب کے مصنف نے صفحہ نمبر ۵۶ پر دیئے ہیں۔ لیجیے اب میں کتاب کے دوسرے باب تک پہنچ گیا ہوں۔

مصنف نے اپنی کتاب کے اس حصے میں سید آلِ رَضا کی تصنیفات اور تالیفات کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ آلِ رضا کی تصنیفات کے بارے میں مصنف کی یہ رائے ملاحظہ فرمائیں:

''سیدآل رضا نے ''کم مگر عمدہ'' کے اصول کو اپناتے ہوئے بہت کم لکھا۔ مگر جو لکھا، خوب لکھا۔''

آپ اس بات کو سمجھ گئے ناں، یعنی یہ کہ آل رضا مقدار کے نہیں معیار کے قائل تھے۔ اسی بات کو آپ ان کی حالات زندگی میں تلاش کیجیے یعنی یہ کہ وہ کم بولتے تھے، مگر جتنا بولتے تھے، اس میں معنی کی ایک دنیا پنہاں ہوتی تھی۔ پھر میری وہ بات درست ہوئی ناں کہ شاعری انسان کی ذات کا اظہار ہوتی ہے۔

اب مصنف آل رضا کی شعری کارگزاریوں کا ایک جائزہ پیش کر رہا ہے، مگر ایک ترتیب کے ساتھ، ایک تنظیم کے ساتھ۔ غزلیات کے مجموعے، مراثی کے مجموعے اور ان کی مختصراً تفصیل، نثری سرمایہ جو معدودے چند مثالوں تک محدود ہے۔ اس لیے بھی کہ آل رضا بنیادی طور پر شاعر تھے۔ زیرِ نظر کتاب کا یہ باب آپ کو آل رضا کی تصنیفات سے متعلق ایک تعارفی مرحلے سے گزارتا ہے۔

میرے ذہن میں آل رضا کی شاعری سے متعلق جو نقش بن رہے ہیں، اس باب نے ان میں رنگ بھر دیے ہیں۔ تصویر آہستہ آہستہ اُبھر رہی ہے۔ آپ نے کبھی دیکھا تو ہوگا کہ مصور اپنے شاہ کار کی تکمیل کرتے ہوئے ایک رنگ اسے دیتا ہے۔ پھر ذرا ٹھہرتا ہے۔ دیئے ہوئے رنگ کو صرف ایک نظر دیکھتا ہے۔ اور پھر دیکھنے والے اسے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ابھی کتاب کے مصنف نے آل رضا کے نقش کو دوسرا رنگ دیا ہے اور میری چشمِ تصور اس تصویر کو ابھرتا ہوا دیکھ رہی ہے، جسے ''آل رضا کا فنِ غزل گوئی'' کہتے ہیں۔

آیئے اب تیسرے باب کا مطالعہ کرتے ہیں......

''غزل کی لکھنوی روایت آل رضا تک'' یہ اس باب کا عنوان ہے۔ آپ نے ''شعری ماحول'' کے حصے میں مصنف کے یہ الفاظ تو پڑھے تھے ناں کہ:

''آل رضا کو لکھنؤ میں جو ماحول میسر آیا وہ ان کی شاعری کے لیے بہت معاون ثابت ہوا۔ ان کی شاعری اسی ماحول میں نکھرتی چلی گئی۔''

یہ ماحول کیسا تھا؟ یہ روایت کیا تھی؟ اور اس روایت نے آل رضا کی غزل کو کیا ڈھنگ دیے؟ ان تمام سوالوں کے جوابات آپ کو کتاب کے اس حصے میں ملیں گے۔ یہاں مصنف نے اُردو غزل کی تاریخ کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اُردو غزل، جس کا باقاعدہ آغاز دکن سے ہوتا ہے، وَلی کی معرفت خود کو مستحکم کرتی نظر آتی ہے۔ پھر میر، سودا، درد جیسے بلند پایہ شعرا نے اس صنف کو عظمت سے ہم کنار کیا۔ ان شعرا نے وَلی کی شاعری کو مشعلِ راہ بناتے ہوئے اور اپنے انفرادی لب و لہجے کو شامل کرتے ہوئے غزل کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ پھر اٹھارھویں صدی کے انتشار اور زبوں حالی نے شعرا کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ یہیں سے لکھنوی دبستان کے خدوخال ابھر کر نمایاں ہوئے اور لکھنوی دبستانِ شعری کی حیثیت و اہمیت دو آتشہ ہوئی۔ اب لکھنوی شاعری کے مختلف رنگ مذکورہ کتاب میں دیکھتے جائیں۔ مصنف نے ان شعرا کے کلام میں جتنے بھی رنگ ہو سکتے ہیں، نمایاں

کر دیے ہیں۔ جرأت، مصحفی، انشا کے کلام کی مثالیں لکھنوی رنگِ سخن کو اُبھار رہی ہیں۔ یہاں پہنچتے پہنچتے آپ محسوس کریں گے کہ مصنف پر غزل کی پوری تاریخ سمیٹنے کی ذمہ داری ہے اور وہ خوش اُسلوبی کے ساتھ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو رہا ہے۔ اب مصنف نے آپ کو ناسخ و آتش تک پہنچا دیا ہے اور لکھنو کی شعری روایت کے تمام عقدے وَا ہو رہے ہیں اور دماغ کی شاعری دل کے درد کے ساتھ مل رہی ہے۔ داخلیت اور خارجیت نے خود کو ایک نقطے پر پہنچا دیا ہے۔

اب مصنف کی نگاہ ۱۸۵۷ء کے بعد بدلتے ہوئے شعری رویوں کو دیکھ رہی ہے۔ کس طرح حالی نے غزل سے اصلاحی تقاضے کیے۔ لکھنؤ میں اس کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اب اس ردِ عمل کا عکس شاعری میں ملے جلے رویوں کے ساتھ نظر آتا ہے، بالخصوص ضامن علی جلال کے ہاں۔ لکھنوی شاعری کی یہ روایت کبھی خود کو بدلتی ہوئی اور کبھی نئے رنگ و آہنگ میں ڈھلتی ہوئی مختلف شعرا کے ساتھ ساتھ آل رضا تک پہنچتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۱ پر مصنف نے اس تمام روایت کو آل رضا کے ساتھ ملا دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ:

"ان کی شاعری میں جدید اور قدیم دونوں انداز متوازی صورت میں چلتے ہیں۔"

سیّد آلِ رضا کے حالاتِ زندگی، سیرت و کردار، شعری ماحول، ان کی تخلیقات کا مختصر جائزہ اور پھر لکھنوی شعری روایت آلِ رضا تک۔ یہ تمام چھوٹے چھوٹے پڑاؤ تھے اصل منزل تک پہنچنے کے لیے۔ مصنف چاہتا ہے کہ ہم منزل میں چھپے ہوئے تمام راستوں کا تعین کر لیں۔ بھئی ایک ہی جست میں فاصلہ طے کرنے والے درمیانی راستے کے سفر کی لذت سے تو آشنا نہیں ہوئے ناں!' کیا میں اسے مصنف کی خوبی نہ کہوں کہ اس نے ہمیں ہر قدم کی اہمیت سے سے آگاہ کیا؟

اب وہ ہمیں منزل کے قریب لے آیا ہے۔ میرے سامنے اس کتاب کا چوتھا اور اہم باب ہے۔ "آلِ رضا کی غزل گوئی کا تنقیدی مطالعہ۔" یہی وہ باب ہے، جو اس کتاب میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے مگر اس کی یہ حیثیت اجزا سے ترتیب پاتی ہے۔ وہ اجزا جن کا مطالعہ ہم نے کتاب کے پیشتر صفحات میں کیا۔ اب وہ اجزا ایک کلیت میں ڈھلنے لگے ہیں، آیئے دیکھتے ہیں کیسے؟

مَیں آپ کو ایک زحمت دے رہا ہوں۔ کتاب کے دیباچے کی طرف آیئے، جسے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آلِ رضا کی غزل ان کے سچے تجربات کی عکاس ہے۔"

کیا یہ بات حرفِ آخر نہیں؟ سچے جذبات تو ذات کی صداقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ذات جب اپنی تمام تر صداقتوں کا اظہار کرے تو تب ہی سچے تجربات جنم لیتے ہیں اور آلِ رضا کے اندر چھپی ہوئی تمام تر صداقت اپنے تمام تر امکانات کے ساتھ ان کے شعری تجربے میں منعکس ہے۔ اسی بات کی تفصیل آپ کو

زیرِ نظر کتاب کے باب چہارم میں نظر آئے گی۔

سب سے پہلے مصنف نے سیّد آلِ رضا کے ''شعری نظریات'' متعین کیے ہیں، جن کے بنیادی مآخذ ان کی نثری و شعری تخلیقات ہیں۔ یہ نظریات کیا تھے؟ مختصراً مصنف کے الفاظ میں دیکھ لیں!

۱۔ ''وہ شاعری کی بنیاد شاعر کے ذاتی تجربے پر رکھتے ہیں۔''

۲۔ ''ان کے ہاں اَدب اور زندگی گلے ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آلِ رضا نے ادب اور زندگی کو ایک ہی تناظر میں دیکھا ہے۔''

یہ تو وہ نظریات ہیں جنھیں مصنف نے بڑی محنت سے آلِ رضا کے کلام سے دریافت کیا ہے۔ اب سیّد آلِ رضا کی رائے سن لیں، شاعری کے بارے میں:۔

''شاعری فنِ لطیف ہے اور غزل گوئی فنِ لطیف تر......!۔''

اب آپ اس باب کے دوسرے حصے یعنی ''فکری و فنی تجزیہ'' تک پہنچ گئے ہیں۔ مصنف یہاں تنقیدی بصیرت سے ان کے کلام کو پرکھ رہا ہے۔ ان کے شعری رویوں اور اسالیب کو ایک کلیے میں ڈھال رہا ہے۔ سید آلِ رضا کے اشعار میں حسن کی جلوہ آرائیاں دیکھیے:

اک آن صبح کے ساتھ، ایک آن شام کے ساتھ
بتا بھی حسن تو کس حسنِ انتظام کے ساتھ

اب حسن کی کرشمہ سازیاں دیکھیے، عالمِ جنوں دیکھیے اور پھر آلِ رضا کے ساتھ اپنے دل کو تلاش کیجیے:

دیوانہ ہوں، کھویا ہوا دل ڈھونڈ رہا ہوں
ہر حسن کے جھرمٹ پہ ہے دھوکہ کہ یہیں ہے

میں اس کتاب سے اور بھی متعدد مثالیں دے سکتا ہوں، مگر آپ کے ذوق وشوق کے شعلوں کو ہوا دیتے ہوئے، آپ کو روشنی کے اس سفر میں ساتھ رکھتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیتا ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں، ابھی آپ کو پھر ساتھ لے کر چلوں گا۔ مَیں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے تھوڑی دیر اس کتاب کے جزیرے میں بھٹکیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کی آنکھ ان پھولوں کو کھلا ہوا دیکھے، جو میری بصارت سے اوجھل رہے، لیکن وہ مصنف کی بصیرت سے اوجھل نہیں ہیں۔ گویا میں نے آپ کو مصنف کے ہم رکاب کر دیا ہے۔ مَیں تو خود اپنے ذوق کو تسکین دینا چاہتا ہوں...... ہوں نہ خود غرض؟۔

آیئے، مَیں پھر آپ کے ساتھ ہوں! اس سفر کے بابِ پنجم کی منزل پر۔ ''اُردو شعری روایت میں آلِ رضا کا مقام۔'' یہ ہے اس باب کا عنوان۔ آپ نے سیّد آلِ رضا کی غزلوں میں موجود نظریات و تصورات کا مطالعہ کیا۔ اب مصنف شعری روایت کے پس منظر میں سیّد آلِ رضا کا مقام متعین کر رہا ہے۔ ایک مقام آپ نے

اپنے ذہن میں مرتب کیا ہوگا، مگر انتہائی خوب صورتی کے ساتھ، مختلف بحثوں اور حوالوں کے ساتھ ایک مقام مصنف نے متعین کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کتاب کا مصنف ہر لمحہ آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کے ہر سوال کا جواب اس کے پاس ہے۔ آپ نے غزلیات کے فکری وفنی تجزیئے کو پڑھنے کے بعد سوچا ہوگا کہ آخر ہم اس تمام بحث کے بعد آلِ رضا کو کیا مقام دیں؟ آیئے دیکھتے ہیں مصنف کیا کہتا ہے:

''آلِ رضا صنفِ غزل میں کسی خاص انقلابی طرز کے موجد نہیں ہیں، لیکن اپنے نادر اُسلوبِ بیان کی وجہ سے اپنی علاحدہ پہچان ضرور رکھتے ہیں۔ وہ غزل کے سانچے کو غزل کی حدود میں رکھ کر نہایت نازک اور لطیف دلی جذبات کی مصوری کرنے کے موجد ہیں۔''

مصنف کا ایک اور اقتباس پڑھ لیں، پوری بات واضح ہو جائے گی:

''آلِ رضا کی غزل گوئی روایت کے شعور سے آگاہ ہے۔ غزل کے کلاسیکی لہجے کی وہ نفیس روایت اور زبان و بیان کا وہ بلیغ احساس، جو آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' بن گیا تھا۔ آلِ رضا کی ''غزلِ معلیٰ'' کے اس شعری سانچے میں ڈھل کر ایک غنائی اشارہ بن گیا۔''

آپ نے آلِ رضا کی غزل گوئی کا جو مقام متعین کیا، اس کا بھید تو خدا جانے! لیکن صاحبِ کتاب نے اس حصے تک پہنچتے پہنچتے پچھلی تمام بحث کے اجزا کو ایک وحدت میں پرو دیا ہے۔ اب تصویر کے وہ نقوش جو پہلے باب سے ابھرنے شروع ہوئے تھے، مکمل ہو گئے ہیں۔ مَیں ایک شاعر کی اتنی زیادہ خوبیوں سے نا آشنا تھا۔ اب میرے سامنے ایک ایسے شاعر کی مکمل تصویر ہے، جو بظاہر گم شدہ اوراق میں تھا۔ کتاب ماضی میں تھا۔ زیرِ نظر کتاب کا صفحہ نمبر ۳ کھولیے! یہی تصویر آپ کو نظر آئے گی، جس کے نیچے یہ شعر درج ہے:

زندگی چھوڑ گئی عالمِ مجبوری میں
اپنی بگڑی ہوئی تصویر بنا بیٹھا ہوں

چوں کہ ضمیمے کتاب کے آخر پر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ضمیموں کی بات بھی آخر پر!

زیرِ نظر کتاب کے پہلے ضمیمے میں ''آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین'' کیا گیا ہے۔ یہ بات ہے تحقیق کی اور تحقیق نام ہے نہ معلوم حقائق کی دریافت اور معلوم حقائق کی توسیع کا۔ مصنف نے نہایت محنت سے آلِ رضا کے سنِ ولادت سے متعلق موجود حقائق کو زیرِ بحث لا کر انھیں رَدّ کیا ہے۔ اور اپنی تحقیق سے اس کا تعین کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے پہلے مختلف لوگوں کا اس سلسلے میں نقطۂ نظر مختلف تھا۔ مصنف نے بنیادی اور ثانوی مآخذ کو بروئے کار لا کر اس سنِ پیدائش کو، جو مختلف مرتبین کے نزدیک ۱۸۹۵ء ہے، رَدّ کیا ہے اور داخلی وخارجی شواہد کی بناء پر آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۶ء بتایا ہے اور مستند حوالوں سے اپنے اس بیان پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

مذکورہ کتاب کا آخری ضمیمہ آلِ رضا کی غیر مطبوعہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ وہ غزلیں جواب تک اہلِ ذوق کی نظروں سے اوجھل رہیں، اس حصے کی زینت ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے لیے آپ تنقیدی اور تحقیقی بحثوں سے گزرے اور بالآخر مصنف نے ہمیں منزل تک پہنچا دیا۔ اب آپ منزل تک پہنچ گئے ہیں، تو آیئے آپ کو اس حصے سے چند اشعار سنائیں، کیوں کہ اَدب کے گھر میں اس سے بڑی میزبانی اور کوئی نہیں !!

سکوں آئے گا ساتھ ان کے مگر اتنا تو دل ٹھہرے
کہیں ہم بیٹھ جائیں اور ان کا راستہ دیکھیں

....

اے شعورِ زندگی، آخر تجھے یہ کیا ہوا
اجنبی کیوں بن رہا ہے جانا پہچانا ہوا

....

پسینہ خشک ہوگا سایہ دیوار میں ان کی
یہی اپنے سفر کی آخری منزل سمجھتے ہیں

....

تڑپتا ہوں مگر اک ربط ہے سوزِ محبت سے
دہکتی آگ پر کیفیتیں پہلو بدلتی ہیں!

....

کبھی کسی کی غزل میں تھی آپ ہی کی پھبن
کوئی رضا تھا، کبھی آپ سے سنا ہو گا

....

آپ نے میرے ساتھ ساتھ روشنی کا سفر طے کیا، اَدب کی یہ مخفی پگ ڈنڈیاں جو اہلِ اَدب پر ناخن کا قرض ہوتی ہیں، روشنی کے سفر سے عبارت ہیں، مگر اس کے لیے عزمِ سفر ضروری ہے، شبیہ الحسن جیسا عزم۔

یہ جگنو کیا ہیں؟ یہ تتلیاں کیا ہیں؟ یہ کرن کیا ہے؟ یہ ستارے کیا ہیں؟ لفظ ہی تو ہیں! لفظ کیا ہیں؟ روشنی ہیں، ستارے ہیں، کرن ہیں اور کیا کچھ نہیں ہیں۔ اگر ان ہی الفاظ نے اَدب کی ایک مخفی پگ ڈنڈی کو تلاش کر لیا ہے، روشنی کے اس سفر نے اگر ایک شاعر کے نقش کو دھنک رنگوں سے سجا دیا ہے، تو پھر کتاب کا مصنف پروفیسر شبیہ الحسن مبارک باد کا مستحق ہوا ناں؟ روشنی کا مسافر ہوا ناں؟؟

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور نومبر ۱۹۹۰ء)

◆◆◆

آیاتِ آمنہؑ ـــــ ایک مطالعہ

مظہر نیازی

◆◆

جہانِ ادب کی پہنائیوں کا احاطہ کرنا مشکل بھی ہے اور دل چسپ بھی...... مشکل اس طرح کہ ادب سے مَس رکھنے والے سے لے کر تمام نامور اور سربرآوردہ لوگ ایک ہی قبیلہ کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک جس نے بھی تخلیقِ شعر کا شرف پایا ہو اور اس کے شعر کے موضوع کی نوعیّت خواہ کچھ بھی ہو، وہ ایک تخلیق کار کا عمل ہی ہوتا ہے۔ اَدب سے دل چسپی رکھنے والے لوگ کس قدر پیارے اور قابلِ احترام ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ ایک نرم و نازک اور لطیف احساسات و جذبات رکھنے والا آدمی ہی لگا سکتا ہے۔ ہمارے علمی و ادبی حلقوں میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ کسی شاعر یا اَدیب کی شخصیت اور فن کا اندازہ اس کے تخلیقی سرمایہ ہی سے لگاتے ہیں۔ یہ نظریہ نقد و نظر اپنی جگہ نہایت وسیع اور مسلّم ہے۔ تخلیق کار کا سرمایہ خواہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، اُس کی بقا کا واحد دارومدار اس تخلیق کی فکری رفعت و عمق پر ہوتا ہے، جو تخلیق کو جنم دیتا ہے۔

بساطِ اَدب پر مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتب کی پذیرائی کا اندازہ تخلیق ہی سے لگایا جا سکتا ہے...... زیرِ نظر یا زیرِ تبصرہ کتاب ''آیاتِ آمنہؑ'' اسمِ با مسمّیٰ ہے۔ یہ ایک مختصر جگہ جامع انداز میں جدید مرثیہ کی نہایت دلآویز کتاب ہے جو موضوع کی انفرادیت کے اعتبار سے میرے مطالعہ کی حد تک پہلی کتاب ہے۔ یہ موضوع اگرچہ ایک مختلف النوع نوعیّت کا حامل ہے، تاہم اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ''آیاتِ آمنہؑ'' جو ایک مسدّس نظم کا شاہ کار ہے، اپنے شعری حُسن، لطیف احساس اور تر و تازہ جذبہ کی وجہ سے شاعر کے داخلی رشتوں کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے ہوئے قاری کے لیے روحانی تقویّت کا باعث بنتا ہے۔

قیصر بارہوی کی عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں بھی مارتا ہے اور ایک تاریخی شعور کو بھی بیدار کرنے کا موقع عطا کرتا ہے اور اسی طرح اس مرثیہ سے اس حقیقت کے اظہار کو بھی سامنے لانا مقصود ٹھہرتا ہے کہ حضرت آمنہ

علیہ السلام کی شخصیت جو بالفاظِ ڈاکٹر میمونہ انصاری صاحبہ رشکِ حاجرہؑ، فخرِ مریمؑ و آسیہؑ، جناب قیصر بارہوی کے مرثیے کا قابلِ توجہ عنوان ہے۔ نیا عنوان، نیا خیال۔

جناب شبیہ الحسن صاحب کی مرتب کردہ کاوش لائقِ صد تحسین اور مبارک کارنامہ ہے۔ اس کتاب کا انتساب سیّد وحید الحسن ہاشمی کے نام سے معنون کیا گیا ہے، جو پروفیسر شبیہ الحسن کے والد بزرگوار ہیں۔ کتاب کا طویل دیباچہ جو مرثیہ نگاری کی مختصر تاریخ ہے، اپنی جگہ ایک تخلیقی شاہ کار ہے، جو اربابِ علم و دانش اور تشنگانِ علم و اُدب کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ دیباچہ میں مرقوم مسدّس قارئین کی دل چسپی کے لئے پیشِ خدمت ہے۔

ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر　　اہلِ زمیں کی چاند ستاروں پہ ہے نظر
مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر　　ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر
عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

(نجم آفندی)

''آیاتِ آمنہؑ'' کے خصوصی مطالعہ کے مضامین بھی اپنی نوعیت کے یادگار مضامین ہیں، جو بالترتیب ڈاکٹر عبیداللہ خاں صاحب، ڈاکٹر طارق عزیز صاحب اور پروفیسر فخرالحق نوری صاحب کے خامۂ نُور افشاں سے تحریر ہوئے ہیں...... ''آیاتِ آمنہ'' کی علمی و اَدبی منزلت خواہ کچھ بھی ہو، اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ حضرت قیصر بارہوی نے نہایت خوش عقیدتی سے اپنے خونِ جگر میں اُنگلیاں ڈبو ڈبو کر، یہ کارنامہ سرانجام دے کر اہلِ حق و انصاف طبقہ سے بے پناہ داد و تحسین سمیٹنے کا اہتمام کیا ہے اور نہایت عجز و انکساری سے اپنے عقیدوں کے نوشگفتہ پھول قارئین کی جھولیوں میں ڈال کر اپنی روحانی تسکین کا سدا بہار گلشن مہکایا ہے۔

قیصر بارہوی کا یہ شاہ کار مرثیہ دل و دماغ اور قلب و رُوح کو تاابد تازگی دیتا رہے گا۔

(بحوالہ ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور 'قیصر بارہوی نمبر' جون ۱۹۹۰ء)

◆◆◆

آغا صاحب

(ڈاکٹر آغا سہیل کے حیات وفن پر گراں قدر آراء کا مجموعہ)

پروفیسر ذوالفقار علی

◆◆

وہ ناقدین یقیناً داد کے مستحق ہیں، جو ماضی کے اوراق سے غیر معروف مگر عظیم اُدبا شعرا کو منظرِ عام پر لاتے ہیں، لیکن اس عمل میں کچھ نقائص بھی ہیں۔ عظیم اُدبا و شعرا کے فن پارے سامنے لانا تو اہم ٹھہرا لیکن پھر اکثر نقاد و محقق اسی ایک موضوع سے منسلک ہو جاتے ہیں اور موجود دور کے تخلیق کاروں کی کماحقہٗ، پذیرائی نہیں ہو پاتی۔ موجودہ دور میں مردہ پرستی کا رجحان کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے جو اُدبا و شعرا ذرائع ابلاغ کے ذریعے شہرت پالیتے ہیں، قارئین و عوام الناس ان ہی کو بڑا ادیب سمجھتے ہیں۔ اس طرح بہت سے عظیم تخلیق کار زمانے کی قدر ناشناس نگاہوں سے دُور اپنی خاموش دنیا میں مگن رہتے ہیں اور حرفِ شکایت لبوں پر نہیں لاتے۔ احمد ندیم قاسمی نے کس خوب صورتی سے اس موضوع کو شعر میں سمویا ہے:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

کسی بھی تخلیق کار کے لیے داد و تحسین ایک ''انجکشن'' کا کام کرتی ہے، جس سے اس میں محنت اور لگن کا جذبہ فروتر ہو جاتا ہے۔ بعض نقاد مردہ پرستی کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اور یقیناً لائقِ مستحسن ہیں۔ ان ہی میں سے ایک ڈاکٹر شبیہ الحسن ہیں، جو اپنے رسالہ ''شام و سحر'' میں مدیر کی حیثیت سے جہاں تخلیق کاروں کو قارئین سے رابطہ کا ذریعہ فراہم کرتے ہیں، وہیں انھوں نے قیصر بارہوی، حسن عابدی، ڈاکٹر آغا سہیل، ظہیر کاشمیری اور ساحر لدھیانی جیسے معروف تخلیق کاروں کے لیے نمبر مخصوص کیے ہیں اور زندگی میں ہی ان جیسے کئی تخلیق کاروں

سے ذرائع ابلاغ کی زیادتیوں کے ازالہ کی کوشش کی ہے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات وخدمات اور فن پر گراں قدر آراء کو جمع کر کے ''آغا صاحب'' جیسی کتاب مرتب کی ہے، جو ان کی اُدب دوستی کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل ایک معروف افسانہ نگار، سفر نامہ نگار، ناول نگار، معتبر نقاد اور اُردو ادب کے معروف اُستاد ہیں۔ ان کے افسانہ نگاری کے پانچ مجموعے اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں: ''بدلتا ہے رنگ آسماں''، ''شہرِ ناپرساں''، ''تل برابر آسماں''، ''اگن کنڈلی'' اور ''بوند بوند پانی'' تنقید وتحقیق کے میدان میں بھی ان کا خاصا حصہ ہے۔ ''معارفِ سہیل'' میں مقالات اور خاکے ہیں۔ ''اُدب اور عصری حسیت'' آغا صاحب کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ''دبستانِ لکھنؤ کے داستانی اُدب کا ارتقا'' ان کے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کا عنوان ہے جو کتابی شکل میں بھی دستیاب ہے۔ ''سرور سلطانی'' اور ''اُردو کا لسانیاتی خاکہ'' ان کی تالیفات ہیں۔ سفر نامہ نگاری کو انھوں نے دو تحفے دیئے: ''اُفق تا بہ اُفق''۔ انگلستان کے سفر کی رُوداد ہے اور ''ایران میں چودہ روز۔'' ان کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ ''سفر نامہ امریکا'' زیرِ طبع ہے۔ ان کتب کے علاوہ بہت سے مقالات مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، اور بحیثیت اُستاد ایم۔ اے اُردو کے طلباء و طالبات نے ان کی زیرِ نگرانی بہت سے تحقیقی مقالات لکھے ہیں آغا صاحب کی ادبی حیثیت کے متعلق احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

> ''......افسانہ، تنقید اور تحقیق کے میدانوں میں انھوں نے بڑے بڑے اہل الرائے سے اپنی اہمیت کو تسلیم کرایا ہے۔ میں خوش ہوں کہ مجلسِ ترقی اُدب کی نظامت کے دوران ان کی ایک مرتبہ کتاب ''سرور سلطانی'' پر میرا نام بحیثیت ناشر درج ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا انداز عموماً تجزیاتی ہوتا ہے اور وہ اپنے موضوع کی گہرائیوں میں اتر کر بھاری بھرکم اصطلاحات سے دامن بچاتے ہوئے قارئین کے ذہنوں کے قریب چلے جاتے ہیں۔ افسانوں میں انھوں نے بیشتر ایسے کرداروں کی نفسیات پیش کی ہے، جنھیں فیشن ایبل افسانہ نگار چھوتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔ زبان پر ڈاکٹر آغا سہیل کو جو قدرت اور عبور حاصل ہے، اس کی بہت کم مثالیں ہمارے یہاں باقی ہیں۔''[1]

''آغا صاحب'' جیسی کتاب مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن کی تفہیم کی ہے اور اس میں شامل نقاد اہل الرائے اصحاب کی آراء بجائے خود اہم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے آغا سہیل پر رقم مضامین کو ایک خاص ترتیب سے پیش کیا ہے جن سے ان کی افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ انھوں نے آغا صاحب کے ہر فن پر ایک علاحدہ باب ترتیب دیا ہے۔ ''آغا صاحب'' میں مندرجہ ذیل ابواب ہیں:

۱۔ مقدمہ ۲۔ تعارف

۳۔ شخصیت ۴۔ خاکے

۵۔ افسانے ۶۔ تنقید

۷۔ سفرنامہ ۸۔ ناول

۹۔ گفت گو ۱۰۔ تبصرہ

''آغا صاحب'' کے آغاز میں مقدمہ خاصہ اہم ہے۔ اس میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے آغا سہیل کی تمام تخلیقات پر فرداً فرداً روشنی ڈالی ہے چناں چہ مقدمہ آغا سہیل کا جامع فنی تعارف ہے۔

''تعارف'' کے دو حصے ہیں، پہلے ''ڈاکٹر آغا سہیل۔ ایک نظر میں'' ہے، جس میں آغا صاحب کی زندگی کے تمام واقعات، تعلیم اور فن کو انتہائی اختصار سے بیان کیا گیا ہے اور دوسرا حصہ ''آغا سہیل...... عہد بہ عہد'' ہے، جس میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے آغا صاحب کی زندگی کو سنِ عیسوی کی ترتیب سے پیش کیا ہے، جو کہ ان کی دقتِ نظری کا ثبوت ہے۔

''شخصیت'' کے بارے میں تین تخلیقات کتاب کی زینت بنی ہیں۔ پہلی تخلیق آغا سہیل کی ہے، جس میں انھوں نے اپنا تعارف خود کرایا ہے۔ اس تعارف میں آغا صاحب نے اپنی فکری ونظریاتی تربیت کے مختلف ادوار کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنے اُستاد سیّد احتشام حسین کی ذات اور کتاب ''ادب اور سماج'' کا خصوصاً ذکر کیا ہے۔ مختلف نقاد اور فلاسفروں کے مطالعے کے بعد وہ نظریاتی اُدب کے قائل ہوئے اور اب زوروشور سے اس کی حمایت میں ہیں۔

دوسری تحریر مشہور شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی صاحب کی ہے جنھوں نے کچھ پرانی یادوں کے اوراق پلٹے ہیں اور آغا سہیل سے محبت ورفاقت کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود بھی انھیں آغا صاحب سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی، اور یہی ایک تخلیق کار کی عظمت ہے۔ شور صہبائی نے آغا صاحب کے بچپن کی باتوں سے اُن کی شخصیت کو واضح کیا ہے۔ وہ جوانی میں پروفیسر احتشام حسین کے پاس انجمن ترقی پسند کی نشستوں کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ وہ اور آغا صاحب پیدل وہاں جایا کرتے تھے۔ آغا صاحب کو روزانہ چوبیس میل پیدل چلنا پڑتا تھا، لیکن ان کی ادب سے محبت تھی کہ کبھی ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی اور وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے شور صہبائی کے ہاں پہنچتے رہے۔

شور صہبائی صاحب آغا سہیل کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں کہ آغا صاحب لوگوں کی خاطر تواضع کرتے ہوئے بہت تکلف برتتے ہیں اور اگر انھیں ایک پیالی چائے پلا دیجیے تو اسی کی تعریف میں لگے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ رقم کرتے ہیں کہ آغا صاحب چند دوستوں کے ہمراہ شورؔ صاحب کے گھر گئے، رات کھانے تک گپ شپ رہی۔ کھانے کے بعد آغا صاحب نے کھانے کی لذّت اور بنانے کی زحمت پر ایک طویل لیکچر دیا جب باقی دوست

چلے گئے تو شورؔ اور آغا صاحب برآمدے میں سو گئے۔ شورؔ صاحب آگے کے واقعات یوں بیان کرتے ہیں:

''صبح جیسے ہی میری آنکھ کھلی، سہیل بھی انگڑائی لیتے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے اور آنکھیں ملتے ہوئے کہا:

''شورؔ ایک گلاس پانی تو منگوانا۔''

''خیریت۔''

''بھئی رات سے پیاسا ہوں۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا، کہیں پانی نہیں ملا۔''

ایک چھنا کا ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ جیسے اَن گنت گلاسوں کے شیشے ٹوٹ کر میرے سارے جسم میں پیوست ہو گئے۔ غصہ تو بہت آیا۔ یہ ہے ایک بے تکلف دوستی کا کردار۔ مگر اس سے قبل کہ میرے اُوپر کوئی ردِ عمل ہو، وہ بھانپ گیا اور مسکراتے ہوئے میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔:

''چلو پانی نہیں تو کوئی بات نہیں، گرم گرم چائے ہی منگوا دو۔ دراصل رات بھابی نے اتنے مزے مزے کے کھانے تیار کیے تھے، پیٹ سے زیادہ کھا گیا۔ کمبخت رات پانی پیتے گزری۔''

وہ تو لفظوں کا بے تاج بادشاہ ہے۔ حقیقت تو صرف اتنی تھی کہ اُس نے کسی کو نیند سے بیدار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور تمام رات شدید گرمی میں پیاسا رہا۔''[۲]

اس واقعے سے واضح ہوتا ہے کہ آغا صاحب طرح دار ادیب ہی نہیں بل کہ ایک طرحدار اور حساس انسان بھی ہیں۔ شورؔ صہبائی رقم طراز ہیں:

''یہ کہتے ہوئے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا، یا تو سہیل کی شخصیت اتنی خوبیوں کا مرقع ہے کہ قریب سے گزرنے والا اس کی دوستی کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے یا پھر وہ اپنے نزدیک آنے والے کے کان میں آہستہ سے اپنے ڈرامائی انداز میں کہہ دیتا ہے۔ ''میں صرف تمھارا ہی دوست ہوں۔''[۳]

''آغا صاحب'' کا ایک اہم حصہ، اس میں آغا سہیل کی شخصیت کے خاکے ہیں، جو کہ خاکہ نگاری کی صنف کے لیے بھی اہم ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جو یہ خاکے تخلیق کروائے ہیں، یقیناً ان کی اپنے استادِ محترم سے محبت و عقیدت کا ثبوت ہیں، لیکن یہ خاکہ نگاری کی طرف توجہ میں اضافہ کا باعث بھی ہوں گے۔ پہلا خاکہ احمد جمال پاشا کا ''پورٹرے'' کیا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے آغا سہیل سے بے تکلفانہ تعارف کروایا ہے:

آغا سہیل پہلے بڑے سرخ و سپید، ایرانی حسن و جمال کے مالک تھے۔ انتہائی دھان پان، پر اسرار سیاہ عینک لگاتے، چیخ چیخ کر ناک میں بولتے اور اُچھل کر بات بات پر ہاتھ ہلاتے۔[۴]

مصنف کے اس خاکہ میں آغا صاحب کی جوانی میں جولانی طبع کا تذکرہ کیا ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ

شروع میں آغا سہیل کسی دفتر میں ملازم ہوئے۔ کسی افسر سے تلخ کلامی پر کرسی دے ماری اور مستعفی ہو گئے۔ بعد میں درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ یونیورسٹی کے زمانہ میں آغا صاحب کی سائیکل چوری ہو گئی۔ دوسری سائیکل قسطوں پر دلوائی گئی۔ سوئے اتفاق وہ بھی چوری ہو گئی۔ بعد میں وہ پیدل مارچ کرتے رہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنے خاکے ''ٹو سر و دلو'' میں تحریر کرتے ہیں:

''نقاد اور ادیب کی بے غرض اور پُر خلوص دوستی ممکن نہیں، جب تک تعریف کی ٹافیاں کھلاتے رہو، ادیب خوش، اس کے احباب خوش اور دوستی برقرار، لیکن جس دن تنقید کی دال میں تعریف کا تڑکا کم ہوا، اُسی دن گفتار کا اُسلوب تبدیل ہو جائے گا...... اس تلخ حقیقت کے ساتھ یہ بھی ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ آغا سہیل میرے اُن پُر خلوص دوستوں میں سے ہیں جن سے دوستی کا رشتہ پختہ تر ہوتا گیا ہے۔''[۵]

ڈاکٹر سلیم اختر کے الفاظ میں آغا سہیل دوست کی دوستی سے غرض رکھتے ہیں، اس کے مشغلے سے نہیں۔ وہ ایک نرم خو انسان ہیں اور بڑی خاموشی سے دوست بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''ان کی شخصیت میں شرافت، رواداری، مروّت اور تحمل شامل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے آغا سہیل۔''[۶]

''...... اگر اندازِ گفت گو کے لحاظ سے آغا صاحب بہت ''پولے پولے'' لگتے ہیں، تو اُسلوب حیات کے لحاظ سے بہت ہی ''ہیبے'' واقع ہوئے ہیں، لیکن ''ہیبے'' ہونے کا مطلب موم کی ناک بننا نہیں۔ چناں چہ سیاسی اور ادبی تصورات کے اظہار میں بے باک ہی نہیں، بے لچک بھی ہیں۔''[۷]

خاکہ نگار رحیم گل نے آغا سہیل کو نستعلیق آدمی کے نام سے معنون کیا ہے۔ وہ اپنے خاکے میں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر ہے، ایم بی بی ایس نہیں، لٹریچر کا، بچوں کو پڑھاتا ہے، سکول میں نہیں، کالج میں۔ چھوٹا قد، بڑا دہن، گھنے بال، گورا رنگ، بتیسی نے کام بگاڑ دیا ورنہ خوب صورت آدمی ہوتا...... پھر بھی خوب صورت آدمی ہے۔''[۸]

رحیم گل نے آغا صاحب کو ''مرنجاں مرنج''، ''بذلہ سنج'' اور ''اچھے انسان'' سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ آغا سہیل کتاب پر رائے دینے سے پہلوتہی کیا کرتے تھے، کیوں کہ کوئی تنقید میں تنقیص برداشت نہیں کرتا، لیکن اب وہ میدان میں آ گئے ہیں اور کھل کر بُرے کو بُرا کہتے ہیں۔ یہی مردِ میدان کا وصف ہے۔ یہ دَور تعریفوں کا دَور ہے۔ نقاد صرف اچھا بیان کرے تو پسندیدہ، وگرنہ نقاد ہی نہیں۔ لیکن آغا سہیل نے اس بات کی

پرواہ نہیں کی۔اس کے باوجود اَدبی حلقوں اور اَدبی پرچوں میں نظر آتے ہیں۔

احمد عقیل روبی آغا صاحب کے متعلق تبصرہ کرتے ہیں:

''آدمی کے لیے اگر آئس برگ کا استعارہ استعمال کیا جائے تو اس کے لیے موزوں ترین آدمی ڈاکٹر آغا سہیل ہیں۔جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ سطحِ سمندر پر آئس برگ کا صرف ایک حصّہ نظر آتا ہے، باقی چھ حصّے پانی کے اندر ہوتے ہیں۔سمندر کی منہ زور لہریں اس ایک حصّے کو مکمل آئس برگ جان کر راستہ لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہیں، مگر قطرہ قطرہ ہو کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔آغا سہیل کا چھوٹا قد سب کی نظر میں ہے لیکن ان کی شخصیت کے باقی چھ حصّے، جو وقت کے سمندر کی تہہ تک چلے گئے ہیں، ان سے صرف وہی لوگ واقف ہیں، جو خبر کے ساتھ ساتھ نظر کا علم بھی رکھتے ہیں۔''[9]

احمد عقیل روبی کے نزدیک آغا صاحب نے ماسک پہن کر دنیا کے سٹیج پر مختلف کردار اَدا کیے ہیں۔ شوہر، باپ، اُستاد، تینوں کرداروں میں وہ کامل نظر آتے ہیں۔آغا صاحب ایک لسانی ادارہ ہیں، بولتی ڈکشنری ہیں۔جہاں یہ بیٹھے ہوں، صرف یہی بولتے ہیں، دوسرے سنتے ہیں۔بولتے اس لیے نہیں کہ کہیں تلفظ کی غلطی پر گرفت میں نہ آجائیں۔

ڈاکٹر اجمل نیازی رقم طراز ہیں:

''وہ بہت نرم خُو، ٹھنڈی چھاؤں جیسے انسان ہیں۔محبتوں کی ہواؤں کو عام کرتے ہیں۔شخصیت سازی میں انھیں کمال حاصل ہے۔''[10]

محمد ظہیر بدر نے آغا صاحب کا ایسا تعارف کروایا ہے کہ ان کی ظاہری ہیئت و عادات کو واضح کر دیا ہے اور اس تعارف کے بعد پہلی ملاقات میں ہی انھیں پہچانا جا سکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''نام ڈاکٹر آغا سہیل، عمر ۶ جون ۱۹۹۳ء کو ساٹھ سال، جائے پیدائش لکھنؤ، قد قدرے چھوٹا۔ اَدبی قد کے برعکس۔پسندیدہ لباس سفاری سوٹ، اس کثرت سے پہنتے ہیں کہ یونیفارم کا گمان ہوتا ہے۔صاف ستھرا رنگ، جس میں سُرخی کی آمیزش نے انھیں گوراچٹا ہونے سے بچا رکھا ہے مگر یہ سُرخی ساغر و مینا کی کرامت نہیں بل کہ صحت کی علامت ہے۔مزاج تصنع اور بناوٹ ایسے جملہ عناصر سے پاک، گفت گو میں لکھنوی پُرکاری اور دہلوی سادگی کا باوقار امتزاج، لہجہ وہی، یعنی لکھنوی لکھنوی سا۔داڑھی مونچھ صاف...... کلین شیو بل کہ نیٹ اینڈ کلین شیو۔سر کے بال آدھے سے کہیں زیادہ سفید اور آہستہ آہستہ مزید سفیدی کی طرف مائل ہیں۔کبھی آنکھوں پر خوف ناک حد تک موٹے شیشوں والی عینک کا قبضہ تھا، مگر کنٹیکٹ لینز کے بعد چہرے کی صورت

حال خاصی واضح ہوگئی ہے، اور آپ کی آنکھیں بہلاتے رہنے کی عادت بھی کھل کر سامنے آگئی ہے۔ احتراماً لوگ آپ کو آغا صاحب کہتے ہیں، مگر پیار سے آپ کو ''آغا جی'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔''[11]

ڈاکٹر آغا سہیل کے افسانوں پر تنقیدی مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سے ڈاکٹر سہیل کی افسانہ نگاری کا ارتقا سامنے آتا ہے اور ان کی افسانہ نگاری کا مقام و مرتبہ بھی مقرر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی انھیں ماضی کا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اقرار کرتے ہیں کہ وہ داخلیت سے زیادہ خارج کی ٹوٹ پھوٹ کے اثرات رقم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

> ''عظیم موضوعات پر لکھنا اور اپنے کرداروں کے نفس میں اُتر جانے کی کوشش بہت سے افسانہ نگار کر سکتے ہیں، لیکن اپنے کرداروں کی صداقت اور ان کے ساتھ یک رنگ نظر آنے کا التباس ہی عظیم ادیب تخلیق کرتا ہے۔ آغا سہیل اسی صف میں شامل ہیں۔''[12]
>
> ''آغا سہیل نے جہاں نظریہ کی اہمیت کو سمجھا ہے، وہاں فن کے نکات اور رموز پر بھی کماحقہٗ توجہ دی۔ وہ کبھی بھی ایسے ادیب نہیں رہے، جن کے پاس نظریہ ہی نظریہ ہو، اور فن کے نام پر صرف عجزِ فن۔ ایسے لوگوں سے نتیجتاً متحیر العقول قلابازیاں سرزد ہوتی ہیں، جن کو ''جدیدیت'' کے خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔''[13]

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک آغا سہیل نظریہ اور فن کے بارے میں رجائی ہیں، جو کہ زندگی سے ربط کی نشانی ہے۔ کہیں کہیں ان کے افسانوں میں نظریہ اور پیغام واضح ہے لیکن اکثر افسانے فنی لوازمات کے ساتھ بین السطور پیغام لیے ہوئے ہیں۔ آغا سہیل کرداروں پر نظریہ تھوپتے نہیں بل کہ کرداروں کی کشمکش سے نظریہ واضح کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی نے آغا صاحب کو جدیدیت کا پیامبر قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں آغا سہیل...... جدیدیت کو ایک اُسلوبِ نگارش کی بجائے ایک نقطۂ نظر سمجھتے ہیں اور وہ ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں، جنھوں نے جدیدیت کی درست توضیح و تشریح کی ہے اور یوں انھوں نے جدیدیت کو محض ہیئت اور ادبی زبان کو چیستاں ہونے سے بچایا ہے۔ آغا سہیل کے مجموعوں ''بدلتا ہے رنگ آسماں'' ''شہرِ نا پرساں'' ''تِل برابر آسماں'' کے متعلق ڈاکٹر صاحب تبصرہ فرماتے ہیں کہ آغا سہیل نے اپنے افسانے ''تو بویا مجھ کو'' (بدلتا ہے رنگ آسماں) سے جس سفر کا آغاز کیا تھا، وہ ''کھڑکی'' (شہرِ نا پُرساں) تک آتے آتے اپنا دائرہ مکمل کر چکا تھا۔

مشہور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر، آغا صاحب افسانہ نگاری کی فضا کو جگنو کی روشنی سے تشبیہ دیتے ہیں، وہ رقم طراز ہیں:

> ''مجھے اس کے افسانوں میں علامت بالکل جگنو کی مانند چشمک کرتی نظر آتی ہے۔ آغا سہیل کے

افسانوں کی فضا بڑی خاموش اور پُر سکون ہوتی ہے۔ وہ تیز روشنیوں سے اجتناب کر کے سایوں، پرچھائیوں اور ہیولوں سے افسانے کی خاموش فضا میں تحیّر کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔[۱۴]

ڈاکٹر صاحب نے آغا سہیل کو اس گروہ میں شامل کیا ہے، جو علامت اور استعارے کو اس خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں کہ معانی کا طلسم پیدا ہو جاتا ہے۔ آغا سہیل کے افسانے قارئین سے داد پاتے ہیں اور ''کھڑکی'' جیسے افسانے کتابی صورت میں آنے سے پہلے ہی تنقیدی مباحث میں شامل ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے آغا صاحب کی فنی حیثیت کو یوں واضح کیا ہے:

''قد آور افسانہ نگاروں کو دیکھیں تو لگتا ہے کہ وہ اب اپنی توانائی کے محفوظ ذخیرے کو ختم کر بیٹھے ہیں۔ ان سب کے ردِ عمل میں اب ''نئے'' کے نام پر رطب و یابس کو مسترد کرنے کا رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بل کہ خود علامتی افسانہ نگار بھی اس کی بے سمتی اور اس میں پائی جانے والی بے وزنی کی کیفیت کے خلاف لب کشا نظر آتے ہیں، تو ان حالات میں آغا سہیل جیسے بالغ نظر نقاد اور معتدل مزاج افسانہ نگار کا علامت کی طرف رجوع نیک فال ہے۔''[۱۵]

ڈاکٹر وحید عشرت نے مجموعہ ''تل برابر آسماں'' پر یوں رائے دی ہے:

تل برابر آسماں، کے اسی افسانوی مجموعے کی کئی خصوصیات قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا سکتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ نہ صرف یہ کہ مجموعہ اپنی ضخامت میں مختصر ہے بل کہ اس کا ہر افسانہ بھی نہایت مختصر ہے اور بے جا قسم کی عبارت آرائی سے ان افسانوں کا دامن پاک ہے۔ یہ افسانے اپنے مرکزی کردار کے قریب ترین رہتے ہیں اور جو تاثر ان کا مصنف اپنے قاری پر چھوڑنا چاہتا ہے، بڑی مہارت اور کامیابی کے ساتھ یہ افسانے اس کا ابلاغ دیتے ہیں۔ ادا کاری پر ہر افسانہ ایک بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ دوسری خوبی ان افسانوں کی نتھری اور دھلی ہوئی زبان ہے، جس کا ذائقہ قاری پر یوں اثر انداز ہوتا ہے کہ قاری چاہتا ہے کہ افسانہ ذرا دراز ہو، اور حکایت ذرا طولانی ہو جائے، مگر قاری کو جلد احساس ہو جاتا ہے کہ افسانہ تو اسے ایک ٹھونکا دے کر تمام ہو چکا ہے۔''[۱۶]

مشہور ڈرامہ نگار اور معروف نقاد ڈاکٹر طارق عزیز نے آغا صاحب کے افسانے کے ارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں آغا سہیل کا افسانوی ارتقا چار مدارج پر مشتمل ہے۔ ان میں کومٹمنٹ اور احتجاج کی لے، زبان کی خوب صورتی تو مشترک ہے، لیکن کچھ چیزیں منفرد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں پہلے مرحلے میں ان کے یاں نظریاتی وابستگی اور نظریاتی منشور بہت اہم ہے۔ اس دور میں وہ موضوعاتی تعین میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دوسرا دور ''شہر نا پُرساں'' نوحوں کا دور ہے، اس میں ''جزاک اللہ'' جیسا افسانہ

معاشرتی رویوں کا ماتم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ تیسری دنیا کے مسائل کا ادراک ملتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں نظریاتی وابستگی کے ساتھ موضوعاتی تنوع بھی ملتا ہے۔ اب وہ بین الاقوامی سطح پر انسانی کرب اور حقائق کو محسوس کرتے ہیں۔

چوتھے دور میں ان کی نظریاتی اور موضوعاتی وسعت روحانی تناظر میں داخل ہوتی ہے اور مجموعہ ''اگن کنڈلی'' منظرِ عام پر آتا ہے۔ یہ مرحلہ داخلی اور خارجی کیفیات کا مکمل امتزاج ہے۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی، آغا سہیل پر بعض اعتراضات عائد کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں آغا صاحب کے ہاں موضوعات کا تنوع تو ہے، لیکن ان کے افسانے قصہ گوئی کی مثال ہیں۔ ان میں دل چسپی اور کہانی کے باوجود تسلسل کی کمی پائی جاتی ہے اور کرداروں میں بھی قوت اور توانائی کا فقدان ہے۔

''آغا صاحب'' میں ڈاکٹر آغا سہیل کی تنقید و تحقیق پر بھی مختلف آرا شامل ہیں۔ پروفیسر جیلانی کامران، آغا صاحب کی کتاب ''لکھنوی ادب میں داستان گوئی'' پر تبصرہ کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

> ''ڈاکٹر آغا سہیل کے مفہوم، تشریح اور داستانی مواد کی پیشکش قابلِ ستائش اور قابلِ تعریف ہے۔ ان کا مطالعہ بہت زیادہ گہرا اور اثر آفرین ہے اور اُسلوبِ بیان دلکش اور یقین بخش ہے۔ تاہم اس مطالعے کو جو چیز بہت زیادہ اہم بناتی ہے، وہ ڈاکٹر آغا سہیل کا پرانے لکھنؤ اور اس کا خیالی ملک (خوابی دنیا) ہے...... گو کہ صرف انسانی خوابوں کے علاقے میں ڈاکٹر آغا سہیل کا اب میں خوابوں کی دنیا کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ یادوں پر مشتمل خوابوں کی حقیقت بھی ایک حقیقت ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس نظریے کی تعریف کریں جو کہ قابلِ ستائش ہے، کیوں کہ اس سے پہلے اس رُخ کو نقادوں نے نظر انداز کیا۔''[۱۷]

مشہور نقاد ڈاکٹر وفا راشدی رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب نے اپنی بحث کا دائرہ صرف لکھنؤ، دہلی، شمالی ہند یا جنوبی ہند کی داستانوں تک محدود نہیں رکھا بل کہ بیرونِ ہند اور اس سے آگے بڑھ کر یورپ اور یونان میں لکھی جانے والی داستانوں سے اُردو داستانوں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ متعدد ماخذات کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر داستانیں بیرونی زبانوں سے اُردو میں درآمد نہ بھی کی جاتیں، جب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس لیے کہ ابتدائی ایام سے جب دیگر زبانوں میں داستان طرازی کا رواج شروع ہوا، اسی زمانے سے اُردو میں بھی داستان نویسی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ داستانیں لکھنؤ، دہلی، شمالی و جنوبی ہند کی فضاؤں میں گونج رہی تھیں۔ یہ داستانیں ان خطوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت و معاشرت کی رگوں میں سمائی ہوئی تھیں اور بتدریج نشوونما پا رہی

تھیں۔''۱۸

''ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کی افادیت اور ان کے تنقیدی اُسلوب کی انفرادیت سے انکار کی گنجائش نہیں۔ لکھنوی تہذیب وشائستگی ان کے سبک لہجے، تحریر کی شگفتگی، زبان کی شیرینی اور بیان کی لطافت نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا طرزِ نگارش فاضلانہ ہوتے ہوئے بھی نہایت دلکش اور خوب صورت ہے۔''۱۹

عبدالکریم خالد نے آغا صاحب کے تنقیدی نظریات پر بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں آغا صاحب کے نظامِ فکر میں اصل اہمیت کلیت اور وحدت کو حاصل ہے۔ وہ مختلف فکری رویّوں اور نظاموں کو ایک کُل میں تبدیل کر کے پیش کرتے ہیں۔ عبدالکریم خالد لکھتے ہیں:

''آغا صاحب کے یہاں کسی مجرد تنقیدی دبستان سے وابستگی کا تصور نہیں۔ یہاں تک کہ وہ ترقی پسند ہونے کے باوجود خالص مارکسی تنقید پر بھی اصرار نہیں کرتے بل کہ تنقید کے اس ہمہ گیر تصور کے قائل ہیں، جس میں غیر ترقی پسندوں کی ہیئت پرستی کے جزوی تصور سمیت تمام معاشرتی علوم اور تنقیدی تصورات شامل ہیں۔''۲۰

عبدالکریم خالد، آغا سہیل کو سائنٹفک تنقید نگار قرار دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''آغا صاحب کا سائنٹفک اندازِ نظر ان کی تنقید ہی نہیں، ان کی شخصیت میں بھی موجود ہے۔''

مذکورہ اہل الرائے اصحاب کے علاوہ میرزا ادیب اور باقر علی شاہ کی آراء بھی کتاب کی زینت بنی ہیں۔

مبہم جوئی اور دوسرے معاشرے کی روایات سفرنامے کا موضوع ہیں۔ آج کل ادب کی اصناف میں سے سفرنامہ فروخت کے اعتبار سے سرِ فہرست ہے۔ مختلف تخلیق کار اس شعبۂ ادب میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ آغا سہیل نے بھی دو سفرنامے تخلیق کیے ہیں۔ ''اُفق تا بہ اُفق'' میں انھوں نے انگلستان کے سفر کا حال تحریر کیا ہے۔ ''آغا صاحب'' میں اس سفرنامہ کے متعلق پروفیسر غلام جیلانی رقم طراز ہیں کہ مصنف نے انگلستان کو ایک سکالر کی نظر سے دیکھا ہے اور یہی اس سفرنامہ کی انفرادیت ہے۔ وہ جہاں مختلف مقامات کی سیر کراتے ہیں، وہیں عظیم اُدبی شخصیات کی متعلقہ عمارات سے تعارف میں تنقید وتحقیق کو بھی شامل کرتے جاتے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''افق تا بہ افق، ایک بہت ہی دل چسپ اور دل فریب سفری بیان ہے۔ سفرنامہ میں دکھی انداز میں ہم وطن خاندانوں کی تہذیبی اور تمدنی حالتِ زار بیان کی گئی ہے۔ پاکستان کی نوجوان نسل کو وہاں کے ماحول نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور یہ بہت سے والدین کے لیے پریشانی کا

باعث ہے۔''[۲۲]

مشہور نقاد ڈاکٹر انیس ناگی اس سفرنامے کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں:

''ڈاکٹر آغا سہیل کے سفرنامے ''افق تا بہ افق'' کو تیسری دنیا کے پس منظر میں پڑھنا چاہیے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے سفرنامے ہمہ جہت نہیں بل کہ بہت سی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ نہ صرف حسین وجمیل قدرتی نظارے لیڈز یا برمنگھم کے بل کہ تیسری دنیا کے ملک سے آنے والے ایک سیاح کے نفسیاتی ردِعمل کو، جو ایک بڑی منظم سوسائٹی کو بہت حیرت اور خوف سے دیکھتا ہے، بے مثال معاشی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی ڈاکٹر آغا سہیل کو انگلستان اور اپنے ملک کی زندگی کا موازنہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔''[۲۳]

جعفر علی نے آغا صاحب کے پہلے سفرنامے کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں آغا سہیل نے جزئیات نگاری کو مرقع نگاری میں شامل کر کے اچھوتا رنگ دیا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اری ان کے ساتھ رُوبہ سفر ہے، اسی طرح وہ نظر افروز مناظر کو باکمال طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ جعفر علی رقم طراز ہیں:

''آغا سہیل نے مختلف شہروں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تاریخی پس منظر، معاشرتی حالات، مقامات ومضافات کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدے کو ایک ماہر فن کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے گلی کوچوں اور ان مقامات (جہاں تاریخی نوادرات رکھے گئے) پر ایک طالب علم کی حیثیت سے نظر ڈالی۔''[۲۴]

آغا سہیل سفرنامے میں جو تاثر دیتے ہیں، ان کے متعلق جعفر علی یہ خیال کرتے ہیں کہ:

''ورڈز ورتھ کے گھر کے بیان کے بعد آغا سہیل اس کی شاعری پر بھی تبصرہ کرتے ہیں۔ اس طرح اس کا سفرنامہ واقعاتی سفرنامے کے زمرے سے نکل کر تاثراتی سفرنامے کے ذیل میں آ جاتا ہے، اور یہ ان کے ادب سے گہرے لگاؤ کا ثبوت ہے کہ سفرنامہ نگار آغا سہیل کبھی کبھار سفر کے دوران نقاد آغا سہیل کے رُوپ میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔''[۲۵]

جعفر علی کے نزدیک مصنف نے اس سفرنامے میں مکمل غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے جہاں مغربی تہذیب ومعاشرت کے روشن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، وہیں منفی پہلو بھی واضح کیے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''آغا سہیل نے اپنے سفرنامے میں ''میں'' کا لفظ بکثرت استعمال کیا ہے، لیکن کبھی کبھی وہ حد سے تجاوز کر جاتے ہیں حتیٰ کہ ذاتی بائیوڈیٹا تک لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ پہلے باب میں بائیوڈیٹا کے علاوہ دوسرا عنصر وعظ ونصیحت کا ہے۔''[۲۶]

آغا سہیل کے دوسرے سفرنامے ''ایران میں چودہ روز'' کے متعلق جعفر علی لکھتے ہیں:

''آغا سہیل نے ایرانی تہذیب کے روشن و تاریک ہر پہلو کا بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا پھر اپنی پسند و ناپسند پر اپنی آراء پیش کیں، جو کہ متوازن اور منصفانہ ہیں۔ گو آغا سہیل کو ایران سے ایک خاص عقیدت اور وابستگی ہے لیکن پھر بھی وہ منفی پہلو بیان کرتے ہیں۔ اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔''[۲۷]

جعفر علی مزید لکھتے ہیں کہ:

''آغا سہیل نے سفرنامے میں دل چسپی کے عنصر کو دوبالا کرنے کے لیے کہیں کہیں مرقع نگاری کا سہارا لیا ہے۔ وہ ایرانی لباس اور معاشرت کے نمونے بڑی عمدگی اور فنی چابک دستی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی تصاویر میں جزئیات نگاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصویریں متحرک، چلتی پھرتی اور حرکت کرتی نظر آتی ہیں اور قاری خود کو اس منظر کا ایک حصہ شمار کرتا ہے۔''[۲۸]

جعفر علی کے خیال میں مصنف نے اس سفرنامہ میں کردار نگاری پر زیادہ زور دیا ہے اور اپنے قاری کو ہر جگہ اپنا ہم سفر بنایا ہے۔ مصنف اس سفرنامے میں اپنے عقائد اور آباؤ اجداد کے قدیمی مسکن اصفہان کے حوالے سے ایک جذباتی کیفیت سے دوچار ہے۔ جعفر علی آخر میں رقم طراز ہیں:

''افق تا بہ افق' خارجی صورتِ حال کو نمایاں کرتا ہے، جب کہ ''ایران میں چودہ روز'' مصنف کے باطنی سفر کو سامنے لاتا ہے۔''[۲۹]

آغا سہیل نے دو ناول تخلیق کیے ہیں۔ ان کے متعلق زیرِ بحث کتاب میں صرف ایک تحریر ہے جو ڈاکٹر خالد اشرف کے مقالے سے حاصل کی گئی ہے۔ خالد اشرف، آغا سہیل کے ناول ''غبار کوچۂ جاناں'' کو نظریاتی ناولٹ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر آغا سہیل کا یہ ناول پاکستان اور ہندوستان کے معاشروں میں سیاست اور معیشت کی مایوس کن صورتِ حال کی نشان دہی کرتا ہے، جہاں جرائم، فرقہ واریت اور پس ماندگی نے سارے انسانی سماج کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔ اور اس معاشرے میں مساوات اور انسانی قدروں کے لیے لڑنے والے چند سر پھرے دانشور تمام زندگی تنہائی، تنگ دستی اور بے بسی کا شکار رہتے ہیں۔''

ڈاکٹر آغا سہیل سے ملاقاتوں اور انٹرویوز کا حصہ بھی خاصہ اہم ہے۔ اس میں آغا سہیل کے نظریات اور تصورات نکھر کر سامنے آتے ہیں اور ان کی علم دوستی بھی واضح ہوتی ہے۔ اس میں حسن رضوی، زاہد بشیر، طاہر مسعود اور سعدیہ شفقت کے لیے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔

''آغا صاحب'' کے آخر میں آغا سہیل کی منتخب تصانیف پر تبصرے شامل ہیں۔ جن سے ان کے ارتقائی سفر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان تبصروں میں عصرِ حاضر کے نامور ناقدین رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر سحر انصاری، زرینہ اجمل کے علاوہ نامور افسانہ نگار خدیجہ مستور کے تبصرے شامل ہیں۔

اب تک ''آغا صاحب'' کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب میں کتنی گراں قدر آرا اور تخلیقی کام ہے۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین کے بعد ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنے بڑے ناقدین اور صائب الرائے اُدبا سے یہ فن پارے تخلیق کروائے اور اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر آغا سہیل کو ایک تحفہ پیش کیا۔ اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں آغا سہیل پر صرف تعریفی کلمات ہی نہیں بل کہ تنقیدی آراء بھی موجود ہیں۔ بعض متنازعہ ہی سہی، شبیہ الحسن صاحب نے ان کو بھی اعتراض کے باوجود شاملِ کتاب کیا ہے، جو ان کی غیر جانبداری کا بین ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے مضامین اور آراء اخبارات اور پرانے رسائل سے تلاش کیے گئے ہیں، جن کے لیے بڑی ہمت اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے، لیکن ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے اس کام کو پورا کر دکھایا اور یوں ''آغا صاحب'' کی صورت میں انھوں نے اُردو ادب کو ایک تحفہ پیش کیا ہے۔

''آغا صاحب'' میں ڈاکٹر آغا سہیل کے فنی و ذاتی پہلوؤں پر بہت واضح انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے باوجود ابھی کئی حصے توجہ کے طلب گار ہیں۔ آغا سہیل ایک معتبر نقاد ہیں ''معارفِ سہیل'' ادب اور عصری حسیت، اُردو لسانیات کا مختصر خاکہ اور سرور سلطانی پر شبیہ الحسن صاحب کے مقدمہ کے علاوہ بھی تنقیدی آراء ہونی چاہئیں تا کہ آغا سہیل بحیثیت نقاد اور نکھر کر سامنے آسکیں۔

آغا سہیل کے ناولوں پر ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مقدمہ کے علاوہ صرف ایک تحریر کتاب میں شامل ہے جو کہ تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ ان کمیوں کے باوجود کتاب خاصی وقیع ہے۔ اس میں ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوتے ہیں اور ان کے فنی پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی وقعت واہمیت کے بارے میں احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور فن کے بارے میں متعدد صائب الرائے اہلِ قلم کے افکار کو کتابی صورت میں یک جا کر کے پاکستان کی اُدبی تاریخ کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے علم وفضل اور فکر وفن کی متنوع جہات ہیں۔ ان سب کو ایک کتاب میں اس سلیقے سے سمیٹنا، آغا صاحب سے مرتب کی عقیدت کے علاوہ ان کی توانا اور ہمہ گیر لگن کا ثبوت ہے۔ انھوں نے آغا صاحب کی شخصیت کے علاوہ ان کے سفر ناموں، افسانوں، ناول،

تنقید و تحقیق کے الگ الگ عنوانات کے تحت دورِ حاضر کی بڑی بڑی شخصیات کے وقیع مضامین اس مجموعے میں شامل کیے ہیں۔ یوں یہ مجموعہ آغا صاحب کی سوانح عمری کا کردار بھی ادا کر رہا ہے اور دورِ حاضر کی ایک اہم اَدبی شخصیت کے کمالاتِ فن کے متوازن اذکار سے تاریخ ادب کا ایک الگ باب بھی تکمیل پذیر ہو گیا ہے۔ اس کامیابی کے لیے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب بھرپور تحسین کے مستحق ہیں۔''۳۰

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور اکتوبر ۲۰۰۱ء)

....

حواشی

۱۔ احمد ندیم قاسمی...... ''آغا صاحب'' ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور...... الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص:۷۳۔

۲۔ شور صہبائی، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص۷۹، ۸۰، ۸۱۔

۳۔ شور صہبائی، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص۷۹، ۸۰، ۸۱۔

۴۔ احمد جمال پاشا، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص۷۹، ۸۰، ۸۱۔

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۹۸، ۹۹، ۱۰۰۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ رحیم گل، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص۷۹، ۸۰، ۸۱۔

۹۔ احمد عقیل روبی، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۷۔

۱۰۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۲۔

۱۱۔ محمد ظہیر بدر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۵۔

۱۲۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۷۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۶، ۱۵۹۔

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۶، ۱۵۹۔

۱۶۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۶۱، ۱۶۳۔

۱۷۔ جیلانی کامران، پروفیسر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۸۔
۱۸۔ وقار اشدی، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷۔
۱۹۔ ایضاً۔
۲۰۔ عبدالکریم خالد، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۷۔
۲۱۔ عبدالکریم خالد، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱۸۔
۲۲۔ جیلانی کامران، پروفیسر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲۷۔
۲۳۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۰۔
۲۴۔ جعفر علی، آغا صاحب (ڈاکٹر شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۸، ۲۳۹۔
۲۵۔ ایضاً۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۴۳، ۲۴۹۔
۲۷۔ ایضاً۔
۲۸۔ ایضاً، ص ۲۵۳، ۲۵۷۔
۲۹۔ ایضاً۔
۳۰۔ احمد ندیم قاسمی (فلیپ)، آغا صاحب (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

◆◆◆

maablib.org

''آغا صاحب'' کے محاسن

سعدیہ انور

◆◆

بعض شخصیات سمندر کی مانند ہوتی ہیں جن کے دامن میں انواع واقسام کی خصوصیات کے حامل دریا گرتے ہیں اور پھر سمندر ان مختلف النوع پانیوں کی خصوصیات میں اپنے خونِ جگر کو شامل کر کے ایسے ایسے موتی اور سیپ تخلیق کرتا ہے، جو نہ صرف قابلِ دید بل کہ قابلِ داد بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت بھی ایک ایسا ہی سمندر ہے، جو پہلے مختلف دریاؤں کی خصوصیات کو اپنے اندر سموتا ہے اور پھر اپنی تخلیقِ نو کی صلاحیت کو بروکار لا کر ایسے ایسے موتی اور سیپ تخلیق کرتا ہے، جو نظر کو خیرہ ہی نہیں کرتے بل کہ حیران بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا، جسے اگر ارسطو کے گھر کی طرح "The House of Scholars" کہہ کر پکارا جائے تو کوئی بُری بات نہ ہوگی۔ آپ کے والد سیّد وحید الحسن ہاشمی نہ صرف ایک حساس شاعر ہیں بل کہ ان کو مطالعۂ کتب سے اس قدر شغف ہے کہ ان کے مطالعے کا کمرہ ایک مکمل لائبریری کا منظر پیش کرتا ہے، جہاں سے ہمیں ادب کے ایک مضمون سے متعلق سینکڑوں کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ شبیہ صاحب کے چچا حبیب جون پوری بھی ایک باشعور شاعر تھے۔ مرثیہ ان کی شاعری کی خاص صنف تھی، جس پر انھوں نے طبع آزمائی کی۔ جون پور دراصل لکھنؤ کا ایک نواحی علاقہ ہے، جہاں سے آپ کا تعلق تھا۔ اسی مناسبت سے آپ اپنے نام کے ساتھ ''جون پوری'' لگاتے تھے۔ شبیہ صاحب کے دادا سیّد شبیر حسن بھی شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ غرضیکہ علم واَدب سے دل چسپی آپ کے لیے کوئی نئی بات نہیں بل کہ اَدب اور شاعری تو آپ کے گھر کی باندی ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے لکھنے لکھانے کا آغاز کیا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر سے

مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرنا شروع کیے۔ شاعری کی ابتدا تو اس سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ باقاعدہ تنقیدی مضامین کی تحریر کا آغاز انھوں نے یونیورسٹی میں ایم۔اے کے دوران کیا اور اب تک نہ صرف جاری ہے بل کہ اس میں مزید تندی و تیزی آ چکی ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تصنیف کردہ کتب میں ''آلِ رضا کے فنِ غزل گوئی'' ایک تحقیق و تنقید پر مبنی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ''مفاہیم'' اور ''ترجیحات'' دونوں مختلف موضوعات پر مبنی تنقیدی مقالات ہیں۔ شبیہ الحسن کے قلم کے کرشمے ''شام و سحر کی باتیں'' کی شکل میں ہمارے سامنے آئے۔ یہ کتاب ''شام و سحر'' کے عصری شعور کے حامل اداریوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی غیر مطبوعہ تصانیف میں ''آلِ رضا کا غیر مطبوعہ کلام'' کی تدوین اور ''لکھنؤ کی اُردو شاعری۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک'' تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مرتبہ کتب میں ''بجھی وہ شمع'' نسیم امروہوی کی شخصیت اور فن پر مبنی جامع کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ''بیسویں صدی کا شعری ادب'' کے نام سے مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ آپ کے والد سیّد وحید الحسن ہاشمی کے تحریر کردہ مرثیوں کی تدوین ''العطش'' حصہ اوّل، حصہ دوم اور حصہ سوم کی صورت میں آپ نے کی ہے۔ قیصر بارہوی کے ''منتخب مرثیے'' مرتب کیے اور پھر قیصر بارہوی کے ہی ''معتبر مرثیے'' کی تدوین کے علاوہ ان کا ایک مرثیہ ''آیاتِ آمنہ'' کے نام سے شائع کیا۔

حال ہی میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ایک گراں قدر نئی تخلیق ''آغا صاحب'' طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات اور فن پر ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ایک جامع کتاب ہے، جس میں ڈاکٹر آغا سہیل پر ان کی مختلف تصانیف کے حوالے سے تقریباً ۵۰، ۵۵ صفحات پر مشتمل مقدمہ کے علاوہ آپ نے ''آغا صاحب'' کو ۹ ر ابواب میں تقسیم کیا ہے، جن کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے:

۱۔ تعارف	۲۔ شخصیت	۳۔ خاکہ
۴۔ افسانہ	۵۔ تنقید	۶۔ سفرنامہ
۷۔ ناول	۸۔ گفت گو	۹۔ تبصرہ

پہلے باب کے دو حصے ''آغا سہیل۔ ایک نظر میں'' اور ''آغا سہیل۔ عہد بہ عہد'' ہیں۔ اس کتاب کا ''مقدمہ'' اور پہلا باب ہی اس کتاب کی جان ہیں۔ مصنف نے اس پہلے باب کے پہلے حصے میں آغا صاحب کا نام، ولادت اور پتہ سے لے کر مختلف عنوانات کے تحت ان کی علمی و اَدبی کاوشوں اور علم و اَدب پروری کا مختصر مگر جامع مرقع پیش کیا ہے۔

دوسرے حصے میں پیدائش سے لے کر اب تک کے حالات پیش کیے گئے ہیں، جو مصنف کی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

دوسرا باب ''شخصیت'' تین حصوں ''میں کون ہوں، کیا ہوں''۔ ''آغا سہیل۔ چند باتیں چند یادیں'' اور ''آغا سہیل۔ میرا دوست'' بالترتیب ڈاکٹر آغا سہیل، احمد ندیم قاسمی اور شور صہبائی کے تحریر کردہ مضامین ہیں۔ جس میں ان کی شخصیت کے مختلف، دل چسپ و حسین پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

تیسرے باب ''خاکہ'' میں چند معتبر مصنفین نے نہایت دل چسپ و پُرخلوص پیرائے میں آغا سہیل صاحب کے خاکے پیش کیے ہیں، جو کچھ اس طرح ہیں:

۱۔	آغا سہیل۔ پوٹریٹ	احمد جمال پاشا
۲۔	ٹوسرو دلو	ڈاکٹر سلیم اختر
۳۔	ایک نستعلیق	رحیم گل
۴۔	آغا سہیل	احمد عقیل روبی
۵۔	آغا سہیل کی خوشبو	ڈاکٹر اجمل نیازی
۶۔	آغا سہیل	محمد ظہیر بدر

چوتھا باب افسانے سے متعلق ہے۔ اس باب میں نہایت خوب صورت انداز میں مضامین تحریر کیے گئے ہیں جو کہ بالترتیب اس طرح سے ہے:

۱۔	آغا سہیل کے افسانے	ڈاکٹر محمد علی صدیقی
۲۔	آغا سہیل وقت اور زندگی کے عکاس	ڈاکٹر محمد علی صدیقی
۳۔	آغا سہیل حقیقت سے علامت تک	ڈاکٹر سلیم اختر
۴۔	تل برابر آسمان	ڈاکٹر وحید عشرت
۵۔	آغا سہیل کے افسانوی کردار	ڈاکٹر رئیس قمر
۶۔	پرورشِ لوح و قلم	ڈاکٹر طارق عزیز
۷۔	آغا سہیل کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر فردوس انور قاضی
۸۔	زندگی مزاحمت اور ارتقا	باقر علی شاہ

اس کے بعد ''تنقید'' کا باب آتا ہے۔ کتاب کا یہ پانچواں باب ہے، جس میں پانچ ناقدین کے مضامین شامل ہیں:

۱۔	لکھنوی اُدب میں داستان گوئی	جیلانی کامران
۲۔	داستانی اُدب کے تہذیبی عناصر کی نشاندہی	میرزا ادیب
۳۔	آغا سہیل کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ	ڈاکٹر وفا راشدی

۴۔ آغا سہیل کے تنقیدی نظریات　　　پروفیسر عبدالکریم خالد

۵۔ آغا سہیل کے تنقیدی افکار　　　باقر علی شاہ

''سفرنامہ'' سے متعلق چھٹا باب تین مضامین پر مشتمل ہے۔ ''اُفق تا بہ اُفق'' کے نام سے جیلانی کامران نے ڈاکٹر آغا سہیل کے اس سفرنامے پر تنقید کی ہے۔ اسی سفرنامے پر ڈاکٹر انیس ناگی نے بھی بعنوان ''آغا سہیل کا سفرنامہ۔ اُفق تا بہ اُفق'' اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''آغا سہیل کے دو سفر نامے'' کے نام سے جعفر علی نے ہمیں اپنے نادر خیالات سے نوازا ہے۔

''ناول'' کے نام سے ساتویں باب میں ڈاکٹر خالد اشرف نے ''آغا سہیل کے ناول'' کے نام سے ایک تنقیدی مضمون تحریر کیا ہے۔

آٹھواں باب میں ''گفت گو'' کے عنوان سے چار مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ اس میں براہِ راست انٹرویو کے انداز میں ڈاکٹر حسن رضوی، زاہد بشیر، طاہر مقصود اور سعدیہ شفقت نے بیش قیمت خدمات پیش کی ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ ''تبصرہ'' کے عنوان پر مشتمل ہے، جس میں مختلف ناقدین نے اپنی نادر آراء سے نوازا ہے، جو کہ انھوں نے مختلف مواقع پر رسائل و کتب میں دیں۔

قدرت کی ہر پیدا کردہ شے، خواہ وہ شکل و صورت میں کتنی ہی بھدی اور بدشکل کیوں نہ ہو، اپنے اندر ایک قسم کا حُسن اور جاذبیت سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مرتّب کردہ کتاب ''آغا صاحب'' ایک ایسی ہی کتاب ہے، جو کہ نہ صرف ظاہری حسن بل کہ باطنی حسن کی بھی حامل ہے۔ اس کا اندازہ اس کے مطالعے سے خود بخود ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کوئی لمحہ بھر کا فیصلہ نہ تھا اس کا خیال شبیہ صاحب کے دُوراندیش ذہن میں کافی عرصہ قبل پرورش پا رہا تھا اور اسی غرض سے انھوں نے ماہ نامہ ''شام و سحر'' میں مختلف ناقدین سے ''آغا صاحب'' پر اور ان کی مختلف اَدبی خدمات پر مضامین لکھوائے اور پھر ۸۰ کی دہائی میں ایک ''آغا سہیل نمبر'' شائع کیا، جس میں مختلف عنوانات کے تحت ان کی اَدبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر آغا سہیل صاحب کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو، جو کہ قارئین کی نظر سے بچ گیا ہو کیوں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب جیسے زیرک اور چاک و چوبند دماغ رکھنے والے شخص نے آغا صاحب کی زندگی کا احاطہ کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو، جو کہ ہماری نظر سے اوجھل ہو سکے اور کتاب کے مطالعے کے بعد قارئین محسوساتی طور پر آغا صاحب کو اپنی نظروں کے سامنے کھڑا پاتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب اپنے مضمون ''ڈاکٹر سہیل آغا۔ چند باتیں، چند یادیں'' میں آغا صاحب کی

شخصیت اور اندازِ گفت گو کو ان موتیوں میں پروتے ہیں:

''......میں تو احباب سے کہا کرتا تھا کہ اگر دلّی کے لہجے سے فیض یاب ہونا چاہتے ہو تو حکیم نبی خان جمال ہویدا سے ملو، اور اگر لکھنؤ کے رسیلے محاورے اور روز مرے سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو ایف۔سی کالج چلے جاؤ اور ڈاکٹر آغا سہیل سے دو چار باتیں کرلو۔ تمھیں نہ صرف لکھنؤ کے لہجے پر بل کہ پوری اُردو زبان پر پیار آنے لگے گا۔''

ڈاکٹر آغا سہیل ایک منفرد شخصیت کے حامل ہیں، جنھیں اس دیس سے بھی پیار ہے، جو انھوں نے ہزاروں قربانیوں کے بعد پایا اور وہ اس مٹی کی خوشبو سے بھی اپنے آپ کو الگ نہیں کر پاتے، جو ان کی جنم دھرتی ہے۔شور صہبائی ''ڈاکٹر آغا سہیل۔میرا دوست'' میں ان حالات کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''......اس کا خمیر لکھنؤ کی مٹی کا مرہونِ منت ہے۔ نتیجتاً لکھنوی تہذیب کا بانکپن اس کے تمدّن کا ٹھہراؤ آغا سہیل کی شخصیت کا نمایاں جزو ہے۔''

جب ہم ان کے خاکوں پر نظر ڈالتے ہیں تو آغا صاحب کے مختلف رُخ ہمارے سامنے آتے ہیں۔وہ اپنے دوست واحباب کی نظر میں ایک الگ شخصیت ہیں۔ایک اُستاد کی حیثیت سے مختلف زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں اور اپنے عزیز واقارب کو مختلف انداز میں برتتے ہیں۔ان کی اس خصوصیت کا اظہار احمد عقیل روبی صاحب اس انداز میں کرتے ہیں:

''......ان کا دوسرا کردار جو انھوں نے ماسک پہن کر کیا، وہ باپ کا کردار ہے۔اس کردار میں دوست کے ضمنی کردار کو شامل کر کے بچوں سے دوستی کی۔ ہیمنگ وے کے ناول "Old Man and the Sea." کا بوڑھا بن کر اپنی اولاد کو اپنے اردگرد بٹھایا اور طوفان سے کھیلنے کے گُر بتلائے۔''

پھر لکھتے ہیں:

''اپنی پوتی کو سکول، بہو اور بیٹی کو کالج پہنچا کر جب وہ ایف۔سی کالج کے ڈی بلاک میں داخل ہوتے تو وہ اپنی زندگی کے اہم اور مقدس ترین کردار کے رُوپ میں ڈھل جاتے۔''

ان کے اخلاق و کردار کا مرقع ڈاکٹر محمد اجمل نیازی اپنے مضمون ''آغا سہیل کی خوشبو'' میں کچھ اس انداز میں کھینچتے ہیں:

''......وہ بہت نرم خُو، ٹھنڈی چھاؤں جیسے انسان ہیں، محبتوں کو ہواؤں کی طرح عام کرتے ہیں۔''

آغا سہیل صاحب کے افسانے ایک خاص ماحول میں پروان چڑھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔اس

ماحول کا آدرش آغا صاحب محسوساتی طور پر رکھتے ہیں اور پھر اپنے کرداروں کے ذریعے اس ماحول کی تشکیل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رئیس قمر اپنے مضمون میں کچھ اس انداز میں رقم طراز ہیں:

''......آغا سہیل کے افسانے پڑھتے ہوئے بار بار مجھے لگا جیسے یہ کہانیاں ابوداؤد کی خودکلامیاں ہیں۔ وہ انتظار کے طویل لمحوں میں اپنے وجود میں جھانکتا ہے۔ اولی الامر کا اور اپنے شہر کے لوگوں کے اعمال کا احتساب کرتا ہے اور جو سچائیاں اس کے ہاتھ آتی ہیں، ان کو حکایت بنا کر بڑی سادگی سے بیان کر دیتا ہے۔''

آغا صاحب کے زندہ کردار جو کہ اسی دنیا کی مخلوق ہیں، کسی ماورائی دنیا کا منظر پیش نہیں کرتے۔ ''پرورشِ لوح وقلم'' میں ڈاکٹر طارق عزیز کا کہنا ہے:

''......آغا سہیل کے افسانوی کردار ہماری روزمرہ زندگی کے کردار ہیں۔ چلتے پھرتے، مرتے جیتے، روتے ہنستے کردار۔ آغا سہیل ان ہی کرداروں کے ذریعے چپکے سے اپنے نظریات کا اظہار کر جاتے ہیں۔''

''آغا صاحب'' میں آغا صاحب کی ادبی تنقید کا احاطہ نہایت خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر جیلانی کامران کا کہنا ہے کہ:

''......ڈاکٹر آغا سہیل نے تنقیدی دلائل کے ذریعے داستانی اَدب کے ارتقاء کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔''

آغا سہیل صاحب کے تنقیدی نظریات اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے تنقیدی نظریات کو پروفیسر عبدالکریم خالد صاحب نے ان الفاظ میں جامہ پہنایا ہے:

''آغا صاحب اَدب کے سائنٹیفک مطالعے پر زور دیتے ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب ہم اجزا کے پیچھے لپکنے کے بجائے ادب کی کلیت کو نگاہ میں رکھیں۔''

یوسف کمبل پوش نے جس باقاعدہ سفرنامہ کی بنیاد رکھی، محمود نظامی نے ''نظر نامہ'' کے ذریعے اس سفر نامہ کو باطنی سفرنامے کی اُونچ تک پہنچایا۔ گو آغا صاحب نے سفرناموں کی ایک فہرست تحریر نہیں کی لیکن انھوں نے دو سفرناموں میں ہی اس صنف میں اپنے مقام کو منوالیا ہے۔

آغا سہیل صاحب کے تحریر کردہ دو ناولوں پر تنقید پر مشتمل ڈاکٹر خالد اشرف کا مضمون اس کتاب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا اہم ترین حصّہ انٹرویوز پر مبنی ہے جس میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب نے آغا صاحب کے ساتھ براہِ راست گفت گو کے ذریعے ان کی شخصیت اور خاص طور پر ادب سے متعلق ان کے نادر خیالات سے فیض یاب ہونے کا موقع مہیا کیا ہے۔

عام طور پر کلاسیک کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کلاسیک سے مراد وہ فن ہے، جو نہ صرف اُس دور میں، جب وہ تخلیق پایا، بل کہ آنے والے دور میں بھی اتنی ہی ضرورت و اہمیت کا حامل ہو، اور اس کی مقبولیت کا گراف گرنے کے بجائے مائل بہ ارتقاء ہو۔ ''آغا صاحب'' ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جس کی ضرورت و اہمیت نہ صرف دورِ حاضر میں ہے بل کہ آنے والے دور میں بھی تشنگانِ ادب کی تشنگی دُور کرتی رہے گی۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے ان خیالات کی تصدیق کرتی ہے:

> ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور علم و فن کے بارے میں متعدد صائب الرائے اہلِ علم کے افکار کو کتابی صورت میں یک جا کر کے پاکستان کی ادبی تاریخ کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے علم و فضل اور فکر و فن کی متنوع جہات ہیں۔ ان سب کو ایک کتاب میں اس سلیقے سے سمیٹنا، آغا صاحب سے مرتب کی عقیدت کے علاوہ ان کی توانا اور ہمہ گیر لگن کا بیّن ثبوت ہے۔ انھوں نے آغا صاحب کی شخصیت کے علاوہ ان کے افسانوں، سفرناموں، ناول، تنقید اور تحقیق کے الگ الگ عنوانات کے تحت دورِ حاضر کی بڑی بڑی شخصیات کے وقیع مضامین اس مجموعے میں شامل کیے ہیں۔ یوں یہ مجموعہ آغا صاحب کی سوانح عمری کا کردار بھی ادا کر رہا ہے اور دورِ حاضر کی ایک اہم ادبی شخصیت کے کمالاتِ فن کے متوازن اذکار سے تاریخ کا ایک الگ باب بھی تکمیل پذیر ہو گیا ہے۔''

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۰ء)

◆◆◆

madlib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور ڈاکٹر آغا سہیل

پروفیسر صفدر نعیم

◆◆

عام طور پر دو صورتوں ہی میں لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ پہلی صورت یہ کہ کسی موضوع یا شخصیت پر بالکل نہ لکھا گیا ہو اور دوسری صورت یہ کہ کسی موضوع یا شخصیت پر بہت کچھ تحریر کیا گیا ہو۔ یہ مضمون لکھتے ہوئے میں دوسری صورتِ حال سے دوچار ہوں۔ عصرِ حاضر کے دو معروف تخلیق کار ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور ڈاکٹر آغا سہیل کے علمی روابط، خاندانی مراسم، مختصر شجرہ نسب، آغا سہیل بطور اُستاد، ڈاکٹر شبیہ الحسن بحیثیت شاگرد اور رفیق کار، ڈاکٹر شبیہ الحسن کا آغا سہیل کے لیے "آغا صاحب" کی شکل میں ارمغاں، "شام وسحر" سے آغا سہیل کا تعلق، خطوط، آغا سہیل نمبر، آغا سہیل کی تصانیف و تالیفات، ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تصانیف و تالیفات، ان تمام پہلوؤں کو نہایت اختصاص کے ساتھ سپردِ قلم کرنے کی طالب علمانہ سی کوشش میں ہوں، ورنہ کہاں ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کا مقام و مرتبہ اور کہاں گمنام راقم الحروف۔

ڈاکٹر آغا سہیل ایک مشہور افسانہ نگار، مقبول سفرنامہ نگار، منفرد ناول نگار، مثالی اُستاد اور معتبر نقاد ہی نہیں بل کہ ایک علم دوست اور شریف النفس انسان بھی ہیں۔ آپ آغا محمد صادق (محمد صادق علی خان) کے ہاں ۶ رجون ۱۹۳۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جدِ اعلیٰ آغا محمد حسن اصفہانی، اصفہان کے محلّے قزلباشاں میں مقیم تھے۔ ابتدائی تعلیم اصفہان میں حاصل کی اور تحصیل علم کے بعد لکھنؤ آ گئے۔ یہاں تفسیر و حاشیہ پڑھانے لگے۔ آغا محمد حسن کے ہاں آغا محمد جعفر نے آنکھ کھولی۔ آغا محمد جعفر کے دو بیٹے تھے جن میں آغا محمد صادق (جن کے جدی پُشتی کو ان کی والدہ نے بدل کر محمد صادق علی خان رکھ دیا تھا) کے ہاں دس بیٹے تولد ہوئے۔ جن میں آغا سہیل کا ساتواں نمبر ہے۔ آغا صاحب کا چھوٹا بھائی (جس کا دسواں نمبر بنتا ہے) اور موصوف حیات ہیں باقی سب ابدی نیند سو چکے ہیں۔ آغا سہیل کی اولاد میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کے شجرۂ نسب کو درج

ذیل جدول کی مدد سے با آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

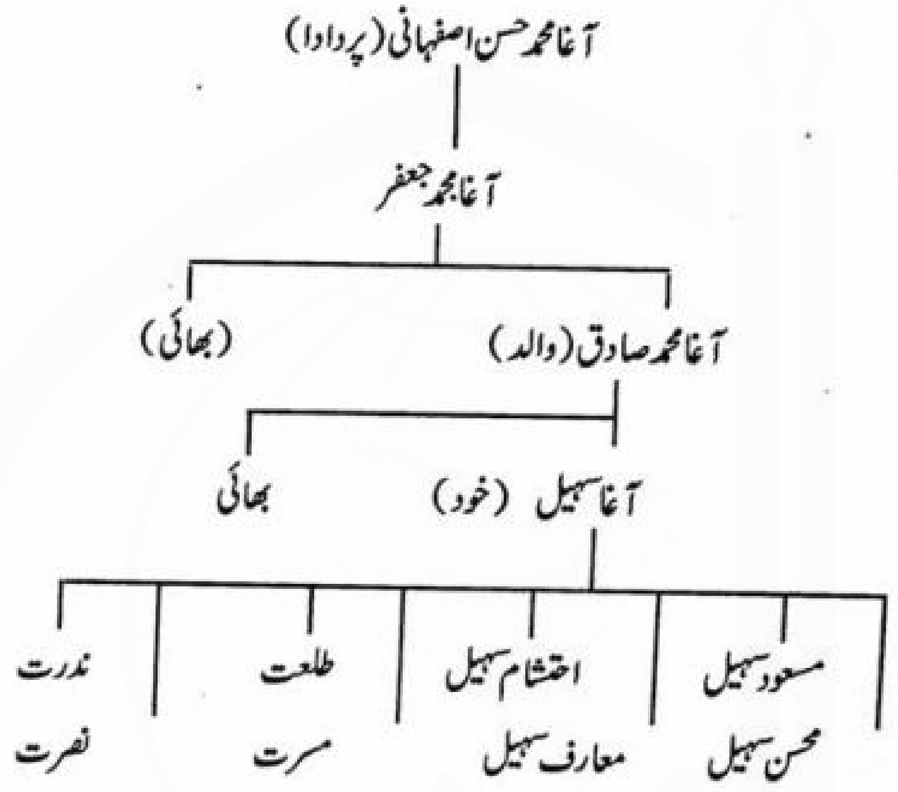

آغا سہیل نے ابتدائی تعلیم گردھاری سنگھ اندر کنور انٹر کالج لکھنؤ سے حاصل کی۔ انٹر میڈیٹ کا امتحان، جوبلی کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔ گریجویشن اور پوسٹ گریجوایشن کی ڈگریاں لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ سے حاصل کیں۔ ۱۹۷۶ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے پہلے مضمون سے ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ اُن کا پہلا افسانہ ''راشی'' الوارث بمبئی کے سیماب نمبر میں شائع ہوا۔

انھوں نے درس و تدریس کا آغاز شیعہ کالجیٹ سکول، لکھنؤ سے کیا۔ بعدازاں مدرس ایڈورڈز کالج، پشاور اور اس کے ساتھ معاون سکرپٹ رائٹر ریڈیو پاکستان، پشاور بھی رہے۔ ۱۹۷۷ء میں گورنمنٹ ایف۔ سی کالج میں صدر شعبۂ اُردو متعین ہوئے۔ ۶/ جون ۱۹۹۳ء کو صدر شعبہ اُردو اور ڈین آف آرٹس کے عہدے سے اپنی ملازمت کا دورانیہ مکمل کرتے ہوئے سبکدوش ہوگئے۔ کچھ عرصہ ڈائریکٹر جنرل اُردو سائنس بورڈ لاہور بھی رہے۔ انھوں نے بہت سے ملکوں کی سیاحی کی جن میں سرفہرست بھارت، ایران، انگلستان، ترکی، ابوظہبی، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ ہیں۔

ڈاکٹر آغا سہیل کی زیرنگرانی ایم۔ اے اُردو کے بہت سے تحقیقی مقالات لکھے جاچکے ہیں اور ان دنوں ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھے جارہے ہیں جن سے اُن کی علم دوستی بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اردو ادب کی ترقی و ترویج کے لیے وہ ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ چناں چہ اسی سلسلے میں وہ سیکرٹری ترقی پسند مصنفین لکھنؤ،

ممبر حلقہ اربابِ ذوق، لاہور اور ممبر بزمِ ہم نفساں، لاہور ہیں۔ ان دنوں اُن کا دولت کدہ ۳۵۵۔اے جوہر ٹاؤن، لاہور میں ہے اور علم واَدب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ علم واَدب کی معتبر شخصیت کی بنا پر انھیں اندرون وبیرونِ ملک بہت سے اعزازات سے بھی نوازا کیا گیا ہے۔

آغا سہیل کی شخصیت کا خاصا ہے کہ وہ آئس برگ کی طرح شانت، پُرسکون، خاموش اور نرم ایسے کہ مکھن بن کر بال کو راستہ دے دیں۔ سخت ایسے کہ پتھر ٹکرائے تو ریزہ ریزہ ہو جائے۔ متوازن رفتار سے مسلسل بے کراں سمندر کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ خود سر لہریں، بے ہنگم شور کرتی موجیں اگر کبھی متحد ہو کر حملہ آور ہوئیں بھی تو ان سے ٹکرا کر ہواؤں میں بکھر گئیں اور بادلوں میں تحلیل ہو گئیں۔

آغا سہیل کی صفات کو سیّد زردوش ترابی نے یوں بیان کیا ہے:

مشفق بھی، مہربان بھی، آغا سہیل ہیں
اُردو کی آن بان بھی، آغا سہیل ہیں
کہسار کی طرح ہے ارادوں میں پختگی
کہنے کو دھان پان بھی، آغا سہیل ہیں
بے انتہا ہے دولتِ اخلاص اِن کے پاس
یارو! وفا کی شان بھی، آغا سہیل ہیں
افسانوی ادب ہو کہ نقدونظر کی بات
اِس کی پھٹک بھی چھان بھی آغا سہیل ہیں
ان کی زبان ہے کوثر و تسنیم سے دُھلی
زردوشؔ خوش بیان بھی آغا سہیل ہیں[1]

اشعار تو بہت تھے مگر باقی اشعار حذف کر دیے ہیں۔

اسی طرح پروفیسر مطلوب عالم نے ڈاکٹر آغا سہیل کے بارے بہت سے اشعار کہے ہیں مگر اُن میں سے صرف چند اشعار آپ کی نذر کرتے ہیں:

اک معلم، اِک مفکر، ایک ادارہ مل گیا
شکلِ آغا میں مجھے میرا مسیحا مل گیا
بے بسی کا اب کوئی شکوہ نہ غربت کا گلہ
جستجو تھی مجھ کو جس کی وہ شناسا مل گیا
کس قدر خوش ہو رہے تھے جن کو دولت مل گئی
میں تھا خوش قسمت کہ آغا سا سہارا مل گیا[2]

ان کی شخصیت میں شرافت، رواداری، مروت اور تحمل شامل ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ چار عناصر ہوں تو آغا سہیل بنتے ہیں۔ یہ چاروں عناصر اُن کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ لڑائی جھگڑا، بدخوئی اور غیبت ان میں ہرگز نہ تھی۔ وہ نرم لہجے کے نرم خو انسان ہیں۔ وہ گفتار کے غازی ہیں بل کہ کم آمیز ہیں۔ فقرہ بازی اور چٹکلوں کے معاملے میں بھی تہی دست ہیں۔ دوست ایسے کہ شکایت ہونے پر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں گے۔ آغا صاحب کے اندازِ گفت گو اور بے لچک رویے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''اگر اندازِ گفت گو کے لحاظ سے آغا صاحب بہت ''پولے پولے'' لگتے ہیں تو اُسلوبِ حیات کے لحاظ سے بہت ہی ''بیبے'' واقع ہوئے ہیں لیکن ''بیبے'' ہونے کا مطلب موم کی ناک بننا نہیں چناں چہ سیاسی اور اَدبی تصورات کے اظہار میں بے باک ہی نہیں، بے لچک بھی ہیں۔ میں متعدد ایسے مواقع کا گواہ ہوں، جہاں انھوں نے محفل کی عمومی فضا کے برعکس جس بات کو حق جانا، بلا جھجک اس کا اظہار کر دیا۔''[۳]

اپنے ساتھیوں کو آگے لانے، انھیں آگے بڑھانے میں آغا صاحب بہت فراخ دل ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کی کامیابی میں اپنی کامیابی کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے حوالے سے ڈاکٹر اجمل نیازی یوں رقم طراز ہیں:

> ''انھیں ہمیشہ زندگی میں درد بانٹنے کا پاس رہا، آغا صاحب کی ایک اور اَدا جو مجھے کھینچ کر اُن کے پاس لے جاتی ہے وہ اُن کی گفت گو کا خوب صورت لہجہ ہے۔ وہ دل سے بولتے ہیں۔ ان کے طرزِ تخاطب میں ایک لاڈلا اُسلوب کہیں سے دَر آتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار نہیں کرتے، ایک ربط ضبط ان کی شخصیت کا حصہ ہے، انھیں اپنی کیفیتوں پر بھی کنٹرول ہے۔''[۴]

آغا سہیل ایک اچھے دوست، اچھے رفیقِ کار، اچھے شوہر، اچھے باپ اور مثالی اُستاد ہیں۔ انھوں نے تقریباً چالیس سال تک درس و تدریس کی خدمت سرانجام دیں۔ پڑھانا اگر عبادت ہے تو یقین جانیے آغا سہیل نے گزشتہ ساری عمر یہ عبادت پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اَدا کی۔ علم و فن کے موتی زبان و بیان کی طشتریوں میں سجا کر طالب علموں کے سامنے یوں پیش کیے کہ طالب علموں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور وہ سوچتے تھے کہ فلک کے ستارے زمین پر کیسے اُتر آئے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر آغا سہیل کے مثالی اُستاد ہونے کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''وہ نرم خو، ٹھنڈی چھاؤں جیسے انسان ہیں۔ محبتوں کو ہواؤں کی طرح عام کرتے ہیں مگر جہاں تربیت کا معاملہ آئے تو وہاں ان کی مستحکم شخصیت ایک اور طرح سے ظہور کرتی ہے۔ شخصیت سازی میں انھیں کمال حاصل ہے اور یہی ایک مثالی اُستاد کا کردار ہے اور آغا صاحب واقعی ایک صاحب

کردار اُستاد ہیں۔''۵

گورنمنٹ ایف ۔سی کالج میں آغا صاحب کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ صدر شعبۂ اُردو اور استاد ادبیات اُردو۔ ایسے جاں فشاں اساتذہ کا ذکر صرف تذکروں میں ہی رہ گیا ہے، جن کے علمی تبحر سے طلبہ بجا طور پر مستفید اور اخلاق و کردار سے مستفیض ہوتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت بچوں کی بہتری، ان کی کردار سازی، ان کا نصاب مکمل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ ان کی اس فکرمندی کے پہلو کو اُن کے دوست اور ماتحت اُستاد محمد ظہیر بدر کے اقتباس سے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ قومی اسمبلیوں کی تحلیل کے بارے میں گفت گو ہو رہی تھی۔ ہر کوئی ملک کے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھا، مگر آغا صاحب کو ان سنگین حالات میں بھی اپنے طلبہ کی پڑی ہوئی تھی۔ بڑے فکرمند لہجے میں فرمایا:

سیاسی بے یقینی کی فضا ہے، ہڑتالیں ہوں گی، جلسے جلوس......''

''جی ہاں! ملکی معیشت پر اس کے بُرے اثرات پڑیں گے۔'' کسی نے لقمہ دیا، مگر آغا جی نے اس کی کہی اَن سنی کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ سال پنجم اور ششم کا ابھی کافی نصاب باقی ہے۔ اگر ہنگاموں، ہڑتالوں کی صورت میں کالج بند ہو گئے تو ان کا نصاب کیسے ختم ہوگا۔''۶

ڈاکٹر آغا سہیل اچھے انسان، مثالی اُستاد، مشہور افسانہ نگار، منفرد ناول نگار، مقبول سفرنامہ نگار، کامیاب سوانح نگار، معتبر نقاد ہیں۔ یہاں میں نے ان کے اچھا انسان اور مثالی اُستاد ہونے کی چند جھلکیاں دکھائی ہیں۔ اگر ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر بات کی جاتی تو یقیناً ایک ضخیم کتاب وجود میں آ جاتی۔ چوں کہ میرا مطمحِ نظر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور ڈاکٹر آغا سہیل ہے۔ اس لیے ان دونوں کی مشترکہ خوبیوں کو سراہتا ہوں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن عصرِ حاضر کے معروف محقق، منجھے ہوئے شاعر، کامیاب معلم، معتبر نقاد اور اعلیٰ منتظم ہیں۔ شعر و اَدب کے حوالے سے وہ ایک خاص شناخت رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق علمی و ادبی خانوادے سے ہے۔ اُن کے دادا صفا الٰہ آبادی تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کے والد سیّد وحید الحسن ہاشمی صاحب طرز شاعر اور مستند نثر نگار ہیں۔ ان کے تایا حبیب جون پوری صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اور آرزو لکھنوی کے براہ راست شاگرد ہیں۔ ان کے دو بھائی سیّد نقاش ہاشمی اور عرفی ہاشمی صاحب دیوان ہیں۔ اُن کے تایازاد بھائی اختر ہاشمی کا شمار کراچی کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ ایسی فضا میں کیسے ڈاکٹر صاحب لفظ شناس نہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے گھر میں شاعری میں گفت گو ہوتی ہے۔ انھیں شعری ذوق ورثے میں ملا۔ اُن کے خاندانی پس منظر کو جدول کی مدد سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

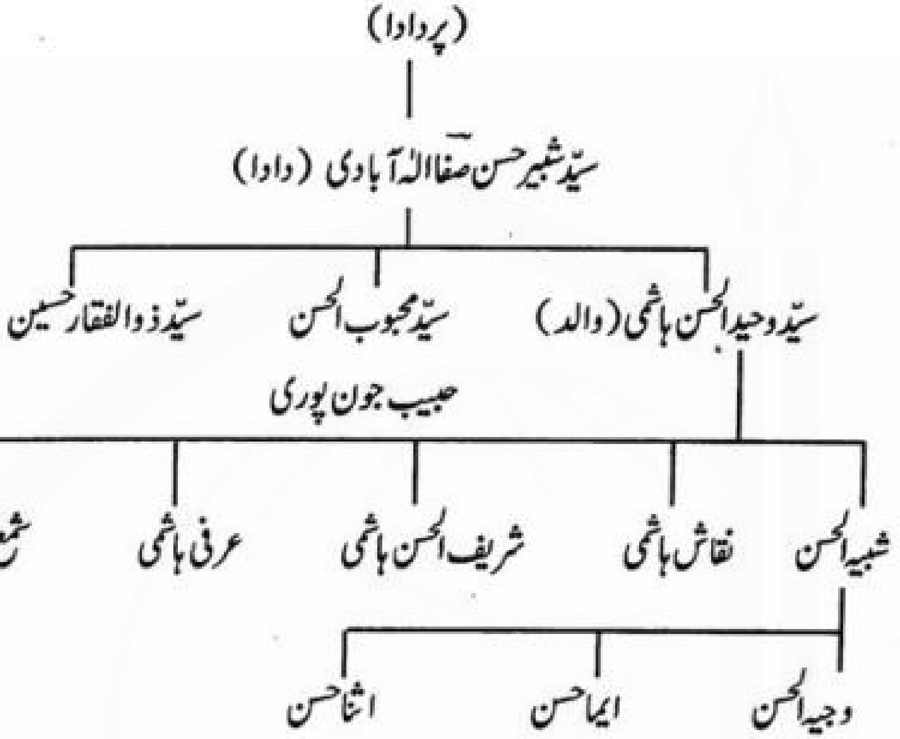

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۸ء کو وحید العصر سید وحید الحسن ہاشمی کے ہاں لاہور میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم مقامی سکول میں حاصل کی پھر قزلباش ہائی سکول لاہور سے میٹرک اور ایف سی کالج لاہور سے ایف۔اے اور بی۔اے کی اسناد حاصل کیں۔

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔اے اُردو کیا اور ''آل رضا کا فنِ غزل گوئی'' کے موضوع پر ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی زیرِ نگرانی تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ ایم۔فل (اُردو) میں آپ نے ''آل رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین کی اور مقالہ سپردِ قلم کیا۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی زیرِ نگرانی ''لکھنؤ کی اُردو شاعری'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۸۲ء میں گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور سے بحیثیت لیکچرار اُردو اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ اب ٹاؤن شپ کالج، لاہور شعبہ اُردو میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

اُردو تحقیق و تنقید اور تدریس میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے صاحبانِ علم و ادب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ان کی بیس سے زائد تصانیف و تالیفات شائع ہو کر اہلِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اُن کی اہم کتابوں میں مفاہیم (مقالات)، ترجیحات (انعام یافتہ)، تصریحات (مقالات)، آل رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق)، باقیاتِ آلِ رضا (تدوین)، کلیاتِ حبیب جون پوری (تدوین)، مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی (تحقیق و تنقید)، آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت و فن)، اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تنقید)، سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں

(تنقید)، جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت اور فن)، العطش (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین)، طاہرینؑ (سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں، منقبتوں اور سلاموں کے مجموعے کی ترتیب و تدوین)۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن پچھلے تقریباً بیس (۲۰) برس سے ماہ نامہ ''شام و سحر'' نکال رہے ہیں جو اَدبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کم و بیش پچیس سال سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز ایف۔ سی کالج لاہور سے کیا۔ راقم الحروف کو ایف۔ سی کالج میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے علمی تبحر سے استفادہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ علاوہ ازیں راقم الحروف کو اُن کے ساتھ بحیثیت رفیق کار درس و تدریس کا شرف بھی حاصل ہے۔ یوں اُن کو بحیثیت اُستاد اور بحیثیت دوست، بہت مشفق اور نرم خُو پایا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تدریسی ملازمت کا آغاز ایف۔ سی کالج لاہور سے کیا۔ انھوں نے تدریسی فرائض پوری ذمہ داری سے سرانجام دیئے۔ اُن کے پڑھانے کا محبت بھرا لہجہ، گفت گو کا انداز، بے ساختہ مثالی اُسلوب اُن کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ ایم۔ اے اُردو کی کلاسز کے لیے اضافی لیکچرز کا اہتمام کیا گیا۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری کلاس (ایم۔ اے اُردو سال اول) کو ''غالب کے تصورِ حسن و عشق'' پر لیکچرز دیئے۔ وہ لیکچرز آج بھی میرے ذہن میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں بل کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب ایف۔ سی کالج کے خوش گوار ماحول میں اپنے علم کے موتی اُسلوب کی طشتریوں میں سجا سجا کر طالب علموں کے ذہنوں میں منقش کر رہے ہیں۔

زبان و اَدب کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ بھی ہیں۔ آپ کا مطالعہ بہت وسیع اور آپ کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ آپ تصنیفی، تحقیقی اور تنقیدی میدان کے شہسوار ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں:

> ''میں ایک تحقیقی مزاج کا حامل طالب علم ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میرے مقالات میں تنقیدی افکار کے ساتھ ساتھ تحقیقی رویوں کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔''[۲]

سجاد باقر رضوی کا کہنا ہے کہ لفظ بھی انسانوں کی طرح ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ لفظ مرتے نہیں، زندہ رہتے ہیں، زندہ رکھتے ہیں اور اچھے ادیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا گھرانہ شروع ہی سے لفظ کو زندگی کا گراں قدر اثاثہ سمجھتا تھا اور سچ کے بیان کے لیے کبھی غزل، کبھی نثر اور کبھی مرثیہ کو اظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس گھرانے کا اہلِ بیتِ عظام سے تعلق بھی نشانِ ظفر مندی بنا ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کے فن اور شخصیت دونوں کو عرفان و آ گہی اور غیبی مدد عطا کی اور آج وہ معتبر تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کو قلم سے پیار اور لفظ سے محبت ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے تنقیدی و تخلیقی رویے اور ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید کی صداقت ان کی آگہی کا وہ خام مال ہے جسے ان کی وراثت، انفرادی خصوصیات اور روایت نے ندرت عطا کی ہے۔ اس رفیع الشان مقام کا خود ڈاکٹر صاحب کو ادراک ہے۔ وہ کہتے ہیں:

مرا وجود ہے تخلیقِ زندگی کا بھرم
میں کائنات کے پیکر میں ہوں رگوں کی طرح ۸

شبیہ الحسن کے والد گرامی سید وحید الحسن ہاشمی نے ایک جگہ فرمایا ہے:

جو جذبہ ہائے شوق چھپائے ہوا تھا مَیں
وہ میرے بعد سب میرے بیٹے میں آ گئے ۹

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو تخلیقی ذہن ورثے میں ملا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا رہے بل کہ انھوں نے برسوں علمی ریاضت کی، محنتِ شاقہ سے کام لے کر تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار نیازی نے ڈاکٹر صاحب کے متعلق بجا فرمایا کہ:

> ڈاکٹر صاحب نے محنت شاقہ سے چھوٹی عمر میں جو علمی و ادبی مقام بنایا ہے اس میں ان کا خونِ جگر شامل ہے۔ اور شاعر کی زبان میں:

ہم چراغوں کی جگہ دل کو جلا رکھتے ہیں
پھر ہواؤں کے مقابل اسے لا رکھتے ہیں ۱۰

سرزمینِ لاہور علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ اس دبستان میں ہاشمی خاندان کی حیثیت مسلّم ہے۔ عرصہ دراز سے علم و ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے سادات کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے یقیناً یہ عطیہ رب ذوالجلال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ادب کے لیے بالعموم اور مرثیہ نگاری کے لیے بالخصوص وقیع کام کیا ہے۔ ان کے تبصرے، تجزیے اور اداریے اور لیکچرز دانش وروں کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور انھیں نئے زاویوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ جب دانش و آگاہی، شعور و ادراک، علم و عقل، جذبہ ہائے شوق میں مجتمع ہوتے ہیں تو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت وجود میں آتی ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے کئی مقامات پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ان کی شخصیت سازی میں ڈاکٹر آغا سہیل کا کردار اساسی اور مثالی رہا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایف سی کالج میں بی۔ اے میں اُردو زبان و ادب کی تعلیم براہِ راست ڈاکٹر آغا سہیل سے حاصل کی۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے ان کی کما حقہ تربیت بھی کی اور ان کی نظریہ سازی میں معاونت بھی کی۔ ڈاکٹر آغا سہیل ترقی پسند نظریات کے حامل تھے اور انھوں نے ڈاکٹر شبیہ الحسن میں

بھی یہ روح پھونک دی تھی کہ حرکت وعمل کے بعد کسی بھی چیز کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ انھوں نے شبیہ الحسن کو کارل مارکس، لینن، سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری اور ممتاز حسین کے افکار و نظریات سے آشنا کیا۔ میرے نزدیک ڈاکٹر شبیہ الحسن میں جو ترقی پسندانہ سوچ ہے وہ ڈاکٹر آغا سہیل کی دین ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل ایک سکالر ہیں اور انھوں نے یہی سکالرشپ شبیہ الحسن میں بھی پیدا کر دی ہے۔ آپ کو شبیہ الحسن کی شخصیت اور تحریروں میں جو ثقالت اور ثقہ پن دکھائی دیتا ہے۔ وہ ڈاکٹر آغا سہیل کا عطیہ ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے شبیہ الحسن کے مزاج میں سنجیدگی اور نظر میں گہرائی و گیرائی عطا کی۔ ان ہی نادر اوصاف کے باوصف ڈاکٹر شبیہ الحسن آج بھی آغا سہیل کے روبرو سر جھکا کر گفت گو کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے آغا صاحب سے اپنی والہانہ محبت کے اظہار میں ماہ نامہ ''شام وسحر'' کا آغا سہیل نمبر نکالا۔ اُن کی پذیرائی کے لیے تحقیقی وتنقیدی کتاب ''آغا صاحب'' (شخصیت وفن) تحریر کی۔ آغا صاحب بھی اُن سے بہت پیار کرتے ہیں۔ یقین جانیے اگر مضمون کی طوالت، وقت کی قلت اور مضمون کا کتاب کی صورت اختیار کرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی علمی وادبی تمام جہات پر تفصیل سے بات کرتا۔ ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن، ڈاکٹر آغا سہیل کے ہونہار شاگرد، اچھے رفیقِ کار اور باوفا دوست ہیں۔ ان کے اندازِ گفت گو، اُسلوبِ حیات، طریقِ نقد، اُصولِ تحقیق اور تدریسی مہارتوں کی تمام کی تمام جڑیں ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت ہی سے نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔

حواشی

۱۔ نزدوش ترابی، سیّد، غزل، مطبوعہ ماہ نامہ ''شام وسحر'' آغا سہیل نمبر، جون ۱۹۹۳ء۔
۲۔ مطلوب عالم، پروفیسر، غزل، مطبوعہ ماہ نامہ ''شام وسحر'' آغا سہیل نمبر، جون ۱۹۹۳ء۔
۳۔ مضمون ''ٹوسر وولو'' ڈاکٹر سلیم اختر، مشمولہ 'آغا صاحب'، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۲۔
۴۔ مضمون، آغا سہیل کی خوشبو، ڈاکٹر اجمل نیازی، مشمولہ: آغا صاحب، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۲۔
۵۔ ایضاً۔
۶۔ مضمون، آغاجی، محمد ظہیر بدر، مشمولہ: آغا صاحب، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۷۔
۷۔ مضمون، ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے لیے چند تحسینی کلمات، ڈاکٹر علی شیر طور، مطبوعہ 'شام وسحر' اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۶۔
۸۔ مضمون، ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ ایک عظیم نقاد'' از پروفیسر خورشید بیگ میلسوی، مطبوعہ ماہ نامہ 'شام وسحر' اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۸۔
۹۔ مضمون، ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ ایک باشعور نقاد، از مظہر حسین اظہر، مطبوعہ ''شام وسحر'' اکتوبر ۲۰۰۶ء۔
۱۰۔ مضمون، ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور ماہ نامہ ''شام وسحر'' از محمد افضل ثاقب، مطبوعہ ''شام وسحر'' اکتوبر ۲۰۰۶ء۔

◆◆◆

العطش

سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا مجموعہ

ڈاکٹر سلیم اختر

◆◆

جس انداز و اُسلوب میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرثیے قلم بند کیے وہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا کہ انھوں نے مرثیہ کی صنف کو یوں نقطۂ عروج تک پہنچایا کہ اپنے مخصوص انداز و اُسلوب کے خاتم بھی ثابت ہوئے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد بھی مرثیہ قلم بند کیا جاتا رہا مگر انیسؔ و دبیرؔ مرثیے کے ایسے کوہِ گراں ثابت ہوئے کہ کوئی بھی مرثیہ نگار ان سے آگے نہ بڑھ سکا۔

بیسویں صدی میں اُردو مرثیہ نے جدید انداز، ہیئت اور اُسلوب اپنایا۔ جوشؔ ملیح آبادی کا مرثیہ ''حسینؑ اور انقلاب'' جدید مرثیہ کا منشور قرار پایا۔ جوشؔ کے بعد آلِ رضاؔ، نجمؔ آفندی، نسیمؔ امروہوی، قیصرؔ بارہوی اور متعدد دیگر مرثیہ گو حضرات نے جدید مرثیہ کے خدوخال سنوارنے کے لیے بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے مرثیہ جیسی قدیم صنف کو بدلتے زمانہ کے متغیر تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی بھی اسی کہکشاں کے کوکبِ تابندہ ہیں۔ ۷۵ سالہ وحید الحسن نے عمرِ عزیز مرثیے کے گیسو سنوارنے میں بسر کی۔ یوں کہ مرثیہ اور وحید لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے۔

ہاشمی صاحب نے پہلے علامہ سہیل بلگرامی سے اور ان کے انتقال کے بعد سیّد آلِ رضاؔ سے اصلاح لی۔ یاد رہے کہ سیّد آلِ رضاؔ آرزوؔ لکھنوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ آرزوؔ لکھنوی کا شاعرانہ مقام تو مسلّم، وہ زبان کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ یہی صفت آلِ رضاؔ اور وحید الحسن ہاشمی کو شاعری میں بھی نمایاں تر نظر آتی ہے۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی کی اب تک کل ۳۵ کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی ''الصراط'' (سلام و

نوحہ) اور ۲۰۰۵ء میں چالیس مرثیوں کا کلیات ''العطش''۔ سلام، نوحہ، منقبت، غزل، نظم اور مرثیہ کے ساتھ مرثیہ کے حوالے سے انھوں نے بیش قیمت تحقیقی اور تنقیدی کام بھی کیا۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کہ اس مردِ خوش فعال کے فرزندِ خوش اطوار ہیں اور اپنے اوصاف میں منفرد ہیں۔ وہ ماہ نامہ ''شام وسحر'' کے مدیر ہیں اور متعدد کتابوں کے مولف اور مرتب بھی۔ ''العطش'' کے فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے وحید الحسن کی حیات، تعلیم، کیریئر، شاعری اور فنِ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ یوں ''العطش'' کے مراثی کے مطالعہ سے پیشتر مرثیہ نگار سے بھی مفصل تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جدت یہ کی کہ ہر مرثیہ پر کسی ایک معروف ادیب انقاد/ محقق/ شاعر کا تجزیہ شامل کیا ہے یوں مرثیہ، فنِ مرثیہ اور وحید الحسن ہاشمی کے فن کے بارے میں چالیس معتبر حضرات کی آراء یک جا ہو گئیں (کتاب میں ترتیب کے مطابق) فہرست اسماء پیش ہے: ڈاکٹر میمونہ انصاری، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سرفراز حسین قاضی، سید سجاد رضوی، پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر خیال امروہوی، پروفیسر عتیق احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر عبید اللہ خاں، ڈاکٹر محمد صالح طاہر، پروفیسر ہارون قادر، پروفیسر مشکور حسین یاد، ڈاکٹر معراج نیر زیدی، ڈاکٹر نیر صمدانی، ڈاکٹر نواز حسن زیدی، پروفیسر باقر علی شاہ، ڈاکٹر ریاض قدیر، ڈاکٹر ضیا الحسن، شاہد نقوی، ڈاکٹر عارف ثاقب، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر ظفر چشتی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، پروفیسر سجاد حارث، ڈاکٹر نصیر عالم زیدی، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر سحر انصاری، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر ناہید شاہد، ڈاکٹر انور سدید، شہزاد احمد، ڈاکٹر کنول فیروز، ڈاکٹر ہلال نقوی، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر مرغوب حسین طاہر اور ڈاکٹر ناصر بلوچ اور ان پر احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وحید قریشی کی صورت میں دو فلیپ نگار...... یہ مختلف الخیال و مسلک بیالیس حضرات اس امر پر متفق ہیں کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی نہ صرف یہ کہ بہت اچھے مرثیہ نگار ہیں بل کہ انھوں نے جدید مرثیہ کو نیا انداز و اُسلوب بھی دیا۔ احمد ندیم قاسمی کے بقول:

> ''ہاشمی صاحب کے کلام کا مطالعہ کیجیے وہ پورے سانحۂ کربلا کو اس کے صحیح سیاق و سباق کے ساتھ مگر دورِ جدید کے طرزِ احساس کی روشنی میں اتنے کمال سے حق کا پیرایہ عطا کرتے ہیں کہ اردو میں فنِ مرثیہ نگاری عروج کی ایک نئی سطح کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔''

اس پر ڈاکٹر وحید قریشی کی اس رائے کا اضافہ کر لیجیے:

> ''ہاشمی صاحب نے اس صنف کا رشتہ زمین سے استوار کیا جس میں فرقہ پرستی کی تنگ نظری موجود نہیں ہے۔ ہاشمی صاحب نے ان مرثیوں میں اپنے تخلیقی رجحانات کو بھرپور انداز میں پیش کر کے اُردو اَدب میں ایک نئی اور جاندار مثال قائم کی ہے۔ العطش کے یہ مرثیے جدید مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''العطش'' کا سرنامہ یہ بند ہے اور دیکھا جائے تو اس بند میں ہاشمی صاحب نے مرثیہ کے جو خصائص گنوائے وہ بھی سب خود ان کے مرثیوں کی فنی اساس بھی مہیا کرتے ہیں:

فضائے مرثیہ میں درد بھی، دوا بھی ہے ۔۔۔ خدا کی حمد بھی، اعجاز انبیاؑ بھی ہے
وغا کی گونج بھی ہے، صلح کی ادا بھی ہے ۔۔۔ مدینہ بھی ہے، نجف بھی ہے، کربلا بھی ہے
نہیں کلام کہ اس فن میں کیا نہیں ہوتا
مگر رثا جو نہیں، مرثیہ نہیں ہوتا

وحید الحسن ہاشمی نے اگرچہ مرثیہ کی مقبول و مروّج ہیئت یعنی مسدس میں مرثیے قلم بند کیے لیکن انھوں نے اس قدیم مسدس کو جدید تصورات کے ابلاغ کے ذریعہ بھی تبدیل کر دیا۔ چوں کہ امام عالی مقام، شہادت کربلا اور دیگر شخصیات کے بیان میں حقائق سے روگردانی نہ کرنے کے باوجود بھی، ان سب کو آج کی بلیغ علامت میں تبدیل کر دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی جدید مرثیہ کی اساسی صفت ہے کہ وہ 'قدیم' کو 'جدید' کے محدب شیشہ میں پہلے دیکھتا ہے۔ اس ضمن میں 'ناموسِ وفا' 'خلقِ حسن' 'زندگی' 'صبر' 'پردہ' 'انا' 'خودداری' 'جوہرِ وراثت' 'شباب' 'معرفتِ ذات' 'شخص و شخصیت' 'ادب اور ادیب' 'قوم و قومیت' 'قیادت' 'احتساب' اور 'زمانہ' کا بطور خاص تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ ہاشمی صاحب مرثیہ کی تمہید کو روایتی طور پر استعمال کرنے کے بجائے اسے اپنے افکار و تصورات کے ابلاغ کے ذریعہ میں تبدیل کر دیتے ہیں یوں وہ مرثیہ کی ابتدا ہی میں قاری کو ذہنی طور پر اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں، جب ایک مرتبہ قاری ان سے ہم آہنگ ہو گیا تو پھر ترسیل و تفہیم کی منزلیں آسانی سے سر ہو جاتی ہیں۔ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

تہذیب کے چمن میں کھلے بے شمار پھول ۔۔۔ رنگینیِ جمال پہ دل سے نثار پھول
صورت گرِ حیات کے آئینہ دار پھول ۔۔۔ بھاری ہزار خار پہ دو تین چار پھول
اُکھڑی ہوا تو زیست کا نقشہ بگڑ گیا
ہر خار ڈر کے پھول کی پتی میں گڑ گیا

....

اخلاق پر مدارِ شعورِ حیات ہے ۔۔۔ اخلاق اہلِ فکر کی راہِ نجات ہے
اخلاق ہی سے کون و مکاں کا ثبات ہے ۔۔۔ اخلاق اہلِ بیتؑ کے ہونٹوں کی بات ہے
اس کی بقا ہے حق و صداقت کی راہ میں
پلتا ہے یہ مزاج رسالتؐ پناہ میں

....

شمعِ کمالِ حُسن کی اخلاق سے ہے ضو
اخلاق زندگانیِ بزمِ جہاں کی رَو
اخلاق ہی کے نور سے بڑھتی ہے اس کی لَو
اخلاق کی حیات کے عنواں ہیں تُو بہ تُو
دونوں کی احتیاط کا انجام نیک ہے
قرآں کہو کہ خُلق کہو بات ایک ہے

....

وحدت جمالِ کُل ہے تو مظہر ہے زندگی
حُسنِ ازل ہے رُوح تو پیکر ہے زندگی
قدرت ہے جس کا رنگ وہ منظر ہے زندگی
عہدِ اَلست نور ہے محور ہے زندگی
خالق سے اختیار دو عالم لیے ہوئے
اُتری زمیں پہ صورتِ آدم لیے ہوئے

....

آدم کے ساتھ کھل گیا ایوانِ زندگی
جاری ہوا زمیں پہ دبستانِ زندگی
پھیلا ہوا کی طرح سے دامانِ زندگی
بولی زبان ہو گیا اعلانِ زندگی
لفظ و بیاں عدم سے جو آئے وجود میں
شاہد خدا کے نام سے اُبھرا شہود میں

....

دل کی بستی میں جو تنہائی کا اٹھتا ہے دُھواں
وہم ہو جاتا ہے جب بزمِ خیالات کی جاں
اشک جب ٹوٹ کے بن جاتے ہیں نظروں کی زباں
آدمی دَرد سے ہوتا ہے جو مجبورِ فغاں
یوں سنبھل جاتا ہے وہ صبر کی دولت پا کر
جیسے مزدور کو تسکین ہو اُجرت پا کر

....

انساں لیے ہوئے ہے خیالوں کا اک جہاں
وہ تیزیِ نظر کہ ڈرے برقِ بے اماں
دل اختیارِ حضرتِ یزداں کا رازداں
رہ کر مکاں میں خواہشِ دیدارِ لامکاں
جس کو خبر نہیں ہے خود اپنے جہان کی
وہ ڈھونڈنے چلا ہے زمیں آسمان کی

....

ابھری کہاں سے کُن کی ندا کچھ خبر نہیں
لیکن حجابِ قدس ہے کیا کچھ خبر نہیں
مانا ہے کیوں وجودِ خدا کچھ خبر نہیں
اظہارِ ذات کیسے ہوا کچھ خبر نہیں
معنے چھپے ہوئے ہیں حروفِ کتاب میں
ایماں کی پوچھیے تو ہے ایماں حجاب میں

....

یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ اس انداز کی فکر اور اس سے جنم لینے والی نکتہ طرازی کی کمی نہیں۔ دیکھا جائے تو اس اندازِ نظر میں سے مرثیہ کا فکری پہلو مسلّم ہوتا ہے اور وہ وضاحت و بلاغت کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی، سیّد آلِ رضا کے تلامذہ میں سے تھے۔ اس لیے وہ لفظ و معنی کے لطیف رشتہ کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں اگر صرف اُسلوب کی جمالیات کے معیار پر بھی ان کے مرثیوں کو پرکھیں تو وہ کسی بھی لحاظ سے ''کم عیار'' نہ ثابت ہوں گے، وحید الحسن ہاشمی کو اس امر کا ادراک ہے کہ مرثیہ کے مخصوص موضوع اور شخصیات کے بیان میں ندرت صرف اُسلوب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے اس لیے وہ اظہار کی عمدگی پر خصوصی توجہ دیتے ہیں، کسی بھی مرثیہ کا کہیں سے بھی مطالعہ کر لیجیے، ان کی فن کارانہ مساعی کا قائل ہونا پڑتا ہے اور پھر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ افراد و وقوعات کے بیان میں حسبِ ضرورت اُسلوب کا انداز تبدیل ہوتا جاتا ہے ملاحظہ کیجیے چند مثالیں:

اسی شجر میں تو لگتے ہیں جور و جبر کے پھل
مگر ستم تو یہ ہے ظلم بھی ہے ایک عمل
اسی کو کہتے ہیں فرعونیت کا دستِ اجل
اسی سے بنتے ہیں نمرودیت کے تاج محل
عرب کے دشت میں یہ رہنِ تخت و تاج ہوا
پلک جھپکتے ہی سفیانیت مزاج ہوا

....

حیات دیکھ کے ڈرتی ہے اختیار اس کا
بس اک توازنِ طاقت پہ ہے مدار اس کا
پیمبروں نے بھی کھینچا ہے انتظار اس کا
عجائباتِ زمانہ میں ہے شمار اس کا
یہ خوش مذاقیِ فطرت اثر دکھاتی ہے
شباب دیکھ کے پیری بھی گنگناتی ہے

....

حرکت وہ نظر سوز کہ شرمائیں ستارے
احساسِ جوانی کے وہ بے باک نظارے
بندوں کو سمجھتا ہے کہ محکوم ہیں سارے
وہ عیش کے ارمان تکبّر کے سہارے

ہاتھوں میں کمانیں ہیں کوئی تیر نہیں ہے
خواب اس کے مقدر میں ہیں تعبیر نہیں ہے

....

ذہن ناقص ہے تو معدوم ہے امکانِ کمال — متصادم ہیں جب اعصاب تو گھائل ہے خیال
داغ حسرت لیے پھرتی ہے تنگ ظرفیِ حال — پُر بداندیشی کے چھالوں سے ہے رخسارِ جمال
کتنا مذموم ہے یہ اس کا قضا پر الزام
زہر خود کھاتا ہے رکھتا ہے خدا پر الزام

....

اک طرف قلب ہے اولاد کی الفت میں مگن — دوسری سمت وہیں ولولۂ حفظِ وطن
اک طرف دل میں مچلتی ہے شہادت کی لگن — دوسری سمت ہے قربانی جاں سے الجھن
اس طرح سے جو بشر زیست کا آغاز کرے
کشمکش اپنے مقدر پہ نہ کیوں ناز کرے

....

دیکھ کر گہوارۂ اصغرؑ کی جلتی تیلیاں — چوٹ سی دل میں لگی یاد آ گیا اک بے زباں
گردشِ تقدیر کو اپنا بنا کر رازداں — ماں سے پوچھا کچھ خبر ہے میرا بھائی ہے کہاں
جانے کیا گزری صغیرِ سیدِ ابرار پر
یہ سنا ہے مسکرایا تھا اجل کے وار پر

....

شام و کوفہ کے بھرے بازار ہیں اب تک گواہ — کس طرح طے کی علیؑ کی بیٹیوں نے غم کی راہ
سر کے بالوں کی رداؤں سے چھپائے تھیں نگاہ — منہ سے جب نکلا تو نکلا اشھد ان لا الٰہ
مستقل ذہنِ سکینہؑ تھا جو چادر کی طرف
تکتی رہتی تھی چچا عباسؑ کے سر کی طرف

....

قلبِ حسینؑ میں نہ خلش تھی نہ اضطراب — ازبر تھی ان کو شدّتِ احساس کی کتاب
کرنے لگے جو روشنیِ فکر کا حساب — دیکھا تو آس پاس بہتر تھے آفتاب
جن کی ضیا نے موت کے سائے کچل دیئے
لفظِ غروب رہ گیا معنی بدل دیئے

حسینؑ آج بھی زندہ ہے زندگی کی طرح　　قلوب میں ہے محبت کی روشنی کی طرح
شجاعتوں کے سب انداز ہیں علیؑ کی طرح　　لیے ہے دوش پہ بارِ جہاں نبیؐ کی طرح
نفاذِ شرع کی راہوں میں رُک نہیں سکتا
یہ کٹ تو سکتا ہے لیکن یہ جھک نہیں سکتا

''حسین آج بھی زندہ ہیں زندگی کی طرح''...... یہ ابدی حقیقت ہے اور ہر مرثیہ نگار دراصل اس حقیقت کو اپنے اپنے انداز میں اُجاگر کرتا ہے۔ یوں کہ اس اثبات سے وہ اپنے فن کا بھی اثبات کرتا ہے اور یہی اثبات سید وحید الحسن ہاشمی کے فن و وجود کا اثبات ہے :

جب زبانِ قلم نکتہ وراں چلتی ہے
قالبِ سطر میں سورج کی کرن ڈھلتی ہے

◆◆◆

maablib.org

جدید غزل اور اسلم کولسری

ڈاکٹر انور سدید

◆◆

اسلم کولسری کو ابتدائی شہرت ان کے نام کی ارضی نسبت سے حاصل ہوئی۔ میں نے اُردو بازار سے ضلع اوکاڑہ کا بڑا نقشہ خرید کر قصبہ ''کول سر'' تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی تو میں اسلم کی غزل کی طرف متوجہ ہو گیا جس کے معنوی باطن سے روشنی کی نئی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور اسلم کولسری ان کرنوں میں نہاتے اور فطرت سے اکتساب کی ہوئی روشنی کو میری طرف منعطف کر رہے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اسلم کولسری سے ملاقات ہوئی تو مجھے ان کے فطری وجود میں افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی کی دیہاتی روح موجود نظر آئی جو ان کے افسانوں کے باطن میں سما جاتی ہے اور لوگ دریافت کرتے ہیں کہ نقوی صاحب زندگی میں اتنے ہی شریف ہیں جتنے اپنے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ اسلم کولسری کی غزل بھی ان کے داخل کے انسان کی عکاس ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا جو سفر ۱۹۷۹ء میں ''نخلِ جاں'' سے شروع کیا تھا وہ اب کاش، ویرانہ، نیند، جیون، برسات، عنبر، پنچھی اور ایک نظر کافی ہے'' سے بھی آگے نکل گیا ہے اور ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ اپنی تحقیقی نگاہ کا رُخ اسلم کولسری کی طرف پھیر دیا اور زیرِ نظر کتاب ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' تالیف کی جس میں شاعر اپنی ذات میں پوری کائنات سمیٹے ہوئے موجود نظر آتا ہے اور اس عہد کے نامور نقاد اس کی ۱۹۷۹ء سے لے کر زمانہ حال تک کی شاعری پر تنقید و تبصرہ ہی نہیں کر رہے بل کہ مدلل انداز میں اسلم کولسری کی تخلیقی خوبیوں کا اعتراف کر رہے ہیں اور حیرت زدہ ہیں کہ جو شخص ۱۹۶۳ء میں ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ میں ایک عام مزدور تھا وہ آج اُردو سائنس بورڈ میں ڈپٹی ڈائریکٹر کی مسند پر بیٹھا ہے۔ لیکن انھیں سماجی و تہذیبی وادبی امتیاز ان کی شاعری سے حاصل ہوا ہے جو فطرت کی آواز ہے۔ غیب سے اُترتی ہے اور اسلم کولسری کے قلم کی ضرب سے نوائے سروش بن جاتی ہے۔ یہ کتاب اسلم کولسری کی زندگی اور ان کی شاعری کے تعارف کی

کتاب ہے۔ان کی نمائندہ غزلوں کا انتخاب آخر میں دیا گیا ہے اور اس سے ہم شاعر کے باطن میں بھی جھانک سکتے ہیں۔ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ کتاب لکھ کر ایک استغنا پسند شاعر کے مقام فضیلت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی عظمت پر زمانے کی مہر بھی ثبت کر دی ہے۔اس کتاب میں زمانہ بھی موجود ہے اور اسلم کولسری اس زمانے کو فتح کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔کتاب کی ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت ۲۰۰ روپے۔ ملنے کا پتہ القمر انٹر پرائز، اُردو بازار۔لاہور

(روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، ۱۲ نومبر ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا ایک وقیع کارنامہ

جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ

ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی

◆◆

''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' اسلم کولسری کی شعری کائنات پر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تنقید ہے۔ اسلم کولسری کم و بیش ربع صدی سے جگر لخت لخت کو ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اسلم کولسری کے اس شعری سفر کے نشیب و فراز کو ایک محقق اور نقاد کی نظر سے دیکھا ہے۔ اسلم کولسری نے اپنے خونِ جگر سے گلشن شعر و سخن کی جو آبیاری کی اس کے نتیجے میں ''نخلِ جاں'' (۱۹۷۹) ''کاش'' (۱۹۹۲) ''ویرانہ'' (۱۹۹۵) ''نیند'' (۱۹۹۵) ''جیون'' (۱۹۹۶) برسات (۱۹۹۷) ''عنبر'' (۲۰۰۱) اور ''پنچھی'' (۱۹۹۵) ایسے گل ہائے رنگا رنگ اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان تازہ گلابوں سے اپنی شامِ جاں کو معطر کیا اور اس خوشبو کو قارئین ادب تک منتقل کرنے کے مشکل اور محنت طلب فرض نقابیہ کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' محض ایک تنقیدی کوشش ہی نہیں بل کہ نقاد نے تیشۂ تنقید استعمال کرنے سے قبل تحقیق کے نشتر کو بھی نہایت سلیقے سے آزمایا ہے۔ چناں چہ اسلم کولسری کی شاعری پہ تنقید کرنے سے پہلے انھوں نے شاعر کی سوانح مطبوع اور زیرِ طباعت تخلیقات اور اسلم کولسری کے فنِ شاعری کے معترف ناقدین اور دانشوروں کی آرا کو بھی شاملِ کتاب کیا ہے اگر چہ کتاب میں اسلم کولسری کے اب تک کے شعری سفر کا ہر سنگ میل شامل ہے لیکن کتاب کا عنوان ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' اس حقیقت کی جانب بلیغ اور بین اشارہ ہے کہ جدید غزل ہی اسلم کولسری کا شعری اختصاص ہے۔ معروف جدید غزل گو عباس تابش کا یہ قول اسی موقف کی تائید کرتا ہے کہ:

''اسلم کولسری کی غزل کو جدید غزل نہ کہنا تنقیدی ناانصافی ہوگی۔ فکری اعتبار سے اسلم کولسری اس طبقے کی نمائندگی کر رہا ہے جہاں تک بیشتر ادیبوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی''۔

کتاب کے آغاز میں نقاد نے ''صرف ایک بات'' کے عنوان سے ان اسباب وعلل کا ذکر کیا ہے جنھیں اس کتاب کی تخلیق کے جواز کا درجہ حاصل ہے۔ یوں تو اسلم کولسری کے اس شعری سرمائے کو بارہ ابواب (رخ) میں تقسیم کیا گیا ہے تاہم موضوعی اعتبار سے اسے تین حصوں میں بھی تقسیم کرنا غلط نہ ہوگا۔

پہلے حصے میں اسلم کولسری کے سوانحی کوائف کی تفصیل محققانہ انداز میں پیش کی گئی ہے دوسرا حصہ اسلم کولسری کے مجموعہ ہائے کلام پر تنقید ہے اور ہر مجموعہ کلام پہ باری باری تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کہنہ مشق نقاد ہیں۔ ان کے تنقیدی شعور کی تربیت اور آبیاری میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور ڈاکٹر خواجہ زکریا جیسے ادب کے نوگزوں کا خون جگر شامل ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی بیسیوں تنقیدی کتب شایع ہو چکی ہیں۔ اسلم کولسری کے شعری سرمائے پر تنقید اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ انھوں نے اسلم کولسری کے پہلے مجموعہ کلام ''نخل جاں'' سے تنقیدی سفر کا آغاز کیا اور پنچھی پر جا کر سانس لیا ہے۔ تاہم اختصاصی پہلو یہ ہے کہ ہر مجموعہ کلام پر تنقید کا آغاز کرنے سے قبل وہ اس کے سن اشاعت' سر ورق کی تفصیل ناشر' دیباچہ/ فلیپ لکھنے والے کا نام۔ انتساب۔ غزلوں کی تعداد اور ہر غزل کا مصرع اولیٰ غرض یہ کہ مجموعہ کلام کا ''شجرۂ نسب'' بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور یوں اسلم کولسری کے فن پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک معتبر حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تنقید کے دوران قارئین کی دل چسپی اور اسلم کولسری کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں جا بجا معتبر ناقدین کی آرا کو بھی شامل کیا ہے۔ ان میں مرزا ادیب، ڈاکٹر وزیر آغا' ابوالاعجاز حفیظ صدیقی' افتخار عارف' ظفر اقبال' شہزاد احمد' بانو قدسیہ، امجد اسلام امجد، پروفیسر عارف عبدالمتین، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر آغا سہیل، مشفق خواجہ' ڈاکٹر سعادت سعید' ڈاکٹر سرفراز حسین قاضی' ڈاکٹر ریاض قدیر' سید ضمیر جعفری' ڈاکٹر طارق عزیز' خالد اقبال یاسر' عطاالحق قاسمی اور سید وحید الحسن ہاشمی ایسے مستند اور معتبر ناقدین شامل ہیں۔

اس شعوری کوشش سے کتاب کے تنقیدی اعتبار میں مزید اضافہ بھی ہوا ہے اور شعر وادب کی دنیا میں اسلم کولسری کے فن کی مقبولیت اور پزیرائی کی پوری گواہی بھی مہیا ہوگئی ہے۔ تیسرے حصے میں ''اسلم کولسری کا شعری اختصاص'' کے عنوان سے اسلم کولسری کی غزل کو جدید غزل کے تناظر میں پرکھا اور اس پر محاکمہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اسلم کولسری کو جدید غزل کی اس روایت سے لا جوڑا ہے جس کا آغاز حالی نے کیا ور یہ روایت ظفر اقبال تک پہنچی تاہم اسلم کولسری کے جدید غزل سے مراد محض روایت شکنی یا روایت دشمنی نہیں بل کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا موقف یہ ہے کہ:

''ان کا بنیادی مزاج کلاسیکی ہے وہ جدت کے شوق میں نہ تو اپنی شاعری میں ابہام پیدا ہونے دیتے ہیں اور نہ ادھوری بات کر کے قاری کے ذہن کو عدم تحفظ کا شکار کرتے ہیں''۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اسلم کولسری کی جدید غزل کے بارے میں جو تنقیدی نظریات پیش کیے ہیں ان کی بنیاد ان اشعار پر ہے جو اس کتاب میں حوالے کے طور پیش کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں شاعری کے بعض اہم فنی محاسن کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔ اگرچہ تحسینِ شعری کا یہ ''پوسٹ مارٹم'' محدود ہے تاہم بحروں' قافیوں اور ردیفوں کے موزوں انتخاب اور استعمال کی چند مثالوں سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلم کولسری کی مجموعی شاعری کا ذائقہ کیا ہے؟

اسلم کولسری کی غزل پر تنقید کرتے وقت نقاد نے خود کو کسی ایک دبستانِ تنقید سے منسلک کرنا مناسب خیال نہیں کیا کہ اس صورت میں تنقید کے پروں کو سمیٹنا پڑتا ہے۔ اور پرواز میں کوتاہی کا خطرہ بہرحال موجود رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہ تنقید مختلف دبستانوں کے مثبت پہلوؤں کا حسین امتزاج ہے۔

عام طور پر تخلیق کار نقادوں کو اپنی مقبولیت کے راستے کا بھاری پتھر خیال کرتے ہیں۔ انھیں ناقدین سے یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ قارئین کی آتشِ شوق تنقید کی برف سے سرد پڑ سکتی ہے لیکن ڈاکٹر شبیہ الحسن کی جانب سے اسلم کولسری کو ایسا تو کوئی خطرہ نہیں اس لیے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کتاب کے آخر میں جو ''انتخاب'' پیش کیا ہے وہ قارئین کے ذوقِ مطالعہ کے لیے مہمیز سے کم نہیں امید ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقید سے قارئین اسلم کولسری کی شاعری کے مکمل متن تک رسائی حاصل کرنے کی آتشِ شوق مزید بھڑک اٹھے گی۔ پھر ہو سکتا ہے اسلم کولسری کی یہ تمنا بر آئے:

اے شہر کوئی چہرہ اسلم کی غزل جیسا
کم کم سا نیا نکھرا' کم کم سا کلاسیکی

اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے فلیپ پر بہت خوب اور وقیع رائے دی ہے۔ یہ رائے ایک جانب تو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے علمی کارناموں کا احاطہ کرتی ہے اور دوسری جانب اسلم کولسری کی شعری عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن' ایک باصلاحیت اور ہوش مند نقاد ہیں' انھوں نے اسلم کولسری کے حوالے سے ایک ایسی منفرد کتاب پیش کی ہے جو بیک وقت شاعر کی غزلوں کا خوب صورت انتخاب بھی ہے' اس کے سوانحی کوائف اور شعری کارکردگی کا بیان بھی اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی۔''

اسلم کولسری کے ہاں' کلاسیکی اُسلوب کے بجائے جدید لب ولہجہ اُبھرا ہے جو اس کے معاصرین کے

اُسلوبِ شعر سے مختلف ہے۔ اس کے ہاں اردگرد کی اشیا اور مظاہر کو ایک بچے کی سی حیرت سے دیکھنے کا اندازہ ملتا ہے جو ایک نادرونایاب عطیہ ہے۔ اس کے اندر ''بچپن'' پوری طرح آباد ہے اور چوں کہ یہ بچپن دیہاتی فضا میں پروان چڑھا ہے' اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی شاعری میں ''بچپن'' اور ''گاؤں'' ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ یہی گاؤں جب شہر کے رُوبرو آیا ہے تو عکسوں کے ایک ایسے سلسلے نے جنم لیا ہے جو اسلم کولسری کی شاعری کی پہچان ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے' اپنی اس قابلِ قدر کتاب میں' اسلم کولسری کو متعدد سطحوں پر دریافت کر کے' ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے' کم ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے تنقیدی شعور کے حوالے سے اسلم کولسری کا شعری سرمایہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے لیکن کمال ہنرمندی سے اس سرمائے کو لاکر Locker' کی صرف ایک چابی گھمائی ہے اور دوسری چابی قارئین کو تھما دی ہے تاکہ انھیں خود اس خزینے کو کھوجنے کی لذت سے آشنا کیا جا سکے۔

''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' دراصل ایک معتبر نقاد کی ایک مستند شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعیِ مشکور ہے امید ہے قارئین ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقید کے آئینے میں اسلم کولسری کی شخصیت اور ان کے شعری سرمائے کا عکس دیکھنے کے موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔

◆◆◆

جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ

صفدر نعیم

◆◆

''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تازہ تنقیدی تصنیف ہے، جس میں انھوں نے ان کے طبع شدہ شعری مجموعوں کی روشنی میں ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس تنقیدی کتاب کا انتساب عصر حاضر کے تین نامور ناقدین ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر نواز حسین زیدی اور ڈاکٹر عباس رضا کے نام ہے۔خوب صورت کتابیں چھاپنے کے دعوے دار ''القمر انٹر پرائز لاہور'' نے حال ہی میں اسے شائع کیا ہے اور یہ سوا تین سو (۳۲۵) صفحات کو محیط ہے۔حرفِ آغاز مصنف کے موقلم کا شاہ کار ہے۔اس سے پہلے کہ کتاب پر بات کی جائے مصنف کا مختصر تعارف کروائے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک معروف محقق اور مستند نقاد ہیں۔وہ ایک علمی و ادبی گھرانے کے فرد ہیں۔ان کے دادا سیّد شبیر حسن صؔفا تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ان کے والد سید وحید الحسن ہاشمی صاحب طرز شاعر اور مستند نثر نگار ہیں۔ان کے تایا حبیب جون پوری صاحب دیوان ہیں۔ان کے تایا زاد بھائی اختر ہاشمی کراچی کے اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں گویا ڈاکٹر شبیہ الحسن کو شعری ذوق ورثے میں ملا۔ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی سحر انگیز شخصیت اور علمی تبحر نے ان کی شخصیت کو نکھارنے میں اساسی کردار اَدا کیا۔وہ اُردو تحقیق، تنقید اور تدریس میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔انھوں نے بہت کم عرصے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر صاحبانِ علم و ادب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ان کی بیس (۲۰) سے زائد تصنیفات و تالیفات شائع ہو کر قارئین ادب سے داد وصول کر رہی ہیں۔حال ہی میں ان کی شائع ہونے والی تنقیدی تصنیف نے ناقدین اور قارئینِ اُدب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے لہٰذا اب ہم اس کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' اس حوالے سے دوسری تصنیفات سے منفرد ہے کہ اس

میں اسلم کولسری کے تمام شعری مجموعوں کا انتخاب اور ان پر تنقیدی بحث بھی کی گئی ہے۔ ابتدائی حصے میں معروف ناقدین کی آراء شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں ان کے شعری مجموعوں کے حوالے سے ان کی شعری جہتوں کے بارہ رخ متعین کیے ہیں۔ پہلے رخ میں ان کے سوانحی کوائف اور اعتراف، دوسرے رخ میں ان کے شعری سفر کا آغاز ''نخلِ جاں'' تیسرے رخ میں شعری تیقن کا نمائندہ ''کاش'' چوتھے رخ میں انسان دوستی کا مظہر ''ویرانہ'' پانچویں رخ میں پُر ملال اور اُداس کیفیتوں کا اظہار ''نیند'' چھٹے رخ میں فلسفیانہ رخوں کا عکاس، ساتویں میں جدید لسانیاتی رویوں کا مظہر معبر سات، آٹھویں رخ، عصر حاضر کے نمائندہ معاملات کا بھرپور اظہار ''عنبر'' نواں رخ پنجابی کی اولین شعری تخلیق ''پنچھی'' دسواں، ترجے میں تخلیق کے لطف کا مظہر ''ایک نظر ہی کافی ہے'' گیارھواں اسلم کولسری کا شعری اختصاص، بارھواں رخ ان کی نمائندہ غزلوں کا انتخاب۔

کتاب کے مندرجات سے اسلم کولسری کی زندگی اور شخصیت کے متعلق نہایت نادر معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک معمولی گھرانے میں جنم لینے والے معمولی انسان نے اپنے اندر غیر معمولی خصوصیات پیدا کر کے ان کو پروان چڑھایا۔ اسلم کولسری کا اصل نام محمد اسلم جب کہ قلمی نام اسلم کولسری ہے۔ قصبہ ''کولسر'' کی نسبت سے انھوں نے کولسری کہلوانا پسند کیا۔ وہ یکم اگست ۱۹۶۲ء کو چک نمبر ۱۶۔۴/ اپریل کولسر تحصیل اوکاڑہ ضلع ساہی وال میں چوہدری رحمت علی (مرحوم و مغفور) کے ہاں پیدا ہوئے۔ انھوں نے میٹرک کا امتحان اپنے قریبی گورنمنٹ ہائی سکول ۱۵۸۔۵ اپریل گنوں تحصیل و ضلع ساہی وال سے پاس کیا۔ ایف۔اے، بی۔اے اور ایم۔اے کے امتحانات پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیے۔ ملازمت کا آغاز ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ سے کیا۔ بعد ازاں جامعہ مدینہ پرائمری سکول کوٹ لیاقت حیات، اوکاڑہ میں بطور اُستاد، عرفان فارمیسی اوکاڑہ میں لیبارٹری اسسٹنٹ، ثاقب کاٹن انڈسٹریز، اوکاڑہ میں آفس منیجر، روزنامہ ''مشرق'' لاہور میں سب ایڈیٹر، اُردو سائنس بورڈ، لاہور میں ریسرچ آفیسر اور ان دنوں بھی اُردو سائنس بورڈ میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اسلم کولسری فطری شاعر ہیں۔ ان جیسی نابغہ روزگار شخصیات صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں جو اپنے کام، کردار اور اپنے بے پناہ خلوص سے ایک زمانے کو متاثر کرتی ہیں۔ ان کی شاعری فکری پیغام لیے ہوئے ہے۔ ان کا لہجہ تندرست اور آواز توانا ہے۔ وہ پُر اُمید شاعر ہیں اور اپنے قاری و سامع کے دل میں بھی زندگی کرنے کی خو پیدا کر دیتے ہیں۔ امجد اسلام امجد ان کی غزل کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''غزل اسلم کولسری کا فطری ذریعۂ اظہار ہے۔ اس کا نظامِ فکر، اُسلوب، پیرایۂ بیان، افتادِ طبع، نفاست طباعی اور جودتِ فکر سب کے سب عناصر غزل روی ہو کر چلتے ہیں۔ اس کی شخصیت کی سادگی، گہرائی، متانت، درویشی اور کم آمیز مگر مستحکم دوست داری نے اس کے ہاں ایک ایسے

لہجے کو تشکیل دیا ہے جو سہل ممتنع ہونے کے باوجود پُر کاری سے خالی نہیں۔''

اسلم کولسری ایک منفرد غزل گو ہے۔ سادگی، متانت اور سلاست ان کی شاعری کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کی شخصیت اور شاعری میں تکلف و بناوٹ کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ وہ غیر قیاسی تشبیہات و استعارات بھی استعمال نہیں کرتے بل کہ وہ اپنے دل کی بات سادہ الفاظ اور سادہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ انسان اور انسان دوستی، قومی اور بین الاقوامی حالات، معاشی اور معاشرتی مسائل نے بھی ان کی شاعری پر اپنے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ ان کی شاعری میں عصر حاضر کا رنگ بہت گہرا ہے۔ اسی جدوجہد کے رنگ نے ان کی شاعری کو عہد جدید کے موثر بنایا ہے۔

اسلم کولسری ایک انسان دوست شاعر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ایک جانب تو انسانی معاملات سے رغبت کے پہلو نکلتے ہیں اور دوسری جانب وہ ہر اس چیز سے محبت کرتے ہیں جو انسان کے لیے پسندیدہ ہے۔ وہ انسان درد والم کی کہانیوں کو پہلے ذاتی آشوب کی بھٹی میں پکاتے ہیں اور پھر انھیں عصری آشوب کے سانچے میں ڈھال کر بڑی ہنر مندی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے درج ذیل چند اشعار ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے ذاتی غم کو کس طرح آفاقی بنایا ہے:

کوئی منظر نہ رہا درد کو بھڑکانے کا
قرض اتنا تو نہ تھا شہر پہ ویرانے کا

O

اہلِ دانش نے جہاں خار بچھائے دن بھر
شام کے بعد وہیں رقص ہے دیوانے کا

(ویرانہ)

دوستوں سے بھی شکایت کیا کریں
دشمنوں سے بھی گلہ کوئی نہیں
کیا کہیں اس عہد کج آثار کو
شور کتنا ہے صدا کوئی نہیں

(ویرانہ)

اسلم کولسری نے انسانی درد وغم کو جدید لب و لہجے میں پیش کیا ہے۔ وہ دوسرے جدید شعرا کی نسبت پیچیدہ اور مبہم باتوں سے گریز کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کا اُسلوب بیان دل میں اُتر جاتا ہے۔ ان کے اشعار نشتر بن کر دل میں پیوست ہو جاتے ہیں، یہی طرزِ احساس انھیں دوسرے شعرا سے منفرد کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر

خواجہ محمد زکریا کا کہنا ہے:

''پاکستان میں اُردو غزل نے بے شمار شاعر پیدا کیے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو قدیم روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ متعدد ایسے ہیں جنھوں نے ابہام سے مبرا، پیچیدگی خیال سے دور اور دقیق اُسلوب سے پاک غزلیں کہی ہیں۔ تاہم ان کے ہاں ایسے اشعار بھی آ جاتے ہیں جو ہمیں جذبات کا ترفع عطا کر دیتے ہیں۔ کچھ شعرا نے بہت نئے تجربات کو تخلیق کی بنیاد بنایا ہے اور امیجری سے لے کر ہیئت کی تبدیلی تک بے شمار نئے امکانات کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے...... اسلم کولسری دس پندرہ سال سے صنفِ غزل میں نئے اور منفرد لہجے کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان کی غزل پر جدید غزل کے کسی شاعر کا اثر سرے سے موجود نہیں، ایسا ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ ان کے کئی اشعار ظفر اقبال، شہزاد احمد، مجید امجد، منیر نیازی، شکیب جلالی یہاں تک کہ عدم اور سیف وغیرہ کی بھی یاد دلاتے ہیں مگر اس کے باوجود انھوں نے ایک تازہ لہجہ اور منفرد اُسلوب غزل کو دیا ہے......''

اسلم کولسری کے ہاں رونے دھونے اور اُداسی کی کیفیت ان کے اندر سے ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ناصر کاظمی کی اُداسی کی طرح ان کی اُداسی کی کیفیت بھی کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے، یہاں تک کہ قاری اور سامع کو ذہنی ترفع میں لے جا کر اسے انسانیت کا سبق یاد دلاتی ہے۔ وہ ماضی میں کیے گئے انسانی وعدوں کی بازیافت کرتی ہے کہ انسان انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، ایک دوسرے کی خوشیاں اور غم آپس میں بانٹ لیا کرتے تھے مگر اب صورت حال اس کے الٹ ہو چکی ہے۔ اس کرب کی کیفیت ان کی شاعری میں عیاں ہے:

انسانوں کے ہاتھوں اجڑی بستی میں
راتوں کو لاشوں پر کتے روتے ہیں
کچھ یادیں تو خاصی روشن ہیں، لیکن
کچھ قبروں پر خالی کتبے روتے ہیں
اخباروں کی سطریں دیکھ کے لگتا ہے
جیسے خالی گھر میں بچے روتے ہیں
رات کے پچھلے پہر چلے جب تیز ہوا
خالی گھر کے سب دروازے روتے ہیں

(نیند)

شاعری میں اظہار کی بے ساختگی اسلم کولسری کی پہچان ہے۔ اسلم کولسری کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے کئی بار بیدل حیدری یاد آئے جن کی شاعری میں انسان دوستی اور ترقی پسند اور نظریات نے جگہ پائی ہے چناں چہ

اسلم کولسری کے ہاں بھی ترقی پسندانہ نظریات جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری انسان کو حقیقت پسندی، رنج والم سے خندہ پیشانی اور مصائب ومشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا درس دیتی ہے۔ وہ مزدور کو ہمیشہ پستا ہوا نہیں دیکھ سکتے جیسا کہ ان کی شاعری میں واضح ہے، چند اشعار پیش خدمت ہیں :

کٹ جائے گا پورا دن
شہر کے بھوکے بچے گن
گھر، پھلواری، حسن، غزل
کیا سوچا تھا لیکن
چائے کی اک پیالی ہو
کتنے لمحوں کی ضامن

....

مجھ کو تو نوکری نے بچا ہی لیا مگر
سینے میں ایک پھول سا فن کار مر گیا
اے دوست ایک باہم اگر ہوں تو کس طرح
صدیوں کی دھوپ میرا بدن جذب کر گیا
چوپال کا سکوت سراپا سوال ہے
اسلم وہ جھونپڑوں کا مغنی کدھر گیا

(نخلِ جاں)

اسلم کولسری کا ایک اور اسلوبیاتی وصف یہ ہے کہ وہ منفرد قوافی استعمال کرتے ہیں۔ وہ رائج اور فرسودہ قافیوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں اور جہاں معروف قافیہ آ جائے وہاں وہ نادر خیالی سے اس میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ چند اشعار آپ کی نذر کرتے ہیں۔

جیسے جیون کاٹ رہے ہیں ہم بے خواہش لوگ
گویا پتھر چاٹ رہے ہیں ہم بے خواہش لوگ

....

سینہ ہے کہ بندی خانہ ہے، دیکھو تو سہی بیدادگری
ہر آن یہاں پر ہوتا ہے اک سانس مقید ایک بری

عرصہ افلاس میں کیا دوستی کیا دشمنی
آشنا، نا آشنا، یکساں، برابر، ایک سے
دونوں ہاتھوں سے نوازا ہے مجھے اس شوخ نے
ایک سے خوشبو عطا کی اور خنجر ایک سے
اک تبسم سے مہک اٹھتا ہوں اسلم اور پھر
قریے قریے میں بکھر جاتا ہوں ٹھوکر ایک سے

(نیند)

آپ نے جو کچھ بھی فرمایا' بجا
شوق سے رہتا ہوں میں تنہا' بجا

....

سلگتا ہوں اسلم
گزر ہو رہی ہے

(نیند)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تنقیدی تصنیف ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' ان کی شخصیت اور زندگی کے متعلق نادر معلومات اور شعری جہتوں کے حوالے سے بہت سے دَر وا کرتی ہے اگر ان کی شاعری کے تمام موضوعات اور فنی خصائص پر تفصیل سے بات کی جائے تو ایک اور کتاب بن جائے گی۔ مختصر یہ ہے کہ میں اپنی ساری بحث کو ان الفاظ پر ختم کرنا چاہوں گا کہ اسلم کولسری نے غزل کو جدت سے روشناس کرایا۔ ان کی غزل میں زندگی کی تمام تر جولانیاں، حسن کی یکتائی، محبوب کی دلبری، محویت، سپردگی، خودداری، سماجی شعور، سیاسی حالات، نادار و مفلس کی کسمپرسی نیز سیکڑوں فکری مضامین اچھوتے انداز میں ملتے ہیں۔ انھوں نے عصری تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کیا اور قدیم و جدید غزل کی روایت کو اپنے احساس و شعور میں جذب کر کے اپنے فکر و فن کی راہوں کو متعین کیا۔

◆◆◆

اسلم کولسری کی شاعری اور......
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی جوہر شناسی

پروفیسر وحید عزیز

◆◆

عصرِ حاضر میں اُدب کی ناقدری نے اُدب کو کھیل تماشہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ زمانے کی تیز رفتاری اس صنفِ خاص کو نگل رہی ہے۔ نفسانفسی کا عالم ہے کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے متعلق سوچ سکے۔ ہمارا معاشرہ جن بنیادوں پر حساس اور محبتوں سے بھرپور تھا ان عناصر کو خود غرضی اور نفسانفسی کی طاقت پیروں تلے روند رہی ہے۔ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کی ناقدری نے معاشرے کو شعروادب سے دور رہی نہیں بل کہ نئی نسل کو تو اس سے ناواقف بنا دیا ہے۔

شعروادب سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت اور ہنر مند لوگوں کی کمیابی کا رونا رویا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فن اور صلاحیت معاشرے سے مکمل طور پر غائب و بے نشان ہو چکی ہے۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہنر مند افراد کی قدر نہیں کرتے۔ شعروادب سے دوری کے باعث ہم صلاحیتوں اور فن کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہ صنفِ خاص جو ہمارے معاشرے کا اہم جز تھی قریباً معدوم ہوتی جا رہی ہے۔

ہمارے خطے کو اللہ تعالیٰ نے لاتعداد و بے حساب نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے عقل و فہم کی...... عقل و فہم سے شعروادب کا تعلق اتنا ہی گہرا ہے جتنا جسم کا جان سے اگر جسم کو جان سے جدا کر دیا جائے تو وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر شعروادب کو معاشرے سے الگ کر دیا جائے تو معاشرے سوائے بے جان جسم کے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

اسی شہر، اسی خطے میں باصلاحیت و باکمال اور فن و رموزِ شاعری سے واقفیت رکھنے والا بہترین شاعر

اسلم کولسری بھی ہے۔ اسلم کولسری ایک اچھے شاعر اور مصنف ہیں۔ لیکن اپنی کم آمیز طبیعت کی بدولت انھیں بہت زیادہ سراہا نہیں گیا۔ کیونکہ معاشرہ شعروادب وفن سے ناواقف ہوتا جا رہا ہے اور اس پر اسلم کولسری کی سادگی نے انھیں مزید گوشہ نشین کر دیا۔

مگر اب مقام مسرت یہ ہے کہ عالمی مجلس ادب کے چیئرمین اور عصر حاضر کے بہترین ناقد، دانش ور، محقق اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جو گوشۂ نشین مگر باصلاحیت لوگوں کی پذیرائی کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور اپنی اس عادت کی بنا پر انھوں نے حمید کوثر، جعفر بلوچ، شیر افضل جعفری، قیصر بارہوی، آغا سہیل کے نام ایسے ہیں جن پر انھوں نے کتابیں لکھ کر پذیرائی حاصل کروائی اور شعروادب کے معاشرے میں انھیں متعارف کروایا۔ حال ہی میں انھوں نے عصر حاضر کی عظیم شخصیت اسلم کولسری کی شاعری پر ایک کتاب ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' لکھ کر انھیں اَدبی حلقوں میں متعارف کروایا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن دنیائے ادب کے باکمال جوہری ہیں جو ادبی ہیرے کی پرکھ بہ خوبی کر لیتے ہیں اسلم کولسری کو متعارف کروانا بھی اسی صلاحیت خاص کا حصہ ہے۔

اسلم کولسری کا اصل نام اسلم، ہے۔ جب کہ قلمی نام اسلم کولسری ہے۔ یہ عظیم شاعر یکم اگست ۱۹۴۸ء کو چک نمبر ۴/۱۶ کولسر تحصیل اوکاڑہ (حال ضلع) ضلع ساہی وال میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول ۵/۵۸ ایل گنوں تحصیل وضلع ساہی وال سے ۱۹۶۲ء میں میٹرک کیا۔ اور ۱۹۶۹ء میں دوران ملازمت ملتان بورڈ سے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر ایف۔ اے کیا۔ سلسلۂ تعلیم کو اس کے بعد بھی اس شاعر عظیم نے رکنے نہیں دیا۔ ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے گریجوایشن پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا اور ۱۹۷۶ء میں دوران ملازمت ہی پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے اُردو کیا۔

اسلم کولسری ایک بہترین شاعر اور جفاکش انسان ہیں۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۴ء تک عام مزدور کی حیثیت سے ستلج کاٹن ملز اوکاڑہ میں محنت کی۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء تک انٹرنیڈ مدرس کے طور پر جامعہ مدینہ پرائمری سکول کوٹ لیاقت حیات اوکاڑہ میں خدمات سرانجام دیں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۸ء تک لیبارٹری اسٹنٹ کے طور پر عرفان فارمیسی اوکاڑہ میں کام کیا۔ اس دوران آپ نے ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔

۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۳ء تک آفس منیجر کے طور پر ثاقب کاٹن انڈسٹریز اوکاڑہ میں خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک روزنامہ مشرق کے سب ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۸۷ء سے ۲۰۰۳ء تک اردو سائنس بورڈ لاہور میں ریسرچ آفیسر کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ ۲۰۰۳ء سے لے کر موجودہ وقت تک ڈپٹی ڈائریکٹر اُردو سائنس بورڈ لاہور ہیں۔

اسلم کولسری نے اپنی تمام زندگی میں رزق حلال پر اکتفا کیا۔ اور اس کا واضح ثبوت ان کی شاعری میں

نظر آتا ہے "جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ" ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ایسی تصنیف ہے جس میں اسلم کولسری کلام کا بہترین استعمال کیا گیا ہے اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اپنے بہترین و باکمال دانشور اور ناقد ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

اسلم کولسری کی اَدبی حلقوں میں پذیرائی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ آپ حلقۂ اربابِ ذوق کے ممبر ہیں۔ اسلم کولسری کی نو سے زیادہ تصانیف منظرِ عام پر آ چکیں ہیں اسلم کولسری کی تصانیف درج ذیل ہیں:

نخلِ جان	(اُردو شاعری)
کاش	(اُردو شاعری)
ویرانہ	(اُردو شاعری)
نیند	(اُردو شاعری)
جیون	(اُردو شاعری)
برسات	(اُردو شاعری)
عنبر	(اُردو شاعری)
پنچھی	(پنجابی شاعری)
ایک نظر کافی ہے	(جدید آسٹرین شاعری کا انتخاب)

اسلم کولسری کی زیرِ طبع کتب میں تازہ اُردو شعری مجموعہ۔ کھنڈر میں چراغ (بچوں کے لیے ناولٹ)۔ زخمی گلاب (بچوں کے لیے ناولٹ)۔ انوکھے شکاری (بچوں کے لیے ناولٹ) چاند کے آس پاس (بچوں کے لیے ناولٹ) روشنیوں سے دُور (روزنامہ مشرق میں لکھے ہوئے کالم) جنگل کی چاندنی (شعری تراجم) اسلم کولسری کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی تحریریں اعترافات اس کے علاوہ سید شبیہ الحسن کے قلم سے جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تنقید)۔

اسلم کولسری کے فن کے اعتراف میں رسائل نمبر شائع کیے گئے ۱۳ اگست ۱۹۸۵ء میں لودھراں بہاول پور سے "لفظ ہمارے" خصوصی مطالعہ...... اسلم کولسری شائع ہوا۔ نخلِ جان کی تقریبِ رونمائی میں مجلّے کی اشاعت ہوئی اس کے علاوہ ماہ نامہ شام وسحر لاہور نے اسلم کولسری نمبر (زیرِ تسوید) شائع کیا۔ ماہ نامہ شام وسحر میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بطور اعزازی مدیر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اسلم کولسری عصرِ حاضر کے ادب میں بلاشبہ ایک اہم و خاص مقام کے حامل ہیں۔ کئی روزناموں اور ہفت روزوں نے ان کے انٹرویو سے اپنے اخباروں اور رسالوں کی زینت بڑھائی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلم کولسری ایک بہترین و باکمال شاعر ہیں مگر ان کی شاعری کو منظرِ عام پر

لانے میں عصرِ حاضر کے شہزادۂ اَدب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا بہت اہم کردار ہے جو اس نفسانفسی اور افراتفری کے دَور میں بھی اَدب کی آبیاری میں شب و روز مصروفِ عمل ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ انھیں حوصلہ و ہمت و زندگی عطا کرے تا کہ وہ اسی طرح باکمال لوگوں کو منظرِ عام پر لاتے رہیں۔

آخر میں اسلم کولسری کے دو شعر پیشِ خدمت ہیں ان اشعار سے ان کے فن کی پختگی کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تم جانبِ ظلماتِ عدم چل دیئے تنہا
بچے۔ تو گلی میں بھی اکیلے نہیں جاتے

....

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

(روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۲۴ اپریل ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیقی اور تنقیدی کاوش

جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ

پروفیسر آصف وٹو

◆◆

اس عہد کا المیہ یہ ہے کہ گروہ بندیوں کا شکار اُدب زوال پذیر معاشرے میں بڑی تیزی کے ساتھ فروغ پا رہا ہے۔ اس المناک صورتِ حال کے شکار ادیب اور قاری دونوں ذہنی پراگندگی اور انتشار کا نشانہ بنتے جا رہے ہیں اور صورتِ حال اس شعر کے مصداق ہوتی چلی جا رہی ہے :

کتنا حسیں فریب نظر کھا رہے ہیں لوگ
دو کشتیوں میں پاؤں ہیں اور جا رہے ہیں لوگ

دوسری جانب اس روبہ زوال معاشرے میں خونِ جگر سے علم واَدب کی آبیاری کرنے والے بھی شب و روز تندہی کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ ان کا یہ قلمی جہاد اُدب کو گروہ بندیوں سے نکال کر اُدبا اور شعرا کی پذیرائی کی قابلِ رشک روایت قائم کیے ہوئے ہے۔ ان ہی مردانِ حق میں نامور محقق اور باشعور ناقد ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا بھی شمار ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اسلم کولسری کے لیے انجام دیا ہے۔ گو اسلم کولسری کی تخلیقات میں اتنی تاثیر ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں اس کے باوجود وہ جس مقام و مرتبہ کے اہل تھے یہ کتاب اُن کو ان کا اصل مقام دلانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جس انداز سے اسلم کولسری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ اس کتاب میں اسلم کولسری کی شعری تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کو تنقیدی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنا فرض بطور نقاد پورا کیا ہے۔ اس کتاب کی خوبی جو اسے دوسری کتب سے

ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اسلم کولسری کی ذات کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے' شروع میں اسلم کولسری کے سوانحی کوائف پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرے حوالے میں اسلم کولسری کی جملہ تصنیفات پر مختلف ناقدین کی آرا کو مدنظر رکھتے ہوئے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ آخر میں اسلم کولسری کی کتب سے ان کی نمائندہ غزلیں بطور انتخاب پیش کی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے اسلم کولسری کے حوالے سے یہ کتاب اُن کا نفسیاتی اور شعری تجزیہ ہے۔ اس میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان کی ذات کو اُجاگر کیا ہے۔ آیئے ذیل میں اس کتاب کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ اس کتاب کے پہلے باب میں اسلم کولسری کا تخلیقی رویہ' ان کے سوانحی کوائف' تعلیمی مدارج' حصولِ رزق کے لیے ملازمت' منظوم خراجِ تحسین اور مضامین و مقالات کے علاوہ ان کی ذات پر اُردو اَدب کے تیس نامور ناقدین کی آرا شامل ہیں ان میں ڈاکٹر وزیر آغا' سید ضمیر جعفری' میرزا ادیب' بانو قدسیہ' شہزاد احمد' ڈاکٹر خواجہ زکریا' ڈاکٹر آغا سہیل' افتخار عارف' ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اور خالد احمد نمایاں ہیں۔

دوسرے باب میں اسلم کولسری کی پہلی شعری تخلیق ''نخلِ جاں'' پر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا۔ نخل جاں کا دیباچہ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ اس میں 'نخلِ جاں' کی تمام غزلیات کی فہرست دی گئی ہے اور اس کتاب کی خوبیاں تفصیل سے درج ہیں۔ ان میں اسلم کولسری کا فطرت سے لگاؤ' فکر انگیزی' دیہات کی زندگی کے مختلف مناظر کا ذکر ہے جو اسلم کولسری نے اپنے اشعار میں پیش کیے ہیں۔ اسلم کولسری کے کاٹ دار لہجے اور ان کے شعری اختصاص کے حوالے سے گراں قدر آرا اور تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اسلم کولسری کے اشعار کی سادگی' پرکاری اور ان کی تراکیب جو ان کا امتیاز بن کر جلوہ گر ہوئی ہیں ان کا ذکر بھی اس باب میں ملتا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلم کولسری دیہات کی یاد کو منفرد انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اسلم کولسری کے لہجہ میں ایک نکھار' جدت اور تاثر ملتا ہے جو انھیں اپنے عہد کے شعرا میں ممتاز کرتا ہے :

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
میں نے اپنے سارے آنسو بخش دیے
بچے نے تو ایک ہی پیسہ مانگا تھا

اس طرح اسلم کولسری اپنے سچے خیالات کو سچے لفظوں میں پیش کرتے ہیں وہ صرف اپنے ہی نہیں بل کہ اپنے اردگرد کے حالات سے بھی واقف ہیں اور قاری کو بھی اپنے گردونواح سے باخبر رکھنے کی دعوت دیتے ہیں :

کٹ جائے گا پورا دن
شہر کے بھوکے بچے گن

اسلم کولسری مختلف مضامین کو بڑے سچے انداز میں پیش کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے اندر جو غم ہے وہ ان کا

اپنا ہی نہیں بل کہ اس کے آس پاس اجڑتی ہوئی حسرتوں کا بھی غم ہے :

کاٹے گی ایک نسل، غمِ تیرگی کی فصل
یارانِ شب نواز بہت بیج بو گئے

....

ساحل کے اُبلتے پانیوں میں
جوانی کا جزیرہ جل رہا ہے

تیسرے باب میں اسلم کولسری کی دوسری شعری تخلیق ''کاش'' کا ایک تنقیدی اور فکر انگیز محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ شہزاد احمد نے تحریر کیا ہے۔ اس میں بھی ''کاش'' کی غزلوں کی فہرست دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلم کولسری کی غزل میں جدید غزل کے تمام رجحانات جلوہ گر ہیں لیکن اس کتاب کو پڑھ کر ایک احساس ہوتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے لکھا ہے ''اسلم کولسری کی شاعری جدید اور قدیم روایات کا سنگم ہے'' یعنی اسلم کولسری نے کلاسیکی غزل کے نقوش اپنی غزل میں مٹنے نہیں دیے اور جدت کی بھی آبیاری کی ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ اسلم کولسری نے 'کاش' کی غزلیات میں صرف ستم گری کا شکوہ نہیں کیا بلکہ پریشان کن حالات کے اسباب کا بھی خوب صورت انداز میں ذکر کیا ہے :

یہ سناٹا ذرا خاموش ہو لے
میں کوئی بات کرنا چاہتا ہوں

اسلم کولسری تلخ تجربات کو ناصر کاظمی کی طرح سلیقے اور حلاوت کے ساتھ اشعار کے پیکر میں پیش کرتے ہیں:

اگرچہ پیکرِ حسن وفا تھا' وہ بھی گیا
ما شریکِ غزل اک دیا تھا' وہ بھی گیا

....

یار کو دیدۂ خوں بار سے اوجھل کر کے
مجھ کو حالات نے مارا ہے مکمل کر کے

اسلم کولسری نے زندگی کا بغور جائزہ اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اشعار میں سلگتے' سسکیاں لیتے رویّے کو پیش کیا ہے۔ یہ اشعار میرے خیال کی تصدیق کریں گے :

ہر طرف چہروں کا اک چڑھتا ہوا دریا لگے
پھر بھی اپنے آپ کو میرا بدن آدھا لگے

....

وقت نے ایسی کروٹ لی ہے ڈر لگتا ہے
سوہنا چاند بکھر نہیں سکتا' یہ لگتا ہے

اس کتاب میں ان کی نظموں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور اسلم کولسری نے احساس' شدتِ غم' اضطراب اور سادگی کو اپنے اُسلوب میں رچا بسا کر پیش کیا ہے اور شعری حوالوں سے اپنی آرا کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا گیا ہے۔ ان کا یہ شعر میری باتوں کی سچائی میں کافی حد تک میری معاونت کرے گا:

عزت کی خواہش لے کر آئے ہو اسلم
پوری ہوسکتی ہے لیکن سر لگتا ہے

اس کتاب کا چوتھا باب اسلم کولسری کی شعری تخلیقات ''ویرانہ'' پر جائزہ ہے۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر آغا سہیل نے قلم بند کیا ہے۔ اس میں پہلے ان کی کتاب 'ویرانہ' پر مہتمم سعید اللہ کی رائے کی چند سطور دی گئی ہیں اور بعد میں اس کتاب میں شامل شعری تخلیقات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ اس میں اسلم کولسری کی شاعری کے ارتقائی سفر میں اُن کی اپج اور نئے محاسن کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور اشعار کے حوالے سے اپنی بات میں وزن پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں اسلم کولسری کی شاعری کے چند نئے دروا کیے ہیں کہ وہ انسانی معاملات کی جانب مائل نظر آتے ہیں جیسا کہ اس کے بارے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی گراں قدر سطور سے اس کا تجزیہ پیش کیا ہے کہ:

> ''اسلم کولسری نے اس مجموعۂ کلام ''ویرانہ'' میں کمال یہ کیا ہے کہ انسانی درد وغم کی کہانیوں کو پہلے ذاتی آشوب کی بھٹی میں اچھی طرح پکایا ہے پھر اسے عصری آشوب کے سانچے میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے صرف اپنی رائے سے ہی نہیں نوازا بل کہ انھوں نے اپنی رائے کو تقویت دینے کے لیے اور اپنی بات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اشعار بطور سند پیش کیے ہیں۔ اس میں اسلم کولسری کی اس خوبی کو نمایاں کیا گیا ہے کہ انھوں نے غمِ دل کو جدید انداز میں غزل کے پیکر میں سمونے کی مشکور سعی کی ہے۔ غم کی شدت نے ان کے اندر اضطراب تو پیدا کیا ہے لیکن یہ اضطراب ان کے احساس میں رچ بس گیا ہے اور اس نے شدت اختیار کرنے کے باوجود ان کے ہاں بغاوت نہیں کی:

دل وحشی ذرا قرار میں ہو
آج کل کس کے اختیار میں ہو
مسکراہٹ نہیں تو اشک سہی
کچھ تو اپنے بھی اختیار میں ہو

ڈاکٹر پروفیسر خواجہ محمد ذکریا کے بقول اسلم کولسری کی اس شعری تخلیق کے اشعار مجید امجد' منیر نیازی اور شکیب

جلالی کی یاد دلاتے ہیں۔ اس باب میں اس کتاب پر ایک طویل محاکمے سے اسلم کولسری کے غم کی مختلف سطحوں کو خوب صورت انداز میں اشعار کے حوالے کے ساتھ پیش کر کے اس کتاب کی تمام خصوصیات کو جلوہ گر کرنے کی پُر تاثیر سعی کی گئی ہے۔

اس کتاب کے پانچویں باب میں اسلم کولسری کی شعری تخلیق ''نیند'' کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایک نعت اور باقی غزلیات ہیں اور آخر میں اسلم کولسری نے چند سطریں کے عنوان سے شعروادب کے محرکات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

اس باب میں بتایا گیا ہے کہ ''نیند'' میں اُداسی کے کئی رنگ اسلم کولسری کی زندگی میں نظر آتے ہیں اسلم کولسری صرف اندر سے نہیں بل کہ باہر کی دنیا سے بھی خوف زدہ ہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ غمِ دل کو غمِ دوراں بنا دیتے ہیں اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی فنی چابک دستی پر بھی نظر پڑتی ہے۔ اسلم کے ہاں زندگی کے مختلف حالات اور واقعات ان کو اداس کر دیتے ہیں وہاں اسلم کولسری ان حالات وواقعات کو پیش بھی نئے انداز سے کرتے ہیں۔

اس کتاب میں اُن کے ہاں بڑے کرب کو کم لفظوں میں مربوط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے چھوٹی بحر میں جذبات کو نہایت احسن انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ شعر میرے موقف کی بھرپور تائید کرے گا :

کیسا موسم آن لگا
حبس بھی، طوفان بھی
سوکھے پتے ہو گئے
ہرے بھرے انسان بھی

اس کتاب میں اسلم کولسری زندگی کی حقیقت کو بھی روشناس کراتے ہیں اور اس کی بے ثباتی پر اپنے خیالات کو شعری پیکر میں اس طرح پیش کرتے ہیں :

مٹی میں تو ایک ہیں
سائل بھی، سلطان بھی

اسلم کولسری معاشرے کی بے حسی، غریب سے ناانصافی اور لٹتی ہوئی، پامال ہوتی ہوئی انسانی قدروں پر بھی اشک فشانی کرتے ہیں۔ اشک فشانی اور اُداسی کی دوسری وجہ اُن کی دلی دنیا ہے۔ وہ اپنے اندر کی کائنات کو بھی بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور احساس، اعتماد اور پیار کے نازک برتنوں کی توڑ پھوڑ سے خود بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر اُن کے اندر کا غم جلوہ گر ہو کر ان کے باہر بھی ان پر اثر انداز ہوتا ہے :

محبت ہو تو جاتی ہے ذرا سی
پھر اُس کے بعد صدیوں کی اُداسی

وہ اس اندر کی اُداسی سے جب فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اپنے اندر کی آنکھیں پھر باہر کی طرف کھول دیتے ہیں اور ماضی کی یاد سے دل بہلانے کی کوشش کرتے ہیں :

جی بہلنے لگا اکیلے میں
بزم احباب کی عنایت سے

لیکن یہ اندر اور باہر کی آپس میں ملتی ہوئی اُداسی بھی ان کے ہاں یاسیت کی بجائے رجائیت کے دامن میں پناہ لیتی ہے اور وہ اچھے دنوں کی آس اور امید کی شمع اپنے ویران دل میں روشن کر لیتے ہیں :

دل کی بے گناہی کو زعم تھا' گواہی کا
رات کی عدالت میں آفتاب اُترے گا
میں یقین رکھتا ہوں آنسوؤں کی محنت پر
ایک دن تو آنکھوں سے داغِ خواب اُترے گا

اس مضمون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلم کولسری کے ہاں ایک فنی پختگی کی تکمیل اور فکری خوب صورتی کے عناصر واضح طور پر رونما ہوئے ہیں کہ انھوں نے اپنے غم' اُداسی اور رجائیت کو مختلف انداز میں بل کہ اپنے اچھوتے انداز میں مختلف بحور اور مشکل ردیفوں میں کیسے بیان کیا ہے :

پتھروں کو ہوتا ہے
آئینوں پہ شک اُلٹا

خواب' عذاب
آب سراب
موت محیط
زیست حباب

اس طرح اس باب میں اسلم کولسری کے شعری ارتقا کو خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے چھٹے باب میں ان کی شعری تخلیق ''جیون'' پر ایک وقیع محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شامل غزلیات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے کہ اس کتاب میں اسلم کولسری کے ہاں کائنات کے بارے میں استفسار اور اس کے مسکت جواب پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں شامل غزلیات میں غور و فکر اور کائنات کے بارے میں سوچ کے کئی زاویے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی تنقیدی نظر سے کام لیتے ہوئے اس کتاب میں شامل غزلیات میں زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے :

کیا ہے اپنی شعر گری اور کیا ہے اپنا فن
شیشے کے بازار میں کچی مٹی کا برتن

اس میں شامل غزلیات کے بغور مطالعہ سے اس بات سے بھی پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ وہ زندگی کی تلخیوں اور بے درد رویہ کو کس انداز سے اپنے اشعار میں سموتے ہیں :

آخر کو ان جلتی بجھتی سانسوں پر
ہم جیون کی ساری پونجی ڈھو لیں گے

اس میں وہ زندگی میں کھو جانے والی چیزوں پر اظہار افسوس نہیں کرتے مگر احساس کو دل میں زندہ رکھتے ہیں۔ ان کی بعض غزلیات کو پڑھ کر اہلِ وطن کی غفلت اور کاہلی کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے :

سروں پہ جیسے آسمان تک بھی نہیں
رسائی اپنی کسی مہربان تک بھی نہیں
لہو بہے گا تو دھرتی کو بانجھ کر دے گا
مگر ہمیں تو کسی شے کا دھیان تک بھی نہیں

اس کتاب میں اسلم کولسری کے مضامین کی ایک مثلث کا خوب صورت ذکر اچھے انداز میں کیا گیا ہے کہ اُن کے ہاں اس کتاب میں فطرت، زندگی اور کائنات کے بارے میں شعر کے پیکر میں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت کا ذکر جو ڈاکٹر شبیہ الحسن کی وسیع نظر کا بین ثبوت ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے جن بحور اور قافیوں کا استعمال کیا ہے وہ ان ہی کا اختصاص ہے:

سب کے سب لوگ ہیں اپنے ہی حال میں بے تحاشا مگن
ایک دوجے سے پھر بھی یہی پوچھنا اور کیا حال ہے

درج بالا نکات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اسلم کولسری کی اس کتاب میں کائنات، فطرت اور زندگی کے علاوہ شعور اور فلسفۂ حیات و کائنات کی کئی صورتیں ہمارے سامنے جلوہ گر کی ہیں۔

اس کتاب کا ساتواں باب اسلم کولسری کی چھٹی شعری تخلیق ''برسات'' کا تجزیہ ہے۔ اس میں ایک حمد یہ قطعہ، ایک نعت اور باقی غزلیات شامل ہیں۔ اس کے آغاز میں اسلم کولسری نے ''چند معروضات'' کے عنوان کی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کتاب میں اسلم کولسری کی شاعری میں موضوعات کا ایک تنوع ہے، ایک جنگل ہے جس میں قاری کھو جاتا ہے اور اپنے جذبات کا ذخیرہ لٹا دیتا ہے اور قاری کا کتھارسس ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کے اس باب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلم کولسری اپنے شعری سفر میں ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے جب 'برسات' تک پہنچتے ہیں تو مختلف موضوعات کا احاطہ اپنے اشعار میں کرتے ہیں جہاں ان کے اشعار میں معاشرے پر ایک گہرا طنز بھی ملتا ہے اور وہ معاشرتی رویوں کے بے

ڈھب اور بے وزن انداز پر شعر ملتے ہیں۔ اس میں غریبوں کا احساس' بے کسوں کی بے چارگی کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے :

سلامت کون ہے دنیا میں پیارے
جو لگتے ہیں نظر کے شعبدے ہیں

اس میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلم کولسری کے ہاں طنز کا انداز اصلاحی زیادہ اور ناصحانہ کم ہے یعنی اُن کے ہاں ان کا طنز ایک تعمیری صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہو کر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ طنز کے لیے اسی انداز اور آواز کے الفاظ لے کر آتے ہیں :

عجب نہیں کہ زمانے کو راکھ ہی کر دے
چھڑی ہے جو ابھی سوچوں کی جنگ عالی جاہ

اس باب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اور نکتہ واضح کیا ہے کہ اسلم کولسری مظلوموں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر صرف آبدیدہ نہیں ہوتے بل کہ سخت احتجاج کرتے ہیں اور اس احتجاجی انداز کو اشعار میں بھی اسی صورت میں بیان کرتے ہیں:

کاروبارِ دہر میں اپنی شراکت ہے یہی
گوشۂ عزلت سہی' لیکن دلِ کم کوش چیخ

اس کتاب میں اسلم کولسری کے دائرہ حسن و عشق میں اُن کے الگ انداز کو بھی احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے کہ حسن و عشق کے معاملات میں بھی کس طرح اسلم کولسری اپنے آپ پر بھی طنز کرتا ہے :

جسے چاہا اُسے ملنے کی خواہش
کوئی تلوار سی دل میں جڑی ہے

اس میں ایک اور نکتہ بھی ڈاکٹر شبیہ الحسن نے واضح کیا ہے کہ اسلم کولسری اپنے طنز سے معاشرے کے رویہ کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اور بات جو ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس میں باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس کتاب میں اسلم کولسری کی شاعری میں لسانی حوالے سے ایک بڑی تبدیلی اور بڑے خوب صورتی نمایاں ہوتی ہے اور اسلم کولسری ایسے الفاظ کو پیش کرتے ہیں جو عام طور پر غیر مانوس ہوتے ہیں مگر اس خوبصورت انداز سے وہ غیر مانوس الفاظ کو استعمال کرتے ہیں کہ مانوس لگنے لگتے ہیں :

من کا پتھر ٹوٹ
پھر کچھ منھ سے پھوٹ

اس میں اسلم کولسری نے ایسے مسائل کو بیان کیا ہے جو آج کے ہر انسان کا مسئلہ ہے جس سے ہر انسان دوچار

ہے اور وہ ان مسائل کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں :

کچھ تو رنگ چہرے کے بھی اڑے اڑے ہوں گے
کچھ غریب لوگوں کے آئینے بھی کچے ہیں
شوق بھی نہیں اتنا بارِ غم اٹھانے کا
اور ادھر ارادے کچھ آپ کے بھی کچے ہیں

ایک اور پہلو جو ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس میں واضح کرنے کی بلیغ سعی کی ہے کہ اسلم کولسری کے نزدیک ایک تلخ حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے کہا کہ عصرِ حاضر کا انسان مادیت پرستی کے غبار میں آلودہ ہو رہا ہے تو اس کے فن کا آئینہ اس سے دھندلا ہو رہا ہے:

اپنی روح کے خالی پن سے
تنگ بہت ہوں اس جیون سے

اسلم کولسری کے ایک اور رویے پر بھی غور کیا گیا ہے کہ آج کل کا انسان انتشار کا شکار ہے وہ کشمکش اور اُلجھن کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔

زندگی بھی مشکل ہے
خودکشی بھی مشکل ہے
غم، عذاب ہے اسلم
اور خوشی بھی مشکل ہے

اسلم کولسری کے ایک اور رویہ کو ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اِن حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان ناقابلِ تسخیر ہے :

چڑھتے ہوئے دریاؤں سے تکرار کریں کیا
پانی کی طرح خود ہی اُتر جائیں گے حالات

اس کتاب کے مطالعے سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ بات اخذ کی ہے کہ ان غزلیات میں اسلم کولسری نے اپنے افکار کو عالمی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مختصر بحور میں وسیع موضوعات کو پُر تاثیر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس باب کے آخر میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر طارق عزیز کی رائے کو بیان کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے ہاں صوتی نظام کا اثر بڑے پُرتاثیر انداز میں جھلکتا ہے۔

اس کتاب کا نواں باب اسلم کولسری کی آٹھویں پنجابی شعری تخلیق ''پنچھی'' پر ایک خوب صورت جائزہ ہے۔ اس کتاب میں اسلم کولسری کی حمد، سلام، گیت، غزلیں اور نظمیں شامل ہیں اور آخر میں اسلم کولسری

نے ''یاداں فریاداں'' کے عنوان سے پنجابی شاعری کے محرکات بیان کیے ہیں۔اس کتاب کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بتایا ہے کہ اسلم کولسری نے ان غزلوں' نظموں اور قطعات سے پیار' محبت' سادگی اور دیہات کے مناظرِ فطرت کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں دیہات کے تہذیب وتمدن کی مختلف جھلکیاں بھی اسلم کولسری کے اس پنجابی مجموعے سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے چن کر ہمیں دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زبان کے مختلف روپ بھی لفظوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں :

کرناں دے بجھ گئے' مرے سینے وچ نچوڑ
توں سورج دے کھیت دا مالک' تینوں کاہدی تھوڑ

اسلم کولسری کی پنجابی شاعری کے جو پہلو ڈاکٹر شبیہ الحسن نے واضح کیے ہیں وہ اُن کی پنجابی شاعری میں ان کی فنی پختگی کے غماز ہیں۔ان کی پنجابی شاعری میں بھی فکر' عشق اور دیہات کی یاد موجزن ہیں اور یہ کہ اسلم کولسری تلخ حالات میں بھی شیریں خیالات سے حلاوت پیدا کرتے ہیں اور یاسیت کی رات میں رجائیت کے ستارے روشن کرتے ہیں۔ان کی یہ نظم ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے موقف کی تائید کے لیے پیش کی ہے :

خوش رہ
جیہڑی چیز پسند نہ ہووے
اوہوای سانبھ کے رکھ
نہیں تے
چیز گوا چن مگروں
اڈ جاوں گے ککھ

اس مضمون میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اُن کی پنجابی شاعری میں دیہات کا بانکپن اور ہجر والم کی باتیں اشعار کی صورت میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ تفکر کے مختلف مضامین کو بیان کیا ہے۔

اس کتاب کا دسواں باب اسلم کولسری کا آسٹریائی شاعری کا ترجمہ ''ایک نظر کافی ہے'' کے عنوان سے اس کتاب کی زینت بنا ہے۔اس میں اسلم کولسری نے آسٹریا کے شعرا کی شعری تخلیقات کا بڑے سلیقے سے ترجمہ کر کے اپنے آپ کی عالمی اُدب سے آشنائی ثابت کی ہے۔اس باب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ بتایا کہ اسلم کولسری نے آسٹریا کے شعرا کا منظوم ترجمہ کر کے آپ کے سماجی اور معاشرتی حالات کو خوب صورت انداز میں رقم کیا ہے۔اُردو شعر واُدب میں آسٹریا کی شاعری کے بعد مزید وسعت دی جا سکتی ہے۔اس میں اسلم کولسری نے آسٹریا کے شعرا کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور آخر میں ڈاکٹر عباس رضا کی رائے کے حوالے سے یہ بتایا گیا

ہے کہ اسلم کولسری نے آسٹریا کی شاعری کا ترجمہ کر کے اصل میں اپنے فکر اور اپنی شاعری کی ہیئت اور نئے انداز کو رائج کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔

گیارھویں باب میں غزل کے ارتقا میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اسلم کولسری کا مقام متعین کیا ہے۔ ان کی فکری بالیدگی اور لسانی تشکیلات سے غزل میں ایک معتبر اضافے کے طور پر انھیں روشناس کروایا ہے۔ اسلم کولسری نے کلاسیکی غزل اور جدید غزل کے امتزاج سے اپنی شاعری کا خمیر پیدا کیا ہے۔ ان کے ہاں اسلوب کی جاذبیت، متنوع ردیفیں، مختصر بحور جوان کا خاصہ ہیں کی مثالیں بطور سند پیش کی ہیں۔ اسلم کولسری کی غزل کے نمایاں محاسن کو ایک تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔

آخری باب میں اسلم کولسری کے تمام معروف شعری مجموعوں سے ایک کڑا انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس انتخاب سے جہاں اسلم کولسری کی تخلیقی جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہاں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے شعری ذوق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اسلم کولسری کی شخصیت اور ان کے فن کے حوالے سے ایک لافانی کتاب ہے اس میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے نہایت مدبرانہ اور مدلل انداز میں اسلم کولسری کی شاعری کا احاطہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے اختصاصی پہلو بیان کیے ہیں جو اسلم کولسری کو بطور شاعر نہیں بل کہ معتبر شاعر کے طور پر ہمارے سامنے لاتے ہیں۔

آخر میں کہا جاسکتا ہے یہ کتاب نہ صرف اسلم کولسری کے حوالے سے ایک مستند کتاب ہے بل کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اعلیٰ ذوق کی بھی ایک سند ہے۔

◆◆◆

madlib.org

باقیاتِ آلِ رضا......ایک یادگار کتاب

تاج سعید

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب ایک طویل عرصے سے میرے نام اپنا اُدبی ماہ نامہ ''شام وسحر'' ارسال کر رہے ہیں۔ کبھی ان کا خط میرے نام نہیں آیا، نہ ہی کبھی کوئی فرمائش انھوں نے لکھنے کی زحمت کی ہے لیکن جب کبھی میرا جی چاہا میں نے اپنے طور پر ایک آدھ نظم، غزل ارسال کر کے اپنے طور پر ''شام وسحر'' کے ساتھ تعاون کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بار انھوں نے ''شام وسحر'' کا بہت عمدہ سال نامہ شائع کیا تھا چناں چہ میں نے اس شمارے کے حوالے سے ان کی اور ان کے رسالے کی اَدبی خدمات کے بارے میں ایک کالم لکھا تھا جس کی نقل بھی ان کو بھجوا دی تھی۔ مجھے خیال تھا کہ وہ جب اس کالم کا مطالعہ کریں گے تو شکریے کا خط ضرور لکھیں گے اور اس طرح ان سے خط و کتابت کرنے اور ان کی علمی، اَدبی سرگرمیوں سے زیادہ باخبر ہونے کا موقع ملے گا لیکن سید شبیہ الحسن نے کوئی توجہ نہیں دی۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے دوست اور مہربان حمید کوثری جو پندرہ روزہ ''ذوالفقار'' کے ایڈیٹر ہیں اور ریٹائر ہونے کے بعد اب وہ صرف اپنے اس رسالے کو بنانے، سنوارنے میں لگے رہتے ہیں، انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے والد گرامی سید وحید الحسن ہاشمی کے نام کسی خط میں میرا ذکر خیر بھی کر دیا۔ کوثری صاحب کے خط میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کا ہاشمی صاحب پر بڑا اچھا اثر پڑا اور انھوں نے اپنے مرثیوں، غزلوں، نعتیہ منقبت وغیرہ کی نہایت ہی قیمتی کتابوں سے مجھے نوازا۔ جب یہ کتابیں مجھے ملیں تو ان کے بارے میں مرتب کی گئی ایک کتاب جو ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں تھی پر کالم لکھا اور وہ ان کو بھجوا دیا اور ساتھ ہی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ایک کتاب کی فرمائش بھی کر دی جو انھوں نے ایک نہایت ہی ذہین شاعر اور میرے دوست سیف زلفی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے مرتب کی تھی۔ چند دنوں بعد مجھے یہ کتاب بھی مل گئی جسے دیکھ کر دل خوش بھی ہوا اور ڈاکٹر صاحب کی محبت کی گرمی کا احساس بھی۔ اس کتاب پر بھی میں نے کالم لکھا۔ سیف زلفی کی شاعری اور اس کی دوستی کا میں خود بھی بڑا مداح تھا۔ ساتھ ہی مَیں نے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی عمدہ

کارکردگی کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا حالاں کہ وہ اس کے علاوہ چند اور عمدہ کتابیں بھی لکھ چکے ہیں اور اس کالم کو انھوں نے کمال مہربانی کے ساتھ اپنے ماہ نامے ''شام و سحر'' میں آج کے حوالے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حال ہی میں انھوں نے اپنی کتاب مجھے ارسال کی ہے وہ بڑی کارآمد ہے۔ یہ برصغیر کی علمی اَدبی شخصیت آلِ رضا کی ''باقیات'' کا مجموعہ ہے۔ سیّد آلِ رضا لکھنوی تہذیب و شرافت کا نمونہ تھے اور جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے پھر اہلِ بیت کی شان میں اپنی شاعری کا ایک بڑا حصہ وقف کر کے اپنی محبت اور عقیدت کے جو پھول پیش کیے ہیں وہ ایک یادگار کا درجہ رکھتے ہیں۔ محرم الحرام کے دسویں دن شامِ غریباں کے آخر میں جو سلام ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے پہلے ناصر جہاں اور اب اُن کے صاحب زادے اسد جہاں کی آواز میں نشر کیا جاتا ہے اس کو سن کر انسان پر درد و الم کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کا اظہار الفاظ کے ذریعے اَدا کرنا ممکن نہیں۔ مَیں، میرے ساتھی ریڈیو کی ملازمت کے دوران محرم کے دس دنوں میں امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت کے غم و اندوہ کی وجہ سے گریہ کناں رہا کرتے پھر میرے بہت پیارے دوست فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور دوسرے جن کا تعلق شیعہ برادری سے ہے پھر ان کی صحبتوں کا اثر بھی تھا اور اب جب میں ریڈیو سے ریٹائر ہو گیا ہوں بڑی باقاعدگی سے شامِ غریباں کے اختتام پر دل گداز نوحہ ''گھبرائے گی زینبؑ'' اور یہ نظم ضرور سنا کرتا ہوں:

سلام خاک نشینوں پہ سوگواروں کا
غریب دیتے ہیں پرسا تمھارے پیاروں کا
سلام اِس پہ، جو رحمت کش سلاسل ہے
مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے
سلام بھیجتے ہیں اپنی شاہ زادی پر
کہ جس کو سونپ گئے چلتے وقت گھر سرورؑ
مسافرت نے جسے بے بسی یہ دکھلائی
نثار کر دیئے بچے نہ بچ سکا بھائی

یہ ساری نظم دَرد و غم میں ڈوب کر لکھی گئی ہے اور اب تو یہ کلاسک کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ ''گھبرائے گی زینبؑ'' والا نوحہ بھی آلِ رضا ہی کا سمجھا کرتا تھا لیکن جب اسے مَیں نے باقیاتِ آلِ رضا میں نہ دیکھا تو مجھے افسوس ہوا چناں چہ میں نے فوراً کوثری صاحب کو فون کر کے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ نوحہ شاہد نقوی کا ہے اسی لیے اس مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ عاشورہ محرم کے پروگرام کا اختتام کرتے وقت اپنی اناؤنسمنٹ ہمیشہ ان کے اس شعر پر کرتے تھے۔

یہ کہہ کے ڈوب گیا آفتاب عاشورہ
رہے حسینؑ کی تا حشر روشنی باقی

''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' مرتب کرنے پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے بڑی محنت کی ہے اس لیے کہ آلِ رضا کی غزلوں کے دو مجموعے ''نوائے رضا'' اور ''غزلِ معلّٰی'' ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بھی طبع ہوا اس کے بعد وفات تک انھوں نے جو کچھ لکھا، جو اخبارات یا رسائل میں چھپا وہ تو موجود تھا لیکن اپنے پاس جسے سنبھال کر رکھنا چاہیے تھا اسی کی طرف توجہ نہ دی۔ ایک تو ان کی عمر ایسے موڑ پر آ گئی تھی جس میں نوجوانوں کی طرح اپنی شعری تخلیقات کو سنبھال کر رکھنا ممکن نہیں رہتا دوسرے انھیں کبھی کوئی سلام، نوحہ یا منقبت لکھنے کا موقع ملا بھی تو اسے کاغذ کے کسی پرزے پر نوٹ کیا جسے کسی طرح محفوظ رکھنا خاصا مشکل کام ہے لیکن آفرین ہے ڈاکٹر شبیہ الحسن پر کہ انھوں نے دس برس کی کڑی محنت اور ریاضت سے اس ہفت خواں کو طے کیا اور ''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' میں ان کا وہ کلام طبع کرنے میں کامیاب ہو گئے جو دست بردِ زمانہ کی وجہ سے ضائع ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دس برسوں میں کس کس دروازے پر دستک دی ہے اور کس کس شخص سے ملاقات کی ہے اور کہاں کہاں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے اس کی روداد خاصی دل چسپ ہے اور اسے انھوں نے کتاب کے ایک صد صفحات میں تحریر کیا ہے اور جو شعر، نوحہ، غزل، مرثیہ، نعت، منقبت جہاں سے انھیں ملی ہے اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اگر کوئی پرزہ کٹا پھٹا ملا ہے تو اس کی چھان پھٹک بھی کی ہے اور ہر قدم پر اس بات کا خیال رکھا ہے کوئی مصرعہ بھی غلط نہ چھپنے پائے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا اور اسے کر گزرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے بارے میں ہمارے مہربان ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ ''آلِ رضاؔ خوش نصیب شعرا میں ہیں جنھیں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن جیسا مخلص نقاد ملا ہے جو اپنے اجداد کی روایت کا پاسدار ہی نہیں بل کہ اس کا بہت بڑا مبلغ بھی ہے۔ شبیہ الحسن کے والد سیّد وحید الحسن، آلِ رضاؔ کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے اس سے شبیہ الحسن نے ضروری جانا کہ آبائی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے بزرگوں کی متاعِ بے بہا کو قارئین تک پہنچانا چاہیے۔ یہ ایک کٹھن کام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دس برس کی مسلسل محنت سے اخبارات، رسائل اور بیاضوں سے ریزہ ریزہ کلام جمع کیا اور اس طرح آلِ رضاؔ کے کلام کی باقیات یک جا ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام میں تدوین کے جدید اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے اور جا بجا حوالوں اور حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ شاعری شبیہ الحسن کے گہوارہ تربیت کا حصہ ہے اس لیے یہ متن صحت کے اعتبار سے کئی معاصرین سے بازی لے گیا ہے۔ انھوں نے محض ایک مرحوم شاعر کے کلام ہی کو یک جا نہیں کیا بل کہ لکھنوی روایت کے اس آخری زمانے کو محفوظ بھی کر دیا ہے۔''

ڈاکٹر وحید قریشی کی اس رائے کے بعد مجھے کالم کو آگے نہیں بڑھانا چاہیے تھا لیکن محترم سید آلِ رضاؔ

کی شخصیت کے ذکر کے بعد یہ تحریر اُدھوری لگے گی چناں چہ کالم نگار نصر اللہ خان لکھتے ہیں کہ ''سید صاحب جسے ایک بار اپنا دوست سمجھ لیتے، زندگی بھر اس کی خامیوں کے باوجود اس سے نبھانے کی کوشش کرتے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنے دشمن نما دوستوں کی باتوں میں آ جاتے اور غضب تو یہ ہے کہ وہ اس زمانے میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا اور نہ اس سے دھوکے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ہاتھوں بڑی آسانی سے دھوکہ کھا جاتے اور مزے کی بات یہ ہے کہ بعض صورتوں میں تو وہ بڑے شوق سے دھوکے کو دھوکہ سمجھ کر بھی کھایا کرتے تھے۔'' ان کے چھوٹے بھائی سید ہاشم رضا ایک مشاعرے کا احوال بیان کرتے ہیں۔ ''جب شمع گردش کرتے ہوئے ان کے سامنے رکھ دی جاتی تھی تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شمع کا اُجالا بڑھ گیا ہے۔ سامعین بڑی فراخ دلی سے انھیں داد دیتے تھے۔ ایک ایسے مشاعرے کا منظر میری آنکھوں میں اب بھی گھوم رہا ہے۔ مشاعرے کی صدارت جناب ناصری فرما رہے تھے۔ بھائی جان نے جو غزل پڑھی اس کا مطلع تھا:

وفا خطا تھی، خطا مَیں نے زندگی بھر کی
اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی

ان کے بعد صدرِ مشاعرہ کی باری آئی تو جناب ناصری نے فرمایا ''آلِ رضا کی غزل کے بعد لطف مشاعرہ ختم ہو گیا اور اپنی غزل شمع کی لو کی نذر کر دی۔ میرے بھائی نے کہا حضرت یہ میری داد نہیں ہے بل کہ حاضرین کے ساتھ بیداد ہے مگر جناب ناصری نے صدر مشاعرہ کی حیثیت سے مشاعرے کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔'' لکھنؤ سے پاکستان آ جانے کے بعد بھی وہ لکھنوی فضا کو یاد کرتے رہے جس کے وہ پروردہ تھے۔ درج ذیل اشعار ان کی لکھنؤ سے روانگی کی یادگار ہیں:

یوں تو بیتاب سے اس محفل سے اٹھ جانا پڑا
کیا کہوں پھر کیا ہوا، جب دل کو سمجھانا پڑا
موت ہی جس کو چھڑا سکتی تھی وہ دل کش دیار
یوں چھٹا ہم سے کہ ہم کو خود ہی چھوڑ آنا پڑا
وقت نازک، رشتہ اُلفت کے پھندے جا بہ جا
گتھیوں کو کانپتے ہاتھوں سے سلجھانا پڑا
گھر چھٹا، گھر کی فضاؤں کی جمی محفل چھٹی
اپنے بیگانے ہوئے غیروں کو اپنانا پڑا

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''باقیاتِ آلِ رضا'' کی تلاش و جستجو کا مرحلہ بڑی کامیابی سے سر کر لیا۔ اس

بھاگ دوڑ میں ان کے ہاتھ جو کچھ آیا وہ بڑا ہی قیمتی سرمایہ ہے اور سید آلِ رضا کے بارے میں یہ کتاب ایک یادگار کا درجہ رکھتی ہے۔ بڑی محنت اور خوب صورتی سے اس کتاب کی تزئین و آرائش کی گئی ہے جو صحیح معنوں میں سید آلِ رضا کے شایان شان ہے۔ تین صد صفحات کا یہ مجلّہ صحیفہ ۲۵۰ روپے میں الحسن پبلی کیشنز۔ ۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، فروری ۲۰۰۱ء)

(اشاعت ثانی ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جنوری ۲۰۰۲ء)

◆◆◆

maablib.org

باقیاتِ آلِ رضاؔ

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا کارنامۂ خاص

پروفیسر عبدالکریم خالد

◆◆

کسی بڑے شاعر کے کلام کی تدوین میں جو مشکلات درپیش ہیں، اُن کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو اس کام میں خود کو صرف کرتے اور جگرِ لخت لخت کی طرح ریزہ ریزہ اوراق کو جمع کر کے سوزن کاری کا فریضہ انجام دیتے ہیں، لیکن شاید جگرِ لخت لخت کی نسبت ان ریزہ ریزہ اوراق کو جمع کرنا زیادہ مشکل ہے، جنھیں گزری ساعتوں کی ہوائیں خدا جانے کہاں کہاں اڑائے پھرتی رہیں اور اگر وہ اِدھر اُدھر کہیں پڑے بھی رہ گئے تو کرم زدگی اور شکستگی نے ان پر نہ معلوم کیا کیا قیامتیں ڈھائیں، کہاں کہاں سے حرف و لفظ اُچک لیے گئے، کہاں کہاں کی روشنائی وقت کا ساتھ نہ دے سکی اور نقوش اتنے مدھم پڑ گئے کہ بصارت تو ایک طرف، بصیرت بھی گھٹنے ٹیک گئی۔ ایسے میں صاحب تدوین کے لیے ایک پُلِ صراط ہے جسے عبور کرنے کے لیے احتیاط تو خیر لازمی ہی ہے، ہمت و حوصلہ بھی درکار ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے عین جوانی کے عالم میں تحقیق و تدوین کے باب میں چند ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جن کے لیے عام طور پر بزرگی کا شرف درکار ہوتا ہے۔ تحقیق کا سفر بڑی آبلہ پائی کا سفر ہے۔ یہ سفر جہاں ختم ہوتا ہے، وہاں سے ایک دوسرا سفر شروع ہوتا ہے، جس کے لیے دیدہ ریزی اور جاں سوزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو شخص عنفوانِ شباب میں یہ غم جھیلنے کا حوصلہ پیدا کر لے اُسے ضعفِ پیری کے خطرات ڈرا نہیں سکتے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے شعر گوئی اور سخن فہمی کا سلیقہ اپنے والد جناب سیّد وحید الحسن ہاشمی صاحب سے پایا، جو نسلاً بعد نسل اس خاندان میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، لیکن انھوں نے شاعری کو ذریعۂ عزت بنانے کے

بجائے تحقیق و تدوین اور تنقید سے اپنا ناتا جوڑ لیا کہ اس میں علم و ادب کے آفاق کو چھونے اور تاریخِ ادب کے وسیع تر پھیلاؤ میں وسعت پذیر ہونے کے امکانات زیادہ نظر آئے۔ یوں بھی اُن کی مہم جُو اور نکتہ رس طبیعت کو تحقیق کا میدان ہی راس تھا۔ نئی چیزوں کی تلاش اور ان میں نئے پہلوؤں اور نئی جہتوں کی دریافت سے انسان کو اتنی ہی طمانیت اور آسودگی حاصل ہوتی ہے، جتنی ایک عمدہ شعر کہنے یا ایک اعلیٰ نثر پارے کی تخلیق سے۔ یہاں تحقیق و تنقید کو تخلیق کے مقابلے پر رکھ کر دیکھنا مقصود نہیں، کیوں کہ تخلیق کا مرتبہ بہر حال بلند ہے لیکن تحقیق و تنقید کو تخلیق سے کم درجے کی شے قرار دینا بھی مناسب نہیں کہ تفہیم و ادراک کے مرحلوں کو آسان بنانے اور تخلیق شناسی کا جوہر پیدا کرنے میں محقق اور نقاد کی بصیرت ہی کام آتی ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تحقیقی و تنقیدی مقالات پر مشتمل پہلی کتاب ''مفاہیم'' منظرِ عام پر آئی تو اہلِ فکر و نظر نے نہ صرف ان کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کیا بل کہ مستقبل کے روشن امکانات کی پیشگوئی بھی کر دی۔ بلند فکر اساتذہ اور صاحبانِ بصیرت نے ان کی تحقیقی و تنقیدی ریاضتوں پر تحسین آمیز آرا قلم بند کیں اور یوں وہ ایک نئے حوصلے اور عزم کے ساتھ نئے منطقوں کی تلاش میں جادہ پیما ہوئے۔ ''ترجیحات'' ان کی دوسری اہم اور قابلِ ذکر تحقیقی و تنقیدی کتاب تھی، جسے آثار و افکار اکادمی کراچی نے ۱۹۹۸ء کی بہترین کتاب گردانتے ہوئے انعام کا مستحق ٹھہرایا۔ ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی''، ''ترجیحات'' سے پہلے منظرِ عام پر آ گئی تھی۔ اس کتاب کے ذریعے سید آلِ رضا مرحوم پہلی مرتبہ اپنی غزل گوئی کے حوالے سے علمی و ادبی حلقوں کا موضوع بنے۔ ان کی شخصیت اور فن کے نئے گوشوں کی بازیافت، خصوصاً ان کے سنِ ولادت کے تعین کے سلسلے میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی معرکتہ الآرا بحث نے تحقیق و تنقید کے نئے دَر کھولے اور اہلِ فن کو باور کرایا کہ تحقیق میں اُلجھے ہوئے معاملات کی گرہ کشائی کے لیے کس نوع کی ہنر مندی درکار ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیق کے اچھوتے انداز سے متعارف کراتی ہے۔

سید آلِ رضا کی شخصیت اور فن ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحقیق و تنقید کا مستقل موضوع رہا ہے۔ اس کا بنیادی سبب شاید یہ ہے کہ سید آلِ رضا سخنوری میں ان کے والد گرامی سید وحید الحسن ہاشمی کے اُستاد تھے اور اس حوالے سے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی جستجوئے شوق کا مرکز بھی۔ چناں چہ انھوں نے لکھنوی اندازِ شاعری کی اس آخری یادگار کے تمام احوال و آثار اور کلام کو محفوظ کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور اس میں وہ حیران کن حد تک کامیاب رہے ہیں۔

حال ہی میں ان کی طویل جد و جہد اور محنت کا ثمرہ ''باقیاتِ آلِ رضا'' کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتاب میں انھوں نے آلِ رضا کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام کو اس خوش سلیقگی سے مدون کیا ہے کہ خود آلِ رضا کے اقربا حیران ہیں کہ یہ انہونی کیسے ہوگئی۔ اس کتاب پر آلِ رضا کے بھائی سید ہاشم رضا کا یہ تبصرہ نہایت اہم ہے کہ سید آلِ رضا کی بعض چیزیں پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعے ان کے علم میں آئی ہیں۔ میرا

خیال ہے کہ اگر ایک محقق اپنی تحقیق کے نتائج سے آپ کو حیران کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور آپ کے رگ و پے میں مسرّت کی ایک لہر پیدا کر دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اُسے ایک بڑا صاحبِ فن تسلیم کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

یوں تو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا بیشتر تحقیقی کام اہلِ علم کی حیرانی اور مسرّت میں اضافہ کرتا ہے لیکن ''باقیاتِ آلِ رضا'' کی تدوین نے انھیں ایسے قابلِ لحاظ تحقیق نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جنھیں اُردو ادب کے اہم تحقیقی کاموں کا ذکر کرتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

''باقیاتِ آلِ رضا'' کے آغاز میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے تقریباً ۷۰ صفحات پر مشتمل ایک جامع اور مبسوط مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے۔ یہ مقدمہ ان کی اعلیٰ علمی استعداد اور تحقیقی صلاحیتوں کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس مقدمے میں انھوں نے جہاں سیّد آلِ رضا کی شخصیت اور تخلیقی سفر کے حوالے سے نادر و نایاب مواد جمع کر کے حُسنِ ترتیب کے جوہر جگائے ہیں، وہاں اُصولِ تدوین پر بھی ایسی معلومات افزا اور فکر انگیز بحث کی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ انھوں نے شاعری کی تدوین کے مروّجہ طریقوں کو سامنے رکھ کر نہ صرف دیکھا اور پرکھا ہے بل کہ سیّد آلِ رضا کے کلام کی تدوین پر ان کا انطباق کر کے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان میں سے بیشتر طریقے اپنے فنی نقائص کے سبب کار آمد نہیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ بنے بنائے تحقیقی اُصولوں کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا جائے بل کہ نئی اور بدلی ہوئی صُورتِ حال میں ایک محقق کو اجتہاد کر کے نئے زاویے قائم کرنے اور نئے اُصولوں کو وضع کرنے کا فریضہ بھی انجام دینا چاہیے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے زیرِ نظر کتاب میں بعض پہلوؤں سے تحقیق کا ایک نیا منظر نامہ ترتیب دیا ہے۔

سیّد آلِ رضا کا غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام، جو دو بیاضوں میں، بوسیدہ کاغذ کے ٹکڑوں، چند کارڈوں اور اخبارات و رسائل سے دستیاب ہُوا، اپنی تدوین کے ابتدائی مراحل ہی میں صاحبِ تدوین کے لیے جو اُلجھنیں پیدا کرتا ہے، ان کی تفصیل اپنی جگہ پر، لیکن اس مقدمے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں سیّد آلِ رضا کی متنوع اصنافِ سخن کی موجودگی میں کہیں ہیئت اور کہیں صنف کے تعیّن میں درپیش عقدوں کو جس صفائی اور خوب صورتی سے حل کیا گیا ہے، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ ہمارے کئی تدوین کار عام طور پر اس تردّد میں نہیں پڑتے اور اپنی سہولت کو مقدّم رکھتے ہوئے اصناف کو بے سبب خلط ملط کر جاتے ہیں، جس سے تدوین کے اُصول تو ایک طرف رہے، ان کے بنیادی تقاضے بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف ہیئت کا تعیّن کرنے میں کوئی غلطی نہیں کرتے بل کہ بعض اشعار کے موضوعی سلسلوں کے حوالوں سے ان کی صنف کا تعیّن کرنے میں بھی باریک بینی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے باقاعدہ مثالیں دے کر یہ واضح کیا ہے کہ سیّد آلِ رضا کے فلاں اشعار، سلام یا قطعہ کے بجائے نظم یا کسی دوسری صنف کے ذیل

میں آتے ہیں۔اس نوع کے کام کے لیے ایک خاص طرح کی شعری استعداد درکار ہوتی ہے۔شاعری کی تدوین میں یہ استعداد قدم قدم پر اپنی اہمیت اور افادیت کا احساس دلاتی ہے۔خوش قسمتی سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نہ صرف شعر فہمی کی صلاحیت رکھتے ہیں بل کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی کی تربیتِ خاص نے انھیں شعر کہنے کا سلیقہ بھی بخشا ہے اور وہ شعر گوئی کے باوصف علمِ عروض کی جملہ جزئیات تک بھی بکمال خوبی رسائی رکھتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے تدوین کے اس کام میں اپنی ان صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔

سیّد آلِ رضا کے دستیاب کلام کو گیارہ اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے۔مقدمے میں ان جملہ اصناف کے تفصیلی تعارف کے ساتھ آلِ رضا کے یہاں ان کے برتاؤ اور اس تناظر میں ان کی شاعرانہ انفرادیت اور نمایاں اوصاف اُجاگر کیے گئے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۸۰ء میں جب سیّد آلِ رضا کی غزل گوئی پر تحقیقی کام کا آغاز کیا تھا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کی بیشتر تخلیقات ابھی تک غیر مطبوعہ اور غیر مدون صورت میں بکھری پڑی ہیں چناں چہ انھوں نے سیّد آلِ رضا کے حقیقی بھائی سیّد ہاشم رضا اور صاحبزادی محترمہ رعنا زیدی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ یہ منتشر شعری سرمایہ ''باقیاتِ آلِ رضا'' کے نام سے مدون ہونا ضروری ہے۔انھوں نے اس سلسلے میں پیش رفت کا وعدہ تو کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں دبی ہوئی یہ خواہش ضرور موجود تھی کہ اس بڑے اور اہم کام کو سرانجام دینے کا سہرا بھی اسی شخص کے سر بندھنا چاہیے،جس نے سیّد آلِ رضا کو نئے سرے سے زندہ کرنے کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے اور اپنے ذاتی وسائل کی بنیاد پر اس تعلقِ خاطر کو نبھانے کے لیے ہمہ تن کوشاں ہے چناں چہ یہ سعادت ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے مقدر میں تھی، سوان ہی کے حصے میں آئی۔

جہاں تک ''باقیاتِ آلِ رضا'' میں شامل کلام کے صحتِ متن کا سوال ہے،تو اس سلسلے میں نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ جملہ ہی کافی ہے کہ:

''یہ متن صحت کے اعتبار سے کئی معاصرین کے کام سے بازی لے گیا ہے۔''

تدوینِ متن کے سلسلے میں تمام وضاحتی امور کو بھی مقدمے میں زیرِ بحث لایا گیا ہے۔سیّد آلِ رضا کے متنِ کلام میں قدیم طریقۂ املا استعمال ہوا ہے،جس کے بعض الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں مثلاً توجھ (توجہ) ،منھ (مُنہ)، پھاڑ (پہاڑ)، چھرے (چہرے)، دوھرائی (دہرائی)، سونچے (سوچے) اور اس قسم کے کئی اور الفاظ تواتر سے سیّد آلِ رضا کے یہاں استعمال ہوئے ہیں چناں چہ صاحب تدوین کے خیال میں آلِ رضا کے کلام کو زیادہ بہتر، بامقصد اور رواں عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کے لیے ایسے الفاظ کے املا کو جدید شکل دینا ضروری تھا۔چناں چہ انھوں نے یہ کام حد درجہ احتیاط سے سرانجام دیا ہے اور حواشی میں اصل املا کے الفاظ بھی درج کر دیے ہیں۔

سیّد آلِ رضا کے قلمی مسودے میں بعض الفاظ کو ملا کر لکھا گیا ہے چناں چہ تدوین کے دوران ابلاغ کو

آسان بنانے کے لیے ان الفاظ کو الگ الگ صورت میں رقم کیا گیا ہے۔ البتہ سید آلِ رضا کی استعمال کی ہوئی رموزِ اوقاف کی علامتوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اور انھیں احتیاط سے من وعن ثبت کیا گیا ہے۔

اصل مسودے میں سہواً رہ جانے والے الفاظ کے سلسلے میں قیاس اور ذوقِ سلیم پر بھروسہ کر کے قوسین میں ممکنہ الفاظ درج کیے گئے ہیں اور حاشیے میں ان کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ایک سے زائد نسخوں کی صورت میں جہاں متنی اختلافات سامنے آئے ہیں، ان کی وضاحت بھی حاشیے میں موجود ہے تاہم تدوینِ متن میں قلمی بیاض کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

کتاب میں سید آلِ رضا کے کلام کو صنفی درجہ بندی کے ساتھ ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے اور اس میں بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ تمام کلام ردیف وار ہونے کے ساتھ ساتھ آخری حرف کے لحاظ سے معکوس الترتیب بھی ہو۔ یہ خاص بات بہت کم دواوین میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ کتاب کے آخر میں آلِ رضا کے نام سے شائع ہونے والا الحاقی کلام بھی درج ہے اور اپنے موقف کی تائید میں واضح شہادتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔ آلِ رضا کا نو دریافت اور متروک کلام بھی کتاب کے آخری حصے میں شامل ہے اور صاحبِ تدوین کی تحقیقی ریاضت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مزید یہ کہ آلِ رضا کی غزلوں کے دو مجموعوں ''نوائے رضا'' اور ''غزلِ معلّیٰ'' میں شامل غزلوں کا اشاریہ مرتب کر کے ڈاکٹر صاحب نے سید آلِ رضا کے مجموعۂ کلام کی ایک جھلک بھی دکھائی ہے۔

المختصر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے اس بلند پایہ تحقیقی کام کی جس قدر تحسین کی جائے، کم ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے ایک بڑے شاعر کی متاعِ بے بہا کو قارئین تک پہنچا کر اپنی محبت اور اخلاص کا حق ہی ادا نہیں کیا بل کہ تحقیق و تدوین کی روایت میں بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس شاندار اور بے مثال کام کے ذریعے انھوں نے خود کو ان مستند اور قابلِ اعتبار محققین کی فہرست میں شامل کر لیا ہے جن کی تحقیقی کاوشیں تلاش و عمل کے سلسلوں کی استواری کا بھی باعث ہیں اور آئندہ ادبی تحقیق کے لیے ایک ٹھوس بنیاد بھی فراہم کرتی ہیں۔

(بحوالہ ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، جنوری ۲۰۰۳ء)

◆◆◆

باقیاتِ آلِ رضا...... تحقیقی و تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ریاض قدیر

◆◆

اہم شعرا کے غیر مطبوعہ و غیر مدون کلام کی تدوین اس لحاظ سے ادبی تحقیق کا ایک دقیع عمل ہے کہ اس سے جہاں کسی معروف شاعر کی شاعری کے بعض مخفی پہلو منکشف ہوتے ہیں وہاں اس شاعر کے شعری سفر کے جملہ مراحل کی تفہیم کے در بھی وا ہو جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اتنا بڑا شاعر اپنی تخلیقات کو جب انتخاب کی میزان پر تولتا ہے تو بعض فنی اعتبار سے بعض کم معیار تحریروں کو کتابی صورت میں منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتا۔ خود احتسابی کا یہ عمل شعر و اَدب کی تاریخ میں اس شاعر کے مقام و مرتبے کی عظمت کو یقینی بناتا ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخِ اَدب میں بلند مقام مل جانے کے بعد اس شاعر کے کلام کی باقیات بھی اَدبی تاریخ کی لازمی ضرورت بن جاتی ہیں کیوں کہ ان تحریروں میں بھی اس کی غیر معمولی شخصیت کے تخلیقی کرشموں کے سرچشموں کا سراغ ملتا ہے۔

آلِ رضا بیسویں صدی کے شعری ادب کی تاریخ میں مرثیہ اور غزل کے حوالے سے ایک منفرد مقام و مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ آپ نے نہ صرف لکھنؤ کی شعری روایات کو آگے بڑھانے میں اہم کردار اَدا کیا بل کہ اپنی تخلیقی سوچ سے اُردو شاعری میں نئے نئے موضوعات اور اسالیب کا اضافہ کیا۔ آلِ رضا کا شعری سفر نصف صدی کو محیط ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

ہزاروں اشعار پر مشتمل آپ کے کلام کے قریباً چھ (۶) مجموعے مدون صورت میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس کے باوجود آپ کے کلام کا ایک بڑا حصہ مختلف رسائل، اخبارات نیز آلِ رضا کے ذاتی بیاضوں اور بعض کاغذات میں بکھرا ہوا تھا، جسے یک جا کر کے تحقیق کے اصولوں کے مطابق مدون کر کے شائع کرنا اُردو شعر و اَدب کی اہم ضرورت تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت اس کام کے لیے موزوں ترین ثابت ہوئی

ہے۔ کسی شاعر کے غیر مطبوعہ اور غیر مدون کلام کو تدوین و تحقیق کے اصولوں کے مطابق مدون کرنا ایک کٹھن اور نازک فن ہے۔ اس کے لیے بیک وقت مسلسل لگن، ذوقِ لطافت اور تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔

آلِ رضا اس لحاظ سے ایک خوش قسمت شاعر ہے کہ اسے پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن جیسا صاحب نظر نقاد اور محقق میسّر آیا جنھوں نے نہایت لگن، تحقیقی بصیرت اور تنقیدی شعور کے ساتھ نہ صرف کلامِ رضا کو مرتب و مدون کیا ہے بل کہ وقیع تحقیقی و تنقیدی نتائج کا استخراج کرنے کے بعد اُردو شعر و ادب میں آلِ رضا کے مقام و مرتبے کا تعین بھی کیا ہے۔ ''باقیاتِ آلِ رضا'' ہماری اُدبی تحقیق میں ایک اہم اضافہ ہے جو متنی تنقید، تحقیق اور عمومی تنقیدی تجربے کا امتزاجی جامع ہے۔ اس اجمال کی وضاحت کے لیے ہمیں ''باقیاتِ آلِ رضا'' کو تحقیق و تدوین کے فنی اصولوں کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔

متنی تحقیق اور تدوینِ کلام میں بنیادی کام متن کے مختلف مآخذات تک رسائی حاصل کر کے اصل متن کی بازیافت اور اسے صحت کے ساتھ منظرِ عام پر لاتا ہے۔ کتاب کے مرتب و محقق نے اس ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی سے قبول کیا ہے اور آلِ رضا کے غیر مطبوعہ مدون کلام کے جملہ مآخذات تک پہنچنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مختلف رسائل و اخبارات سے آگے بڑھ کر شاعر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں آلِ رضا کی دو بیاضوں کا اور دیگر کاغذات پر مشتمل کلام کا حصول فاضل محقق کے ذوقِ تحقیق اور جذبۂ جستجو کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

ایک سچے محقق کی طرح انھیں راہِ تحقیق کے کٹھن مراحل طے کرنے میں ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے اور وہ تحقیق کے خاردار راستوں سے دامن بچانے کی بجائے راہ کو پُر خار دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنے اس کام کی تکمیل میں انھوں نے قریباً نصف معروف اور غیر معروف اخبارات و رسائل کی فائلوں تک رسائی حاصل کی۔ تین ماہ تک کراچی میں قیام کیا اور پھر ملک کے نامور محققین سے مختلف تحقیقی امور پر تبادلۂ خیال کیا۔

فاضل محقق کی تحقیقی دیانت اور محنت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے محض آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کو ہو بہو شائع کر دینے پر اکتفا نہیں کیا بل کہ بعض رسائل میں شایع ہونے والے غیر مدون کلام کو بھی شاعر کے بیاضوں سے موازنہ کر کے صحتِ متن کے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ جس سے کتاب کی تحقیقی و تاریخی وقعت دو چند ہو گئی ہے اور آلِ رضا کا تمام تر غیر مدون کلام صحتِ متن کے ساتھ یک جا ہو گیا ہے۔

متن کے مختلف روپ حاصل کرنے کے بعد متنی نقاد کے لیے بہت بڑا مسئلہ درست متن کا ہے۔ اصل روپ کا تعین اور اس کی ترتیب و تدوین ہے۔ متنی تنقید کے مروجہ اور مستند اُصول کے مطابق مصنف یا شاعر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہی بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''باقیاتِ آلِ رضا'' میں بھی شاعر کی بیاضوں اور دیگر خود نوشت کلام کو متن کی بنیاد بنایا گیا ہے اور اسے اصل متن کا درجہ دے کر شاملِ کتاب کیا گیا ہے جب کہ حاشیہ

میں بیاضوں کے علاوہ دیگر مقامات (اخبارات و رسائل) میں چھپنے والے کلام کو موازنے کے کام لایا گیا ہے اور مختلف متون کا فرق بھی حاشیے میں واضح کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں فاضل مرتب نے اپنے ذوقِ حُسن سے یہ اہتمام رکھا ہے کہ حواشی کی بے جا افراط اور تکرار کی صورتِ حال پیدا نہ ہونے پائے۔

کسی بھی شاعر کے کلام کی تدوین کا عمومی طریقہ ہمارے یہاں قدیم دوائن میں کلام کی ردیف وار تدوین رہا ہے۔ بعد کے متنی محققین نے شعرا کے کلام کو موضوعاتی اعتبار سے مدون کرنے کی طرح ڈالی، پھر تاریخی ترتیب (سن وار) سے بھی کلام کو مدون کرنے کا طریق اپنایا گیا۔ اسی طرح حروفِ تہجی کے اعتبار سے کلام کو ترتیب دینے کا انداز بھی نظر آتا ہے۔

تدوین کے یہ چاروں طریقے اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے اہم اور مستند قرار دیے جا سکتے ہیں تاہم یہ شاعر کے دستیاب کلام کی نوعیت کے پیشِ نظر اس کے کلام کی تدوین کا مناسب و موزوں طریقۂ تدوین کون سا ہوگا؟ یہ متنی محقق اور مرتب کے تحقیقی و تنقیدی شعور کا اصل امتحان ہوتا ہے کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر شاعر کے دستیاب کلام کی تدوین کا کوئی حتمی طریق مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ فاضل مرتب ''باقیاتِ آلِ رضا'' تدوینی مسائل کے جملہ پہلوؤں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اگر کسی شاعر کا کلام سن وار تاریخی ترتیب سے مدون ہو کر سامنے آ جائے تو ادبی ناقدین کے لیے شاعر کے فکری و فنی ارتقا کو سمجھنے میں نہایت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ طریق شاید کسی شاعر کے کلام کی تدوین کے لیے سب سے مفید اور مناسب ہوتا ہے۔

آلِ رضا کے دستیاب کلام میں چوں کہ اکثر مقامات پر تاریخ تخلیق تحریر نہیں کی گئی لہٰذا کلام کو تاریخی ترتیب سے مدون کرنا ناممکن تھا۔ اندریں حالات مرتب نے اپنے تدوینی شعور سے کام لیتے ہوئے تدوین کے مروجہ طریقوں کے امتزاج سے کلامِ رضا کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ پہلے تمام کلام کو اصناف کے اعتبار سے الگ الگ کر لیا ہے۔ پھر ہر صنف کے کلام کو ردیف وار ترتیب دے کر شاملِ کتاب کیا ہے۔ اس طریقِ کار میں فاضل مرتب پر اگرچہ دو چند محنت و کاوش کرنا پڑی ہے لیکن اس سے قاری اور محقق و نقاد کے لیے سہولت پیدا ہو گئی ہے نیز تمام متن حسنِ ترتیب کا نمونہ بن گیا ہے، جو جاذبِ نظر بھی ہے اور کتاب سے عملی استفادہ کے لیے کارآمد بھی۔

بحیثیت مجموعی کتاب کے مرتب نے متنی تنقید کے جملہ تقاضوں کا نہ صرف گہرا اور بھرپور شعور رکھتے ہیں بل کہ متنی تنقید کے جملہ اُصولوں کو عملی طور پر برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ مثلاً مسودات میں جو الفاظ سہواً رہ گئے ہیں۔ فاضل مرتب نے انھیں قیاسی تصحیح سے قوسین میں لکھ کر شاملِ متن کر لیا ہے۔ جس سے متن مکمل حالت میں سامنے آ گیا ہے۔

مسودات میں قدیم طریقِ املا کے مطابق لکھے گئے الفاظ کو عصرِ حاضر کے مروجہ طریقۂ املا کے مطابق تحریر کیا گیا ہے، تاکہ قاری کو اجنبیت کا احساس نہ ہونے پائے۔ اس عمل میں فاضل مرتب نے فنِ تدوین کے

تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ذوقِ شعری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور یہ احتیاط برتی ہے کہ املا کی تبدیلی کے اس عمل سے شعر میں کسی قسم کا فکری یا فنی سقم پیدا نہ ہونے پائے اور جہاں ایسی صورتِ حال پیدا ہونے کا اندیشہ تھا وہاں محض میکانکی انداز سے املا تبدیل کرنے کی بجائے قدیم املا کو جوں کا توں رہنے دیا ہے مثلاً ایک شعر کی مثال دیکھیے:

جب نکلتا ہوں اُدھر سے تو بڑی دور تلک
کان بجتے ہیں کہیں اس نے پکارا تو نہیں (ص ۱۹۲)

یہاں مصرع اول میں ''تلک'' کے قدیم طریقِ املا کو برقرار رکھا گیا ہے کیوں کہ اسے تک کرنے سے شعر وزن سے گر جاتا۔ اسی طرح الحاقی کلام کی تحقیق کر کے اسے الگ سے شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں فاضل مرتب نے آلِ رضاؔ کے شعری مزاج اور منفرد اُسلوب کو مدِ نظر رکھ کر اصل کلام اور الحاقی کلام میں امتیاز کیا ہے اور اپنے رضا شناس ہونے کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے۔

باقیاتِ آلِ رضاؔ کے آغاز میں شامل ''مقدمہ'' بذاتِ خود تحقیق و تنقید کے اعلیٰ معیار کا عملی نمونہ ہے۔ جس میں آلِ رضا کے سوانحی حالات کو لکھنؤ اور کراچی کے ادبی ماحول کے تناظر میں نہایت (تحقیق سے جامع انداز میں) مرتب کیا گیا ہے۔ نیز آلِ رضاؔ کی شخصیت اور شاعری کے جملہ اوصاف کی روشنی میں ان کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کر دیا گیا ہے۔

آغازِ کتاب میں آلِ رضاؔ کی شاعری سے متعلق جملہ اصنافِ شعر، حمد، نعت، منقبت، سلام، نوحہ، غزل، نظم، قطعہ، رباعی، مرثیہ اور فرد وغیرہ کا مختصر تعارف کروانے کے بعد ہر صنف شاعری میں آلِ رضاؔ کی شعر گوئی کے بارے میں نہایت جامع تحقیقی و تنقیدی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب محض تدوینِ کلام کے عمل تک محدود نہیں رہی بل کہ اُردو کی جملہ اصنافِ شعر کی فنی روایات اور ارتقائی مراحل کے تناظر میں آلِ رضا کی ادبی خدمات اور Contribution کا احاطہ بھی کرتی ہے۔

بحیثیت مجموعی ''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' فنِ تحقیق و تدوین کا ایک جامع مرقع ہے جو صحتِ متن، تدوینی تکنیک اور تحقیقی طریقِ کار کی بنا پر ہم عصر اَدبی تحقیق میں نہ صرف منفرد مقام کا حامل ہے بل کہ آنے والے محققین اور ناقدین کے لیے ایک معیار کا کام دے سکتا ہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی بالغ نظری

''باقیاتِ آلِ رضا'' کے حوالے سے

امتیاز حسین

◆◆

تحقیق ایک فن ہے۔ یہ فن بلاشبہ سہولت و آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ تحقیق کسی مخفیہ، مبہم اور غیر واضح امر کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے کا عمل ہے۔ اس عمل کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور مسائل کے پیشِ نظر ہی مایہ ناز محققین نے اسے جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ تحقیق اور تدوین ایک موضوع نہیں بل کہ دو الگ الگ موضوع ہیں، البتہ ان دونوں کی حدیں کہیں کہیں باہم مل جاتی ہیں۔ رشید حسن خان صاحب نے اس سلسلہ میں بجا فرمایا ہے کہ:

> ''تحقیق کا لفظ عام طور سے ان دونوں (تحقیق اور تدوین) پر حاوی سمجھا جاتا ہے مگر یہ اچھا خاصا خلط مبحث ہے۔''[۱]

تحقیق سے تدوین اگلی منزل ہے۔ تحقیق کرنا دشوار ہے تو تدوین دشوار تر۔ تحقیق کی راہ میں متعدد دشواریاں اور مسائل درپیش آتے ہیں تو تدوین کے کام میں بڑے گھمبیر مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جیسے ہر پڑھا لکھا محقق نہیں ہو سکتا، ویسے ہی ہر محقق ترتیب و تدوین کا کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ جو محقق تحقیقی مزاج رکھتا ہو اور آدابِ تحقیق سے آشنا ہو، وہ اُصولِ تحقیق سے کماحقہٗ آگاہ ہو اور عمل کے میدان میں تجربہ کار ہو تو وہ ترتیب اور تدوین کا کام احسن طور پر کر سکتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نکتہ شناس، پختہ شعور، کہنہ مشق اور مستند محقق ہیں۔ بلاشبہ آپ اُردو ادب پر بڑی عمیق نظر رکھتے ہیں۔ آپ کو معلوم تھا کہ بیسویں صدی کی شعری تاریخ میں سیّد آلِ رضا اپنا ایک منفرد مقام

رکھتے ہیں۔ان کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ اور غیر مدّون ہے، جس کو طبع کرانے کی کئی ایک کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوسکیں۔اس کی وجہ اس کام کا انتہائی دشوار گزار اور وقت طلب ہونا ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اس اہم اور وقیع اَدبی کام کا آغاز کردیا۔ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''راقم نے ۱۹۸۰ء میں آلِ رضا کی غزل گوئی پر باقاعدہ تحقیقی کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ آلِ رضا کی بیشتر تخلیقات ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں...... بہر حال راقم نے ''آلِ رضا کی غزل گوئی'' پر اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا، جو قطع برید کے بعد ۱۹۸۹ء میں ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' کے نام سے شایع ہوا۔ابتدا ہی سے راقم کی یہ کوشش وخواہش تھی کہ آلِ رضا کا غیر مطبوعہ کلام کسی نہ کسی طرح مدّون ہو جائے، تاکہ ان کی علمی واَدبی حیثیت کا بارِ دگر تعین ہو سکے۔اپنی نوعیت اور وسعت کے اعتبار سے یہ کام انتہائی دشوار گزار اور ناممکن دکھائی دیتا تھا۔''[۲]

ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے آلِ رضا کے غیر مطبوعہ اور غیر مدّون تخلیقات کو ایک فائل میں اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔اسی دوران انھوں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے اربابِ اختیار سے تحریری درخواست کی کہ وہ ایم۔فل (اُردو) کی سطح پر تحقیقی کام کی اجازت مرحمت فرمائیں، چناں چہ ان کی اس درخواست کو بمسرت وامتنان قبول کرلیا گیا۔اس تحقیقی کام کی نگرانی کے لیے برصغیر پاک وہند کے نامور نقاد پروفیسر ڈاکٹر سجاد باقر رضوی صاحب کو متعین کیا گیا، جنھوں نے یہ فریضہ بڑے احسن انداز میں پورا کیا۔اس حقیقت کا اعتراف ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یوں کیا ہے:

''باقر صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔آپ علم وادب کے ایک بحرِ ناپیدکنار ہیں۔اس مقالے کو خوب تر بنانے کے لیے ان کے گراں قدر مشورے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ اگر آپ کو اس مقالے میں کچھ محاسن نظر آئیں تو وہ باقر صاحب کا فیضان ہیں کہ اپنی علالت کے باوجود پورے کام کو نہایت محنت اور محبت سے پڑھا۔اپنے قیمتی مشوروں سے اس تحقیقی کام کی فنی حیثیت کو استحکام بخشا۔''[۳]

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو اپنے تحقیقی مقالے ''باقیاتِ آلِ رضا'' کی تکمیل کے دوران درپیش آنے والے مسائل سے نمٹنے کے سلسلے میں برصغیر پاک وہند کے نامور محققین اور ناقدین بالخصوص ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، ڈاکٹر نثار قریشی صاحب، ڈاکٹر سہیل احمد خاں صاحب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب اور ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی وغیرہ سے بہترین راہ نمائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔سیّد وحید الحسن ہاشمی جو کہ سیّد آلِ رضا مرحوم کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ مایہ ناز شاعر، ادیب اور نقاد ہیں، نے بھی اس تحقیقی کام میں بھرپور معاونت فرمائی۔ضمیر اختر نقوی، سیّد ہاشم رضا اور نواز حسن زیدی وغیرہ نے بھی اس سلسلہ میں ڈاکٹر شبیہ الحسن

صاحب کی ہر ممکن مدد کی۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جہاں اپنے عہد کے نامور محققین و ناقدین کی بہترین آراء سے استفادہ کیا، وہاں خود بھی دس برس تک سخت محنت و جاں فشانی سے کام کیا۔ انھوں نے وطنِ عزیز کی تمام قابلِ قدر لائبریریوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسی دوران تین ماہ تک کراچی میں قیام کیا اور ڈاکٹر باقر رضوی صاحب، اسیر فیض آبادی اور محترم منقاد حیدر اختر صاحب کی بھرپور مدد سے ممکنہ حد تک مواد حاصل کیا۔ اس تحقیقی کام کو بہتر سے بہتر بنانے میں جہاں مقالہ نگار کے گھر کا جنت نظیر، علمی اور ادبی ماحول معاون رہا، وہاں پروفیسر طاہر مسعود اور پروفیسر عباس رضا کا وجود بھی بہت معین و مددگار رہا۔ یہ تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں ''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' کے نام سے برسوں کی شبانہ روز محنت کے بعد جون ۲۰۰۰ء کو لاہور سے طباعت کی روشنی حاصل کر سکا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے خود راقم رقم طراز ہے:

> ''آلِ رضاؔ کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین کے حوالے سے جنم لینے والے مسائل اور مشکلات کا جزوی ذکر راقم نے ابتدائی صفحات میں کر دیا ہے لہٰذا ان تمام نکات کو دہرانا کسی صورت میں بھی مناسب نہیں، تاہم ہم نہایت عاجزی سے کہنا چاہتے ہیں کہ زیرِ نظر کتاب اس برس کی مسلسل اور متواتر محنتوں کا ثمر ہے۔''[۴]

''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' کا پہلا ایڈیشن جون ۲۰۰۰ء میں الحسن پبلی کیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام طبع ہوا ہے۔ اس کتاب کی طباعت اور کتابت جاذبِ نظر، کاغذ خوب صورت اور معیاری ہے۔ پروف خوانی بہت بہتر ہے۔ البتہ چند غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا سرورق کوہ نور آرٹ سیکشن والوں سے بڑی ذہانت سے تیار کروایا گیا ہے، جس میں سیّد آلِ رضاؔ کی تصویر کا عکس خوب صورتی سے ایڈجسٹ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' کے آغاز میں ۴۷ صفحات پر مشتمل مفصل محققانہ و ناقدانہ مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑی عرق ریزی کے نتیجے میں سیّد آلِ رضاؔ کے سوانحی حالات اور سیرت و شخصیت کو لکھنؤ اور کراچی کے سماجی، علمی اور ادبی ماحول کے تناظر میں بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی بل کہ سیّد آلِ رضاؔ کی سیرت و شخصیت اور ان کے کلام کی جملہ خوبیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُن کا اُردو ادب میں مقام اور مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بطور نمونہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

> ۱۔ ''۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کا عمل وقوع پذیر ہوا۔ ہنرمند اور اہلِ دانش مسلمانوں کی پاکستان ہجرت نے دلّی اور لکھنؤ جیسے دبستانوں کو ویران کر دیا آلِ رضاؔ تو لکھنؤ کے پرستار تھے، اور اس کوچے سے اُن کو بے پناہ محبت تھی، لہٰذا لکھنؤ سے ہجرت کرنا انھیں سوہانِ رُوح تھا...... بہرحال

آلِ رضا اپنے بھائیوں کے پُر زور اصرار پر لکھنؤ سے کراچی تشریف لے آئے۔ کراچی میں اگرچہ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے اصحاب کی کثیر تعداد میں موجود تھی، تاہم آلِ رضا عمر بھر اس لکھنوی فضا کو یاد کرتے رہے، جس کے وہ پروردہ تھے۔''۵

۲۔ ''آلِ رضا نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزارا تھا یہی سبب ہے کہ آخری عمر تک ان کے لکھنوی طرزِ بود و باش میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ بڑی نفاست اور نزاکت سے انگرکھا بھی پہنتے اور ٹوپی اور شیروانی بھی...... آلِ رضا اگرچہ ایک سادہ منش، سنجیدہ، کم گو اور متین انسان تھے تاہم ان کے مزاج میں شوخی اور ظرافت کے عناصر بھی موجود تھے۔''۶

۳۔ ''بیسویں صدی میں لکھنؤ کی شعری روایات کو زندہ رکھنے اور انھیں معتبر بنانے والوں میں سیّد آلِ رضا کا نامِ نامی بھی شامل ہے۔ آپ نے نہ صرف اس شعری روایت کو آگے بڑھایا بل کہ اپنی جدّتِ طبع سے اس میں نئے نئے موضوعات و اسالیب بھی پیدا کیے۔ نظم اور نثر دونوں میں جو طبع آزمائی کی، اس سے ان کی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار ہوا...... آپ نے غزل اور مرثیہ دونوں میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات و میلانات بھی شامل کیے۔ اس سبب سے وہ بیسویں صدی کی شعری تاریخ میں ایک منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔''۷

''باقیاتِ آلِ رضا'' کے آغاز میں درج مقدمے میں اس کتاب میں دستیاب سیّد آلِ رضا کی شاعری کے حوالے سے اصناف کا مختصراً تعارف بھی کروایا گیا ہے، جس کی مدد سے سیّد آلِ رضا کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی تفہیم میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ یقیناً مقدمے کا یہ حصہ قارئین کی بہت راہ نمائی اور معاونت کرتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے نہایت عمدہ اندازِ بیان اپنایا ہے۔ آپ حمد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حمد ایک مشکل صنفِ سخن ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر شعرا نے اس صنف میں بہت کم طبع آزمائی کی ہے۔ آلِ رضا کی بھی محض دو غیر مطبوعہ حمدیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ یہ دونوں حمدیں مختلف ہیئتوں میں ہیں۔

پہلی حمد ''ترے بہترین جمال کا، جو کروں سوال، تو کیا کروں'' غزل کی ہیئت میں ہے اور دوسری حمد ''بہتر مرے کریم ہر ے کل سے آج ہے'' مسدّس میں ہے۔''۸

ڈاکٹر صاحب موصوف ذرا آگے چل کر سلام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''سلام سیّد الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام اور میدانِ کربلا میں حق کی خاطر جان قربان کرنے والے ان کے رفقا کی شان میں جو شعری نذرانہ پیش کیا جاتا ہے، اُسے ''سلام'' کہتے ہیں۔ آلِ رضا عمر بھر سلام نگاری کرتے رہے تاہم تلاش و جستجو کے بعد آلِ رضا کے ان ۱۶ سلام

حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ سلام اپنی نوعیت اور انفرادیت کے لحاظ سے بہر حال قابلِ توجہ ہیں۔"۹۹
قطعہ کے حوالے سے درج ہے کہ:

"قطعہ ایک قدیم صنفِ سخن ہے اور اس میں کسی خاص موضوع پر طبع آزمائی کی قید نہیں ہے۔ آلِ رضا کو قطعہ نگاری سے خاص شغف تھا۔ وہ عمر بھر مختلف موضوعات پر قطعات لکھتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی بعض غزلوں اور سلاموں میں بھی قطعہ بند اشعار موجود ہیں۔ سخت ترین جستجو و خیز کے بعد ان کے پچیس قطعات تلاش کرنے میں ہمیں کامیابی ہوئی۔ ٹائپ کے عمل کے دوران ہمیں پندرہ روزہ 'آہنگ' کراچی کی ایک گم شدہ فائل سے ان کے دو قطعات مزید ملے۔"۱۰۰

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب نے "باقیاتِ آلِ رضا" کے مقدمے پر جو حواشی سپردِ قلم کیے ہیں، وہ بلاشبہ اس کی (مقدمے) قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ انھوں نے حواشی بہت سوچ سمجھ کر عرق ریزی سے قلم بند کیے ہیں۔ بطورِ نمونہ صرف دو حواشی درج ہیں:

"۲۔ آلِ رضا کے سنِ ولادت کے بارے میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اگر مرتبین، ناقدین اور محققین کے پیش کردہ سنین کا جائزہ لیں تو آلِ رضا کا سن ولادت ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۶ء کے مابین متعین ہوتا ہے۔ ہم نے تحقیق و تدوین کے اُصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل مآخذ کی روشنی میں آلِ رضا کی تاریخ ولادت ۱۰ جون ۱۸۹۶ء قرار دی ہے:

الف۔ جسٹس سید محمد رضا (والد سید آلِ رضا) کی بیاض میں یہی تاریخ درج ہے۔

ب۔ آلِ رضا "غزلِ معلیٰ" کراچی، مکتبۂ افکار.....س۔ن، ص:۴۔

ج۔ سید محمد ہاشم رضا "تمہیدی جملے" (مراثی رضا) کراچی، خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۱ء۔

د۔ سید وحید الحسن ہاشمی 'جدید فنِ مرثیہ نگاری' لاہور، مکتبۂ تعمیرِ ادب، ۱۹۶۷ء، ص:۴۰۔

ہ۔ ضیاء الحسن موسوی "مجلہ بیادِ آلِ رضا" کراچی، ہماری منزل، ۱۹۷۸ء، ص ۶۳۔

و۔ اریل (محمد علی صدیقی) لٹریری راؤنڈ اَپ، کراچی، روزنامہ 'ڈان'، ۱۸ر مارچ ۱۹۷۸ء۔

ح سلطانہ مہر "سخن ور۔ تذکرۂ شعرائے پاکستان" کراچی، التحریر، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۱۔

ط۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر "بیسویں صدی اور جدید مرثیہ" کراچی، محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء ص ۶۰۰۔

ی۔ راقم الحروف نے ''آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ اس موضوع کے حوالے سے دل چسپی رکھنے والے قارئین درج ذیل کتب میں یہ مقالہ دیکھ سکتے ہیں:

(i) شبیہ الحسن، ڈاکٹر ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' لاہور، الحسن پبلی کیشنز۔

(ii) شبیہ الحسن، ڈاکٹر ''ترجیحات'' لاہور.....اظہار سنز، ۱۹۹۸ء''۔ ۱۱

یقیناً یہ حاشیہ سیّد آلِ رضا کے سنِ ولادت کے حوالے سے بڑی مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔

''۳۔ آلِ رضا کا شجرۂ نسب درج ذیل ہے:

سیّد محمد رضا ابنِ سیّد علی ابنِ سیّد فراز علی ابنِ سیّد فرزند علی، ابن سیّد قاسم علی ابن سیّد سعادت علی ابنِ سیّد پیر علی ابن سیّد مراد علی ابن سیّد محمد صالح ابن سیّد ابوالقاسم ابن سیّد شاہ محمود ابن سیّد عبداللہ عرف بہدین ابن سیّد ارحمن ابن سیّد منتخب ابن سیّد محمود ابن سیّد محمد نبی، ابن سیّد احمد ابن سیّد حسین ابن سیّد یحییٰ ابن سیّد ابا کر ابن سیّد عبدالعزیز ابن سیّد ابراہیم ابن سیّد محمود ابن سیّد زید ابن سیّد عبداللہ ابن سیّد یعقوب ابن سیّد احمد بن سیّد محمد تقی ابن سیّد ابوالفضل ابن سیّد واسط ابن سیّد امام علی رضا علیہ السلام۔'' ۱۲

جب ہم ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تحقیقی مقالے ''باقیاتِ آلِ رضا'' کے مقدمے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین سے پہلے ان کے مطبوعہ کلام ...... (دواوین) کا ایک مختصر مگر جامع تعارف بھی ملتا ہے، جو غیر مطبوعہ کلام کی حقیقی معنوں میں تفہیم میں ہماری بھرپور معاونت کرتا ہے۔

''باقیاتِ آلِ رضا'' کا مقدمہ اس حقیقت کی بھی عکاسی کرتا ہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اگر چاہتے تو آسانی سے اپنی جان چھڑا سکتے تھے، وہ یوں کہ سیّد آلِ رضا کے محض غیر مطبوعہ کلام (وہ کلام جو کسی جگہ طبع نہ ہوا ہو) کو مدوّن کر دیتے لیکن انھوں نے علمی اور تحقیقی دیانت داری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دشوار موضوع اور طریق کار چنا۔ انھوں نے بالخصوص اپنے مقالے کے نگران ڈاکٹر سجاد باقر رضوی صاحب سے مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ سیّد آلِ رضا کے تمام و کمال غیر مطبوعہ اور غیر مدوّن کلام کی تدوین کی جائے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن لکھتے ہیں:

''اول الذکر موضوع کا دائرہ کار نہایت محدود تھا۔ اس کو اپنانے کی صورت میں آلِ رضا کا بیشتر کلام مدوّن ہونے سے رہ جاتا، خاص طور پر اخبارات و جرائد میں شائع شدہ کلام تلف ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ متن کا موازنہ بھی ممکن نہ ہوتا اور تدوین کا یہ منصوبہ اُدھورا، نامکمل اور ناقص رہ جاتا لہٰذا احباب و اساتذہ کے مشوروں کے بعد مؤخر الذکر کٹھن اور مشکل موضوع اور طریق کار منتخب کیا گیا اور حتی الامکان اپنی ہمت، صلاحیت اور استعداد کے مطابق اس کام کو مکمل کرنے کی

کوشش کی گئی۔''۱۳

غیر مطبوعہ کلام کی تدوین کے سلسلہ میں سب سے ضروری کام متن کے مختلف مآخذ تک رسائی حاصل کر کے اصل متن کو تلاش کرنا اور اُسے صحت کے ساتھ منظرِ عام پر لانا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس کٹھن اور دشوار تر تحقیقی کام کو نہایت محنت و جاں فشانی اور دیانت داری سے پورا کیا ہے۔ انھوں نے دس برس کی پیہم عرق ریزی کے نتیجے میں اخبارات، رسائل اور بیاضوں سے ریزہ ریزہ کلام جمع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے تین ماہ مسلسل کراچی میں قیام کیا، سیّد آلِ رضا کے اہلِ خانہ، دوستوں اور قرابت داروں سے مسلسل رابطہ رکھا۔ برصغیر کے نامور محققین اور ناقدین سے بل واسطہ اور بلا واسطہ راہ نمائی و معاونت حاصل کی اور وطنِ عزیز کے متعدد پبلک اور نجی کتب خانوں سے مقدور بھر استفادہ کیا۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ''باقیاتِ آلِ رضا'' میں سیّد آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کو اس کے حقیقی روپ میں شایع کر دینا ہی کافی نہیں سمجھا بل کہ بعض رسائل اور اخبارات میں چھپنے والے غیر مدوّن کلام کو بھی شاعر کی بیاضوں سے موازنہ کر کے پوری صحت کے ساتھ درج کیا ہے، اس طرح جہاں اس کتاب کا تحقیقی و تنقیدی معیار بلند ہوا ہے، وہاں سیّد آلِ رضا کا تمام غیر مدوّن کلام صحتِ متن کے ساتھ اکٹھا ہو گیا ہے۔

متن کے مختلف مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کے بعد محقق کے سامنے بڑا مسئلہ اصل متن کی تلاش ہے۔ اصل متن کا تعین اور اس کی ترتیب و تدوین ہے۔ مدوّن اس مسئلے کے حل کے لیے تحقیق اور تدوین کے اُصولوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور شاعر یا مصنف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کو بنیادی مآخذ کی حیثیت دیتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ''باقیات آلِ رضا'' میں بھی سیّد آلِ رضا کی دو بیاضوں اور ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے کلام کو بنیاد بنا کر اور اسے اصل متن قرار دے کر کتاب میں شامل کیا ہے۔ حواشی میں متن کے دیگر مآخذ یعنی اخبارات اور رسائل وغیرہ میں شایع ہونے والے کلام کو موازنہ کرنے کی غرض سے استعمال میں لایا گیا ہے اور مختلف مآخذ کو عمدگی سے حواشی میں واضح کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ''باقیاتِ آلِ رضا'' کے صفحہ ۱۸۴ پر ایک غزل درج کی ہے، جس کا مطلع یوں ہے:

محبت ناشناسوں میں محبت کی فغاں کب تک
نہ جانے کٹ کے دل سے کام دیتی ہے زباں کب تک

سات اشعار پر مشتمل اس غزل کا اصل متن دستیاب نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب نے مطبوعہ متن ہی کو اصل کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور اس کی وضاحت نیچے حاشیہ نمبر ۱ میں کر دی ہے:

''اس غزل کا اصل متن حاصل نہیں ہو سکا ہے لہٰذا مطبوعہ متن ہی کو اصل کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔''

مطبوعہ:

(i) رفیق خاور، مدیر، ماہ نامہ ''ماہِ نو'' کراچی، مارچ ۱۹۵۶ء، ص ۴۴۔

(ii) کشور ناہید، مدیر، ماہ نامہ ''ماہِ نو'' لاہور، (انتخاب) اگست ۱۹۵۷ء، ص ۳۶۷۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی جگہ کوئی اور محقق ہوتا تو اس حقیقت کو چھپا جاتا اور کسی قاری کو پتہ بھی نہ چلتا۔ یہ امر یقیناً فاضل محقق کی تحقیقی دیانت کا ثبوت ہے۔

کسی بھی شاعر کے کلام کی تدوین کے سلسلہ میں چار طریقے اپنائے جاتے ہیں:

۱۔ کسی شاعر کے کلام کی ردیف وار تدوین کی جاتی ہے۔ یہ طریقہ ہمارے ہاں قدیم دواوین کو مدوّن کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

۲۔ کسی شاعر کے کلام کی موضوعاتی تدوین کی جاتی ہے۔

۳۔ کسی شاعر کے کلام کو سن وار مدوّن کیا جاتا ہے۔

۴۔ کسی شاعر کے کلام کو مدوّن کرنے کے لیے اُس کی حروفِ تہجی کے اعتبار سے تدوین کی جاتی ہے۔

تدوین کے یہ چاروں اہم اور مستند طریقے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے پیشِ نظر تھے لیکن انھوں نے سیّد آلِ رضا کے کلام کی تدوین کے سلسلہ میں پیدا شدہ مسائل کو دیکھتے ہوئے اپنے ہم عصر نامور محققین سے مشاورت کی اور یہ فیصلہ کیا کہ سیّد آلِ رضا کے تمام کلام کو صنف وار تقسیم کر دیا جائے اور اس کے بعد ہر صنف کی ردیف وار تدوین کی جائے۔ فاضل محقق کو تدوین کا یہ طریقہ اپنانے میں بھی متعدد دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن رقم طراز ہیں:

> ''راقم نے آغازِ کار میں تمام کلام کو الف واری یعنی حروفِ تہجی کے اعتبار سے، مرتب کر لیا تھا تاہم باقر صاحب کی ہدایات کی روشنی میں کلام کو از سرِ نو مرتب کرنا شروع کیا گیا۔ ابتداً راقم کے لیے سب سے زیادہ وقت طلب مسئلہ یہ تھا کہ کلام کی صنف وار تقسیم مواد کے مطابق کی جائے گی یا ہیئت کے اعتبار سے۔ موضوع و مواد کو بنیاد بنا کر کلام کو صنف وار ترتیب دینے کی کوشش کی گئی تو بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔''[15]

فاضل محقق نے گہرے تدبر اور پختہ شعور سے کام لے کر تدوین کے چاروں طریقوں کے ملاپ سے سیّد آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کو اس طرح مدوّن کیا ہے کہ پہلے تمام کلام کو اصناف میں تقسیم کر دیا ہے، بعد ازاں ہر صنف کے کلام کو ردیف وار مرتب کر کے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب کو تدوین کے اس مشکل طریقہ کار کو اپنانے میں یقیناً بڑی محنت کرنا پڑی ہے لیکن اس سے قارئین کو سیّد آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام میں ایک انتہائی خوب صورت ترتیب کا عنصر دکھائی

دینے لگا ہے۔ مزید یہ کہ اس طرح محققین اور ناقدین کے لیے بھی بہت آسانی ہو گئی ہے۔

''باقیاتِ آلِ رضا'' کا مطالعہ اس حقیقت کو بھی عیاں کرتا ہے کہ فاضل محقق متنی تنقید کے اصولوں کا صرف علم ہی نہیں رکھتے بل کہ وہ ان کو عملاً برتنا بھی جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر سید آلِ رضا کے بیاضوں وغیرہ میں جو لفظ سہواً درج ہونے سے رہ گئے ہیں، سید شبیہ الحسن نے انھیں قیاساً درست کرتے ہوئے کلام میں قوسین کے اندر تحریر کر دیا ہے اور نیچے حواشی میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ بلاشبہ اس طرح متن مکمل اور عمدہ حالت میں آ گیا ہے۔ بطور نمونہ چند مثالیں درج ہیں:

۱۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۲ پر ''حمد'' درج کی ہے، جس کا تیسرا شعر یوں ہے:

ترے ہر جمال و جلال (کی) کوئی حد نہ کوئی مثال ہے
جو خیال ترکِ ادب نہ ہو، میں تجھی کو تجھ سے نہ مانگ لوں

اس پر حاشیہ یہ تحریر ہے:

''یہاں ''کی'' کا لفظ سہواً رہ گیا ہے۔''[۱۶]

۲۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''باقیاتِ آلِ رضا'' کے صفحہ ۱۱۸ پر منقبت (در مدح جنابِ فضہؑ) درج کی ہے، جس میں یہ شعر شامل ہے:

تھا چشمِ امامت میں مقام، ایسی تھی فضہؑ
حسنینؑ کریں جھک (کے) سلام ایسی تھی فضہؑ

اس شعر کے حوالے سے حاشیہ یوں لکھا گیا ہے:

''۲۔ ''کے'' کا لفظ سہواً رہ گیا ہے جب کہ علاحدہ کاغذ پر ملنے والی منقبت میں یہ لفظ موجود ہے۔''[۱۷]

۳۔ ''باقیاتِ آلِ رضا'' کے صفحہ ۱۳۸ پر منقبت (در مدح حضرت مسلم بن عقیل علیہ السلام) درج ہے، جس میں یہ شعر بھی شامل ہے:

آئے آندھی بھی تو لہرانے نہ دے (لو) وہ چراغ
وہ فدا کار جو تھا جوہرِ توریثِ عقیل

اس شعر کے متعلق حاشیہ یوں ہے:

''۲۔ ''لو'' کا لفظ سہواً رہ گیا ہے تاہم کارڈ پر دستیاب منقبت میں یہ لفظ موجود ہے۔''[۱۸]

فاضل محقق موصوف نے سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین میں ہر ممکن کوشش کی ہے کہ کلام بہتر سے بہتر شکل میں پایۂ تکمیل تک پہنچے۔ اس سلسلہ میں عصرِ حاضر کے مایہ ناز محققین و ناقدین کی راہ نمائی اور مشاورت سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کو زیادہ بہتر، بامقصد اور دورِ حاضر کے

تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے اس کے بے شمار الفاظ اور اِملا کو تبدیل کیا گیا ہے۔ اس طریقۂ کار کی وجہ سے شعر میں کسی قسم کا فکری اور فنی سقم پیدا نہیں ہونے دیا گیا۔ چند مثالیں درج ہیں:

۱۔ ''باقیاتِ آلِ رضا'' میں شامل ''سلام'' کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

''خیمے جلانے والو، نکلتی ہیں بیبیاں
چادر نہیں ہے، بالوں سے منھ کو چھپا تو لیں'' ۱۹

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں ''منھ'' کے قدیم طریقۂ املا کو برقرار نہیں رکھا گیا اسے ''منہ'' کرنے سے شعر کا وزن ویسا ہی رہتا ہے اور کسی قسم کا فنی سقم نہیں پیدا ہوتا۔

۲۔ ''باقیاتِ آلِ رضا'' میں درج ''سلام'' کا پانچواں شعر یوں ہے:

''اے مسلمانو! جہاں پہنچا پہنچا نہ ذکرِ اہلِ بیت
سلطنت کی تم نے برسوں، پھر بھی مٹ کر رہ گئے'' ۲۰

یہاں پہلے مصرعے میں ''پہونچا'' کے قدیم طریقۂ املا کو تبدیل کیا گیا ہے، کیوں کہ اسے ''پہنچا'' کرنے سے شعر میں کوئی فکری یا فنی سقم پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ اس کتاب میں درج ''شامِ غریباں'' کا حسبِ ذیل شعر ہے:

''پہاڑ رات بڑی دیر ہے، سویرے میں
کہاں ہو شامِ غریباں کے گھُپ اندھیرے میں'' ۲۱

اس شعر کے پہلے لفظ میں ''پھاڑ'' کے قدیم طریقۂ املا کو برقرار نہیں رکھا گیا، کیوں کہ اسے عصرِ حاضر کے مروجہ طریقۂ املا ''پہاڑ'' کرنے سے شعر میں کسی قسم کا فکری یا فنی سقم نہیں آیا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین کرتے ہوئے بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ انھوں نے کراچی کے ایک کتب خانے میں ہفت روزہ ''سرفراز'' لکھنؤ کے ایک شمارے میں آلِ رضا کا غیر مطبوعہ کلام دیکھا تو اسے آلِ رضا کے شعری مذاق و مزاج کے مطابق نہ پایا۔ اس پر مطمئن نہ ہوئے اور مزید تحقیق کرنے کے لیے سرگرداں ہوگئے مگر کوئی حتمی نتیجہ سامنے نہ آ سکا۔ بالآخر ان کی کوششیں کراچی کے محقق و نقاد ضمیر اختر نقوی صاحب کے توسط سے بارآور ہوئیں۔ وہ کلام واقعی الحاقی کلام تھا اور غلط فہمی کی بنیاد پر آلِ رضا کے نام سے منسوب ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب نے آلِ رضا مرحوم کا الحاقی کلام اصل متن سے الگ کر کے زیرِ بحث کتاب کے صفحے ۲۵۷ تا ۲۵۹ پر تحریر کیا ہے۔ انھوں نے سید آلِ رضا کے متروک کلام کو بھی اصل کلام سے الگ کر کے صفحہ ۲۲۵، ۲۵۶ پر درج کیا ہے۔

زیرِ بحث کتاب کے آخر میں سید آلِ رضا کے بیاض کے پانچ صفحات کا عکس شائع کیا گیا ہے تاکہ

قارئین بالخصوص محققین اور ناقدین شاعر موصوف کے عکس تحریر سے آشنا ہو سکیں۔ مزید برآں آلِ رضا کی غزلوں کے دو مجموعوں ''نوائے رضا'' (۱۹۲۹ء) اور ''غزلِ معلّیٰ'' (۱۹۳۹ء) کا ردیف وار اشاریہ بھی فاضل محقق نے مرتب کر کے شاملِ کتاب کیا ہے۔ اس اشاریے کی مدد سے آلِ رضا کے تمام کلام سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہ اشاریہ یقیناً مستقبل کے محققین کے لیے سود مند ثابت ہوگا۔

نتیجتاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے دس برس کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں سیّد آلِ رضا کا غیر مطبوعہ کلام رسائل، اخبارات، قلمی نسخوں اور بیاضوں سے اکٹھا کیا، تب اُسے آلِ رضا کی ''باقیات'' کا روپ کہا۔ اس تحقیقی کام کی تکمیل میں ترتیب و تدوین کے جدید اُصولوں کو ممکنہ حد تک مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ ''باقیاتِ آلِ رضا'' ہم عصر ادبی تحقیق میں قابلِ تحسین و آفرین اضافہ ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب کا بہت بڑا تحقیقی کارنامہ ہے، جس پر وہ جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔

....

حواشی

۱۔ رشید حسن خان ''اُدبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ'' الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۸۸۔

۲۔ سیّد شبیہ الحسن، ڈاکٹر۔ مرتب ''باقیاتِ آلِ رضا'' الحسن پبلی کیشنز، لاہور...... جون ۲۰۰۰ء، ص ۸۸۔

۳۔ ایضاً ـــــ ص ۸۹،۹۰۔

۴۔ ایضاً ـــــ ص ۸۹۔

۵۔ ایضاً ـــــ ص ۲۰،۲۱۔

۶۔ ایضاً ـــــ ص ۴۲،۴۳۔

۷۔ ایضاً ـــــ ص ۸۷،۸۸۔

۸۔ ایضاً ـــــ ص ۷۲۔

۹۔ ایضاً ـــــ ص ۷۵۔

۱۰۔ ایضاً ـــــ ص ۷۸۔

۱۱۔ ایضاً ـــــ ص ۹۲،۹۳۔

۱۲۔ ایضاً ـــــ ص ۹۳۔

۱۳۔ ایضاً ـــــ ص ۶۲۔

۱۴۔ ایضاً ـــــ ص ۱۸۴۔

۱۵۔ ایضاً ـــــ ص ۷۰۔

۱۶۔ ایضاً ـــــ ص ۱۰۲۔

۱۷۔ ایضاً ـــــ ص ۱۱۸۔

۱۸۔ ایضاً ـــــ ص ۱۳۸۔

۱۹۔ ایضاً ـــــ ص ۱۵۲۔

۲۰۔ ایضاً ـــــ ص ۱۶۵۔

۲۱۔ سیّد شبیہ الحسن، ڈاکٹر، مرتب ''باقیاتِ آلِ رضا'' لاہور: الحسن پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۰ء، صفحہ ۲۰۶۔

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء)

◆◆◆

باقیاتِ آلِ رضاؔ

فرح ناز

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ایک طویل محنت و کاوش کا ثمر باقیاتِ آلِ رضاؔ کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ آلِ رضاؔ کی غزلوں کے دو مجموعے ''نوائے رضاؔ'' اور ''غزلِ معلّیٰ'' ان کی زندگی میں شایع ہو چکے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بھی طبع ہوا لیکن اس کے بعد سے وفات تک انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا مکمل ریکارڈ نہ تھا۔ ان کی مطبوعہ تصانیف کے علاوہ ان کا قابلِ لحاظ غیر مطبوعہ کلام بھی تلف ہوتا جا رہا تھا۔ ایک عرصے سے اس تمام بکھرے ہوئے کلام کو مدوّن کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے دس برس کی کڑی محنت اور ریاضت سے اس ہفت خواں کو طے کیا اور باقیاتِ آلِ رضاؔ میں وہ تمام کلام اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو دستبردِ زمانہ کی وجہ سے ضائع ہونے والا تھا۔ تدوین کے دوران ڈاکٹر شبیہ کو جن جاں گسل حالات سے گزرنا پڑا اس کا احوال ان کے تحریر کردہ مقدمے میں ملتا ہے۔ بہر حال اس محنت کا ثمر ڈاکٹر صاحب کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طرف سے ایم۔ فل کی ڈگری کی صورت میں ضرور مل چکا ہے۔

بیسویں صدی میں لکھنؤ کی شعری روایات کو زندہ رکھنے اور انھیں معتبر بنانے والوں میں آرزو لکھنوی کے شاگرد سیّد آلِ رضاؔ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ آلِ رضا نے نہ صرف شعری روایات کو آگے بڑھایا بلکہ اپنی جدت طبع سے نئے نئے موضوعات و اسالیب بھی پیدا کیے۔

تدوین ایک مشکل فن ہے اور بقول ڈاکٹر وحید قریشی:

''آج کل تدوین متن کا کام اُردو کے محققین کے بس کا رہا نہیں اکثر نقادِ علمِ عروض میں پیدل ہیں اور تدوین متن میں عجیب و غریب غلطیاں کرتے ہیں۔''

لیکن ڈاکٹر شبیہ نے یہ کام تدوین کے جدید ترین اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر کیا ہے۔ حوالوں اور حواشی نے اس کام کو

اور معتبر بناڈالا ہے۔کلام کو درج ذیل اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) حمد (۲) نعت (۳) منقبت (۴) سلام (۵) نوحہ (۶) غزل (۷) نظم (۸) قطعہ (۹) رباعی (۱۰) مرثیہ شخصی (۱۱) فرد

درج بالا صنفی تقسیم کے بعد ہر صنف کے کلام کو ردیف وار مرتب کیا گیا ہے۔اب کتاب میں جس قدر کلام موجود ہے وہ اصناف کے اعتبار سے مدون ہے اور تمام اصناف ردیف وار مرتب ہیں۔

''باقیات آلِ رضاؔ'' کا اہم ترین حصہ مقدمہ پر مشتمل ہے۔تقریباً ۷۵ صفحات پر محیط اس مقدمے کے مصنف ڈاکٹر شبیہ خود ہیں۔یہ مقدمہ آلِ رضاؔ کی حیات، شخصیت اور فن کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ڈاکٹر شبیہ نے ان حالات کار کی تفاصیل بھی بیان کی ہیں جو انھیں اس کلام کی تدوین کے دوران پیش آئے۔ان کا اُردو اَدب پر احسان ہے کہ انھوں نے آلِ رضاؔ کے ترکے کو ان کے اصل وارثوں تک پہنچا دیا۔یقیناً اس ترکے کے اصل وارث عام قارئین اور اُردو اَدب کے طالب علم ہی ہیں۔ورنہ یہ کلام:

کتنی خوشبوئیں مل کے اک خوشبو
کس مزے سے وہ یاد آتے ہیں
ہم وہ بنتے ہیں، کتنے شوق کے ساتھ
آپ جو کچھ ہمیں بناتے ہیں

....

ملے جب تم، اسے ہم نازش حاصل سمجھتے ہیں
یہ وہ ماضی ہے، جس کو حال و مستقبل سمجھتے ہیں
یہ دنیا جو نشاط زندگی پر منحصر ٹھہری
ہم اس میں، واقعات درد بھی شامل سمجھتے ہیں

اور اس جیسا دیگر انمول کلام نگاہوں سے اوجھل ہی رہتا۔اس کتاب نے آلِ رضاؔ پر تحقیق کرنے والوں کا کام آسان کر دیا ہے۔کتاب کے آخر میں ضمیمے میں نو دریافت، متروک اور الحاقی کلام کے علاوہ آلِ رضاؔ کی تحریر کا عکس بھی موجود ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے۔آلِ رضاؔ کی غزلوں کی ابتدائی دونوں کتابوں 'نوائے رضاؔ' اور 'غزل معلّٰی' کا اشاریہ بھی شامل ''باقیات آلِ رضاؔ'' ہے۔اس زبردست کام پر ڈاکٹر شبیہ الحسن مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(رسالہ 'مخزن' لاہور، جلد ۱، شمارہ ۲)

◆◆◆

سوچ کی چتاؤں کا شاعر، سیف زلفی اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر سیّد معراج نیّر

◆◆

بیسویں صدی میں مغربی افکار و نظریات کی بدولت ہماری شاعری نئے ذائقوں سے آشنا ہوئی۔ جدید اصناف متعارف ہوئے اور نئی نئی ہیئتیں معرضِ وجود میں آئیں۔ اب وہی شاعر چشمِ معنی آشنا میں معتبر قرار پایا جس نے جدت پسندی کو اپنا شعار بنایا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد ہماری شاعری میں جدت اور طنطنہ یک جا ہو گیا، اور اس زمانے میں سیف زلفی کی شاعری کا منظر نامہ مرتب ہوا۔ انھوں نے ہر صنف میں جدید لب ولہجہ کا سہارا لیا اور اسے اپنے افکار و نظریات سے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ سیف زلفی کے اس جدید لہجے کو متعارف کرانے کا سہرا ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے سر ہے۔ انھوں نے پانچ سو سے زیادہ صفحات کی کتاب ''جدید لہجے کا شاعر، سیف زلفی'' مرتب کر کے اُردو اَدب پر احسان کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ستر صفحات کا وسیع و بسیط مقدمہ لکھ کر سیف زلفی کے بارے میں وہ معلومات فراہم کر دی ہیں جن سے اہلِ دانش بے خبر تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ اہلِ علم اور صاحبانِ بصیرت کے مضامین جمع کر دیے ہیں اور میرے نزدیک یہ بلاشبہ سیف زلفی کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور آنے والے زمانے میں محققین اور ناقدین اس سے بے شمار فائدے اٹھائیں گے۔

مغرب کے ایک فلسفی کا قول ہے کہ ''انسان ایک سماجی جانور ہے'' یہ قول سچا اور بات کھری اپنی جگہ، لیکن اس کے باوجود میں ایک غیر مجلسی انسان ہوں۔ یہ دوسرا موقعہ ہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن مجھے بھری چوپال میں لے آئے ہیں تو یہ احساس ہوا کہ میں سراسر گھاٹے کے سودے میں تھا۔ مجھے تو سیف زلفی کا دیدار بھی نصیب نہ ہوا میں نہ تو اس کی کسی محفل میں بیٹھا اور نہ کسی مجلس میں گیا لیکن مَیں نے اسے بکھری ہوئی کتابوں میں پایا اور جب کتابوں کے دریچوں سے جھانکا تو اس کی ہر محفل میری محفل اور ہر مجلس میری مجلس بن گئی، اس کی شاعری، اس

کا احساس، اس کی شخصیت سب واہوتے چلے گئے۔

اس نے مجھے بتایا:
میرا نام زلفی ہے
سوچ کی چھاؤں میں درد کی ہواؤں میں
اور کچھ نہیں کرتا
صرف شعر کہتا ہوں
فکر کے شبستاں میں
جتنے دیپ روشن ہیں
سب دُکھوں سے روشن ہیں

اس کی فکر کے شبستاں میں حمد، نعت اور منقبت کی عقیدت کی جھلملاتی ہوئی روشنی ہے جو نہ صرف اس کا سرمایۂ حیات بل کہ نجات کا زادِ راہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیف زلفی نے نعت گوئی میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بھرپور انداز سے استعمال کیا ہے اور اپنی تمام شاعرانہ اصنافِ سخن کے انداز کو اس میں جذب کر دیا ہے وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں ۔

توصیف تری خامۂ جدّت سے لکھوں گا
میں تیرا سراپا نئی صورت سے لکھوں گا
اے پرتوِ انوارِ خدا تیری فضیلت
ایماں کی ضیا بار دیانت سے لکھوں گا
اللہ کی لہریں ہیں محمدؐ کے بدن میں
یہ موج شرف چشمۂ وحدت سے لکھوں گا
میں روئے محمدؐ کا پرستار ہوں زلفی
یہ پیار کی باتیں ہیں، محبت سے لکھوں گا

زلفی کا کہنا ہے کہ اس کے سارے دیپ دکھوں سے روشن ہیں اور ان دکھوں میں سب بڑے ابدی غم نے اہل بیت رسولؐ کے لیے مرثیہ نگاری کا روپ دھارا۔ زلفی کو اس غم کو سینے سے لگا لینے کا فخر بھی ہے۔ زلفی کا تو دعوا ہے کہ ۔

ہم نے شعورِ فکر کی منزل کو پا لیا
دل بجھ گیا تو ذہن کا سورج جلا لیا
زلفی بہت سے غم تھے کفِ کائنات میں
اپنی پسند ہم نے ''غمِ کربلا'' لیا

اور اس طرح زلفی کے شعور کے تمام سوتے اسی قندیل سے روشن ہیں۔ یقیناً اس نے مدھر گیت بھی گائے، دوہے کہے، غزل کو توانائی بخشی، وطن کے ترانے الاپے اور شاعری کی کون سی صنف ہے جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو لیکن اس کے شعور کی تمام راہیں بڑی منور اور توانا ہیں وہ باطل شکن شاعر ہے وہ مظلوموں کا ترجمان ہے اور باطل سے کسی بھی منزل پر مروّت بخشنے کا قائل نہیں۔ اسے اس بات پر فخر ہے کہ۔

غم کا شعور فکر کا ہر فن ملا مجھے
میرا نصیب دیکھ بڑا دھن ملا مجھے
جس کے سخن کی چاہوں کلائی مروڑ دوں
لہجہ ملا کہ پنجۂ آہن ملا مجھے
ہر دور پر محیط ہے میرے سخن کا رنگ
ہر دور کے شعور کا جوبن ملا مجھے
میرا روایتوں سے بھی رشتہ ہے استوار
اور اپنے دور کا بھی نیا پن ملا مجھے
زلفی یہ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے
شہرت ملی کسی کو مگر فن ملا مجھے

....

ایٹم کے اژدھوں کا بڑا اژدھام ہے
سمجھو کہ اب زمین کا قصہ تمام ہے

....

اُٹھو ان اژدھوں کو سمندر میں ڈال دو
دنیا کے دل سے جنگ کی دہشت نکال دو

....

اللہ کی زمین کو مٹانا حرام ہے
گھر میں کسی کے آگ لگانا حرام ہے

''لہولہو چاند'' اور ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' میں بھی وہ انسان کی تذلیل اور احترام آدمیت کے زوال کا شاکی ہے۔

زلفی کی غزلوں میں جدت و قدامت کا امتزاج پایا جاتا ہے جس سے اس نے ایک خاص بانک پن

پیدا کر دیا ہے مثلاً وہ کہتا ہے۔

دیوانہ کر گئی تری تصویر کی کشش
چوما جو پاس جا کے تو پیکر میں کچھ نہ تھا
یارو وہ بانکپن سے تراشا ہوا بدن
فنکار کا خیال تھا، پتھر میں کچھ نہ تھا
دیکھا تو سب ہی لعل و جواہر لگے مجھے
پرکھا جو دوستوں کو تو اکثر میں کچھ نہ تھا
زلفی ہمیں تو جرأت پرواز لے اُڑی
ورنہ ہمارے زخم زدہ پر میں کچھ نہ تھا

زلفی شاعر ہے بس شاعر آموزدہ احساس کا شاعر، انسانیت کا شاعر اور سچ کا چتاؤں کا شاعر وہ بڑے فخر سے کہتا ہے۔

مرے ضمیر میں قربانیوں کا جوہر ہے
دیا ہے ماں نے شہادت نصیب شیر مجھے

اور اس لیے۔

لکھتا ہوں وہی بات میں اس دور میں زلفی
جو بات کسی ڈر سے سخن ور نہیں لکھتے

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک باصلاحیت تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے سیف زلفی کو دیکھا، ان سے ملاقاتیں کیں اور ان کی شاعری سے لطف اٹھایا۔ ''جدید لہجے کا شاعر، سیف زلفی'' میں انھوں نے سیف زلفی کی ادبی شخصیت کے متنوع روپ اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کتاب کے بعد وہ ان کے بارے میں کون سی کتاب منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے جس محبت آمیز انداز میں یہ کتاب ترتیب دی ہے وہ ان کا تمام غیر مطبوعہ کلام مرتب کر دیں گے اور ان کا یہ کام اُردو ادب و شعر پر یقیناً ایک احسانِ عظیم ہوگا۔

◆◆◆

جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی

بڑے شاعر کے بارے میں بڑی کتاب

سرفراز سیّد

◆◆

سیف زلفی بڑے شاعر، بڑے انسان تھے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے انھیں اور بھی زیادہ بڑا بنادیا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم کچھ لوگوں کے ساتھ طویل وقت گزارتے ہیں ان کی باتیں، ان کا کلام سنتے ہیں اس کی داد بھی دیتے ہیں مگر اکثر اکٹھے رہنے کے باعث ان لوگوں کی اس بڑائی اور فطرت کا کماحقہٗ احساس نہیں ہوتا مگر کسی روز اچانک وہ لوگ ہم سے دور، بہت دور وہاں چلے جاتے ہیں جہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ تب ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جانے والا تو بہت بڑا انسان تھا، بہت اچھا شخص تھا، وہ بھرپور زندگی آمیز باتیں کرتا تھا، ہماری خوشیوں اور دُکھوں میں یکساں شریک ہوتا تھا۔ وہ ہمیں اپنا کلام سنا کر ہمیں آسودہ کر دیتا تھا۔ پھر یہ بھی یاد آتا ہے کہ جانے والا ہم سے کچھ بھی تو نہیں مانگتا تھا سوائے محبت کے دو جملوں، پیار اور خلوص کے دو بولوں کے!

ایک دانش ور نے اہم بات کہی کہ کسی شخص کی بڑائی کا اندازہ فوری طور پر نہیں ہوتا بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ کلام اُبھرتا ہے اس کے اندر چھپی ہوئی دانائی بولتی ہے، ہم کلام ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ہماری راہ نمائی کرتی ہے۔ ایسے لوگوں میں ایک شخص کا نام سیف زلفی ہے! وہ میرا دوست تھا، بھائی تھا، ہم سفر تھا، ہم نوا تھا......
مگر ایک دن اچانک ابد کی چادر اوڑھ کر کہیں چلا گیا!

ایسا بھی نہیں کہ لوگ سیف زلفی کے نام، کلام اور باتوں کو بھول گئے ہوں۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر جب بھی ترانہ گونجتا ہے، ہمارا پرچم، یہ پیارا پرچم، یہ پرچموں میں عظیم پرچم......! تو سیف زلفی کا پورا پیکر سامنے آ

موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' جیسی اہم اور نادر کتاب مرتب کر کے سیف زلفی کی بوقلموں شخصیت، زندگی اور فن کا نیا روپ اور نیا مستقل رنگ دے دیا ہے۔ اس کتاب میں سیف زلفی کے بارے میں ملک کے تقریباً ۴۵ اہم ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کے اہم مضامین اور متعدد شعرا کا منظوم خراجِ عقیدت شامل ہے۔ ان مضمون نگاروں میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر آغا سہیل، اسرار زیدی، سلیم شاہد، آغا سلمان باقر، پروفیسر جیلانی کامرانی، اظہر غوری، حفیظ تائب، ڈاکٹر سعادت سعید، سیّد وحید الحسن ہاشمی، میرزا ادیب، مرتضٰی برلاس، اختر حسین شیخ، کرامت بخاری اور بہت سے دوسرے نامور لوگوں کے نام شامل ہیں۔ مجھے اعزاز حاصل ہے کہ میرا بھی ایک مضمون شاملِ اشاعت ہے۔ یہ تمام مضامین اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں۔ ہر مضمون نگار نے سیف زلفی کی زندگی کی کسی نہ کسی نئی پرت کو کھولا ہے، تاہم کتاب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا طویل مقدمہ اور تین دوسرے مضامین نے سیف زلفی کی تمام تصنیفات، ہر قسم کے کلام، نظم، غزل، گیت، دوہوں، حمد، نعت خاص طور پر مرثیوں وغیرہ کا جو اجمالی جائزہ پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک اہم تاریخی مسودہ و مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نرم گو اور دھیمے مزاج کی خوب صورت باعلم، باخبر اور اعلیٰ بصیرت والی شخصیت ہیں۔ خود شناسی اور خود نمائی کی دنیا سے الگ تھلگ اپنی مخصوص دنیا میں حرف ولفظ کو بڑھاوا دینے میں مصروف رہتے ہیں۔ علم وادب کے مختلف پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ایک ماہ نامہ 'شام وسحر' بھی نکالتے ہیں۔ ادبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایف۔ سی کالج اور گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ میں طویل عرصہ سے تدریس کا اعزاز حاصل ہے۔ بہت سا علمی و اَدبی تحقیقی کام کیا ہے مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے، وہ مجلسوں، مشاعروں والی تقریبات میں کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ سیف زلفی جیسے بڑے شاعر کے بارے میں کچھ کہنے اور لکھنے کے لیے ایسی ہی باعلم اور معتبر شخصیت کی ضرورت تھی۔

یہاں پھر سے واپس کتاب کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تقریباً ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اپنے مقدمہ اور تین مضامین میں سیف زلفی کے شائع شدہ آٹھ شعری مجموعوں، آٹھ غیر مطبوعہ کتابوں، حلقہ اہلِ قلم کے تین سال کے مسلسل اجلاسوں کی کارروائیوں کی تفصیل کے علاوہ بہت سے دوسرے مضامین اور شعری کاوشوں کا ایک ماہر مورخ کی حیثیت سے تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اسی کتاب ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' میں خاص خود پر قابلِ ذکر اختر حسین شیخ کا ۶۴ صفحات کا ایک سیر حاصل مضمون بھی ہے۔ دراصل اختر حسین شیخ کا یہ مضمون کراچی کے معروف جریدہ سرگزشت میں جنوری ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ اسے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مرتب کردہ کتاب میں آخری اور نمایاں مضمون کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ مضمون بڑی عمدگی کے ساتھ سیف زلفی کی زندگی کے متعدد علمی وادبی پہلوؤں، مختلف دل چسپ واقعات، مشاہدات اور تجربات کا احاطہ کرتا ہے۔

کتاب میں سیف زلفی کے بارے میں گورنمنٹ کالج کی طالبہ عفت حسین کے ایک سوال نامہ کے جواب میں احمد ندیم قاسمی، جیلانی کامران، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور مرتضیٰ برلاس کی آرا شامل ہیں۔ یہ چاروں مضمون نما جواب نامے اپنی جگہ خاصے کی نادر چیز ہیں۔

سیف زلفی کا انتقال ۲۱ مئی ۱۹۹۱ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ ان کے انتقال کے دس برس بعد ڈاکٹر شبیہ الحسن کی زیرِ نظر کتاب شائع ہوئی تاہم اس کی تعارفی تقریب کے لیے مزید تین برس گزر گئے۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ سیف زلفی ایک بار پھر ایک زندہ پیکر کی شکل میں سامنے آ گئے ہیں۔

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا گراں قدر کارنامہ

جدید لہجے کا شاعر: سیف زلفی

اظہر غوری

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن دبستان لاہور کی ایک نابغہ روزگار شخصیت ہیں، درس و تدریس ان کا پیشہ ہی نہیں، ذوق بھی ہے اور یہ رحمت کئی ہزار میں سے کسی ایک آدھ پروفیسر صاحب کو ہی ارزاں ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات میں خود کو الجھایا نہیں بل کہ باقاعدگی سے خود کو تحقیق و تالیف کے کارہائے گراں مایہ میں منہمک رکھا ہے۔

مجھ پر کئی ایک دوستوں کے قرض واجب الادا ہیں مگر میں کوئی قرض اَدا نہیں کر پایا۔ یہ خیال مجھے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی بابت آیا ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ ۱۹۷۷ء میں پاک ٹی ہاؤس گیا، تو سیف زلفی پہلے سینئر ادیب تھے، جنھوں نے ازخود میرا تعارف پوچھا، مجھے چائے پلوائی، دیگر اُدبا سے میری شناسائی کا فریضہ انجام دیا، مجھے شعر سنانے کو کہا اور پھر عروض کی دُرستی کے لیے مشورہ دیا۔ ۱۹۷۸ء میں چینیز لنچ ہوم کے مقام پر حلقہ ارباب ذوق گجرات کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس مبارک احمد نے شروع کروائے تو سیف زلفی سے ملاقاتوں میں باقاعدگی آ گئی۔ وہ دیگر سینئر شعرا کی نسبت زیادہ اپنائیت اور شفقت سے پیش آتے اور حوصلہ افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ بعد میں حلقہ ارباب ذوق گجرات کی جگہ حلقہ ارباب ذوق پاکستان (مرکز) کے نام سے یہی اجلاس جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا، تو سعادت سعید سیکرٹری بنائے گئے، جب کہ مجھے جائنٹ سیکرٹری کے فرایض انجام دینے کے لیے کہا گیا۔ تب میں اپنے چند دوستوں کے ایما پر مذکورہ ذمہ داری سے فرار کی راہ اختیار کیے ہوئے تھا، اس موقع پر سعادت سعید، سیف الدین سیف، جیلانی کامران اور مبارک احمد کے علاوہ سیف زلفی نے بھی مجھے حلقے

کے لیے کام کرنے پر آمادہ کرنے کی خاطر خاصا سمجھایا۔ سیف زلفی نے کئی اعتبار سے غیر محسوس طریق پر میری تربیت کی۔ وہ جب بھی کوئی غزل، گیت، سلام یا نظم لکھتے، مجھے بالخصوص سناتے اور یوں رائے طلب کرتے، جیسے میں کوئی اہم نقاد ہوں۔ انھوں نے انگلش اَدب کے تراجم بھی کیے، غالباً شیکسپیئر کا ڈراما ''اوتھیلو'' ان کا قابلِ ذکر ترجمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ دورانِ گفت گو انگلش کے کلاسیکی شاعروں کے بے تکان حوالے دیا کرتے تھے۔

۱۹۸۲ء میں سیف زلفی نے مجھے اپنی غزلیات عنایت کیں اور کہا کہ مَیں انھیں ترتیب دوں۔ ان کی خطاطی میں کچھ وقت صرف ہوا، اور پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ مَیں ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' شائع کرنے میں ان کی معاونت کروں۔ میں رات کو پاک ٹی ہاؤس سے واپسی پر سیف زلفی کے ہاں چلا جاتا اور رات گئے ہم غزلوں کی پروف ریڈنگ کرتے، اس کتاب کی کاپی پیسٹنگ بھی مَیں نے ہی کی تھی۔ اس دوران میں چار پانچ راتیں ان کے گھر ڈرائنگ روم میں بسر کیں۔ وہ نہایت شفقت سے خاطر مدارت کرتے، اور چائے بھی خود ہی بنا کر پلاتے۔ ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' سے قبل ان کی پانچ کتب شائع ہو چکی تھیں، لیکن وہ اپنی اس کتاب کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ گو میں آج بھی تنقیدی شعور سے بے بہرہ ہوں، مگر اس زمانے میں تو واقعی جاہل تھا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ سیف زلفی بجا طور پر اپنی ان غزلیات کو اہمیت دے رہے تھے۔

۱۹۸۷ء کے بعد میں حالات کا شکار ہو کر اَدبی حلقوں اور دوستوں سے لاتعلق ہو گیا۔ اس دوران میں سیف زلفی سے بھی میرا رابطہ منقطع ہو گیا۔ ۲۰۰۱ء میں دوبارہ اَدبی حلقوں کی جانب آیا تو میرے ساتھ سیف زلفی سے ہمیشہ بچھڑ جانے کا الم واندوہ بھی تھا۔ لگ بھگ چھ ماہ قبل مجھے حلقہ تصنیفِ اَدب کے بانی غضنفر علی ندیم مرحوم نے مطلع کیا کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے سیف زلفی صاحب کے بارے میں ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ یہ خبر میرے لیے نہ صرف ولولہ خیز تھی، بل کہ رقت انگیز بھی۔ میں نے کئی دکانوں پر اس کتاب کو تلاش کیا، مگر بے سود۔ بالآخر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سے رابطہ کیا اور تقاضا بھی۔ انھوں نے کمال مہربانی سے وعدہ کیا اور ۳ مئی ۲۰۰۳ء کو ایفا کر دیا۔ ہم نے مل کر سیف زلفی کی یادیں تازہ کیں اور آج ہم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی وساطت سے ہی سیف زلفی کے تخلیقی اثاثے سے فیض یاب ہونے کے اہل ہوئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ''جدید لہجے کا شاعر: سیف زلفی'' لاہور کے تمام ادیبوں اور پبلشرز پر ایک قرض تھا، جسے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے تنِ تنہا ادا کر دیا۔ ۵۴۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سیف زلفی کا تعارف، ان کی اَدبی خدمات، ان کی شخصیت، ان کی گفت گوئیں، ان کی غزلیات، ان کی نعتوں، ان کی نظموں، ان کے مرثیوں، ان کے سلاموں، ان کے دوہوں، ان کے لیے اُدبا کا خراجِ تحسین، ان کے نام نادر خطوط اور ان کے کلام کے نمائندہ انتخاب کے علاوہ شبیہ الحسن صاحب کا ۶۲ صفحات پر مشتمل تحقیقی مقالہ شامل ہے۔

سیف زلفی اُردو اَدب میں ایک اہم شاعر کی حیثیت سے اپنا مقام بنائے رکھیں گے، انھوں نے عمر بھر

کسی ادبی گروہ یا مفاد کے لیے تخلیقی عمل میں شرکت نہیں کی۔ وہ کُل وقتی شاعر تھے، محکمہ ریلوے کے شعبہ اکاؤنٹس میں دیانت داری سے نوکری کرتے، دوپہر میں بچوں کے ساتھ وقت گزارتے، شام سے رات تک پاکستان ٹیلی ویژن کے شعبہ نیوز میں محنت سے جز وقتی ملازمت کرتے، رات کو پاک ٹی ہاؤس میں بھی باقاعدگی سے آتے اور وقت پر گھر چلے جاتے۔ ان کی اہلیہ محترمہ طویل مدت تک بیمار رہیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کو باپ کے علاوہ ماں کی محبت بھی دی اور ایک وفا شعار شوہر کے ساتھ ذمہ دار والد بھی بنے رہے۔ مزید برآں اَدبی حلقوں میں بھی مجھ جیسے کئی لوگوں کی فکری تربیت کے فرض سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ وقتی مقبولیت کسی ادیب کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اصل مقام اور مرتبے کا تعین فقط تاریخ پر ہی منتج ہوتا ہے۔ اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مرتبہ کتاب ''جدید لہجے کا شاعر: سیف زلفی'' نہ صرف ایک مُدلل اور وقیع تاریخی حوالہ ہے، بل کہ سیف زلفی کی عمر بھر کی سنجیدہ تخلیقی کاوش کا صلہ بھی ہے۔ خدا کرے میں بھی ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی معرفت ادائے قرض کا ہنر جان لوں۔

◆◆◆

جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی

پروفیسر ظفر الحق چشتی

◆◆

سیف زلفیؔ کی شخصیت وفن پر یہ کتاب پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے مرتب کی ہے اور الحسن پبلی کیشنز لاہور نے اسے شایع کیا ہے۔ یہ کتاب ترتیب وتدوین کی تکنیکی، معنوی اور تاثیری خوبیوں سے آراستہ ہے۔خوب صورت ٹائٹل نے اس مجلد کتاب کے ظاہری حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک ماہر اُستاد، تجربہ کار محقق، منجھے ہوئے نقاد اور خوب صورت شاعر ہیں۔انھوں نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں بھی اپنی فطری مہارتوں کا ثبوت دیا ہے،اور ترتیب وتدوین کے کام کو تحقیق کی منزل سے آگے بڑھا کر تنقید اور تخلیق کی فضاؤں میں پہنچا دیا ہے...... بادی النظر میں ان کا یہ کام صرف تدوین وترتیب کا کام دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا تقریباً ایک تہائی حصہ ان کے ذاتی قلم سے احاطۂ تحریر میں آیا ہے۔کتاب کی ابتدا میں مقدمہ ''تعارف/سیف زلفی۔ایک نظر میں'' اَدبی خدمات،''حلقۂ اہلِ قلم''۔ایک تحقیقی مطالعہ اور لاہور سے نکلنے والا معتبر رسالہ ''گل فشاں'' کے عنوانات کے تحت انھوں نے سیف زلفی کی شخصیت وفن پر سیر حاصل تحقیقی وتنقیدی بحث کی ہے۔ان کی اس تحریر پر اُستاذ الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی دادِ تحسین دی ہے۔ان کی نظر میں:

> ''ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے بنیادی لہجے کی تلاش میں یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ابتدائی ڈیڑھ سو صفحات میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے جدید لہجے کو اُجاگر کرنے میں بڑی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن نے محض دوسروں کے مقالات کو جمع نہیں کیا بل کہ ان کی موضوع وار شیرازہ بندی کر کے سیف زلفی کی تفہیم کا راستہ صاف کیا ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہ ضخیم کتاب اس لیے بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس میں سیف زلفی پہلی مرتبہ صحیح تناظر میں سامنے آئے

ہیں۔ سیف زلفی کی شخصیت اور فن پر یہ مجموعہ ایک اہم اضافہ ہے۔''

سیف زلفی ایک ہمہ گو، پُرگو اور زود گو شاعر تھے۔ انھوں نے بہت سی اصناف میں اپنے جذبوں کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس کتاب میں سیف زلفی کے تمام شاعرانہ پہلوؤں کو بہتر طریقے سے اُجاگر کر دیا ہے اور سیف زلفی کی شخصیت، غزل، نعت، نظم، مرثیہ، سلام اور دوہے پر کاملینِ فن اور طالبانِ فن کے مضامین شامل کیے ہیں اور ان مضامین کو اصناف کی الگ الگ تقسیم کر کے مخصوص ابواب میں شامل کیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک بات کا خاص خیال رکھا ہے، وہ یہ کہ ہر صنف پر جن صاحبانِ علم و ادب سے مضامین لکھوائے ہیں وہ اس صنف میں اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتے ہیں مثلاً غزل پر احمد ندیم قاسمی، نعت پر حفیظ تائب، نظم پر ظہیر کاشمیری اور مرثیے پر سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مضامین بھی شامل ہیں اور مذکورہ حضرات اپنی اپنی اصناف میں حرفِ آخر ہیں۔

اس کتاب میں سیّد وحید الحسن ہاشمی، ظہور حیدر جارچوی، حسن عسکری کاظمی، نزدوش ترابی، راحت نقوی، ڈاکٹر اقبال سرہندی، گلزار بخاری، مسعود ظفر اور خود ڈاکٹر شبیہ الحسن کے سیف زلفی کے لیے منظوم خراجِ تحسین بھی موجود ہیں۔ یہ منظوم خراجِ تحسین صرف رسمی نہیں ہیں بل کہ حقائق پر مبنی ہیں اور ان میں ممدوح کے لیے شاعر کی قلبی محبت بھی جھلکتی نظر آتی ہے مثلاً وحید الحسن ہاشمی کے یہ اشعار:

جب سے تری آنکھوں کو ملا خواب نجف کا
تو مدح سرائے رُخِ حیدرؑ نظر آیا
یہ ہے اثرِ حُبِّ شہنشاہؐ مدینہ
نعتوں میں چھلکتا ہُوا کوثر نظر آیا
ہم ڈھونڈ رہے تھے تجھے خوبانِ جہاں میں
تو مدح گرِ شافعِ محشر نظر آیا

اس تحقیقی و تنقیدی مجموعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سیف زلفی بنیادی طور پر مدحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ اور غزل کے شاعر تھے۔ انھوں نے اگرچہ دوسری اصناف میں بھی بہت کچھ لکھا، خصوصاً سیاسی شاعری بھی کی لیکن وہ دیگر اصناف میں وہ رنگ اور آہنگ پیدا نہیں کر سکے۔ بہرحال وہ غزل اور نعت میں ایک منفرد لہجے کے حامل تھے۔ احمد ندیم قاسمی کا خیال ہے کہ:

''سیف زلفی اُردو غزل میں ایک ایسا لہجہ لے کر آئے ہیں جو سراسر ان کا اپنا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک خاص لہجہ متعدد عناصر کے ملاپ سے بنتا ہے اور ان عناصر میں ذاتی ذہنی رجحانات کے ساتھ ہی شاعری کی روایات کے بعض حصے بھی شامل ہوتے ہیں مگر ایک منفرد لہجے والے شاعر کا

کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان عناصر کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ یک جا کرتا اور ان پر اپنی انفرادیت کی چھاپ لگاتا ہے۔ سیف زلفی کا سراغ ہمیں نظیر اکبر آبادی اور جوش ملیح آبادی کی شاعری میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک عجیب سی کھنک ہے اور وہ غزل میں دھیمے لہجے کے قائل نہیں معلوم ہوتے، ساتھ ہی نظیر اور جوش کی طرح ان کے پاس بھی الفاظ کا وسیع ذخیرہ ہے اور ان کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کوئی بھی لفظ غیر شاعرانہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ اسے حسن اور سلیقے سے استعمال کیا جائے اور وہ شعر میں کچھ اس پہلو سے استعمال ہو کہ اسے کسی اور لفظ سے بدلنا ناممکن نظر آئے۔

سیف زلفی ایک جری غزل گو ہے اور اپنے کسی جذبے اور کسی خیال سے شکست نہیں کھاتا اور اسے پوری طرح اپنے فن کی گرفت میں لاکر غزل کی روایتی ہیئت میں اپنے خاص لہجے کے ساتھ شعر میں منتقل کر دیتا ہے۔"

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس کتاب میں سیف زلفی کی نعتوں، غزلوں، نظموں، دوہوں اور سلاموں کا انتخاب بھی شامل کیا ہے جس سے ایک طرف تو سیف زلفی کی شعر گوئی کا معیار قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اپنے ذوقِ شعر کے اشارے ملتے ہیں۔ اس انتخاب میں سے نعت کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

توصیف تری خامۂ جدّت سے لکھوں گا
میں تیرا سراپا نئی صورت سے لکھوں گا

....

حسان بنا دے مجھے میں تیرا قصیدہ
قرآن کے لہجے میں بلاغت سے لکھوں گا

حاصلِ کلام یہ کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا یہ کام بہت ہی قابلِ تحسین ہے۔ محقق اور نقاد کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ایسے فن کاروں کے فن پاروں کو بھی عوام تک پہنچائے جن کے پاس ابلاغ کے زیادہ وسیلے موجود نہیں ہوتے۔ سیف زلفی بھی ایک ایسے فن کار تھے، جنھیں ابلاغ کے زیادہ وسیلے حاصل نہیں ہوئے۔ وفات کے بعد تو یہ صورتِ حال تھی کہ کون سیف زلفی کی شاعری کو عوام تک پہنچاتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک نیک کام کیا ہے، خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔ وہ خود اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے بارے میں کہتے ہیں:

"زیرِ نظر کتاب "جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی" کی ترتیب و تدوین کا سلسلہ ماہ نامہ "شام و سحر" لاہور کے "سیف زلفی نمبر" مطبوعہ اکتوبر ۱۹۹۲ء سے جا ملتا ہے۔ راقم کی ہمیشہ یہ خواہش

رہی ہے کہ شعروادب کے خدمت گاروں کی ممکنہ طور پر حوصلہ افزائی کی جائے۔ ''سیف زلفی نمبر'' کی اشاعت کے بعد راقم نے ذہنی طور پر طے کر لیا تھا کہ وہ سیف زلفی کی شخصیت اور فن پر ایک مبسوط کتاب ضرور مرتب کرے گا۔ راقم کے اس فیصلے کو اس وقت مزید تقویت ملی جب سیف زلفی کے صاحب زادے سید رضا انتخاب صاحب نے اس سلسلے میں ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر رضا انتخاب صاحب دستِ تعاون نہ بڑھاتے تو یہ کتاب اتنی آب وتاب کے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آ سکتی تھی۔

اس کتاب کی ترتیب کے وقت راقم کے پیشِ نظر تین مقاصد تھے:

الف: سیف زلفی کی شخصیت کو اُجاگر کرنا۔

ب: سیف زلفی کے فکری اوصاف کو ظاہر کرنا۔

ج: سیف زلفی کے فنی رموز وعلائم سے آگاہ کرنا۔''

غرض ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہ کتاب اُردو تحقیق وتنقید میں ایک صالح اضافہ ہے اور امید ہے کہ اس سے ادب کے قارئین بہت استفادہ کریں گے۔

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور ستمبر ۲۰۰۰ء)

◆◆◆

جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی

سیّد اعجاز ثقلین بخاری

••

حال ھی میں پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تازہ کتاب ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' منظر عام پر آئی ہے۔ اس ضخیم کتاب کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب موصوف کی محققانہ اور تنقیدی کاوشوں کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ اس دور میں بھی جب مادی اور مقداری رویے قلم اور لفظ کی حرمت کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں کشتِ حرف کو خونِ جگر سے سینچ رہے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی کئی پشتیں علم و اَدب اور عرفان و آگہی کی منزلیں سر کرتی رہی ہیں۔ ان کے والد گرامی سیّد وحید الحسن ہاشمی گذشتہ نصف صدی سے شاعری کے میدان میں جم کر کھڑے ہیں اور مرثیہ گوئی میں حدِ کمال کو چھو رہے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے شاعری کے ساتھ ساتھ وہ تمام تہذیبی اور اَدبی اقدار بھی ورثے میں پائی ہیں جن کی مطافت اور نفسیات نے ان کی شخصیت میں توازن اور گداز پیدا کر دیا ہے۔ علم و اَدب اور تہذیبی قدروں سے والہانہ وابستگی کی جھلک ان کی ان تمام تحریروں میں دیکھی جا سکتی ہے جس کے انبار لگا کر بھی وہ اپنے طالبِ علمانہ عجز و انکسار کا اظہار کیے جاتے ہیں اور اپنے علمی و ادبی کارناموں کی طویل فہرست پر احساس تفاخر سے سر اٹھانے کی بجائے سر جھکا دیتے ہیں۔ بے نیازی اور درویشی کا یہ رویہ انھیں اپنے والد گرامی سے عطا ہوا ہے جن کا اپنا یہ عالم ہے کہ جدید مرثیے کی مسندِ اعلیٰ پر براجمان ہونے کے باوجود وہ اپنے اساتذہ کا نام لینا نہیں بھولتے اور ان کے کہے ہوئے کو سند مانتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن چاہتے تو اپنے والد کی طرح شاعری میں نام پیدا کر سکتے تھے کہ شاعری کے تقاضوں سے باخبر بھی ہیں اور اچھا شعر کہنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے لیے تحقیق و تنقید کا میدان پسند کیا اور تفکر و تعقل کی راہ سے گزر کر سوچنے اور مغز کھپانے کے خارِ مغیلاں چننے کو اولیت دی۔ شاعری کے چمنستان میں پھلنے اور مصرعوں کی عطر

تیز ہواؤں میں سانس لینے کی بجائے وہ ان صحراؤں کی جانب چل دیئے جس کے گرم بگولوں کی تمازت حواس ہی نہیں جھلتی بل کہ اچھے بھلے انسان کی مت مار کر رکھ دیتی ہے۔ تحقیق اور تنقید کے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علو ہمتی اور جرأت مندی نے اس مسئلے کو بڑی خوب صورتی سے اپنے دام میں اسیر کر رکھا ہے اور کتاب پر کتاب چھاپے چلے جا رہے ہیں۔

گزشتہ برس ''آغا صاحب'' منظر عام پر آئی تو کتاب کی ترسیل اور نکاسی کا بندوبست کرنے کی بجائے وہ مرحوم سیف زلفی کے پیچھے ہو لیے۔ وہ جب بھی کوئی علمی و ادبی کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو گویا طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ طوفان ان معنوں میں کہ جہاں جہاں ان کے موضوع کے حوالے سے کسی چھوٹی یا بڑی شے کے ملنے کا امکان ہوتا ہے وہاں وہاں ان کے ہاتھ پہنچتے ہیں اور متعلقین کی راتوں کی نیندیں حرام کر دیتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ان پرانے محققین کا گمان ہوتا ہے جو ایک لفظ کی تحقیق پر عمریں صرف کر دیتے تھے۔ اب اسی کتاب کو لیجیے سیف زلفی شاعروں کی بھیڑ میں ایک شاعر تھے، بے نیاز سے کسی نے کچھ لکھ دیا تو ٹھیک ہے نہ لکھا تو لکھوانے کا تردد نہیں کیا۔ لکھنے والوں نے کتنا لکھ دیا ہوگا۔ جہاں فیض، ندیم، منیر، ناصر جیسے بڑے بڑے شاعر ہوں وہاں نقاد کی نگاہ کسی دوسرے شاعر پر کم ہی پڑتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیف زلفی پر کتاب لکھنے کی ٹھان لی تو اس شاعر پر ایسی ایسی تحریریں نکال لائے کہ خود ان تحریروں کے لکھنے والوں کو بھی حیرت ہوئی کہ یہ انھوں نے کب اور کس موقع پر لکھی تھیں۔ انھوں نے ان بکھری ہوئی تحریروں کو اکٹھا کرنے پر ہی اکتفا نہیں بل کہ الگ سے قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور سیف زلفی پر دو شاندار مالے تیار کر ڈالے۔ سیف زلفی کا قائم کیا ہوا ''حلقہ اہل قلم'' بہت سے اَدبی حلقوں میں ایک حلقہ ہوگا مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاتال میں اُتر گئے۔ حلقہ اہل قلم کی رپورٹوں اور کارروائیوں تک رسائی حاصل کی۔ دو تین برس کے ہفتہ وار اجلاسوں کی تفاصیل معلوم کیں اور ایسا زبردست تحقیقی مضمون لکھ ڈالا کہ ''حلقہ اہل قلم'' ایک نئے اَدبی رجحان کا محرک نظر آیا۔ حلقہ ارباب ذوق کی پشت پر اس کی ۲۵ سالہ طویل روایت نہ ہوتی تو حلقہ اہل قلم اس کے شانے زمین پر لگا گیا ہوتا۔ کسی ادبی شخصیت یا ادبی تحریک کو ایک اعلیٰ پائے کے محقق یا نقاد کا میسر آ جانا اس کے لیے نعمت عظمیٰ سے کم نہیں کہ اس کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا فیصلہ اسی سے ہوتا ہے۔ سیف زلفی کے اَدبی رسالے ''گلفشاں'' کے بارے میں ہماری ادبی تاریخ چپ سادھے ہوئے ہے۔ سوائے چند بڑے بوڑھوں کے کسی کو معلوم نہیں کہ اس ادبی رسالے نے ایک محدود عرصے میں کیسی کیسی اَدبی شخصیتوں کو اپنے صفحات پر لا جمع کیا تھا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنا دوسرا طویل مضمون رسالہ ''گلفشاں'' کے حوالے سے تحریر کیا ہے اور اس ادبی رسالے کے متعلق ایسی نادر و نایاب معلومات جمع کر دی ہیں کہ اگر سیف زلفی کو بھی یہ کام کرنے کی مہلت مل جاتی تو اتنی باریک بینی سے شاید وہ بھی یہ کام نہ کر پاتے۔

کتاب کے آغاز میں یہ دونوں مضامین شامل ہیں اور نہ صرف کتاب کا اعتبار بڑھاتے ہیں بل کہ اس

امر کا اعلان بھی کرتے ہیں کہ کتاب کا مرتبہ کوئی روایتی قسم کا لکھاری نہیں ہے جو اِدھر اُدھر سے چیزیں اکٹھی کر کے صاحبِ کتاب بننے کے چکر میں ہے بل کہ ایک پختہ قلم ادیب اور صاحبِ بصیرت نقاد ہے اور ادب کی مختلف صورتوں کو پہچانتا ہے اور لکھے ہوئے لفظ کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب ابواب بندی اور مضامین کی ترتیب و تسوید کے حوالے سے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے اعلیٰ ذوق اور خوش سلیقگی کی مظہر ہے۔ احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، جیلانی کامران، مرزا ادیب، رئیس امروہوی، ظہیر کاشمیری، سید وحید الحسن ہاشمی، اسرار زیدی، ڈاکٹر سعادت سعید، حفیظ تائب، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر طارق عزیز، عبدالجبار لطیفی، سلیم شاہد، اختر حسین شیخ، ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی، بیدار سرمدی، ظفر الحق چشتی، سرفراز سید، کرامت بخاری، نثار اکبر آبادی، گلزار بخاری، حفیظ الرحمٰن سحابی، اظہر غوری، تنویر ظہور، ڈاکٹر ناہید شاہد، صفدر شاہد، رانا غلام شبیر، غضنفر علی ندیم، طارق سلیمی، محمد رفیق بلوچ، عفت حسن اور دیگر اصحاب کے متنوع اسالیب کا حُسن اپنی جگہ پر انھوں نے سیف زلفی کے فن اور شخصیت پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس کتاب میں جمع ہو کر محفوظ تو ہو ہی گیا ہے تاہم ان تحریروں کے آئینے میں سیف زلفی کا اُجلا اور روشن چہرہ کچھ اور اُجلا اور روشن ہو گیا ہے۔ اگر آپ ان تحریروں کو پہلے پڑھ چکے ہیں تو اس کتاب میں مکرر پڑھیے کہ اب ان میں ایک مرتب کے حسنِ ترتیب کا رنگ بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے بعد اہلِ ذوق ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اگلی کتاب کے بیتابی سے منتظر ہیں۔

(ماہ نامہ 'پیامِ عمل' لاہور، جولائی ۲۰۰۰ء)

◆◆◆

جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی

پروفیسر سیّد ندیم جعفر

◆◆

عصرِ حاضر میں زندہ رہنے والا ہر انسان ایک خاص قسم کے اضطراب میں مبتلا ہے۔ بے یقینی، بے اطمینانی اور عدم تحفظ کے احساس نے ہر شخص کو مایوس اور خوف زدہ کر دیا ہے اور وہ اس مشینی زندگی کا ایک کل پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ خوشی اور اطمینان کے لمحات ناپید ہونے کے قریب ہیں، معاشی عدم مساوات نے انسانی رشتوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے، تہذیبی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور شخصیت پرستی کے مصنوعی معیار نے معاشرے میں منفی طرزِ احساس کو جلا بخشی ہے۔ غربت، احساس کمتری اور بے روزگاری نے معاشرتی زندگی کو بے جان کر دیا ہے، ایسی صورتِ حال میں خلوص، شرافت اور اخلاقی قدروں کا بدل جانا بعید از قیاس نہیں، ایسے ہی حالات میں معاشرے کے حساس افراد کے ذہنوں میں نئی نئی سوچیں اور تحریکیں جنم لیتی ہیں اور یوں ایک اجتماعی احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ حساس ذہن رکھنے والے افراد بنجر ذہنوں کو زرخیز بنانے اور پتھر کے دلوں میں احساس اور فکر کی روح پھونکنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ سیف زلفی کی شاعری اس اجتماعی احساس میں سانس لینے کے باوجود انفرادی سطح پر ایک غیر منظم احتجاج کا درجہ رکھتی ہے۔ سیف زلفی نڈر، بے باک، ناساعد حالات میں حق بات کہنے والا شاعر ہے۔ وہ مارشل لاء کی سختیوں میں بھی ہاتھ میں علمِ بغاوت تھامے سربلندی سے سچ کہنے میں گریز نہیں کرتا۔ سیف زلفی تخلیقی ذہن رکھتے تھے۔ تمام زندگی انھوں نے اُدب کی خدمت کی اور کئی شعری مجموعے اور نثری تخلیقات یادگار چھوڑیں۔ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کے ورثے کی حفاظت کی اور روایت کی اعلیٰ قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا اور انفرادیت کا سہارا لے کر دنیائے اُدب میں اپنے لیے ایک مستقل مقام بنالیا۔

سیف زلفی نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک کو کامیابی کے ساتھ نبھانے میں کامیاب ہوئے۔ غزل، نظم، منقبت، سلام، مرثیہ، نعت، نوحہ، دوحہ، حمد، ترانہ غرض ہر صنف میں زلفی کا تخلیقی سرمایہ اور

شعری پختگی دیکھی جا سکتی ہے۔ سیف زلفی نے ہر صنف کو خون جگر سے پروان چڑھایا مگر ان کا اصل جو ہر غزل یا نظم میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ زلفی جس زمانے میں شاعری کر رہے تھے وہ غزل اور نظم دونوں اعتبار سے اہم تھا۔ راشد، میراجی، فیض، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، شکیب جلالی، ناصر کاظمی، منیر نیازی، شہزاد احمد اور ظفر اقبال نے شاعری میں جو مقام حاصل کیا تھا ان سے آگے جانا یا ان کے ساتھ قدم ملانا کسی عام شاعر کے بس میں نہ تھا۔ مگر سیف زلفی نے اپنے لیے ایک الگ اچھوتا اور جدید انداز اپنایا اور ان بڑے ناموں میں جدید لہجے کے شاعر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ احمد ندیم قاسمی کی رائے کے مطابق سیف زلفی اور دو غزل میں ایسا لہجہ لے کر آئے جو سراسر ان کا اپنا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ایک خاص لہجہ متعدد عناصر کے ملاپ سے بنتا ہے۔ مگر ایک منفرد لہجے والا شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان عناصر کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ یک جا کرتا ہے اور ان پر اپنی انفرادیت کی چھاپ لگا دیتا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مطابق سیف زلفی نے جس قدر اصناف شعری کو خون جگر سے سینچا، ان کو وقار بخشا اور ہر صنف شعری کو دوام بخشا مگر زمانے نے ان کی وہ قدر افزائی نہ کی جس کے وہ حقدار تھے۔ مرزا ادیب نے لب ولہجہ، گھن گرج، بلند آہنگی، للکار اور رجزیہ انداز بیان کی وجہ سے سیف زلفی کو جوش کے قبیلے کا شاعر کہا ہے اور شکیب جلالی کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، سیف زلفی کی شاعری میں لہو کے استعارے کو اہمیت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی شاعری میں ایک مرکب رجحان ہے جس میں متعدد رنگ سمٹ آئے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل سیف زلفی کی لاابالی طبیعت اور شدت جذبات کو کسی قدر ناپسند کرتے ہیں اور اسے ان کی شخصیت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ رئیس امروہوی کے بقول سیف زلفی کے ہاتھ میں الفاظ سنگ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ انھیں تراش خراش کر قوت تخیل سے ایک ایسے تاج محل میں تبدیل کر دیتے ہیں جس پر فن وسخن دونوں کو ناز ہوتا ہے۔ مختلف آراء کی روشنی میں جب ہم سیف زلفی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک سچا، کھرا، دلیر، گھن گرج کرنے والا، جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے والا انسان اور اپنے لہو میں قلم کو ڈبو کر لکھنے والا او راستحصالی قوتوں کے سامنے سراپا احتجاج شاعر نظر آتا ہے جو علم وحلم میں ختمی مرتبت کا پیروکار ہے۔ تو جوش شہادت میں کربلا والوں کا معتقد ہے جو وطن کی محبت سے سرشار ہے اور معاشرے کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہے۔ وہ اپنے مرتبے سے خوب آشنا ہے اور کبھی کبھی خود پسندی کے انداز میں تعلّی سے بھی کام لیتا ہے۔ بطور شاعر وہ اپنے آپ کو بہت سوں سے قد آور گردانتا ہے اور اس کا اظہار کھلے بندوں کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ شدتِ جذبات کا یہ عالم تھا کہ بھٹو صاحب سے محبت کی بنا پر سیف زلفی نے اپنی کتاب کا سرورق پیپلز پارٹی کے پرچم جیسا بنوایا اور مارشل لاء کی صعوبتیں برداشت کیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد سیف زلفی حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہوئے اور انھوں نے حلقۂ اہل قلم کے نام

سے ایک الگ تنظیم بھی بنائی۔ اسے ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اور اس کے اجلاسوں میں ملک کے کونے کونے سے شاعر اور نثر نگار شرکت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ''گل فشاں'' کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا مگر مالی مشکلات کی بنا پر یہ رسالہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ اسی طرح حلقہ اہلِ قلم بھی سرمائے کی کمی، فعال کارکنوں کی عدم دستیابی اور سیف زلفی کے جذباتی فیصلوں کی وجہ سے دیر تک حلقۂ ارباب ذوق کا مقابلہ نہ کر سکا اور دو سال کے بعد اچانک بند ہو گیا۔

سیف زلفی نے جن اصناف میں طبع آزمائی کی ان میں ان کا شعری سرمایہ ان کی شعری عظمت پر گواہی دیتا نظر آتا ہے۔ سیف زلفی نے نعت میں بندھے ٹکے خیالات پیش نہیں کیے۔ یہاں بھی ان کا انداز جداگانہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے بقول وہ نعت میں غزل کا دھیمہ اور والہانہ پن ہوتا ہے۔ مگر سیف زلفی کے ہاں اس کی جگہ قصیدے کے بلند بانگ انداز نے لے لی ہے اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں لکھے گئے یہ قصائد متعدد پہلوؤں سے جدید ترین ہیں۔

سیف زلفی کی نعت میں ان کی محمدؐ و آل محمدؐ سے محبت اور عقیدت جگہ جگہ نظر آتی ہے اور ان کی نعت میں بھی بعض اوقات مرثیے اور سلام کا رنگ ملتا ہے۔ ''سیف زلفی چوں کہ عقیدتاً جعفری تھے اس لیے مرثیے میں آل محمدؐ اور شہدا کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں ان کے قلم سے عقیدت بھرے الفاظ نکلتے ہیں وہاں ان کی آنکھ بھی پر نم رہتی ہے۔ سیف زلفی کی شاعری کا اصل منبع ان کی غزل ہے۔ اگر وہ صرف غزل ہی کہتے تو شاعری میں ان کا مقام اتنا ہی بلند ہوتا جتنا اب ہے۔ مارشل لاء کی وجہ سے ان کی غزل میں مزاحمتی انداز نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر طارق عزیز ان کی غزل کے تین پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ ''سیف زلفی کی شاعری کے تین نمایاں پہلو ہیں (۱) محبت (۲) سیاست (۳) اور ایک خاص قسم کا تہذیبی لاشعور (جس سے ہم ان کا ذہنی و دینی پس منظر یا ان کی میتھاڈولوجی (Methodology) بھی کہتے ہیں)۔

اس کے علاوہ سیف زلفی نے شیکسپیئر کے ڈرامے ''اوتھلو'' کا منظوم اُردو ترجمہ بھی کیا جسے ڈاکٹر طارق عزیز اُردو کا سب سے بڑا منظوم ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول ''جب کوئی جذبہ اچھی طرح رچ بس کر شعر کا روپ دھارنا چاہتا ہے تو زلفی اسے کوئی سا بھی لباس پہنا دیتے ہیں اور وہ جذبہ اتنا پختہ ہوتا ہے کہ اس میں ایک آنچ کی بھی کسر باقی نہیں رہتی۔''

مندرجہ بالا سطور جن سے سیف زلفی کے فن اور شخصیت کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے ان کا ماخذ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کتاب ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' ہے۔ متذکرہ کتاب شبیہ صاحب کی عرق ریزی اور انتھک محنت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ مختلف مصنفین کے لکھے ہوئے مقالات نے کتاب کے حسن، اہمیت اور ضخامت میں اضافہ ضرور کیا ہے مگر ابتدائی ڈیڑھ سو صفحات ہی کتاب کی اصل جان ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے

تنقیدی اور تخلیقی جوہر کا ثبوت ہے۔ ان میں مفصل دیباچہ، تعارف، گل فشاں اور حلقہ اہل قلم پر علاحدہ علاحدہ جامع مضمون بھی شامل ہیں جن میں سیف زلفی کی شخصیت، ان کی پوری زندگی اور ان کے فنی اور تخلیقی سفر پر مکمل اور جامع معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ جہاں ڈاکٹر صاحب نے حلقہ اہل قلم کے اجلاس کی تفصیل بیان کی ہے وہاں ساتھ ساتھ ان کے اغراض ومقاصد گل فشاں کا اجراء اور خاتمہ اور سیف زلفی کے فن اور شخصیت پر ناقدانہ اور غیر جانبدار بحث بھی کی ہے اور سیف زلفی کے جدید لہجے کو تلاش کرنے اور اُبھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ راقم السطور یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ دیگر افراد کے مقالات اگر کتاب سے حذف بھی کر دیئے جائیں تو یہ کتاب سیف زلفی کی زندگی، شخصیت اور فن پر ایک بہترین اور مکمل دستاویز ہے اور زلفی کے شعری سرمائے کی عظمت کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اُردو کے معروف ترین اور نابغہ اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ جس جاں فشانی اور لگن سے ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے اور اس بات پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور ستمبر ۲۰۰۰ء)

◆◆◆

جدید لہجے کا شاعر: سیف زلفی (شخصیت و فن)

محمد ھارون عثمانی

◆◆

زیرِ تبصرہ کتاب ''جدید لہجے کا شاعر: سیف زلفی'' شخصیات کے حوالے سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے قبل وہ سیّد آلِ رضا اور ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیات وفن پر کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مقدّمے میں کتاب کے تین مقاصد بیان کیے ہیں:

۱۔ سیف زلفی کی شخصیت کو اُجاگر کرنا۔

۲۔ سیف زلفی کے فکری اوصاف کا بیان۔

۳۔ سیف زلفی کے فنی رموز و علائم۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے مرتب نے ۳ سطحوں پر کام کیا۔

الف۔ سیف زلفی کی تمام تخلیقات کا مطالعہ۔

ب۔ سیف زلفی کے بارے میں لکھے گئے مواد کا حصول و مطالعہ۔

ج۔ ملک کے نامور اور معتبر ناقدین کو سیف زلفی کی شخصیت وفن کے حوالے سے لکھنے کی تحریک دینا۔

مرتب اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب رہے ہیں۔

سیف زلفی، جن کا اصل نام سیّد ذوالفقار حسین رضوی تھا۔ ستر کی دہائی کی بہت توانا آواز تھے۔ اس کتاب میں ایسے شخص کی شاعری اور فن کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے اپنے دَور میں وہ پذیرائی نہ ملی جس کا وہ حق دار تھا۔ سیف زلفی نے اپنی زندگی میں بڑی خاموشی کے ساتھ اُردو اَدب اور بالخصوص اُردو شاعری کی خونِ جگر سے آبیاری کی۔ ان کی زندگی میں ہی کئی مجموعے چھپے، رثائی شاعری کے حوالے سے ''ہمارے ہیں

حسین‘‘ ’’کربلا کے دو اسیر‘‘ ’’تا بخاکِ کربلا‘‘ اور والد پر رثائی نظم ’’بہشت مقام‘‘۔ مزاج کے اعتبار سے وہ غزل کے آدمی تھے اسی لیے غزل کے حوالے سے سب سے زیادہ مضامین شامل کتاب ہیں۔

پوری کتاب ۱۵ عنوانات میں تقسیم ہے۔ اس میں ایک حصہ شبیہ الحسن ہاشمی کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ سیف زلفی کے کلام کا انتخاب اور آخر میں خطوط بھی شامل ہیں۔ یہ خطوط ایم۔ اے کے مقالے کے سلسلے میں محترمہ عفت حسن کو نامور تخلیق کاروں کی طرف سے موصول ہوئے تھے، ان میں سے چار اصحاب کے خطوط کتاب کی زینت ہیں۔

اختر حسین شیخ صاحب کی تحریر حاصل مطالعہ ہے جو انھوں نے ’’شمشیر براں۔ سیف زلفی‘‘ کے عنوان سے سپردِ قلم کی ہے۔ یہ آخری صفحات سیف زلفی کی سوانح، شخصیت اور فن کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ اگر ہم ڈاکٹر شبیہ کے اپنے تحریر کردہ صفحات کا مطالعہ کریں تو ان کی ہنرمندی اور ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔ مرتب اس لحاظ سے بھی قابلِ تعریف ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو مدلل مداحی یا کتاب المناقب نہیں بل کہ سیف زلفی کے فن پر ناقدین کی کڑی آراء کو من وعن شائع کر دیا ہے۔

(ادبی جملہ ’مخزن‘ لاہور، جلد ۱، شمارہ ۱۰، جنوری ۲۰۰۱ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تدوین کا مظہر ''کلیاتِ حبیب''

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

◆◆

تحقیق و تدوین کا کام مسلسل محنت اور ریاضت کا متقاضی ہے۔اس میں قدیم و جدید عہد کی تخصیص نہیں بل کہ دونوں زمانے تحقیق کے حوالے سے یکساں توجہ چاہتے ہیں۔بعض اوقات جدید عہد میں بالکل سامنے کی بات بہت دُور جا پڑتی ہے اور تحقیق و تدوین کار کو مشکل میں ڈال دیتی ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے دائرہ تحقیق میں ہر نوع کا عہد اور ہر نوع کے ادبی رجحانات موجود ہیں اور وہ ہر قسم کی صورت حال میں تحقیق و تدوین کے مروجہ اصولوں کے ساتھ ساتھ اپنی اجتہادی فکر اور ناقدانہ بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے جانچ پرکھ اور چھان بین کے مراحل سے گزرتے ہیں اور اپنے ہدف تک پہنچنے میں ممکن حد تک کامیاب رہتے ہیں۔

سیّد محبوب الحسن حبیب جون پوری (۱۹۱۸ء۔۱۹۸۷ء) بیسویں صدی کے اہم شاعر ہیں۔انھوں نے نظم، غزل، قصیدہ، قطعات و رباعیات میں فکرِ سخن کی اور اپنی شاعری کا ایک معقول ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ حالات نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی شاعری کو ترتیب دے دیتے۔ چناں چہ ان کی تخلیقات کے منتشر اوراق مختلف رسائل، ڈائریوں اور مسودات کی شکل میں اِدھر اُدھر پڑے رہے۔ اَدب کی تاریخ لکھنے والے بھی ان سے بے خبر رہے اور یوں اُردو زبان کا ایک نابغہ شاعر اپنی موت کے دس برس بعد بھی کسی ایسے محقق کا منتظر رہا جو اس کے کلام کو ریزہ ریزہ جمع کر کے مدوّن کرتا اور علمی و ادبی حلقوں میں اسے ایک قابلِ لحاظ شاعر کے طور پر متعارف کراتا۔

مقامِ مسرت ہے کہ حبیبؔ جون پوری کو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن جیسا محقق میسر آ گیا جس نے نہ صرف ان کے کلام کو جمع کر کے مدوّن کیا بل کہ اس پر ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا۔ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس اہم کام کو یہیں

تک محدود نہیں رکھا بل کہ حبیب جون پوری کے احباب اور دیگر نقادوں سے بھی ان کے فن کے بارے میں آرا لیں۔ انھوں نے مسودے کی ایک نقل مجھے بھی عطا کی۔ میں نے اپنی عقل اور فہم کے مطابق بساط بھر اپنے معروضات تحریر کردیے جو ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

فیروز شاہ تغلق کے بسائے ہوئے شہر جون پور کی علمی و ادبی، مذہبی اور تاریخی حیثیت مسلمہ ہے۔ سیکڑوں ایسی بلند پایہ اور عظیم شخصیات ہیں جن کے قدوم میمنت لزوم نے اس شہر کو اعتبار بخشا اور تاریخ نے اسے ''شیرازِ ہند'' کے نام سے سرفراز کیا۔ آج بیسویں صدی کے آخری دہے میں شاید جون پور کو وہ مقام حاصل نہ رہا ہو، جو ماضی میں تھا۔ دہلی، لکھنؤ، آگرہ، الہ آباد اور ان جیسے نہ جانے کتنے شہر ہیں جو اپنے روشن خیال اور عالی دماغ اسلاف کے حوالے سے ہمارے دلوں میں بستے ہیں۔ زمانے کی تیز ہواؤں نے ان چراغوں کو بجھا دیا مگر ان کی چھوڑی ہوئی روشنی آج بھی ان دیاروں کو تابندہ رکھے ہوئے ہے۔ ان شہروں سے منسوب اِکا دکا شخصیتیں نظر آتی ہیں تو اس مٹی کی سوئی ہوئی خوشبو جاگ اُٹھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ سب لوگ زندہ ہو کر کلام کرنے لگتے ہیں جن کی قبروں کے نشان بھی مٹ چکے ہیں۔

بیسویں صدی کے پہلے دہے میں جب جون پور کی قدیم تہذیبی اور علمی روایت نئے سانچوں میں ڈھل رہی تھی اور ہندستان کا پرانا ریاستی نظام آخری سانسیں لے رہا تھا تو پانچ صدی پیش تر ہمایوں بادشاہ کے ساتھ ہندستان آنے والے میر درویش علی مرحوم کی ساتویں پشت میں مولوی سیّد شبیر حسن ایسے صاحب علم شاعر اور روضہ خواں جون پور کی نئی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ مولوی شبیر حسن پیدا تو الہ آباد میں ہوئے مگر جون پور کی مٹی انھیں اپنی طرف کھینچ لائی۔ یہیں ان کی شادی ہوئی اور ان کے علم و دانش اور فہم و بصیرت سے براہِ راست فیض پانے والے سیّد محبوب الحسن نے ان کے آنگن میں خوشبوئیں بکھیر دیں۔ سیّد محبوب الحسن المعروف حبیب جون پوری اور سید وحید الحسن ہاشمی اپنے اپنے رنگ میں خوب جمے۔ شعر و اَدب میں ایک منفرد پہچان کے حوالے سے یہ دو نام بیسویں صدی کی اَدبی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

سیّد محبوب الحسن نے تحصیلِ علم کا آغاز ہی ایک عربی اسکول سے کیا۔ جہاں عربی زبان و اَدب، فقہ، منطق اور حدیث کے علوم سے بہرہ ور ہوئے۔ علم کا ایسا چسکا پڑا کہ جون پور سے نکل کر لکھنؤ جا پہنچے جہاں علوم شرقیہ کی تمام اسناد حاصل کیں۔ یہ وہ دَور تھا جب لکھنؤ میں صفیؔ لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا، اور ملک کے گوشے گوشے میں تبدیلی اور انقلاب کی ہوا چل رہی تھی۔ آرزوؔ لکھنوی، اثرؔ لکھنوی، جوشؔ ملیح آبادی، بےخودؔ موہانی، اصغرؔ گونڈوی، حسرتؔ موہانی اور جگرؔ مراد آبادی جیسے شعرا داد سخن لے رہے تھے اور شاعری میں اصلاح پسندی کا رجحان غالب تھا۔ حبیبؔ جون پوری کو نہ صرف اس دور کے مشاعروں میں شریک ہو کر ان شعرا کو سُننے کا موقع ملا، بل کہ انھیں ان نابغۂ روزگار شخصیتوں سے ملاقات کے مواقع بھی میسر آئے۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔

ان شعرا کے اثر نے ان کے طبعی رجحان کو صیقل کرنے میں اہم کردار اَدا کیا۔ اس دَور میں انھوں نے آرزو لکھنوی سے اصلاح لینا شروع کی۔ آرزو لکھنوی کا شمار اساتذہ لکھنؤ میں ہوتا تھا۔ ان کے اَدبی و شعری کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انھوں نے نہ صرف زبان کو وسعت دی بل کہ شاعری میں فکر کے نئے دَر وا کیے۔ ان کے صالح موضوعاتِ فکر اور دل کش رنگِ تغزل نے انھیں ایسی انفرادیت بخشی تھی کہ وہ اردو شاعری میں تنہا ایک اسکول تھے۔ حبیب جون پوری آرزو لکھنوی کی شاگردی میں اُردو شاعری کے ایک نئے آہنگ سے آشنا ہوئے۔ ۱۹۴۵ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ملازمت کے سلسلے میں انھیں بجنور، کلکتہ، الہ آباد اور کئی دوسرے مقامات پر جانا پڑا۔ جس کی وجہ سے شاعری میں وہ یکسوئی حاصل نہ ہوسکی جو بڑے شاعروں کی صحبت میں رہ کر میسّر آتی ہے تاہم اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ مختلف شہروں کی فضا اور ماحول میں رہ کر انھیں بعض ایسے تجربات حاصل ہوئے جو ان کی شعری بوطیقا کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ عربی اُستاد، لیبر انسپکٹر اور فوج کی ملازمت نے بھی تجربات کے حوالے سے ان کے شعری آفاق کو وسیع کرنے میں اہم کردار اَدا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے اپنے اہلِ خانہ کو کراچی روانہ کر دیا اور خود ۱۹۵۳ء میں پاکستان آئے تو لاہور میں عربی فارسی اُستاد کی حیثیت سے آر۔ اے بازار ہائی سکول میں پڑھانے لگے۔ یہاں ان کی شاعری کے جوہر خوب چمکے اور شاگردوں کا ایک اچھا خاصہ حلقہ بن گیا۔ لاہور میں عابد علی عابدؔ کا اپنا ایک شعری حلقہ تھا۔ چناں چہ دونوں حلقوں میں ٹھن گئی اور ایک عرصے تک شاعرانہ مجادلے ہوتے رہے۔ لیکن حبیب جون پوری نے اپنی روایتی شرافت اور وضع داری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انھوں نے ہمیشہ عابد علی عابدؔ کا دل سے احترام کیا اور مشاعروں اور دیگر اَدبی محفلوں میں انھیں عزت کا مقام دیا۔ یہاں تک کہ اُن کی وفات پر ایک قطعہ بھی کہا ہے:

درد کی ٹیس نے دل کو کر لیا آماج گاہ
دل تو ٹوٹا تھا مرا پہلے ہی والد کے بغیر
حسرت نظارگی کچھ مضمحل سی ہو گئی
اُٹھ گیا لطفِ سخن گوئی بھی عابدؔ کے بغیر

لاہور میں تقریباً بائیس برس گزارنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں وہ کراچی چلے گئے۔ کراچی میں انھوں نے جتنا عرصہ بھی گزارا، اس میں شعر و شاعری کا سلسلہ موقوف نظر آتا ہے اور وہ مذہب کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں امام بارگاہ و مسجد حسینیہ سجادیہ کی خطابت، مجالس خوانی اور قصیدہ خوانی نے ان کی شخصیت کو بالکل بدل کر رکھ دیا اور انھوں نے شاعری سے مکمل طور پر ہاتھ اُٹھا لیا۔ ۱۹۸۷ء میں انہتر برس کی عمر میں انتقال کیا اور کراچی ہی میں مدفون ہوئے۔

حبیبؔ جون پوری کی شاعری

بیسویں صدی کا شعری منظر نامہ، سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالت کے تناظر میں نئے نئے رجحانات اور امکانات سے ترتیب پاتا ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات نے روایتی شاعری کی بساط لپیٹ کر زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ غزل سمیت تقریباً ہر صنف سخن نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئے موضوعات کو قبول کیا اور اصلیت و واقعیت کی بنیاد پر حسن و عشق کے فرسودہ مضامین کے بجائے مسائل حیات اور تلخی ایام کو جگہ دی۔ حبیبؔ جون پوری کا عہد شاعری میں موضوعی اعتبار سے نئے تجربوں کا عہد تھا اس دور میں نئے سرے سے شاعری کا مفہوم متعین ہوا اور اسے محض دل بہلاوے کی شے سمجھنے کے بجائے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے ایک مفید ذریعہ تسلیم کیا گیا۔ ''اعلیٰ مقاصد'' سے مراد یقیناً وہ خواب تھے جو سماج کو بدلنے کی زبردست خواہش کی صورت میں اس دَور کے شعرا دیکھ رہے تھے۔ قوم کی سماجی اور معاشی زبوں حالی کو ختم کرنے، رہن سہن کے انداز بدلنے، معاشرت کے طور طریقوں کی درستی اور خوب سے خوب تر کی جستجو نے شاعری کے پرانے معیارات کو بدل کے رکھ دیا، اور شعرا نے فنی اور سماجی شعور سے بہرہ ور ہو کر اُردو شاعری کو نئے رجحانات سے روشناس کرایا۔ یہ نئے رجحانات سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر اُن خارجی عوامل سے ترتیب پاتے ہیں جنھوں نے تخلیق کار کے دروں میں جذبے اور احساس کی ایک نئی دنیا تشکیل دی۔ ماحول کی آویزش اور زمانے کی تلخیوں نے اپنے اظہار کے لیے ایک ایسا پیرایہ اختیار کیا جو روایت سے اکتساب کر کے جدید فکر و عمل کے رنگ میں ڈھلتا نظر آتا ہے۔ حبیبؔ جون پوری اس پورے منظر نامے میں ایک نئے اور منفرد طرز احساس کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ یوں تو یہ نیا طرز احساس ہمیں اجتماعی سطح پر بھی ملتا ہے لیکن حبیبؔ جون پوری کی شاعری کی مذہبی اور اخلاقی فضا ان کے بطن میں نمو پانے والی روحانیت اور مذہبیت سے اثر پذیر ہو کر اپنا الگ رنگ جماتی ہے۔ انھوں نے قطعہ، غزل، نظم اور قصیدہ سمیت اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان تمام اصناف میں ان کی طبیعت کا رنگ معمولی بیش و کم سے تقریباً ایک سا نظر آتا ہے۔ غزلیں انھوں نے کم کہی ہیں لیکن جتنی بھی کہی ہیں ان میں اُن کا اپنا ایک خاص انداز اور روایت کی پاس داری مل جل کر نئے لہجے کی خبر دیتے ہیں:

خود بڑھے تھے وہ ہماری سمت پیمانہ بکف
دیکھتے اُن کا کرم یا روئے توبہ دیکھتے

....

چار دن میں اپنی صورت ہی نہ پہچانی گئی
ہم کہاں سے زندگی لاتے کہ دنیا دیکھتے

ان کو ہے چمن سے کیا مطلب یا پھول کھلیں یا آگ لگے
جن تنکوں نے رشتہ جوڑا تھا چن چن کے جلائے جاتے ہیں
بتلائیں حبیبؔ زار تمھیں کیا شامِ فراق میں ہائے چراغ
کس طرح جلائے جاتے ہیں کس طرح بجھائے جاتے ہیں

درج ذیل اشعار میں لہجے کا بانکپن اور انفرادیت صاف محسوس کی جاسکتی ہے:

ایک آنسو میرے کام آیا بہت — دیکھ کر مجھ کو وہ گھبرایا بہت
غم کے ہر پتھر سے ٹکرایا بہت — قلب کا آئینہ ٹوٹا تو مگر

....

فیض پائے نہ طاقت سے ناطاقتی
رشتۂ آفتاب و قمر کاٹ دو

....

مشکلیں آتی ہی رہتی ہیں محبت میں حبیبؔ!
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار ملے

....

ممکن ہے دل کے جلنے سے روشن ہو شہرِ غم
پی لو نظر جو آئے کہیں دوستی کی آگ

....

بحرِ ہستی سے تباہی کی شکایت ہے عبث
نقش بہتے ہوئے پانی پہ بناتے کیوں ہو
درد کی لے کا نہیں لحنِ سکون سے کوئی ربط
میری آواز سے آواز ملاتے کیوں ہو

....

اک حشر ہے اُس کا کسی کوچے سے گزرنا
رفتار کی حد حدِّ قیامت سے ملی ہے
مشکل کی ہر اک شکل پہ میرا ہے تصرف
مجھ کو یہ سند شاہِ ولایت سے ملی ہے

جو سطحِ آب پہ اُبھرا اُبھر کے ٹوٹ گیا
وہ میری عمر کا آئینہ تھا حباب نہ تھا
کلیم طور پہ حالت بدل گئی جس سے
وہ اک نظر کی کرامت تھی انقلاب نہ تھا

....

درج بالا اشعار کے انتخاب میں کسی خاص ترتیب کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا تاہم اس جستہ جستہ انتخاب سے بھی یہ بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ بیسویں صدی کی غزل جس ڈھب پر اپنا وجود برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس میں حبیبؔ جون پوری کا زیادہ نہ سہی لیکن ایک قابلِ اعتبار حصّہ ضرور بنتا ہے۔ انھوں نے حالیؔ اور ان کے معاصر لکھنوی شعرا کے زیرِ اثر اصلاحِ غزل کے کام کو نہ صرف آگے بڑھایا بل کہ ایک ایسے انداز میں غزل کی صورت گری کی کہ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں زندگی کے ناپائیدار اور فانی ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اسے بسر کرنے اور برتنے کا سلیقہ بھی موجود ہے۔ بے عملی اور زندگی سے فراریت کا رجحان جو اس دور کے اکثر شعرا کے ہاں نظر آتا ہے حبیبؔ جون پوری کی غزل میں ایک حقیقت پسندانہ انداز میں مشکلوں اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صورت میں ملتا ہے:

مشکلیں آتی ہی رہتی ہیں محبت میں حبیبؔ
کیا ضروری ہے کہ ہر راستہ ہموار ملے

....

مشکل کی ہر اک شکل پہ میرا ہے تصرف
مجھ کو یہ سند شاہِ ولایت سے ملی ہے

....

بیسویں صدی کی صنعتی زندگی نے جہاں انسان کو سیاسی انتشار اور معاشی بدحالی سے دوچار کیا وہاں ہر شے کو مادیت کے پیمانوں میں رکھ کر ذہنی اور جذباتی خلفشار کو بھی ہوا دی۔ اس صورتِ حال میں غیر فطری جذباتیت کا پیدا ہونا ایک لازمی امر تھا لیکن حبیبؔ جون پوری اس صورتِ حال سے صاف بچ نکلتے ہیں اور اپنی داخلی روحانیت سے توانائی حاصل کر کے زندگی کی تلخیوں، پیچیدگیوں اور اُلجھنوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں، وہ نہ صرف زندگی کا گہرا شعور رکھتے ہیں بل کہ اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے وسیع سماج کی تبدیلیوں سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔ انھیں غالبؔ کی طرح غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے اور اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعت درکار ہوتی ہے تو وہ نظم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غزل کو از کار رفتہ صنفِ سخن

جان کر اس سے دست کش ہو جاتے ہیں بل کہ غزل میں موضوعات کے نئے تجربات کے ساتھ ساتھ وہ نظم میں ذرا کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی پابند نظمیں اپنے عہد کے آشوب اور تغیر پذیر صورتِ حال کی آئینہ دار ہیں۔ حبیبؔ جون پوری کا دَورِ نظم نگاری کے لیے بہت ساز گار تھا۔ یہ پورا عہد بنیادی طور پر موضوعاتی شاعری کا تھا۔ سیاسی، اخلاقی، مذہبی، اصلاحی اور فطرت کے موضوعات پر لکھی گئی نظموں کا ایک وافر ذخیرہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ شاعر اپنے بند خول سے نکل کر خارجی مشاہدات کے ذریعے کائنات کے وسیع آفاق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے۔ یہ تلاش اس جدوجہد کے ہم رکاب چلتی ہے جو اپنے دامن میں شدید بے چینی اضطراب اور عدم اطمینانی کو لیے ہوئے ہے۔ حبیبؔ جون پوری بھی شاعروں کے اس کارواں میں نمایاں نظر آتے ہیں جو اپنے حال سے ناآسودہ ہیں اور اپنے گرد و پیش میں بکھرے ہوئے دُکھوں اور غموں کی داستان کو کرب انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں ''بیوہ کی خودکشی، نوجوان ساتھی کی موت، لاشیں، فرنگی، شاعر، نامعلوم حسرت، مفلس طالب علم، حسرتِ دیدار اور کشمکش'' سماجی اور تہذیبی شعور کی آئینہ دار ہیں جو شاعر کے قلب و روح میں رچا ہوا نظر آتا ہے۔ نظم ''مفلس طالب علم'' صرف ایک طالب علم کی مفلسی اور غربت کا نقشہ ہی پیش نہیں کرتی بل کہ اس نظم میں ایک پورے عہد کا دَرد اور کرب سمٹ آیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

مفلسی نے اس طرح کر دی ہے کچھ مٹی خراب
غیر تو کیا اپنے سائے سے بھی آتا ہے حجاب

....

یاس میں اُستاد کی بھی بدلی نظریں بھانپ کر
تلملا اُٹھتا ہے رہ جاتی ہے ہمت کانپ کر

....

حوصلے کیا چھوڑے تن میں جان بھی رکھتی نہیں
مفلسی انسان کو انسان بھی رکھتی نہیں

....

اے حبیبؔ اندھی ہوا میں شمع جل سکتی نہیں
یہ زمینِ ہند ہے کروٹ بدل سکتی نہیں

....

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ نظم فکری اور فنی اعتبار سے چالیس کے دہے میں لکھی جانے والی اعلیٰ ترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ شدتِ تاثر اور موضوع کے حوالے سے یہ نظم نہ صرف ہندستان کی اقتصادی

صورتِ حال کو سامنے لاتی ہے بل کہ جبر اور استحصال کے شکنجے میں جکڑے ہوئے انسانوں کا نوحہ بھی ہے۔ نظم ''بیوہ کی خودکشی'' عورت پر ہونے والے ظلم وستم اور ان معاشرتی رسم ورواج کا پتہ دیتی ہے جنھوں نے حالیؔ کو ''چپ کی داد'' لکھنے پر مجبور کیا۔ پچاس اشعار پر مشتمل یہ نظم ایک بیوہ عورت کے شکستہ جذبات اور معاشرت کی ستم ظریفیوں کی رُوداداس انداز میں پیش کرتی ہے کہ پڑھتے ہوئے دل دہل جاتا ہے۔ حبیبؔ جون پوری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک مظلوم عورت کے جذبات کی عکاسی اس خوب صورتی سے کی ہے کہ اس ہنرمندی پر انھیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

حبیب جون پوری کی دیگر نظموں میں ''حسرتِ دیدار، شکستِ حسن، عہدِ ماضی، اور جدائی'' اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک مختلف صورتِ حال کا پتہ دیتی ہیں۔ ان نظموں میں شاعر کا انفرادی احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ حبیبؔ کے ذاتی تجربات اور واردات وکیفیات ان نظموں کی اساس ہیں۔ فنی اور معنوی حوالے سے بھی ان نظموں کی اہمیت کم نہیں ہے تاہم حبیبؔ جون پوری کی وہ نظمیں جو اپنے دامن میں اجتماعی طرزِ احساس لیے ہوئے ہیں زیادہ اثر انگیز ہیں کہ ان کے مشاہدے کی وسیع کائنات ان نظموں میں سمٹ آئی ہے۔

حبیبؔ جون پوری نے قطعات اور قصیدے بھی لکھے۔ ان اصناف میں بھی ان کی شاعرانہ مہارت اور فنی پختگی پورے طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ قطعات زیادہ تر اخلاقی نوعیت کے ہیں جب کہ قصائد مذہبی معتقدات کو نمایاں کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ اور حضرت امام زمانہ کی مدح میں لکھے گئے قصائد جوش، محبت اور عقیدت سے پُر ہیں اور ان عظیم ہستیوں سے شاعر کی والہانہ وابستگی کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔

حبیب جون پوری کا کلام کتاب کی صورت میں پہلی بار منظرِ عام پر آرہا ہے۔ اہلِ دانش اور ادب فہم اس پر کیا رائے دیتے ہیں۔ یہ الگ معاملہ ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک بھولا ہوا شاعر پھر سے زندہ ہو رہا ہے۔

میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کو بیسویں صدی کے ایک معتبر شاعر کے کلام کی تدوین پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے جس دقتِ نظر سے حبیب جون پوری کا کلام ترتیب دیا ہے، اس سے ان کی تحقیقی صلاحیتیں ہی اُجاگر نہیں ہوتیں بل کہ ان کی سخن فہمی اور حُسنِ ذوق کی شعاعیں بھی جلوہ ریز ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تدوین کا کام عام تحقیق سے زیادہ مشکل ہے کہ اس میں بے شمار ایسی اُڑچنیں بھی ہیں جن سے ہر کوئی نبرد آزما نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن لائقِ تحسین ہیں کہ وہ تدوین کے ہر مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں۔

◆◆◆

کلیاتِ حبیبؔ پر ایک نظر

پروفیسر آفاق صدیقی

◆◆

زباں پہ بارِ خدایا، یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نُطق نے بوسے مری زباں کے لیے

یادش بخیر حضرت محبوب الحسن حبیبؔ جون پوری سے میرا بھی روحانی رشتہ ہے۔ جون پور جو صدیوں سے علم واَدب کا گہوارہ رہا اور جس خطۂ مردم خیز نے ایسی جلیل القدر ہستیوں کو جنم دیا، جن کا نام تاریخ عالم میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے اپنے شیخپوری بزرگوں کے طفیل مجھے بھی دو تین مرتبہ شیرازِ ہند یعنی جون پور کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور شیخ اعظم شاہ پیر سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریکِ تصف کے بارے میں بھی اپنے والد محترم سے بہت کچھ سُنا، لیکن ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان آنے کے بعد رفتہ رفتہ سندھی اَدب و تاریخ سے واقفیت کا دائرہ وسیع ہوا تو میرے علم میں یہ بات آئی کہ سندھ کے تو بڑے بڑے عالموں، فاضلوں اور صوفی بزرگوں پر جون پور کے اثرات رہے ہیں مثلاً مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں ٹھٹھہ، سیہون، ٹیاری اور بکھر جیسے تاریخی مقامات سے تعلق رکھنے والے کئی شعرائے کرام اور بلند پایہ صوفی بزرگ مہدوی تحریک کے حوالے سے جون پور کے شیدائی تھے۔ سندھی کے پہلے ذی علم شاعر قاضی قادن، شاہ لطیف کے نگڑ دادا شاہ عبدالکریم اور ٹھٹھہ کے مشہور و معروف عالم و عارف مخدوم معین ٹھٹھوی، جنھوں نے عربی میں رسالۂ اویسیہ تصنیف کیا اور جو عربی، فارسی اور ہندی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ہندی میں ''بیراگی'' تخلص تھا اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے شاہ جو رسالو تھے، میں جو بیت اور دائیاں ہیں، ان پر رسالۂ اویسیہ کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خطیبِ ملت نواب بہادر یار جنگ بھی مہدوی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ مجھے خوشی ہے اور میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بڑی جگر کاری سے جناب محبوب الحسن حبیب جون پوری کے کلامِ بلاغت نظام کی کچھ جھلکیاں ''کلیاتِ حبیبؔ'' میں یک جا کر دیں۔ حبیبؔ صاحب کی ولادت باسعادت ۱۹۱۸ء میں ہوئی تھی۔ شعر و اَدب کا ذوق وشوق وراثتاً ملا اور اٹھارہ برس کی عمر میں مشقِ سخن کے نکھار کی یہ کیفیت رونما ہوئی کہ ''نامعلوم حسرت'' کے عنوان پر جو نظم کہی، اس نظم ہی سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابتدائی دَور کی شاعری بھی کتنی جان دار ہے۔ مثال کے طور پر اس نظم کا ابتدائی بند ملاحظہ فرمائیں:

میں ہوں کہ گھٹا جاتا ہوں دل ہے کہ حزیں ہے
مایوس فضائیں ہیں شب تار زمیں ہے
اس دَرد کا اس غم کا ٹھکانا بھی کہیں ہے
میں چاہتا ہوں کیا، مجھے معلوم نہیں ہے

اسی نظم کا آخری بند کچھ یوں ہے:

اُلفت کی شکایت ترا شکوہ نہیں پیارے
میں جانتا ہوں ظلم کسی کا نہیں پیارے
پوری ہو تمنا تو تمنا نہیں پیارے
بس اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے

''کلیاتِ حبیبؔ'' میں ۱۹۶۸ء تک لکھی گئی جو نظمیں شاملِ اشاعت ہوئی ہیں، ان میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ رجحانات و میلانات اور فنی جدّت وندرت کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ اندازِ بیان پر انیسؔ و چکبستؔ، اخترؔ شیرانی، جوشؔ ملیح آبادی اور احسان دانشؔ کی نظم نگاری کے علاوہ حسرتؔ موہانی کے غزلیہ لہجے کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''عہدِ ماضی'' ایک نظم کا عنوان ہے اور اس کے اشعار کا لطفِ بیاں کچھ اس طرح ہے:

یاد ہے آغازِ اُلفت کا زمانہ یاد ہے
ڈال کر بانہوں میں بانہیں مسکرانا یاد ہے
خم بہ خم زلفوں کا وہ چہرے پہ میرے لوٹنا
بھینی بھینی نکہتوں میں ڈوب جانا یاد ہے

....

وہ مری بے تابیِ دل سے تری بے تابیاں
وہ مرے شکووں پہ تیرا سر جھکانا یاد ہے
وہ مرا جذبات سے گھبرا کے تجھ سے روٹھنا
آب دیدہ ہو کے وہ تیرا منانا یاد ہے

آیئے اب ۱۹۳۹ء کی ایک نظم "بیوہ کی خودکشی" کا منظر دیکھتے ہیں، جس پر شاعرِ مزدور حضرت احسان دانش کی منظومات کا پرتو ہے:

یہ اندھیری رات یہ ساری فضا سوئی ہوئی
پتّی پتّی منظرِ خاموش میں کھوئی ہوئی
چند تارے ہیں بھی تو بے نور پتھرائے ہوئے
جیسے باسی ہار میں ہوں پھول کمھلائے ہوئے

....

وہ بھیانک سی گھٹن اشجار پر چھائی ہوئی
ہر لچکتی شاخ اک ناگن ہے لہرائی ہوئی

غمزدہ رات کے بھیانک منظر کی ان جھلکیوں کے بعد جواں سال بیوہ کے گھر کا سماں دیکھیے:

سو رہے ہیں مست و بے خود گھر کے سب پیر و جواں
ہو گئی ہیں بند حُسن و عشق کی سرگوشیاں
ہاں مگر اک سمت اک گوشے میں کوئی نوحہ گر
لے رہی ہے کروٹیں پیہم کلیجہ تھام کر
سوگ کے کپڑوں میں نازک جسم کفنائے ہوئے
رو رہی ہے دل میں ارمانوں کو دفنائے ہوئے

....

جب نظر آتا نہیں دیتا کوئی بیکس کا ساتھ
زہر کی شیشی کی جانب خودبخود بڑھتا ہے ہاتھ

....

اشک ٹپکا، آنکھ جھپکی، ہچکی آئی، کھو گئی
موت کی آغوش میں اک آہ بھر کر سو گئی

مذکورہ نظموں کے علاوہ ''مفلس طالب علم''، ''شکستِ حُسن''، ''فرنگی''، ''لاشیں''، ''کشمکش''، ''حسرتِ دیدار''، ''آؤ گیت گائیں''، ''نوجوان ساتھی کی موت''، ''جدائی''، ''اُردو''، ''شاعر''، ''میر انیس'' اور ''علامہ اقبال'' جیسے عنوانات پر جو نظمیں ہیں، ان سب کا بنیادی وصف یہ ہے کہ زبان و بیان میں بے ساختگی، روانی، برجستگی اور فصاحت و بلاغت کے رکھ رکھاؤ کو بڑے سلیقے سے قائم رکھا گیا ہے۔ ان نظموں میں رومانی نظمیں بھی ہیں، سیاسی بصیرت کو ظاہر کرنے والی نظمیں بھی اور وہ نظمیں بھی جو اکابرین سے اظہارِ عقیدت کے طور پر لکھی گئیں۔

ھ۔نظم کے بعد اس شعری مجموعے میں ۱۶ غزلیں ہیں، جن کو پڑھ کر کلاسیکی غزل گوئی کے آداب سے وابستگی اور اپنے لہجے میں تغزل کی روایات کو سمونے کا رنگ و آہنگ ملتا ہے، مثلاً یہ اشعار دیکھیے :

سر جھکا کر لے گیا گردن پہ خونِ وفا
کس طرح چہرے سے ان کے رنگ اڑتا دیکھتے

....

یہ کس نے دن میں ہٹا لی نقاب چہرے سے
نظر اُٹھا کے جو دیکھا تو آفتاب نہ تھا

....

جو سطحِ آب پہ اُبھرا، اُبھر کے ٹوٹ گیا
وہ میری عمر کا آئینہ تھا، حباب نہ تھا

....

لبوں سے جن کے برستے تھے قہقہے دن رات
وہ لوگ آج ترستے ہیں مسکرانے کو

....

اس آخری شعر میں جو کرب ناکی پائی جاتی ہے، وہ کتنی معنی خیز ہے۔ یہ اُن کے دلوں سے پوچھیے جنھوں نے وہ دَور دیکھا ہو، جس میں خوف و دہشت، ناآسودگی، منافقت، طبقاتی کشمکش، جرائم پروری، لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری اور ایسی ہی کئی دوسری لعنتوں کا دور دورہ نہ تھا۔ ایسے ویسے، کیسے کیسے اور کیسے کیسے، ایسے ویسے نہیں ہوئے تھے۔

حبیب صاحب ۱۹۵۳ء میں پاکستان آگئے تھے۔ قریب قریب ۲۳ سال لاہور میں رہے۔ ظاہر ہے دبستانِ لاہور کا کچھ اثر فکر و فن پر پڑنا تھا۔ ملکی حالات بھی کھینچاتانی اور افراتفری کا شکار تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ۱۶

اکتوبر ۱۹۵۱ء کو قائدِ ملت کا قتل، پاکستان کا قتل تھا۔ بہر حال ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگا۔ سیاست میں کیا کچھ ہوا، اس کو چھوڑیے، حبیبؔ جون پوری کی شاعری کے مزاج میں جو تبدیلی آئی اُسے دیکھیے، فرماتے ہیں:

جوان خون نئے کھیت کو مفید سہی
زمین فصل کو خود کھا گئی تو کیا ہو گا
نہ رہ نماؤں کی محفل میں لے چلو مجھ کو
میں بے ادب ہوں ہنسی آ گئی تو کیا ہو گا

....

انسان سے رخصت ہوا معیارِ فضیلت
دستار تو لاکھوں ہیں مگر سر نہیں ملتا

....

گاہکوں نے مرے سر کی تو لگائی قیمت
میری اُلفت کے نہ دنیا میں خریدار ملے

....

مرے ہی باغِ وفا سے نہ پھل ملے مجھ کو
مگر میں خوش ہوں کہ کچھ ڈالیوں کے سائے ہیں

....

دھوپ جب صحرا میں تڑپانے لگے
ایک ٹہنی کا بھی ہے سایا بہت

....

"کلیاتِ حبیبؔ" میں کچھ قصائد اور کچھ قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں، جن سے شاعر کی پُرگوئی واضح ہوتی ہے۔ قصائد میں چار قصیدے حضرت علیؓ کی مدح میں ہیں، ایک قصیدہ حضرت امام حسنؓ کی ثناء خوانی میں اور ایک قصیدہ امام حسینؓ کی شان میں۔ ان میں شعری محاسن کی موجودگی اور قصیدہ گوئی کے آداب کی بجا آوری یہ ثبوت دیتی ہے کہ لفظی اور معنوی اثر آفرینی میں شاعر نے کتنی خوش سلیقگی برتی ہے۔

قطعات اور رباعیات میں بھی خوش اُسلوبی سے قادر الکلامی کا جادو جگایا ہے، گویا روح بن کر ذرّے ذرّے میں سما جانے کا جو دعوا حبیب صاحب نے کیا ہے، اس کی دلیل بل کہ روشن دلیل "کلیاتِ حبیبؔ" ہے۔ کاش مولانا اپنا پورا کلام سینت کر رکھتے، مگر اپنی عمرِ عزیز کے آخری دَور میں حبِ الٰہی کا جمال، شعر و سخن کی جمال

آفرینی سے بے نیاز سا لگتا ہے۔

۱۹۷۶ء میں موصوف کراچی آ گئے تھے۔ سجادیہ امام بارگاہ میں تین چار مرتبہ شرف نیاز حاصل ہوا۔ اپنے استاد محترم علامہ آرزو لکھنوی کا ذکرِ خیر انتہائی عقیدت و محبت سے کرتے تھے۔ آرزو صاحب سے مجھے بھی بڑی عقیدت رہی۔ جو خلوص و محبت، عجز و انکسار اور شفقت بے پایاں علامہ آرزو کے مشفقانہ برتاؤ میں پائی، وہی حبیب صاحب کے حُسنِ سلوک میں۔ اب ایسے عالم باعمل اور شاعری کو خلوصِ دل سے اپنا تہذیبی سرمایہ اور کرداری تشخص سمجھنے والے کہاں ملیں گے:

شاعر ہے تو دل کر لے نگینوں کی طرح
بازارِ وفا میں رہ تو ہیروں کی طرح
دل میں ہو اگر حُبِّ الٰہی کا جمال
اشعار نکلتے ہیں حدیثوں کی طرح

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور دسمبر ۱۹۹۹ء)

◆◆◆

کُلیاتِ حبیبؔ۔ایک جائزہ

ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی

◆◆

مولانا الطاف حسین حالی نے جب اپنا دیوان مرتب کیا تو اپنی بعض قدیم غزلیں، حصہ داشعار بوجوہ شاملِ دیوان نہ کیے اور یوں ان کے کلام کا کثیر حصہ زیورِ اشاعت سے آراستہ نہ ہونے کے سبب تلف ہو گیا، لیکن بعض ایسے شعرا بھی ہیں، جن کا کلام ان کی حیات میں سرے سے ہی مرتب نہیں ہونے پاتا اور ان کی رحلت کے بعد گردشِ زمانہ کی نذر ہو جاتا ہے یا پھر کسی متشاعر کے لیے ذریعۂ عزت قرار پاتا ہے۔

حبیبؔ جون پوری اس اعتبار سے خوش بخت ہیں کہ ان کے کلام کا بیش تر حصہ ان کی زندگی میں نہ سہی، بعد از وفات ہی سہی، مرتب ہو کر ''کلیاتِ حبیبؔ'' کے نام سے شائع ہو گیا ہے اور یہ فرض کفایہ ان ہی کے خانوادے کے ایک محقق اور نقاد ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ہاتھوں اَدا ہوا۔

''کلیاتِ حبیبؔ'' نظموں، غزلوں، قصائد، رباعیات و قطعات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی حبیبؔ جون پوری کے کلام کو موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے اہم خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جناب حبیب جون پوری کا کلام اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں متنوع معروضات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔'' (فلیپ پسِ ورق)

بلاشبہ کسی شاعر کے ہاں موضوعات کے تنوع کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم کسی شاعر کی شاعرانہ عظمت کا معیار محض موضوعات کی کثرت نہیں، شعریت ہے۔ اس حوالے سے ''کلیاتِ حبیبؔ'' کا مطالعہ کیا جائے تو حبیب جون پوری ایک کہنہ مشق اور مستند شاعر کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں۔ ان کی نظموں، غزلوں اور رباعیات و قصائد میں روایتی اور جدید دونوں طرح کے موضوعات پر تحمل شعری اسلوب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر بریلوی کا یہ قول ہمارے مؤقف کی بھرپور تائید کرتا ہے کہ:

"پڑھنے والے ان کی شاعری اور انداز سے مستفید ہو سکتے ہیں۔"

حبیبؔ جون پوری کو شعری ماحول ورثہ میں ملا۔ ان کے والد سید شبیر حسن صفاؔ الٰہ آبادی معروف شاعر اور تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ حبیبؔ جون پوری نے اپنے عہد کے قلبی جذبات اور زبان کے ماہر غزل گو آرزوؔ لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے تھے چناں چہ ان کی غزلوں میں اُستاد کا رنگ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

باتوں میں مروّت کے رشتے وہ توڑ رہے ہیں ہنس ہنس کر
آنکھوں سے محبت کے ساغر رہ رہ کے پلائے جاتے ہیں

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں غزل کی مقبولیت کے دَور میں جدید نظم نگاری کی جس تحریک کو پروان چڑھایا تھا، اس نے مابعد کی تحریکوں پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے چناں چہ ترقی پسند شعرا نے نہ صرف اس روایت کی پاس داری کی بل کہ اسے تازہ خون سے بھی سیراب کیا۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں نظم نگاری کی تحریکوں کے باعث غزل کے محدود کینوس میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اس عہد میں جن غزل گو شعرا نے غزل کے چراغ کی لَو کو فروزاں رکھنے کی کوشش کی اور اسے سیاسی، سماجی، اخلاقی، اصلاحی موضوعات کا ترجمان بنانے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ان میں آرزوؔ لکھنوی اور ان کے شاگردوں کا نام سرِ فہرست ہے۔

حبیبؔ جون پوری کی دستیاب غزلوں میں قدیم اور جدید دونوں رنگوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی غزل مزاحمتی رجحان کی آئینہ دار بھی ہے، سیاسی و سماجی مسائل کے بیان سے بھی مملو ہے اور خالص لکھنوی لہجہ کی ترجمان بھی ہے۔ انھوں نے نرم، لطیف اور شیریں لہجے سے کام لیتے ہوئے غزل کی ہیئت کو کارآمد بنانے کی سعی کی ہے۔

ترقی پسند شعرا کی صحبت کے زیرِ اثر حبیبؔ جون پوری نے نظم کی دنیا میں قدم رکھا لیکن ان کی اس ہجرت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غزل کو دور از کار رفتہ خیال کرتے تھے یا انھیں غزل گوئی پر قدرت نہ آتی تھی، بل کہ ان کی نظم نگاری میں بھی غزل کا سا لہجہ دَر آیا اور ان کی نظم تغزل کے عناصر لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ حبیبؔ جون پوری کی شاعری پر رومانیت کے اثرات بھی پڑے۔ رومانوی رجحانات نے کم و بیش تین دہائیوں تک شعر و ادب کو اپنے سحر میں مبتلا کیے رکھا۔ تشکیک اور ماضی سے محبت رومانوی شعرا کی شناخت ہیں۔ ماضی کی حسین یادیں ان کے غموں کا مرہم ہوتی ہیں، وہ خوشیوں کے تخت پر براجمان ہوتے ہوئے بھی رنج و الم کے لیے دستِ سوال دراز کرتے نظر آتے ہیں۔ حبیبؔ جون پوری کی نظم "عہدِ ماضی" انھیں رومانوی شعرا کی صف میں جگہ دیتی ہے:

خم بہ خم زلفوں کا وہ چہرے پہ مرے لوٹنا
بھینی بھینی نکہتوں میں ڈوب جانا یاد ہے
سرخیوں سے وہ جھلک اٹھتا رُخِ ضو ریز سے
لیتے لیتے نام میرا جھینپ جانا یاد ہے

حبیب جون پوری کا عہد انگریز سامراج کے ظلم وستم اور ہندو انگریز گٹھ جوڑ سے عبارت تھا۔ اس ظلم کا شکار زیادہ تر مسلمان ہی ہوتے تھے۔ سیاسی ابتری کے علاوہ ہندوانہ رسوم ورواج نے مسلمانوں کے سماجی اور خاص طور پر عائلی زندگی پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ چناں چہ افلاس اور غیر اسلامی رسوم ورواج پر حبیب جون پوری نے جس انداز سے آنسو بہائے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں معاشرتی حالات کا کس قدر گہرا شعور موجود تھا۔ اس تناظر میں ان کی نظم ''مفلس طالب علم''، نظیر اکبرآبادی کی نظم ''مفلسی'' اور ''بیوہ کی خودکشی'' حالی کے نظم ''مناجات بیوہ'' کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ذیل کے چند اشعار حبیب جون پوری کی قادرالکلامی اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعہ کا پتہ دیتے ہیں :

دل سنبھلتا ہی نہیں ہے سینۂ صد چاک میں
پھول سا چہرہ اَٹا ہے بیوگی کی خاک میں

....

اشک ٹپکا آنکھ جھپکی ہچکی آئی کھو گئی
موت کی آغوش میں اک آہ بھر کر سو گئی

....

اور کر اک آہ ٹوٹے ہند کی رسموں کا دام
اے جوانِ مرگ بیوہ تجھ پہ ہو میرا سلام

(بیوہ کی خودکشی)

''کلیاتِ حبیب'' کی نظموں میں میر انیس اور علامہ اقبال کی نظموں کے مطالعے سے حبیب جون پوری کی اس عقیدت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، جو میر انیس اور علامہ اقبال کے لیے ان کے قلب وذہن میں موجود تھی۔ انیس کی ادبی خدمت اور علامہ اقبال کی ملت دوستی کو موضوع بنا کر حبیب جون پوری نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

حبیب جون پوری شاعر کے مرتبے اور اس کی ذمہ داریوں سے خوب آگاہ تھے۔ ''کلیاتِ حبیب'' میں شامل ان کی نظم بعنوان ''شاعر'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

جب رگِ جمہوریت کو کاٹنے بڑھتا ہے ظلم
بے گناہی ہی صبر کرتی ہے اثر دیتا ہے وہ

....

قلبِ شاعر کو ملی ہیں عشق کی سب برکتیں
عشق ہی سے قلبِ آہن موم کر دیتا ہے وہ

۱۸۶۷ء کے اُردو ہندی جھگڑے کے بعد اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیے جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ حبیبؔ جون پوری کی اُردو زبان سے محبت اور تاریخِ زبانِ اُردو سے آگہی، اُن کی نظم بعنوان ''اُردو'' ہے، جس کے بارے میں جناب وحیدالحسن ہاشمی کا مؤقف یہ ہے کہ اسے ''محاسنِ اُردو'' کہا جانا چاہیے۔

حبیبؔ جون پوری کی طبیعت قصیدہ نگاری کے لیے موزوں تھی۔ ''کلیاتِ حبیبؔ'' میں آٹھ قصائد شامل ہیں، جو تمام آئمہ مطاہرین کی شان میں کہے گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے روایتی قصیدہ نگاروں کی طرح مبالغہ آرائی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے وہ نجمؔ آفندی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ان قصائد کی فنی پختگی، زبان و بیان کا جوش، پُرشکوہ ترکیب حبیبؔ جون پوری کو مذہبی قصیدہ نگاروں کی صف میں جگہ دینے کے لیے کافی ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر سحرؔ انصاری کا مؤقف یہ ہے:

> ''......نظم نگاری پر انھیں قدرت تو تھی، جب قصیدے کی طرف توجہ ہوئی اس میں انفرادیت کے جوہر نمایاں کیے۔''

''کلیاتِ حبیبؔ'' کے آخری حصہ میں رباعیات اور قطعات شامل ہیں۔ ان میں روایتی موضوعات شاعری کے علاوہ اخلاق، مذہب اور معتقدات کو جگہ دی گئی ہے۔ چند ایک میں حبیبؔ جون پوری نے اپنے ''مولا'' کو مختلف اُدبی حوالوں سے بیان کرتے ہوئے ''تعلّی'' سے کام لیا ہے۔ ان کے قطعات بیان کے تسلسل، مناسب اختصار، برجستگی، شوخی اور ذہانت کے اظہار ایسی صفات سے مملو ہیں۔

''کلیاتِ حبیبؔ'' کی اشاعت سے قبل پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے فن اور فن کار کے رشتے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ملک کے نامور اہلِ قلم سے حبیبؔ جون پوری کی شخصیت اور فن پر مقالے لکھوائے ہیں۔ فن کار کی سوانح عمری اس کے فن کے بعض پہلوؤں کی تفہیم کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح تہذیب اور سماج کے روّیوں کے بارے میں حقائق کا بھی تخلیق کے جائزے کے لیے ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاثراتی تنقید کے علم برداروں کے نظریات کے علی الرغم جدید عہد میں فن پارے کو فن کار کی ذات سے الگ کر کے نہیں دکھایا جاتا۔

خوش قسمتی سے مرتب خود بھی محقق ہیں، اس لیے انھیں اس ضرورت کا شدید احساس تھا چناں چہ جناب سید وحید الحسن ہاشمی، جو ایک طرف تو شعر و ادب کی دنیا میں بلند مرتبے پر فائز ہیں، دوسری طرف تحقیق و تنقید سے ان کی دل چسپی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مزید یہ کہ وہ حبیب جون پوری کے برادر ہیں۔ اس حوالے سے ان کی مہیا کردہ معلومات کہیں زیادہ معتبر ہیں۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی نے اپنے مضمون ''حبیب جون پوری۔ چند باتیں چند یادیں'' میں حبیب جون پوری کی سوانح بیان کرتے ہوئے بعض ایسے واقعات کی نشان دہی کی ہے، جن کے بغیر بعض تخلیقات کی تفہیم شاید ممکن نہ ہوتی۔

حبیب جون پوری کی ایک نظم ''فرنگی'' کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...... بھائی صاحب مرحوم کی واسق جون پوری سے صرف شناسائی تھی، لیکن ۱۹۲۸ء میں قیامِ لکھنؤ کے زمانہ میں گہری دوستی ہوگئی۔ اس کی نظم ''بھوکا ہے بنگال'' سے متاثر ہو کر انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک نظم ''فرنگی'' کے عنوان سے کہی، لیکن یہ نظم کہیں شائع نہ ہو سکی۔''

اپنے مضمون میں سیّد وحید الحسن ہاشمی نے حبیب جون پوری کی شاعری پر ان کی شخصیت اور عہد کے حوالے سے تنقید کی ہے۔ نظم نگاری، تغزل، قصائد، رباعیات و قطعات پر فرداً فرداً تحقیقی اور تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے یہ فیصلہ صادر فرمادیا کہ:

''......ان کی متعدد نظموں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو خوبی اور حُسن ان کی نظموں میں ہے، وہ غزلوں میں موجود نہیں۔ مَیں انھیں بنیادی طور پر نظم کا شاعر اس لیے کہتا ہوں کہ ان کی نظموں میں تغزل بھی ہے اور مرثیت بھی۔''

''کلیاتِ حبیب'' کی تفہیم و تفسیر کے حوالے سے دوسرا اہم مقالہ جناب پروفیسر سحؔر انصاری کا ہے۔ موصوف کا شمار عہدِ حاضر کے صفِ اول کے محققین اور ناقدین میں ہوتا ہے۔ سحؔر انصاری نے اپنے مقالے میں حبیب جون پوری کے مولد اور ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات پر ادبی رجحانات پر بھرپور انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے حبیب جون پوری کی سیاسی وابستگی اور سیاسی و قومی شعور کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج اور مذہبی و ادبی نظریات کے حوالے سے ان کی شاعری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر سحؔر انصاری نے اپنے مقالے بعنوان ''تپ حبیب'' میں شاعری کے بارے میں حبیب جون پوری کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''......حبیب صاحب نے ایک نظم ''شاعر'' کے عنوان سے لکھی ہے، اسے ان کا منشورِ شاعری کہا جاسکتا ہے...... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر کو معاشرے کی ایک فعال اور انقلاب آفریں شخصیت سمجھتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر تعمیری، مقصدی اور مثبت ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ''کلیاتِ حبیب'' کی تفہیم کو مزید آسان اور بااعتبار بنانے کے لیے جن

ناقدین اور محققین کو مقالات لکھنے کی دعوت دی، ان میں ایک معتبر نام پروفیسر عبدالکریم خالد کا ہے۔ موصوف کی ژرف نگاہی بیسویں صدی کے شعری ونثری اَدب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ عبدالکریم خالد نے حبیب جون پوری کے بارے میں اپنے تحقیقی مقالے بعنوان ''حبیب جون پوری۔ ایک مطالعہ'' میں حبیب جون پوری کی شاعری کو بیسویں صدی کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، اَدبی اور اقتصادی تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''حبیب جون پوری کی شاعری کی مذہبی اور اخلاقی فضا ان کے بطن میں نمو پانے والی روحانیت اور مذہبیت سے اثر پذیر ہو کر اپنا الگ رنگ جماتی ہے۔ انھوں نے قطعہ، غزل، نظم اور قصیدہ سمیت اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان تمام اصناف میں ان کی طبیعت کا رنگ معمولی بیش وکم سے تقریباً ایک سا نظر آتا ہے۔''

حبیب جون پوری کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے دیگر مضامین حسین اعظمی اور پروفیسر اقبال حسین کے تحریر کردہ ہیں۔ ان مضامین سے بھی حبیب جون پوری کی شاعری کی تفہیم میں بیش از بیش مدد ملتی ہے۔

''کلیاتِ حبیب'' کی تدوین پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی چار سالہ محنتِ شاقہ کا ثمر ہے۔ موصوف اس سے قبل سیّد آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین وترتیب کے فرض سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔ ''کلیاتِ حبیب'' متنی تحقیق کے زمرے میں آتی ہے۔ محقق موصوف نے ''مقدمہ'' میں تدوین کے حوالے سے اپنے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''......راقم نے حبیب جون پوری کے کلام کے صنف وار تدوین کا فیصلہ کیا اور اصناف کے اعتبار سے معیارِ کلام کو پیشِ نظر رکھا ہے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن تحقیق کے کٹھن سفر کی کلفتوں سے خوب آگاہ ہیں۔ اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کی ترتیب وتسوید اور تدوین کے تجربے سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کا اظہار ان کے مرتب کردہ ''کلیاتِ حبیب'' میں بیش از بیش ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اس سعی مشکور کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کلیاتِ حبیب'' مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھے شاعر سے ہمیں متعارف کرایا ہے اور ایک جوہرِ قابل کو مٹی میں ملنے سے بچالیا ہے۔''

''کلیاتِ حبیب'' کی اشاعت سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے محض ایک مستند شاعر اور جوہرِ قابل کو مٹی میں ملنے سے نہیں بچایا ہے بل کہ قارئین کو معتبر کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقع عطا کیا ہے اور ہمارے نزدیک یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، نومبر ۱۹۹۸ء)

◆◆◆

کُلیاتِ حبیبؔ۔ایک تحقیقی اور تنقیدی دستاویز

پروفیسر ذوالفقار علی

◆◆

حالی کی جدید اور نیچرل شاعری کی تحریک نے بیسویں صدی کے آغاز میں غزل کو محدود کر دیا تھا۔لیکن اس جدید شاعری کے زور و شور میں بھی آرزو لکھنوی نے کلاسیکی غزل کو نہ صرف سہارا دیا بل کہ اسے نئی جدتوں سے روشناس کرایا۔آرزو لکھنوی کی غزل گوئی کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اسے زبان و بیان کے نئے ذائقوں سے ہم کنار کیا۔آرزو لکھنوی نے فارسی و عربی زبان سے مزین اُردو غزل میں ہندی الفاظ کی آمیزش کی،جس سے شاعری میں موسیقیت کا اضافہ ہو گیا۔آرزو لکھنوی نے ''سریلی بانسری'' کے آغاز میں یہ دعوا کیا کہ اس مجموعہ میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش نہیں ہے۔اس مقصد میں وہ مکمل طور پر کامیاب تو نہ ہو سکے لیکن اُردو غزل کو ایک نیا انداز ضرور دے گئے۔آرزو لکھنوی کی جدید شاعری کے جدید لہجے سے ہاں ایک زمانہ متاثر ہوا،وہاں ان کے شاگردوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔آرزو لکھنوی کے بے شمار شاگردوں نے اُستاد کی جلائی ہوئی اس شمع کی حوادثِ زمانہ سے حفاظت کی اور اسے اپنے افکار و نظریات کے خونِ جگر سے روشن رکھا۔آرزو لکھنوی کی اس شاعرانہ روایت کے ایک پاس دار محبوب الحسن حبیبؔ جون پوری بھی تھے۔حبیبؔ جون پوری پر اُستاد کی ہمہ جہت شخصیت کا بھی بھرپور اثر ہوا اور حبیبؔ جون پوری نہ صرف ممتاز شاعر بل کہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے طور پر اُبھرے۔ان کا ملکی سیاست میں بھی عمل دخل رہا۔وہ ایک گیت نگار کی حیثیت سے فلمی دنیا سے بھی منسلک رہے۔پاک و ہند کے مختلف تعلیمی اداروں میں انھوں نے تیس سال درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیے اور اسی علاقہ میں ان کے شاگردوں کا ایک کثیر حلقہ بن گیا،جواُن سے شاعری کی اصلاح لیتے۔حبیبؔ جون پوری نے ''انجمن آرزو'' کی بنیاد ڈالی،جس سے شاعری کو فروغ حاصل ہوا اور پروفیسر عابدؔ علی عابدؔ اور ان کے مابین مقابلہ کی فضا پیدا ہو گئی۔حبیبؔ جون پوری معلم ہونے کے علاوہ ایک اعلیٰ مقرر اور خطیب بھی تھے۔مذہب اور

روحانیت سے بھی خاص دل چسپی رکھتے تھے۔

۱۹۷۶ء میں حبیب جون پوری نے ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی جا کر حسینیہ سجادیہ امام بارگاہ میں خطابت شروع کر دی اور ساتھ مایوس و پریشان افراد کے مسائل کا حل بذریعہ عملیات کرتے رہے، جس میں وہ خاصے کامیاب رہے، اور اسی خدمتِ خلق کو سرانجام دیتے ہوئے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یوں ایک شخص جو شاعر، گیت نگار، معلّم، خطیب، مفکر، عامل اور عالم تھا، ہم سے جُدا ہو گیا۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت کم کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

کسی بھی شاعر کی عظمت کا باعث تین باتیں ہوتی ہیں، نسل، ماحول اور انفرادیت۔ حبیب جون پوری ہر طرح سے خوش قسمت شاعر تھے۔ ان کے والد شبیر حسین صفا الٰہ آبادی ایک باذوق شاعر تھے۔ اس طرح حبیب جون پوری کو شاعری ورثہ میں ملی تھی اور جب وہ آرزو لکھنوی کے شاگرد ہوئے تو ان کی شعری صلاحیتیں نکھر کر سامنے آ گئیں۔ انھوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم، قصائد، رباعیات، قطعات اور گیت تخلیق کیے۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی ان کی مہارتِ فن کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

حبیب جون پوری کی شاعری میں معاشرتی مسائل کا بھرپور اظہار ہے۔ اپنی نظم ''مفلس طالب علم'' میں انھوں نے ایک غریب طالب علم کے مسائل کو وسیع تناظر میں پیش کیا ہے:

گُل سے چہرے پر غبارِ مفلسی چھایا ہوا
جسمِ مردہ میلے کپڑوں میں کفنایا ہوا

....

فیس باقی ہے تو ایسا چور بجھتے دل میں ہے
مٹ جاتی ہے چمک وہ بھی جو مستقبل میں ہے

....

حوصلے کیا چھوڑے تن میں جان بھی رکھتی نہیں
مفلسی انسان کو انسان بھی رکھتی نہیں

''بیوہ کی خودکشی'' ایک لازوال نظم ہے۔ ہندوؤں کی ستی کی رسم کو مسلمان نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہمارے رسوم بھی کچھ مکروہ نہیں۔ حبیب جون پوری نے اسی معاملے کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک نوجوان عورت کے لیے بیوگی جان کا عذاب بن جاتی ہے:

سوگ کے کپڑوں میں نازک جسم کفنائے ہوئے
رو رہی ہے دل میں ارمانوں کو دفنائے ہوئے

عمر آمادہ نہیں مردہ پرستی کے لیے
بار ہے یہ زندہ میت دوشِ ہستی کے لیے

نظم میں روانی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ایسے انداز میں یہ نظم تخلیق کی گئی ہے کہ جب تک ہمارے معاشرے میں بیوہ عورتوں کے مسائل موجود ہیں، اس نظم کی اہمیت کم نہ ہوگی۔

حبیب جون پوری نے غزلوں میں بھی معاشرتی رویوں پر گہرا طنز کیا ہے:

انسان سے رخصت ہوا معیارِ فضیلت
دستار تو لاکھوں ہیں مگر سر نہیں ملتا

''فرنگی'' انگریزوں کے آمرانہ وظالمانہ نظام پر ایک طنزیہ نظم ہے، جس میں انھوں نے انگریزوں کی چال بازیوں کو آشکار کرنے کے بعد واضح کیا ہے کہ:

اپنی فتح دو روزہ پر پھولے ہو کیوں
خبثِ باطن کا انجام بھولے ہو کیوں

اسی طرح ''لاشیں'' میں وہ شہداء کے جسموں کو منزلوں کا راہبر قرار دیتے ہیں اور رجائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنگ میں قربانی دینا ہمارے لیے نیا نہیں۔ اس نظم میں آزادی کا جذبہ انتہا پر ہے۔ انگریزوں کے جبر کے خلاف نظم کے علاوہ غزل میں بھی حبیب جون پوری نے بہت کچھ لکھا:

چھاؤں حق ہی نہیں اہلِ افلاس کا
سایہ دیتے ہیں جو وہ شجر کاٹ دو
یہ کیا والیِ شہر نے فیصلہ
جو جھکاتا نہیں سر تو کاٹ دو

حبیب جون پوری کی شاعری میں ماضی سے تعلق بھی ملتا ہے، جو ان کی رومانویت کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کی نظمیں ''عہد ماضی''، ''کشمکش''، ''حسرتِ دیدار'' وغیرہ اسی مزاج کو لیے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے شخصی نظمیں بھی تخلیق کیں۔ ''انیس'' میں انھوں نے میر انیس کی شاعرانہ خصوصیات کو صرف سات اشعار میں بیان کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اسی طرح ''اقبال'' بھی ایک شاہ کار ہے۔ علامہ اقبال کی خدمات کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

اب اس سے بڑھ کے بس میں تیرے تھا بھی کچھ نہیں
ملت کو دے دیا وہ لہو جو بدن میں تھا

نظم ''شاعر'' حبیب جون پوری کا منشور محسوس ہوتی ہے، جس میں وہ شاعر کی تعریف بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی

اس پر ذمہ داریاں بھی عائد کرتے ہیں کہ اُسے کن کمالات کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح ''اُردو'' ان کی ایک ایسی دستاویزی نظم ہے، جسے اُردو زبان کی تاریخ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

''کلیاتِ حبیبؔ'' کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حبیبؔ جون پوری نے زندگی کی رنگا رنگیوں سے بھرپور شعر کہے ہیں۔ انھوں نے کہیں بھی زندگی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، بل کہ مسائل کو واضح کیا اور ساتھ ساتھ امید بھی دلائی کہ عزم ہو تو منزل دُور نہیں۔ انھوں نے آرزوؔ کے رنگ کو اختیار کرتے ہوئے شاعری میں سادگی کو رواج دیا اور فارسی و عربی کے استعمال کو انتہائی کم کر کے شاعری کو خاص افراد کی بجائے عوام کی شاعری بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

حبیبؔ جون پوری نے مذہبی معتقدات سے تعلق کی وجہ سے دینی شاعری کا بھی ایک خاصہ حصّہ رقم کیا۔ اُن کے قصائد اسی تعلق کے غماز ہیں۔ ان قصائد میں انھوں نے حضرت علی علیہ السلام، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کی شخصیت کے محاسن اُبھارے اور انھیں مذہبی اوتار کے طور پر پیش کیا۔

''کلیاتِ حبیبؔ'' میں کُل سولہ نظمیں، سولہ غزلیں، آٹھ قصائد، سترہ قطعات اور گیارہ رباعیات ہیں۔ حبیبؔ جون پوری نے زندگی بھر شعر کہے لیکن ان کی زندگی میں یہ کلام یک جا نہ ہوسکا۔ ان کی وفات کے بعد پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان کے بکھرے ہوئے کلام کو بڑی عرق ریزی سے جمع کیا ہے اور اس کام میں انھوں نے چار سال صرف کیے ہیں۔ یہ مجموعہ ترتیب دے کر انھوں نے ایک قادرالکلام شاعر کو لوگوں کے ذہنوں سے محو ہونے سے بچا لیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ''کلیاتِ حبیبؔ'' کے متعلق یوں اظہارِ رائے کرتے ہیں:

''ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کی شاعری پر قابلِ قدر کام کر کے اُردو زبان و ادب کے باقاعدہ طالب علم ہونے کا حق ادا کیا ہے۔''

''جناب حبیبؔ جون پوری کا کلام اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے اور پڑھنے والے ان کی شاعری اور انداز سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ ''کلیاتِ حبیبؔ'' مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھے شاعر سے ہمیں متعارف کرایا ہے اور ایک جوہرِ قابل کو مٹی میں ملنے سے بچا لیا ہے۔''

(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۱۹۹۸ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی کارِ مسیحائی۔ ''کلیاتِ حبیب'' کی تدوین

شفیق الرحمن الہ آبادی

◆◆

دانش مند کہتے ہیں کہ تحقیق کھوج لگانے اور تنقید تجزیہ کرنے کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ اس صورتِ حال میں محقق اور ناقد کی سمتیں جدا ہو کر بھی پیوست رہتی ہیں۔ خاص طور پر یہ صورتِ حال اس وقت مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ جب نقاد محقق اور محقق نقاد بن جائے۔ اُردو اَدب میں ایسے نفوس کی بے حد کمی ہے کہ جو بیک وقت محقق بھی ہوں اور نقاد کا فریضہ بھی ادا کر رہے ہوں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو یہ امتیاز بہرحال حاصل ہے کہ انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بنا دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب ہم ان کی تحقیقی کاوشوں پر نظر دوڑاتے ہیں تو وہ باصلاحیت، ہنرمند اور ثقہ محقق کے روپ میں ہمارے سامنے آ جاتے ہیں اور جب ہم ان کی تنقیدی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ایک معتبر نقاد کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن تحقیق اور تنقید دونوں کے مردِ میدان ہیں اور ان کے وجود میں ان دونوں صفتوں کی مہک موجود ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اپنی زندگی کو شعر و ادب کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ انھوں نے دو سطحوں پر کام کیا ہے۔ اولاً زندہ تخلیق کاروں کی پذیرائی کی ہے اور ان کے بارے میں حیات افروز مقالات اور کتب لکھ کر ان کی بے حد پذیرائی کی ہے۔ ثانیاً انھوں نے رحلت فرما جانے والے ادیبوں اور شاعروں کی شخصیت اور فن کے گراں قدر پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور ان کے کلام کو دست بردِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے آل رضا لکھنوی، سیف زلفی، قیصر بارہوی، نسیم امروہوی، مرتضیٰ حسین فاضل اور اسی قبیل کے بیسیوں ادیبوں اور شاعروں پر کتابیں اور مضامین لکھ کر انھیں حیاتِ تازہ عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح انھوں نے بہت سے شعرا کے کلام کو بھی محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک یادگار، بے

مثال اور اہم تحقیقی کام ''کلیاتِ حبیبؔ'' کی تدوین بھی ہے۔

''کلیاتِ حبیب'' معروف شاعر محبوب الحسن حبیبؔ جون پوری کے کلام پر مشتمل ہے جسے ممتاز ادیب اور محقق پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے چار برس کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں مرتب کا تحریر کردہ جامع مقدمہ ہے اور حبیب جون پوری کے فکر و فن کے حوالے سے وحیدِ عصر سیّد وحید الحسن ہاشمی، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر عبدالکریم خالد، حسین اعظمی اور پروفیسر اقبال حسین کے مضامین شامل اشاعت ہیں۔ دوسرے حصے میں کلیاتِ حبیب ہے جس میں نظمیں، غزلیں، قصائد، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب آرزو لکھنوی، سیّد وحید الحسن ہاشمی، پروفیسر ذوالفقار حسین ہاشمی، ڈاکٹر محمد باقر زیدی اور سیّد منقاد حیدر اختر کے نام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی مذکورہ کتاب پر رائے دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے انھوں نے لکھنؤ کی شاعری پر قابلِ قدر کام کر کے اردو زبان و ادب کے باقاعدہ طالب علم ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ جناب حبیب جون پوری کا کلام اس اعتبار سے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے اور پڑھنے والے ان کی شاعری اور انداز سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کلیات حبیب مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھے شاعر سے ہمیں متعارف کرایا ہے اور ایک جوہرِ قابل کو مٹی میں ملنے سے بچالیا ہے۔''

بیسویں صدی میں آرزو لکھنوی کے شاگردوں میں حبیب جون پوری کا نام انتہائی اہم ہے۔ انھوں نے اپنے اُستاد کی جلائی ہوئی شمع روشن رکھی اور اُن کے بتائے ہوئے انداز اور قوانین کو اپنی شاعری میں برتنے کی مشکور سعی کی۔ حبیب جون پوری کا کچھ کلام تو غیر معروف رسالوں میں طبع ہو کر ارباب دانش کی نگہ میں معتبر قرار پایا اور بہت سا کلام تلف بھی ہو گیا۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے انتہائی محنت اور جاں فشانی سے ان کے کلام کو تلاش کیا اور انھیں نفاست سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ اس طرح انھوں نے ایک گم شدہ شاعر کو حیات تازہ عطا کر دی۔ آج جب ہم 'کلیاتِ حبیب' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہ کار مسیحائی ہمارے لیے رحمت کا باعث ہے۔ اب آخر میں حبیب جون پوری کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے:

دل لے کے مرا، درد مجھے تول دیا　　انمول لیا مال اور انمول دیا
دے دے کے ہر اک گام پہ اُلفت کا سبق　　تو نے مری ہستی کا سبب کھول دیا

(مطبوعہ)

ماہ نامہ 'میلسی نیوز پاکستان، میلسی، جنوری ۲۰۰۷ء ...... پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، فروری ۲۰۰۷ء

◆◆◆

مفاہیم۔ایک مطالعہ

ڈاکٹر ہارون قادر

••

سید شبیہ الحسن کے تازہ شائع کردہ مضامین کا مجموعہ ''مفاہیم'' آج پیشِ نظر ہے۔اظہار سنز، ۱۹۔اُردو بازار، لاہور نے نہایت خوب صورت ٹائپ اور عمدہ اہتمامِ طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کی ظاہری خوب صورتی بظاہر سادگی آمیز ہے، لیکن اتنی نظرنواز ہے کہ کتاب ہاتھ میں لے کر پھر اُسے ختم کرنے سے پہلے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ظاہری اوصاف کے ساتھ کتاب اس باطنی حسن سے بھی ممیز ہے جو مطالعاتی شغف رکھنے والوں کے لیے مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ان خوبیوں کے ساتھ کتاب کی قیمت۔ ۵۵/ روپے نہایت مناسب اور موزوں محسوس ہوئی۔

مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی باک محسوس نہ ہوتا کہ تنقید و تحقیق اور تخلیق و تحریر کے میدان میں ان کی تیز رفتار پیش رفت بجاطور پر صرف مجھے ہی نہیں، دیگر احباب کو بھی رشک آمادہ کیے ہوئے ہے۔ ملک میں ہونے والے دھماکوں کی طرح وقفے وقفے سے ان کی مطبوعات بھی آشنا حلقوں میں دھماکہ خیز کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ شبیہ الحسن کی تازہ تصنیف ''مفاہیم'' بھی میرے لیے ایک ایسا تازہ دھماکہ ثابت ہوئی۔ یکایک مجھ تک پہنچی اور نظرنواز ہوئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس دھماکہ خیز تصنیف کے متاثرین میں شامل نہ ہوتا۔

ڈاکٹر آغا سہیل نے کتاب کا مبسوط دیباچہ قلم بند کیا ہے۔ جو بذاتِ خود ایک مکمل مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف نے کتاب کے مندرجات کا نہایت جامع تنقیدی خاکہ پیش کیا ہے، جو کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے رہنما اشارے متعین کر دیتا ہے۔ ظہیر کاشمیری نے بجاطور پر اس امر کا اعتراف کیا ہے، کہ شبیہ الحسن عموماً موضوع کے داخلی، خارجی اور زمانی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ یہ درحقیقت ان کی تحریری جامعیت کا کھلا اعتراف ہے۔ دوسری طرف ظہیر کاشمیری نے مرثیہ گوئی اور ڈرامے کے حوالے سے ان کے نئے پن اور فکری اضافوں کی جھلک سے بھی قارئین کو مطلع کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان نے کھلے دل سے اس امر کی نشان

دہی کر دی ہے کہ جن طلبہ سے اپنے تجسس کو کسی تنقیدی یا تخلیقی وحدت میں ڈھالنے کی توقع تھی، ان میں اوروں کے برعکس شبیہ الحسن اپنے تنقیدی امکانات کو ایک مربوط شکل دینے کی مخلصانہ کاوش میں مصروف ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ''شبیہ الحسن اُردو شعری اصناف کے پس منظر میں کارفرما تہذیب طرزِ احساس سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔'' بنیادی طور پر ''مفاہیم'' پروفیسر شبیہ الحسن کے سات مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ تنقیدی مضامین ہیں...... میں نے اس کا مطالعہ کیا تو اس وضاحت میں خود کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔ بطورِ خاص مرثیے کے حوالے سے ان کی تین ایسے مضامین شامل ہیں، جنھیں میرا مذاقِ مطالعہ تنقیدی کی بجائے تحقیقی مضامین قرار دینے پر بضد ہے۔ ''اُردو مرثیہ (ایک تمہید) اور'' قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ'' مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں، تینوں ایسے مقالات ہیں، جو تمام تر تحقیقی مواد اور تحقیقی مطالعے پر مبنی ہیں۔ بطورِ خاص دونوں مؤخر الذکر مقالات کو حوالہ جاتی حواشی سے بھی مزین کیا گیا ہے۔ ان حواشی سے مرثیے کا مطالعاتی شغف رکھنے والے قارئین کو وہ مآخذ بھی معلوم ہو جاتے ہیں، جو اُن کی تحقیقی تدوین کی مطالعاتی بنیاد ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی روانیٔ قلم نہ صرف موقوع کے سیاق و سباق سے آگاہ کراتی ہے بل کہ مختلف محققین اور ناقدین کے متعلق بہ موضوع آراء سے بھی بیک نظر متعارف کرا دیتی ہے۔ یوں قارئین تنقیدی نظریات، مسلمہ کلیات اور تحقیقی نتائج کے استخراج سے موضوع کے مختلف گوشوں اور اس کی وسعت پیراستوں سے وقوف و خبر کی تشکیل دُور کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نفسِ مضمون کو جان دار بنانے کے لیے موصوف نے اپنے شعری طرزِ احساس کو داخلی و خارجی دونوں حیثیتوں سے اپنی ماضی و حال کے تہذیبی تناظر میں بروئے کار لانا ضروری سمجھا، جس نے ایک جدت اور ندرت کا احساس پیدا کیا اور اپنے قارئین کے ذہنی رشتے خود ان کے تہذیبی عوامل سے اس طرح استوار کیے کہ موضوعاتی نوعیت سے ذہنی فضا میں ایک خوش گوار نکھار پیدا ہو جائے۔

مجھے مصنف سے دوسرا اختلاف اس بنیاد پر ہے کہ ایجاز و اختصار کی ممکنہ خوبیوں کے باوجود مرثیے کے موضوع پر جتنا کچھ اصولاً لکھا جانا چاہیے تھا، اس کی مناسبت سے موصوف پورا پورا انصاف نہیں کر سکے، چوں کہ مرثیے کے موضوع پر دیگر مقالات کی مناسبت سے اُن کے تینوں مقالات ''مفاہیم'' کے مندرجات میں غالب حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے بہتر ہوتا کہ اس موضوع پر چند مقالات کے ساتھ یا اپنے مقالات کو وسعت دے کر ایک علاحدہ کتابی شکل دیتے۔ جو مرثیے کے موضوع پر کام کرنے والوں یا اس موضوع سے مطالعاتی شغف رکھنے والوں کے لیے معتبر حوالے کی مستقل کتاب ثابت ہوتی۔ مجھے امید ہے کہ وہ کچھ عرصہ بعد عملاً اس تشنگی کا احساس دُور کر دیں گے۔

مولانا ظفر علی خان کی نعت نگاری بھی ایک ایسا مقالہ ہے، جس کے مطالعے سے ان کی تنقیدی

صلاحیت کا بھرپور احساس ہوتا ہے لیکن اس مقالے میں بھی مزید وزن پیدا کرنے کے لیے موصوف نے دیگر ناقدین کی آراء کا سہارا لیا ہے۔ یہاں اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ شبیہ الحسن جب کوئی رائے دیتے ہیں، اس رائے کی وقعت واہمیت ثابت کرنے کے لیے اپنے ہم خیال ناقدین تلاش کرتے ہیں۔ تنقیدی و تحقیقی گواہوں کے ذریعے اپنی بات کا وزن ثابت کرنا موصوف نے ایک بروایت کی صورت میں اپنا لیا ہے۔ اس طرح قاری کو ان کی تنقیدی صداقت اور موضوع کے حوالے سے مطالعاتی وسعتوں کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ تنقید میرے خیال میں آگے چل کر چند برس بعد ان کی شناخت بن جائے گا چوں کہ موضوع زیرِ بحث میں ظفر علی خاںؔ کی نعت نگاری پر اظہارِ خیال مقصود تھا۔ اس لیے جہاں کہیں ان کے دیگر اصنافِ شعر کا ذکر آیا اس میں غرابتِ اظہار کا شدید احساس ہوتا ہے، جیسے ان کے ایک اعلیٰ وصف کی توصیف کرتے ہوئے ان کے دیگر ہنرمندانہ اوصاف یا تو یک سر نظر انداز ہو گئے، یا سرسری انداز میں ان کا ذکر آ گیا۔

مقالے کے آخر میں موصوف نے جو سوال اٹھایا ہے، وہ غیر ضروری تھا۔ بہتر تھا کہ خود سوال کا جواب دیتے۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُردو شاعری کے تمام ذخیرۂ لغت کو موصوف نے اپنے سوال کے ذریعے حیران کن صورت میں نظر انداز کرنے کی غلطی کی ہے۔ نعتوں کے حوالے سے مولانا ظفر علی خان کی تعریف کرتے ہوئے موصوف عام اندازِ نعت گوئی کو جذباتی ہیجان لکھ بیٹھے۔ میرے نقطۂ نظر سے نعتوں کے لیے جذباتی رنگ یا کیفیت کو ہیجان جیسے لفظ سے ظاہر کرنا مناسب نہ تھا۔

''حفیظ جالندھری ایک منفرد گیت کار۔''

حفیظ جالندھری تو اُردو کے عام قارئین کے لیے ''شاہ نامۂ اسلام'' یا ''قومی ترانے'' کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں لیکن ادب وشعر کے قارئین ان کی دیگر خدمات کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیتے رہے ہیں۔ ''افکار'' کے حفیظ نمبر میں ان کی شخصیت وفن کے بے شمار ڈھکے چھپے گوشے نمایاں ہوئے۔

عالمی اُدب اور خاص طور پر عالمی شاعری میں عورت اور حُسن کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ فارسی شاعری میں امرو پرستانہ رجحانات کا براہ راست اُردو شاعری پر بھی اثر پڑا۔ مقامی زبانوں اور ان میں معنویت سے ہندی اور سنسکرت کے مزاج نے اُردو شاعری میں بھی عورت اور جنس کے متعلقہ تصورات اور جذبات کو بہ آغوشِ وا جگہ دی۔ اسی کے زیر اثر ہندستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں بھی دوہوں کو بڑی کثرت سے فنی پذیرائی نصیب ہوئی۔ ان پر گیت کی اصطلاح کا اطلاق تو شاید نہ ہو سکا لیکن ان کی مزاجی نوعیت کے اعتبار سے ہم دوہوں کو گیتوں کی رہنما فکر قرار دے سکتے ہیں۔ جب عظمت اللہ خان نے گیتوں کو جدیدیت میں اعلیٰ فنی مقام تک پہنچا دیا تو دوسرے شاعر بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔

آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' اور حفیظ جالندھری کی ''سوز و ساز'' نے گیتوں کو ایک مستقل

صنف کی حیثیت سے اُردو میں رواج دیا۔ وہ تمام جذبات جو دوہوں میں بکھرے ہوئے تھے یا عربی قصائد کی تشبیب کا حصہ بن چکے تھے اور انھیں رودکی نے غزل کے عنوان سے پیش کیا تھا، اُردو گیتوں کا حصہ بننے لگے۔ ہجر و فراق اور قرب و وصال کی تمام کیفیتیں دوہوں کی طرح گیتوں میں بھی نظم کی جانے لگیں۔ نسوانی ادائیں عشوے غمزے، حیا اور ناز و انداز وغیرہ کی ایمائیت گیتوں کا حصہ بن گئی۔ فلمی صنعت نے خاموش تھیٹر سے آغاز کیا اور موجودہ فلموں کی تیز رفتاری نے غیر معمولی سُرعت سے گیتوں کو فلموں کا حصّہ بنا کر اُردو زبان کی وہ خدمت انجام دی، جو کسی اور صنف کے حوالے سے اتنی قابلِ ذکر حیثیت نہیں رکھتی۔ حفیظؔ جالندھری چوں کہ ان چند گنے چنے شاعروں میں شامل ہیں، جن کی مساعی جمیلہ نے رہنما گیت تخلیق کیے، اس لیے انھیں گیتوں کے حوالے سے خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ حفیظؔ نے بھی مختلف نسوانی اور جنسی کیفیتوں کو ماحول، موسم، فضا، بہار، جوانی اور سرود و رقص کے حوالے سے نظم کیا۔ ان گیتوں نے نوجوانوں کو اتنا متاثر کیا کہ بیشتر شعرا نے گیت نگاری کو اپنی شہرت کا زینہ سمجھ کر اس فن میں غیر معمولی طور پر اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ شبیہ الحسن کے زیرِ نظر مقالے سے ہم نہ صرف ایسی تمام کیفیتوں کی جانب واضح تنقیدی اشاروں کا لطف اٹھا سکتے ہیں بل کہ حفیظؔ جالندھری اور گیتوں کے تخلیقی رشتے کا بھرپور عرفان بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

شبیہ الحسن جا بجا مختلف شعری حوالوں سے اپنے تنقیدی تجربے کا صداقت آمیز ثبوت پیش کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ''مفاہیم'' کے دو اور مقالات قابلِ ذکر ہیں، گو ''مفاہیم'' کا آغاز انھیں سے ہوا ہے، لیکن مناسب یہی محسوس ہوا کہ ان پر گفت گو آخر میں کی جائے۔ پہلا مقالہ ''طنز و مزاح، مقاصد و محرکات'' اور دوسرا مقالہ ''ایک معتبر مزاح نگار، فرحت اللہ بیگ'' ہے۔ بظاہر یہ دو الگ مقالات ہیں، مگر فرحت اللہ بیگ پر ایک معتبر مزاح نگار کے عنوان سے شبیہ الحسن کی تعارفی تنقید کا جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ''طنز و مزاح مقاصد و محرکات'' ان کا تمہیدی مقالہ ہے۔ طنز و مزاح کے موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا رہا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی معروف تصنیف ''طنزیات و مضحکات'' نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ رشید احمد صدیقی اس موضوع کے مختلف گوشے عالمانہ گرفت سے روشن کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے اس موضوع کا نہایت جان دار حیثیت میں احاطہ کیا ہے اور موضوع کی مختلف سمتوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس روایت پر کار بند ہوتے ہوئے عام قاری کے لیے شبیہ الحسن نے طنز و مزاح کے مقاصد و محرکات کے حوالے سے ایک ایسی تنقیدی روایت آگے بڑھائی ہے، جو عمومی سطح پر معلوماتی قدر قیمت کی حامل ہے۔ اس میں طنز و مزاح کی وضاحت کرتے ہوئے المیہ اور طربیہ عناصر کی تفہیم سے اپنی بات آگے بڑھائی ہے۔ یہاں تک کہ موصوف نے ڈاکٹر سلیم اختر کی ہم نوائی کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ طنز و مزاح دراصل شدید تناؤ کے بعد اعصاب کو پُرسکون بنانے کا ایک مضبوط وسیلہ ہے، یعنی بقول

گریگ، ہم بعض جنسی رجحانات کی کھلے بندوں تسکین نہیں کرپاتے۔ اس لیے مزاح کے ذریعے تسکین حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال، یہ نفسیات دانوں کا وضع کردہ کُلیہ ہے، لیکن ضروری نہیں کہ ہر شخص پر اس کا یکساں اطلاق ممکن ہو۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُس مزاح کو، جو اُن کے دور تک مختلف تصانیف میں جزوی طور پر بٹا ہوا تھا، ایک مستقل جداگانہ صنف کے طور پر اُردو نثر کا ایک تابناک حوالہ بنا دیا۔ اس مقالہ میں بھی ابتدائی حصہ ماقبل مقالے کی طرح تمہیدی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے بعد وہ براہِ راست فرحت اللہ بیگ کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ اس مقالے کو بار بار پڑھنے سے مَیں نے یہ محسوس کیا ہے کہ موصوف نے اُردو کی قدیم و جدید مزاحیہ ادب کا تقابلی تعارف کراتے ہوئے ان جدید رُجحانات کا حوالہ دیا ہے۔ جو فرحت اللہ بیگ کے بعد اُردو زبان میں طنز و مزاح کا حصہ بن گئے۔ جہاں تک خود فرحت اللہ بیگ کے ادبی جائزے کا تعلق ہے، مجھے مصنف شبیہ الحسن سے ایک مرتبہ پھر یہ شکایت ہے کہ موصوف نے اپنے غیر معمولی ایجاز و اختصار سے کام لیا کہ تحریر عام قاری اور طلبہ کے لیے تو معلوماتی حیثیت کی حامل قرار دی جاسکتی ہے، لیکن اُدب وفن کے اعلیٰ مذاق قارئین کو چونکانے کے لیے ان عناصر کی خاصی کمی محسوس ہوئی۔ جو خصوصی دل چسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اگلی اشاعت میں وہ فرحت اللہ بیگ سے پورا پورا تنقیدی انصاف کرتے ہوئے اس کی جملہ تصانیف کا مبسوط تنقیدی جائزہ پیش کریں گے۔ اس جسارت پر میں اپنے دوست پروفیسر شبیہ الحسن سے معذرت خواہ بھی ہوں۔

آخر میں ان کی ''باتیں'' زیرِ بحث لانا بھی ضروری ہے جس میں بلاشبہ کسرِ نفسی کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور بجا طور پر اپنے مشفق استاد ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے اس مشورے کا شکر گزاراہ حوالہ بھی دیا ہے جو ان کی حوصلہ افزائی کے سبب ''مفاہیم'' کی اشاعت کا موجب ثابت ہوا۔

شبیہ الحسن کی تصانیف میں یہ تازہ اضافہ نہایت خوش آئند ہے اور یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے تنقیدی اُدب کے اُس خلا کو پورا کرنے کے لیے جو بہت سے بڑے ناقدوں کے بعد بجا طور پر محسوس کیا جارہا ہے۔ وہ ضرور اپنا قلمی کردار ادا کریں گے۔ مجھے توقع ہے کہ وہ اس خوش گمانی کو یقیناً حقیقت کا رنگ رُوپ فراہم کریں گے۔

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، نومبر ۱۹۹۲ء)

◆◆◆

مفاہیم۔ چند معروضات

پروفیسر باقر علی شاہ

◆◆

چونکانے کا عمل سماجی زندگی ہی میں نہیں علم و ادب کی دنیا میں بھی رواج پا چکا ہے۔ چناں چہ اَدب کے افرانِ بالا عموماً ایسے بیانات دیتے رہتے ہیں کہ:

- اُردو زبان میں اعلیٰ اَدب تخلیق نہیں ہو رہا۔
- اَدب پر جمود طاری ہے۔
- اُردو مرثیہ اپنے اَدبی امکانات مکمل کر چکا ہے۔
- نعت کا تعلق اَدب سے نہیں، مذہبی عقیدے سے ہے۔
- اُردو اَدب میں گیت کوئی وقیع صنف نہیں۔

ایسی بیان بازی کرنے والوں کا مقصد شاید لوگوں کو چونکانے کے ساتھ ساتھ اپنے تخلیقی بنجر پن کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں سید شبیہ الحسن کا ان موضوعات پر قلم اٹھانا محض کھوئے ہوؤں کی جستجو نہیں بل کہ برصغیر کی مخصوص تہذیب کے پس منظر میں ان موضوعات کو دیکھنے پرکھنے اور برتنے کی طرف توجہ دلانے کی سعی ہے۔ گیت، نعت، مرثیہ اور طنز و مزاح کے موضوعات اُردو تنقید کے لیے نئے نہیں، ان میں سے ہر موضوع پر ایک سے زیادہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں تفویض ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اُن موضوعات پر بیسیوں تنقیدی مضامین اور تحقیقی مقالے موجود ہیں۔ اس صورتِ حال میں ''مفاہیم'' کی اہمیت دو حوالوں سے بنتی ہے:

۱۔ سید شبیہ الحسن کا اندازِ بیان یا اُسلوب۔

۲۔ ان مضامین میں اٹھائے گئے سوالات۔

جنابِ امیر علیہ السلام کا قولِ فیصل ہے کہ:

''کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ۔''

وہ اس لیے کہ زبان شعور کی معروضی صورت ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیسے کہا جا رہا ہے کیوں کہ اظہار کا تعلق انسانی شخصیت سے ہوتا ہے۔ انسانی فکر ابہام سے جتنی پاک ہوگی، ابلاغ بھی اتنا ہی مکمل ہوگا۔ لکھنے یا کہنے والے پر بات جتنی واضح ہوگی، وہ اتنی ہی وضاحت اور منضبط انداز میں بیان کر پائے گا۔ سیّد شبیہ الحسن نے ''مفاہیم'' میں جو کچھ کہا ہے، وہ نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں کہا ہے اور جہاں کسی معتبر ناقد سے اختلافی صورت پیدا ہوئی وہاں انھوں نے پورے اعتماد اور دلائل سے منطقی انداز میں اپنی بات بغیر کسی لگی لپٹی کے پوری علمی دیانت داری سے پیش کر دی ہے اس کے علاوہ محاکے کی صورت میں ''مفاہیم'' میں موجود مضامین کے آخر میں نتائج منضبط صورت میں پیش کر کے قاری کو کسی قدر فیصلے تک پہنچانے میں بڑی آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔

جہاں تک ''مفاہیم'' میں اٹھائے گئے سوالات کا تعلق ہے، تو ان میں اعلیٰ درجے کی مزاح نگاری کے ادبی و سماجی امکانات، عہد بہ عہد مرثیہ نگاری کے ارتقا اور کربلا کی علامت کی معنویت، سماجی تقاضے اور ضروریات قصیدے اور مرثیے کے مابین طرزِ احساس کے فرق کی اہمیت، مرثیہ اور ڈرامے کے پس منظر میں موجود تہذیبوں کا فرق اور اس کا ان اصناف پر اثر۔ نعت گوئی میں عصری کرب اور معاشرتی اُسلوب کی آمیزش کی اہمیت اور گیت نگاری میں موجودہ عہد اور اس کے شعری مزاج کے رجحان شامل ہیں۔ یہ تمام سوالات ایک طرف تو سماجی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ منسلک ہیں اور دوسری طرف عصرِ حاضر اور اس کے تقاضوں سے جب کہ ان سوالات کی تیسری نوعیت اور اہمیت مستقبل کے امکانات کی نشان دہی سے متعلق ہے۔

''مفاہیم'' میں اختیار کیے گئے نقطۂ نظر سے جزوی اختلاف ممکن ہے۔ لیکن اس سے اٹھائے گئے سوالوں کی اہمیت اور اظہار کی سلاست، شگفتگی اور دل کشی سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

ہمارے ہاں چوں کہ ابھی تک شخصیت پرستی کی روایت خاصی توانا حالت میں موجود ہے، اس لیے کتابوں سے زیادہ شخصیات کو اہمیت دی جاتی ہے کہ مبادا بعد میں شخصیت کے بکھراؤ سے دی جانے والی رائے غیر معتبر نہ قرار پائے۔ اس لیے کسی کتاب کے بارے میں رائے دینے کے بجائے اکثر تخلیق کار کے مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے کہ کلیات اور باقیات کی موجودگی میں ''ہیرو پرستی'' کے جذبے کی تسکین بھی ہو جائے اور تنقید کا ضمنی فریضہ بھی ادا ہو جائے۔ لیکن یہ کوئی مستحسن قدم نہیں۔ بہر حال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، کہنا یہ مقصود ہے کہ ''مفاہیم'' میں اٹھائے گئے سوالات نئے علمی و ادبی مباحث کا جواز فراہم کرتے ہیں، جو تنقید کا ایک اہم فریضہ ہے اور اس طرح سیّد شبیہ الحسن کی تنقیدی کاوش ''مفاہیم'' اُردو تنقید میں ایک اضافہ قرار دی جا سکتی ہے۔

(ماہ نامہ شام و سحر لاہور جولائی ۱۹۹۱ء)

◆◆◆

جدید مختصر مرثیہ اور وحیدِ مودّت

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن سلمہٗ کا گرامی نامہ اور ساتھ ہی کتاب ''مختصر مرثیے کی روایت اور وحید الحسن ہاشمی'' برائے تبصرہ موصول ہوئی۔ زیرِ نظر مقالہ شبیہ الحسن صاحب کا اپنے والد جناب وحید الحسن ہاشمی صاحب کے علمی و اَدبی اثاثے پر ایک تحقیقی دستاویز بھی ہے اور ساتھ ہی عزائی ورثے کی عکاس بھی۔ یقیناً وحید الحسن ہاشمی کی تدریسی خصوصیات' عزائی خدمات اور اَدبی فکر کا مجسم ثبوت انھیں اپنے فرزند کی شکل میں مل چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جنابِ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب آئندہ بھی جیسا انھوں نے اعادہ کیا ہے کہ وحید الحسن ہاشمی صاحب کی دیگر اصنافِ سخن پر بھی اسی طرز پر کام آگے بڑھاتے رہیں گے جو عزائی اثاثے کو مرتب کرنے میں نہایت کارآمد اور آئندہ طالبانِ علم و اَدب کے لیے مددگار و معاون ثابت ہوگا۔ وحید الحسن ہاشمی صاحب سے میرا تعلق مرثیے کے حوالے سے اتنا ہی قدیم ہے جتنا ان کا مرثیہ اور اس کا ثبوت یوں دیا جا سکتا ہے کہ ان کے آغازِ سفر میں' میں نے ان کی مرثیہ نگاری کا ذکر ۱۹۸۲ء میں اپنی کتاب ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' کے ابواب میں کیا تھا۔ جو وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری پر پہلا مربوط تبصرہ یا تعارف کہا جا سکتا ہے۔

جس کے بعد دیگر احباب ان کی مرثیہ نگاری کو مختلف زاویوں سے پرکھتے رہے اور پھر...... ۱۹۹۱ء میں مَیں نے ہی لکھا تھا کہ...... ''مرثیہ نگار شاعر وحیدِ مودّت حضرتِ وحید الحسن ہاشمی نے آلِ رضا کے رنگ کو اپناتے ہوئے مرثیے میں ایک اور جدت کی...... اور وہ یہ کہ موضوعاتی مرثیے کو موضوع کے دائرے میں رکھ کر مختصر مرثیے کی تحریک شروع کی...... اب وہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں یہ فیصلہ وقت کرے گا......'' (''وحید الحسن ہاشمی اور مرثیہ'' القلم شمارہ ۳) لیکن بدقسمتی سے شبیہ الحسن صاحب کی مرتب کردہ فہرست میں یہ مضمون شامل نہیں۔

خیر اس کے بعد ۲۰۰۱ء میں انتظار حسین صاحب نے اپنے انگریزی Short Marsia

Writing میں جناب وحید الحسن ہاشمی کی مختصر مرثیے کی روایت کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم آج جس مرثیہ کو جدید مرثیہ کہتے ہیں وہ بہر حال انیسؔ و دبیرؔ کے فراہم کردہ فارمیٹ Format اور خاکے پر ہی مشتمل ہونے کے باوجود اس سے مختلف بھی ہے۔ گو علمی و فکری سطح پر تا حال اس کی برابری نہیں کی جا سکی اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں' ہر دور کے اعتبار سے پیغام کو آگے بڑھتے رہنا چاہیے لیکن ظلم یہ ہے کہ آج کا ہر مرثیہ گو شاعر انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے کی حقیقت کو سمجھے بغیر اس میں نت نئے تجربات کرنے کی خواہش تو رکھتا ہے لیکن محض اس کی ظاہری شکل و صورت میں ہلکی پھلکی سی تبدیلی کر کے' کربلا سے باہر کے موضوعات پر قلم چلا کے اپنے تئیں یہ خیال کر لیتا ہے کہ اس نے شائد کوئی بہت بڑا کارنامہ کر ڈالا۔ حالاں کہ انیسؔ و دبیرؔ جس فکری بلندی سے واقعہ کربلا کو دیکھتے تھے اس کے بعد انھیں کسی دوسرے دنیاوی واقعے' حادثے یا مسئلے سے مدد لینے کی ضرورت چنداں نہیں تھی۔

وحید الحسن ہاشمی نے جس مرثیے کی بناء ڈالی وہ مختصر بھی تھا' جامع بھی اور پیغاماتی بھی...... آج کا ہر مرثیہ نگار بہتر طور پر جانتا ہے مرثیہ کے زوال کی کیا وجوہات ہیں؟ آج قاری و سامع کے پاس دو سو بند کے مرثیوں کو سننے یا پڑھنے کا وقت ہر گز نہیں ہے' وہ مرثیہ کے اصل ماحول سے بخوبی آشنا بھی نہیں ہے۔ لہٰذا انھوں نے آج کے قاری و سامع کے مسائل و ترجیحات کو سمجھتے بوجھتے ہوئے اپنے قلم سے مختصر مرثیے کی روایت کی بناء ڈالی۔ ان کے تمام مرثیے کم سے کم چالیس ۴۰ اور زیادہ سے زیادہ ۷۲ بند پر مشتمل ہوتے ہیں۔

اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے گزشتہ ۳۵ برس میں چالیس مرثیے پیش کیے۔ ۱۹۷۳ء سے مرثیہ کہنے کی ابتداء کی اور ۱۹۸۲ء تک ۹ مرثیے تخلیق فرمائے' اس کے بعد کے دس برس یعنی ۱۹۹۲ء تک انھوں نے ایک بار پھر ۹ مرثیے کہے...... اور پھر گویا وحید صاحب کا وہ دور شروع ہوا جب قلم نے خود بخود چلنا شروع کر دیا...... اور ۱۹۹۳ء سے ۲۰۰۲ء تک ۱۸ مرثیے مزید منظر عام پر آئے۔

موضوع کے اعتبار سے ان کا ہر مرثیہ عمومی طور پر اپنے ارد گرد کے حالات کا بہترین عکاس ثابت ہوتا ہے' جب کہ ظاہری طور پر دو پہلوؤں کا حامل ہوتا ہے' ایک پہلو وہ مسئلہ کہ جس کا وہ ذکر کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا وہ جو حل کی جانب پیش رفت میں معاون ثابت ہوتا ہے' جس کے لیے وہ کربلا سے رویوں' جذبوں اور اخلاقیات کا درس لے کر موجودہ عہد کے مسائل کا حل تلاش اور فراہم کرتے ہیں اور کمال یہ کہ جہاں وہ عہد حاضر کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کربلا سے رجوع کرتے ہیں تو اس قدر خوب صورتی کے ساتھ گریز کرتے ہیں کہ مرثیہ ذولخت بھی نہیں ہونے دیتے۔

وحید الحسن ہاشمی کا شمار اُن شخصیات میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی حسینی افکار کو بنا رکھا ہے' اور نہایت چابک دستی و روانی کے ساتھ اپنی طے کردہ راہوں پر سلام' نوحہ' مرثیہ' اداریے اور مضامین نچھاور

کرتے جا رہے ہیں۔ آپ مضبوط عقیدہ کی حامل شخصیت ہیں' جو غیر مستند روایات کو عقلی و منطقی دلائل کے ساتھ نہایت ہمت و استقامت کے ساتھ رَد کرتے ہیں اور یہ رویہ ان کے قلم سے نکلی ہر تخلیق میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ آج کے قاری کا سب سے بڑا مسئلہ وقت کی کمی اور اپنے علمی و اَدبی ورثے سے دوری خیال کیا جاتا ہے' مجھے یاد ہے کہ ہمارے گھروں میں انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے زبانی یاد ہوا کرتے تھے' رات کو سب بڑے بوڑھے' بچے' جوان بیٹھ جاتے اور پھر انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی کے منتخب بند بل کہ بعض اوقات مکمل مرثیے زبانی سنے سنائے جاتے تھے' جو ہماری تربیت و پرداخت میں نہایت معاون ثابت ہوئے۔ کوئی مجھے بتائے کہ آج گھریلو سطح پر یہ ماحول کہاں ہے؟

ضرورت ہی اس بات کی ہے کہ اول ان مرثیوں کو گھر میں خواتین رواج دیں اور دوم ان مرثیوں کو محض مجموعہ جات تک محدود نہ کیا جائے بل کہ مرثیہ خواں حضرات کے ذریعے نشر کیا جائے تا کہ آج کا نوجوان مرثیہ کے فن' رموز اور اثر پذیری سے بالکل بے بہرہ نہ ہو جائے۔

وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں تغزل کی شیرینی' قصیدہ کا رنگ اور سلام کا آہنگ سب کچھ ہی موجود ہے' وہ اپنے قاری و سامع کو نہایت روانی کے ساتھ مشکل سے مشکل بات آسان زبان میں کہتے چلے جاتے ہیں' زیادہ گھماؤ پھراؤ اور منظر نگاری سے گریز کرتے اور قاری کے ذہن پر مضبوط گرفت رکھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ان کے مرثیے مقبولیت کی سند حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں۔

مَیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور ایک بار پھر لکھ رہا ہوں کہ ہاشمی صاحب کی مشقِ سخن' مطالعہ کلامِ گزشتگان' مطالعہ کتب اور تجربہ...... ہاشمی صاحب کو اس مقام پر لے آیا ہے جہاں اپنے اپنے دور میں نجم آفندی' نسیم امروہوی' جمیل مظہری اور آلِ رضا تھے۔ پروردگار سے دعا ہے کہ بتصدقِ آلِ محمدؐ ہاشمی صاحب کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ (آمین)

◆◆◆

مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی

سیّد اختر ہاشمی

◆◆

زیر نظر کتاب ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تصنیف کی ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک منجھے ہوئے اُستاد اور مانے ہوئے محقق اور نقاد ہیں۔انھوں نے لکھنؤ کی اردو شاعری پر ۱۹۹۶ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اپنی پینتالیس سالہ عمر میں تقریباً پندرہ اہم کتابیں تصنیف کیں اور آج بھی ان کی چار کتابیں زیر طبع ہیں انھیں اہلِ پاکستان کی طرف سے کئی اَدبی ایوارڈ مل چکے جب کہ ان کی دو کتابیں انعام یافتہ ہیں۔اب انھوں نے مختصر مرثیے کی تاریخ اور اس کی تکنیک پر ایک اہم کتاب لکھ کر ایک نزاعی باب کا خاتمہ کر دیا ہے چوں کہ مختصر مرثیے کے بانی جناب وحید الحسن ہاشمی کہے جاتے ہیں اس لیے مصنف نے ہاشمی صاحب کے حالات وواقعات کے ساتھ ان اسباب پر بھی بحث کی جو مختصر مرثیے کی ترویج وترقی کا سبب ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔باب اول میں ہاشمی صاحب کے حالات اور تصانیف پر تبصرہ ہے۔باب دوم میں ہاشمی صاحب کے فکر وفن پر لکھی گئیں تحقیقات کا ذکر ہے۔باب سوم میں ہاشمی صاحب کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور باب چہارم میں مختصر مرثیے پر بحث کی گئی ہے اور ہاشمی صاحب کا مقام ومرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

ابتدا میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ہاشمی صاحب کو گھر کے اندر ہی ادبی فضا ملی ان کے دادا ہندی اور بھاشا زبان میں نوحے لکھتے تھے ان کے والد نے ہندی، اردو اور فارسی میں سلام، منقبت، غزل اور نوحے کہے اور ان کے کلام کا ۱/۳ حصہ مطبوعہ ہے۔ہاشمی صاحب کے بڑے بھائی صاحب دیوان تھے اور ان کا سارا کلام کلیات حبیب جون پوری کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ہاشمی صاحب نے ۱۹۴۸ء سے لے کر ۲۰۰۴ء تک ۱۳۳ اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ہاشمی صاحب نے الہ آباد اور لاہور کے نام ور اساتذہ سے علم حاصل کیا ابتدا میں علامہ آرزو سے بعد میں سیّد آلِ رضا سے شعری اصلاح لینے لگے۔ہاشمی صاحب نے پانچ رسالوں کی ادارت کے

فرائض ادا کیے اور آج چھ سات انجمنوں کے صدر اور سیکرٹری ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۸۸ء تک محکمہ تعلیم میں اہم عہدوں پر کام کیے اور ۱۹۸۸ء سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب تک تصنیفات و تالیفات کے کاموں میں مصروف ہیں ان کے چالیس مرثیوں کا مجموعہ ''العطش'' کے نام سے جنوری ۲۰۰۵ء میں شایع کیا جا چکا ہے۔ چالیس مرثیوں پر ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ اور ان کا تجزیہ ایک کارنامہ ہے۔

اس کتاب کا اہم ترین حصہ باب چہارم ہے جس میں جدید مختصر مرثیے کی ابتدا اور اس کی تکنیک پر مدلل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے متعدد حوالے دے کر یہ بتایا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حضرت نجم آفندی، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری اور سید آل رضا نے مرثیوں میں انقلاب برپا کیا۔ آل رضا نے مرثیے کے مزاج و مذاق میں تبدیلی کی اور جوش نے اُسلوب میں بلند آہنگی اور زور خطابت کا اضافہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ وحید الحسن ہاشمی اس لحاظ سے قابل قدر مرثیہ نگار ہیں کہ ان کے مرثیوں میں جوش اور آل رضا دونوں کے رنگ پائے جاتے ہیں اس مقام پر مصنف ہاشمی صاحب کے مرثیوں کے حوالوں سے اپنے نظریے کی تصدیق کی ہے۔ جدید مختصر مرثیے میں استعماری قوتوں کے خلاف نہایت تندی اور تیزی کے ساتھ حملے کیے گئے اسی طرح معاشرے کے اعلا اقدار کی پامالی کا بھی ذکر موجود ہے۔ ہاشمی صاحب نے محض کور ذوق، بد طینت اور بد اعمال رہبروں کی مذمت میں اشعار نہیں کہے مثلاً:

کتنا حسیں فریب نظر کھا رہے ہیں لوگ
دو کشتیوں میں پاؤں ہیں اور جا رہے ہیں لوگ

بل کہ نیک نفس اشخاص کا بھی نہایت عمدہ انداز میں تذکرہ کیا ہے مثلاً:

قربانیاں کرم ہیں مکرم ہیں اہلِ بیت
دنیا اگر ہے زخم تو مرہم ہیں اہلِ بیت

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ مختصر مرثیوں میں بندوں کی فقط تعداد کم ہوگئی ہے یعنی کیت آ گئی ہے، کیفیت مفقود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہاشمی صاحب ہی کے کلام سے ایسے بے شمار بند ثبوت میں پیش کیے ہیں جن میں کیفیت کی جلوہ نمائی ہے مثلاً:

اصغر پدر کی صدق بیانی سمجھ گئے
الفاظ بے صدا کے معانی سمجھ گئے
پیتے ہیں کیسے تیغ کا پانی سمجھ گئے
لائے ہیں کیوں حسینؑ کہانی سمجھ گئے
شیر خدا کے شیر کا منظر دکھا دیا
خیبر رگ گلو پہ اٹھا کر دکھا دیا

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جدید مختصر مرثیوں میں رثا جو مرثیے کا اصل مقصد ہے مفقود ہے اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے متعدد مرثیوں کے متعدد مصائب کے بند پیش کر کے اس اعتراض کو باطل قرار دیا ہے۔ ایک پُر سوز اور پُر درد بند اس سلسلے میں سن لیجیے :

خیموں میں لے کے آ گئے مشک و علم امام
سیدانیوں کے بین سے ہلنے لگے خیام
گرد علم تو جمع ہوئیں بیبیاں تمام
بولی اٹھا کے مشک، یہ بنت شہ امامؑ
پیاسوں کی زندگی کے نگہبان کیا ہوئے
بابا بتائیں میرے چچا جان کیا ہوئے

الغرض اس کتاب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ہاشمی صاحب کے مرثیوں کے حوالے سے مختصر مرثیے پر تفصیلی گفت گو کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہاشمی صاحب کی چلائی ہوئی تحریک اس قدر کامیاب ہے کہ آج ہر ایک مرثیہ نگار اس کا تتبع کر رہا ہے۔

◆◆◆

رثائی اَدب میں ارفع تحقیق

علی حسین جاوید

◆◆

مرثیے کی تحقیق وتنقید میں شہرت پانے والے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے عصرِ حاضر کے عظیم مرثیہ گو شاعر سید وحید الحسن ہاشمی کے رثائی ادب میں کارہائے نمایاں پر اہم کام کیا ہے۔ میر انیس کے بعد مرثیہ گوئی کی صنف میں شعرائے کرام نے بکثرت شاعری کی ہے' اور لکھنؤ کے بعد ''مرثیہ'' بعینہٖ ہجرت کر کے پاکستان نہ آسکا۔ ''مرثیہ'' کی ادبی شناخت کم وبیش معدوم ہو رہی ہے اور اسی باب کو شعوری یا لاشعوری سطح پر بند کرنے کے اسباب بے شمار ہیں' تاہم یہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں لیکن ہمارے موضوع سے اس کا تعلق ضرور ہے۔ کیوں کہ ایک درخت جس کے برگ وثمر وشاخ کاٹ دیئے جائیں اور تنے کو بغیر ضروری خوراک رہنے دیا جائے تو یا تو بتدریج زمانے کے نشانات اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں یا پھر وہ زمین پر اعتبار کرتے ہوئے اپنی جڑیں اتنی لمبی کر لیتا ہے جہاں وہ خوراک کو اپنی گرفت میں لا سکے۔ یوں ''مرثیہ'' کے شجر نے برصغیر میں یہی عمل دہرایا یا پسند کیا۔ اور سید وحید الحسن ہاشمی جیسے عظیم مرثیہ گو شاعر منصۂ شہود پر آئے۔ موت برحق ہے'' کل من علیہا فان'' لیکن کوئی موت تک کس طرح پہنچا؟ کیا سانس لیتے ہوئے زندگی گزار دی' کوئی کارنامہ نہ کیا یا زندگی کی جھولی میں عظمت کا کوئی سکہ یا پھول بھی ڈالا۔ یہی مرثیے کا آغاز ہے بقول سیّد وحید الحسن ہاشمی:

اذانِ مرثیہ جس دم سنائی دیتی ہے   مدد جو فن کو سپاہِ رثائی دیتی ہے
رگِ یزید سسکتی دکھائی دیتی ہے   ہر ایک صنف کی دنیا دہائی دیتی ہے
حروفِ غیرِ نسب کی روش مٹاتا ہے
یہ مرثیہ ہے جو کھوٹا کھرا بتاتا ہے

انسانی زندگی کے اَدبی پہلوؤں میں مرثیے کی اہمیت اپنی جگہ مسلّمہ ہے۔ بنیادی طور پر مرثیہ کربلا کے شہدا کے تذکرے سے زندہ ہے۔ سیّد شبیہ الحسن نے نہ صرف مرثیہ کے حوالے سے اہم ناموں کو اپنے قاری سے

متعارف کرایا ہے بل کہ جدید مرثیے کے اوصاف ممیزہ سے بھی ہمیں آگاہی بخشی ہے۔ ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' رثائی اَدب کے فروغ کے سلسلے میں ایک اہم اور قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں سید وحید الحسن ہاشمی کے سوانحی حالات اور تصانیف کا ذکر ہے۔ جن میں ''تفسیرِ انقلاب'' (نظم) ''مباحثے'' (ادبی مضامین) ''شعر اب'' (غزل) ''تنقیدی جہتیں'' (مضامین) ''یاسینؑ'' (نعتیں) ''اداریے'' (رسائل کے اداریے) کے علاوہ ستائیس (۲۷) کتب مرثیہ سے متعلق ہیں جن میں ''زبانِ مقتل''۔ ''خونِ تبسم''۔ ''شبِ عاشور''۔ ''سفیرِ آلِ محمدؐ''۔ ''طاہرین''۔ ''العطش''۔ ''زندگی''۔ ''صبر'' اور ''ملکیۃ العرب'' قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے باب میں ان اٹھاون (۵۸) علم و ادب کی معتبر اور اہم ترین اہلِ قلم ہستیوں کا ذکر ہے جنھوں نے سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیہ کو موضوعِ اظہار بنایا ہے۔ سات (۷) ادبی شخصیات نے ان کی غزل، آٹھ (۸) شخصیات نے نعت اور شخصیت، چار (۴) شخصیات نے منقبت جب کہ گیارہ (۱۱) احباب نے سلام، نظم اور نوحہ کے حوالے سے ان کے فن پر مضامین لکھے ہیں۔ آٹھ (۸) اخبارات نے ان سے انٹرویو کیے اور ادبی صفحات کی زینت بنائے۔ (۱۸) اٹھارہ نامور شعرا کرام نے انھیں منظوم کتب، تحقیقی مقالہ جات اور فلیپ لکھنے والوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

تیسرے باب میں سید وحید الحسن ہاشمی کے ۲۰۰۴ء تک لکھے گئے چالیس (۴۰) مراثی کا احوال ہے۔ اس میں مرثیے کا نام، سنِ تخلیق، کل بند، مطلع اور موضوع بتایا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعے سے قاری کو پتہ چلتا ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی واقعہ کربلا کے کرداروں کی شہادت کے حوالے سے کئی انسانی اعلیٰ وصف اور جوہر کو بیان کرتے ہیں، اور پھر بے حد موثر لہجے میں مرثیہ بیان کرتے ہیں۔ اس طویل باب میں ان کے مراثی کے مختلف بند اور بیانیہ تفصیل بھی دی گئی ہے۔ اس باب کی خاص بات یہ بھی ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی کے مراثی پر معروف اصحابِ علم و فن کی آراء بھی بطور اقتباس ہر مرثیے کے ساتھ دی گئی ہے۔

اگر ہم سید وحید الحسن ہاشمی کے مراثی کا بغور جائزہ لیں تو ایک بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے مرثیہ جیسی دل گداز صنفِ سخن کو اپنا کر اپنے مذہب کی ایسی روشن روش کو اپنایا ہے جو ہمارے ایمان کا جزو ہی نہیں بل کہ زندگی کی ان نامساعد اور پریشان حال صورتوں کا ازالہ کرنے والا ایک ایسا آلہ ہے جسے ایک قلم کار ہی اپنی فکری اپج سے ایجاد کر سکتا ہے۔

انقلاب کی وہ اعلیٰ روایت جو اسلام کے آنے کے فوراً بعد انسانیت کی رگوں میں چراغ خون کی صورت جلنے لگی سید وحید الحسن ہاشمی نے اس شمع وفا کو اپنی فکر سے ایسی تیز لو میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے جس

سے حالاتِ حاضرہ کی ظلمتوں کو وفا کی تجلیوں سے منور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی صدف ہائے آبدار سید وحید الحسن ہاشمی کے بحرِ ادب میں ساحل آشنا ہوتے نظر آتے ہیں۔

سید وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری عقیدت و مودتِ اصحابِ کربلا کا حسین ملاپ ہے۔ ان کے مراثی سے چند منتخب بند دیکھیے:

آتا ہے انقلاب تو اٹھتی ہے بدلیاں　　اللہ رے اک امامِ وفا کی وہ خوبیاں
شمعِ وفا کو لیتی ہیں گھیرے میں آندھیاں　　بجتی ہیں ظلمتوں کو وفا کی تجلیاں
جس پر معاویہ کے تصرف کی گھات ہے
وہ سلطنت نہیں ہے، وفا کی زکوٰۃ ہے

(ناموسِ وفا)

آئی اسی سے چہرہ اطاعت پہ آب و تاب　　چمکا اسی میں صبر و قناعت کا ماہ تاب
بخشی اسی سے ہمت و ایثار کی کتاب　　اب تک لیے ہوئے ہے شہادت کا آفتاب
یہ رات اب ہے بنتِ نبیؐ کی دعاؤں میں
زندہ رہے گی چادرِ زینبؓ کی چھاؤں میں

(شبِ عاشور)

شبیرؓ کی پسر کے ارادوں پہ تھی نظر　　ہم وار کر رہے تھے شہادت کی رہ گزر
تنہا تھے امتحانِ وفا کے محاذ پر　　کمسن پسر کا تول رہے تھے دل و جگر
دنیا کو رنگِ عدل میں حیران کر دیا
اصغرؓ کو اور دہن کو میزان کر دیا

(حسینؑ اور قربانی)

دولتِ صبر سے ہو جائے جو ملت محروم　　اس کا احساسِ فنا، اس کی قیادت معدوم
اس کی قسمت میں کہاں فکر کے تابندہ نجوم　　ایک معنی میں کہا جاتا ہے اس کو مرحوم
قوم بے صبر سہاروں پہ گزر جاتی ہے
غیر کے پاؤں سے خود اپنا سفر کرتی ہے

(صبر)

ذہنوں میں چھپائے ہوئے اوہام کا لشکر　　ہاتھوں میں لیے تنگیٔ احساس کا دفتر
سینوں میں دبائے ہوئے وسواس کا محور　　قدموں میں لپیٹے ہوئے تقدیر کے چکر

جذبوں کے طلاطم میں اماں ڈھونڈ رہا ہے
منزل ہے کہاں اور کہاں ڈھونڈ رہا ہے

(اَنا اور خودداری)

اندھیری رات ہے، پردیس ہے، فضا مغموم — پکارتی ہے سکینہؑ جو یا شہؑ مظلوم
زمینِ گرم پہ بکھرے ہیں مصطفیٰؐ کے نجوم — اٹھا کے گود میں کہتی ہیں پیار سے کلثومؑ
پدر کی راہ میں دنیا کے سو جھمیلے ہیں
گئے ہیں دشت میں، اصغرؑ وہاں اکیلے ہیں

(جوہرِ وراثت)

کربلا مدرسہ فکر ہے قوموں کے لیے — دل کی تسکین ہے یہ درد کے لمحوں کے لیے
مرکزِ جوشِ مہمات ہے جذبوں کے لیے — ہم تو کیا، جائے زیارت ہے رسولوں کے لیے
اس کے ادراک سے ملت کو بقا ملتی ہے
اس کی باتوں سے تمدن کو غذا ملتی ہے

(کربلا کربلا)

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے، صبر وقناعت کا ایک پورا فلسفہ ان کی مرثیہ نگاری میں بھرپور طور سے طلوع ہوتا ہوا نظر آتا ہے، جہاں دعاؤں اور چادرِ زینبؑ کی طہارت، شہادت کا ایک عجب منظر نامہ پیش کرتی نظر آتی ہے۔ یہ رہ گزرِ عشق ایسی مسافت کا ادراک قاری کو عطا کرتی ہے جو ہر کڑے امتحان میں شبیرؑ کے بیٹوں کی طرح ارادوں کو کامیابی کا زینہ فراہم کرتی ہے۔ صبر و رضا کا یہ پیکر جسے انھوں نے اپنی شاعری کا مرکز و محور بنایا ہے ان کے مرثیہ کی فکر کا تابندہ نجوم ہی نہیں بل کہ عوام الناس کے مشکل ترین سفر کا زادِ راہ اور جادہ منزل بھی ٹھہرتا ہے۔ تقدیر کی گراں باری، تنگیِ احساس سے مفلوج ذہن اور معاشرتی واستحصالی قوتوں کی زور آزمائی وہ عوامل ہیں جن کو اپنے قلم کی روشنائی سے سیّد وحید الحسن ہاشمی نے تیرگی کے لبادے سے نکال کر روشن پہلو سے نوازہ ہے اور یہی ایک سچے قلم کار کا منصب اولین ہوتا ہے۔

چوتھے باب میں مختصر مرثیے کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، جس میں ہاشمی صاحب نے زمانے کی آواز کو شامل کیا ہے جب کہ آخر میں ان کے لکھے ہوئے تین مراثی مذکور ہیں۔ پہلا مرثیہ ''زندگی'' حضرت علی اکبرؑ بن حضرت امامِ حسینؑ کی شہادت کے احوال سے متعلق ہے۔ دوسرا مرثیہ ''بچپن'' حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کا احوال لیے ہوئے ہے۔ جب کہ تیسرا مرثیہ ''کشمکش'' حضرت زینبؑ کے میدانِ کربلا میں مصائب اور فکر سے عبارت ہے۔ اسی طرح ان مراثی پر ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر نیر صمدانی اور ڈاکٹر سلیم اختر کے تبصرے بھی شامل کیے

گئے ہیں۔

مرثیہ کی صنف جو اس دور کے مادی پیرہن میں روح کی عظمت وجلالت کا اظہار ہے اور اس پیرہن کو انسانیت کی جامہ زیبی کے قابل بنا سکتا ہے۔ مادی ضرورتوں سے کوئی بھی آزاد نہیں رہ سکتا' مکمل طور پر Matter Free دنیا کا تصور ممکن نہیں لیکن جو دنیا Stufted with matter ہے اس میں روحانی اقدار کی گنجائش نکالنے کی ضرورت ہے۔ آج قہقہہ صحت مندی اور آنسو ڈپریشن کی علامت لگتے ہیں۔ لیکن کیا ایسا ہی ہے؟ ہم ادب کی سمت نمائی میں مشکل پسند رویوں کو بھولتے جا رہے ہیں' ہر عقدہ کشائی کے لمحے کے ساتھ ہماری آسائش پسندی بیٹھی ہوئی ہے۔ ہم ایک چیز کو پرانی کہہ کر یہ بھول رہے ہیں کہ مذہب پرانا ہے مگر اس کے بغیر مہذب دنیا کا تصور تک مفقود ہے۔ اس لیے آج کے دور میں جب دلوں کی جگہ پتھروں نے لے لی ہے' ایثار کی جگہ پر خودغرضی قابض ہو چکی ہے ایسے میں مرثیہ پڑھنے' لکھنے اور سمجھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو ہمارے سیّد وحید الحسن ہاشمی نے جس طرح سمجھا اسی طرح ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ یوں یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے انسان کے لیے فکری جہات کے نئے در بھی وا کر رہی ہے۔ جن کے ذریعے امن' محبت' وفا' خلوص اور ایثار کی ہوائے نسیم کے جھونکے تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی کارنامہ

مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی

عابد منہاس

••

شعر و ادب کی اچھوتی صنف مرثیہ نگاری میں غوطہ زن ہو کر نظر دوڑائی جائے تو ایک طویل قطار نظر آتی ہے جس میں میر ببر علی انیسؔ، میرزا دبیرؔ، میرزا اوجؔ، سوداؔ، سکندرؔ، فیض احمد فیضؔ، جوشؔ ملیح آبادی، پروفیسر احتشام حسین، نیاز فتح پوری، آلِ عباؔ، سید آلِ رضاؔ، نجم آفندی، نسیم امروہوی، ڈاکٹر سلیم اختر، طاہر تونسوی...... سرخیل نظر آتے ہیں مگر اس حسین و جمیل جھرمٹ میں جناب ''سید وحید الحسن ہاشمی'' واضح اور منفرد نظر آتے ہیں۔ جن کی مرثیہ نگاری پر مجھ جیسے ناتواں قلم نگار کا لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ جناب وحید العصر پر قلم بند شدہ دیگر تحقیقی کتب سے قطع نظر ہوتے ہوئے میرے سامنے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تخلیق ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' پڑی ہے۔ جسے ابھی ابھی مکمل طور پر نگاہوں میں اتارا ہے۔ ۲۲۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد دل و نگاہ نے سید وحید الحسن ہاشمی کو میر انیسؔ ثانی تسلیم کر لیا ہے گو میر انیسؔ کے مراثی نہایت طویل ہیں کئی تو ہزار کے لگ بھگ اشعار پر محیط ہیں۔ اس کے برعکس وحید العصر کے مراثی مختصر ہیں مگر سمندر کو کوزے میں سمویا گیا ہے۔ معانی اور مطالب یکساں ہیں۔ تحریر اور معانی کی چاشنی اور مٹھاس مساوی محسوس ہوتی ہے۔

''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' از سید شبیہ الحسن کے تعارف پر لمبی چوڑی تمہید رقم کرنے کے بجائے ڈاکٹر سلیم اختر کے ہو بہو الفاظ پر اکتفا کروں گا جو میرے دل کے سو فی صد عکاس ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تازہ تالیف ''مختصر مرثیہ کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت کے مطالعہ کے ساتھ بطور مرثیہ نگاران کے فن کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے مگر اس انداز اور اُسلوب میں کہ مرثیہ کے فن سے وابستہ تخلیقی اُمور اور فنی جزئیات کا بھی

احاطہ ہو گیا ہے۔ مرثیہ سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ باعث افادہ ہوگا''۔

مذکورہ کتاب کے حوالہ سے سید وحید الحسن ہاشمی کے مراثی' شخصیت اور فن پر کچھ اظہار کی جسارت کر رہا ہوں جو ایک لحاظ سے اس تصنیف کا مختصر تعارف بھی ہوگا۔ وحید العصر جناب سید وحید الحسن ہاشمی کا شمار فی زمانہ کے مرثیہ نگار' نعت گو' غزل گو' نوحہ گو اور سلام نگار شعرا میں ہوتا ہے مگر آپ کی انفرادیت مرثیہ کا میدان ہے۔ آپ کا اصل اسم گرامی سید وحید الحسن ہے مگر قلمی نام وحید الحسن ہاشمی پر مستعمل ہے۔ آپ نے ۱۹۳۰ء میں شیراز ہند جون پور میں جنم لیا۔ جناب کے دادا میر انتظام علی فارسی قصیدے کے مستند اور ماہر اُستاد معروف تھے جب کہ والدِ محترم سید شبیر حسن صفا الہٰ آبادی (۱۹۷۵ء۔۱۸۸۳ء) اردو ہندی اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے ابتدائی تعلیم جون پور سے حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں آبائی سکول سے میٹرک کیا اور ۱۹۴۶ء میں انٹر کالج جون پور سے ایف۔ اے کرنے کے بعد الہٰ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم۔ اے اُردو کرنے کے بعد درس و تدریس کے محکمہ سے منسلک ہو گئے اور ۳۷ سال خدمات سرانجام دینے کے بعد ۱۹۸۸ء میں ریٹائیر ہوئے۔

جناب کو شعر و شاعری کا مادہ ورثے میں ملا۔ دادا جان' والدِ گرامی اور بھائی کے علاوہ خاندان میں بہت سے شعرا تھے وحید الحسن ہاشمی نے بارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کی پہلی غزل کا مطلع یوں تھا :

نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پر خوشی ہے
عجب کشمکش میں مری زندگی ہے

اُدبی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور کی فضاؤں میں گزرا۔ یہاں احسان دانش' احمد ندیم قاسمی' ناصر کاظمی' سجاد باقر رضوی' قتیل شفائی' عابد علی عابد' شہرت بخاری' مظفر وارثی' مرتضیٰ برلاس وغیرہ کی مجلسوں نے شاعری کو جلا بخشی سید وحید الحسن ہاشمی نے نظم و نثر دونوں میں قلم طرازی کی اور تین درجن سے زائد شعر و نثر کی تصانیف منصہ شہود پر آ چکی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔(۱) الصراط (۲) خون اور آنسو (۳) ۷۲ پیاسے (۴) اجرِ رسالتؐ (۵) زبانِ مقتل (۶) حیاتِ غم (۷) تفسیرِ انقلاب (۸) مباحثے (۹) عظمتِ انسان (۱۰) سلام وفا (۱۱) ناموسِ وفا (۱۲) خونِ تبسم (۱۳) شب عاشور (۱۴) خلق حسنؑ (۱۵) حسینؑ اور قربانی (۱۶) زندگی (۱۷) صبر (۱۸) سفیرِ آل محمدؐ (۱۹) ملیکۃ العربؑ (۲۰) چراغ صحرا (۲۱) طاہرین (۲۲) العطش (جلد اول' دوم' سوم) (۲۳) شعراب (۲۴) تنقیدی جہتیں (۲۵) معصومینؑ (۲۶) یاسینؑ (نعتیں) (۲۷) ہل من ناصر (جلد اول' دوم) (۲۸) اداریے (۲۹) آل رضا کے خطوط اور اصلاحیں وغیرہ۔ ان کتب کے کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی قاری مطالعہ کرنے بیٹھے تو ایک ہی نشست میں ختم کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔

اذانِ مرثیہ جس دم سنائی دیتی ہے — رگِ یزید سسکتی دکھائی دیتی ہے
مدد جو فن کو سپاہِ رثائی دیتی ہے — ہر ایک صنف کی دنیا دہائی دیتی ہے
حروفِ غیر نسب کی روش مٹاتا ہے
یہ مرثیہ ہے جو کھوٹا کھرا بتاتا ہے

عصرِ حاضر کے درجنوں آفتابِ اُدب نے جناب کے فن اور سیرت پر تحقیقی مضامین اور مقالے رقم کر کے ظاہر و باطن کے تمام گوشوں کو چاک کیا ہے، جن کے مطالعہ سے قاری ''وحید شناسی'' سے مکمل آگاہ ہو جاتا ہے۔ آپ پر مختلف حوالوں سے کام کرنے والوں میں متین اے شیخ، علی حسین رضوی، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر آغا سہیل، اشفاق نقوی، ڈاکٹر شبیہ الحسن، پروفیسر محمد اشرف، سید سجاد رضوی، پروفیسر عتیق احمد، سید علی عباس، ڈاکٹر میمونہ انصاری، ڈاکٹر حسن رضوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر خیال امروہوی، انتظار حسین، ڈاکٹر قاضی سرفراز، ڈاکٹر محمد اجمل نیازی، ڈاکٹر نیر صمدانی، ڈاکٹر باقر علی شاہ، شاہد نقوی، حسن عسکری کاظمی، پروفیسر محمد ہارون قادر، ڈاکٹر معراج نیر، ڈاکٹر ضیا الحسن، پروفیسر مشکور حسین یاد، ڈاکٹر طارق عزیز، پروفیسر ظفر چشتی، ڈاکٹر ریاض قدیر، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر نصیر عالم زیدی، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر ناصر بلوچ، ڈاکٹر کنول فیروز، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر انور سدید، مرغوب حسین طاہر، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر ناہید شاہد، شہزاد احمد، ساحر لکھنوی، تابش دہلوی، ڈاکٹر علی ظہیر منہاس، حمید کوثری، پروفیسر احمد عقیل روبی، حمید کوثری، ڈاکٹر عارف ثاقب، حنیف اسعدی، ہادی نقوی، سید محمد رضا زیدی، پروفیسر شاہین بھٹی، پروفیسر عظمیٰ عزیز، پروفیسر نواز حسین زیدی، ڈاکٹر سید عبداللہ، عنبرین خان، نیساں اکبرآبادی، پروفیسر جعفر بلوچ، علی رضا کاظمی، پروفیسر نزدوش ترابی، خوشتر علی خوشتر، عرفی ہاشمی، حشمت علی قیصر، ظہور حیدر جارچوی، احسان دانش کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔

''مختصر مرثیے کی روایت'' میں ڈاکٹر وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مراثی شامل ہیں۔ ان میں بے شمار عنوانات کو اشعار کی لڑی میں پرویا گیا ہے گو موضوعات قدیم ہیں مگر آپ نے افکار کو نئی جہت دی ہے۔ میرے خیال میں ان کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ اکثر شعرا مرثیہ کو مذہبی شاعری میں شمار کرتے ہیں مگر بنیادی طور پر اس کا تعلق اور واسطہ مذہب سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہے اور پوری بنی نوع انسان سے ناطہ ہے۔ ابتدا میں مرثیہ کا عنوان مختلف رہا مگر بتدریج اس کا موضوع واقعہ کربلا مختص ہو گیا۔ سانحہ ارتحال وہی ہے مگر ہر مراثی نے اسے اپنے انداز میں رقم کیا ہے اور یہ لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ واقعہ کربلا کی تاریخ کے آغاز میں ساتھ آٹھ سو اشعار کے بھی مرثیے تھے مگر اب چالیس پچاس اشعار پر مشتمل مرثیہ بہترین تسلیم کیا جاتا ہے۔ وحید الحسن ہاشمی کا شمار مختصر مرثیہ نگاروں کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ مذکورہ چالیس مراثی کا مختصر خاکہ یوں ہے۔

''ناموسِ وفا'' (۱۹۷۳ء) میں کل ۴۵ بند ہیں۔ اس میں ناموسِ کربلا حضرت زینبؑ کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ ہے۔

روحِ عمل ہے عزم کی دنیا کا چین ہے
بعد حسینؑ دہر میں زینبؑ حسینؑ ہے

''خونِ تبسم'' (۱۹۷۴ء) میں کل بند ۵۱ ہیں۔ اس میں معصوم کربلا حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کا حال ہے۔

مخلوق پر عذاب کی صورت نہ آئے گی
جب تک زمیں پہ یہ ہیں قیامت نہ آئے گی

''شبِ عاشور'' (۱۹۷۴ء) میں کل ۴۰ بند ہیں۔ جن میں شبِ عاشور کی فضیلت و اہمیت کا بیان ہے۔

خوشنودی خدا کے قبالے اسی میں ہیں
عاشور کی سحر کے اُجالے اسی میں ہیں

''خلقِ حسنؑ'' (۱۹۷۶ء) میں کل ۵۱ بند ہیں۔ جن میں حضرت امام حسنؑ کی سیرت اور شہادت کا حال ہے۔

''حسینؑ اور قربانی'' (۱۹۷۷ء) میں کل ۵۰ بند ہیں۔ اس میں حضرت امام حسینؑ کی قربانی عظمیٰ کا خوب صورت بیان ہے:

شبیرؑ کی پسر کے ارادوں پہ تھی نظر
تنہا تھے امتحانِ وفا کے محاذ پر

''زندگی'' (۱۹۷۸ء) میں ۵۶ بند ہیں۔ جن میں حضرت علی اکبرؑ کی سیرت اور شہادت کا بیان ہے۔
''صبر'' (۱۹۷۹ء) میں بھی ۵۶ بند ہیں۔ اس میں حضرت امام زین العابدینؑ کے مصائب کا تذکرہ ہے۔ ''سفیر آلِ محمدؐ'' (۱۹۸۰ء) میں ۶۹ بند ہیں۔ اس میں سفیر آلِ محمد حضرت مسلم بن عقیلؑ کا مکمل تذکرہ ہے۔ ''ملیکۃ العربؑ'' (۱۹۸۲ء) میں ۶۱ بند ہیں۔ اس میں حضرت خدیجہؑ اور حضرت زینبؑ کا بیان ہے۔ ''زنجیر سفیر'' (۱۹۸۷ء) میں ۵۶ بند ہیں۔ جس میں حضرت امام زین العابدینؑ کی شہادت کا ذکر ہے۔ ''سرکار وفا'' (۱۹۸۸ء) میں ۶۰ بند ہیں۔ جن میں حضرت عباس علم دارؑ کی شہادت کا تذکرہ ہے۔

شرافتِ ابوطالب کا ناز ہے عباسؑ
کھلا جو قلبِ علیؑ پر وہ راز ہے عباسؑ

''اسوہ بتولؑ'' (۱۹۸۹ء) میں حضرت فاطمہؑ ''پردہ'' (۱۹۹۰ء) میں حضرت سکینہؑ ''آرزوئے علیؑ''

(1990ء) میں حضرت بی بی ام البنینؑ’’ ’’انا اور خودداری‘‘ (۱۹۹۱ء) میں زندانِ شام’’ ’’بچپن‘‘ (۱۹۹۲ء) میں حضرت علی اصغرؑ’’ جوہرِ وراثت‘‘ (۱۹۹۲ء) میں جنابِ سکینہؑ’’ ’’آقائے ابوالقاسم خوئی‘‘ (۱۹۹۲ء) میں حضرت امام حسینؑ کا سفرِ آخرت’’ ’’شباب‘‘ (۱۹۹۳ء) میں حضرت علی اکبرؑ کی شہادت’’ ’’معرفتِ ذات‘‘ (۱۹۹۳ء) میں شامِ غریباں۔ ’’جوہرِ نقویؒ‘‘ (۱۹۹۴ء) میں مصائب’’ ’’پیری‘‘ (۱۹۹۴ء) میں حضرت امام حسینؑ کی حضرت علی اکبرؑ کی میت پر آمد’’ ’’شخص اور شخصیت‘‘ (۱۹۹۴ء) میں شہادت حضرت حرؑ’’ ’’کشمکش‘‘ (۱۹۹۵ء) میں حضرت زینبؑ کے مصائب’’ ’’کربلا کربلا‘‘ (۱۹۹۵ء) میں شہادت حضرت علی اصغرؑ’’ ’’ادب اور ادیب‘‘ (۱۹۹۵ء) میں تذکرہ ادب اور ادیب’’ ’’حقیقتِ موت‘‘ (۱۹۹۶ء) میں حضرت بی بی سکینہؑ کے مصائب’ ’’قوم و قومیت‘‘ (۱۹۹۶ء) میں سفرِ آخرت ’’قیادت‘‘ (۱۹۹۷ء) میں حضرت امام زین العابدینؑ کا سفر’ ’’احتساب‘‘ (۱۹۹۷ء) میں سفرِ آخرت’’ ’’احساس‘‘ (۲۰۰۰ء) میں جنابِ سکینہؑ کی زندانِ شام میں وفات’ ’’ارتقا‘‘ (۲۰۰۱ء) میں لاش پر بین کرنا۔ ’’اعتماد‘‘ (۲۰۰۱ء) میں جنابِ عونؑ و محمدؑ کی شہادت’ ’’ماحول‘‘ (۲۰۰۳ء) میں شامِ غریباں’ ’’جلوہ سخن‘‘ (۲۰۰۳ء) میں جنابِ سکینہؑ زندان شام میں’ ’’جارحیت‘‘ (۲۰۰۳ء) میں شہادت سے قبل امام عالی مقام کی اہلِ خانہ سے ملاقات اور وقت کے مناظر اور آخری مرثیہ ’’جانِ شہادت‘‘ (۲۰۰۴ء) میں شہادت جنابِ قاسمؑ کا تذکرہ ہے۔ مندرجہ بالا تمام مراثی کے عمیق مطالعہ کے نتیجہ میں سو فیصد محسوس ہوتا ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی ثانی میر انیسؔ ہیں۔ ’’مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی‘‘ کے مصنف ڈاکٹر سید شبیہ الحسن دلی مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ یہ کتاب حیات رقم کی۔ یقیناً یہ تاریخ مراثی میں عمدہ مقام پائے گی۔

(بحوالہ: مختصر مرثیے کی روایت اور وحید الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر شبیہ الحسن)

◆◆◆

maablib.org

جن کا سخن ہے فکر و عمل کے لیے مہمیز

عاطف خالد بٹ

◆◆

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی قوم کی حقیقی ترقی اس کے علماء، فلاسفہ، مفکرین، اُدبا، شعرا، ناقدین اور طلبائے علم و ہنر کی رہینِ منت ہوا کرتی ہے۔ ان نابغانِ روزگار کا وجود اقوام و ملل کے لیے نہ صرف باعثِ نزولِ علم و فن ہوا کرتا ہے، بل کہ یہی وہ افراد ہوتے ہیں جن کے سبب اقوام معراجِ دانش و بینش پر فائز ہوتی ہیں۔ یہ بھی ایک عالم گیر حقیقت ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ سے موجودہ دور تک حصولِ ترقی و تلاش عرفان کے لیے اقوام و ملل اپنے ان عظیم محسنین کو کبھی فراموش نہیں کیا کرتیں اور ان کی زندگی میں ہی ان کا اعزاز و تحسین سے نوازا جاتا ہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ اس ناقابلِ تردید حقیقت کے باوجود ہمارے ہاں ان بندگانِ خدا میں سے اکثر و بیشتر کو ان کی زندگی میں وہ خصوصی قدر و منزلت اور عزت و تکریم حاصل نہیں ہوتی جس کے وہ مستحق اور سزاوار ہوا کرتے ہیں۔ اس المیہ کے حوالے سے ابوالاثر حفیظؔ جالندھری کے یہ الفاظ مبنی بر حقیقت ہیں:

سخن کی قدردانی زندگانی میں نہیں ہوتی
یہاں جب شمع بجھ لیتی ہے تب پروانہ آتا ہے

گذشتہ ۵۰۰ برس سے اُمتِ مرحومہ ترقی کی ان بلندیوں سے ہم کنار نہیں ہو سکی، جن سے وہ اس سے قبل مالا مال تھی۔ اس کی ایک بین وجہ تو یہی ہے کہ اس قوم میں اہلِ علم تو بہت سے پیدا ہوئے لیکن افسوس صد افسوس کہ قوم ان کو وہ مقام و مرتبہ نہ دے سکی، جس کے وہ حق دار تھے۔ بقیہ اصنافِ علم و ادب تو بہت دور کی بات ہے اگر ہم فقط شاعری کے حوالے سے ہی دیکھیں تو غالبؔ سے لے کر ساغر صدیقی تک ہمیں شاید ہی کوئی ایسا بندہ ملے کہ جس کو اس کی حیاتِ مستعار کے دوران ہی نہ صرف اعتراف کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس کی حالتِ زار کو بھی درست کرنے کے لیے جد و جہد کی گئی ہو۔ ہمارے یہاں پر منفی روایت رواج پا چکی ہے کہ اولاً تو کسی اہلِ علم و ادب کی قدر اس کی زندگی میں کی ہی نہیں جاتی اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس داد و تحسین کو محض

زبانی جمع خرچ تک محدود کر دیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں جن چیدہ و چنیدہ اصحاب کو ان کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے ہی ان کی کاوشوں اور کوششوں کے اعتراف میں عزو جاہ سے نوازا گیا ہے، ان میں ایک نام معروف نقاد، بے بدل شاعر اور یکتائے عصر مرثیہ گو سیّد وحید الحسن ہاشمی کا ہے۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی عصرِ حاضر کے ایک نامور شاعر ہیں اور خاص طور پر صنفِ مرثیہ میں ان کا ایک منفرد مقام ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں سلام، نوحے اور مرثیے پر خصوصی توجہ دی ہے اور ان اصناف شعری کو دوام بخشا ہے۔ وہ جون پور کے مردم خیز خطے میں پیدا ہوئے۔ جون پور جسے اربابِ نظر ''شیرازِ ہند'' کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ بعد ازاں حصولِ تعلیم کے سفر کو بالترتیب کراچی اور لاہور جا کر ہم کنارِ منزل کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد درس و تدریس کے شعبہ سے منسلک ہو گئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اس وقت ایک بھرپور علمی و ادبی زندگی گزار رہے ہیں، جس کا واضح ثبوت وہ چالیس مرثیے ہیں جن کو وہ اب تک تخلیق کا جامہ پہنا چکے ہیں۔ مراثی کو کس مہارت اور ارادت سے انھوں نے تخلیق کیا، اس کا اندازہ ان کو پڑھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ مراثی اور ان کا ایک ایک لفظ ان کے علمی عمق، فکری وسعت اور تخیلاتی گیرائی کا پتہ دیتا ہے۔ حال ہی میں انھیں ۵۰ برس سے زائد قلمی خدمات کے نتیجے میں ''اعتراف علمی و ادبی خدمات ایوارڈ'' سے نوازا گیا ہے۔

گذشتہ دنوں پاکستان میں ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' کے نام سے ایک کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف و مرتب جناب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی ہیں، جو کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے خلف الرشید بھی ہیں۔ مرتب نے جس اندازِ متانت، ثقاہت اور باریک بینی سے کتاب کو ترتیب دیا ہے، وہ ان کے ایک باریک نظر محقق ہونے پر دال ہے۔ کتاب میں بڑے خوب صورت پیرائے میں سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کے تخلیق کردہ مراثی کے اقتباسات بھی شائع کیے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری ان کی علمیت و ذہنیت کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس قحط الرجال میں ایسی شخصیت کا وجود بہر طور ملک و ملت کے لیے ایک گنج گراں مایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۵ - اپریل ۲۰۰۵ء)

◆◆◆

قیصر بارہوی کے مرثیے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا کارنامہ

ڈاکٹر انور سدید

◆◆

قیصر بارہوی کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۶۵ء میں جنگِ ستمبر کے بعد سرگودھا میں دیکھا تھا جہاں وہ سات بلاک کے مرکزی امام بارگاہ میں مرثیہ پڑھنے کے لیے جوہر آباد سے تشریف لائے تھے، مرثیہ کی اس محفل کے انعقاد سے پہلے انھیں کچھ وقت مل گیا تو وہ ڈاکٹر وزیر آغا کی قیام گاہ پر رک گئے، جو ریلوے اسٹیشن کے قریب تھی اور جہاں ہر شام اَدب کی ایک محفل سجتی تھی، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر خورشید رضوی، سجاد نقوی، پرویز بزمی، ڈاکٹر سہیل بخاری اور یہ ناچیز انور سدید اس محفل میں روزانہ شرکت کرتے۔ یہاں باہر سے آنے والے دوستوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے بتایا کہ قیصر بارہوی غزل کے عمدہ شاعر ہیں لیکن اب انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتیں صرف مرثیہ نگاری کے لیے مختص کر دی ہیں اور مسلسل مرثیے لکھ رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے ''غزل'' سنانے سے انکار کر دیا اور مرثیہ اس لیے نہ سنایا کہ اس کے لیے ایک محفل امام بارگاہ میں منعقد ہونے والی تھی اور قیصر بارہوی چاہتے تھے کہ سرگودھا کے سب اہلِ ذوق اس میں شریک ہوں۔ اس وقت تک ان کے انوکھے لحن کا چرچا ہو چکا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لکھنؤ کے آسمان سے یہ ستارہ ٹوٹ کر محکمہ ترقیاتِ تھل میں جوہر آباد کی سرزمین پر اُترا تو اپنی تمام شہرت لکھنؤ میں ہی چھوڑ آیا اور جوہر آباد میں ان کی وسیع پیمانے پر پذیرائی بہت محدود قرار دی جا سکتی ہے۔

ایک مخصوص قسم کی بے نیازی ان کے مزاج میں تھی اور نمود و نمائش سے انھیں رغبت نہیں تھی، چناں چہ انھوں نے جوہر آباد اور بھکر جیسے دُور افتادہ مقامات پر اپنی خلوت کو اپنی ذات کی انجمن سے سجایا اور فرصت کا جتنا وقت ملتا وہ مرثیہ نگاری میں صرف کرنے لگے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ قیصر بارہوی ۱۹۷۰ء میں لاہور آ گئے تھے، اور انھوں نے محکمہ مال میں ملازمت بھی اختیار کر لی تھی لیکن یہاں بھی انھوں نے مجلس آرائی میں وقت ضائع

نہیں کیا۔ مرثیہ لکھ لیتے تو سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کو سنانے کے لیے ان کے گھر پر تشریف لے جاتے اور ان کی مخلصانہ داد کو ہی حرف آخر سمجھ کر مطمئن ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ ہاشمی صاحب کی تحسینِ سخن شناس نے قیصر بارہوی کو کسی اور سخن ور کی داد سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ایک محرم الحرام میں انھیں ٹیلی ویژن پر "مرثیۂ نو تالیف" اپنے مخصوص لحن میں پڑھتے سنا تو خوشی ہوئی کہ آخر پی ٹی وی نے انھیں تلاش کر لیا تھا لیکن بعد میں کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ اس تعارف عام کا باعث سید وحید الحسن ہاشمی تھے جو ملال کرتے تھے کہ اس دور میں ابلاغ کے ذرائع اہلِ فن سے اغماض برت رہے تھے۔ اب حقیقت یہ ہے کہ قیصر بارہوی صاحب نے پی ٹی وی سے پہلا مرثیہ پیش کیا تو اس کی پذیرائی غیر معمولی ہوئی اور پھر یہ تقاضا شدت پکڑ گیا کہ وہ ہر سال ایک نیا مرثیہ ارشاد فرمائیں اور اسے ٹی وی سے نشر کرنے کے لیے محفوظ رکھیں، یہ سلسلہ ان کی وفات ۱۹۹۶ء تک قائم رہا۔ ٹیلی ویژن پاکستان کے پاس قیصر بارہوی صاحب کے مرثیوں کی تمام ریکارڈنگ محفوظ ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس کا "نشرِ مکرر" اب ان پروڈیوسروں پر موقوف ہے جو قیصر بارہوی صاحب کے مقام اور مرتبے اور ان کی مرثیہ نگاری کی جدیدیت سے آشنا نہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ مرثیہ کی تاریخ میں ان کا نام سنہری لفظوں میں لکھا جا چکا ہے۔ سید عاشور کاظمی نے برطانیہ سے عاشور کاظمی فاؤنڈیشن کے تحت شائع ہونے والی معرکہ آرا کتاب "اُردو مرثیے کا سفر" (سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک) میں ایک باب قیصر بارہوی کے لیے مختص کیا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ان کے ترپن (۵۳) مرثیے تجزیہ و تدوین کے بعد ایک جلد میں پیش کیے ہیں جو ۱۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور قیصر بارہوی کے فنی تجدد کی آئینہ دار ہے۔

قیصر بارہوی بھارت کے شہر کرنال میں (ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیق کے مطابق) ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام قیصر عباس رکھا، حصولِ تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے تو بائیس برس کی عمر تک اس شہر پر تمثال میں قیام کیا، میٹرک پاس کر لیا تو شعر گوئی کے حوالے سے قیصر بارہوی بن گئے۔ یہ نام سادات بارہہ سے ان کی خاندانی نسبت ظاہر کرتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں غزل کی شاعری سے آغاز کیا، پہلا شعر یہ کہا:

بجھ گئے ہیں، مری خوشی کے چراغ
اب زمانہ جلائے گھی کے چراغ

اس دور میں وہ مشورۂ سخن معز لکھنوی سے کرتے تھے۔ مرثیے کے حوالے سے انھیں نجم آفندی اور میر انیس نے متاثر کیا لیکن سید وحید الحسن ہاشمی نے ان کے کلام پر مرزا دبیر اور جوش ملیح آبادی کے طرز کی چھاپ کا مشاہدہ کیا ہے۔ تاہم دل چسپ بات یہ ہے کہ لکھنؤ کے قیام کے دوران ریاضِ فن پورا کر لینے کے باوجود وہ مرثیہ نگاری کی طرف ۱۹۵۰ء میں اس وقت راغب ہوئے جب وہ حق و باطل کے فرق کو اپنے ذہن میں واضح کرنے

کے بعد پاکستان میں ہجرت کر آئے تھے۔ ان کے مرثیوں کی پہلی کتاب ''شبابِ فطرت'' ۱۹۶۹ء میں، ''معراجِ بشر'' ۱۹۷۵ء میں، ''عظیم مرثیے'' ۱۹۷۷ء میں اور ''منفرد مرثیے'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس دور میں ہی انھوں نے اپنی مرثیہ خوانی کا منفرد انداز وضع کیا اور تحت اللفظ میں سوز خوانی کا پیوند لگا کر اہلِ محفل کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کے مطابق ''یہ لحن ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے'' اور اسے ٹیلی ویژن پر بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ بالفاظِ دیگر قیصر بارہوی کو مرثیہ گوئی کے اس فن کا موجد قرار دیا جاتا ہے تو اب وہی منتہی بھی شمار ہوتے ہیں کیوں کہ اس طرزِ خاص میں ان کی وفات کے بعد کسی مرثیہ گو نے مرثیہ نہیں پڑھا۔

سید وحید الحسن ہاشمی سے قیصر بارہوی کے تعلقِ خاطر کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ ان سے انجمن آرائی کا فائدہ یہ ہوا کہ ہاشمی صاحب کے صاحب زادے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیقی دل چسپی قیصر بارہوی میں بھی پیدا ہو گئی اور انھوں نے ''آیاتِ آمنہ''......(۱۹۸۸ء)، ''منتخب مرثیے'' (۱۹۹۱ء) اور ''امتزاج'' (۱۹۹۰ء) کے عنوان سے غزلیں ان کی زندگی میں شایع کر دیں۔ وفات کے بعد ایک مجموعہ ''معتبر مرثیے'' کے عنوان سے ۱۹۹۸ء میں شایع کیا اور ۵۳ مختلف الموضوعات مرثیوں کا مجموعہ ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ اہم بات یہ کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن اب ''ہجومِ احساس'' کے عنوان سے ان کے سلام مرتب کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ''باقیاتِ قیصر بارہوی'' کی تلاش و جستجو میں بھی سرگرمِ عمل ہیں اور یہ کہنا مناسب ہے کہ قیصر بارہوی نے اپنی زندگی میں شہرت کا تعاقب کرنے کی بجائے فن کی بارگاہ میں سرِ عقیدت خم کیا اور تخلیق نگاری میں جسم و جاں کی تمام صلاحیتوں کے ساتھ مصروف رہے۔ اب وفات کے بعد ان کی شہرت کا نقش روز بروز مستحکم ہوتا چلا جا رہا ہے اور قیصر شناسی کے زاویے نکھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ ان کے فن کی تحسین سید وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر آغا سہیل، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، سید انوار ظہوری، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر عبید اللہ خان، عاشور کاظمی، مرزا امیر علی جون پوری، ڈاکٹر عارف ثاقب اور متعدد ناقدینِ اَدب نے کی ہے۔ مجھے ان کے مرثیے فرداً فرداً پڑھنے کا موقع ملتا رہا ہے اور مَیں نے چند مرثیے ان کے مخصوص لحن میں بھی سنے ہیں تاہم ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کتاب ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' میں ان سے ایک طویل ملاقات ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ بلاک نمبر ۷ سرگودھا کی مرکزی امام بارگاہ میں منبر پر بیٹھے مرثیہ پڑھ رہے ہیں اور اہلِ محفل کو احساس ہو رہا ہے کہ پوری دنیا یزیدیت کی زد میں آئی ہوئی ہے۔ حق اور صداقت پسند انسانوں پر بارود کے گولوں کی بارش برسائی جا رہی ہے۔ ظلم و استبداد کا دور دورہ ہے۔ انسانی اقدار کی پامالی ہو رہی ہے۔ دنیا مقتل بنی ہوئی ہے اور عظمتوں کے پاسبان قاتل کا کردار ادا کر رہے ہیں، اس دار و گیر میں قیصر بارہوی نوشتۂ دیوار پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں...... نہیں، نہیں، وہ خود آوازۂ حق اُبھار رہے ہیں:

قوتِ جنگ کو سمجھے ہیں، تمدّن کا نکھار قابلِ فخر نہیں دولت و نخوت کا خمار
کیا یہ اندازِ نظر ہے کسی مذہب کا وقار بات جب ہے کہ مسخر ہو خلیجِ کردار
ورنہ پھر نذرِ عدم اپنی ہی صورت ہو گی
سر سے اونچا ہوا پانی تو قیامت ہو گی

وہ جو اپنائے ہیں نخوت کا بیہی برتاؤ وہ جو سینوں میں بسائے ہیں شقاوت کا الاؤ
وہ جو رکھتے ہیں مزاجوں میں تشدد کا رچاؤ انھیں معلوم نہیں موت کے دریا کا بہاؤ
فاصلہ کوئی بھی ہو، پل میں سمٹ سکتا ہے
ایک سیارچہ گیتی کو الٹ سکتا ہے

بلاشبہ جدید دور کی مرثیہ نگاری میں قیصر بارہوی ایک گونجتا نام ہے جو زندگی کے آخری لمحات میں بھی دیکھ رہا تھا:

''پھر خیمۂ نگاہ سے تازہ دھواں اُٹھا''

قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین اور ان کی تجزیہ نگاری پر ڈاکٹر شبیہ الحسن مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(مطبوعہ۔ ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء)

◆◆◆

maablib.org

قیصر بارہوی کے مرثیے......تدوینِ تحقیق کی نادر مثال

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

◆◆

قیصر بارہوی کا نام اُردو مرثیہ نگاری کی روایت میں کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے تیرہ برس کی عمر میں غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۰ء کا زمانہ، جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا، بڑے بڑے سخن وروں کا زمانہ تھا۔ غزل اپنے احیائی دور سے گزر کر نئے سرے سے اپنے قدم جما چکی تھی اور موضوع اور اُسلوب کی سطح پر نئی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے وسیع امکانات ظاہر کر رہی تھی اور نئی لفظیات، استعاروں اور تراکیب کے ذریعے ان تازہ ہواؤں کی خبر دے رہی تھی جو علمی، تہذیبی اور فکری حوالے سے اس دَور کے اذہان کو چھو رہی تھیں۔ قیصر بارہوی اگر غزل کی صنف ہی میں جم کر شاعری کرتے تو بقول احمد ندیم قاسمی:

"کتنے ہی غزل گو حضرات کے منصب و مقام خطرے میں پڑ جاتے۔"

(قیصر بارہوی کی غزل، شام وسحر، لاہور، جون ۱۹۹۰ء، ص ۲۱)

لیکن تیرہ برس کی شعری ریاضت کے بعد جب انھوں نے چھبیس برس کی عمر میں "دُرِّ یتیم" کے عنوان سے پہلا مرثیہ قلم بند کیا تو چھیالیس بند پر مشتمل اس اوّلین مرثیے نے ان کے فکر وفن کی راہیں استوار کر دیں۔ یہ مرثیہ نہ صرف ندرتِ فکر کا شاہ کار ہے بل کہ اپنی مرصّع زبان، معنویت اور اسلوب کے حوالے سے بھی انفرادیت کا حامل ہے۔ اس مرثیے سے قیصر بارہوی کا شعری منظر نامہ ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کی اعلیٰ شعری صلاحیتوں اور استعدادوں کو اپنے اظہار کے لیے ایک وسیع میدان مل گیا جس میں انھیں اپنے جوہر دکھانے کے وسیع مواقع میسر رہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیق کے مطابق قیصر بارہوی نے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۹۶ء تک سو سے زائد مرثیے کہے تاہم ان میں تقریباً نصف تعداد ایسے مرثیوں کی ہے جو بوجوہ نامکمل رہے۔ بعض مرثیوں کے تو صرف پہلے مصرعے یا ایک دو بند ہی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب دس برس کی تلاش وجستجو کے بعد قیصر بارہوی کے ۵۳

مکمل مراثی دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان مراثی کے متن کی محققانہ چھان بین کے بعد انھوں نے اپنے مبسوط مقدمے کے ساتھ انھیں حُسنِ ترتیب سے آراستہ کیا ہے کہ یہ مجموعۂ مراثی بجائے خود ترتیب حسن کی ایک نادر مثال بن گیا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیقی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ وہ تحقیق کے تمام قدیم اور مروّجہ اصولوں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور متن کی جانچ پرکھ کے سلسلے میں دقتِ نظر سے اس کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔ بالخصوص مرثیے کے ذیل میں ان کا تحقیقی تجربہ اور تنقیدی مہارت مسلمہ ہے۔ ان کے ذہنِ رسا کے کمالات دو سو دس صفحات کے شاندار مقدمے میں ظاہر ہوتے ہیں جس میں انھوں نے قیصر بارہوی کے ترپین مراثی کے گراں قدر تحقیقی و تنقیدی جائزے کے ساتھ ان کی غزلوں، قصائد، مناقب، سلام، نوحوں، منظومات اور قطعات و رباعیات کی تعداد بھی گنوادی ہے جن پر آئندہ وہ تحقیقی کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس پر مستزاد قیصر بارہوی کی شخصیت اور سوانحی حالات ہیں جنھیں اکٹھا کرنے میں انھوں نے نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کیے ہیں۔ اور پھر انھیں اس انداز میں ترتیب دیا ہے کہ پڑھنے والا بڑی سہولت سے قیصر بارہوی کی پوری زندگی اور شخصیت کا نقشہ اپنے ذہن میں جما سکتا ہے۔ قیصر بارہوی کی شخصیت اور فن پر اب تک جو کچھ ناقدین نے لکھا ہے۔ انھیں بھی مقدمے کی زینت بنایا گیا ہے جس سے قیصر بارہوی کی اثر انگیز شخصیت بھی ابھر کر سامنے آ گئی ہے اور ان کے فن کی مختلف جہتیں بھی روشن ہو گئی ہیں۔

قیصر بارہوی کے ترپین (۵۳) مراثی کی تدوین کا کوہِ گراں سَر کرنا ایک حیرت میں ڈالنے والا کام ہے۔ لیکن شاید اس سے بھی زیادہ محیّر العقول کام ہر مرثیے کے دروں میں اُتر کر اس کی روح کو سمجھنا اور اس کے مفاہیم سے شناسائی پیدا کرنا ہے۔ قیصر بارہوی کا رثائی اُسلوب، الفاظ کے دروبست میں معانی کا رچاؤ اور صنائع بدائع کا استعمال بجائے خود محقق اور تدوین کار سے بھی اعلیٰ درجے کی سخن فہمی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے لیے صرف تحقیق یا تدوین کے اصولوں کو جاننا ہی کافی نہیں بل کہ صاحبِ فکر و نظر ہونا بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ایک ایک مرثیے کے فکری اور فنی تجزیے اور اس کے اتھاہ کو دریافت کر کے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے محقق اور مدوّن ہی نہیں بل کہ شعر کی باریکیوں پر نگاہ رکھنے والے اور اس کے فنی نظام کا تجربہ رکھنے والے ماہر تجزیہ نگار اور صاحبِ بصیرت نقاد بھی ہیں۔ اپنے مقدمے کے آخری صفحات میں انھوں نے قیصر بارہوی کے مراثی کا الگ الگ جائزہ لینے کے بعد اپنی یہ عالمانہ رائے پیش کی ہے کہ:

> "صنفِ مرثیہ کے حوالے سے موجودہ دور قیصر بارہوی کا دور ہے...... انیسؔ و دبیرؔ نے برصغیر کے تہذیبی اثرات اور واقعہ کربلا کے ہمہ گیر اثرات کو نہایت فن کاری کے ساتھ ملا جلا کر اپنے مرثیوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ قیصر بارہوی نے بھی پاکستانی طرزِ احساس اور کربلا کے اثرات کو

ایک دوسرے میں جذب کر کے مرثیوں کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب اگر ہم چاہیں تو ان مرثیوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ پاکستانی اسلامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔''

(قیصر بارہوی کے مرثیے، ص ۲۰۶، ۲۰۷)

جہاں تک ان مرثیوں کی تدوین کا تعلق ہے تو ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تدوین کے ایک سے زائد اصولوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے جس اصول کو برتا ہے، وہ ان کی مہارت اور ذہانت کی گواہی دیتا ہے۔ تالیف یا تدوین متن کے لیے عام طور پر مآخذ کی جستجو اور معیار بندی کو ضروری قرار دیا گیا ہے جس کے لیے وسائل و مصادر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ معیار کے سلسلے میں وسائل و مصادر کی درجہ بندی کر کے بہتر صورت کا انتخاب کرنا محقق کی ذہانتوں میں ایک ارفع ذہانت ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے پیشِ نظر تدوین کی پانچ صورتیں تھیں۔ اوّل: مرثیوں کی سن وار تدوین کی جائے۔ دوم: مرثیوں کی موضوعاتی تدوین کی جائے۔ سوم: مرثیوں کی فنی و فکری معیار کے حوالے سے ترجیحاتی تدوین کی جائے۔ چہارم: مرثیوں کے ممدوحین کے حفظِ مراتب کے لحاظ سے تدوین کی جائے۔ پنجم: مطبوعہ مجموعوں کی سن وار تدوین کی جائے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تدوین کی آخری صورت کا انتخاب کیا ہے اور مطبوعہ مجموعوں کی سن وار تدوین کی صورت کو اختیار کر کے مراثی کو مرتب کیا ہے۔ مجھے تدوین کی یہ صورت اس لحاظ سے بھی فطری معلوم ہوتی ہے کہ اس میں قیصر بارہوی کا اپنا ذوقِ ترتیب بھی موجود ہے اور مرتب کے لیے شاعر کی اپنی دی ہوئی ترتیب کو ملحوظ رکھنا اسے کئی تدوینی اور ترتیبی غلطیوں سے بچا لیتا ہے تاہم اس سلسلے میں انھوں نے محض مطبوعہ مجموعوں کے مختلف ایڈیشنوں پر ہی انحصار نہیں کیا بل کہ قیصر بارہوی کے ہاتھ سے لکھی ہوئی مختلف بیاضوں اور سمعی و بصری ذرائع سے بھی مدد لے کر اختلافِ متن کے مسائل کو حل کیا ہے۔ تصحیحِ متن کے سلسلے میں قیصر بارہوی کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریروں کو اوّلیت دی گئی ہے۔ جہاں یہ تحریریں دستیاب نہ تھیں وہاں آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے جدید تکنیک سے استفادہ کیا گیا ہے۔ املا کے سلسلے میں رائج املا کو ترجیح دی گئی ہے تا کہ قارئین کے لیے مرثیوں کی تفہیم مشکل نہ رہے۔

یوں تو میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ہر تحقیقی کام کو ان کی بے پناہ ریاضت اور محنت کے سبب ان کا کارنامہ خیال کرتا ہوں لیکن ان کا یہ تازہ کام ان کے کئی دیگر کارناموں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس اہم کارنامے کو سرانجام دینے پر اہلِ علم و ادب اور قیصر بارہوی کے مداحین ان کے ممنونِ احسان رہیں گے۔

◆◆◆

قیصر بارہوی کے مرثیے

(ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا بے مثال کارنامہ)

عمران نقوی

◆◆

اُردو تحقیق اور تنقید کی دنیا میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی بیس سے زیادہ مطبوعہ کتب ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے آہستہ آہستہ اُردو شعر و اَدب کے سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ خاص طور پر درست متن کی تدوین کے حوالے سے ان کے ہر کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے العطش اور طاہرین کے عنوان سے سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں، نعتوں، سلاموں اور منقبتوں کو جس معیار اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ حال ہی میں انھوں نے معروف مرثیہ نگار قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کی تدوین ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' کے عنوان سے کر کے ایک گراں قدر علمی و ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اُردو مرثیے کی تحقیق اور تنقید پر بے مثال کام کیا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ سے لے کر سیف زلفی تک مرثیے کی تاریخ مرتب کی ہے اور بہت سے شعرا کے مرثیوں کو یک جا کر دیا ہے۔ اس وقت لاہور کی حد تک تو انھیں اُردو مرثیے پر ''اتھارٹی'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی تازہ ترین تدوین ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی وقیع اور اہم ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اس کتاب کو انتہائی دیدہ زیب، خوب صورت اور نفیس شکل میں طبع کرایا ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر گیارہ سو چار (۱۱۰۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے دو حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں ان کا دو سو دس (۲۱۰) صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ ہے جس میں انھوں نے قیصر بارہوی کے سوانحی حالات، ان کے ترپن (۵۳) مرثیوں کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ، بیسویں صدی میں قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات اور اُردو مرثیے پر قیصر بارہوی کی

مرثیہ نگاری کے اثرات کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں انھوں نے اس کتاب کی تدوین کے طریقۂ کار کے حوالے سے چند معروضات پیش کیے ہیں۔ یہ طویل مقدمہ ایک جانب تو قیصر فہمی اور قیصر شناسی کے لیے نئے نئے در وا کرتا ہے اور دوسری جانب تدوین متن کے لیے چند نئے اصول وضع کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا یہ مقدمہ نئے لکھنے والوں کے لیے رہ نمائی کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے دعوا کیا ہے کہ انھوں نے ان عسیر الحصول مرثیوں کی تلاش و جستجو میں دس برس کا عرصہ صرف کیا ہے اور مختلف متون کو پیش نگاہ رکھ کر انھیں مدوّن کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں شاید قیصر بارہوی وہ پہلے خوش قسمت مرثیہ نگار ہیں جن کے ترپن مرثیے ایک جلد میں درست متن کے ساتھ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے انتہائی عمیق نگاہی اور دانائی سے ان مرثیوں کو مدوّن کر کے ایک جانب تو قیصر بارہوی کے کلام کو دست بردِ زمانہ سے محفوظ کر دیا ہے اور دوسری جانب مرثیے کے شیدائیوں کے لیے ایک ایسی دستاویز مرتب کر دی ہے جو ان کے ذوق کی تسکین کرتی رہے گی۔

◆◆◆

قیصر بارہوی کے مرثیے......

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیقی و تنقیدی شبیہ

ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی

◆◆

تنقید کی بنیاد تحقیق پر رکھی جاتی ہے۔ یوں تحقیق کو تنقید کے حوالے سے خشتِ اوّل اور اساس کی حیثیت حاصل ہے۔ جب تک متن کی صحت شکوک و شبہات سے بالاتر نہ ہو تو تنقید معتبر کیسے ہو سکتی ہے۔ اس حقیقت کے روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے کے باوجود ستم ظریفی یہ ہے کہ ایسے شعرا کے فن پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں یا لکھے جا چکے ہیں جن کا کلام ہنوز تدوین کا منتظر ہے اور اس کلام میں الحاقی کلام کا اچھا خاصا عمل دخل نظر آتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ شعرا کے کلام کے متن کی جدید سائنسی انداز میں تدوین کی جائے تاکہ ظن و تخمین کے بجائے تیقن اور اعتبار کے ساتھ کلام کے تجزیے اور تنقید کے عمل کو معتبر سمجھا جائے۔

متن کی تدوین ایک باقاعدہ فن ہے اور ہر فن کی طرح اس کے مبادیات اور معیارات سے آگہی ضروری ہے۔ متن کی تدوین محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اس لیے کہ جو الفاظ شاعر کے موئے قلم سے نکلے ہوں ان کی بازیابی آسان نہیں۔ بسا اوقات مطبوعہ متن بھی بوجوہ ساقط الاعتبار ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ ایڈیشنز کی موجودگی میں تو یہ قطرہ اور بھی بڑھ جاتا ہے اس لیے کہ جب تک صحت انتساب اور صحت متن دونوں حوالوں سے مستند شواہد موجود نہ ہوں کسی شاعر کے کلام کا انتساب قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ حذف و اضافے کے حوالے سے بھی مطبوعہ دواوین کا معاملہ ہمارے سامنے ہے اور تاریخ اس سلسلے میں بہت سے گواہ پیش کر سکتی ہے۔ تصرف کی زد میں آ کر کلام کا تبدیل ہو جانا بھی عام ہے اور کبھی شاعر کے چاہنے والے بھی اپنے محبوب کے کلام میں اپنے تئیں کوئی سقم دیکھتے ہیں اور اصلاح کا فرض کفایہ ادا کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ شاعر نے بعد اشاعت اپنے کلام پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کی اور مصرعے کے مصرعے بدل ڈالے لیکن کلام کی اشاعت اولین ہی کو بنیاد بنا کر کلام کی تدوین کر دی گئی۔

اسباب کچھ بھی ہوں تدوین کے بنیادی اصولوں اور تقاضوں سے صرفِ نظر کرنے کی صورت میں جہاں مدوّن کی عزت پر حرف آتا ہے وہاں صحتِ متن کے بارے میں بھی شکوک وشبہات اُبھرنے لگتے ہیں اس لیے کہ:

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک طویل عرصے سے تحقیق وتنقید کے میدان میں موجود ہیں۔ان کی کم وبیش پچیس سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی فتوحات منظرِ عام پر آ کر اہلِ دانش وبینش سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔علاوہ ازیں ایک اُستاد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ایم۔اے اور ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کرنے والے طلبہ کی رہ نمائی بھی کی ہے اور ان کی نگرانی میں مکمل ہونے والا تحقیقی کام شائع بھی ہو چکا ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک مستند اور کہنہ مشق محقق اور معتبر نقاد کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔

تدوینِ متن کے حوالے سے ان کا اوّلین کارنامہ سیّد آلِ رضا کے کلام کی تدوین ہے جس میں انھوں نے متنی تحقیق کے مسلمہ اُصولوں کو نہایت سلیقے سے برتا اور ایک معتبر محقق کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔اس کے بعد ان کی بیسیوں تحقیقی وتنقیدی کتب شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی حال ہی میں (جنوری ۲۰۰۷ء) شائع ہونے والی کتاب ''قیصر بارہوی کے مرثیے۔تجزیہ وتدوین'' ایک تحقیقی وتنقیدی کاوش ہے۔اس کاوش سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے مطالعے کی گہرائی اور گیرائی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔یہ مرثیے کا تفصیلی تعارف تحقیق سے ان کی دل چسپی اور ہر مرثیے پر تنقید ان کی تنقیدی بصیرت کا معتبر ثبوت ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے تدوینِ متن سے قبل کم وبیش ۲۰۰ صفحات (ص ۲۱ تا ص ۲۱۰) پر محیط ایک طویل مقدمہ تحریر کیا ہے لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ مقدمہ ایک الگ مکمل تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' دو حصوں میں منقسم ہیں۔پہلے حصے میں قیصر بارہوی مرحوم کی شخصیت اور ان کے فکر وفن کے حوالے سے جو مستند اور معتبر مواد پیش کیا گیا ہے اسے قیصر فہمی کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔قیصر بارہوی کو بیسویں صدی کے مرثیہ نگاروں میں جو اختصاص حاصل ہے اس پر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے سیر حاصل بحث کی ہے۔انھوں نے مختلف نامور محققین اور ناقدین کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ قیصر بارہوی نے نہ صرف جدید مختصر مرثیے کو زندہ رکھنے کی کوشش کی بل کہ مرثیے کو مخصوص مذہبی حلقے تک محدود رکھنے کے بجائے اسے آفاقی قدروں کا ترجمان بنانے اور ہر مکتبِ فکر کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے بیسویں صدی کے مجموعی طرزِ احساس سے ہم آہنگ کرنے میں اپنا زورِ قلم صرف کیا ہے۔

قیصر بارہوی ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے والد ماجد وحیدِ عصر سیّد وحید الحسن کے قریبی دوستوں میں شامل

تھے۔ جدید مختصر مرثیے کو رواج دینے میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی شبانہ روز کاوشوں کی بدولت مختصر مرثیے کی روایت آگے بڑھی اور سائنسی دَور کے افادی نظریات کی گھن گرج میں مرثیے کو آفاقی قدروں کی ترجمانی کے حوالے سے ایک مؤثر ذریعے کی حیثیت سے زندہ رہنے کا جواز فراہم کیا۔

''جدید اُردو مرثیہ اور قیصر بارہوی کا اختصاص'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے بیسویں صدی کے جدید اَدبی نظریات و میلانات اور سیاسی و سماجی صورتِ حال کے حوالے سے قیصر بارہوی کی اہمیت بیان کی ہے۔ ان کا موقف ہے کہ قیصر بارہوی نے مرثیے کی مذہبی اہمیت برقرار رکھتے ہوئے اس صنف میں فکر انگیز اور اجتہادی تبدیلیاں کیں۔ ان کا شمار بیسویں صدی کی اس صفِ اوّل کے مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے جس میں جوشؔ ملیح آبادی، سیّد آلِ رضاؔ، جمیلؔ مظہری، نسیمؔ امروہوی، نجمؔ آفندی اور سید وحیدالحسن ہاشمی ایسے نوگزے شامل ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے عہدِ طفولیت ہی سے قیصر بارہوی کو اپنے والد ماجد سیّد وحیدالحسن ہاشمی کے احباب میں شامل دیکھا۔ جوں جوں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا شعور پختہ ہوتا گیا قیصر بارہوی (مرحوم) سے ان کی جذباتی اور قلبی وابستگی میں اضافہ ہوتا رہا چناں چہ قیصر بارہوی کی شخصیت اور فن پر ایم۔فل کی سطح پہ تحقیقی و تنقیدی کام کے لیے انھوں نے پروفیسر ہارون قادر کو آمادہ کیا۔ قیصر بارہوی کے مرثیوں کا انتخاب، منتخب مرثیے، آیاتِ آمنہ، شام وسحر کا قیصر بارہوی نمبر اور اب ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' قیصر بارہوی سے سیّد شبیہ الحسن کی اسی جذباتی اور قلبی لگاؤ کا عملی ثبوت ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی وجہ تصنیف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ''قیصر بارہوی کی رحلت کے بعد ناقدین نے انھیں یک سر فراموش کر دیا۔ اِدھر اُدھر چھپنے والی تعزیتی تحریریں چھوڑ کر ان پر کوئی مبسوط تحقیقی کام نہیں ہو سکا۔ راقم الحروف کی دلی خواہش تھی کہ قیصر بارہوی کے تمام مرثیے یک جا ہو جائیں اور اعزاز کے ساتھ طبع ہوں۔ راقم الحروف کا یہ خواب تعبیر کی منزل میں داخل ہو چکا ہے کہ ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' کے عنوان سے راقم الحروف نے قیصر بارہوی کے ترپن مرثیے یک جا کر دیے ہیں۔''

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی مذکورہ بالا خواہش محض ایک جذباتی فیصلہ نہیں اور اس کتاب کی ضخامت سے وہ قارئین کو متاثر یا مرعوب نہیں کرنا چاہتے۔ اس لیے کہ اس سے قبل ان کی کم و بیش ۲۵ سے زائد تحقیقی کتب منظر عام پر آ چکی ہیں اور اَدبی حلقوں میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک معتبر نام ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کی ایک اور اہم وجہ ادب دوستی کا وہ جذبہ ہے جو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو پارے کی مانند مضطرب، بے قرار اور بے چین کیے رکھتا ہے اس اَدب نواز جذبے کے تحت انھوں نے یہ محسوس کیا کہ قیصر بارہوی کے تمام مرثیے مدوّن شکل میں یک جا نہ ہوئے تو یہ اَدبی سرمایہ دریا برد ہو جائے گا اور آنے والے دَور کے نقاد کی دیوارِ تنقید کسی صورت بھی سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ اسی مثبت اندازِ فکر نے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو اس مشقت طلب اور صبر آزما تحقیقی کام

پر آمادہ کیا۔ ''کچھ قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین کے بارے میں'' کے عنوان سے موصوف رقم طراز ہیں:

''بیسویں صدی میں جس مرثیہ نگار کے صنف مرثیہ کو اعتبار بخشا وہ قیصر بارہوی ہیں۔ یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ ان کی رحلت کے بعد ان کی شخصیت اور فن پر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔ راقم الحروف کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کو مدون کرے۔ تقریباً دس برس کی محنت شاقہ کے بعد کتاب ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔''

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کی تدوین خاصی سوچ بچار سے کام لیا ہے اور انھیں اس ترتیب سے مدون کیا ہے جس ترتیب سے وہ اشاعت پذیر ہوئے۔ اس انداز تدوین یعنی زمانی ترتیب سے قیصر بارہوی کے ذہنی ارتقا اور عہد بہ عہد بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی اور ادبی و مذہبی تناظر میں ان مرثیوں کی تفہیم آسان ہو گئی ہے۔ ان مرثیوں کو مدون کرتے وقت قیصر بارہوی کی بیاضوں، آڈیو اور ویڈیو کیسٹس سے مدد لی گئی ہے اور مطبوعہ مرثیوں کے مختلف ایڈیشنوں میں جہاں اختلاف متن پایا گیا وہاں بیاضوں کو ترجیح دی گئی کہ بنیادی مآخذ کو بہر حال معتبر اور مستند سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے تدوینِ متن کے مسلمہ سائنٹفک اصولوں کی ہر حال میں پاسداری کی ہے اور سہل انگاری سے کام نہیں لیا۔ خوش قسمتی سے انھیں وحیدِ عصر سید وحید الحسن ہاشمی ایسے محقق مرثیہ نگار اور اُستاد شاعر کی دست گیری بھی حاصل رہی۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے شعوری سطح پر حتی المقدور یہ کوشش کی ہے کہ ایک طرف تو قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کو اس طرح مدون کیا جائے کہ وہ ایک معتبر اور مستند دستاویز کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں تا کہ مستقبل کا محقق اور نقاد قیصر بارہوی کے فن مرثیہ کے بارے میں جو تنقیدی رائے قائم کرے اس کی اساس معتبر ہو اور دوسری جانب قیصر بارہوی کی شخصیت اور ان کے فنِ شاعری کے بارے میں غور و فکر کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں کے لیے بھی خاطر خواہ انتظام کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں مرثیوں کے متن سے قبل ''قیصر بارہوی کے سوانحی کوائف اور اعترافات'' کے عنوان سے مستند اور معتبر معروف حوالوں کی روشنی میں قیصر بارہوی کے کوائف، تعلیم، عقد، اولاد، ملازمت، سبک دوشی، ابتدائے سخن، سخن زاری، نثری کاوش، شعری تصانیف، اُدب پروری، اعزازات اور اسفار کے ذیلی عناوین کے تحت اہم اور معتبر معلومات فراہم کر دی ہیں اس کے بعد ''قیصر بارہوی کی شخصیت اور فن کے بارے میں شائع ہونے والی تحریریں'' کے عنوان سے عہدِ حاضر کے نامور مستند اور معتبر اہلِ دانش و بینش، محققین اور ناقدین کی تحریروں کی فہرست پیش کی گئی ہے تا کہ قیصر بارہوی کی شخصیت اور ان کے فن سے دل چسپی رکھنے والوں کے ذوقِ مطالعہ کی تشنگی کا خاطر خواہ سامان مہیا کیا جا سکے۔

قیصر شناسی کے حوالے سے جن اہلِ قلم کی نگارشات کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر ہارون قادر، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر عبیداللہ خاں، ڈاکٹر عباس رضا، ڈاکٹر طارق عزیز اور ڈاکٹر فخرالحق نوری ایسے نابغے شامل ہیں۔

علاوہ ازیں جن نگارشات میں قیصر بارہوی کا کوئی حوالہ موجود ہے ان کی نشان دہی بھی نہایت تفصیل سے کر دی گئی ہے۔ ان کتب میں عاشور کاظمی کی ''اُردو مرثیے کا سفر''، ڈاکٹر اسد اریب کی ''اُردو مرثیے کی سرگذشت''، ڈاکٹر ہلال نقوی کی ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ''، ضمیر اختر نقوی کی ''اُردو مرثیہ پاکستان میں''، ڈاکٹر عارف ثاقب کی ''تنقید''، ڈاکٹر محمد ہارون قادر کی ''قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری''، سیّد وحید الحسن ہاشمی کی ''ھل من ناصر'' اور یہ راقم الحروف کی ''نجم آفندی۔ شخصیت وفن'' شامل ہیں۔

قیصر فہمی کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عاصی کرنالی، پروفیسر سجاد رضوی، ڈاکٹر مسعود رضا خاکی، پروفیسر سجاد حارث، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر میمونہ انصاری، پروفیسر حق نواز، ڈاکٹر عبدالکریم خالد اور وحید عصر سید وحید الحسن ہاشمی ایسے معروف اہلِ قلم اساتذہ کی آرا کو من وعن پیش کر دیا گیا ہے۔

معروف شعرا کی جانب سے قیصر بارہوی کو پیش کیا جانے والا منظوم خراجِ تحسین بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ ان شعرا میں شاہد نقوی، سیّد ظہور جارچوی، نیساں اکبرآبادی، ظفر شارب، پروفیسر جعفر بلوچ، سیّد عاصم گیلانی، حسن عباس زیدی، ولی کرنالی، طاہر ناصر علی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، حشمت علی قمر اور وحید عصر سیّد وحید الحسن ہاشمی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

جہاں تک اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا تعلق ہے تو میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی اس تحقیقی وتنقیدی کاوش سے مستقبل کا نقاد بیش از بیش فائدہ اٹھائے گا اور اندھیرے میں ٹامک ٹویاں مارنے کے بجائے اپنی تنقید کو اس تحقیق کی روشنی میں حقیقی منزل کی جانب آگے بڑھا سکے گا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کی سوانح اور ان کے فن کے حوالے سے جو کچھ بھی سپردِ قلم کیا ہے اس کے استناد میں حواشی کا مناسب استعمال کرتے ہوئے اپنے معتبر اور سلیقہ مند محقق ہونے کا ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ وہ کوئی بات بھی بغیر حوالے کے نہیں کرتے لیکن حوالے اور حوالہ سازی کے فرق سے بخوبی آگاہ ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اس حوالے کو ''فٹ نوٹ'' میں جگہ دیتے ہیں جس کی تحقیقی ضرورت افادیت پر انھیں پورا اعتماد اور اعتبار ہوتا ہے۔

''قیصر بارہوی کے مرثیے...... تجزیہ وتدوین'' ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اس تصنیف سے جہاں قیصر شناسی میں بھرپور مدد ملتی ہے وہاں یہ کتاب شبیہ شناسی کے حوالے سے بھی ایک معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس آئینے میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ادبی شبیہ جلوہ گر ہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی کارنامہ۔ قیصر بارہوی کے مرثیے

ڈاکٹر عباس رضا

◆◆

عصرِ حاضر میں ایسے محققین اور ناقدین کی تعداد بے حد قلیل ہے جو تحقیق و تنقید کے میدان میں تن دہی اور دل جمعی کے ساتھ کام کر رہے ہوں۔ تحقیق بطور خاص مسلسل محنت اور لگن کی طلب گار ہے۔ خاص طور پر محقق کو متن کی تدوین کے لیے جو پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں اس کا بیان بھی مشکل ہے۔ یہی سبب ہے کہ عہدِ جدید میں متن کی تدوین میں جو تساہلی دیکھنے میں آ رہی ہے وہ قابلِ صد افسوس ہے۔ یہ امر باعث مسرّت ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے تحقیق اور تنقید کے ساتھ ساتھ متن کی تدوین کی جانب بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ انھوں نے حبیبؔ جون پوری کے کلام کو صحتِ متن کے ساتھ ''کلیاتِ حبیبؔ'' کے نام سے مدوّن کیا۔ آلِ رضاؔ لکھنوی کے غیر مطبوعہ کلام کی ''باقیاتِ آلِ رضاؔ'' کے نام سے تدوین کی۔ سیف زلفی کے گم شدہ چار مرثیوں کی ''سیف زلفی کے مرثیے'' کے عنوان سے جمع آوری کی۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کو ''العطش'' کے عنوان سے ترتیب دیا۔ اسی طرح ''طاہرین'' کے نام سے سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، منقبتیں اور سلام مدوّن کیے۔ اس تمام تدوینی عمل میں انھوں نے تحقیق اور تدوینِ متن کے جدید اصولوں کو پیشِ نظر رکھا اور خود بھی تدوین کے نئے اصول مرتب کیے۔ انھوں نے ہر کتاب کی ترتیب و تدوین کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالی اور طویل مقدمات لکھ کر ان کی معنویت اور اَدبی حیثیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تدوینی کارناموں کو پیشِ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ عصرِ حاضر کے بہترین تدوین کار اور محقق و نقاد ہیں۔ حال ہی میں اُن کی کتاب 'قیصر بارہوی کے مرثیے' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ ذیل میں اس کتاب کے حوالے سے چند معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی معروف و مقبول کتاب ''شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی

کے مرثیے، تجزیہ وتدوین'' ۲۰۰۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ ۱۱۰۴ صفحات پر مشتمل اس نادرو یادگار دستاویز کو اظہار سنز نے لاہور سے بڑی آب وتاب سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ کتاب بیسویں صدی کے نامور نعت نگار، مشہور منقبت گو، مقبول سلام نگار اور جدید مرثیہ نگار حضرت سیّد وحید الحسن ہاشمی، ایک علم دوست شخصیت شیخ کامران مہدی کے والدین مرحومین، مرثیہ فہم الحاج شیخ ولی محمد اور صاحب فہم وذکا واصف علی حیدری کے نام منسوب کی ہے۔

اُردو میں مقدمہ نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے والوں میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا اسمِ گرامی سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے اس کتاب کا بھی ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مقدمہ کو انھوں نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

ا) قیصر بارہوی کے سوانحی کوائف اور اعترافات۔

ب) قیصر بارہوی کے مرثیوں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔

ج) جدید اُردو مرثیہ اور قیصر بارہوی کا اختصاص۔

د) کچھ قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین کے بارے میں۔

حصہ اوّل میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کا سوانحی خاکہ مرتب کیا ہے اور برصغیر پاک وہند کے معروف ناقدین اور دانش وروں کی قیصر بارہوی کے فن کے حوالے سے آرا ترتیب دی ہیں۔ حصہ دوم میں قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کا تجزیاتی مطالعہ خاکوں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے اور ہر مرثیہ کے فکری اور فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حصہ سوم میں مختلف تحقیقی اور تنقیدی آرا کی روشنی میں جدید اُردو مرثیے میں قیصر بارہوی کے مرثیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اُردو مرثیے کی تاریخ میں قیصر بارہوی کے اختصاص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حصہ چہارم میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے جدید تحقیق وتدوین کے اصولوں کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے اس کتاب کی تسوید کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا یہ مبسوط مقدمہ ان کی علمی، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا منھ بولتا ثبوت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس مقدمہ کی روشنی میں اس کتاب کے مطالعہ کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس مقدمہ میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کے جملہ فنی وفکری محاسن کو انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ آپ اس مقدمے کا صرف ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ انیسؔ و دبیرؔ نے برصغیر کے تہذیبی اثرات اور واقعۂ کربلا کے ہمہ گیر اثرات کو نہایت فن کاری کے ساتھ ملا جلا کر اپنے مرثیوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ اب اسی معروضے کی روشنی میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قیصر بارہوی نے بھی پاکستانی طرزِ احساس اور کربلا کے اثرات کو ایک دوسرے میں جذب کر کے مرثیوں کی

صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب اگر ہم چاہیں تو ان مرثیوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ پاکستانی اسلامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تدوین کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے ترتیب و تدوین کے جدید اُصولوں کو وضع کیا ہے اور تدوین متن کو نئے نئے ذائقوں سے روشناس کرایا ہے۔ "قیصر بارہوی کے مرثیے" ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی صناعانہ صلاحیتوں کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس کتاب میں قیصر بارہوی کے درج ذیل تریپن مرثیے شامل ہیں:

۱ دُرِ یتیم — انسان رہنمائے حقیقت تلاش کر

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کارنامے اور شہادتِ امام حسینؑ)

۲ شہرِ معلّیٰ — معراج عقل و فکر ہے سودائے کربلا

(صحرائے کربلا کی عظمت اور مصائب اہلِ بیتؑ)

۳ عزّتِ وجود — شبیرؑ کائنات کی عزّت کا نام ہے

(امام حسینؑ کی فضیلتیں اور مصائب کربلا)

۴ پیکرِ عظمت — تو اعتبار نفس کا جوہر ہے اے حسینؑ

(امام حسینؑ کے کارنامے اور شہادتِ عظمیٰ)

۵ معراجِ وفا — کس باوفا کے نام سے نامِ وفا ہے آج

(حضرت عباسؑ کی شجاعت اور میدانِ کربلا میں وفاداری کے مظاہر)

۶ جہادِ زینبؑ — پھر آ گیا ہونٹوں پہ دُھواں آتشِ غم سے

(حضرت زینبؑ کے فضائل اور اسیری کے واقعات)

۷ یتیمانِ مسلمؑ — دل والو سنو، واقعۂ اشک فشانی

(حضرتِ مسلمؑ کے صاحب زادوں کی کوفہ آمد اور مصائب)

۸ شامِ غریباں — پھر خیمۂ نگاہ سے تازہ دھواں اُٹھا

(امام حسینؑ کی شہادت کے بعد رونما ہونے والے الم ناک واقعات)

۹ نوائے احساس — لطفِ حیات میری پریشانیوں میں ہے

(کربلا کے میدان میں حضرت علی اصغرؑ کی شہادت)

۱۰ حسینؑ اور انتخاب — انسان کی نگاہ میں آبِ حیات ہے

(دنیا میں کامیابی کے لیے اصحاب و انصارِ حسینؑ کے طرزِ عمل کو اپنانا)

۱۱	صبحِ مودّت	رازِ بقا ہے خدمتِ آلِ رسولؐ میں

(کنیزِ بتولؑ حضرت فضّہؓ کی شخصیت اور میدانِ کربلا میں اُن کی خدمات)

۱۲	علمِ علیؑ	میری زباں پہ علمِ علیؑ کا بیان ہے

(بابِ مدینۃ العلم حضرت علیؑ کے علم کا بیان)

۱۳	اعجازِ تحمل	زنجیرِ تخیل میں گرفتار ہیں آنسو

(حضرتِ سیّد سجادؑ کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کا احاطہ)

۱۴	اُجالوں کا سفر	شمعِ توحید فروزاں ہوئی زندانوں میں

(حضرت امام علی نقیؑ کی سیرت اور قید و بند کی صعوبتیں)

۱۵	معراجِ بشر	نماز سے بشریت عروج پاتی ہے

(نماز کی فضیلت اور نماز کے قیام کے لیے اہلِ بیتؑ کی قربانیاں)

۱۶	معصومۂ کربلا	زینبؑ کے نام سے ہے بقائے حسینیتؑ

(حضرت زینبؑ کی سیرت اور قائدانہ صلاحیتوں کا بیان)

۱۷	یوسفِ حسینؑ	دشتِ جہاں میں کون شکارِ اجل نہیں

(موت کی اہمیت اور کربلا کے میدان میں حضرت علی اکبرؑ کا کردار)

۱۸	عرفانِ حیات	فکر سے پیار کی تصویر بناتا ہوں میں

(حضرتِ حرؓ کی سیرت اور کربلا کے میدان میں قربانیاں)

۱۹	سبطینِ مرتضیٰؑ	حیراں ہوں کیا فضائلِ زینبؑ رقم کروں

(جنابِ زینبؑ کے صاحب زادوں حضرت عونؑ اور حضرت محمدؑ کے کارنامے)

۲۰	آشوبِ عصر	ظلمتیں پھولتی پھلتی ہیں خدا خیر کرے

(اصلاحِ معاشرہ کے لیے امام حسینؑ کی کاوشیں اور اہلِ بیتؑ کے مصائب)

۲۱	مظلومیت	مظلومیت شعور کے خنجر کی دھار ہے

(انسانی زندگی میں مظلومیت کی اہمیت اور حسینیؑ خانوادے کی مظلومیت)

۲۲	انسان اور کربلا	انسان کو عظیم بناتی ہے کربلا

(کربلا کی افادیت، دبستانِ کربلا کے اثرات اور اہلِ بیتؑ کی قربانیاں)

۲۳	علمِ غیب اور محمدؐ و آلِ محمدؐ	عالمِ غیب سے ملتے ہیں مضامینِ سخن

(علمِ غیب کی اہمیت اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کی علمِ غیب پر دسترس)

۲۴ کعبہ و محافظانِ کعبہ اے اہلِ فکر کعبۂ دل کی اذاں سنو

(کعبہ کی عظمت اور کعبہ کے تحفظ کے لیے امام حسینؑ کی قربانیاں)

۲۵ بے ثباتی عالم مسافرانِ عدم کا سفر، ارے توبہ

(دنیا کی ناپائیداری اور کربلا میں پائیدار ہستی کے نمونے)

۲۶ سیدِ مسمومؑ شہرِ تاریخ سے مسموم ہوا آتی ہے

(امام حسنؑ کی سیرت اور اُن کی شہادت کے دل خراش مناظر)

۲۷ عرفانِ امامت کیا چاہتا ہے آج کا انساں، یہ سوچیے

(عصرِ حاضر میں انسان کی پریشاں خیالی اور حضرت علیؑ کی شہادت)

۲۸ نمازِ دل دل ہے تو زندگی کے چمن میں بہار ہے

(انسانی زندگی میں دل کی اہمیت اور اسلام کی خاطر اہلِ بیتؑ کی قربانیاں)

۲۹ نظامِ اسلام امنِ عالم کی ضمانت ہے نظامِ اسلام

(مضبوط نظام کے لیے اسلامی تعلیمات کی ضرورت اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کی کاوشیں)

۳۰ کربلا و نجف جدید عہدِ سخن کا نظام لایا ہوں

(دیارِ نجف و کربلا کی اہمیت اور حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کی قربانیاں)

۳۱ عظمتِ فن کیا کیا چراغ اہلِ بصیرت جلا گئے

(اہلِ بصیرت کی علم و ادب سے وابستگی اور نسیم امروہوی کی خدمات)

۳۲ مدحِ ابوطالبؑ مدحِ ابوطالبؑ میں ہے اندازِ بیاں اور

(حضرتِ ابوطالبؑ کے فضائل اور اُن کے خانوادے کی قربانیاں)

۳۳ آیاتِ آمنہؑ ابھرا ہے لوحِ فکر پہ اک لازوال نام

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہا کی سیرت اور کارنامے)

۳۴ عروجِ عالمِ نسواں عروجِ عالمِ نسواں ہے ماجرائے سخن

(حضرت فاطمہؑ کی سیرت و کردار کا احاطہ اور اُن کے خانوادے کی قربانیاں)

۳۵ عشقِ حسینؑ میں جو گزرتا ہے دوستو

(حضرت مسلم بن عقیلؑ کی سیرت کے پہلو اور کوفے میں ان کے مصائب)

۳۶ عباسِ نامدارؑ عباسؑ نامدار کو جوشِ نبرد ہے

(حضرت عباسؑ کی کربلا میں بے مثال شجاعت اور اُن کی شہادت)

۳۷ سخنِ لاجواب — یارب مری زبان کو سخن لاجواب دے

(حضرت علی اکبرؑ کی سیرت کے نمایاں محاسن اور شہادت)

۳۸ یوسفِ کربلا — حسینؑ لاشۂ اکبرؑ تلاش کرتے ہیں

(کربلا کے میدان میں حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے دل خراش مناظر)

۳۹ ہفت اقلیم — ہفت اقلیم سے بہتر ہے مقدر میرا

(حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی سیرت اور بغداد میں اُن پر ہونے والے مظالم)

۴۰ آبروئے فکر — دوستو انسان کے اندر بھی اک انسان ہے

(صحابیِ رسولؐ حضرت بلالؓ کی سیرت کے نمایاں رُخ اور کربلا میں اذانِ صبح)

۴۱ شاہدِ محشر — دنیا میں نیا بابِ سخن کھول رہا ہوں

(حضرت جبریلؑ کے کارنامے اور محمدؐ و آلِ محمدؐ سے اُن کی والہانہ عقیدت کے مظاہر)

۴۲ وحدتِ مذہب — فکرِ مذہب ہے تو مذہب کی حقیقت سمجھو

(عصرِ حاضر میں مذہب کی ضرورت اور امام عالی مقامؑ کی قربانیاں)

۴۳ تربیت — تربیت سے آدمی کے ذہن کی تعمیر ہے

(رسول اکرمؐ کی تربیت میں حضرت ابوطالبؑ کا کردار اور عونؑ و محمدؑ کی قربانیاں)

۴۴ آئینۂ انقلاب — ماہِ محرم آئینۂ انقلاب ہے

(غمِ حسینؑ کی فضیلت، کربلا میں امام علیہ السلام کی جنگ اور شہادت)

۴۵ معراجِ نفس — خدا کے شہر سے گزرا جو کاروانِ خیال

(روزے کی فضیلت اور حضرت علیؑ کی شہادت)

۴۶ قرآن کی کہانی — قرآن کے ہونٹوں پہ جو فریاد ہے سُن لو

(قرآن کی فضیلت اور کربلا میں امامِ حسینؑ کی نیزے پر قرآن کی تلاوت)

۴۷ جنابِ سیّدہؑ — رکھیے کتابِ سیرتِ زہراؑ نگاہ میں

(جنابِ فاطمہؑ کی زندگی اور رسولِ خداؐ کے بعد اُن پر ہونے والے مظالم)

۴۸ جنابِ فاطمہ بنتِ اسدؑ — زوجِ ابوطالبؑ کا شرف حسن شرف ہے

(حضرت فاطمہؑ بنتِ اسدؑ کی سیرت کا جائزہ اور جنابِ زینبؑ کی شہادت)

۴۹ عزاداریِ حسینؑ — انساں کی آبرو ہے عزاداریِ حسینؑ

(عزاداری کی اہمیت، عزاداروں کے مصائب اور جنابِ زینبؑ کے بین)

۵۰ شاعرِ دربارِ حسینؑ میں شاعرِ دربارِ حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں

(دربارِ حسینؑ کے شاعر کا منصب اور دربارِ یزید میں جنابِ زینبؑ اور سیدِ سجادؑ کے خطبات)

۵۱ فریاد اے جبرئیلؑ نگر، مدینہ دکھا مجھے

(شاعر کا رسولؐ خدا سے فریاد کرنا، آلِ رسولؐ کے مصائب اور جنابِ فاطمہؑ کا اضطراب)

۵۲ مولانا محمد مصطفےٰ جوہر منظر میں آبروئے گلستاں گلاب ہے

(مولانا مصطفےٰ جوہر کے سوانحی کوائف اور عاشورۂ محرم کے حالات)

۵۳ روشنیِ فکر و عمل آیئے خانۂ معبود کی تحریر پڑھیں

(خانۂ کعبہ کی عظمت، حضرت علیؑ کی ولادت اور شہادت)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے شاعرِ حسینیت حضرت قیصر بارہوی کے درج بالا ترپن مرثیے مرتب کر کے ایک جانب تو ان گراں قدر مرثیوں کو تلف ہونے سے بچا لیا ہے اور دوسری جانب قیصر بارہوی کو جدید اُردو مرثیے کی تاریخ میں ممتاز مقام دلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کے فلیپ پر عصرِ حاضر کے نامور محقق، نقاد اور دانش ور **ڈاکٹر وحید قریشی** رقم طراز ہیں:

"پاکستان میں اُردو مرثیے کی روایت کو مستحکم کرنے میں جن مرثیہ نگاروں نے اہم کردار ادا کیا ہے اُن میں قیصر بارہوی کا نام خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ میرے نزدیک قیصر بارہوی کا خاص وصف یہ ہے کہ اُنھوں نے مرثیے کی لکھنوی روایت کو قائم رکھتے ہوئے معاصر زندگی کو مرثیہ کا اہم حصہ بنا لیا ہے۔ وہ مرثیے کے ایک اہم شاعر تھے لیکن اپنی زندگی میں انھوں نے اپنے کام کو مدوّن نہیں کیا۔ اس لیے اُن کی رحلت کے چند برس بعد ہی اُن کے مرثیے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے طویل عرصے کی تلاش و جستجو کے بعد مرحوم کے مسودات کو سامنے رکھ کر تمام مرثیوں کو انتہائی سلیقے سے یک جا کر دیا ہے۔ اُن کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ اُن باکمال مصنفین میں سے ہیں جنھوں نے اُردو مرثیے پر بیش بہا کام کیا ہے اور مرثیہ نگاری کی تاریخ کو مربوط کر دیا ہے۔ قیصر بارہوی کے مرثیوں کی یہ تدوین اہم اور یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا وہ قابلِ قدر کارنامہ ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ انھوں نے جتنی محنت اور مہارت کے ساتھ یہ مرثیے مرتب و مدوّن کیے ہیں یہ ان ہی کا حصہ ہے۔"

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی کتاب 'قیصر بارہوی کے مرثیے' اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک گراں قدر تالیف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آئندہ جب بھی قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری پر کام کیا جائے گا تو یہ کتاب بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کی جائے گی۔ یہ کتاب محض قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین ہی نہیں جدید مرثیہ نگاری کے حوالے سے ایک اہم دستاویز قرار دی جا سکتی ہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی گراں قدر تخلیق۔ قیصرِ اقلیمِ مرثیہ

رابعہ عرفان

◆◆

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرثیہ نگاری کی روایت انیسؔ و دبیرؔ پر آ کر ختم ہو گئی ہے لیکن یہ خیال خام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعد بھی اہم مرثیہ نگار شاعری کے اُفق پر طلوع ہوئے گو ان کو وہ شہرت نصیب نہ ہوئی جو انیس و دبیر کے حصے میں آئی لیکن اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جدید شاعری میں مرثیے کی صنف کو وہ توجہ حاصل نہیں جو دوسری اصناف شعر کو ہے۔ مگر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس نشیب و فراز کے باوجود مرثیے کی روایت اپنی پوری آب و تاب سے قائم ہے۔ جدید ترین اُردو مرثیہ نگاروں میں نجم آفندی، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، نسیم امروہوی، آلِ رضا، شاہد نقوی، ڈاکٹر صفدر حسین، سید وحید الحسن ہاشمی اور قیصر بارہوی کے نام شامل ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا شمار جدید ناقدین اور محققین میں ہوتا ہے۔ مرثیے کی صنف سے ان کو خصوصی لگاؤ ہے۔ مرثیے کے حوالے سے ان کی اہم تصانیف میں ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' (تحقیقی و تنقیدی مقالات)، ''مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی'' (تحقیق و تنقید)، ''سیف زلفی کے مرثیے'' (تجزیہ و تدوین) اور ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' (قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کا تجزیہ و تدوین) شامل ہیں۔ مرثیے کے حوالے سے ان کی کتابوں کی یہ تعداد ان کی اس صنف سے خصوصی وابستگی کی غماز ہے۔

''قیصرِ اقلیمِ مرثیہ'' مرثیے کے حوالے سے ایک نہایت عمدہ اور نادر کتاب ہے۔ اس کتاب میں قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کا تجزیہ نہایت عمدگی اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے قیصر بارہوی کی سوانح، شاعری اور خاص طور پر ان کے مرثیوں کے حوالے سے جامع بحث ملتی ہے۔

اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں قیصر بارہوی کے حالات زندگی کو مختصراً مگر جامع طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حالات زندگی کے ساتھ ساتھ مصنف کی نثری و شعری تصانیف کے بارے میں بھی مکمل تحقیقی فہرست ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے ان کتب اور رسائل کی بھی فہرست دی ہے جن میں قیصر بارہوی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ پہلے باب کے آخری حصے میں

قیصؔر بارہوی کے مقام و مرتبے کے حوالے سے ناقدین، دانش وروں اور اکابرین مثلاً احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر سجاد رضوی، ڈاکٹر مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد وغیرہ کی آرا شامل ہیں۔ یہ آراء قیصؔر بارہوی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اَدبی دنیا میں ان کا مقام و مرتبہ قائم کرنے میں مدد کرتی ہیں مثلاً احمد ندیم قاسمی ان کے مرثیے کے فن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے اپنی بیشتر تخلیقی صلاحیتیں مرثیے پر صَرف کر دیں اور اس دَور میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی کا ایک منفرد اُسلوب پیدا کیا جب کہ اہلِ ادب کی عام رائے یہ بھی ہے کہ صنفِ مرثیہ زوال پذیر ہے۔ یوں انھوں نے اُردو شاعری کی ایک محترم صنف ''مرثیہ'' کو نئے امکانات بخشے اور اس کے آفاق کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔''

اس کتاب کے دوسرے باب میں قیصؔر بارہوی کے مرثیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نواز حسن زیدی انھیں ''اُردو مرثیے کا مرکزی ستون'' قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''قیصؔر بارہوی نے مختلف موضوعات پر ترپن مرثیے تخلیق کیے اور ہر مرثیے میں اپنی جدتِ فکر اور ندرتِ طبع کے جوہر دکھائے۔ قیصؔر بارہوی کے مرثیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اب اُردو مرثیہ کی صنف اور قیصؔر بارہوی کا نام لازم و ملزوم ہیں۔''

باب دوم میں قیصؔر بارہوی کے تمام مرثیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ہر مرثیے کا نام، سن تخلیق، کل بند، مطلع اور موضوع کے بارے میں ایک خاکہ دیا گیا ہے۔ ان خاکوں کے مطالعے سے قیصؔر بارہوی کے مرثیوں کی تفہیم میں قاری کو آسانی رہتی ہے۔

قیصؔر بارہوی کے مرثیوں کے مختصر مگر جامع خاکے کے بعد تمام مرثیوں کا تحقیقی اور تنقیدی تعارف پیش کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے قاری باآسانی قیصؔر بارہوی کے مقام و مرتبے کا تعین کر سکتا ہے۔ ان مرثیوں کے تحقیقی و تنقیدی جائزے سے ان کی جدتِ فکر اور ندرتِ طبع کا بخوبی اندازہ ہو رہا ہے۔ ان کے اہم ترین مرثیوں میں ''عشقِ حسین''، ''عباسِ نام دار''، ''یوسفِ کربلا''، ''ہفت اقلیم''، ''آیاتِ آمنہؑ''، ''کربلا و نجف''، ''شامِ غریباں''، ''معراجِ وفا'' اور دیگر مرثیے شامل ہیں۔ انھوں نے نہایت اچھوتے اور نامور موضوعات اختیار کیے ہیں۔ روایت کے دائرے کو اپنائے ہوئے اس دائرے کو وسیع کیا ہے مگر اس دائرے میں جدید رجحانات سے آگہی اور عصری میلانات سے وابستگی کے باوجود روایت کے ساتھ گہری وابستگی نظر آتی ہے۔

اس کتاب کے تیسرے باب ''جدید اُردو مرثیہ اور قیصؔر بارہوی کا اختصاص'' میں اُردو مرثیے کی روایت اور اس کے موضوعات کا قیصؔر بارہوی تک ذکر ملتا ہے۔ قیصؔر بارہوی کا شمار ایسے شعرا میں ہوتا ہے جو کہ مختلف النوع اصناف پر دسترس رکھتے ہیں۔ انھوں نے دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنے فن کے جوہر

دکھائے۔ قیصر بارہوی کی شاعری ان کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس ضمن میں ان کے مرثیوں کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے ان کے مرثیوں میں داخلی اور خارجی دونوں کرب نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں قصیدے کا شکوہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں قیصر بارہوی کے مطبوعہ مرثیوں کے مجموعوں کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس خاکے کے بعد قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری اور اس کی فنی وفکری خصوصیات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی شخصیت وفن پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات دلائل کی روشنی میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم میں قیصر بارہوی کے مختلف اہم مراثی کا منتخب متن پیش کیا گیا ہے تاکہ قاری تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے مرثیوں سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔ ان مرثیوں میں ''آیاتِ آمنہ'' (مرثیہ درحال حضرت آمنہؑ) ''علم غیب اور محمدؐ وآلِ محمدؐ'' (مرثیہ درحال مصائب آلِ محمدؐ)، ''آبروئے فکر'' (درحال حضرت بلالؓ) اور ''یوسفِ کربلا'' (درحال حضرت علی اکبرؑ) شامل ہیں۔

یہ کتاب ''قیصر شناسی اور قیصر فہمی'' کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ عہد جدید میں مرثیے کو اس کا مقام از سر نو دلانے کے لیے ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے یہ کتاب نہایت محنت سے ترتیب دی۔ اس کتاب کی روشنی میں بات کی جائے تو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیق وتنقید اعلیٰ اُصولوں پر پورا اُترتی نظر آتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عصرِ حاضر کے تمام نامور ناقدین، محققین اور دانش وروں نے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تنقیدی صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اب یہ بات بلاخوف وتردد کہی جا سکتی ہے کہ اکیسویں صدی میں مرثیے کی صنف اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن لازم وملزوم ہیں۔ آخر میں قیصرِ اقلیم مرثیہ کے آخر میں انتظار حسین کی گراں قدر رائے ملاحظہ فرمایئے اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کی رثائی خدمات کا اعتراف کیجیے:

> ''ایک زمانے تک صورت یہ رہی کہ ہمارے مرثیے کی تنقید انیس ودبیر پر آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ کلاسیکی عہد کے بعد کے مرثیے کو زیادہ لائقِ توجہ نہیں سمجھا گیا مگر اب شاید اس پر زیادہ توجہ ہے۔ قیصر بارہوی مرحوم تو ہمارے ہی زمانے کے شاعر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد لازم تھا کہ ان کے سارے کام کو سمیٹا جاتا اور اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کر کے ان کے مرثیے کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم کی جاتی۔ بہت اچھی بات ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے بارہوی مرحوم کے سارے مرثیوں کو سمیٹ کر اولاً سرسری تعارف کروایا ہے، ہر مرثیے کا ایک مختصر تعارف پیش کیا ہے اور پھر دقتِ نظر کے ساتھ ان کا ایک تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ قیصر بارہوی مرثیے کے میدان میں اپنے مقام ومرتبے کے اعتبار سے یقیناً اس مطالعہ کے مستحق تھے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی اپنے اس مطالعہ کے لیے جو ان کی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے، داد کے مستحق ہیں۔''
>
> (انتظار حسین (فلیپ)، قیصرِ اقلیم مرثیہ، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۵ر جولائی ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ایک مرثیہ گو کا نثری مرثیہ

پروفیسر انیقہ سلیم

◆◆

کربلا کہنے کو تو ایک واقعہ ہے جو وقت کے عظیم بہاؤ کی چند گھڑیوں میں رُونما ہو کر ختم ہو گیا لیکن بصیرت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی روایت ہے جس کے دامن میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہزار ہا اصول و ضوابط موجود ہیں۔ اس روایت نے انسانی زندگی کے متنوع پہلوؤں پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی اُسی آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ تمام قبائلی معاشروں کی طرح اہلِ عرب بھی اپنے اقربا کی موت پر اپنی کیفیات منظوم انداز میں پیش کرتے تھے۔ وہ جب کسی عزیز کے انتقال پر اپنے غم کا اظہار کرتے تھے تو اسے ''رثا'' کہا جاتا تھا اسی سے لفظ ''مرثیہ'' نکلا۔ واقعۂ کربلا کے انسانی زندگی پر اثرات میں ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ اس نے عربی زبان کے محدود لفظ کو آفاقی حیثیت دی ہے۔ پہلے ہر مرثیہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے چند ایک برس کے لیے ہوتا تھا لیکن کربلا نے مرثیہ کو عمرِ خضر عطا کی۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس دنیا میں موت اور غم دونوں ناگزیر ہیں۔ عرب مرثیہ چند افراد اور خونی رشتہ داروں کی بے قراری کا مظہر ہوتا تھا، لیکن کربلا نے مرثیہ کو کل انسانیت کا سرمایہ اور اس کے دکھ دُرد کا علم بردار بنا دیا۔ مرثیہ کے مرکزی مضامین دو ہوا کرتے تھے۔ موت اور غم، لیکن کربلا نے اسے حق و صداقت اور قربانی کا علامتی نشان بنا دیا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کا اعزاز ہے کہ انھوں نے اسلام، اس کے مصادر و ماخذ، اس کے شعائر اور تاریخ کے ساتھ باقی دنیا سے بڑھ کر نہ صرف عقیدت اور وابستگی کا اظہار کیا ہے بل کہ اہلِ عرب کی فضیلت کے احساس کے تحت ان کی ہر اچھی روایت کو سینے سے لگایا ہے اور ان سے بڑھ کر اس کی محافظت اور آبیاری کی ہے۔ یہی معاملہ مرثیہ کا ہے۔ کہتے ہیں کہ سولھویں صدی کے آخر میں مرثیہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اورنگزیب کے سپاہی دکن میں قیام کے بعد جب اپنے وطن یعنی شمالی ہند کو واپس جاتے تو انھیں دکن کے شعرا کے مرثیے زبانی یاد ہوتے

جنھیں وہ واپسی پر اہلِ وطن کو سنایا کرتے تھے۔

اُردو ادب میں ایسے شعرا کی تعداد انتہائی قلیل ہے، جنھوں نے مرثیہ کو ہی اپنی شناخت بنایا ہو اور اسے اپنے فن اور فکر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہو۔ مرزا سودا نے مرثیہ کو مشکل ترین صنف قرار دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم شعرا نے اس میدانِ سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان چنیدہ لوگوں میں ایک نام قیصر بارہوی کا بھی ہے جو بیسویں صدی کے ممتاز مرثیہ گو شعرا میں انتہائی ممتاز مقام رکھتے ہیں، جن کی صلاحیتوں کے اعتراف میں مرحوم احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا کہ اگر وہ مرثیہ گوئی کی بجائے صرف غزل کہتے تو بہت سے غزل گو شعرا کے منصب و مقام خطرے میں پڑ جاتے۔ قیصر بارہوی نے صنفِ مرثیہ کی آبیاری ایک تحریک کی صورت میں کی، خود مرثیہ کہا، اس کے مضامین میں وسعت پیدا کی، اس کا اُسلوب سنوارا، مرثیہ خوانی کا منفرد اور خوب صورت انداز اپنایا اور مرثیہ لکھنے والوں اور مرثیہ پڑھنے والوں کی خوب حوصلہ افزائی کی۔

اپنی مجاہدانہ زندگی کے دوران قیصر بارہوی نے کسی حد تک محروم توجہ مگر حد درجہ لائق توجہ صنف ادب سے جذباتی وابستگی جوڑ کر اسے فکر اور اُسلوب کا ایک نیا پیراہن دیا اور انیس و دبیر کے مرثیہ کو جو کہ بالعموم میدانِ کربلا اور اس میں پیش آنے والے عظیم سانحہ کے گرد ہی گھومتا تھا، آفاقی اقدار کا ترجمان بنایا اور بیسویں صدی کے جدید رجحانات کے پیش نظر صنف مرثیہ میں ایسی فنی اور فکری جدت پیدا کی کہ ان کا مرثیہ اکیسویں صدی میں بھی عظیم انسانی اقدار اور مصائب و آلام کی ترجمانی کے قابل ہو گیا ہے۔

اب تو یہ بات بلا شک و بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی میں مرثیے کی تنقید کو نیا رُخ عطا کرنے والے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہیں۔ پروفیسر سیّد محمد رضا زیدی کے بقول ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اُردو اَدب کی ایسی خدمت کر رہے ہیں جو آج کے دورِ ناپرساں میں ایک عجیب سا کام لگتا ہے۔ ایک شخص اُردو اَدب کو ایسے ایسے گوہر نایاب تحقیق و ترتیب و تدوین اور تجزیوں کے حوالے سے اَدبی دنیا کو عطا کر رہے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر شبیہ نے واقعی جس محنت اور مہارت سے قیصرِ روم کی طرح ''قیصرِ اقلیمِ مرثیہ'' میں مرحوم قیصر بارہوی کا مفصل تعارف پیش کیا ہے وہ انتہائی داد و تحسین کے لائق ہے۔ قیصر بارہوی کے سوانحی کوائف، ان کے بارے میں ان کے ہم عصر اُدبا اور ناقدین کی آرا اُن کے ترپن (۵۳) مرثیوں کا تعارف اور ان کی مرثیہ گوئی کے امتیازی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کے فروغ اور ترقی کا بھی ایک اجمالی مگر عمیق مطالعہ پیش کر دیا ہے۔ یوں ایک طرف ان کی یہ تخلیق قیصر بارہوی کی فکر اور فن کی عظمت کا اعتراف ہے وہیں ڈاکٹر صاحب کا اُردو ادب کے تلامذہ اور بالخصوص نوجوان مرثیہ گو شعرا اور ناقدین مرثیہ پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تازہ تصنیف ''قیصرِ اقلیمِ مرثیہ'' بنیادی طور پر چار ابواب پر مشتمل ہے۔ بابِ اوّل میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کے سوانحی کوائف کی تفصیل کے ساتھ ساتھ، انتہائی محنت سے بے شمار

کتب اور جرائد سے پینتیس معروف دانش ور حضرات اور ناقدین کی قیصر بارہوی کے متعلق آرا اور تبصروں کو بہت نفاست سے ترتیب دیا ہے اور آخر میں پندرہ شعرا کا منظوم خراج تحسین بھی شامل کر کے کتاب کی خوب صورتی اور رنگینی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

دوسرا باب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں مصنف نے قیصر بارہوی کے ہر مرثیہ کا ''پانچ نکاتی اجمالی جائزہ'' پیش کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے قاری ایک ساعت میں کسی بھی مرثیہ کے نام، سن تخلیق، کل بند، مطلع اور موضوع سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس باب میں قیصر بارہوی کے فکر و فن اور مرثیہ کے بنیادی موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے قاری کو ان تمام وسائل و ذرائع یعنی ان کتب، جرائد اور اشاعتی اداروں کا تعارف بھی ہو جاتا ہے۔ جہاں جہاں یہ مرثیے شائع ہوئے۔

کتاب کا تیسرا باب انتہائی دل چسپ مباحث اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور وہ ہے قیصر بارہوی کی مرثیہ گوئی کے امتیازی پہلو۔ ڈاکٹر شبیہ نے بڑی محنت سے اُردو مرثیہ کا ارتقائی سفر بہت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے جدید رجحانات پر بحث کرتے ہوئے اُردو مرثیہ میں ہونے والی فنی اور بالخصوص فکری تبدیلیوں کا خوب صورت تجزیہ پیش کیا ہے اور قیصر بارہوی کی مرثیہ گوئی کے ممتاز پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہوئے ان کے منفرد اُسلوب، فکری ندرت اور جدت اور جوش تخیل کے سبب، بیسویں صدی کے معروف مرثیہ گو شعرا میں سرفہرست قرار دیا ہے اور ان کے فن پر اٹھائے گئے اعتراضات کا بھی تسلی بخش جواب دیا ہے۔

اس کتاب کے چوتھے باب میں قیصر بارہوی کے چار مرثیوں کا انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔ پہلا مرثیہ 'آیات آمنہ' ہے جو بی بی آمنہ سلام اللہ علیہا کے بارے میں ہے اور میرے خیال میں اُردو مرثیے کی تاریخ میں یہ پہلا مرثیہ ہے۔ دوسرا مرثیہ ''علم غیب اور محمدؐ و آل محمدؐ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ تیسرا مرثیہ معروف صحابیِ رسولؐ حضرت بلالؓ کی شخصیت کے حوالے سے ''آبروئے فکر'' کے عنوان سے شامل ہے۔ چوتھا مرثیہ ''یوسفِ کربلاؑ'' کے نام سے ہے، جس میں شاعر نے حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے واقعات انتہائی الم انگیز انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہ چاروں مرثیے جہاں ایک طرف قیصر بارہوی کی صناعانہ صلاحیتوں کا مظہر ہیں وہاں دوسری طرف ڈاکٹر شبیہ کے ذوقِ شعری کا منہ بولتا ثبوت بھی ہیں۔

جناب ڈاکٹر اجمل نیازی نے خوب کہا ہے کہ ''ڈاکٹر شبیہ الحسن جیسے بندے بہت ہونے چاہئیں، جو ایسی محفلیں آباد کریں کہ جہاں اپنے اندر گم ہونے والے لوگوں کو بھی تلاش کیا جا سکے۔ لوگوں نے کیسے کیسے لوگ اپنے اندر ہی کھو دیے۔'' خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہم قیصر بارہوی کو کھونے سے بچ گئے کیوں کہ ڈاکٹر شبیہ جیسے لوگ موجود ہیں۔ اب ان کی نوازش سے ایک مکمل دستاویز ہمارے ہاتھ آ گئی، ایک پوری فلم جو قیصر بارہوی کی

حیات فکر اور فن کا ایک ایک سین ہمیں دکھا رہی ہے اسی دستاویز، اسی فلم کے بارے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے لکھا ہے کہ ''قیصرِ اقلیم مرثیہ'' میری لائبریری میں بھی رہے گی اور میرے دل کے نہاں خانے میں بھی۔ اس میں آپ کے خلوص کی خوشبو بھی ہے اور ایک بزرگ مرثیہ نگار شعرِ سخن کی بھی۔''

دراصل ڈاکٹر صاحب نے بھی ایک مرثیہ لکھا ہے ایک مرثیہ گو کا نثری مرثیہ...... قیصر اقلیم مرثیہ جو ''کربلائے سخن'' کے ہیرو کے کوچ کر جانے کے بعد تخلیق ہوا۔ اس کی فکری اور فنی عظمت کے اعتراف میں ہم بھی ڈاکٹر صاحب کی اس مرثیہ گوئی کے معترف ہیں، لیکن ہم اُن کی زندگی میں اُن کا ''قصیدہ'' کہنے کا شرف اور سعادت پا رہے ہیں۔

◆◆◆

maablib.org

سیف زلفی کے مرثیے اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا اختصاص

سیّد وحید الحسن ہاشمی

◆◆

حضرت علیؑ کا قول ہے کہ مجھے میرے منصب سے گرانے اور بڑھانے والے دونوں جہنمی ہیں۔ یہی قول اُردو مرثیے پر بھی صادق آتا ہے۔ مرثیے کی تضحیک کرنے والوں کے دو گروہ ہیں پہلا تو وہ ہے جس نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی عینک لگا رکھی ہے۔ دوسرا گروہ ادیبوں اور نقادوں کا ہے۔ انھیں مرثیے کے فن پر اعتراض ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مرثیے کے رُخ پر غلو کا غازہ مَل دیا گیا ہے کسی کا خیال ہے کہ عرب کی شخصیات کو ہندستانی کلچر کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ جناب عباسؑ جناب قاسمؑ اور جناب حُرؑ کی جنگ میں ایک ہی قسم کا سماں باندھا گیا ہے۔ بعض دوسرے نقادوں کا کہنا ہے کہ مرثیے میں ایسی روایات نظم کر دی گئی ہیں جن کا تاریخ میں وجود ہی نہیں۔ یہ روایتیں ایجاد بندہ کی ذیل میں آتی ہیں۔

مرثیے کو اس کے منصب سے بڑھانے یا مرثیے کو نیا موڑ دینے والے خود مرثیہ نگار ہیں کسی نے مرثیے کو مروّجہ نظم کا درجہ دے دیا اور کسی نے اسے مسدّس کہہ کر ہمیں مجبور کیا کہ ہم اسے مرثیہ کہیں اور مرثیہ سمجھیں۔ یہ تبصرہ ان حضرات کے فن پر ہے جو مرثیے میں اِدھر اُدھر کی باتیں نظم کر کے آخر میں مصائب کے چند بند ٹانک دیتے ہیں اور اس امر کے مدعی ہیں کہ انھوں نے مرثیے کے وقار کو بلند کر دیا ہے۔

پاکستان میں مرثیہ گوئی کا ایک نیا اور آسان نسخہ ایجاد کر لیا گیا ہے۔ اس نسخے کی رو سے کسی لفظ کو عنوان مرثیہ قرار دیا جاتا ہے پھر لغات سے اس لفظ کے چالیس پچاس محاورات و مستعملات چن لیے جاتے ہیں۔ ہر محاورے پر ایک بند کہہ کر دس بیس بند اسی لفظ کی رعایت سے نظم کر کے مرثیہ مکمل کر لیا جاتا ہے اور اسے جدید مرثیے کا نام دیا جاتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جدید مرثیہ لکھنے والوں کے فائدے کے لیے جدید مرثیے کے چند نکات پیش کر دیے جائیں تاکہ مرثیے کے نقادوں کو ایک صاف سیدھا اور غیر مبہم راستہ مل جائے۔ یہ عمومی نکات ہیں ان

میں کمی اور بیشی ہو سکتی ہے۔

- جدید مرثیہ میں روایات نظم نہیں ہوتیں بل کہ ان روایات کی طرف اشارے کنائے کیے جاتے ہیں یا تلمیح سے کام نکالا جاتا ہے۔
- جدید مرثیہ مختصر ہوتا ہے اسے ساٹھ منٹ کے اندر اندر مکمل ہو جانا چاہیے۔
- جدید مرثیے میں شمشیر زنی کا فن بیان نہیں کیا جاتا کیوں کہ مرثیہ نگار اور سامعین دونوں اس دور میں اس فن سے نابلد ہیں۔
- جدید مرثیے میں گھوڑ سواری کا فن نظم نہیں ہوتا کیوں کہ مرثیہ نگار خود اس فن سے واقف نہیں۔
- قدیم مراثی میں کربلا سے آفاق کی طرف جاتے تھے۔ جدید مرثیے میں آفاق سے کربلا کی طرف آتے ہیں۔
- جدید مرثیوں میں حسینؑ نے کہا، بانو بولیں، زینبؑ نے کہا قسم کے الفاظ استعمال نہیں کیے جاتے۔
- جدید مرثیوں میں مکالمے کی گنجائش نہیں۔ مرثیہ نگار خود ہی سب کچھ بیان کرتا ہے۔
- قدیم مرثیوں میں کربلا زمین کے ایک ٹکڑے کا نام تھا، جدید مرثیوں میں کربلا حق وصداقت اور عزم و استقلال کا سمبل بن چکی ہے۔
- جدید مرثیوں میں کُل ارضِ کربلا کا بنیادی تصور پیش کیا جاتا ہے قدیم مرثیوں میں یہ تصور نا پید تھا۔
- جدید مراثی میں کُل یوم عاشورہ کا تصور سرایت کر گیا ہے۔ قدیم مراثی میں یہ تصور نہ تھا۔
- جدید مرثیوں میں استدلال اور تعقل پسندی سے کام لیا جاتا ہے۔ قدیم مرثیے ان صفات سے خالی تھے۔
- جدید مرثیوں میں تجزیہ نگاری عام ہے۔
- جدید مرثیوں میں بکا سے زیادہ پیغام کو اہمیت دی جاتی ہے۔
- جدید مرثیے عمودی ساخت رکھتے ہیں معروضی یا اُفقی نہیں۔
- جدید مرثیوں میں واقعات کم اور مقصدِ حسینؑ زیادہ بیان کیا جاتا ہے۔
- جدید مرثیوں میں منظر نگاری اور محاکات کم سے کم تر ہو گئی ہے۔
- جدید مرثیوں میں صنائع اور بدائع کا استعمال کم ہوتا ہے۔
- جدید مرثیوں میں قرآنی آیات کا استعمال کم ہو گیا ہے۔
- جدید مراثی میں نفسیاتی عنوانات زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔
- جدید مرثیوں کی زبان آسان، صاف اور تصنع سے پاک ہے

موجودہ زمانے میں مرثیہ کہنے والوں کی تین اقسام ہیں کچھ وہ ہیں جو خارجیت پسند ہیں۔ وہ مرثیوں میں منتخب الفاظ اور دور از کار تشبیہوں اور استعاروں سے عالمانہ شان پیدا کرتے ہیں۔ اسی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے وہ کلام میں بلندی تو نظر آتی ہے مگر تاثیر جو مرثیے کی اصل غایت ہے مرثیے سے رخصت ہو جاتی ہے۔

دوسرے وہ مرثیہ نگار ہیں جو داخلیت پسند ہیں وہ زبان و بیان کی شیرینی کے ساتھ جذبات نگاری اور واقعات نگاری پر گہری نظر رکھتے ہیں ایسے مرثیہ گو حضرات عقیدے کی وابستگی کے پیشِ نظر اپنے من پسند افراد کے کردار کو موضوعِ مرثیہ بنا لیتے ہیں اور پھر ایسے ایسے گوشے پیدا کرتے ہیں جن سے جیتی جاگتی تصاویر حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جو شعرا غزل کی داخلیت کے قائل ہیں جب مرثیے کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو غزل کی داخلیت ان کے مرثیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مناظرِ فطرت کی عکاسی خارجیت ہے اور رموزِ فطرت کا بیان داخلیت ہے۔ جب تک مرثیے میں ذہنی، روحانی اور جذباتی انداز کی شمولیت نہ ہوگی داخلیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

مرثیہ نگاروں کی تیسری قسم ان شعرا کی ہے جو مرثیوں میں خارجیت اور داخلیت دونوں انداز نظر استعمال کرتے ہیں چوں کہ شاعر کی ذہنی پرورش اور دماغی جھکاؤ یک طرف ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے شعرا دونوں نظریوں سے انصاف نہیں کر پاتے۔ خصوصیت سے جب شاعر مرثیہ کہنے کی ابتدا کرتا ہے تو کسی خاص رنگ کے شاعر سے متاثر ہوتا ہے مگر ایک دو مرثیہ کہنے کے بعد پہلے رنگ والے کی تاسی چھوڑ کر دوسرے رنگ والے شاعر کا تتبع کرنے لگتا ہے اسی لیے اس کے کلام میں دورنگی دخیل ہو جاتی ہے۔

۱۹۷۰ء میں قیصر بارہوی کی آواز پر لاہور اسکول آف مرثیہ اُبھرا۔ اس مدرسۂ فکر میں قیصر بارہوی کے علاوہ ظہور حیدر جارچوی، ڈاکٹر خاکی، ظفر شارب، وجاہت حسین، افسر عباس، آثر ترابی، سیف زلفی اور راقم الحروف پیش پیش تھے۔ لاہور میں مرثیوں کا پہلا عشرہ ۱۹۷۲ء میں منعقد ہوا جس میں مندرجہ بالا شعرا کے علاوہ راول پنڈی سے فیض الحسن فیضی اور جوہر آباد سے جوہر نظامی نے بھی حصہ لیا۔ اگر چہ لاہور میں مرثیوں کے عشرے نہ رہے لیکن مرثیے اپنی پوری گھن گرج کے ساتھ کہے بھی جا رہے ہیں اور پڑھے بھی جا رہے ہیں۔

مرثیہ شروع کرنے سے قبل سیف زلفی کے سامنے نجم آفندی، آلِ رضا، جوش ملیح آبادی اور قیصر بارہوی کے اُسلوبِ نگارش تھے۔ کلام کی پختگی، شعروں کی بناوٹ، مصرعوں کی اکائی کا مکمل تجزیہ انھیں غزل سے مل چکا تھا اور سب سے بڑھ کر ان کے پاس غزل کا گداز اس کی داخلیت اور اس کا سوز موجود تھا جو مرثیے کی عمارت کی تعمیر میں مسالے کا کام دیتے ہیں۔ مسئلہ صرف مرثیے کی اندرونی ساخت کا تھا جسے جناب قیصر بارہوی کی محبت اور نصیحت نے حل کر دیا۔ آج جب ہم سیف زلفی کے مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے کلام میں صرف اور صرف جوش کا ولولہ اور قیصر بارہوی کے اندرونی جذبات و محاکات کی تصویریں صاف نظر

آتی ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی، سوداؔ دہلوی اور دبیرؔ لکھنوی کے قبیلے کے شاعر ہیں۔ ان کے مراثی میں جو غضب کا طنطنہ اور پرزور ولولہ نظر آتا ہے وہ مندرجہ بالا دونوں شعرائے کرام کی دین ہے۔ اس طنطنے اور ولولے سے مرثیے کی بیرونی ساخت بڑی حسین معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے عوام بیرونی رنگ و روغن اور ٹیپ ٹاپ پر جان چھڑکتے ہیں وہ پھولوں کے رنگوں کے دلدادہ ہیں، پھولوں کی خوشبو کے نہیں۔ وہ شخصیت کے بھڑکیلے لباس سے جلدی متاثر ہوتے ہیں، شخصیت کے کردار سے غرض نہیں رکھتے۔ وہ اُڑتے ہوئے جہاز کی تیزی اور اس کے پھرتیلے پن کے رسیا ہیں۔ اس میں سواری کرنے کے شوقین نہیں ہیں۔ سیف زلفی نے یہ راز ان ہی شعرا سے حاصل کیا ہے:

لکھتا ہے داستانِ قیادت مرا قلم — کرتا ہے جنگ امن کی صورت مرا قلم
پی کر شعور فہم و فراست مرا قلم — دیتا ہے زندگی کو حرارت مرا قلم
میرے قلم کی چھاؤں میں چلتا ہے آفتاب
لفظوں کے دائروں میں مچلتا ہے آفتاب

پھیلاؤں حرف حرف چراغوں کی روشنی — دکھلاؤں لفظ لفظ دماغوں کی روشنی
چھلکاؤں شعر شعر ایاغوں کی روشنی — برساؤں بند بند سے باغوں کی روشنی
مصرع لکھوں تو لفظ کی مہکار بول اُٹھے
مطلع پڑھوں تو سارا چمن زار بول اُٹھے

(مرثیہ: عشق حسینؑ)

شاعر جس ماحول میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے اس کے اثرات جسم کے علاوہ اس کی روح پر بھی نظر آتے ہیں۔ ہر بڑا شاعر اپنے شعروں میں اپنے ماحول کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ سیف زلفی جس ماحول سے دوچار تھے اس میں زر پرستی کی وبا عام تھی۔ اُمرا دولت کے سہارے تہذیب کا گلا کاٹ رہے تھے اور غریبوں کا خون چوس رہے تھے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ کہنے کو وہ آزاد تھا مگر اسیری کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا وہ امیر کس کام کا جو اپنی دولت کو ابوذرؓ کی طرح تقسیم نہ کر دے۔ انسان تو وہ ہے جو باطل کے سامنے اپنا سر نہ جھکائے جو اپنی زبان اخلاق کی تبلیغ کے لیے وقف کر دے۔ سیف زلفی نے ان مسلمانوں پر بھی سخت تنقید کی ہے جو غرور و تکبر کو پال کر باطل بدوش اور شریعت فروش ہیں اس سلسلے میں ان کے دو بند نذر قارئین ہیں:

ہاں وہ امیر میری نظر میں ہے محترم — حاصل ہو جس کو دہر کا ہر رتبہ و حشم
لیکن نگاہ و دل سے لگائے ہو تیرا غم — جس کا وجود ہو ترے کردار کا بھرم

لبریز جس کا دل ہو غریبوں کے دھیان سے
تقسیم زر کرے جو ابوذرؓ کی شان سے

جس نے غرور و کبر کو پالا ترا نہیں — نخوت میں جس نے علم کو ڈھالا ترا نہیں
جو تر کرے لہو میں نوالا ترا نہیں — اور تیرا خون بیچنے والا ترا نہیں

اہلِ بیتؑ کے ساتھ نہ باطل بدوش ہو
تیرا کہاں ہے وہ جو شریعت فروش ہو

(مرثیہ: عظمتِ حسینؑ)

سیف زلفی جدید ذہن کے مالک تھے۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی تحریکات کا شعور رکھتے تھے۔ دنیا کے اہم افراد اور ان کے فلسفے کا ادراک سیف زلفی کے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ لینن ہوں یا مارکس، سقراط ہوں یا زرتشت، گوتم ہوں یا اشوک ہر ایک فلسفی کے خیالات سے وہ واقف تھے مگر زلفی کی نظر کا اُجالا امام حسینؑ کی شخصیت تھی، جس نے اپنی جان دے کر وجودِ خدا کو ثابت کر دیا:

لینن کے اشتراک پہ کچھ لوگ ہیں نثار — اور فلسفے پہ مارکس کے مرتے ہیں بے شمار
سقراط کے پیالے میں غلطاں ہیں دس ہزار — زرتشت کے الاؤ میں جلتے ہیں چند یار

کچھ طالبانِ امن کو گوتم سے چین ہے
لیکن مری نظر کا اُجالا حسینؑ ہے

(مرثیہ: عشقِ حسینؑ)

سائنس آج خود کو کہے لاکھ بے مثال — ایجاد نو بہ نو کے بچھائے ہزار جال
تسخیر ماہتاب کو سمجھے بڑا کمال — حکمت کا تیری اے خدا ادراک ہے محال

ممکن نہیں کہ کوئی ترا بھید پا سکے
آئنہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

(مرثیہ: وسیلہ)

سیف زلفی کے اُسلوب کے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں ان کے کلام میں جوش ملیح آبادی کا طنطنہ اور کروفر ہے اور کہیں قیصر بارہوی کی مصلحانہ روش کا عکس ہے۔ کلام میں گھن گرج اور جوش خطابت خارجیت کی دین ہے۔ مصلحانہ روش ان کی اندرونی اور داخلی انانیت کے سبب سے ہے۔ سیف زلفی کو یہ احساس تھا کہ اپنے ہم عصروں میں وہ ایک ممتاز اور منفرد اُسلوب کے مالک ہیں مگر انھیں وہ مرتبہ نہیں دیا جا رہا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ثقیل اور غیر معروف الفاظ اور تراکیب کے استعمال سے وہ اپنے جذبات کا کتھارسس کرتے معلوم ہوتے

ہیں۔ شاید اس طرح ان کے خیال میں ان کی باطنی انا کو تسلی اور تشفی ہو جائے ذرا ان کے طنطنے کا انداز ملاحظہ کیجیے:

لفظوں کے آفتاب اُگلنے لگی بزاں　　ذہنوں میں روشنی کا سراپا ہوا جواں
آنکھوں میں رنگ و نور کا اک بحرِ بیکراں　　غلطاں ہوا تو مطلعِ انوار تھا جہاں
خورشید عقل و فکر کی بارات ہو گئی
ارض و سما میں نور کی برسات ہو گئی

(مرثیہ: وسیلہ)

چہرہ شمیم گل کی نمی سے دُھلا ہوا　　ماتھا تہوری کے شفق سے سجا ہوا
چشم وغا میں رعب کا سرمہ لگا ہوا　　پیکر تمام جلوۂ یزداں بنا ہوا
واللیل کی لٹوں میں فضیلت کے پیچ ہیں
یزداں کے آگے سیکڑوں یوسفؑ بھی ہیچ ہیں

(مرثیہ: اسوۂ عباسؑ)

تکرار الفاظ شاعری میں ایک صنعت سمجھی جاتی ہے۔ یہ عام طور پر اُس مقام پر استعمال کی جاتی ہے جب بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اکثر تکرار تاکید کی غرض سے استعمال ہوتی ہے۔ اکثر اپنی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرانے کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر سیف زلفی کے یہاں تکرار الفاظ ان کے اسی طنطنے کی بازگشت ہے اپنے خیال اور جذبے کو پُر اثر کرنے اور مصرعوں میں جاہ وجلال پیدا کرنے کے لیے انھوں نے تکرار الفاظ کا سہارا لیا ہے۔ صرف چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

۱۔ پھیلاؤں حرف حرف چراغوں کی روشنی
۲۔ دکھلاؤں لفظ لفظ دماغوں کی روشنی
۳۔ چھلکاؤں شعر شعر ایاغوں کی روشنی
۴۔ برساؤں بند بند سے باغوں کی روشنی　　(مرثیہ: عشق حسینؑ)

حمد ہو یا نعت، سلام ہو یا مرثیہ ان سب کا تعلق جذبات اور احساسات سے ہے۔ اچھی میٹھی اور شیریں شاعری برصغیر پاک وہند کے باسیوں کو ہمیشہ سے مرغوب رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فکر وفلسفہ کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ شعر میں خیال آرائی کا ایک مقام ہے مگر عوام الناس فلسفیانہ شعر کی گہرائی تک نہیں پہنچتے۔ جذبہ چوں کہ خاص وعام میں برابر کا شریک ہے اس لئے جذبے یا عقیدے کی شاعری کا جادو جلد چل جاتا ہے۔ شاہ نصیر، ناسخ، مصحفی، غالب، اصغر گونڈوی اور اقبال دماغ کے شاعر ہیں، میر تقی میر، آتش، داغ، اختر شیرانی، آرزو

لکھنوی اور اُستاد قمر جلالوی دل کے شاعر ہیں۔ سیف زلفی نے نجم آفندی سے عقیدت کا فن لیا اور قیصر بارہوی کا طریقہ اظہار اپنایا۔ سیف زلفی کو خدا کے بعد محمدؐ و آلِ محمدؐ سے خصوصی لگاؤ ہے۔ وہ ابتدا میں مرزا دبیر کی راہ پر چلے مگر پھسل کر میر انیس کی شاہراہ پر آ گئے۔ وہ خود کہتے ہیں:

مجھ کو بھی فن ملا ہے انیس و دبیر کا
شاعر ہوں خاندانِ جنابِ امیر کا

عقیدت کے میدان میں سیف زلفی کا اشہب قلم بہت تیز دوڑتا ہے۔ انھوں نے تمام ائمہ اہلِ بیت کی مدحت کی ہے مگر حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کی تعریف و توصیف میں متعدد مصرعے اور بیتیں کہی ہیں اس مقام پر صرف دو بند پیش کرنا چاہتا ہوں:

ہوتا نہ گر حسین اُجالوں کا پاسباں
کھاتی یہ کائنات اندھیروں میں ڈبکیاں
ملتا کہیں نہ منزلِ خورشید کا نشاں
اُڑتا رسولِ پاکؐ کی تبلیغ کا دھواں
دینِ محمدیؐ کو نکھارا حسین نے
اللہ کو دلوں میں اُتارا حسین نے

(مرثیہ: عشقِ حسینؑ)

سچے قلندروں میں علیؑ کی پکار ہے
شہباز کے چمن میں علیؑ سے بہار ہے
چشتی کی سلطنت کا علیؑ تاجدار ہے
داتا اگر ولی ہے علیؑ پر نثار ہے
مولا علیؑ کے عشق سے ایماں ہے ٹھیک بھی
مولا علیؑ سے پائی فقیروں نے بھیک بھی

(مرثیہ: وسیلہ)

قیصر بارہوی نے اپنے ایک مرثیے کے چہرے میں ناصحانہ انداز اختیار کیا ہے۔ سیف زلفی نے یوں تسلسل کے طور پر تو ناصح بن کر بات نہیں کی مگر مرثیے کے بطن میں کہیں کہیں وہ عوام سے تخاطب کرتے ہوئے انھیں نصیحت کرتے ہیں۔ مثلاً:

دیکھو ان اژدہوں کو سمندر میں ڈال دو
دنیا کے دل سے جنگ کی دہشت نکال دو
امن و سکوں کا روئے زمیں کو جمال دو
نفرت کا زہر پیار کے امرت میں ڈھال دو
اللہ کی زمیں کو مٹانا حرام ہے
گھر میں کسی کے آگ لگانا حرام ہے

تم چاند کے نگر میں بساتے ہو بستیاں یارو ابھی زمیں پہ اندھیرا ہے بیکراں
دولت کے بل پہ نخوت طاقت بھی ہے زیاں انسانیت کے نام پہ گونگوں کو دو زباں
پر سوز میں یہ ابر گہر بار کی طرح
صحرا کو بھی وقار دو گلزار کی طرح

....

بھوکے ہیں ملک بھوک مٹاؤ تو شان ہے پیاسوں کو آب سرد پلاؤ تو شان ہے
کشتی شکستگاں کی بچاؤ تو شان ہے انسان کا وقار بڑھاؤ تو شان ہے
سوچو تو آدمی کی بھلائی کے واسطے
بھائی تو جان دیتا ہے بھائی کے واسطے

لفظوں کو تجسیم کرنا اور پھر ان کی زبان سے اپنا مقصد بیان کرنا شاعری میں ایک نہایت اہم فن تسلیم کیا گیا ہے۔ شدت جذبات یا وفور احساسات کے موقع پر جب شاعر کی اپنی زبان گنگ ہو جاتی ہے تو وہ بے جان اشیا یا اسمائے صفات کی زبان سے واقعے کی شدت کو سامعین کے قلوب میں گداز پیدا کرنے کے لیے جذب کرنا چاہتا ہے مثلاً میر انیس نے شہادت امام حسینؑ کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ذیل کا یادگار مصرع تحریر کیا ہے:

خنجر سے آ رہی تھی صدا یا حسینؑ کی

سیف زلفی نے اپنے اُسلوب کو تقویت دینے کے لیے اس فن کا استعمال بڑی خوبی اور فراست سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند مصرعے پیش قارئین ہیں:

(ا) گھبرا کے روشنی یہ پکاری کہ الاماں (مرثیہ: عظمتِ حسینؑ)
(یہاں روشنی کو تجسیم کیا گیا ہے کیوں کہ وہ انسان کی طرح پکار رہی ہے)

(ب) الفاظ کی جبیں پہ خیالوں نے خوں ملا (مرثیہ: اسوۂ عباسؑ)

(ج) سن کر کہا خرد نے مدد یا علیؑ مدد (مرثیہ: وسیلہ)

(د) فن ہاتھ باندھ کر یہ کہے اے سخن مآب (مرثیہ: عشق حسینؑ)

(ہ) موج صبا کی چال سے چلتی تھی ذوالفقار (مرثیہ: عشق حسینؑ)

اب یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں کہ شعرا اُردو انگریزی کے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ صفی لکھنوی جیسے ثقہ شاعر نے تھیٹر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ شاہد نقوی (کراچی) نے مرثیے میں مشن کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سیف زلفی نے بھی اپنے مرثیوں میں جا بجا انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں مگر ان کے مرثیوں میں استعمال ہونے والے الفاظ زباں زد خلائق ہیں۔ مثلاً:

(ا) لیکن مشن میں ان کے ذرا بھی خلل نہیں (مرثیہ: عشقِ حسین)

(ب) دانش وروں کے آئیڈیل بھی ہیں منتخب (مرثیہ: عشقِ حسین)

(ج) لکھنے لگوں تو موڈ میں لکھتا چلا چلوں (مرثیہ: عشقِ حسین)

(د) ایٹم کے اژدہوں کا بڑا اژدحام ہے (مرثیہ: عشقِ حسین)

مرثیے یا عمودی ہوتے ہیں یا اُفقی۔ عمودی مرثیوں میں ایک مصرع دوسرے مصرعے سے اور ایک بند دوسرے بند سے مسلسل ہو کر تحت سے فوق کی طرف جاتا ہے۔ تسلسل قائم رکھنے کے لیے صنائع بدائع کا التزام نہیں ہوتا اس کے برعکس اُفقی مرثیے مشرق سے مغرب کی طرف دونوں پھیلے ہوئے ہاتھوں کی طرح کہے جاتے ہیں۔ اس قسم کے مرثیوں میں تشبیہ واستعارہ اور دیگر صنائع بدائع کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے مثلاً جوشؔ ملیح آبادی نے زندگی کے عنوان پر تین بند کہے۔ اگر اس میں سے دس بند نکال لیے جائیں تو مرثیے پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا مگر آلِ رضاؔ کے مرثیے عظمت انساں سے ایک بند بھی حذف کر لیا جائے تو تسلسل منقطع ہو جائے گا اور یہ مرثیے کا عیب شمار کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جوشؔ کے یہاں صنائع بدائع کی بھرمار ہے جب کہ آلِ رضاؔ کے یہاں صنائع بدائع کا استعمال آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ سیف زلفی کے مرثیے اُفقی یعنی معروضی ہیں جس کی وجہ سے وہ صنعتوں کا استعمال فراخدلی سے کرتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ہر بیت میں ہیں فکر کے سورج جڑے ہوئے (صنعتِ استعارہ)

۲۔ سوچوں کی ٹہنیوں پہ خرد بولنے لگی (استعارہ)

(مرثیہ: وسیلہ)

۱۔ کڑیل جوان حیدرِ کرار کی طرح (تشبیہ)

(مرثیہ: اُسوۂ عباس)

۲۔ جس طرح تین روز کی ہانڈی سڑی ہوئی (تشبیہ)

(مرثیہ: عشقِ حسین)

۱۔ حکمت سے تیری سات سمندر ہیں موجزن (صنعتِ اعداد)

۲۔ ہاں میری ایک ایک فضیلت علیؑ میں ہے (اعداد)

(مرثیہ: وسیلہ)

۱۔ ہاں بحر و بر کا مالک و مختار ہے وہی (صنعت تضاد)

(مرثیہ: وسیلہ)

۲۔ وہ آدمی ہے آخر اول کی روشنی (تضاد)

(مرثیہ: عشقِ حسین)

۱۔ اس فاطمہؓ کی قبر کو مسمار کر دیا (صنعتِ تلمیح)

(مرثیہ: عشقِ حسینؑ) ۱۹۲۶ء میں شاہ سعود کے انہدام قبور کی طرف اشارہ ہے

۲۔ میری رگوں میں فاتحِ خیبر کا خون ہے (تلمیح)

(مرثیہ: عشقِ حسینؑ) خیبر میں حضرت علیؑ کی طرف اشارہ ہے

محاوروں کا استعمال زبان و بیان کے ارتقاع کے لیے ہوتا ہے۔ ایک طرف تو اس سے بیان میں خوبی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرح کلام کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی محاورہ کلام کی تفصیل کو اختصار میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مثلاً غم برداشت کرنا یا دل کے کرب سے پریشان ہونا اور تکلیف سے دوچار ہونے کو غم کھانا کے محاورے سے غم کی پوری کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ سیف زلفی کے مرثیوں میں قدم قدم پر محاورے استعمال ہوئے ہیں جن سے کلام میں معنویت کے ساتھ حُسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً درج ذیل کے مصرعے دیکھیے کس خوبی سے محاوروں کا برمحل استعمال ہوا ہے:

ا۔ کو وہ یزیدیت کا جگر چاک ہو گیا	(مرثیہ: عظمتِ حسینؑ)	جگر چاک ہونا
ب۔ لبیک کہہ کے قوت دیں پر کسی کمر	(مرثیہ: عظمتِ حسینؑ)	کمر سنا
ج۔ چلّے پہ جو چڑھے تھے کبھی تیر گر پڑے	(مرثیہ: وسیلہ)	چلّے پر تیر چڑھنا
د۔ بزدل ستم گروں کے تو چھکے چھڑا دیئے	(مرثیہ: عشقِ حسینؑ)	چھکے چھڑانا

شاعر تلمیذ الرحمان ہوتا ہے۔ وہ قرآن یا معصوم انسانوں کی زبان سے باتیں کرتا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی اس کی زبان سے نکلا ہوا کوئی شعر یا کوئی مصرع مستقبل کی خبر دیتا ہے جسے ہم پیش گوئی کے خانے میں شمار کرتے ہیں۔ کسی بھی بڑے شاعر کا دیوان اٹھا کر دیکھ لیں اس میں ایسے اشعار ضرور مل جائیں گے جن کا تعلق آنے والے زمانے سے ہوگا۔ سیف زلفی نے جاپان میں ایٹم بم کی تباہ کاریاں دیکھیں، امریکا اور برطانیہ کی ہوس اقتدار نے ساری دنیا کے لوگوں کو مشوش کر دیا تھا۔ امریکا کے خوفناک ارادوں کو ان کی چشمِ بصیرت دیکھ رہی تھی۔ ان کے انتقال کے پندرہ برس بعد امریکا کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ اپنے اقتدار کے لیے دنیا کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اب ذرا سیف زلفی کی قبل از وقت ۱۹۷۴ء کی پیشین گوئی کا احوال ملاحظہ فرمائیں:

اے حاکمانِ دہر یہ نازک مقام ہے — سایا تباہیوں کا بھی نزدیک بام ہے
ایٹم کے اژدہوں کا بڑا اژدحام ہے — سُن لو کہ اب زمین کا قصہ تمام ہے

دنیا سُلگ رہی ہے دہانے پہ جنگ کے
اِک دن بھڑک اُٹھے گی نشانے پہ جنگ کے

سیف زلفی نے قدیم مرثیہ گویوں کی طرح اپنے مرثیوں میں تلوار اور گھوڑے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جنگ اور رجز

خوانی کا حال بھی بیان کیا ہے۔ تعلّی سے بھی کام لیا ہے اور متعدد متروک الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ایک بیت میں صوتی قافیہ بھی استعمال ہوا ہے:

مانگی سخن کی بھیک درِ شہرِ علم سے
لے آیا ایک بوند فقط بحرِ علم سے

شہر کے قوافی دہر، قہر، نہر اور لہر ہوتے ہیں۔ بوند کے ساتھ نہر کا قافیہ آسانی سے استعمال ہو سکتا تھا نہ جانے کیا سبب تھا کہ انھوں نے معلوم اور دستیاب قافیے کو چھوڑ کر صوتی قافیے کا سہارا لیا۔

یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ مرثیوں کے قارئین میں روز بروز کمی ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کو انیس و دبیر کے مرثیے زبانی یاد ہوتے تھے لیکن آج کسی کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ کلاسیکی مرثیوں کی ورق گردانی کرے۔ اب جب کہ مرثیہ پڑھنا ممکن نہیں رہا تو اس کے فنی محاسن کا کون احساس کرے۔ اس سے بھی زیادہ المناک صورتِ حال یہ ہے کہ مرثیے کے معتبر ناقدین ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر صفدر حسین، ڈاکٹر احراز نقوی جیسے مرثیہ شناس ناقدین رحلت فرما گئے تاہم مرثیے کے حوالے سے ان کی کاوشیں یادگار ہیں۔ عصرِ حاضر میں ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر تقی عابدی، سید محمد رضا کاظمی، ڈاکٹر اسد اریب، عاشور کاظمی اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے مرثیے کی صنف کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور اسے عصری ادب میں ممتاز مقام دلانے کی کامیاب سعی کی۔ ان ناقدین اور محققین میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو یہ اختصاص ہے کہ انھوں نے روایتی موضوعات سے ہٹ کر مرثیوں کے حوالے سے نئے موضوعات کو متعارف کرایا اور مرثیہ نگاروں کے ان رُخوں کو اُجاگر کیا جن کی طرف ناقدین کی توجہ کم تھی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے جدید مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کو درست متن کے ساتھ پیش کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے 'العطش' کے عنوان سے راقم الحروف کے چالیس مرثیے مرتب کیے۔ اسی طرح حضرت قیصر بارہوی کے ترپن مرثیے شایع کیے اور ''سیف زلفی کے مرثیے'' طبع کر کے انھوں نے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس صنف کے فروغ کے لیے عصرِ حاضر کے تمام نامور ناقدین اور محققین کو بھی اس جانب متوجہ کیا ہے۔ اس طرح اب مرثیہ کی صنف عہدِ جدید میں روشن اور تاباں دکھائی دیتی ہے۔

''سیف زلفی کے مرثیے'' کی اشاعت ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا قابلِ قدر اور قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک تسامح یہ ختم ہو گیا ہے کہ سیف زلفی نے کل کتنے مرثیے کہے ہیں؟؟ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے وقیع و بسیط مقدمے میں انتہائی استدلال کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ سیف زلفی نے کُل چار مرثیے تخلیق کیے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جہاں ایک طرف سیف زلفی کے چاروں مرثیوں کو تلاش بسیار کے بعد

درست متن کے ساتھ شائع کیا ہے وہاں دوسری طرف ایک سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھ کر سیف زلفی کے حوالے سے بے شمار معلومات فراہم کردی ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان چاروں مرثیوں کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ حیرت انگیز ہیں اور اگر وہ محنت شاقہ کے ساتھ یہ مفید اور کارآمد معلومات فراہم نہ کرتے تو اُردو مرثیے کا دامن ایک اچھے مرثیہ نگار کے ذکر سے محروم رہ جاتا۔ سیف زلفی خوش قسمت ہیں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن جیسے محقق اور نقاد کی نگاہِ دُوررس ان پر پڑ گئی اور ان کے مرثیے دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہو گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اُردو مرثیے کے دامن کو کس گوہرِ نایاب سے مالا مال کرتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ:

ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

(ماہنامہ ’شام وسحر‘ لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور سیف زلفی کے مراثی

شہزاد احمد

◆◆

پاک ٹی ہاؤس جو پاکستان بننے سے پہلے انڈیا ئی ہاؤس کے نام سے مشہور تھا، لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کی پہچان بن چکا ہے اب تو شاید اس کی سرگرمیاں آخری سانس لے رہی ہیں مگر ایک زمانے تک اسے علامت کے طور پر جانا جائے گا۔ یہ مقدر کی بات ہے ویسے تو لاہور میں ہمیشہ ادیب مختلف مقامات پر اکٹھے ہوتے رہے ہیں، آج بھی ناصر باغ کے علاوہ میکلوڈ روڈ پر فضل کے ہوٹل میں رات گئے تک ادیبوں کا جمگھٹا ہوتا ہے۔ خالد احمد اس کے روح رواں ہیں اور ایک ایسی شمع کو فروزاں رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں، جو کبھی کبھی پل دو پل کی مہمان دکھائی دیتی ہے مگر سخت جان ہے اور شاید دیر تک قائم رہنا اس کا مقدر ہے۔

اس کے پاس مل لکشمی کے بالکل قریب کنگ سرکل نام کا ایک ہوٹل تھا جس میں زیادہ تر فلمی صنعت سے متعلق لوگ بیٹھا کرتے تھے، مگر دو ایک میزیں ادیبوں کے لیے بھی وقف تھیں، ایک میز پر سیف زلفی، مظفر وارثی، سلیم شاہد اور مَیں برسوں تک بیٹھتے رہے، یہ زمانہ دیوانگی کا تھا، روز شعر لکھنا معمول تھا اور شعر لکھنے کے بعد سنانے کا عمل بھی مستقل ہو گیا تھا۔ ہم بھی لوگ بہت پُر گو تھے، کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے تھے۔ اس زمانے میں جدید غزل کا دور دورہ تھا اور اب اس میز پر بیٹھنے والوں کو ادب کا ہر سنجیدہ طالب علم جانتا ہے۔ اس گروہ میں جسے شاید گروہ کہنا مناسب نہ ہو، ایسے لوگ تھے جو اپنی اپنی راہ پر چل رہے تھے، زندگی کے بارے میں سب کا انداز ایک دوسرے سے الگ تھا اور سیف زلفی تو اس زمانے میں بھی بہت بلند بانگ تھے، غزل کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھتے تھے مگر ہمیں صرف غزل ہی سناتے ہیں، اس وقت بھی وہ اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ تھے، اس کا اندازہ ہمیں ان کی روزمرہ کی گفت گو سے ہوتا تھا، مظفر وارثی اس زمانے میں نعتیں کم کم ہی لکھتے تھے اور سلیم شاہد تو تھا ہی غزل کا مارا ہوا، بعد میں اس نے پنجابی میں طویل داستانیں رقم کیں اور ناول بھی لکھے۔

معلوم نہیں کیوں یہ محفل بکھر ہی گئی، شاید ہمارے درمیان کوئی رنجش نام کی چیز نہیں تھی، بس زندگی نے

جس قدر مہلت دی ہم کنگ سرکل میں بیٹھتے رہے، پھر اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے، سیف زلفی نے یکے بعد دیگرے اَدبی رسائل نکالے اور اس کا حلقہ احباب بھی بدلتا چلا گیا۔

ایک بار پھر ہم اس وقت ملے جب سیف زلفی کو حلقۂ ارباب ذوق کا سیکرٹری چنا گیا، اس نے حلقے کی روایات کی بجائے اپنے خاص انداز سے حلقے کو چلایا۔ سیکرٹری شپ کی مدت ختم ہونے کے بعد حلقے میں اس کی دل چسپی برائے نام رہ گئی، اب وہ زیادہ تر نعت، سلام، منقبت اور مرثیے کی طرف مائل ہو گیا۔ غزل وہ اب بھی لکھتا رہا مگر کم اور اس غزل میں بھی اس کا مذہبی اور عقیدت مندانہ رنگ نمایاں تھا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی چار مرثیوں پر مشتمل اس کی یہ کتاب زیادہ تر مذہبی عقیدت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ سیف زلفی نے اپنے خاص مزاج کے پیشِ نظر ان مرثیوں کو روایتی انداز میں نہیں لکھا، لیکن وہ بار بار یہ کہتا رہا کہ وہ ۲۵ مرثیے لکھنا چاہتا ہے، مگر جو کچھ شائع ہوا ہے وہ صرف چار مرثیے ہیں۔ شاید وہ ان سے آغاز کرنا چاہتا تھا مگر زندگی نے اسے مہلت نہ دی، مرثیوں پر مشتمل یہ کتاب اگرچہ بہت سے اَدبی محاسن کی نشان دہی کرتی ہے مگر یہ مرثیے کی دیگر کتابوں سے مختلف ہے۔ اس پر قیصر بارہوی کے اثرات بھی نمایاں نہیں ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان مراثی کا مطالعہ کیا ہے ان کی زندگی اور تخلیقات کے بارے میں خاصی معلومات جمع کر دی ہیں، اس سے پہلے بھی وہ سیف زلفی کی حیات وتخلیقات کا مطالعہ کر چکے ہیں مگر موجودہ مطالعہ خصوصی طور پر مرثیے کے حوالے سے ہے۔ یہ دل چسپ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ انھوں نے منظوم ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ڈرامے کی صنف اپنے طور پر ایک جداگانہ کام ہے اور منظوم ڈرامے لکھنا یا انگریزی سے منظوم ڈراموں کا ترجمہ کرنا ایک الگ مگر نہایت اہم کام ہے۔ روسی انقلاب کے بعد جب پاسترناک دوسرے غیر اشتراکی لکھاریوں کی طرح روس سے باہر آ گیا تو اسے ترجمے کرنے کا کام تفویض کر دیا گیا چناں چہ اس نے روسی زبان میں شیکسپیئر کے ایسے ترجمے کیے کہ شیکسپیئر اب روس میں بھی انگلستان کی طرح مقبول ہے۔

سیف زلفی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے اور انھوں نے اُردو شاعری میں جو اضافے کیے ہیں، وہ دیر تک یاد رکھے جائیں گے۔

(ماہ نامہ شام وسحر لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا نیا کارنامہ۔ 'سیف زلفی کے مرثیے'

ڈاکٹر سلیم اختر

◆◆

اوصاف باب علم کروں گا اگر رقم | چومیں گے روشنی کے فرشتے مرا قلم
اُترے گی داد محفلِ انجم سے دمبدم | چہکیں گے شعریت کے پرندے ارم ارم
مجھ کو بھی فن ملا ہے انیس و دبیر کا
شاعر ہوں خاندانِ جنابِ امیر کا

سیف زلفی نے یہ دعویٰ کیا کہ اسے انیس و دبیر کا فن ملا ہے تو اسے محض شاعرانہ تعلّی نہ سمجھا جائے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کی توثیق ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مرتبہ کتاب 'سیف زلفی کے مرثیے' سے ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شبیہ الحسن سیف زلفی کے فن اور شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> ''سیف زلفی ایک تخلیقی ذہن رکھتے تھے۔ انھوں نے عمر بھر ادب کی خدمت کی اور کئی نثری و شعری تخلیقات یادگار چھوڑیں۔ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کے ورثے کی حفاظت کی، روایت کی اعلیٰ قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا اور انفرادیت کا سہارا لے کر دنیائے اُدب میں اپنے لیے ایک مستقل مقام بنانے میں کامران ہوئے۔ روایت، وراثت اور انفرادیت کی اس فنی تکوین نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ سیف زلفی کی کسی بھی نثری یا شعری تخلیق کا مطالعہ فرما لیجیے آپ خود دیکھیں گے کہ اس تخلیق کے پس پردہ یہی فنی مثلث کارفرما ہے۔ سیف زلفی نے شعری ذوق اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں پایا اور وہ برملا کہتے تھے کہ شاعری ان کے اجداد کا پیشہ تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اسی طرح وہ روایت کے رچاؤ کو شاعری کے لیے لازمی قرار دیتے تھے۔ ان کا واضح موقف یہ تھا کہ وراثت اور روایت میں اگر نیاپن، تازگی اور انفرادیت نہیں ہے تو شاعر عظیم نہیں کہلا سکتا۔''

سیف زلفی کی زندگی میں اگرچہ ان کے کئی شعری مجموعے طبع ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ہمارے ہیں حسینؑ (۱۹۶۸ء)

۲۔ کربلا کے دو اسیر (۱۹۷۴ء

۳۔ تابخاک کربلا (۱۹۷۶ء)

۴۔ روشنی (۱۹۷۹ء)

۵۔ نور (۱۹۸۰ء)

۶۔ ٹکڑے ٹکڑے آدمی (۱۹۸۴ء)

۷۔ لہو چاند اور سویرا (۱۹۸۹ء)

لیکن ان کے بعض ایسے مرثیے دستیاب نہ تھے جن کے بارے میں شنید تو تھی مگر ان کی دید نہ تھی۔ یہ مرثیے مختلف مجلسوں میں بھی سنائے گئے اور ریڈیو، ٹی وی کی محفلوں میں بھی پیش کیے گئے۔ اسی طرح کچھ مرثیے دل لخت لخت کی مانند بیاضوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انتقال تک اگرچہ سیف زلفی کا قلم مرثیے کے لیے وقف رہا لیکن ان کی اچانک موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی تھی کہ وہ اطمینان سے تمام مراثی یک جا کر کے ان پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے اور پھر انھیں ترتیب دے کر کتابی صورت دیتے لیکن یہ کام سیف زلفی کے بجائے مقدر نے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سے لینا تھا کہ جو غالباً ان ہی کاموں کے لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ مرحومین کو ان کا حق دلانے کے لیے کوشاں رہیں، وہ حق جو زمانے یا معاصرین نے نہ دیا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بڑی محنت سے مختلف ذرائع سے سیف زلفی کے مرثیے حاصل کیے۔ انھیں ترتیب دیا، نوک پلک سنواری اور 'سیف زلفی کے مرثیے' کی صورت میں چار مرثیے مدوّن کر دیے۔ میں یہ بات دعواے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر شبیہ نے محنت سے یہ کام نہ کیا ہوتا تو بالآخر ان مرثیوں نے تلف ہو جانا تھا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے محض مرثیے جمع ہی نہ کیے بل کہ انھوں نے سو صفحے کا مفصل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں سیف زلفی کے حالاتِ زندگی، تعلیم، روزگار، شادی، اولاد اور تصانیف وغیرہ کے بارے میں ضروری کوائف مل جاتے ہیں لیکن اس مرثیے کا غالب حصہ مرثیوں کے تجزیہ و تحسین کے لیے وقف ہے۔ اس ضمن میں شبیہ الحسن نے محض سیف زلفی کے مرثیوں کے محاکمہ پر اکتفا نہ کرتے ہوئے معاصر اَدبی منظر نامے میں مرثیے اور مرثیہ نگاروں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یوں وہ تناظر مہیا ہو جاتا ہے جس پر رکھ کر ہم سیف زلفی کے مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی تنقیدی قدر و قیمت متعین کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ضمن میں یہ اساسی امر ملحوظ رہے کہ وہ ایسے علمی ادبی خانوادے کے فرد ہیں جہاں علم کا نور اور اہلِ بیتؑ سے محبت و عقیدت وراثتاً ملتا رہا ہے۔ ان کے والد سید وحید الحسن ہاشمی بزرگ مرثیہ

نگار ہیں۔ وہ مرنجاں مرنج انسان ہیں اور ساری عمر شہرت اور جاہ طلبی سے دُور رہ کر انھوں نے مرثیوں کی صورت میں اہلِ بیت سے محبت کا حق اُدا کیا ہے۔ یہی ذوق ان کے بیٹوں میں بھی ودیعت ہوا ہے۔ چناں چہ نقاش ہاشمی اور عرفی ہاشمی صاحب کتاب ہیں جب کہ شبیہ الحسن نے شاعری پر کم توجہ دی لیکن تحقیق وتنقید میں اپنے قلم کے جوہر دکھا دیے۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا اظہار اُن کی ایک درجن سے زیادہ کتابوں سے بھی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن جب سیف زلفی کے مرثیوں کا تجزیہ وتحسین کرتے ہیں تو وہ آشنائے مرثیہ ہو کر کرتے ہیں کہ مرثیہ ان کے .D.N.A میں شامل ہے۔ دیکھیے سیف زلفی کے پہلے مرثیے کے بارے میں انھوں نے کیا اچھی رائے دی ہے:

''سیف زلفی کا یہ مرثیہ جلال و جمال کی بہترین مثال ہے۔ پورے مرثیہ میں قصیدے کا ططنہ موجود ہے اور مرثیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ آخری بندوں میں شاعر نے بکائیہ بند شامل کر کے اسے حزنیہ رنگ دینے کی شعوری کوشش کی ہے۔ بعض مقامات انتہائی الم انگیز ہیں اور شاعر نے مہارت شعری سے ان کو مزید غم ناک بنا دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب مرثیہ ہے۔''

اب پہلے مرثیے کے دو بند ملاحظہ فرمایئے:

تو فخرِ انبیاؑ کی نشانی ہے اے حسینؑ
تو دین کی حسین جوانی ہے، اے حسینؑ
تجھ میں سمندروں کی روانی ہے اے حسینؑ
پتھر بھی تیرے ہاتھ میں پانی ہے اے حسینؑ
ہے جبر و اختیار پہ قدرت لیے ہوئے
آیا ہے معجزاتِ رسالت لیے ہوئے

جو مصطفیؐ خصال ہے تو وہ حسینؑ ہے
جو مرتضیٰؑ کمال ہے تو وہ حسینؑ ہے
جو مجتبیٰؑ جمال ہے تو وہ حسینؑ ہے
ہاں وہ جو لازوال ہے تو وہ حسینؑ ہے
تو نقطۂ عروج ہے انساں کی ذات کا
تو عکس ہے زمیں پہ میرے ثبات کا

سیف زلفی کے دوسرے مرثیے کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

''شاعر کا موقف ہے کہ اس معصوم بچے کی شہادت ذہن انسان پر اپنے مثبت اثرات مرتب کرے گی۔ آخری بندوں میں شاعر نے جذبات واحساسات کے بیان میں اپنی شاعرانہ مہارت کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرثیہ سیف زلفی کے فکر وفلسفہ اور فنی چابک دستی کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ اس مرثیے کی ایک نئی جہت یہ تھی کہ شاعر نے ''وسیلہ'' کا

عنوان دے کر اس مرثیے کو موضوعاتی بنا دیا تھا اور اسی حوالے سے انھوں نے موضوع کے مختلف رُخوں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب سعی بھی کی۔ مجموعی طور پر اس مرثیے کو موضوعاتی سطح پر بھی ایک کامیاب مرثیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔"

اب دوسرے مرثیے کے تین بند ملاحظہ فرمائیں:

بیٹے کی لاش لے کے چلے سیّدِ اُمم　　لیکن کسی خیال سے رکنے لگے قدم
سرکارؐ کو عجیب تذبذب تھا دم بدم　　بس ایک ہی گمان ستاتا تھا ایک غم
گودی میں کیسے لے گی تنِ پاش پاش کو
مر جائے گی ربابؑ جو دیکھے گی لاش کو

آخر لحد غریب نے کھودی بااضطرار　　کام آئی اس جہاد میں، حیدرؑ کی ذوالفقار
لے کر تمام ہمت و جرأت بروئے کار　　شبیرؑ نے زمیں میں چھپایا وہ شیر خوار
مٹی بیانِ غم سے زباں کھولنے لگی
وہ زلزلہ ہوا کہ زمیں ڈولنے لگی

دیکھا جو ضبط و صبر شہِ ذی وقار کا　　دانتوں میں انگلیوں کو دبائے تھے انبیاً
ششدر تھا دم بخود تھا فرشتوں کا سلسلہ　　اور اپنے انتخاب پہ نازاں تھا کبریا
آئی صدا کہ عزم کا پیکر حسینؑ ہے
ہاں میری ذات پاک کا مظہر حسینؑ ہے

سیف زلفی کے تیسرے مرثیے کے بارے میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن رقم طراز ہیں:

"سیف زلفی کا یہ مرثیہ فکری اعتبار سے موضوعی تناظر میں اس لیے اہم قرار پاتا ہے کہ شاعر نے پورے مرثیے میں حضرت عباسؑ ہی کو موضوعِ بحث رکھا ہے۔ لفظوں کے اُتار چڑھاؤ اور زیر و بم نے مرثیے کو صوتی اعتبار سے خوش گوار بنا دیا ہے۔ خاص طور پر جب سیف زلفی نے یہ مرثیہ اپنے مخصوص طرز میں پڑھا ہوگا تو اس کا اثر دوچند ہو گیا ہوگا۔"

اب تیسرے مرثیے کے دو بند ملاحظہ فرمائیں:

کڑیل جوان حیدرِ کرارؑ کی طرح　　اور آن بان جعفرِ طیارؑ کی طرح
ابرو کمان احمدِ مختارؐ کی طرح　　غازیؑ کا انگ انگ ہے تلوار کی طرح
ایسا دلیر ہے کہ دلیروں میں مرد ہے
وہ شیر ہے کہ دہر کے شیروں میں فرد ہے

اطوار میں سحر کی ''نئی پو'' لیے ہوئے
کردار میں اثر کی ہر اک رو لیے ہوئے
گفتار میں کتاب کا پرتو لیے ہوئے
رفتار میں سفر کا دمِ نو لیے ہوئے
اوصاف مصطفےٰؐ کا خزینہ ہے اس کی ذات
میدانِ کربلا میں مدینہ ہے اس کی ذات

چوتھے مرثیے کے بارے میں بھی اُن کا موقف دیکھ لیجیے۔ وہ اس طویل مرثیے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس طویل مرثیے میں شاعر نے اپنی خداداد شعری صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ خوب صورت اور نادر تراکیب و مرکبات نے اس مرثیے کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرثیہ اپنی فکر اور ندرت کے اعتبار سے انتہائی قابلِ قدر اور لائق توجہ ہے۔ خاص طور پر سیف زلفی نے اس مرثیہ میں عصرِ حاضر کے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی حالات و واقعات کو جس استعاراتی رنگ میں پیش کیا ہے وہ ان کی شاعرانہ مہارت کی دلیل ہے۔''

اب چوتھے مرثیے کے دو بند ملاحظہ کیجیے:

ہر چند راستہ ہی دکھاتے ہیں سب کے سب
دانش وروں کے آئیڈیل بھی ہیں منتخب
کچھ زیست کا جواز ہیں کچھ موت کا سبب
کچھ قائدانِ صبح ہیں کچھ رہبرانِ شب
ہر راہ رو کو راہبری سے لگاؤ ہے
ہر ذہن کو کسی نہ کسی سے لگاؤ ہے

اور فلسفہ پہ مارکس کے مرتے ہیں بے شمار
لینن کے اشتراک پہ کچھ لوگ ہیں نثار
زرتشت کے الاؤ میں جلتے ہیں چند یار
سقراط کے پیالے میں غلطاں ہیں دس ہزار
کچھ طالبانِ امن کو گوتم سے چین ہے
لیکن مری نظر کا اُجالا حسینؑ ہے

یہ مختصر مضمون اس اہم کتاب کے تمام مندرجات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ دراصل ''سیف زلفی کے مرثیے'' کو ایک کتاب نہیں بل کہ دو کتابیں کہنا چاہئیں کہ جو حُسن اتفاق سے ایک جلد میں پیوست ہیں۔ ایک کتاب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا طویل مقدمہ اور دوسری کتاب سیف زلفی کے مرثیے، مقدمے کے مطالعہ کے بعد سیف زلفی کے مراثی کا لطف دو چند ہو جاتا ہے کیوں کہ قاری مقدمے کی روشنی میں مرثیے کی فنی لطافتوں کا ذائقہ شناس بھی ہو جاتا ہے۔

ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر چڑھتے سورج کے پجاریوں کا معاشرہ ہے۔ ہم ان کی ''قدر'' کرتے ہیں جن سے ہمیں کسی طرح کی منفعت کی توقع ہو۔ اسی لیے وہ نمبر دو کا ذب تخلیق کار نمایاں نظر آتے ہیں

جو لوگوں کو فائدہ یا نقصان پہنچانے پر قادر ہوں۔ ان حالات میں جینوئن تخلیق کار کے لیے تخلیق گھاٹے کا سودا ثابت ہوتی ہے۔ اس عمومی بے قدری کے رویّے نے لاتعداد شعرا کو یوں بددل کیا کہ یا تو وہ لکھنا ہی چھوڑ گئے یا عمر بھر Frustrated رہے۔ نہ خود خوش رہے نہ کسی کی خوشی دیکھ پائے۔ ایسے میں ڈاکٹر پروفیسر سیّد شبیہ الحسن کی اس مساعی کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو وہ مرحومین کے تخلیقی ورثے کو منظرِ عام پر لا کر محفوظ کر رہے ہیں اور سیف زلفی کے مرثیے اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ اب چلتے چلتے آخری بات سیف زلفی ہی کے الفاظ میں سُن لیجیے:

دیکھے اگر تو چشمِ حقیقت نما ملے
پڑھ لے کوئی تو ذہن کو اس کے جلا ملے
لکھے اگر تو اس کے قلم کو بقا ملے
سُن لے تو کیفِ نغمگیٔ بے صدا ملے
شاعر کے تیوروں میں شبابِ حیات ہے
یہ مدحتِ حسینؑ بھی آبِ حیات ہے

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

maablib.org

سیف زلفی ــــــ روشنیِ فکر کا استعارہ

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

◆◆

رثائی ادب تخلیق کرنے میں استقامت، بلند حوصلگی اور ضبطِ نفس کی اہمیت سے انکار نہیں، مرثیہ کہنا آسان ہوتا یا مرثیے کی صنف سے کسی منفعت کا حصول ممکن ہوتا تو ہمارے شعرا بھی کوشش کرتے کہ دوسری اصناف شاعری کے ساتھ یہاں بھی اپنی صلاحیتیں آزمانے کی ہمت کرتے مگر مرثیہ کہنا عام شعرا کے بس میں نہیں۔ اس لیے رثائی ادب کی تخلیق سے شغف رکھنے والے اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، مرثیے میں ریاضت، بصیرت و بصارت اور فکر و نظر کی سخاوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ دوسرے مرثیے کی صنف میں جتنے کمالات فن عہد ماضی کے دو بڑے مرثیہ نگار شاعروں نے بھر دیے ان پر سبقت لے جانے کا تصور بھی خیال خام کہلائے گا لیکن جس طرح کوئی بات حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی یا کوئی تخلیق آنے والے زمانوں میں کسی نئی تخلیق کی راہ کا پتھر نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح صنف مرثیہ میں نئے گوشوں اور نئے اسالیب کی جستجو کا عمل جاری و ساری ہے۔ چناں چہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے بعد یہ سلسلہ جو عارضی طور پر آگے بڑھنے کی بجائے رُک سا گیا تھا لیکن ایک عرصہ کے بعد جوشؔ ملیح آبادی جیسے انقلابی شاعر نے اس صنفِ شاعری کو چیلنج سمجھ کر قبول کیا، مرثیہ گوئی میں ان کی طبع رواں نئے آب و رنگ اور جدید تقاضوں کو سامنے لائی، انھوں نے مرثیے میں روایتی انداز اظہار کی بجائے بیداری اور خودداری، حمیت و غیرت اور قوم میں عزم و حوصلہ پیدا کرنے کا وسیلہ قرار دے کر امام عالی مقام کی عظمتِ کردار کو نمایاں کیا۔ جوش کے مرثیے کو بعض ناقدین نے مسدس ثابت کرنے کی کوشش کی حالاں کہ مرثیہ اپنے موضوع کے اعتبار سے کربلا اور فن کے حوالے سے مسدّس سے الگ نہیں، جوشؔ کے مرثیے میں مرثیت سے زیادہ مقصدیت غالب ہے لیکن شعری معیار اتنا بلند ہے کہ ان کا مرثیہ پڑھتے ہوئے رگوں میں خون کی روانی تیز ہونے لگتی ہے اور فنی محاسن کے پیشِ نظر جوشؔ کا اُسلوب اظہار اپنی انفرادیت کا پرچم بلند رکھنے میں قاری سے اپنی عظمت کا لوہا منوالیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جوشؔ کے فکروفن سے مصطفٰے زیدی نے اثر قبول کیا اور مرثیے جیسی مشکل صنفِ سخن سے سیف زلفی متاثر ہوئے، اس میں شک نہیں کہ سیف زلفی ہمہ جہت شاعری کرتے رہے لیکن مرثیے میں ان کے ہاں جوش کا سا طمطراق، بلند آہنگ لہجہ، انقلابی رویہ اور بے باک انداز دیکھ کر ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ سیف زلفی جہاں ایک طرف عقیدت کے بحرِ ناپیدا کنار کے غواص ہیں وہاں وہ اس کی تہہ سے درِ بے بہا بھی نکال لاتے ہیں، ان کے مرثیوں میں روانی اور قافیہ پیمائی اپنی جگہ لیکن الفاظ کی دروبست، لہجے کی کھنک اور پُر اعتماد اندازِ اظہار نے سیف زلفی کو مرثیہ نگاروں کی اس صف میں لا کھڑا کیا ہے، جو عہدِ موجود میں مکتبِ جوشؔ کی نمائندگی کا دم بھرتے ہیں مثلاً

لکھتا ہے داستانِ قیادت مرا قلم   کرتا ہے جنگ امن کی صورت مرا قلم
پی کر شعور فہم و فراست مرا قلم   دیتا ہے زندگی کو حرارت مرا قلم
میرے قلم کی چھاؤں میں چلتا ہے آفتاب
لفظوں کے دائروں میں مچلتا ہے آفتاب

سیف زلفی کے حلقۂ احباب میں پرتو روہیلہ اور قیصر بارہوی کی شاعری میں جو خصوصیات نمایاں ہیں وہی سیف زلفی کے ہاں بھی نظر آئیں گی لیکن جس طرح ہر شخص کی آواز دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور اسی آواز سے وہ پہچانا جاتا ہے اسی طرح سیف زلفی کے ہاں وہ آواز ان کی شعریت میں ڈھل کر قدرے مختلف ہو جاتی ہے، مرثیے میں ان کے ہاں حُسن غلو اور حُسنِ عقیدت کے امتزاج سے جو فضا بنتی ہے وہی فضا قیصر بارہوی کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے لیکن مماثلت کے باوجود سیف زلفی اپنی پہچان کے لیے جس اعتماد کے ساتھ قلم برداشتہ مصرے رقم کرتے ہیں اس پر کسی دوسرے شاعر کی چھاپ نہیں۔ ان کی فکر کا دھارا اس طرح بہتا دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی جھرنا پھوٹ کر بہہ نکلے۔ سیف زلفی نے مرثیے میں لفظوں سے نئی روشنی اُگائی ہے، قاری ان کی لفظیات میں حُسنِ بیان سے زیادہ قدرتِ بیان کا مطالعہ کرتے ہوئے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے، شعری صداقتوں میں زمینی حقائق کی جستجو کرنا بے سود عمل ہے بل کہ یوں کہا جائے کہ ایسا طرزِ عمل کم ذوقی پر دلالت کرتا ہے۔ سیف زلفی نے لفظی تراکیب کے استعمال میں اسی مرثیے کا ایک اور شعری بند عشقِ علیؑ کی سرمستیوں میں ڈوبا اور نادِ علیؑ معجز نمائی کا آئینہ بنا۔ ہماری نظروں میں نور وفور بھرتا دکھائی دیتا ہے:

عشقِ علیؑ کا کیف سمو دوں نفس نفس   ذکرِ علیؑ کے پھول پرو دوں نفس نفس
حبِّ علیؑ کے سیل سے دھو دوں نفس نفس   مدحِ علیؑ کے بیج بھی بو دوں نفس نفس
پودے اُگیں تو جھوم کے نادِ علیؑ پڑھیں
دیوانے گھوم گھوم کے نادِ علیؑ پڑھیں

سیف زلفی جس طرح عقیدے میں کھرے تھے اسی طرح وہ معاملات میں بھی کھرے تھے۔ خوددار، خودنگر اور بے دار مغز ہونے کے سبب کسی سے دب کر بات کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ زندگی گزارنے کا سلیقہ یہی رہا کہ قدم قدم پر ہماری وسعت پذیر دنیا کو روشنی سے نوازا، مرثیے سے بہتر اخلاقی اقدار کی فروغ پذیری کا عمل کسی دوسری صنفِ شاعری کے حصے میں نہیں آیا۔ اس لیے سیف زلفی نے مرثیے میں عالمِ انسانیت کی اعلیٰ اور ارفع کرداروں کے اندازِ فکر و عمل کو مشعلِ راہ بنا کر اپنی زندگی کو ہنرمندی سے بسر کیا۔

حضرت خدیجہؓ کی سیرت کو مرثیے کے ایک بند میں ایجاز و اختصار سے پیش کرنے کی مثال ملاحظہ کیجیے:

اتنی بلند تھی وہ خدیجہؓ فلک مقام ‏ ‏ رہتی تھی بس رسولؐ کی خدمت میں صبح و شام
پیکر تھی نیکیوں کا تو پایا تھا نیک نام ‏ ‏ اسلام کی کتاب میں زندہ ہے اس کا کام
زر جس قدر تھا راہِ خدا میں لٹا دیا
فاقے اٹھائے دین کا سکّہ بٹھا دیا

اسی طرح پنجتن پاکؑ کی سیرت و کردار سے مرثیے کو وقیع بنانے میں سیف زلفی خصوصیت کے ساتھ کردارِ حسینؑ کو موضوعِ سخن بنا کر پیش کرتے ہیں تو ان کا قلم خوشبو بکھیرنے لگتا ہے، وہ امام عالی مقامؑ کے اوصافِ جلی بیان کرتے ہوئے سرخوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور قاری کو اس مقامِ عقیدت پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں سے وہ اس عظیم المرتبت ہستی کے ساتھ رشتۂ مودّت باآسانی استوار کر سکتا ہے:

اک تازہ انقلاب کا بانی حسینؑ ہے ‏ ‏ زندہ شجاعتوں کی نشانی حسینؑ ہے
طوفاں کی تند و تیز روانی حسینؑ ہے ‏ ‏ جرأت کی لازوال جوانی حسینؑ ہے
ہے مشکلوں کے سامنے سینہ تنا ہوا
راہِ ثبات میں ہے ہمالہ بنا ہوا

یہی سیف زلفی کا فن ہے کہ ان کی نظر میں امام عالی مقامؑ عزمِ شہادت اور دین کی نصرت میں ہمالہ کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں...... یقیناً عہدِ موجود کا مرثیہ نگار سیف زلفی ہم سب کی نگاہ میں روشنی فکر کا استعارہ ہے وہ اعتبارِ وطن ہمارے قلم قبیلے کی آبرو ہے۔

وہ اپنے زخمِ جگر کے ہاتھوں نڈھال ہو کر بھی سرخرو ہے ـــــ اور اس کا یہ دعوا بجا ہے کہ:

جھولی بھری ہے میں نے زکاتِ حسینؑ سے
ہر روشنی ملی ہے حیاتِ حسینؑ سے

سیف زلفی نے احتیاط کے باوجود مبالغہ آرائی یا بیان میں ندرت پسندی سے کام لیا ہے:

اوصاف بابِ علم کروں گا اگر رقم چومیں گے روشنی کے فرشتے مرا قلم
اُترے گی داد محفلِ انجم سے دم دم چہکیں گے شعریت کے پرندے ارم ارم
مجھ کو بھی فن ملا ہے انیسؔ و دبیرؔ کا
شاعر ہوں خاندانِ جنابِ امیرؑ کا

ادراک کا جمال سپردِ قلم کروں ہر نقطۂ عروجِ فراست رقم کروں
جن و ملک کو پائے تقدس پہ خم کروں مولاؑ کی منقبت پہ میں قرآن دم کروں
مصرعوں میں کائنات کی سمتیں سمیٹ لوں
اُنگلی پہ آسمان کی پرتیں لپیٹ لوں

سیف زلفی مبالغہ پسندی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے جتنا لکھا اس میں ایک طرف اپنی حیثیت اور اہمیت سے کبھی صرفِ نظر نہیں کیا۔ دوسری طرف ان کے ہاں تعلّی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔

وہ اپنے عہد کی اہم شخصیتوں سے گہرے روابط رکھتے اور ان کو ادبی سرگرمیوں میں شریک رہنے کی ترغیب دیتے رہے، انھوں نے نظمیں اور دوہے بھی لکھے اور غزل بھی کہی جو کچھ لکھا ڈوب کر لکھا اور فکر و احساس کی شدت ہر تخلیق میں ان کی پہچان بن گئی، مرثیہ نگاری میں نیا لہجہ شعوری کوشش اور ہنرمندی کے ساتھ اپنایا، کسی نے سیف زلفی کو غمِ زیست کا شاعر کہا، کسی نے جرأتِ اظہار کا شاعر گردانا اور کوئی انھیں ایک انقلابی شاعر خیال کرتا ہے لیکن سید وحید الحسن ہاشمی نے انھیں مرثیے کا منفرد شاعر بتایا ہے، ان کا کہنا ہے کہ سیف زلفی نہ خطیب ہے نہ مناظر نہ اسے منطق سے کام ہے نہ اصلاحِ رسوم سے، وہ ایک شاعر ہے اور شاعر کا مقصدِ حیات فن کی بقا اور شاعری کی روایت کو آگے بڑھانا ہے اور اگر وہ اپنے بگڑے ہوئے معاشرے اور گرتی ہوئی اقدارِ حیات پر تنقید کرتا ہے تو یہ معروضی حالات کے سبب ہے کیوں کہ وہ اسی ماحول اور اسی معاشرے میں زندگی گزار رہا ہے۔ جہاں دوسرے انسان اپنی بقا کے لیے کوشاں ہیں۔

سیف زلفی کو اُدبی دنیا میں نمایاں ہونے اور اپنی قدر و قیمت سے دوسروں کو آگاہ کرنے کی بھاری قیمت اُدا کرنا پڑی۔ انھوں نے جتنی محنت کی اتنا معاوضہ نہ ملا بل کہ ایک طبقۂ خیال نے ان کو انا پرست شاعر خیال کیا حالاں کہ ایسا نہیں بل کہ وہ ایک دردمند انسان تھے اور دوسروں کے غم میں شریک رہ کر زندہ رہے۔
یوں تو رثائی اُدب تخلیق کرنے والا شاعر اپنے پہلو میں درد آشنا دل رکھتا ہے مگر وہ ہر بے بصر کو راہ دکھانے اور روشنی کا راگ الاپنے کی خواہش رکھتے تھے، وہ عشقِ علیؑ کو نعمتِ عظمیٰ اور ان کے در کی گدائی اور خلقِ خدا کے ساتھ بھلائی کو اپنے لیے موجبِ فخر و مباہات تصور کرتے رہے۔

ذکرِ علیؑ میں لفظ کے سورج اُچھال دوں | مصرعوں کو آفتاب کی کرنوں میں ڈھال دوں
جذبے کو دوں جلا تو شفق کو جمال دوں | منکر کے ذہن و دل سے اندھیرے نکال دوں

ہر بے بصر کو راہ دکھاتا چلا چلوں
میں روشنی کے راگ میں گاتا چلا چلوں

سیف زلفی نے مختلف جہتوں میں تخلیقی سفر جاری رکھا لیکن طبیعت میں بے نیازی اور لااُبالی پن کے باعث اپنے تخلیقی سرمائے میں جتنا اضافہ ہوتا رہا اتنا ہی اسے مرتب کرنے میں ان کی غفلت شعاری اور بیماری حائل رہی جس کے نتیجے میں ان کا کلام خصوصاً رثائی سرمایہ کاغذ کے پرزوں یا اُدھوری بیاضوں میں تقسیم ہوتا رہا، وہ اپنی زندگی میں یہ کام نہ کر سکے اور یوں ان کے مرثیے اشاعت سے محروم رہے جب کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اس بکھرے ہوئے اور غیر مرتب کلام کو محققانہ انداز میں دیکھا اور پرکھا، سیف زلفی غیر معروف نہیں تھے لیکن بحیثیت مرثیہ نگار ان کا مقام و مرتبہ متعین نہیں ہوا تھا، چناں چہ انھوں نے ''سیف زلفی کے مرثیے'' (تجزیہ و تدوین) کا مقدمہ لکھتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی کہ سیف زلفی کی مجموعی شاعری اور خصوصاً ان کے مرثیوں میں معاشرتی اصلاح اور عظمت انسانی کے مثبت رویے موجزن ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیف زلفی کی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات منظر عام پر لائی جائیں تاکہ ہم سیف زلفی کی قدر و منزلت کا بار دگر تعین کر سکیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا مقدمہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انھوں نے ''سیف زلفی کے مرثیے'' کی تدوین میں کوئی پہلو تشنہ نہیں رکھا۔ سیف زلفی کی پیدائش سے لے کر ان کے سفرِ آخرت تک ان کے خاندان خصوصاً ان کے والد گرامی سید مقبول حسین رضوی کا اَدب سے شغف، مذہب سے لگاؤ اور رثائی اَدب سے دل چسپی اور سید ذوالفقار حسین رضوی (سیف زلفی) کی تعلیم و تربیت اور بریلی میں ان کے بچپن کے واقعات کے علاوہ نقل مکانی اور لاہور میں نئے سرے سے جہد مسلسل کا آغاز غرض تحقیق کا حق اَدا کیا، ان کا شاعری کے ساتھ جنون کی حد تک عشق ہم عصر شعراء میں نمایاں ہونے کی خواہش اور اَدبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا شوق عمر عزیز کے آخر تک رہا، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ سیف زلفی عمر بھر علم و اَدب کی آبیاری میں سرگرم عمل رہے انھوں نے رسالہ ''عکسِ نو'' اور ''گل فشاں'' کے مدیر کی حیثیت سے شعر و اَدب کی ترویج کے لیے اپنی جملہ صلاحیتیں صرف کیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان کے بیٹے رضا انتخاب کے تعاون سے جہاں ان کے چار مرثیوں کی طباعت کا اہتمام کیا وہاں اس سے پہلے ''شام و سحر'' کا خصوصی نمبر ''سیف زلفی'' شائع کیا اسی طرح ایک ضخیم کتاب ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' مرتب کر کے نذرِ قارئین کی جو ۵۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں سیف زلفی کا

تعارف، ادبی خدمات اور نمائندہ ادیبوں کے مضامین اکٹھے کر کے اس کتاب کو سید اعتبار عطا کی، ان میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، جیلانی کامران، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر ناہید شاہد کے علاوہ ان کی نعت نگاری پر رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، ڈاکٹر آغا سہیل، ظہیر کاشمیری، ظفر الحق چشتی اور دوسرے احباب نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مرثیہ نگاری پر سیر حاصل مضمون سیف زلفی اور اُردو مرثیہ کے عنوان سے سید وحید الحسن ہاشمی کی تحریر پڑھنے کے لائق ہے۔ سلام نگاری پر سید نواز حسن زیدی کا مضمون ان کے ہاں جدت فکر کی نشان دہی کرتا ہے۔

بہر حال اب سیف زلفی ہمہ جہت شخصیت اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جائیں گے یقیناً وہ روشنی فکر کا استعارہ بھی ہیں اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کی محنت اور ریاضت کے حوالے سے شاعر کامگار بھی ہیں کہ ان کی تمنا اور حرف دعا میں مطابقت نے انھیں آبجو سے دریا اور دریا سے سمندر بنا دیا ہے، آیئے ان کی التجا سے اپنی سماعتوں میں رس گھولنے کا اہتمام کرتے ہیں، یہ التجا بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کی گئی:

زلفی کو شاعری کا پیمبر بنایئے — غالبؔ کا اور انیسؔ کا ہم سر بنایئے
عزت میں زر میں جاہ میں برتر بنایئے — سرکارؐ اس ندی کو سمندر بنایئے

کر دیجیے علاج مرے دل کے چین کا
سرکارؐ مانگتا ہوں میں صدقہ حسینؑ کا

(ماہنامہ شام وسحر لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

سیف زلفی کے مرثیوں کی دستک

ڈاکٹر اجمل نیازی

♦♦

جب وہ زندہ تھا تو وہ میرے قریب کے دوستوں میں سے نہیں تھا لیکن میں نے اُس کی دوست نوازیوں میں قربتوں کے دائرے بنتے ضرور دیکھے ہیں۔ وہ اپنے ہر ملنے والے کو دوستی کے دائرے میں لے لیا کرتا تھا۔ اُس کے اردگرد دائرے بنتے اور بڑے ہوتے رہتے تھے۔ جس طرح لہروں پر دائرے بنتے اور رقص کرتے ہوں لیکن بڑے ہو کر تحلیل ہوتے رہتے ہیں مگر تحلیل اپنے ہی پانی کے اندر ہوتے ہیں۔ ایک عجب بے قراری اُس کے وجود میں وجد کرتی تھی۔ یہ بے قراری اپنے آپ سرشاری بنتے بنتے پھر بے قراری بن جاتی تھی اور وہ اس کیفیت سے مزا لیتا تھا بلکہ لطف اٹھاتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اُس کی شاعری اسی کیفیت سے پھوٹتی تھی اور پھر ٹوٹتی تھی اور ٹوٹ ٹوٹ کر پھوٹتی تھی۔ مگر ٹوٹ پھوٹ نہیں جاتی تھی۔ وہ پڑھتا تھا تو لگتا تھا کہ جیسے اپنے آپ کو سُنا رہا ہے۔ وہ اپنے سامعین کو اپنے آپ میں سمجھتا تھا۔ اُس کے مرثیے برادرم ڈاکٹر شبیہ الحسن نے چھاپے ہیں اور اُس سے مطابقت رکھتا ہوا دیباچہ لکھا ہے۔ سو صفحے کے مرثیے اور سو صفحے کا دیباچہ۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھا جو اُس کی شاعری کی طرح لوگوں نے علاحدہ چھاپ کر اُس کا نام ''مقدمہ شعر و شاعری'' رکھ دیا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مرتبہ سیف زلفی کے ان مرثیوں کے مقدمے کو ''مقدمہ سیف زلفی'' کہا جائے تو غلط نہیں ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن مرے ہوئے دوستوں کو یاد کرتا ہے اور انھیں زندہ کر دیتا ہے۔ اُس کا شکریہ کہ اُس نے سیف زلفی کے لیے اس یادوں بھری محفل میں مجھے بھی یاد کیا اور ساتھ میں میرے محبوب بزرگ سید وحید الحسن ہاشمی کو بھی بلوایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی محفلوں میں شریک ہو کر میں نئے سرے سے جی اُٹھتا ہوں۔ سیف زلفی کے مرثیوں کی یہ کتاب بھی اندر سے زندہ کرنے والی کتاب ہے۔ جاگنے والوں کو جگا دینے والی کتاب ہے۔ سیف زلفی نے اپنے زمانے میں اپنے آپ کو جگا کر رکھا اور اب ہم اُسے یاد کر کے اپنے آپ کو جگانے کی کوشش

کر رہے ہیں۔ میں نے اُس کے لیے پہلے بھی شبیہ الحسن کے کہنے پر ایک مضمون لکھا تھا ''ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا شاعر''۔ وہ اس ٹکڑے ٹکڑے بار بار ہوتا تھا کہ ہر ٹکڑے میں کئی سیف زلفی دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور اب تو کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگ گئے ہیں اور اُسے کسی بھی طرح بیان کرنا بڑا مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اُسے جانتا ہوں مگر میں اُسے نہیں جانتا تو بھی سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ میں برملا کہہ دوں کہ میں اُسے مانتا ہوں۔ اُس کے ساتھ میری آخری ملاقات پاکستان ٹیلی ویژن کے صدر دروازے پر ہوئی تھی۔ وہ اپنا مرثیہ پڑھ کر آرہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے مجھے دیکھا تو محسوس ہوا کہ یہ مرثیہ اُس نے اپنی ان ہی آنسوؤں بھری آنکھوں میں قلم ڈبو کر لکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مرثیہ تو پھر اسی طرح لکھا جاسکتا ہے۔ مَیں اُس سے ہاتھ ملاتے ہی مسکرایا تو وہ بھی مسکرایا۔ اُس کی مسکراہٹ میں ایسی آہٹ تھی جو مَیں نے پھر کسی دستک میں نہیں سُنی۔ شاید دل پر دستک ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ اندر سے خوب صورت آدمی تھا۔ افتخار مجاز نے بھی اُسے ایسے ہی کسی عالم میں دیکھا تھا۔ اُسے چاہیے کہ وہ اُس کے بارے میں لکھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شبیہ الحسن جیسے بندے بہت ہونے چاہئیں جو ایسی محفلیں آباد کریں کہ جہاں اپنے اندر گم ہونے والے لوگوں کو بھی تلاش کیا جاسکے۔ لوگوں نے کیسے کیسے لوگ اپنے ہی اندر کھو دیے ہیں۔ مَیں نے سیف زلفی کے یہ مرثیے پڑھے تو اُسے اپنے سامنے مرثیے پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ ایسے شخص کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ اُسے یاد بھی کیسے رکھ سکتے ہیں۔ بھلانے اور یاد کرنے کے درمیان کوئی لمحہ کہیں ہے جہاں سیف زلفی جا کر آباد ہو گیا ہے۔ ہم وہاں پہنچیں تو اُس سے ملیں۔

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا منفرد کارنامہ "سیف زلفی کے مرثیے"

ڈاکٹر عبد الکریم خالد

◆◆

میرا اندازہ ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں فقط دو اصناف ہی ایسی ہیں جو سیکڑوں ماہ و سال گزرنے کے باوجود اپنے پورے طمطراق اور شان و شوکت کے ساتھ آج بھی قدم جمائے کھڑی ہیں اور حوادثِ زمانہ ہزار کوشش کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے بل کہ ابتلا اور مصیبت کا ہر دَوران کے لیے ایک نئی زندگی کا پیام ثابت ہوا ہے اور یہ کارواں نئے بھر ے سے جادہ پیما ہوا ہے۔ میری دانست میں ان دو اصناف میں سے ایک مرثیہ ہے، جس کا علَم آج بھی اُتنا ہی اُونچا ہے جتنا انیس و دبیر، ضمیر و خلیق، سودا اور اُن سے پہلے ادوار میں رہا ہے اور دوسری صنف غزل کے سوا اور کون سی ہو سکتی ہے۔ جس طرح آج کی غزل نے کشادہ دلی اور فراخ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے مستقل موضوعات کے ساتھ اُن موضوعات کے ساتھ بھی ناتا جوڑا ہے جو اس کے مزاج اور کیفیت سے بظاہر مناسبت نہیں رکھتے۔ اُسی طرح مرثیے نے بھی رواں عہد میں نہ صرف موضوعی اور معنوی سطح پر بل کہ فنی سطح پر بھی اپنا رنگ بدلا ہے اور جدید تناظر میں نئے آہنگ کے ساتھ اپنی زندگی کا جواز فراہم کیا ہے۔ میرے خیال میں غزل اور مرثیے دونوں کی بقا کا راز اِسی بات میں پوشیدہ ہے کہ انھیں ہر دَور میں ایسے باکمال، ذہین اور جگر کاوی کے عمل سے گزرنے والے شعرا ملتے رہے ہیں، جنھوں نے تازہ ہواؤں اور نئی روشنی کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں اور نئے دَور میں پرانی بات بھی اس سلیقے اور ہنر مندی سے کہی ہے کہ اس پر مصرعۂ تر کا گمان ہوا ہے۔

چناں چہ آج کا مرثیہ ہر اعتبار سے اس مقام پر کھڑا ہے جہاں اسے اپنا خونِ جگر دینے والے بھی میسر ہیں اور اسے افکارِ تازہ سے سروسامان کرنے اور مضامینِ نو کے انبار لگانے والے بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُردو مرثیے کی ترویج و اشاعت اور اس کی وسعت پذیری کے عمل میں ان اہلِ بصیرت نقادوں کا بھی بہت ہاتھ ہے، جنھوں نے اس صنفِ سخن کی قدر و اہمیت کو اُجاگر کرنے میں بے دریغ اپنا قلم استعمال کیا اور اسے اپنی

اصل روح کو زندہ کرنے والے اہلِ سخن کے کارناموں سے آج کی دنیا کو روشناس کرایا۔

سیف زلفی کا نام اُردو شاعری کی تاریخ میں کئی حوالوں سے زندہ و تابندہ رہے گا لیکن انھیں ایک پُر مغز اور باکمال مرثیہ گو کے طور پر متعارف کرانے میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے جس محنت اور ریاضت سے کام کیا ہے اِس پر وہ ہم سب کے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے علم و ادب کے دائرے میں رہ کر جو کام بھی کیا ہے اُسے اس توجہ، محنت اور دیدہ ریزی سے انجام دیا ہے کہ وہ بجائے خود نہ صرف تخلیق کے حُسن سے بھر گیا ہے بل کہ اُسے ایک تاریخ اور دستاویز کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ خاص طور پر انھوں نے اپنی تخلیق اور تنقید کا رُخ اُردو مرثیے کی طرف پھیر کر جس خوش سلیقگی سے جمع و تدوین کے اصولوں کو متعارف کرایا ہے اور مختلف شعرا کے کلامِ دل نشین کی اساس دریافت کر کے نادر فنی جہتوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس پر وہ ہمیشہ کے اُردو مرثیے کی تاریخ سے اِس طرح وابستہ ہو گئے ہیں کہ آئندہ اِس موضوع پر کام کرنے والا اُن کے دائرۂ عمل سے باہر نکل کر کام کر ہی نہیں سکتا۔ اس سے قبل وہ اُردو مرثیے کے حوالے سے آلِ رضا اور سید وحید الحسن ہاشمی پر نہایت اہم اور مفید کام سرانجام دے چکے ہیں۔ حال ہی میں سیف زلفی کے مرثیوں کی تدوین کے عمل سے گزر کر سرخرو ہوئے ہیں اور آئندہ کے لیے قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین و ترتیب کا اہم منصوبہ شروع کر چکے ہیں اور اس سے آگے نہ جانے کتنے ہفت آسماں ہیں جو انھیں طے کرنا ہیں۔ مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو کام اداروں کو کرنے چاہئیں وہ اکیلے شبیہ الحسن اس سہولت سے انجام دے جاتے ہیں کہ اس پر ایک معجزے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ دراصل ان کی ذہنی اور علمی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے اور علم و ادب کا ذوق و شوق انھیں جس فراوانی سے عطا ہوا ہے وہ اُس کے تقاضوں کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کا حق اَدا کرنے میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔ اِن کی دیگر مصروفیات کا حال مجھے معلوم ہے کہ اَب دوستوں سے ملنے کے لیے وقت نکالنا بھی ان کے لیے مشکل ہے اور اس کے لیے بھی انھیں باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑتی ہے۔ اس حال میں تحقیق و تدوین کے کاموں کے لیے وہ کہاں سے وقت لاتے ہیں اور ذہن و خیال کے مابین سلسلوں کو جوڑنے کے لیے کس گھڑی مصروفِ کار ہوتے ہیں، اِس کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں سیف زلفی کے چار مرثیے شامل کیے گئے ہیں اور یہ چار مرثیے ایسے ہیں جنھیں ڈھونڈ نکالنا بھی شبیہ الحسن کے کمالات میں سے ایک کمال ہے۔ ان مرثیوں کی ترتیب و تدوین کے علاوہ اِس کتاب میں خاصے کی چیز وہ مدلل اور جامع مقدمہ ہے جو سیف زلفی کی پوری شخصیت اور اُن کے کُل کلام کا احاطہ کرتا ہے۔ تحقیق کی روایت میں مقدمہ نگاری کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن پوری تفصیل سے مقدمہ قلم بند کرتے ہیں اس میں معمولی جزئیات کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور ممکنہ حد تک اپنے موضوع کے بارے میں تمام تفصیلات فراہم کر دیتے ہیں چناں چہ اِس کتاب میں ۱۰۴ صفحات کو محیط طویل مقدمہ تحقیقی اور تنقیدی

اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس مقدمے میں سیف زلفی کی شخصیت کے خدوخال ہی واضح نہیں ہوتے بل کہ اُن کی سخن وری کے مختلف زاویے بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ نیز اُن کے فن پر دیگر اہلِ قلم کی آرا سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مقدمے میں سیف زلفی کے مرثیوں پر نہایت مبسوط اور مدلّل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے بارے میں تحقیقی حقائق کو مختلف حوالوں کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مرثیوں کا مختصر تجزیہ بھی بے حد اہم ہے جس کے تناظر میں سیف زلفی کا بطور مرثیہ نگار مقام و مرتبہ متعین ہوتا ہے۔ جہاں تک سیف زلفی کے مرثیوں پر میری رائے کا سوال ہے تو یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ سرِ دست اتنا ہی کہوں گا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اِن مراثی کو منظرِ عام پر لا کر ایک بہت ہی اہم علمی و اَدبی خدمت انجام دی ہے اور اُن کے اِس علمی و ادبی اور تحقیقی کارنامے پر داد دینا ہم سب پر فرض ہے۔

◆◆◆

سیف زلفی کے مرثیے اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کا نسخۂ خیر

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

◆◆

سیف زلفی مرحوم اپنی متنوع الجہات شاعری اور منفرد تخلیقی استعداد کے سبب اپنی زندگی ہی میں نامور ہو چکے تھے۔ موضوعات کی وسعت اور ہمہ گیری نے انھیں کسی ایک صنف کا پابند رہنے نہیں دیا ان کی طبع آزاد کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اظہار بیاں کے لیے وہ کسی ایک سانچے کے اسیر نہ رہ سکتے تھے۔ بل کہ نئے سانچوں کی تلاش میں اختراعی حربوں کو آزمانے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ اس نوع کی کاری گری ایک اعلیٰ درجے کی ذہانت کے بغیر عمل میں نہیں آ سکتی۔ یوں تو ہر شاعر ذہانت کا حُسن رکھتا ہے کہ شاعر کی ذہانت ہی حُسنِ تدبیر کی صورت اختیار کر کے اس کی نازک خیالی کو لفظوں میں متشکل کرتی ہے اور انھیں تربیت دے کر مصرعۂ تر ایجاد کرتی ہے لیکن سیف زلفی کی ذہانت ایک عام شاعر کی ذہانت سے مختلف درجے پر اپنی حُسن کاری دکھاتی ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے یہاں تخلیقی سطح پر کسی خیال کا در آنا شعوری حربوں کا رہین احسان نہیں۔ آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ شعر کسی شعوری کاوش کے بغیر بھی وجود میں آ سکتا ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ بظاہر تو ایسا ممکن نہیں کہ شعر کی خارجی ساخت سراسر شعور کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن شعر اپنی خارجی شکل میں نمو پانے سے پہلے جن مراحل سے گزرتا ہے وہ خیال، وجدان، گمان اور دھیان کے غیر مرئی ہیولوں کی کیفیتوں میں نمو پذیر ہوتے اور اپنی سیمابیت کے سبب تھرکتے ہوئے کئی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ یہ عمل آناً فاناً رونما ہوتا ہے اور اس دوران میں ہزاروں کیفیتیں آ کر گزر جاتی ہیں۔ تب دھیرے دھیرے یہ کیفیتیں ایک کیفیت میں ڈھل جاتی ہیں اور شعر ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو جو چاہے نام دے لیں، آپ پر منحصر ہے لیکن میرے خیال میں یہ اس نوع کی شعوری کاوش نہیں ہے کہ آپ بطورِ خاص اہتمام کر کے لفظوں کے سیپ میں خیال کے نگینے تراش کر رکھتے رہیں۔

سیف زلفی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ شاعری کی تخلیق کسی میکنزم کے ذریعے عمل میں نہیں

آ سکتی۔ نہ ہی شاعر کے پاس کوئی ایسا آلہ موجود ہوتا ہے جسے گھما کر یا بٹن دبا کر وہ اِدھر خیال کو حاضر کرے اور اُدھر لفظ کو حکم دے کہ خیال کا ماتھا چوم کر اُسے سینے سے لگائے اور دم سادھ لے۔ لفظ کے اندر خیال کا وُرود یوں غیر محسوس انداز میں انجام پاتا ہے کہ لفظ کو بھی دیر بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بطن میں کوئی شے پل رہی ہے جسے شاعر کے حیات آفریں لمس نے تکمیل کا اِذن دینا ہے اور ''کُن'' کہہ کر اہلِ ذوق کے لیے ''فیکون'' کا سامان فراہم کرنا ہے۔ میں بطور خاص سیف زلفی کے حوالے سے یہ بات اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کی شاعری کا ہر لفظ آپ کو بولتا اور کلام کرتا نظر آئے گا۔ اہلِ نظر یہ بات جانتے ہیں کہ لفظ پر کسی شعوری خیال کا حکم لگا کر اسے بولنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ سیف زلفی کی غزلیں ہوں یا دوہے، نغمے ہوں یا گیت، قطعات ہوں یا رباعیات، بچوں کے لیے نظمیں ہوں یا لوریاں۔ ان سب اصناف میں اس کی تخلیقی ذہانت عجب انداز میں اپنی کرشمہ کاری دکھاتی اور فطری احساس کی شبنم میں بھیگے ہوئے لفظوں کو سُبک خرام کرتی ہے۔

سیف زلفی کا کمال یہ ہے کہ اس نے مرثیے جیسی خالص خارجی صنف میں بھی اِسی تخلیقی ذہانت کے بل بوتے پر لفظوں کا مزاج تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے پہلے مرثیے ہی کا پہلا بند ہے:

لفظوں کے دائروں میں اِرم کی بہار ہے — اجلا ہے ذہن اور قلم پر نکھار ہے
مصرعوں سے حسن، حسن سے فن آشکار ہے — جبریلِ فکر دوشِ صبا پر سوار ہے
آنکھیں ہوئیں جو بند تو تنویر دیکھ لی
تخئیل نے حسینؑ کی تصویر دیکھ لی

دوسرے مرثیے کا دوسرا بند بھی اسی صورتِ حال کو سامنے لاتا ہے:

ذہنوں میں روشنی کا سراپا ہوا جواں — لفظوں کے آفتاب اگلنے لگی زباں
غلطاں ہوا تو مطلعِ انوار تھا جہاں — آنکھوں میں رنگ و نور کا اک بحرِ بے کراں
خورشید عقل و فکر کی بارات ہو گئی
ارض و سما میں نور کی برسات ہو گئی

یہ دونوں بند سامنے رکھیے اور میری اس بات پر غور کیجیے کہ شاعر کے تخیل نے نہ صرف الفاظ کے دروں میں اپنی طلسم کاری کے جوہر دکھائے ہیں بل کہ ان کی خارجی سطح پر اس طور اپنی پرچھائیں ڈالی ہیں کہ لفظ بجائے خود ایک وجدانی کیفیت کے حصار میں سرمست نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شاعر کا تخلیقی عمل ہے جس کے بارے میں ایک نقاد کا کہنا ہے کہ وہ ایک ایسا پُرگو اور زود نویس تھا کہ باتوں باتوں میں شعر تخلیق کر لیا کرتا تھا۔ میرے خیال میں پُرگوئی اور باتوں باتوں میں شعر کہنے کا وصف اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک ایک زبردست قوتِ متخیلہ شاعر کے احساس اور اس کے وجدان میں موجود نہ ہو اور اس کے تخلیقی عمل کو مہمیز دینے میں مصروفِ کار نہ ہو۔

ایسا تخلیق کار نقاد کو بہت مشکل میں ڈالتا ہے چناں چہ نقاد اس کے اِس نوع کے کام کو محض خیال آرائی پر محمول کر کے اپنا پنڈا چھڑا لیتا ہے اور اس کی متخیلہ کے دروں میں جھانکنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ نقاد کو یہ کام ضرور کرنا چاہیے لیکن کم از کم اتنا تو ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ تخلیق کار کا یہ سارا عمل کس غیر مرئی وجدانی نظام کے تحت وقوع پذیر ہو کر انجام پا رہا ہے۔

میرے اس بیان کو اگر آپ تشبیب کا درجہ دے لیں تو اس کے بعد گریز بھی لازم ہے اور گریز کے بعد مدح سرائی کا مرحلہ آتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن میرے دوست ہیں اور انھوں نے کافی عرصے سے سیف زلفی کی شخصیت اور فن پر قلم آزمائی کا منصب سنبھال رکھا ہے۔ سیف زلفی کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی نادر شخصیات کو دھیان میں رکھا ہے اور گاہے گاہے ان کے بارے میں اپنے خلوص اور محبت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ میں انھیں ایک شائستہ اطوار اور خوش بیاں نقاد اور ایک دردمند اور رحم دل محقق کا درجہ دیتا ہوں۔ تنقید اور تحقیق دونوں میں وہ خوب رواں ہیں مگر یوں کہ چڑھتے ہوئے پانی کی شوریدہ سری کو جوئے نغمہ خواں بنا کر چھوڑتے ہیں۔ ان کے کیسہ ہنر میں پتھر بھی نگینے بن جاتے ہیں اور دستِ جوہر شناس میں خاک بھی کیمیا ہو جاتی ہے۔ انھیں قدرت کی طرف سے یہ وصف ودیعت ہوا ہے کہ محبتیں بانٹتے رہو اور اپنی فیض رسانی کے سلسلے کو استوار رکھو اور دوسرے سے صرف ایک امید رکھو کہ وہ ملتا رہے اور اپنی خیر خبر دیتا رہے۔ یاروں کے کئی کام ان کی صرف ایک ''ہاں'' سے ہو جاتے ہیں۔ بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہیں اور اپنی خاندانی شرافت اور نجابت کو جی جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ اپنے والد گرامی کی طرح انھوں نے بھی قلم و قرطاس سے ناتا جوڑ رکھا ہے۔ نقاد اور محقق کے علاوہ شاعر بھی ہیں چناں چہ شعری تخلیقات کی نبضوں پر انگلیاں رکھ کر ان کے مزاج، آہنگ اور طرزِ احساس کو ٹٹولتے ہیں اور حکیم حاذق کی طرح نپے تلے انداز میں مرض کی تشخیص بھی کر جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نقاد کو ہمیشہ مثبت فکر اور رحم دلانہ نظر کے ساتھ تخلیق کار اور اس کے فن کا مطالعہ کرنا چاہیے اور خامیوں سے زیادہ اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنا چاہیے تاکہ آپ کے چند توصیفی کلمات سے وہ حوصلہ پا کر اپنے سلسلہ تخلیق کو جاری رکھے اور آئندہ کوئی ایسا فن پارہ تخلیق کر دے جو اہلِ نقد کو حیرت میں ڈال دے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے کل تنقیدی اور تحقیقی کام کو ان کے اس نیک طینت خیال کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے اپنی تنقید اور تحقیق کے لیے جو نسخہ خیر ایجاد کیا ہے اس کے فطری اور عملی دونوں پہلو افادۂ عام کی ذیل میں آتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ تنقید سانس لینے کی طرح ناگزیر ہے، تو یہ ماننا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ تنقید ایک زندگی بخش اور حیات آفریں رویے کا نام ہے جو تخلیق کی سانسیں بحال کرنے کا فریضہ ہی ادا نہیں کرتی بل کہ قاری کو بھی تخلیق کے بارے میں ایک مثبت ردِ عمل کے لیے تیار کرتی ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے نزدیک تنقید کا افادی پہلو یہی ہے کہ تخلیق، تخلیق کار اور قاری کی ایک ایسی

مثلث تیار ہو جائے جس کا ہر سرا گرفت میں آ کر اتحادِ ثلاثہ قائم کر دے۔ اسی میں تینوں کی عافیت اور ادب کی زندگی کا راز پنہاں ہے۔ ان کے خیال میں تنقید کی بقا تحقیق سے وابستہ ہے چناں چہ وہ کسی بھی تخلیق کار کے تخلیقی عمل کی اتھاہ میں اترنے کے لیے اس کے سوانحی حالات اور شخصیت کی کرید ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں ممکن حد تک معلومات جمع کر کے معاشرتی، تہذیبی، سیاسی اور ذاتی حالات کے تناظر میں ان خارجی اور داخلی عوامل کا تجزیہ کرتے ہیں جو مختلف صورتوں میں اثر انداز ہو کر تخلیق کو وجود میں لانے کا باعث بنے۔ چناں چہ ان کی تنقید و تحقیق کی یہ معروضیت جہاں حقائق کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے وہاں منطقی نتائج کو سامنے لا کر شفاف اور اجلا منظر نامہ ترتیب دیتی ہے۔

تنقید و تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی دیگر مساعی جن کی جھلک ''مفاہیم''، ''ترجیحات''، ''اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار''، ''آل رضا کا فن غزل گوئی''، ''تصریحات'' وغیرہ میں نظر آتی ہے، میری نگاہ میں ہیں اور ان کے بارے میں جستہ جستہ میں اپنی معروضات پیش کر چکا ہوں۔ ان کی اکثر کوششیں اُردو تنقید و تحقیق کی گزشتہ روایات اور مروجہ طریقوں سے ذرا ہٹ کر مختلف انداز میں تخلیق کاروں اور ان کے تخلیقی رویوں سے متعارف کراتی ہیں اور قاری کو ایک خاص سطح پر لا کر غور و فکر اور اکتساب کا موقع فراہم کرتی ہیں اسی تسلسل میں ان کی تازہ کتاب ''سیف زلفی کے مرثیے'' ان کے زاویہ فکر اور اندازِ نظر میں تبدیلی کے آثار کا اشارہ دیتی ہے۔ یہ تبدیلی اگرچہ اتنی واضح نہیں ہے کہ ہم اسے ان کے تنقیدی و تحقیقی سفر میں کوئی اہم موڑ قرار دے کر کسی نئی جہت کے انکشافات کا اعلامیہ جاری کر دیں تاہم تبدیلی موجود ہے اور اس کا پتہ ان کے تجزیاتی اُسلوب سے چلتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے سیف زلفی کے فن کو ان کی ہمہ جہت شخصیت کے تناظر میں اس طور جانچنے کی کوشش کی ہے کہ تنقید و تجزیے پر تحقیق کا پہلو غالب آ گیا ہے اور تحقیق بھی اس نوع کی کہ اس کی ہمہ اقسام رَل مل کر ایک بھرپور صورتِ حال کو منکشف کرتی ہیں۔ مفروضات بعض بنیادی نوعیت کے سوالات کی صورت میں تشکیل پاتے ہیں جن کے جوابات دھیرج اور سہج انداز میں منطقیت سے حاصل کیے گئے ہیں۔ شاید یہ تحقیق کا بنیادی تقاضا بھی تھا لیکن جہاں تنقید و تجزیے کے مراحل آئے ہیں وہاں بھی انھوں نے خود کو تحقیق کے ضابطوں سے باہر نہیں نکلنے دیا جب کہ اس سے پہلے ''مفاہیم''، ''ترجیحات''، اور ''تصریحات'' کے مضامین میں ان کا تجزیاتی اور تنقیدی انداز مختلف رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سیف زلفی کے نو دریافت مرثیوں کے تعارف اور تجزیے سے پہلے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان شعری تخلیقات پر مفصل رائے دینا ضروری سمجھا ہے جو ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۹ء تک کے عرصے میں منظر عام پر آئیں اور سیف زلفی کی اصل شہرت کی اساس ہیں۔ یہاں یہ نکتہ اُٹھایا جا سکتا ہے کہ بات سیف زلفی کے مرثیوں کی ہو رہی ہے تو اُردو میں مرثیہ نگاری کی روایت کا ذکر ہونا چاہیے اور سیف زلفی کے ہم عصر مرثیہ نگاروں

کی کاوشوں کا جائزہ لے کر سیف زلفی کے مقام و مرتبے کا تعین کیا جانا چاہیے جب کہ یہاں صورت حال مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ذہن میں یہ بات نہ تھی اور یہ بھی نہیں کہ اُردو مرثیے کی تاریخ ان کی نظر میں نہ رہی ہو۔ اُردو مرثیے کے حوالے سے ان کا قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی کام منظر عام پر آچکا ہے بل کہ اگر میں یہ کہوں کہ اُردو مرثیے کے چند اہم نقادوں میں ان کی قابلِ لحاظ جگہ بنتی ہے تو غلط نہ ہوگا تو پھر انھوں نے سیف زلفی کے چار اہم مراثی کی تدوین کا کام سرانجام دیتے ہوئے اُردو مرثیے کی روایت پر مقدمہ تحریر کیوں نہ کیا؟ جب کہ دیگر محققین اور تدوین کاروں کے یہاں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

میرے خیال میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے یہاں اس کا باقاعدہ جواز موجود ہے۔ اول یہ کہ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا جو دائرہ متعین کیا ہے اس میں سیف زلفی کو مرکز نگاہ بنایا ہے اور ایک ذہین محقق کی طرح اپنے موضوع کو ہدف میں رکھ کر اپنی تحقیق کے سارے عمل کو اس پر مرتکز کیا ہے۔ اگر وہ تاریخ مرثیہ یا روایت مرثیہ کی طرف جانکلتے تو ان کا ہدف کمزور پڑ سکتا تھا۔ دوم یہ کہ سیف زلفی کی شعری تخلیقات کا مطالعہ منطقی انداز میں ان کے مراثی کے مطالعے سے جاملتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا یہ جملہ ان کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ''سیف زلفی کی یہ تخلیقات ان کے مرثیوں کے لیے ''ابتدائیہ'' ثابت ہوئیں۔'' گویا ان کے مراثی تک پہنچنے کے لیے ان کی تمام شعری تخلیقات کا مطالعہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے سیف زلفی کے مرثیوں پر تحریر کیا جانے والا مقدمہ کسی ایک صنف کے مافیہ کو کھنگالنے اور محض تاریخ رقم کرنے کا بہانہ نہیں بنتا بل کہ ایک ہمہ نوع اور ہشت پہلو شخصیت کی تخلیقی زندگی کے آثار کی دریافت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ سیف زلفی کے کل شعری سرمائے، ان کی دیگر تخلیقات اور شخصیت کی تخلیقی زندگی کے آثار کی دریافت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ سیف زلفی کے کل شعری سرمائے، ان کی دیگر تخلیقات اور شخصیت کو سامنے رکھ کر ان کے مرثیوں کا جو امیج بنتا ہے وہ ان کے تخلیقی معیار سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے مراثی کا نہایت شاندار، برمحل اور مبسوط تجزیہ پیش کیا ہے کہ مراثی کے اصل متن تک پہنچنے سے پہلے ہی قاری ان کے حلقہ عقیدت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں ایک نقاد اور محقق کی یہی بڑی کامیابی ہے کہ وہ قاری اور تخلیق کار کو اس طرح آپس میں ملا دے جیسے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک ملتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے قاری، تخلیق اور تخلیق کار کی جو مثلث قائم کی ہے اس میں ایک کونے کا مزید اضافہ کرنا چاہوں گا۔ پھر یہ مثلث نہیں رہے گی مربع بن جائے گا۔ نقاد اور محقق کے اعلیٰ منصب کا لحاظ کرتے ہوئے یہ اضافہ بہت ضروری ہے کہ تحقیق کے ابلاغ اور اس کے بین السطور تک رسائی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ خیال ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ''نسخہ خیز'' کو آزما کر میرے ذہن میں آیا ہے۔

◆◆◆

سیف زلفی کے مرثیے۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی محنتوں کا ثمر

پروفیسر سیّد محمد رضا زیدی

◆◆

اُدب کے دُرہائے شہوار کا ایک خزینہ، بصیرت و آگہی کا گنجینہ، فصاحت و بلاغت کا نمونہ، عقیدت و مودّتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے جوش میں ذہنِ سیف زلفی میں درجِ گہر بن کے ذہنِ سیف زلفی سے نکلے یہ مرثیے جو تعداد میں تو چار ہیں لیکن معرفت کے گہرہائے آبدار ہیں۔ سیف زلفی کی فکر کے چمکتے ہوئے تارے ہیں۔ سیف زلفی کے چمنِ سخن کے مہکتے ہوئے پھول ہیں۔ خطرہ تھا کہ کہیں یہ تلف نہ ہو جائیں۔ اپنی دمک اور مہک سے محروم نہ ہو جائیں کہ ایک اُدبی گھرانے کے اُدب پرور ماحول میں پروان چڑھنے والے اپنے ہی انداز کے ایک محقق کے ذہنِ رسا میں ان ادبی موتیوں کو طباعت کے حُسن سے آراستہ کر کے شائقینِ اُدب کے لیے بطورِ تحفہ پیش کرنے کا خیال آیا۔ بس خیال آنا تھا کہ بھاگ دوڑ شروع۔ سیف زلفی کے خاندان سے رابطہ کیا انھیں آمادہ کیا کہ اس ادبی میراث کو اُدبی حوالے سے اہلِ اُدب کے حوالے کر دیں۔

وہ محقق جس کی جبیں میں شمعِ صداقت کا نور، نفس میں سوز، نظر میں شعور اور دل میں ذوقِ یقین ہے اُس کا نام ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہے۔ دیکھنے میں تنہا ہے لیکن اپنے آپ میں ایک انجمن، ایک ادارہ بل کہ چلتا پھرتا دار العلوم ہے۔ جنابِ فیض جھنجھانوی کا ایک مصرع کتنا صادق آتا ہے:

ع   تیرے دَم سے گلشنِ شعر و سخن شاداب ہے

ان کے علاوہ مسلسل اشاعت کے انتیسویں سال میں داخل جدید و قدیم اُدب کا حسین سنگم، علم و ادب کی خدمت پر کمر بستہ ماہ نامہ ''شام و سحر'' لاہور کے مدیر اعزازی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہیں۔ اس اُدبی پرچے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ بہت سے ادیبوں کے اعتراف ہنر پر خصوصی نمبر شائع کر کے اُدبی صحافت میں ایک نئی روایت پیدا کی۔ حلقۂ شعرائے اہلِ بیتؑ ہو یا عالمی مجلسِ ادب، حلقۂ حمد و نعت و سلام پاکستان لاہور، انجمن اُردو مصنفین پاکستان لاہور، حلقۂ مصنفین پاکستان لاہور ہو یا انجمن معراجِ ادب لاہور ہو یا سید آلِ رضا میموریل

کمیٹی پاکستان ہوان سب میں:

رفیع ایوانِ جستجو ہے، وسیع دامانِ آرزو ہے

زیرِ نظر کتاب ''سیف زلفی کے مرثیے'' (تجزیہ و تدوین) ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے الحسن پبلی کیشنز، ۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ لاہور کے زیرِ اہتمام نہایت خوب صورت سرورق جس پر سیف زلفی ایک خاص انداز میں نظر آتے ہیں۔ مضبوط جلد بندی، کمپوزنگ کے اعلیٰ معیار اور اچھے کاغذ پر چھپی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا (۹۵) پچانوے صفحات پر مشتمل ذہن گیر اور وسعتِ مطالعہ کا شاہ کار فن کاری کی عظمت کے نشانات کے ساتھ ساتھ سیف زلفی کے مرثیوں کا صحیح مقام متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ تخلیق ایک طوفان خیز سمندر ہے جس کی موجوں پر مدوجزر طاری ہوا۔ اعلیٰ نقاد ان کیفیتوں کو اپنے پر طاری کرتا ہے اور پھر اسی سمندر سے گراں بہا موتی تلاش کرتا ہے۔ آ گہی کا چراغ روشن ہوا تو نگار خانۂ اُدب میں روشنی ہی روشنی نظر آئی اور اس کشفِ تازہ کے عرصۂ حیرت میں کھو گیا۔ خمارِ کشف میں سے شہرِ وجود جھوما۔ حریمِ فن میں بہار آئی اور ایک نئی کتاب ''سیف زلفی کے مرثیے'' ہاتھ آئی۔

۲۱ مئی ۲۰۰۶ء کا دن تھا عالمی مجلسِ ادب پاکستان لاہور کے زیرِ اہتمام ''سیف زلفی کے مرثیے'' کی تقریبِ رونمائی میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ صدرِ محفل اُستاد الشعرا وحیدِ عصر جناب سیّد وحید الحسن ہاشمی تھے اور مہمانانِ خصوصی میں معروف نقاد جناب ڈاکٹر سلیم اختر اور جناب ڈاکٹر اجمل نیازی تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عباس رضا انجام دے رہے تھے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور سیف زلفی (مرحوم) کے فرزند جناب رضا انتخاب اس تقریب کی خاص شخصیتیں تھیں۔ سیف زلفی (مرحوم) کے اہلِ خانہ بھی موجود تھے۔ ۲۱ رمئی سیف زلفی کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا دن تھا لیکن اس تقریب کے حوالے سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ثابت کر دیا کہ سیف زلفی مرا نہیں وہ زندہ ہے اس کا کام زندہ ہے اس کا کلام زندہ کیوں کہ سیف زلفی نے اُن خاصانِ خدا کا دامن پکڑ رکھا تھا جنھیں موت نہیں جب انھیں موت نہیں تو اُن کے ماننے والوں کو موت کہاں؟

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اُردو اَدب کی ایسی خدمت کر رہے ہیں جو آج کے دورِ نا پرساں میں ایک عجیب سا کام لگتا ہے۔ ایک شخص اُردو اَدب کو ایسے ایسے گوہرِ نایاب تحقیق و ترتیب و تدوین اور تجزیوں کے حوالے سے اَدبی دنیا کو عطا کر رہے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ انھوں نے سیف زلفی (مرحوم) کی اہلیہ محترمہ اور صاحب زادے رضا انتخاب کو متحرک کیا اور سیف زلفی کے تمام غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے جو تسامحات ہیں ان کی درستی بھی کی مثلاً سیف زلفی نے اپنی مرثیہ نگاری کے متعلق کہا تھا:

''میں نے آج تک پانچ مرثیے لکھے ہیں۔ میرا آخری مرثیہ دو سو اکتیس (۲۳۱) بندوں پر مشتمل

ہے۔ انیس ودبیر کے بعد بہت مرثیہ لکھا گیا مگر اس میں جان پیدا نہیں ہوسکی۔ اس دور کے مرثیہ نے ترقی کی لیکن بہت زیادہ نہیں...... میں خود کو باقاعدہ مرثیہ نگار نہیں سمجھتا۔ کم از کم ۲۵ مرثیے لکھ کر اپنے آپ کو مرثیہ نگار سمجھوں گا۔ البتہ اپنے ایک مرثیہ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں اسے انگریزی میں ترجمہ کروں تو وہ بین الاقوامی اُدب کی آنکھ سے آنکھ ملا سکتا ہے۔ میرے اس مرثیے کا نام ہے ''عشقِ حسینؑ اور آبِ حیات۔''

(سلمان باقر، آغا سیف زلفی سے ملاقات، ماہنامہ ’شام وسحر‘ اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۷۔)

مجموعی طور پر صرف اور صرف چار مرثیے بطور یادگار چھوڑے ہیں جو وجدانِ مخزن کا انمول خوش رنگ حصہ ہیں اور نسلِ نو کے خضر ہیں۔

پہلا مرثیہ

عظمتِ حسین علیہ السلام......سنِ تخلیق: ۱۹۷۱ء......کل بند: ۲۷......موضوع امام حسین علیہ السلام کی بے مثال قربانیاں:

اُجلا ہے ذہن اور قلم پر نکھار ہے ۔۔۔ لفظوں کے دائروں میں ارم کی بہار ہے
جبریلِ فکر دوشِ صبا پر سوار ہے ۔۔۔ مصرعوں سے حُسنِ جلوۂ حق آشکار ہے
آنکھیں ہوئیں جو بند تو تنویر دیکھ لی
محفل نے سب، حسینؑ کی تصویر دیکھ لی

سیف زلفی کا یہ مرثیہ جلال و جمال کی بہترین مثال ہے۔ پورے مرثیہ میں قصیدے کا طنطنہ موجود ہے۔ آخری بندوں میں شاعر نے حُزنیہ رنگ دینے کی شعوری کوشش کی ہے۔ شاعر نے شعری مہارت سے الم انگیز مقامات کو مزید غم فزا بنا دیا ہے۔ مجموعی طور پر ایک کامیاب مرثیہ ہے۔

دوسرا مرثیہ

جدید مرثیہ......وسیلہ ...... ۸۰ بند ...... سنِ تخلیق ۱۹۷۳ء:

اصغرؑ کا ذکر خالقِ اکبر کا فیض ہے ۔۔۔ غنچہ کے تذکرے میں گُلِ تر کا فیض ہے
حق کا بیانِ صدق پیمبرؐ کا فیض ہے ۔۔۔ چھوٹا سا مرثیہ علی اصغرؑ کا فیض ہے
اصغرؑ کے فیضِ خاص سے چھوٹے بڑے ہوئے
ہر بیت میں ہیں فکر کے سورج جڑے ہوئے

یہ مرثیہ پڑھ کر ذہن کے کینوس پر وسیلے کا عکس اُبھرنے لگتا ہے۔ لوحِ جاں پر سرمدی بشارتیں چھپا اُٹھیں۔ شاعر نے جذبات واحساسات کے بیان میں اپنی شاعرانہ مہارت کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔

مرثیہ سیف زلفی کے فکر و فلسفہ اور فنی چابک دستی کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ یہ مرثیہ جوش ملیح آبادی اور قیصر بارہوی کے مرثیوں کی طرح ایک جدید مرثیہ تھا۔ پڑھنے کا خاص اُسلوب اس پر مستزاد تھا۔

تیسرا مرثیہ

اسوۂ عباس علیہ السلام ...... ۵۱ بند ...... تخلیق ۱۹۷۴ء:

غازی کا نام لکھ کے دبیرِ قلم چلا　　مچلا فراتِ دل میں شجاعت کا ولولہ
چمکا، نگاہِ عشق میں، میدانِ کربلا　　الفاظ کی جبیں پہ، خیالوں نے خوں ملا
مہتابِ فکر، غم کی گھٹاؤں میں گھر گیا
عباسؑ کا شباب، نگاہوں میں پھر گیا

سیف زلفی نے جدید لب و لہجے میں حضرت عباس علیہ السلام کی سیرت و کردار کے اعلیٰ ترین نقوش اس مرثیے میں پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ مرثیہ کے آغاز میں شاعر نے حضرت عباسؑ کے چہرے اور رنگ و روپ کو بیان کیا ہے۔ لفظوں کے اُتار چڑھاؤ سے مرثیے کو صوتی اعتبار سے خوش گوار بنا دیا ہے۔

چوتھا مرثیہ

عشقِ حسینؑ آبِ حیات ...... ۲۴۰ بند ...... سنِ تخلیق ۱۹۷۵ء:

لکھتا ہے داستانِ قیادت مرا قلم　　کرتا ہے جنگ امن کی صورت مرا قلم
پی کر شعورِ فہم و فراست مرا قلم　　دیتا ہے زندگی کو حرارت مرا قلم
میرے قلم کی چھاؤں میں چلتا ہے آفتاب
لفظوں کے دائروں میں مچلتا ہے آفتاب

زیرِ نظر مرثیے میں سیف زلفی نے سیرت و کردار امام حسین علیہ السلام کو آبِ حیات قرار دیا ہے۔ جس کے شعور نے فکر کو تازہ نہال دیے جس کے ادراک نے ذہن کو اوجِ کمال دیا۔ اُن کا کلام دل سے اندھیرے نکال دے اور آدمی کو چاند کے پیکر میں ڈھال دے جس کے فیضِ نظر سے دماغ و دل میں یقین پیدا ہوا اور یہ یقین جذبۂ تعمیر بیدار کرے:

تسخیرِ قلب یاد بڑا سخت کام ہے　　اس معرکہ میں تیغ اٹھانا حرام ہے
دل جیتنا حضور، ولی کا مقام ہے　　یعنی وہی ولی جو خرد کا امام ہے
آبِ حیات جس کو دیا ہے دوام نے
جس کا چراغِ گُل نہ ہو آندھی کے سامنے

سیف زلفی کے مرثیے کشفِ ذات کے سلسلے ہیں کہ حرف وصوت کا پیرہن ملبوس کیے سوچوں کی تجسیم اور باطن کی ترسیل قرطاس پر عبارت کی صورت تاروں کی طرح جھلمل کر رہے ہیں اور شاخِ سماعت پر کلیاں بن کر کھلے اور شعر گوئی کی نعمت نے نصابِ سخن اور نقشِ اوراق اَدب بنا دیا۔

سیف زلفی کے یہ چاروں مرثیے ان میں سے ایک ایک مرثیہ گوہر شہوار ہے۔ معانی و بیان، اُسلوب و اظہار کے تجربے پیش کیے اور زبان کی وسعت داماں کا اندازہ اور حد معلوم کرنے والوں کے لیے نفیس ذخیرہ ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اپنے ذوقِ سرشار اور جذبۂ خدمتِ اَدب کے طور پر اس خوب صورت مجموعۂ مراثی سیف زلفی کی اشاعت پر توجہ فرمائی۔

سیف زلفی کے مرثیے پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ وہ بھی اِسی زنجیر سے بندھا ہوا ہے جو شعری رکھ رکھاؤ اور شرافت کی رو سے، جذبے کی فراوانی کے اعتبار سے درخشاں ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ شرافت کلاسیکی رچاؤ بھی ہے ماضی کے روشن منظر اور مستقبل کے مثبت امکانات کی زمانۂ حال سے نسبتوں کا ایک وسیع علاقہ رکھتا ہے۔

سیف زلفی نے زبان کے محاکاتی، ہیئتی، تعبیری اور تفہیمی پہلوؤں کے درمیان توازن ملحوظ رکھا۔ وہ اپنے ذخیرۂ الفاظ اور اس کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ ہے اور اس کی اہمیت سے واقف ہے۔ وہ تراکیب کے سیاق وسباق سے خاص معانی اُبھارتا ہے۔ الفاظ اور تراکیب کی نشست و برخاست پر بہت توجہ دیتا ہے۔ احساسات کی بالیدہ سطح پر زبان و بیان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر شعر کہتا اور پختہ فنی شعور سے اپنے شعری تجربے کو ایسی وحدت میں پرو دیتا ہے جو پڑھنے اور سننے والے پر اس کی شناخت کے مرحلے کو آسان بنا دیتا ہے۔

سیف زلفی فکری اعتبار سے ایک ذہنی فضا بناتا ہے۔ شعور سے زیادہ وجدان سے کام لیتا ہے۔ شاعری میں معنویت اور اندرونی ساخت کے اعتبار سے تازگی کا ایک نیا احساس اور شدتِ اظہار موجود ہے اور جلال و جمالِ اقلیمِ فکر وفن سیف زلفی کی شاعری قرار پائی۔

اضافتوں سے احتراز، فکری تسلسل اور مترنم تراکیب کے سیل سے اُبھرنے والے صوتی آہنگ نے معنوی طور پر بھی ایک نئی جہت کی دریافت میں اس کی راہ نمائی کی۔ مناظر، کیفیات، ماحول، فضا اور انسانی جذبوں کی پیکر تراشی جس طریقے سے کی وہ سامع کو حیرت میں ڈال دیتا ہے:

ع جبریلِ فکر دوشِ صبا پر سوار ہے
ع گونجی اذان ولولے بیدار ہو گئے
ع لفظوں کے آفتاب اُگلنے لگی زبان
ع کھولے فضا میں مرغِ تخیل نے بال و پر

تکرارِ لفظی سے سیف زلفی نے شعروں میں حُسن پیدا کر دیا اور شدتِ اظہار کو بھی واضح کر دیا:

ع مصرعوں سے حُسن، حُسن سے فن آشکار ہے
ع گونگوں کو نطق، نطق کو گویائی مل گئی
ع اندھوں کو آنکھ، آنکھ کو بینائی مل گئی
ع ہاں ہاں چلے زمین پہ سکّہ یزید کا
ع اُٹھ اور اُٹھ کے ظلم کا پنجہ مروڑ دے
ع پھیلا نظر نظر کا اُجالا کرن کرن
ع پہلے ''مژہ مژہ'' پہ سجایا ''دیا دیا''

سیف زلفی نے اپنے مرثیوں میں اپنا ایک خاص لہجہ، مصرعوں کی بندش، بندوں کی ترکیب، لفظوں کی صنعت اور خیال کی پاکیزگی کچھ ایسے انداز میں پیش کی ہے کہ ماہرینِ فن نے ان کے مرثیوں کو نہایت نفیس اور عمدہ مرثیے قرار دیے ہیں۔

پہلا مرثیہ (عظمتِ حسینؑ)

تراکیب

جبریلِ فکر۔ دوشِ صبا۔ بامِ تجلیات۔ نقرئی سحر۔ زیست کا شجر۔ سیلِ صبا۔ چہرۂ خورشید۔ عفریتِ شب۔ لطفِ نظر۔ سازِ حیات۔ طرب بیز۔ دستِ فلک۔ مصطفیٰؐ خصال۔ مرتضیٰؑ کمال۔ مجتبیٰؑ جمال۔ خالقِ عمل۔ مالکِ حیات۔ حاکمِ اجل۔ صاحبِ ازل۔ مکینِ خاص۔ کفِ حیات۔ تہذیبِ حُسن۔ اسپِ بے لگام۔ لیلائے شش جہت۔ بساطِ ارض۔ پرچمِ ربوبیت۔ بصیرتِ اوج و کمال۔ ظلمت فگن۔

مرکبات

لطفِ نظر کا قند۔ موادِ عظمتِ آدمؑ۔ حشمتِ جاہ و جلال۔ اہلِ بیتؑ کے ابر۔ زر کے بچھونے۔ دریائے سیم و زر۔ دریا کی غلاظت۔ غرور کا برگد۔ عزم کا لاوا۔ کرنوں کے تیر۔ جبر کے اونچے پہاڑ۔ ابلیسیت کے مرحب و عنتر۔ کبر و جور کا خیبر۔ ولا کے نقیب۔

تلمیحات

حضرتِ جبریلؑ۔ حضرت امام حسین علیہ السلام۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا۔ حضرت محمدؐ مجتبیٰ علیہ السلام۔ اہرمن۔ حضرت آدمؑ۔ شیطان۔ یزداں۔ ابلیس۔ ابوجہل۔ شداد۔ ہامان۔ فرعون۔ نمرود۔ حضرتِ عیسیٰؑ۔ صلیب۔ آتش۔ حضرت خلیلؑ۔ سفیان۔ حضرت عمرانؑ۔ حضرت علی علیہ السلام۔ یزید۔ حیدرِ کرارؑ۔ حضرت شبیرؑ۔ مرحب۔ عنتر۔ خیبر۔ حضرت علی اکبرؑ۔ حضرت عباس باوفاؑ۔ حضرت قاسمؑ۔ حضرت علی اصغرؑ۔

حضرت عونؓ و محمدؓ۔ حضرت جعفر طیارؓ۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا۔ بدر۔ حنین۔

الفاظ کا اچھوتا استعمال:

ع رقصاں ہوئی تو جھوم اُٹھا زیست کا شجر
ذہنوں میں یا حسینؓ کا بجنے لگا گجر

ع سیلِ صبا سے چہرۂ خورشید ڈھل گیا
عفریتِ شب سحر کے بہاؤ میں رُل گیا

ع مخلوق تیرے سامنے کیا شے ہے کچھ نہیں
ہے آسماں غلام، تو لونڈی ہے یہ زمیں

ع وہ شخصیت بہشت کی جاگیردار ہے

ع قطرے کو لوچ دے کے سمندر بنا دیا

ع نہرِ عمل کے نور سے روشن ہوئی زمیں

ع الحاد کے غرور کا برگد جھنجھوڑ دے

دوسرا مرثیہ (وسیلہ)

تراکیب

خالقِ اکبر۔ گُلِ تر۔ صدقِ پیمبرؐ۔ فیضِ خاص۔ مطلعِ انوار۔ بحرِ بے کراں۔ مرغِ تخئیل۔ شہرِ علم۔ بحرِ علم۔ سردِ جمیل۔ عقلِ رسا۔ رشتۂ فن۔ نقوشِ سخن۔ نورِ خرد۔ کاسۂ ادراک۔ شاخِ زیست۔ آفتابِ حقیقت۔ گلشنِ توحید۔ چراغِ فکر۔ خالقِ بہار۔ سدا بہار۔ حُسنِ تکلم۔ بقائے دوام۔ صادق البیاں۔ بلاغت مقام۔ کتابِ حلم۔ حدیثِ علم۔ دستِ خدا۔ مدارِ اخوت۔ جوہرِ قوت۔ اوجِ وقار۔ خاتمِ توحید۔ رمزِ حق۔ برہانِ کفر۔ جوشِ ولا۔ کوہِ عمل۔ دشتِ شجاعت۔ کوہِ یزیدیت۔ خورشیدِ تابناک۔ سینہ سپر۔ کوہِ شجاعت۔ تیغِ لازوال۔ گنجِ شہیداں۔ رنگِ شہادت۔ تابندہ ماہتاب۔ جہانِ حزب۔ شجاعت اساس۔ دشتِ بلا۔ رُخِ حسینؑ۔ محافظِ ملت۔ بیانِ غم۔

مرکبات

فکر کے سورج۔ لفظوں کے آفتاب۔ ذہنوں کی سردِ جمیل۔ جگنوؤں کا نور۔ شعور کی کرنیں۔ قندیلِ علم و فکر۔ سوچوں کی ٹہنیوں۔ فہم کا ساغر۔ کونین کی حیات۔ ترتیبِ شش جہات۔ وحدتِ حق کی دلیل۔ توحید کے شجر کا ثمر۔ شریکِ کارِ رسالت۔ مشیت کا شاہکار۔ راہِ عمل کا دلیر۔ بیشۂ یزداں کا شیر۔ قرآن عزم و رزم کے پارو۔

لالہ زارِ شہادت کا شاہ کار۔ تیور پکارتے ہیں۔ قرآن کا وقار۔

تلمیحات

ذر شہرِ علم۔ معراج۔ کوثر۔ سلسبیل۔ تسخیر ماہ تاب۔ اُستادِ جبریل۔ ذوالفقار۔ آدمؑ۔ عیسیٰؑ۔ مریمؑ۔ علقمہ۔ ابنِ سعد۔ حُرملا۔

لاجواب مصرعے:

ع ہر بیت میں ہیں فکر کے سورج جڑے ہوئے

ع لفظوں کے آفتاب اُگلنے لگی زباں

ع خورشیدِ عقل و فکر کی بارات ہو گئی

ع ذہنوں کی سرد جھیل میں طوفاں اٹھا دیا

ع بونوں کو اپنی فکر سے شاعر بنا دیا

ع ذہنِ بشر نے ساتھ اندھیروں کا چھوڑ کے
سوئے ہوئے ضمیر کا جھونٹا جھنجھوڑ کے

ع غفلت کے پہلواں کی کلائی مروڑ کے
وہ رات پی گیا ہے ستارے نچوڑ کے

ع لڑنے لگا یزید کی آندھی سے دو بدو

ع زہرابِ ماہ و سال بھی پینے سے فائدہ

تیسرا مرثیہ (اُسوۂ عباسؑ)

تراکیب

دبیرِ قلم۔ فراتِ دل۔ مہتابِ فکر۔ شمیمِ گل۔ چشمِ وفا۔ نئی پو۔ دمِ نو۔ فقید المثال۔ بادِ شجاعت۔ شہنشاہِ بخت۔ آئینۂ وفا۔ باغِ حسینؑ۔ پلانِ صف آرا۔ گلدستۂ اذاں۔ مرجعِ صفات۔ منبعِ کرم۔ دشتِ پُر انوار۔

مرکبات

سچائی کا تبر۔ شرافت کی ڈھال۔ ریاضِ علیؑ کا درخت۔ میدانِ کربلا کا وقار۔

تلمیحات

فرات۔ کربلا۔ والیل۔ یزداں۔ یوسف۔ حیدرِ کرارؑ۔ جعفرِ طیارؑ۔ احمدِ مختارؐ۔ غازیؑ۔ مدینہ۔ محمود۔ ایاز۔ مرحب۔ خیبر۔ اکبرؑ۔ یزید۔ روزِ حشر۔ نافع۔ بریرؓ۔ ابنِ مظاہرؓ۔ عونؑ و محمدؑ۔ قاسمؑ۔ مشکیزہ۔ نہر۔ ثانیٔ بتولؑ۔ علم دار۔

منفرد مصرعے :

ع میدانِ کربلا میں مدینہ ہے اس کی ذات

ع ادراک کا وضو ہے خرد کی نماز ہے

ع خیبر سے بھی سوا ہے کہ پیاسے کی جنگ ہے

ع پھرنے لگا نگاہ میں خیبر کا کاروبار

ع عباسؑ کے علم کے پھریرے نے جھوم کر

ع زینبؑ کو دی سلامی ردا ان کی چوم کر

ع غازی کے رُعب داب سے گھبرا کے مر گئے

ع ان بھیڑیوں نے شیر پہ حملے کی ٹھان لی

ع گدھ کی طرح کسی نے تبر کی اڑان لی

چوتھا مرثیہ (عشقِ حسینؑ آبِ حیات)

تراکیب

داستانِ قیادت۔ دبستانِ فکر۔ گُل انیسؔ۔ گلستانِ فکر۔ شعورِ جوشؔ۔ میدانِ فکر۔ شبستانِ فکر۔ سخن مآب۔ جمالِ شعور۔ خیالِ شعور۔ لبِ عمل۔ تبسم یقین۔ تکلّم یقین۔ قلزمِ یقین۔ گُلِ یقین۔ مزاج گری۔ سحر نُما۔ گہر نما۔ سفر نما۔ گلِ عمل۔ غنچائے علوم۔ خیمۂ حباب۔ اقتضائے وقت۔ شعورِ قیادت۔ سیل ارادت۔ نورِ فراست۔ شعلۂ نگاہ۔ گلستانِ مشیت۔ شعورِ فراست۔ عروسِ حیات۔ شعورِ عدالت۔ عفریتِ جہل۔ پنجۂ مشکل۔ ابلیس کرب۔ جبرِ سلاسل۔ فرعونِ ظلم۔ کفر شمائل۔ کشتِ دل۔ فرازِ چشم۔ مشامِ خرد۔ برگِ علم۔ نقطۂ تعمیر۔ منبرِ تقریر۔ خامۂ تحریر۔ نسخۂ تسخیر۔ دہلیز منقبت۔ میزانِ معرفت۔ کتابِ مجسم۔ آیاتِ کبریا۔ آبِ زر۔ شجاع عصر۔ تقدیرِ کائنات۔

مرکبات

چراغوں کی روشنی۔ دماغوں کی روشنی۔ ایاغوں کی روشنی۔ خرد کا سویرا۔ نغمہ گر عندلیب۔ طائرہ سدرہ نصیب۔ معراجِ فکر و فن۔ ظلمت کی ناؤ۔ خرد کا امام۔ معصومیت کے پھول۔ غنچوں کا نرم فرش۔ گرفتِ زمام فکر۔ مقطعٔ دیوانِ انبیا۔ پرچم حکمت کا پاسبان۔

تلمیحات

دبیرؔ۔ انیسؔ۔ جوشؔ۔ طائرِ سدرہ۔ آبِ حیات۔ سکندر۔ سومنات۔ شہرِ علم۔ گلیم۔ طور۔ ابلیس۔

فرعون۔ سلمانؓ۔ بابِ علم۔ ارم۔ نادِ علیؑ۔ قلندر۔ شہبازؒ۔ چشتیؒ۔ داتاؒ۔ غدیرِخم۔ آیۂ تطہیر۔ جبریلؑ۔ غالب۔ اقبال۔ کوثر۔ مریمؑ۔ حواؑ۔ فاتح بدر و حنین۔ بوجہل۔ خدیجہؓ۔ ستونِ کعبہ۔ ہمالہ۔ لینن۔ مارکس۔ سقراط۔ زرتشت۔ گوتم۔ رستم۔ امرت۔ خیبر کشا۔ مرحب۔ عنتر۔ خیبر۔ بیدم۔ دہریے۔ قائداعظم۔ کعبہ۔ مدینہ۔ سلامتی کا سفینہ۔ کربلا۔ فاتحِ خیبر۔ سپاہِ شام۔ شاہی۔ ابن زیاد۔ میسرے۔ میمنہ۔ شیرِ خدا۔ ابنِ ساقی کوثرؑ۔ ابنِ سعد۔ فرات۔ مسیحؑ۔ حرؓ۔ ابن معاویہ۔ موسیٰؑ۔ سامری۔ ذوالفقار۔ کوفیوں۔ ذوالجناح۔ شمرلعین۔ نجف۔ عابد بیمارؑ۔

صوتی اثرات:

مرثیہ: عظمت حسین علیہ السلام

برسے زمیں پہ ظلم کے بادل کڑے کڑے　　　گلنے لگے یقیں کے پودے کھڑے کھڑے
ابلیس کی کمند میں انساں بڑے بڑے　　　یوں آ گئے کہ گھور اندھیروں میں جا پڑے

مرثیہ: وسیلہ

اے میرے آسماں کے ستارو اُٹھو اُٹھو　　　قرآنِ عزت و رزم کے پارو اُٹھو اُٹھو
بے کس کے بے نوا کے سہارو اُٹھو اُٹھو　　　ہاں ہاں اُٹھو اُٹھو مرے پیارو اُٹھو اُٹھو

مرثیہ: عشقِ حسین علیہ السلام آبِ حیات

ایسے علوم جس کے ثمر ہوں ہرے بھرے　　　چلتے ہوں جس سے جہل کے جھونکے پرے پرے
رقصاں ہوں شاخِ فکر پہ پرچم ہرے ہرے　　　ڈھلتے ہوں جس کے ذہن میں جملے کھرے کھرے

صنعت تضاد:

ع　جبر و اختیار پہ قدرت لیے ہوئے
ع　طوفانِ شر سے خیر کی کشتی اُلٹ گئی

....

کتابیات

۱۔ سیف زلفی کے مرثیے، تجزیہ و تدوین، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، الحسن پبلی کیشنز: ۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ، لاہور، ۲۰۰۶ء

۲۔ آبشار، مجموعہ کلام فیض جھنجھانوی، طبع ثانی، ۱۹۶۱ء۔

۳۔ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، شخصیت و فن از ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، الحسن پبلی کیشنز: ۲۵۳۔ ایف، رحمان پورہ لاہور۔

۴۔ روزنامہ ''جنگ'' لاہور، ۴/جون ۱۹۹۱ء، مضمون ڈاکٹر سعادت سعید۔

۵۔ روشنی، مجموعہ نعت سیف زلفی، دیباچہ ''روشنی'' از عبدالجبار لطیفی، حلقہ اہل قلم لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۶۔ ٹکڑے ٹکڑے آدمی، مجموعہ غزل سیف زلفی، دیباچہ از ڈاکٹر طارق عزیز، حلقہ اہل قلم، لاہور ۱۹۸۳ء۔

۷۔ ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، مضمون از ناصر چودھری، اکتوبر ۱۹۹۲ء۔

۸۔ ماہ نامہ ''جمالستان'' لاہور، مضمون از نثار اکبر آبادی، اگست ۱۹۹۳ء۔

۹۔ ماہ نامہ شام وسحر'' لاہور، مضمون از مرزا ادیب، اکتوبر ۱۹۹۲ء۔

۱۰۔ The Daily "Nation" Lahore، مضمون از اصغر ندیم سید، ۴ جون ۱۹۹۱ء۔

۱۱۔ ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، مضمون از: ڈاکٹر آغا سہیل، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۵۔

۱۲۔ مکتوب بنام عفت حسن، احمد ندیم قاسمی، مرقومہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۲ء، مشمولہ ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' الحسن پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۰ء، ص ۳۵۹۔

۱۳۔ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، ہلال نقوی، ڈاکٹر، محمدی ٹرسٹ کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۵۹۔

۱۴۔ ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، وحید الحسن ہاشمی، سید ''سیف زلفی اور اُردو مرثیہ'' اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۵۔

۱۵۔ ہمارے ہیں حسینؑ، سیف زلفی، شیر پبلی کیشنز، ۶۲۔بی علامہ اقبال روڈ۔ لاہور، ۱۹۶۸ء۔

۱۶۔ ماہ نامہ ''گل فشاں'' لاہور، مبصر شیر محمد چودھری، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۹۔

۱۷۔ ماہ نامہ ''فنون'' لاہور، تاثرات سیف زلفی، جدید غزل نمبر، جلد دوم جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۵۹ء۔

۱۸۔ کربلا کے دو اسیر، سیف زلفی، غازی پبلی کیشنز، ۹۲۔بی، علامہ اقبال روڈ لاہور، ۱۹۷۴ء۔

۱۹۔ سیف زلفی۔ شخصیت وفن، عفت حسن، مقالہ ایم۔اے اُردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۹۲ء، غیر مطبوعہ، ص ۶۸۔

۲۰۔ سیف زلفی۔ احوال وآثار، محمد رفیق بلوچ، مقالہ ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء غیر مطبوعہ، ص ۵۰۔

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

سیف زلفی کے جدید مرثیوں کی تدوین اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر ریاض قدیر

●●

بیسویں صدی کے نصف آخر میں سیف زلفی جہاں اُردو شاعری میں منفرد لہجے کے شاعر کے طور پر نمایاں ہوئے وہاں انھوں نے قطعہ، رباعی، سلام، منقبت، نعت اور مرثیہ میں بھی اپنے فنی کمالات کے گہرے نقوش ثبت کیے۔ ان کے شاعرانہ لہجہ کو اُردو غزل کی ایک منفرد اور نئی آواز قرار دیا گیا۔ صنف غزل کی روایتی خودسپردگی اور دھیمے پن کے بجائے قصیدہ کی کھنک، بے باکی اور مردانہ لہجہ ان کی غزل کی پہچان بنا۔ ان کی رثائی شاعری ان کی غزل کے مقابلے میں مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے کسی طرح کم نہیں۔ اُردو شاعری کے ناقدین نے سیف کی غزل کو زیادہ اہمیت دی اور ان کی مرثیہ نگاری پر توجہ کم رہی حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ سیف زلفی نے اپنے شاعری کے آغاز میں محمدؐ اور آل محمدؐ کی محبت کو اپنی تخلیقی شخصیت کا جزو بنا رکھا تھا۔ ان کے ابتدائی شعری مجموعوں کے نام "ہمارے ہیں حسینؑ"، "کربلا کے دو اسیر"، "تابناک کربلا"، "نور" اور روشنی میں حضور اکرمؐ اور ان کے خانوادے خصوصاً امام حسینؑ سے والہانہ محبت کا اظہار ملتا ہے۔ بعدازاں سیف نے مرثیہ نگاری کی طرف باقاعدہ توجہ کی اور اُردو مرثیہ کی تاریخ میں چار عظیم مرثیوں کا اضافہ کیا۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ان چار مراثی کو "سیف زلفی کے مرثیے" کے نام سے تجزیہ و تدوین کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کیا ہے۔ مرثیہ کے حوالے سے اُردو تنقید میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اپنی متعدد تصانیف اور مضامین کے ذریعے ایک ممتاز مقام پیدا کر چکے ہیں۔ سیف زلفی کے مراثی کی تدوین سے ان کے تحقیقی و تنقیدی اعتبار میں مزید اضافہ ہوگا۔ مراثی کے متون سے قبل لکھے گئے ایک سو چار صفحات جہاں صنف مرثیہ کے فنی اور تخلیقی اسرار و رموز کی گرہ کشائی کرتے ہیں وہاں اُردو مرثیے کے تہذیبی محرکات اور سیف زلفی کے مرثیوں کے امتیازی اوصاف کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ کتاب کا نصف اول حصہ جو صنف مرثیہ اور سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کی تحقیق اور انتقاد پر مبنی ہے اپنی جگہ وقعت کا حامل ہے۔

جہاں تک سیف زلفی کی رثائی شاعری کا تعلق ہے اس کے بارے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ بیسویں صدی کے جن مرثیہ گو شعرا صنف مرثیہ کو جدید طرزِ احساس اور عصری تقاضوں سے ہم کنار کر کے مرثیہ کو حیاتِ نو بخشی ان میں جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، آلِ رضا، صبا اکبر آبادی اور وحید الحسن ہاشمی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ فنِ مرثیہ نگاری کے حوالے سے سیف زلفی کا نام ان ہی شعرا کے ساتھ لیا جانا چاہیے۔ سیف زلفی کی مختصر نظموں پر مشتمل رثائی شاعری اور ان کے چار طویل مرثیوں کے مطالعے سے منکشف ہوتا ہے کہ دورِ جدید میں صنفِ مرثیہ بعض فنی تبدیلیوں کے ساتھ فکری وسعتوں اور جدید طرزِ احساس سے ہم کنار ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو جدید مرثیہ حیات و کائنات کے جملہ اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ مختلف عصری مسائل کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ چکا ہے۔ جدید اُردو مرثیہ اب منظر نگاری، واقعات نگاری اور جذبات نگاری تک محدود نہ رہا بل کہ سیرتِ حسینؑ اور شہادتِ حسینؑ کی روشنی میں ہم عصر انسانی مسائل کا شعور بھی حاصل کر چکا ہے۔ جدید مرثیہ عصری مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے سیرتِ حسینؑ سے بصیرت اور توانائی بھی حاصل کرتا ہے۔ سیف زلفی کے زیرِ نظر مرثیوں میں نہ صرف عصری مسائل کا شعور ملتا ہے بل کہ وہ ہم عصر انسانی صورتِ حال کے تناظر میں انسانی اقدار کی معنویت کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ یہی طرزِ احساس ان کے مرثیوں کو جدید مرثیہ بناتا ہے۔ مثلاً:

اے ساکنانِ دہر یہ نازک مقام ہے — سایا تباہیوں کا بھی نزدیکِ شام ہے
ایٹم کے اژدھوں کا بڑا اژدحام ہے — سمجھو کہ اب زمین کا قصہ تمام ہے
دنیا سلگ رہی ہے دھانے پہ جنگ کے
اک دن بھڑک اٹھے گی نشانے پہ جنگ کے

سیف زلفی اپنے مرثیوں میں ایک نظریۂ حیات کا علم بردار نظر آتا ہے۔ یہ نظریۂ حیات حق و صداقت، روشن ضمیری اور شجاعت کی ان عظیم اقدار سے مل کر تشکیل پاتا ہے جس کے بڑے نمائندے حضرت امام حسینؑ ہیں اور جو دنیا کی تمام تہذیبوں، مذاہب اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا مطمحِ نظر ہیں۔ بقول سیف زلفی:

دیں بھی حسینؑ دیں کی بقا بھی حسینؑ ہے — انسانیت کے رخ کی ضیاء بھی حسینؑ ہے
منزل بھی اور راہ نما بھی حسینؑ ہے — کہتا ہوں میں خدا کی رضا بھی حسینؑ ہے
رتبہ بلند تر ہے مرے دل کے چین کا
میں بھی حسینؑ کا ہوں، خدا بھی حسینؑ کا

سیف زلفی کے ہاں مرثیہ محض غمِ حسینؑ میں رونے دھونے کا نام نہیں بل کہ آفاقی شاعری کی طرح زندگی کے حقائق کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر بھی کرتا ہے اور اعلیٰ انسانی صفات و اقدار کی

نشوونما کا باعث بھی ہے۔ اس لحاظ سے سیف زلفی کے مرثیے بصیرت افروز بھی ہیں اور چراغ رہِ زیست بھی:

اس سورما نے روح توانائی دی مجھے — جابر کے آگے جرات گویائی دی مجھے
زندہ حقیقتوں کی شناسائی دی مجھے — بکھرے ہوئے ہجوم میں یکتائی دی مجھے
مہکا دیا ہے زیست کے ایک ایک پھول سے
روشن کیا چراغ حقیقت اصول سے

فنی نقطہ نظر سے سیف زلفی کے مرثیے اُردو کے بڑے مرثیوں کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں۔ انیس و دبیر نے اپنے رثائی کلام میں جو اعلیٰ فنی معیارات قائم کیے بعد کے مرثیہ گو شعرا مرثیے کے فن کو اس سے آگے نہ لے جا سکے کیوں کہ انیس و دبیر اُردو مرثیہ کا عروج ہیں۔ تاہم جدید دَور کے جن شعرا نے مرثیے میں انیس و دبیر کی فنی روایات کا پختہ شعور حاصل کیا اور اسے جدید طرزِ احساس سے نئے عہد میں حیات نو بخشی سیف زلفی کا شمار ان ہی چند شعرا میں ہوتا ہے۔ انتخابِ الفاظ کا سلیقہ، اُسلوب کی روانی اور توانائی جذبات نگاری میں ژرف بینی، حقائق حیات کی نقطہ آفرینی اور واقعات نگاری میں باریک بینی یہ سب کچھ سیف زلفی کے مرثیوں میں رچ بس گیا ہے۔

سیف زلفی کے مرثیوں میں واقعات نگاری کے ضمن میں جو تصاویر بنائی گئی ہیں وہ نہایت زندہ اور متحرک ہیں۔ واقعات کی ہو بہو تصویر کشی میں بھی سیف زلفی نے اعلیٰ فنی اور لسانی شعور کا مظاہرہ کیا۔ سیف زلفی کے مرثیوں میں آنے والے کردار اپنے جملہ جذبات و احساسات اور مستحق اوصاف کے ساتھ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے نظر آتے ہیں بل کہ اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

جھولے سے بڑھ کے ماں نے پسر کو اُٹھا لیا — جلدی سے جھک کے اپنی ردا میں چھپا لیا
تھا مامتا کا جوش، گلے سے لگا لیا — اٹھی نظر سلامِ شہِ کربلا لیا
پہچان کر نگاہ شہِ مشرقین کی
بڑھ کر پسر کو گود میں ڈالا حسینؑ کی

تصویر کشی اور امیجری کے ضمن میں سیف زلفی حروف اور الفاظ کی صوتیات سے تاثرات اُبھارنے کا فن بھی خوب جانتے ہیں۔ وہ الفاظ کی آوازوں سے انسانی حواس پر مرتب ہونے والے اثرات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ الفاظ سے پیدا ہونے والی آوازیں کس طرح ایک خاص کیفیت اور تاثر پیدا کر سکتی ہیں، زلفی اس فنی راز سے بخوبی واقف ہے۔ وہ لفظوں کی تکرار سے تاثر کو گہرا کرنا جانتے ہیں۔ وہ صرف منظر دکھاتے نہیں بل کہ قاری کے ذہن پر اس کو طاری کر دیتے ہیں۔

ٹکرائی تیغ تیغ سے ٹھن ٹھن، ٹھنا ٹھنن — اک گونج تھی فضاؤں میں کھن کھن، کھنا کھنن
اُڑتے تھے سر فضاؤں میں، سَن سَن، سَنا سَنَن — چلتی تھی تیغ شیر کی، شَن شَن، شَنا شَنَن

بہتا تھا خون دشت میں ٹُر ٹُر ، ٹرل ٹرل
ہلتا تھا آسمان بھی، تھر تھر، تھرل تھرل

صوتی امیجری کی ایسی مثالیں اُردو کی رثائی اور رزمیہ شاعری میں کم یاب ہیں۔

مرثیہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ اُردو کے جملہ اصناف شاعری کا جوہر ہے تو بے جانہ ہوگا۔ قصیدہ کا شکوہ الفاظ مثنوی کا تسلسل بیان اور غزل کی نکتہ آفرینی مل کر مرثیہ کی فنی ساخت کی تشکیل و تعمیر کرتی ہے۔ سیف زلفی ایک قادر الکلام شاعر ہیں اور جملہ اصناف سخن کے فنی رموز کو تخلیقی سطح پر برتنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ اسی ہنرمندی نے ان کے مرثیہ کو فنی اعتبار سے باثروت بنا دیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اپنی فکر کی تازگی اور فنی پختگی کے باعث سیف زلفی کے مرثیے اُردو مرثیے کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیے جاسکیں گے اور ان مرثیوں کو مرتب کر کے ہمارے ذوق کی تسکین کرنے والے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا یہ وقیع کارنامہ ادب کی دنیا میں تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

(ماہنامہ شام و سحر لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

سیف زلفی کے مرثیے: ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا اَدبی کارنامہ

ڈاکٹر نواز حسن زیدی

◆◆

پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن تحقیق وتنقید کی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ اُردو مرثیے سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک نئی کتاب ''سیف زلفی کے مرثیے تجزیہ وتدوین'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ ہمارے پیش ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہی کاوش ہے۔

سیف زلفی کی ہمہ جہت شخصیت نے شعروادب کے گلستان کو غزل، سلام، نعت، مرثیے، نظم، گیت دوہےاور ترانے کے گل ہائے رنگا رنگ سے زینت بخشی ہے۔ وہ ایک حساس فن کار اور بیدار ذہن رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی شاعری ان کی ذات اور ان کے عہد کی سچی ترجمان ہے۔ انھیں اپنے جذبات واحساسات اور معاصر حالات وواقعات کے فن کارانہ اظہار پر جو منفرد قدرت حاصل ہے اس کے پیش نظر احمد ندیم قاسمی نے انھیں جدید لہجے کا شاعر قرار دیا ہے۔

سیف زلفی کی زندگی میں یوں تو ان کے بیشتر مجموعہ ہائے کلام زیورِ طباعت سے آراستہ ہوتے رہے لیکن بہت سا کلام اور بالخصوص مرثیے شائع نہ ہوسکے۔ شاید انھیں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایسے محقق اور مدوّن کا انتظار تھا۔ ان مرثیوں کی اشاعت اس لیے ضروری تھا کہ ان کے تنقیدی مطالعے کے بغیر سیف زلفی کے اُدبی مقام و مرتبے کا تعین ممکن نہ تھا۔

بحمد اللہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اس مشکل گھاٹی کو نہایت کامیابی سے عبور کرلیا ہےاور سیف زلفی کے چاروں مرثیوں سے گمنامی کی مٹی جھاڑ کر انھیں کتابی شکل میں پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ شعروادب ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اس اُدبی خدمت پر ان کا رہین احسان ہے۔

''سیف زلفی کے مرثیے'' بنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ دوسرے حصے میں سیف زلفی کے غیر مطبوعہ اور غیر مدوّن مرثیے ہیں جو پہلی مرتبہ اپنی اصل شکل وصورت کے ساتھ شایع کیے گئے ہیں۔ صحت متن کے

بنیادی اصولوں کی روشنی میں انھیں مرتب کرنے کے بعد منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ ان مرثیوں کی تدوین ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اس مساعی جمیلہ کی ایک کڑی ہے جو وہ عرصۂ دراز سے کر رہے ہیں۔ اس سے قبل انھوں نے ''العطش'' کے عنوان سے سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کو شایع کر کے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

تدوین، تحقیق سے ایک قدم آگے کی چیز ہے۔ اسے تحقیق پہ اک درجہ فوقیت حاصل ہے چناں چہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مدون کے لیے محقق ہونا ضروری ہے جب کہ محقق کے لیے تدوین سے آشنائی ضروری نہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن خوش قسمتی سے تحقیق کے مردِ میدان بھی ہیں اور تنقیدی صلاحیت سے بھی مملو ہیں۔ مفاہیم، ترجیحات، تصریحات، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ اور سیّد وحید الحسن کی شعری جہتیں ایسی معتبر تحقیقی و تنقیدی کاوشیں منظرِ عام پر آ کر ناقدینِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کو ایک اضافی اختصاص بھی حاصل ہے یعنی وہ محقق، نقاد اور مدون ہونے کے ساتھ ساتھ معتبر شاعر بھی ہیں۔ اس حوالے سے سیف زلفی کے مرثیوں کی تدوین کا کام نہایت خوش اُسلوبی اور سلیقے سے کیا گیا ہے۔ بالخصوص شعری تخلیقات کو عروضی سطح پر پرکھنے اور مدون کرنے کے لیے ڈاکٹر شبیہ الحسن ایسے محقق نقاد اور شاعر ہی کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مرتب کردہ ''سیف زلفی کے مرثیے'' اُردو شعر و اَدب کی دنیا میں گراں قدر اضافہ ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ کم و بیش ۱۰۶ صفحات پر محیط ڈاکٹر شبیہ الحسن کا وہ مقدمہ ہے جسے ایک مبسوط مقالے کی حیثیت حاصل ہے اور دیوانِ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی طرح اپنی منفرد شناخت کا حامل ہے۔ اس مقدمے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیف زلفی کی سوانح، ان کے فکر و فن اور مرثیوں کا خصوصی طور پر تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کٹھن محنت طلب بل کہ مشقت طلب تخلیقی کام کی انجام دہی کے پس منظر میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی وہ معتبر شخصیت کارفرما ہے، جس کی تربیت گھر اور تعلیمی اداروں ہر دو سطح پر ہوئی ہے۔ گھر میں استاذ الاساتذہ وحید عصر سیّد وحید الحسن ہاشمی کی ہمہ وقت صحبت اور تربیت میسر ہے تو کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر ڈاکٹر آغا سہیل، سجاد حارث، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایسے نامور اور معتبر اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع میسر رہا۔ یہ اسی تربیت کا اثر ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن شعر و اَدب کے بارے میں واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے تحقیقی مزاج اور تنقیدی شعور کے حسین امتزاج نے اُردو شعر و اَدب کو بہت کچھ دیا ہے اور ہنوز یہ تخلیقی سفر جاری ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیقی و تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ''سیف زلفی کے مرثیے'' میں جلوہ افروز ہے۔ انھوں نے مقدمے کے آغاز میں سیف زلفی کے سوانحی حالات نہایت اختصار لیکن جامعیت کے

ساتھ سپردِ قلم کیے ہیں لیکن تحقیق کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں ہر بات کے لیے معتبر حوالہ دینا نہیں بھولے۔ تاریخ پیدائش، ابتدائی حالات، تعلیم وتربیت، شاعری، اولاد غرض یہ کہ تمام کوائف اور ضروری معلومات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد پیش کیا ہے اور ہر صفحے پر فٹ نوٹ میں حوالے بھی درج کر دیے ہیں۔

سیف زلفی شعر وأدب کے آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسلسل ریاض کے ذریعے اپنی خداداد شعری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا اور غزل، نظم، سلام، منقبت، نعت اور مرثیے ایسی معتبر اصناف سخن کی آبیاری میں خونِ جگر صرف کیا۔ ان کی یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ معاصر ناقدین نے ان کے فن کو اپنے اپنے انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے نہایت جاں فشانی، عرق ریزی، تلاش وجستجو اور چھان پھٹک کے مشکل عمل کے بعد مستند اور معتبر ناقدین کی آراء مع حوالہ جات شاملِ کتاب کی ہیں۔ اس کاوش سے کتاب کے اعتبار میں بھی گراں قدر اضافہ ہوا ہے اور نوجوان محققین کے لیے رہنمائی بھی میسر آ گئی ہے۔

کتاب کے اس مقدمے میں سیف زلفی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں طرح کی نگارشات پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی دیانت داری، تنقیدی شعور، سیف زلفی سے گہری عقیدت اور ادب دوستی کے پرخلوص جذبات ہی کا یہ اعجاز ہے کہ ہر تخلیق کے بارے میں بنیادی اور اہم معلومات یعنی دیباچے، مندرجات اور کتاب کے حسن وقبح کے حوالے سے تنقیدی آراء اس جامع انداز سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنی ہیں کہ قاری اصل کتاب کے تفصیلی مطالعہ سے کسی حد تک بے نیاز ہو گیا ہے۔

مطبوعہ کلام کے تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کے بعد ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جن غیر مطبوعہ تخلیقات کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ ان میں ''غزلیں، دوہے، بچوں کے لیے نظمیں، منظوم تراجم اور مراثی شامل ہیں۔ کتاب کی اشاعت کا مقصدِ اولین سیف زلفی کے غیر مطبوعہ مراثی کی تدوین واشاعت تھا اس لیے ان مرثیوں کی عدم اشاعت کے باعث اُردو مرثیے کی روایت میں سیف زلفی کے مقام ومرتبے کا تعین میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے غیر مطبوعہ مرثیوں کی اشاعت کی ضرورت اور اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''اُردو مرثیے کے حوالے سے لکھی جانے والی معروف تنقیدی کتب میں سیف زلفی کے بارے میں جزوی اشارے ملتے ہیں۔ ناقدین نے سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کا حوالہ تو ضرور دیا ہے لیکن ان کی مرثیہ نگاری کی محاسن ومعائب سے ہمیں بے خبر رکھا ہے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے موقف کی تائید میں جن معروف ناقدین کی تحریروں کے اقتباس پیش کیے ہیں ان میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر ہلال نقوی، ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر اسد اریب، میرزا ادیب، ڈاکٹر آغا سہیل

وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے محض آراء پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بل کہ سیف زلفی کے مرثیوں کے حوالے سے بعض تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے اور ان کی تصحیح کا فرض کفایہ بھی انجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر سیف زلفی کے مرثیوں کی تعداد کے بارے میں ناقدین اور محققین کے ہاں پائی جانے والی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ سیف زلفی نے پانچ نہیں صرف چار مرثیے ہی کہے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا بیان ملاحظہ کیجیے :

> ''راقم الحروف نے انتہائی احتیاط کے ساتھ سیف زلفی کی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے اور خاص طور پر ان کے تحریر کردہ مرثیوں کو بنظر غائر دیکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیف زلفی نے مجموعی طور پر صرف درج ذیل چار مرثیے یادگار چھوڑے ہیں۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے موقف کی دلیل کے طور پر چاروں مرثیوں کے اصل متن کے مطالعے کے بعد ہر مرثیہ کا عنوان، سن تخلیق، بندوں کی تعداد، موضوع اور ہر مرثیہ کا مطلع درج کیا ہے۔ اس تحقیقی مطالعے کے بعد فرداً فرداً ہر مرثیے پر تنقیدی تبصرہ بھی کیا ہے۔ ان چاروں مرثیوں کے بارے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے درج ذیل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان معلومات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محقق کا بیان کردہ ہر دعوا تحقیقی صداقت پر مبنی ہے۔

''پہلا مرثیہ: سیف زلفی کا یہ مرثیہ ''ڈائری نمبر۲۱'' پر مرقوم ہے۔''

''دوسرا مرثیہ: سیف زلفی کا یہ مرثیہ ایک بوسیدہ کاغذ پر کاربن کاپی کے طور پر ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔''

''تیسرا مرثیہ: سیف زلفی کا یہ مرثیہ ایک بوسیدہ کاغذ کی خود ساختہ کاپی پر ان کے ہاتھ سے تحریر کردہ ہے۔''

''چوتھا مرثیہ: سیف زلفی کا یہ مرثیہ ایک کاغذی دستہ پر رقم ہے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے ان چار مرثیوں کے تحقیقی و تنقیدی مطالعے سے اُردو مرثیہ نگاری میں سیف زلفی کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور سیف زلفی کی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت کا احساس بھی دلایا ہے۔

''سیف زلفی کے مرثیے'' کی اشاعت سیف زلفی کے صاحب زادے رضا انتخاب کی اپنے والد سے عقیدت، ان کی تخلیقات سے دل چسپی اور اُدب پروری کا ثمر ہے۔ سیف زلفی اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ انھیں رضا انتخاب ایسا باذوق اور سعادت مند فرزند رشید نصیب ہوا۔ سیف زلفی اس لیے بھی خوش بخت ہیں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن ایسے محقق، نقاد، مدوّن اور ادیب کی معتبر نگاہ ان کے تخلیقی سرمائے پر پڑی ہو جنھوں نے عدیم الفرصتی کے باوجود اس دفینے کو شعر و اُدب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے سہل الحصول بنا دیا ہے۔

(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، سیف زلفی نمبر، اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

''شام وسحر'' کی حکیمانہ باتیں

میرزا ادیب

••

ایک باشعور اور فرض شناس مدیر کی صرف یہی کوشش نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رسالے کے قارئین کے لیے اچھے اور مفید مضامین، نظم ونثر فراہم کرے۔ یقیناً یہ اس کا ادارتی فریضہ ہوتا ہے مگر یہ فریضہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اداریے میں ان تحریکات پر روشنی ڈالے، جو عہد حاضر میں اَدب پر اپنے اثرات مرتب کر رہی ہیں اور دنیائے اَدب میں جو کچھ ہو رہا ہے، اَدب پر ان کے نتائج کا بھی تجزیہ کرے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، مَیں کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس روایت کی ابتداء علامہ نیاز فتح پوری سے نہیں ہوئی تو کم از کم انھوں نے ''نگار'' کے فکر انگیز اداریوں میں اس روایت کو مستحکم کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ موجودہ دَور میں ہر اَدبی پرچے نے تو اس روایت کو التزاماً نہیں اپنایا مگر ایک پرچا ایسا ہے جس میں یہ روایت تسلسل سے جاری ہے اور یہ چیز اس پرچے کی خصوصی خوبی بن گئی ہے۔ یہ پرچہ ہے ''شام و سحر'' جس کے مدیر پروفیسر ڈاکٹر شبیہ الحسن ہیں۔ موصوف ''شام وسحر'' کے ہر پرچے میں ''باتیں'' کے عنوان سے بڑی خیال افروز اور قابلِ توجہ باتیں کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات مختصر ہوتی ہے، مگر اپنے اندر خصوصی جامعیت رکھتی ہے۔

''شام وسحر'' کا پرچہ دیکھتے ہی میں سب سے پہلے ''باتیں'' کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پروفیسر شبیہ الحسن نے اپنے ہر اداریے میں کوئی نہ کوئی ایسا موضوع ضرور چھیڑا ہے جو اَدبی مسائل کے حوالے سے اہم بھی ہے اور بھرپور توجہ کا متقاضی بھی۔ اس وقت میرے سامنے ''شام وسحر'' کے پرچے پڑے ہیں۔ میں ایک بار پہلے بھی ان پرچوں کے سارے اداریوں کا مطالعہ کر چکا ہوں اور آج پھر ان پر فرداً فرداً نظر ڈالی ہے۔ پروفیسر صاحب ایک باخبر، حساس اور بڑے ذمے دار مدیر ہیں۔ صرف یہی نہیں، ان کے پہلو میں ایک دل

وردآشنا بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اُدبی مسائل پر گفت گو کرنا کوئی اتنا مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اہم مسئلہ اس وقت بنتا ہے، جب کوئی لکھنے والا کسی مسئلے پر لب کشائی کرتے وقت، اس کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھ کر کچھ کہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے اداریے میں کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر جو لفظ بھی ان کے قلم سے نکلتا ہے۔ اس کی اتنی اہمیت ہوتی ہے کہ اگر اس لفظ کو تحریر سے الگ کر دیا جائے تو وہ ایک نمایاں خلا محسوس ہونے لگے گا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی باتیں، حکیمانہ باتیں ہیں یہ گہری سوچ کی شاہد ہے اور یہ گہری سوچ پڑھنے والوں کو کچھ سوچنے کی ترغیب دیتی ہیں، ان کی بڑی افادیت ہے اور اسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

◆◆◆

''شام وسحر'' کے فکری اداریے

ڈاکٹر آغا سہیل

◆◆

''**شام و سحر**'' ایک ایسا اَدبی مجلّہ ہے جو پابندی وقت کے ساتھ ہر ماہ تواتر سے شائع ہوتا ہے اور چند صفحات میں معیاری تخلیقات پیش کرتا ہے۔ تخلیقات کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کے مرقوم اس کے مختصر اداریے بھی انتہائی پُر مغز اور اہم موضوعات پر قارئین اَدب کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان اداریوں میں نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ کسی نہ کسی مسئلہ پر توجہ دی گئی ہے، جس میں اَدب کی خدمات کے لیے نئے عزائم بھی ہیں، ادیبوں کے باہمی تنازعات سے اَدب کو جو نقصان پہنچ رہا ہے، اس پر توجہ بھی دی گئی ہے۔ اشتہارات کے حصول میں سیاسی مصالح کو ارباب اختیار جس طرح دخل دیتے ہیں اس کا ذکر ہے، مہذب معاشرے کی تشکیل میں بزرگوں کے آراء کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ علمائے سوء کی طرح مالی منفعت کی طمع میں خالقین اَدب جس طرح مبتلا ہو کر تخلیق اَدب کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس سے اَدب کو اور معاشرے کو جو جو نقصانات پہنچ رہے ہیں، ان پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ آمریت اور تمرد کے خلاف حضرت امام حسین علیہ السلام نے جو مثالی قربانی پیش کی وہ شعر و اَدب کی تخلیق میں نہایت وقیع مقام کی حامل ہے۔ بیشتر معاشرے میں انسان اپنی ذات کے بطون میں سمٹتا اور سکڑتا چلا جاتا ہے اور معاشرے سے اس کا رابطہ ٹوٹتا چلا جاتا ہے، جو ایک المیہ ہے اور اس طرح ادیب مسائل حاضرہ سے چشم پوشی کر کے ایک جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ بعض اُدبا اور شعرا تازہ اَدبی مسائل اور معاشرتی مسائل حاضرہ کو نظر انداز کر کے اپنی پرانی تخلیقات کو نئے ناموں سے بار بار چھپوا رہے ہیں اور اس تکرار سے تکرار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ اس نظریئے کا قائل ہے کہ گمنامی کی گرد جھاڑ کر ادیبوں اور شاعروں کو دریافت کیا جائے اور ان کے افکار و نظریات کے احیاء سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا جائے۔ ادیبوں کو حالی کانفرنس کو زیادہ کارآمد اور مفید بنانے کے سلسلے میں کچھ تجاویز مدیر ''شام وسحر'' نے بھی پیش کی ہیں اور آخر میں اَدب، ادیب اور قارئین کے باہمی روابط سے صحت مند مقصدی اَدب کی تخلیق کے تعین میں آسانی پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

دراصل یہ مختصر شذرات ہیں، جو بہترین مقصدی اَدب کی تخلیق میں بالواسطہ اور بلاواسطہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر بہ یک نظر از اول تا آخر ان پر توجہ کی جائے تو آئندہ کے لیے اصلاحی راستے کھل سکتے ہیں۔

◆◆◆

اندھیرے کے جگنو

ڈاکٹر انور سدید

◆◆

کسی اَدبی پرچے کا اداریہ بنیادی طور پر مدیر کا ذاتی صفحہ ہوتا ہے جس پر مدیر کو دنیا کے ہر موضوع پر بالعموم اور اَدبی مسائل و افکار پر بالخصوص اظہار خیال کا حق حاصل ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ''اَدبی اداریہ'' میں مدیر ''واحد متکلم'' میں بات کرنے کے بجائے قارئین کو جمع متکلم کے لفظ ''ہم'' سے مخاطب کرتا ہے تاہم اس ''ہم'' کا استعمال ''جلال شاہانہ'' کی نمائش نہیں بل کہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ زیرِ بحث مسئلہ صرف مدیر کا مسئلہ نہیں بل کہ اس کی نوعیت اجتماعی ہے اور ادارتی صفحے سے تنہا مدیر کی آواز نہیں آ رہی بل کہ وہ سب آوازیں اُٹھ رہی ہیں جو زیرِ بحث مسئلے سے متعلق اور متفق ہیں۔ اداریے سے اختلاف کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ اداریہ تو وہ کھڑکی ہے، جس سے خیال کا نیا جھونکا رسالے کے صفحات سے نکل کر بیرونی دنیا میں پھیل جاتا ہے اور بعض اوقات اختلاف رائے سے مزید نئے خیالوں، نئے زاویوں کی انگیخت دیتا ہے۔ اس قسم کی بحث بالعموم آئندہ صفحوں میں خطوط کے حصے میں نمایاں ہوتی اور اَدبی دل چسپی کا سامان فراواں پیدا کرتی ہے۔ اس زاویے سے دیکھیے تو ادبی پرچے کا اداریہ اس کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ یہ اُدب کا سمت نما بھی ہے اور اکثر اوقات ادبی رجحانات اور تحریک کو بھی جنم دیتا ہے۔

یہاں مجھے اس حقیقت کا اظہار بھی کرنا ہے کہ اب کچھ عرصے سے اَدبی رسائل سے ''اداریے'' غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض اَدبی پرچے اس کمی کو کسی موضوعاتی مقالے سے پورا کرتے ہیں۔ فرض کفایہ کی ادائیگی میں مقالہ نگار کو بطور ''مہمان مدیر'' پرچے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مَیں نے اس روش کے خلاف ''احتجاج'' کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اَدبی رسالے اب ''پوسٹ آفس'' بن گئے ہیں۔ قلمی معاونین سے ڈاک وصول کی جاتی ہے۔ زیورِ طبع سے آراستہ کرانے کے بعد پوری ایمان داری سے قارئین تک پہنچا دی جاتی ہے۔ چناں چہ بیشتر اَدبی رسائل ''بے سمت'' ہو گئے ہیں۔ اس سے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ محترم ''مدیر'' خود فکری اعتبار سے بانجھ

ہیں۔ان کے پاس کہنے کے لیے، قارئین کو رستہ دکھانے اور اَدب کی راہ نمائی کرنے کے لیے اکھر نہیں، ان کا کیسۂ دماغ خالی ہے۔ مَیں نے اپنے ایک دوست مدیر سے گزارش کی کہ کبھی ہمیں اپنے خیالات سے بھی نوازیے! بڑی آسانی سے بولے، بہت مغز مار چکے ہیں، نتیجہ کچھ نہیں نکلا' مَیں نے مولانا صلاح الدین کی مثال دی کہ وہ ''ادبی دنیا'' کی ''بزمِ اَدب'' میں کس خوب صورت انداز میں موضوعات پر قلم اٹھاتے اور لکھنے والوں کی تخلیقات کا تعارف کراتے تھے۔ان کا دَور اب تک اَدبی لحاظ سے توانا اور فکری لحاظ سے منور نظر آتا ہے۔ ہنس کر بولے۔

''بھئی! میں مولانا صلاح الدین احمد تو نہیں ہوں۔''

اس اَدبی پرچے میں تا حال مدیر کے اپنے لکھے ہوئے اداریے کی مشعل روشن نہیں ہوئی، کام انھوں نے مہمان مدیران کو سونپ رکھا ہے۔

''شام وسحر'' بے قاعدگی سے چھپنے والا ضخیم ادبی جریدہ نہیں۔ یہ ماہ بہ ماہ باقاعدہ چھپنے والا کم ضخامت ایک ایسا جریدہ ہے، جسے آپ آسانی سے اُٹھا سکتے ہیں، گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر پڑھ سکتے ہیں۔ سفر اور حضر میں معاون بنا سکتے ہیں، لیکن اسے آلۂ ضرب کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کے ہر پرچے میں ''باتیں'' کے عنوان سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کا تحریر کردہ اداریہ بھی شامل ہوتا ہے۔ جو قاری اور مدیر اور ادیب اور مدیر کے درمیان بھی رابطے کا وسیلہ بنتا ہے۔ اَدبی پرچوں کی بدحالی اور بے قاعدگی کے دور میں یہ حقیقت معجزہ معلوم ہوتی ہے کہ ''شام وسحر'' کے سالانہ بارہ پرچے شائع ہوتے ہیں۔

''شام وسحر'' کے اداریے بنیادی طور پر ''مسائل'' کے اداریے ہیں۔ یعنی وہ مسائل جن سے ادبی دنیا فی الوقت دوچار ہے اور جو اَدب کے صحت مند ارتقا میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر مدیر ''شام وسحر'' ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ہمیں مصائب سے آگاہ کرنے اور اَدب کے راستے سے خاروخس ہٹانے کا مشورہ دیا ہے اور مشورہ دینے کا انداز چوں کہ جارحانہ نہیں بل کہ شائستہ ہے، اس لیے بات دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شمارے میں کتابوں کی رونمائی کی تقریبات کی ''بدعت'' پر اداریہ لکھا گیا۔ ایک شمارے میں اَدب سے جلد شہرت ومنفعت کے منفی رجحان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک اداریے میں ''نعرہ باز اَدب'' پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ایک پرچے میں یہ سوال اُٹھایا گیا ہے کہ ''معاشرہ تخلیق کار کی پذیرائی سے گریزاں کیوں ہے؟'' اَدبی رسالے سے قاری اور حکومت کے اغماض کے علاوہ ڈائجسٹوں کے فروغ اور اَدبی رسائل کے زوال آمادگی اور خود ستائشی، خود تشہیری اور خود نمائشی'' جیسے منفی زاویوں کو روبہ منظر لانے کی سعی بھی کی گئی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب مسائل نئے نہیں لیکن کیا آپ نے ان مسائل پر کبھی غور کیا ہے؟ انھیں رفع کرنے کی کبھی کوشش کی ہے؟ مدیر ''شام وسحر'' نے یہ مسائل چھیڑ کر یقیناً موجودہ دَور کا سرسیّد احمد خان بننے کی کوشش نہیں کی، لیکن انھوں نے

قاری اور ادیب کے سوئے ہوئے احساس کو جگانے کی سعی ضرور کی ہے۔

میرے سامنے بیشتر اداریے موجود ہیں، جن پر مجھے اظہارِ خیال کرنا ہے۔ مجھے بات کو پھیلانے کے بجائے ''شام و سحر'' کے اداریے جیسا اجمال برتنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس لیے بات کو سمیٹتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ ''شام و سحر'' کے اداریے اندھیرے کے جگنو ہیں، جو چمکتے ہیں تو اندھیرا روشن ہو جاتا ہے، بجھ جاتے ہیں تو تاریکی دبیز ہو جاتی ہے۔ میرے دوست حیدر قریشی اور راغب شکیب نے ''اوراق'' کے اداریوں کی کتاب ''پہلا ورق'' شائع کی تو میں نے لکھا تھا کہ ''پہلا ورق'' کی بحث سے مجھے کئی نئے موضوعات پر لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ خیال کو کروٹ دینے کا زاویہ ''شام و سحر'' کے اداریوں میں بھی موجود ہے لیکن ان اداریوں میں چوں کہ ادبی معاشرے کو زیادہ موضوع بنایا گیا ہے، اس لیے یہ عمل کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ڈاکٹر شبیہ الحسن مدیر ''شام و سحر'' نے ان اداریوں میں ''سفینۂ غم دل رواں'' کیا ہے۔ اور انھیں توقع ہے کہ:

ع۔ ''کہیں تو ہو گا شب ست موج کا ساحل''

◆◆◆

حقیقت پسندانہ باتیں

پروفیسر سجاد مرزا

◆◆

کسی جریدے کا اداریہ اس کے مدیر کے ذہنی رجحانات ہی کا عکاس نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس منظر میں کسی نظریے یا مکتبہ خیال کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے۔ رسائل و جرائد کے اداریے ان کے تخلیق کاروں اور قارئین کے درمیان ایک بلاواسطہ رابطے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ سمجھ دار مدیر اپنے قارئین سے براہ راست ایک خوش گوار تعلق کی راہ ہموار کر لیتا ہے اور باہمی اعتماد کی یہ فضا بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل بھی نکال لیتا ہے۔

ہم نے وہ دور بھی دیکھا ہے، جب مولانا صلاح الدین احمد کے ''اَدبی دنیا'' اور ان کے اداریے ''بزم ادب'' کا بڑا شہرہ تھا۔ اس میں ان کے شریک مدیر ڈاکٹر وزیر آغا بھی اپنے دل کی باتیں تخلیق کاروں اور ان کی تخلیقات کے حوالے سے کھل کر کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دَور میں نقوش، اَدب لطیف، افکار، رنگ زمانہ، تہذیب واَدب، فیض الاسلام، الرشید، گجر، محفل، اُسلوب، سویرا، مینار اور نقیب کے پُر مغز مختصر اداریے دامن کش دل ہوا کرتے تھے۔ پھر اَدبی رسائل و جرائد سے اداریہ نویسی کا رجحان کم ہونے لگا اور اسے خالص صحافتی چیز تصور کیا جانے لگا۔

اداریہ نویسی کی روایت کو ''فنون'' اور ''اوراق'' نے دوبارہ زندہ کیا اور ان جرائد نے کشادہ نظری کو راہ دی۔ ان کی پیروی میں تخلیق، ابلاغ، غنیمت، تجدید نو، منشور، صریر، شام و سحر، مفیض اور دیگر اَدبی رسائل کے بالغ نظر مدیران نے بلند فکری، روشن خیالی، غیر جانب داری اور خرد افروزی کے فروغ کے لیے اپنے اداریوں کو وسیلہ اظہار بنایا۔

افکار، صریر اور مفیض کے اداریے مستقل نوعیت کے مضامین کی ذیل میں آتے ہیں۔ محدود ضخامت کے پرچوں کے اداریے اختصار اور اجمال کی ایک خوب صورت مثال ہوتے ہیں۔ ''شام و سحر'' کے اداریے

اس قبیل میں شامل ہیں۔

جنوری ۱۹۹۴ء کے اداریئے ''باتیں'' میں ''شام وسحر'' کے مدیر ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔

''شام وسحر'' کم صفحات کا حامل اُدبی ماہ نامہ ضرور ہے لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے یہ ضخیم رسائل کے ہم پلہ ہے۔ اس جریدے کو کسی قسم کی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے۔ اسے نہ تو اشتہارات ملتے ہیں اور نہ ہی رعایتی نرخوں پر کاغذ میسر ہے۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی ہم یہ رسالہ مسلسل نکال کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جہاد میں کامیابی وسائل سے نہیں، ثابت قدمی سے حاصل ہوتی ہے۔''

مدیر ''شام وسحر'' نے مذکورہ اقتباس میں اس قبیل کے محدود وسائل رکھنے والے بہت سے رسائل کے مدیران کے دل کی بات کہہ دی ہے۔

فروری ۱۹۹۴ء میں مدیر ''شام وسحر'' نے ایک اہم مسئلے کی جانب توجہ مبذول کروائی ہے۔

''تخلیق کاروں کی باہمی آویزش نے معاشرے میں ادیب کے مقام کو انتہائی پست کردیا ہے۔ معمولی سی رنجش کو بنیاد بنا کر یہ ادیب ایک دوسرے کے خلاف طنز وتعریض کے تیر برسانے لگتے ہیں۔ (اخباری) کالموں کے پیٹ نفرت آمیز مواد سے بھر دیئے جاتے ہیں اور ذاتی مخاصمت کو قومی اور نظریاتی لڑائی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔''

گروہ بندیوں نے اُدب اور ادیب کو کتنا نقصان پہنچایا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج کا قاری اُدب اور ادیب سے نفرت کرنے میں حق بجانب ہے تو اس سے شکایت کیسی؟

مارچ ۱۹۹۴ء کے ''شام وسحر'' میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک عام المیے کی جانب اشارہ کیا ہے:

''اُدبی رسائل کی ترتیب واشاعت جان جوکھوں کا کام ہے۔ مواد کے حصول سے لے کر قارئین تک رسالے کی ترسیل جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ حکومت اُدبی رسالوں کو خاطر میں نہیں لاتی اور حکومت کی منظور نظر تشہیری کمپنیاں صرف ان رسالوں کو اشتہارات سے نوازتی ہیں جو محض حکومتی پالیسیاں اُجاگر کریں اور حکومت کے ہر جائز وناجائز کام کو صحیفہ آسمانی کے مطابق ثابت کردیں۔''

اس طرز عمل کے دیگر بہت سے رسائل بھی شاکی ہیں۔ وہ اکثر اپنے اداریوں میں اس بات کا برملا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

مئی ۱۹۹۴ء کے اداریے میں مدیر ''شام وسحر'' رقم طراز ہیں:

''یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ عصرِ حاضر میں پاکستانی ادیب اپنے فرائض سے غافل ہو کر مالی منفعت کے حصول میں تمام اخلاقی واَدبی روایات کو پامال کر رہے ہیں۔ اگر یہ صورتِ حال کچھ عرصہ مزید جاری رہی تو معاشرے سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا خاتمہ ہو جائے گا اور اَدب اپنی افادیت کھو بیٹھے گا۔''

کسی رسالے کے مدیر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عصری مسائل کی شدت سے بھی اپنے قارئین کو آگاہ کرتا رہے۔ مدیر ''شام وسحر'' ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے اس فریضے سے غافل نہیں ہیں اور وہ اپنے قارئین کو ہم راہ لے کر چل رہے ہیں۔ جولائی ۱۹۹۴ء کے اداریے میں وہ دعوت دیتے ہیں:

''آیئے عہد کریں کہ ہم ذاتی معاملات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے ملکی اور قومی مفادات کا خیال رکھیں گے اور معاشرتی ترقی میں اپنا مثبت کردار اَدا کرتے رہیں گے۔''

اگست ۱۹۹۴ء کا اداریہ بھی متذکرہ صدر بات کی طرف اشارہ کناں ہے:

''ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے مسئلہ کے حل میں دوسرا دلچسپی لے، اس صورتِ حال میں لوگ ادیبوں اور شاعروں کی طرف دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح حالات کی تلخیق کو شیریں بنانے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کریں اور اَدب اور معاشرے سے باہمی تعلق کو مضبوط تر بنانے میں اپنا فعال کردار اَدا کریں۔''

ایک اور انتہائی بُری صورت حال کی جانب مدیر ''شام وسحر'' نے توجہ دلائی ہے اور اس بُری رسم کو روکنے کی استدعا کی ہے:

''ہمارے تخلیق کاروں کو اپنی زندگی ہی میں کلیات چھپوانے کا ''جنون'' پیدا ہو گیا۔ ایک زمانے میں رحلت کے بعد کلیات کی اشاعت اس لیے قابلِ تحسین سمجھی جاتی تھی کہ اس طرح تخلیق کار کا مکمل تخلیقی سرمایہ قاری کے سامنے آجاتا تھا اور وہ اس کے حُسن وقبح کا جائزہ لے کر تخلیق کار کے بارے میں حتمی رائے قائم کر لیتا تھا۔ زندگی میں کلیات کی اشاعت نے قاری کو اُلجھن میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ شاید اس کلیات کے خالق کا تخلیقی سفر ختم ہو گیا ہے۔ تخلیق کاروں سے التماس ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنا فاتحہ خود نہ پڑھیں دوسروں کو بھی اس کا موقع فراہم کریں۔''

اکتوبر ۱۹۹۴ء کا اداریہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں شبیہ الحسن نے عہد حاضر کے ناقدین کے منفی رویوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ عصر حاضر کے ناقدین کی تخلیقات کا بنظر غائر مطالعہ فرمائیے۔ آپ خود محسوس کریں گے کہ بیشتر ناقدین نے دوسروں کے چراغ سے اپنے فکری چراغ روشن کیے ہیں۔ ناقدین اُدب سے ہماری التماس ہے کہ وہ اپنے مقام و منصب کو پہچانیں اور غیر جانب داری کے ساتھ تخلیق کاروں کو ان کا جائز مقام عطا کریں۔ اگر ناقدین نے یہ مخلصانہ روش اختیار نہ کی تو آنے والا وقت انھیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

اکتوبر ۱۹۹۴ء میں منعقد ہونے والی ''کانفرنس'' کا تمام حال واحوال سامنے آ چکا ہے۔ اس کی مدح سرائی کرنے والے بھی موجود ہیں اور اس میں نقائص تلاش کرنے والے بھی اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کر چکے ہیں۔

نومبر ۱۹۹۴ء کے اداریے میں مدیر ''شام وسحر'' شبیہ الحسن نے اس حوالے سے سرکار کو مشورہ دیا:

''ارباب اختیار سے گزارش ہے کہ وہ قومی اُدبی کانفرنس منعقد کرتے ہوئے سینئر ادیبوں اور دانش وروں کے مشوروں سے کوئی حتمی پروگرام وضع کریں تاکہ اس کے مثبت نتائج سامنے آئیں، موجودہ طرزِ عمل سے ادیبوں کے شکم پُر اور ذہن خالی ہوتے جا رہے ہیں۔''

سال کے آخری شمارے میں مدیر ''شام وسحر'' نے تحریر فرمایا:

''کسی بھی باشعور معاشرے میں ادیب، اُدب اور قاری کی تکون بنیادی حیثیت کی حامی ہوتی ہے۔ اس تکون میں قاری کی حیثیت اس اعتبار سے کلیدی ہو جاتی ہے کہ اس کے تقاضوں سے اُدب اور ادیب اپنا اپنا رخ تبدیل کر لیتے ہیں۔ اگر قارئین باذوق ہوں تو معاشرے میں مثبت طرزِ فکر کا حامل اُدب تخلیق پاتا ہے۔''

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ادبی جریدے کی پالیسی اور اُدبی جہت کا اندازہ اس کے مدیر کے لکھے ہوئے محتاط اور متوازن اداریوں سے کیا جا سکتا ہے۔

◆◆◆

”شام وسحر“ کی باتیں اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر افتخار بیگ

◆◆

تقریباً ہر ماہ کے اولین ہفتے میں ڈاکیے کی دستک کے ساتھ اڑتالیس صفحوں پر مشتمل ایک اَدبی دستاویز کہ نام اس کا ”شام وسحر“ ہے، موصول ہوتی ہے۔ یہ کئی برس کا معمول ہے۔ میرے لیے ڈاکیے کی دستک اور ”شام وسحر“ کا وجود اس بات کی شہادت ہے کہ وقت اور حالات اپنے دامن میں کتنی ہی بے چیرگیوں کو سمیٹ لیں، مگر کچھ صاحبانِ جنوں ساماں آج بھی آشفتگیوں کی نئی داستان رقم کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

شیخ صفدر علی اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اس لحاظ سے عجیب ہیں کہ مادیت پرستی کے اس دور میں جب ہر آدمی پیسہ بنانے کی فکر میں ہے، یہ شعر و اَدب کے حوالے سے فکر و آ گہی کو عام کرنے کے لیے پیسہ پھونک رہے ہیں۔ یہ عجیب لوگ ہیں کہ انھوں نے ”شام وسحر“ کو ایک ایسے چھتناور میں ڈھال دیا ہے جہاں نو واردانِ اَدب آ کر ستاتے ہیں۔ یہ گداختگی و دل اور سوز دروں کہ صرف اپنے آپ کو سینت سنبھال اور باندھ کے رکھنا ہے بل کہ نو واردانِ اَدب کے لیے چھپاں بھی مہیا کرتی ہے، اب میسر ہی کہاں ہے؟

شام وسحر کے قاری اور لکھاری بھی اس بات سے متفق ہوں گے کہ اس رسالے کے اوراق میں ایک دل نوازی اور دل دہی کا انداز ملتا ہے۔ دوسروں کے لیے محبت بانٹنا شام وسحر کا اُسلوب ہے۔

۳۱ دسمبر ۲۰۰۵ء کی رات اپنے ساتھ پورے سال کو لے گی اور ہمیں سال بھر کی یادیں دے گئی۔ شام وسحر کی یادیں...... شام وسحر کا قصہ...... پورا سال...... بارہ مہینے...... بارہ شمارے...... اب یہ بارہ شمارے سرگوشیاں کرتے اور بولتے ہیں۔

آج ۸ جنوری ۲۰۰۶ء ہے۔

ان بارہ شماروں کی سرگوشیاں شور میں ڈھل گئی ہیں۔ ان کی ضد ہے: ”ہمیں دیکھو۔ ہمیں سوچو“...... ”مگر میں ڈرتا ہوں!..... میں نے پہلے کبھی اس قسم کی تحریر نہیں دیکھی“ ”تو ہم کیا کریں...... قصور ہمارا تو نہیں

...... پڑھتے ہونا! لکھتے بھی ہو...... پھر ہماری بات کیوں نہیں کرتے'' یہ شمارے ضد کرتے ہیں۔ شور بڑھتا جاتا ہے۔ میرے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں۔ بات میری خواہش اور رضامندی کی نہیں...... بات مان کی ہے، بھرم کی ہے۔ میں اگر نہیں لکھوں گا تو شاید لفظ مجھ سے روٹھ جائیں گے۔ لفظوں کا بھرم ٹوٹ جائے گا اور میں یہ گناہ کر ہی نہیں سکتا۔ سو میں ہار گیا ہوں اور لکھنا چاہتا ہوں۔ ''باتیں'' کرنا چاہتا ہوں۔ ''باتیں'' کے بارے میں باتیں یہ باتیں...... قلب ونظر میں اٹھنے والے جوار بھاٹے کی عکاس ہوتی ہیں۔ باتیں۔ جنوری ۲۰۰۵ء، گزرے سال کی کارگزاریوں پر انفعالیت کا اظہار ہے کہ

''گزشتہ برس ہم نے علم واَدب کی ترقی کے لیے کوئی بڑا وقیع کام نہیں کیا۔ نہ ہی ادبی بحثیں شروع ہوئیں اور نہ نئے نتائج کا استخراج ہو سکا۔''

یہ احساسِ انفعالیت پوری اَدبی دنیا میں موجود تھا اور موجود ہے۔ شاید مباحثے کا دور ہی ختم ہو چکا۔ نظریات...... جن کا تعلق فکری آزادی سے ہوا کرتا ہے، مر چکے ہیں۔ ہم عصرِ تجارت (مرکنٹائل ایج) میں زندہ ہیں۔ ہر شے کا محور ومرکز معاشیات ہے سو فکری مباحث مفقود اور فکری آزادیاں سلب ہو چکی ہیں۔

مقامِ شکر ہے کہ ابھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جو فکر ونظر کے حوالے سے نئے عہد کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے نتائج کا استخراج چاہتے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہم نے خود اپنے آپ کو بہت سی زنجیروں کا اسیر نہیں کر لیا۔ فکری سطح کی یہ اسیری از حد خطرناک ہے کیوں کہ اس اسیری کی وجہ سے ہم نئے عہد کے نئے دنوں کو، نئے تقاضوں کو، نئی قدروں اور نئی اخلاقیات کو قبول کرنے کی بجائے ہچکچاہٹ کا شکار بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پرانی قدروں اور پرانے اصولوں میں سانس لینے پر مصر بھی۔ فروری ۲۰۰۵ء، کے شمارے میں ''کچھ باتیں اَدبی جائزہ نمبر کے بارے میں'' کے ذیل میں شام وسحر کی روایت شکنی اور روایت سازی کا دعوا ہے اور ساتھ ہی پروفیسر ظفر چشتی کے لیے اظہارِ تشکر۔ یہ شمارہ ۲۰۰۴ء کے شام وسحر کا اَدبی جائزہ نمبر ہے۔ مدیر کی طرف سے ظفر چشتی کے محاکے کو سراہنا اور قارئین کو دعوتِ فکر دینے کی بات اس لحاظ سے خوب صورت ہے کہ خود اپنی کاوشوں پر (کہ شمارے میں موجود تمام تخلیقات کے حسن وقبح کی ذمہ داری مدیر کی ہی ہوتی ہے) اس طرح تنقید کو خندہ پیشانی سے قبول کرنا بڑے حوصلے کی بات ہے۔

''باتیں'' مارچ ۲۰۰۵ء کی' واقعہ کربلا اور امام کی قربانی کے مفاہیم کو تلاش کرنے کے بارے میں ہیں۔ مدیر کا کہنا ہے کہ ''عصرِ حاضر میں استحصال کرنے والی قوتیں مختلف روپ دھار کر ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم سنتِ شبیری اَدا کرتے ہوئے باطل اور استعمار کی قوتوں سے خوف زدہ نہ ہوں بل کہ ان کے سامنے حق اور سچ کا علم بلند کریں۔''

اپریل ۲۰۰۵ء کے شمارے میں ''باتیں'' ہمیں بتاتی ہیں کہ استحصال کرنے والی قوتوں نے جو مختلف

روپ دھارے ہیں ان میں سے ایک روپ ہے نام نہاد ادیبوں، دانش وروں کا۔ مدیر کا خیال ہے کہ:

"......عصرِ حاضر کے دانشور اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ پاکستان میں شعروادب پر ایک خاص گروپ کا قبضہ ہے۔ یہ "قبضہ گروپ" ایک جانب تو حکومتی سطح پر ملنے والی مراعات سے لطف اندوز ہوتا ہے اور دوسری جانب وہ غیر معتبر تخلیق کاروں کو نواز کر حقیقی اور سچے تخلیق کاروں کا استحصال کرتا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ ہمیں پر اسوۂ شبیری کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت سے دردمندانہ اپیل کرنے کا کوئی مفہوم نہیں کیوں کہ حکومت کوئی مجرد شے نہیں ہے بل کہ یہی نام نہاد دانشور اور قبضہ گروپ کے لوگ ہیں۔ حکومتی اداروں پر ایک خاص انداز میں قابض ہیں۔ ادب، آرٹ اور کلچر کے فروغ کے لیے ان "دانشوروں" کی بے پایاں خدمات انھیں اہم تر بنا رہی ہیں لہٰذا ہمیں اپنا کام کرنا ہے۔ خلوص اور دیانت سے۔ اور "انھیں" اپنا کام کرنے دیجیے۔ اس کے علاوہ ادیبوں کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ ہاں استقامتِ عمل ضروری ہے اور ساتھ ہی ایک من مندر میں جگمگتی جوت کہ ہم ایک فکری انقلاب لے ہی آئیں گے۔

"باتیں" مئی ۲۰۰۵ء "مدیر کے فکری کرب کی غماز ہیں۔ کہتے ہیں:

"ضرورت اس امر کی ہے کہ یا تو ہم اس گلوبل ولیج کے تقاضوں کے مطابق ایک نیا معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کریں یا اپنے آپ کو مخصوص نظامِ فکر کا اسیر بنا لیا (لیں) ہمیں اس متذبذب کیفیت سے جلد از جلد نکلنے کی ضرورت ہے اگر ہم نے خودی طور پر حتمی فیصلہ نہ کیا تو آنے والا زمانہ ہمیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔"

اس تذبذب سے نکلنے کے لیے ہمیں اخلاقی، سماجی، معاشی اور مذہبی اقدار کے بے شمار امکانات میں سے مخصوص امکانات کا انتخاب کرنا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہم اس جذبی یقین سے محروم ہو چکے ہیں جہاں ایک فرد اور اپنے لیے یقینِ ذات کشید کیا کرتا ہے۔ سماجی سطح پر فرد کی ذات ایک سوالیہ نشان کی زد میں ہے۔ ہم نے سائنسی، علمی اور صنعتی حوالے سے قطعاً ترقی نہیں کی، بل کہ ہم محض ایجادات کے خریدار اور استعمال کنندہ ہیں اس کے باوجود معاشرے میں تیز رفتاری اور تنہائی نے جنم لیا ہے اور فرد ذاتی سطح پر لایعنیت کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ بے روزگاری، محرومی، مجبوری، باصلاحیت نوجوانوں کی صلاحیتوں کو تسلیم نہ کرنے کی روایت نے اس معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ نصب العین مفقود ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح فرد کا میو کے سی فس میں ڈھل گیا ہے۔ اب تو کارواں کے دل سے احساسِ زیاں بھی مفقود ہے۔ زمانوں کی سزا اور جزا کو تو زندہ قومیں پیش نظر رکھا کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو مجموعی طور پر "دل کی موت" واقع ہو چکی ہے۔ حفیظ جالندھری نے ساٹھ کے عشرے میں کہا تھا:

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی -
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

جون ۲۰۰۵ء کی ''باتیں''...... مدیر کا خیال ہے کہ اُردو کے تحفظ اشاعت اور ترقی کے لیے ہمیں کچھ ''نیا'' کرنا ہوگا۔ تجویز یہ ہے کہ ''ہمیں ایک جانب تو اُردو رسم الخط کے لیے قارئین پیدا کرنے پڑیں گے اور دوسری جانب ہمیں نئی تخلیقات کو اُردو کے ساتھ ساتھ رومن رسم الخط میں بھی متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔'' اور مدیر کی طرف سے انتباہ یہ ہے ''یاد رکھیے کہ اگر ہم آئینِ نو سے ڈرتے ہوئے طرزِ کہن پر اڑ گئے تو آنے والا وقت اُردو زبان کے لیے بے حد کٹھن ہوگا۔''

مدیر نے ''باتیں'' میں جو نکتہ واضح کیا ہے اس کی رمزیت اور اہمیت میں کوئی کلام نہیں۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ آنے والے دَور میں ''اُردو'' کا مقام کیا ہوگا......؟ دنیا گلوبل ولیج بن رہی ہے۔ کمپیوٹر کی زبان انگلش ہے۔ ویسے بھی جس زبان میں سائنسی علوم فروغ پاتے ہیں اسی زبان میں نئی سائنسی اور صنعتی اصطلاحات جنم لیتی ہیں۔ علوم کا وہ خزانہ جو اس وقت انگلش میں موجود ہے اس تک رسائی صرف انگلش کے توسط سے ہی ممکن ہے۔ آج انگلش کی بے شمار اصطلاحات اپنے اصل تلفظ کے ساتھ اُردو میں رائج ہو چکی ہیں اور اُردو نے انھیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ اُردو بول چال اُردو کا صوتیاتی نظام اتنا جامع ہے کہ ایک طرف پشاور میں اُردو بولی سمجھی جاتی ہے تو دوسری طرف ہندستان سمیت سری لنکا اور نیپال، بھوٹان تک اردو بول چال اور رابطہ کی زبان کے طور پر موجود ہے۔

ہندی ہندی کی رٹ لگانے والے بہت سے ''دانشوروں'' کا پول سیٹلائیٹ نے کھول دیا ہے۔ آج زی ٹی وی کا مائیک اور کیمرہ جب دور دراز کے دیہات میں جاتا ہے اور وہاں ایک دیہاتی اپنی زبان میں کچھ بولتا ہے تو بچے کہتے ہیں ''بابا یہ تو اُردو بول رہا ہے۔ ہندی تو نہیں'' ادھر ہندی فلم نے نوجوان نسل کو زبان کی حد تک یہ باور کروا دیا تھا۔ ہمارے ہاں کے کچھ لوگوں نے محض رسم الخط کا سہارا لے کر ایک خاص تعصب کے حوالے سے ایک ہی زبان کو دو زبانیں قرار دے کر خود اپنے ساتھ اور اپنی زبان کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے۔

اِدھر صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں اُردو کا وجود ایک عجیب انداز سے فضا میں معلق ہے۔ مٹی سے اس کی جڑت ابھی تک قائم نہیں ہو سکی۔ مقامی ثقافتوں اور کلچر نے اس زبان کو تو شاید قبول کر لیا ہوتا مگر کچھ لوگ آج بھی دلی کا محاورہ دلی کا روزمرہ اور دلی کے لہجے کو اُردو قرار دینے پر مصر ہیں اور یوں اُردو مقامی کلچر اور ثقافت سے جڑت قائم کرنے میں کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کر رہی ہے۔ ہمارے دیہی علاقوں میں پشتو، بلوچی، براہوی، سندھی، سرائیکی، پوٹھوہاری اور پنجابی کا غلبہ ہے، رہن سہن، تمدن اور ثقافت کے اپنے اپنے انداز ہیں۔ ان مقامی زبانوں میں بہت سے لفظ اسماء اور افعال ایسے ہیں جو ''قدیم'' اُردو'' میں مستعمل تھے اور آج انھیں

بڑی خوبی سے اُردو میں سمویا جاسکتا ہے مگر کچھ ''لوگ'' اس کے حق میں نہیں ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ ہر لفظ اپنی اصل میں ہندی سے مستعار ہیں اور ہندی کے الفاظ کو اس طرح اُردو میں رائج کرنے کا مطلب اُردو کے تقدس کو پائمال کرنا ہے۔ ان لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ اُردو زبان کا بنیادی ڈھانچہ ہندی سے مستعار ہے بل کہ سچی بات یہ ہے کہ یہ زبان ہندوی ہی ہے جسے ہم اُردو قرار دے رہے ہیں۔ یہ ایک ہی زبان کے دو نام ہیں اور ایک ہی زبان ہے جو دو رسم الخطوں میں لکھی جا رہی ہے۔

ادھر جدید سائنسی اور صنعتی ماحول نے نئے تمدن اور نئے طرز فکر کو جنم دیا ہے۔ ساتھ ہی لسانی رویوں میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔ پشتو، بلوچی، سندھی، پنجابی، پوٹھوہاری اور سرائیکی زبان کی کایا کلپ ہو رہی ہے اور اُردو زبان بھی نئے لہجے اور نئے رویے سے آشنا ہوا چاہتی ہے۔ مگر ہماری مخصوص جذباتیت نے اُردو کو محض چند شہروں کے چند لاکھ شہریوں اور نصاب تک محدود کر رکھا ہے۔

جذباتی طور پر فتوے دینے کی بجائے اگر ہم پاکستانی تہذیب و تمدن کے نئے مسائل اور بین الاقوامی مسائل کے تناظر میں اُردو زبان کے مستقبل کے بارے میں زیادہ سنجیدگی اور متانت سے فیصلے کریں تو شاید ہمارا بھی بھلا ہو گا اور اُردو کا مستقبل بھی محفوظ ہو سکے گا مگر اس کے لیے روایتی تحریمات کے تقدس کو پیش نظر رکھنے کی بجائے ہمیں بہت واضح انداز میں آزادیٔ فکر کی راہ اپنانا ہو گی۔ مگر ہم فکری سطح پر نئے فیصلے کرنے کے عادی ہیں ہی نہیں۔ ماضی پرستی ہماری عادت ہے اور ماضی کے فیصلوں کو وحی اور الہام کا تقدیس دینا ہماری نفسیاتی کمزوری ہے تو پیارے قارئین...... ایسے میں مدیر محترم کی باتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور مستقبل کے کٹھن مراحل کسی عفریت کی مانند بڑی تیزی سے ہماری جانب بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

جولائی ۲۰۰۵ء کی باتیں کسی خاص پس منظر کی حامل ہیں، جس کا راقم کو قطعاً علم نہیں۔ تاہم اگر اسے عمومی بات سمجھ لیا جائے تب بھی اس بات کی اہمیت مسلمہ ہی رہے گی کہ ''ضرورت اس امر کی ہے کہ سنجیدہ فکر ادبا یک جا ہو کر شعر و ادب کے ان افراد پر گرفت کریں جو تخلیق کاروں کا سادہ اوڑھ کر ادیبوں کے لیے ذات کا سامان فراہم کر رہے ہیں'' ...... دراصل شعر و ادب کی دنیا میں آج ان ہی لوگوں کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے جو پبلک ریلیشنگ کے ہنر سے بہرہ مند ہیں۔ الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا سے لے کر مقامی دفاتر میں فائز افسران تک سبھی سے رابطے میں رہنا آج کے کچھ ادیبوں کا وطیرہ ہے اور یہ نام نہاد ادیب ایک خاص انداز شہرت کو جائز اور ضروری سمجھتے ہیں۔ نتیجتاً انھوں نے کچھ خاص ''چراگاہیں'' قائم کی ہوئی ہیں اور جب کوئی شخص ان کی ''چراگاہوں'' میں مداخلت کرے تو اس کی پگڑی اُچھالنا ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ''چراگاہ'' پر کوئی دوسرا ناجائز قبضہ نہ کر سکے اور یوں بعض اوقات ''بچوں کے ہاتھوں بزرگوں کی تذلیل'' ہو جاتی ہے۔

اگست ۲۰۰۵ء کی باتیں ...... ایک طرح سے ادیبوں کی طرف سے اقبالی بیان ہے کہ ''ادبی تقاریب''

کا انعقاد اب محض ایک ''فیشن'' بن کر رہ گیا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں منعقد ہونے والی تقاریب ''اب محض لذتِ کام و دہن اور چرب زبانی سے مخصوص'' ہیں۔ ایسی تقریبوں میں علمی اور فکری گفت گو اور فنی محاکمہ کوئی بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ نتیجتاً ان تقاریب کی روح مر چکی ہے اور یہ تجویز کہ ''معتبر ناقدین کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے تازہ افکار سے سامعین کے دل و دماغ معطر کریں'' قطعاً بے جا ہے۔ ضرورت شاید اس امر کی ہے ہم سب ادیب اپنے اندازِ فکر اور رویوں پر نظرِ ثانی کریں۔ گڑبڑ ہے کہاں؟ سماج بدل چکا ہے۔ وقت اور حالات کا دھارا کروٹ بدل چکا ہے۔ سماجی قدروں میں تبدیلی آئی ہے۔ فرد کی مصروفیت میں اضافہ ہوا ہے۔ علمی اور فکری سطح پر تبدیلیاں کس نوعیت کی ہیں انھیں سمجھے بغیر اس بات پر اصرار کرنا کہ ادبی تقاریب زندہ رکھی جائیں قطعی طور پر عجیب بات ہے۔ اس حوالے سے بھی ایک مباحثے کا آغاز ہونا ضروری ہے تاکہ کسی مثبت نتیجے پر پہنچا جا سکے۔

ستمبر ۲۰۰۵ء کی باتیں ...... ''یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ علم و ادب کے پرستاروں اور خدمت گاروں نے ڈاکٹر معین الرحمٰن کو اتنا زچ کیا کہ وہ ان کے ہاتھوں پر اپنا لہو چھڑک کر عالمِ جاوداں روانہ ہو گئے'' اور جولائی ۲۰۰۵ء کی باتیں سمجھ میں آ گئیں ...... میرا خیال بھی یہی ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است ...... اور کبھی کبھی اس قسم کی خطائیں جرم بن جاتی ہیں۔ مگر عصرِ حاضر میں ایک المیہ یہ بھی جنم لے چکا ہے کہ اکثر و بیشتر اندر کا آدمی اگر مرا نہیں تو سو ضرور چکا ہے۔ جرم کا احساس بھی ختم ہو چکا ہے۔ ایسے میں کیا کیا جائے۔ یہاں پر ہر حساس آدمی خاص ادیب اور حساس شاعر ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔

بھیڑوں کے بارے میں رہنے والی بھیڑیں ہراساں ہیں اور ایک دوسرے سے چھپتی پھرتی ہیں کیوں کہ جانے کس کھال کے نیچے سے کوئی بھیڑیا نمودار ہو جائے۔ کشادگیِ فکر و نظر اور فکری آزادی ...... یہ دو اصول جب تک علم و ادب کی دنیا میں تسلیم نہیں کیے جاتے کئی معین الرحمٰن ذہنی دباؤ کے شکار رہیں گے۔

اکتوبر ۲۰۰۵ء کی باتیں ...... تاسف سے بھرپور ہیں کہ ''اب تو شاعروں میں مقتدر شعرا کی موجودگی میں بعض شعرا بے وزن اشعار سنا کر بھی واد سمیٹ لیتے ہیں اور ہنرمند شعرا منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں'' مدیرِ محترم قصور کس کا؟ ''بے وزن شعرا'' کا، سامعین کا یا ہنرمند شعرا کا؟

ان ''بے وزن شعرا'' کو مشاعروں میں مدعو کون کرتا ہے ......؟ سامعین اب دلی اور لکھنو والے نہیں ہیں کہ شعر کے حسن و قبح کو جانچ سکیں۔ مدیرِ محترم کا خیال ہے کہ ''اگر مشاعروں کی یہی صورتِ حال رہی تو یہ تہذیبی علامت بھی مٹی میں مل جائے گی اور ہم کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے'' ...... گویا ابھی کچھ وقت ہمیں حاصل ہے۔ میرا خیال ہے ماضی کی تہذیب پیوند خاک ہو چکی۔ آج ہم ایک نئی تہذیب میں سانس لے رہے ہیں۔ بے ہنگم ٹریفک کے درمیان رینگتے تھانوں، کچہریوں، ہسپتالوں اور بسوں کے اڈوں پر توہین و تذلیل کا

شکار ہوتے اور سسکتے انسانوں کے جن تہذیبی رویوں کا تقاضا ہم کر رہے ہیں وہ غلط ہے۔ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ مشاعرے کی روایت مر چکی ہے اور اب مشاعروں میں اور مشاعروں کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ اور ہی چیزیں اور ہی باتیں ہیں۔

نومبر ۲۰۰۵ء کی باتیں...... زلزلہ سے ہونے والی تباہ کاری پر ایک مختصر نوحہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ زلزلے کے متاثرین کی مالی اور اخلاقی مدد کے ساتھ ساتھ ان کی فکری مدد کے لیے بھی تیار رہیں'' اور میرا خیال ہے کہ اس امر میں پاکستان کے کسی ادیب یا کسی شاعر نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

باتیں: دسمبر ۲۰۰۵ء...... بغیر کسی تبصرے اور توجیح کے...... مدیر رقم طراز ہیں کہ ''عصرِ حاضر میں شعر و اُدب سے تعلق رکھنے والے افراد رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر کلاسیکی مزاج اور مذاق رکھنے والی نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جدید نسل کلاسیکیت کو ہرانے اور بوسیدہ معنوں میں استعمال کر کے اس سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی ہے۔ یہ طرزِ عمل قابلِ گرفت بھی ہے اور لائقِ خدمت بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جدت ہمیشہ کلاسیکیت کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ اگر ہم واقعتاً جدید افکار و نظریات پیش کرنے کے متمنی ہیں تو ہمیں اپنے کلاسیکی اُدب کا نہ صرف یہ کہ تحفظ کرنا ہو گا بل کہ اسے نئے معنی بھی پہنانا ہوں گے۔

عصرِ حاضر کے نوخیز تخلیق کاروں سے ہماری التجا ہے کہ وہ شعر و اُدب سے ربط ضرور رکھیں لیکن اپنے کلاسیکی اُدب کا بغور مطالعہ کریں اور اس میں اپنا خونِ جگر شامل کر کے اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنائیں۔ اگر انھوں نے ہماری اس التجا کو اہمیت نہ دی تو ان کی تخلیقات میں سے آفاقی مہک مفقود ہو جائے گی۔''

بارہ مہینے ختم ہوئے۔ بارہ شماروں کی باتیں ختم ہوئیں مگر شام و سحر کا تسلسل جاری ہے۔ ہر شام ایک صبح کی نوید ہے اور ہر صبح تبدیلیٔ حالات کا اشارہ۔ سوائے سوچنے اور کرب سے گزرنے کے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں۔ سو سوچیے، سوچتے رہیے۔

◆◆◆

شبیہ الحسن کی ''باتیں''

اسد عباس خان

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن وسیع المطالعہ نقاد اور ژرف نگاہ محقق ہیں۔ ان کا کام ایک حوالے کی صورت اختیار کر گیا ہے جہاں انھوں نے تنقید اور تحقیق پر کتابیں لکھیں وہاں ساتھ ساتھ 'شام و سحر' کے اداریے ''باتیں'' میں اپنی عالمانہ، محققانہ اور ناقدانہ صلاحیتوں کے گل کھلاتے رہے۔ اپنے اداریوں سے حکومتی، سماجی اور معاشرتی سطح پر تبدیلی لانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے اداریے اگرچہ مختصر ہوتے ہیں مگر فکر انگیز ہوتے ہیں۔ ان میں تنوع ہوتا ہے۔

عصری اور سماجی شعور سے مملو باتیں پڑھتے ہی دل میں اُتر جاتی ہیں۔ خورشید بیگ میلسوی نے انھیں عظیم نقاد کہا ہے۔ وہ بلاشبہ عظیم نقاد ہیں کیوں کہ ان کے تنقیدی اُسلوب میں بھی ابلاغ اور تخلیقی جوہر نمایاں ہوتا ہے ان کے ہاں تنقید بھی تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اپنے اداریے ''باتیں'' میں فکری اور فنی پہلوؤں کو اس طرح کھول کر بیان اور اُجاگر کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن میں سارا متن بیٹھ جاتا ہے اور وہ اس کے سحر سے نکل ہی نہیں پاتا۔ یہ تخلیق در تخلیق کا عمل ہے ان کی ''باتیں'' سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں مثلاً وہ دسمبر ۲۰۰۳ء کے اداریے میں لکھتے ہیں کہ ''جس معاشرے میں سوچنے والے معتبر دانش وروں کو اہمیت نہ دی جائے وہاں کون عقل و دانش کی بات کرے گا۔

ہمارے معاشرے کے انحطاط و زوال کی پہلی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس معاشرے میں دانش وروں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں خیالات اور احساسات جزوی شکل میں ترتیب پاتے ہیں اور بعد ازاں اپنی پوری طاقت صلاحیت اور اپنی تمام تر جہتوں کے ساتھ ایک "Totality" میں متشکل ہوتے ہیں اور یوں ان کی ''باتیں'' ظہور میں آتی ہیں اور ان کی باتوں میں موجود ارتباط بھی مترشح ہوتا ہے۔ یہی فکری ارتباط بہت سارے محققین اور ناقدین کے ہاں ناپید ہے۔ شام و سحر کے اداریے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ تنقید اور تحقیق، اَدب و فن اپنے مافی الضمیر اُسلوب اور خلوص کے اعتماد سے الفاظ اور تخیل کے گورکھ دھندے اور محض زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں ہوئی۔ محدود ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آج کا نقاد اور محقق مروجہ تنقیدی اور تحقیقی طریقہ کار ہی کا شکار نظر آتا ہے اور یہی نقاد اور محقق غیر تخلیقی ہونے کی وجہ سے اپنے ذاتی موضوعات کے حوالے سے اپنی تنقید اور

تحقیق میں جانبدارانہ اور متعصبانہ رویوں سے کہیں بھی اور کبھی بھی آزاد نظر نہیں آتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے ہاں صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ ان کی تنقید اور تحقیق ہر دو اصناف میں خلوص کی شدت پائی جاتی ہے ان کے ہاں فکری تسلسل ہے، جذباتیت نہیں۔ یہی فکری تسلسل آگے چل کر قاری کو فکر انگیز کر دیتا ہے وہ اس چیز کے قائل ہیں کہ اُدب زندگی کا غماز ہوتا ہے۔ (اداریہ جولائی ۲۰۰۳ء)

جولائی کے اداریے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ ''سیاست دانوں کو چاہیے کہ وہ مستقبل سنوارنے کے لیے دوش کے آئینہ میں اپنے افکار و نظریات کا جائزہ لیں'' ڈاکٹر صاحب ہمیشہ ہی ملکی اور عالمی سیاسی صورتِ حال سے خوف زدہ نظر آتے ہیں۔ وہ ساتھ ساتھ اس خوش فہمی پر بھی طنز کرتے ہیں جس میں سابقہ جمہوری حکومتوں اور مارشل لاؤں نے مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے زاویہ نگاہ میں ہمیشہ وسعت اور اداریوں میں تنوع ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ''ہمارے نزدیک معاشرے کی تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب حقیقی دانش ور نظری اور عملی ہر سطح پر حق و صداقت کا اظہار کریں۔ (اداریہ مئی ۲۰۰۴ء)

اس بدترین صورتِ حال میں تخلیق کار کا ذہن ماؤف ہوتا چلا جا رہا ہے۔ (جولائی ۲۰۰۴ء)

اگر ہم نے اب بھی ماضی سے سبق نہ سیکھا تو آنے والا ہر برس پہلے سے بھی زیادہ الم ناک ہوگا۔ (دسمبر ۲۰۰۳ء)

میں یہاں ان کے اداریوں سے متعلق چند آراء پیش کرنا چاہتا ہوں:

''شام و سحر کا پرچہ دیکھتے ہی میں سب سے پہلے باتیں کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ شبیہ الحسن نے اپنے ہر اداریے میں کوئی نہ کوئی ایسا موضوع چھیڑا ہے جو ادبی مسائل کے حوالے سے بھی اہم ہے اور بھرپور توجہ کا متقضی بھی۔'' (مرزا ادیب)

''اداریہ خاصا فکر انگیز ہے اور صاحب علم کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے'' (محمد حامد سراج، میاں والی)

''شام و سحر کے اداریے بنیادی طور پر مسائل کے اداریے ہیں۔'' (انور سدید)

''شام و سحر کے اداریے اگرچہ مختصر ہوتے ہیں لیکن غزل کے فکر انگیز اشعار کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔'' (سلطان جمیل نسیم)

''ڈاکٹر صاحب اپنے ہر اداریے میں کسی نہ کسی خاص ادبی، معاشرتی اور سماجی مسئلے کو چھیڑتے ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب کا یہ تنقیدی رویہ اُن کو اُن کے معاصر ناقدین سے ممتاز اور منفرد کرتا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب ہمارا عظیم سرمایہ اور قومی ورثہ ہیں اور ہمیں اپنا یہ سرمایہ اور ورثہ سنبھال کر رکھنا چاہیے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اُن کے فکر و فن کا بھرپور مطالعہ کرنا چاہیے اور فیض حاصل کرنا چاہیے کیوں کہ ڈاکٹر صاحب سچے فن کار، عظیم نقاد اور غیر معمولی محقق ہیں۔ اُن کی یہ عالمانہ، ناقدانہ اور محققانہ باتیں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا منفرد کارنامہ۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں

حسن عسکری کاظمی

◆◆

ہمہ جہت شخصیت کے کسی مخصوص پہلو پر نظر کرتے ہوئے بھی بہت سی باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں۔ ایسی شخصیت کی اعجاز نمائی فوری اور دلبرائی اسے ہم عصر تخلیق کاروں میں منفرد بنا دیتی ہے اور وہ سب اوصاف اور خصوصیات جنھیں آنے والے زمانے میں دیکھا اور پرکھا جائے گا صرف خلاصے کی صورت میں تخلیقی اعتبار بڑھانے میں ممد و ثابت ہوتی ہیں' عہد موجود میں یہی شخصیت نقد و نظر کے حوالے سے جتنی نمایاں دکھائی دیتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر مستقبل میں قد و قامت اور ادبی مقام کے آئینے میں مرکزِ نگاہ بن جاتی ہے' سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتوں میں صرف نعت' منقبت اور سلام کے حوالے سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے عرق ریزی کے ساتھ تنقیدی اور تحقیق کے اعلیٰ معیار کو سامنے رکھتے ہوئے باب اوّل سے باب ششم تک جتنے مباحث قلم بند کیے انھیں پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوا کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی بجائے خود ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں وحید شناسی کے لیے ضروری ہے کہ ہم نعت' منقبت اور سلام کے فنی اور معنوی پہلوؤں پر غور کرنے سمجھنے اور ترسیلِ فکر کی باریکیوں سے کماحقہٗ آگہی حاصل کرنے کے مراحل طے کریں' ان تینوں اصنافِ سخن کی پذیرائی کے لیے جتنی ریاضت اور محنت سیّد وحید الحسن ہاشمی نے کی اور اپنے فن کو جلا بخشنے میں گزشتہ آدھی صدی سے زیادہ عرصہ اس دشت کی سیاحی میں گزرا اس پر قلم اُٹھانا اور تنقید کا حق ادا کرنا قابلِ تعریف ہے۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی درویش صفت صاحب دیدہ و دل قلم کار ہیں' ان کا شمار ہمارے عہد کے ان سر برآوردہ ادیبوں میں ہوتا ہے جو آغاز سفر سے کمال جذب و شوق کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں' وہ تخلیقِ شعر کو ہر مشغلے پر فوقیت دینا پسند کرتے ہیں' ان کی وسعتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ ہر مکتبِ فکر سے منسلک احباب سے دوستی' تعلق خاطر اور محبت کا رشتہ قائم ہے' ان کا اندازِ نظر ایسا ہے کہ ان سے کسی مسئلے پر گفت گو کیجیے وہ

آسانی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر سادہ الفاظ میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں‘ ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ہم عصر ناقدین نے جو کچھ کہا اور لکھا اسے ’’سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں‘‘ میں محفوظ کر لیا گیا ہے‘ سید آلِ رضا‘ رئیس امروہوی‘ ڈاکٹر سید عبداللہ‘ ڈاکٹر عبادت بریلوی‘ ڈاکٹر وحید قریشی‘ احمد ندیم قاسمی‘ ڈاکٹر جمیل جالبی‘ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی‘ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا‘ ڈاکٹر خورشید رضوی‘ انتظار حسین‘ ڈاکٹر سہیل احمد‘ شہزاد احمد‘ ڈاکٹر عبیداللہ خان‘ ڈاکٹر آغا سہیل‘ ڈاکٹر میمونہ انصاری‘ ڈاکٹر سلیم اختر‘ ڈاکٹر انور سدید‘ مشکور حسین یاد اور ڈاکٹر ہلال نقوی کے علاوہ بہت سے دوسرے اہلِ قلم سے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا‘ سید وحید الحسن کے نعتیہ مجموعے ’’یاسین‘‘ اور مجموعہ مناقب ’’طاہرین‘‘ پر سیر حاصل تبصرے ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر خورشید رضوی کا لکھا ہوا تبصرہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انھوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کے اس محاورے کو تازہ کر دکھایا ’’سید وحید الحسن ہاشمی کی نوکِ قلم سے قوسِ قزح پھوٹتی ہے‘ نعت‘ منقبت‘ مرثیہ‘ غزل اور تنقید جیسے متنوع میدانوں میں یکساں سہولت کے ساتھ لکھا ہے‘ ’’الصراط‘‘ (۱۹۴۸ء) سے لے کر اس تازہ ترین مجموعۂ نعت تک ان کی تصنیفات نظم و نثر کی تعداد تیس کے لگ بھگ آ پہنچی ہے‘ شاعری میں قدرتِ کلام اور سلاست‘ نثر میں سادگی کے ساتھ ایک دل نشیں منقبت اور تنقید میں ژرف نگاہی اور موضوع کی تاریخ بصیرت کو ان کے نتائجِ قلم کی پہچان کہا جا سکتا ہے...... عقیدے کا رسوخ اور شعور کی جدت ہاشمی صاحب کی نعت کے نمایاں عناصر ہیں اور نعت گوئی ان کی نظر میں بطونِ ذات سے پھوٹنے والے ایک روحانی تجربے سے عبارت ہے‘‘:

ہمارا کام ہے ڈوبے رہیں عشقِ پیمبرؐ میں
محبت کو غذا تو روح کے اندر سے ملتی ہے

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تحقیق اور تنقید میں نمایاں مقام رکھتے ہیں‘ ان کی جچی تلی آرا کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے‘ ان کی رائے یہ ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی نے قدرتِ کلام اور شعری گوئی کی صلاحیت کو رسولِ کریمؐ سے اپنے پُرخلوص جذبات‘ عقیدت و محبت کے اظہار اور شیفتگی خانوادۂ رسول کی مدح سرائی میں استعمال کیا ہے‘ ان کے اشعار ان کے پاکیزہ اور نکھرے ہوئے ذوق کے آئینہ دار ہیں‘‘۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ’’سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں‘‘ مرتب کرتے ہوئے نعت‘ منقبت اور سلام کے حوالے سے ان کو متعارف کرا دیا ہے‘ ان کی تخلیقات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہ مختصر احوال صرف ایک جھلکی دکھانے کے مترادف ہے‘ ان کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں بلند‘ اعلیٰ اور ارفع ہے خصوصاً بحیثیت مرثیہ نگار وہ عہد موجود کے بیشتر مرثیہ نگاروں سے معیار اور مقدار کے اعتبار سے بہت منفرد نظر آتے ہیں‘ جہاں تک نعت‘ منقبت اور سلام کو وحید الحسن ہاشمی نے ایک تحریک کی صورت دے کر اپنے کام کو آگے بڑھایا خصوصاً سلام گزاری میں وہ ہم عصر سلام گزار شعرا میں ممتاز دکھائی دیتے ہیں‘ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا یہ تجزیہ درست ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی کے

سلاموں میں موضوعات کا ایک جنگل آباد ہے' وہ کربلا کے واقعے کو ایک سورج کی بجائے ایک شاعر کی چشم تخیل سے دیکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی مشکور سعی کرتے ہیں' ان کے ہاں یہ موضوعاتی تنوع ان کی جدت طبع اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہے۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مجموعہ ہائے سلام کی تعداد آٹھ ہے''الصراط'' سے ''تشنہ لب ہے حسینؑ'' تک ان کا تخلیقی سفر آدھی صدی پر محیط ہے' پاکستان کے معروف نقاد ڈاکٹر وحید قریشی نے پتے کی بات کہی کہ انھوں نے تغزل کا دامن بھی نہیں چھوڑا اور واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی' ان کے سلام درد و غم میں ڈوبے ہوئے اور ندرت فکر سے مزین ہیں' اور انھیں کسی بھی رثائی ادب کے شاعر کے مقابلے میں بخوبی پیش کیا جاسکتا ہے انھوں نے نئے طرز احساس کے ساتھ جذبے کی شدت کو بھی بحال رکھا ہے:

میں حسینیؑ ہوں مرا شیوہ غم عام نہیں
دل میں وہ درد ہے جس درد کا کچھ نام نہیں

سلام کے تمام مجموعوں میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کے ہاں احتجاج کی شائستگی اور مظلوم سے دل بستگی کے ساتھ قاری کو غور و فکر کرنے اور راہ حق اختیار کرنے سے متعلق موثر اظہار کی صورت ابھر کر سامنے آتی ہے' اس اعتبار سے وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب ہیں اور ان کے سلام اعلیٰ مقصد اور اسلوب بیان کی نفاست کے باعث دل میں اتر جاتے ہیں۔ مثلاً:

کھینچے خطوط گردش دوراں نے جس قدر
نقطہ غم حسینؑ کا ہر دائرے میں ہے
جل رہی ہے سینہ اقوام میں شمع حسینؑ!
اس سے بچ کر جو بھی رستہ ہے بہت تاریک ہے
جس کے ہونٹوں میں نہ ہو الفت شبیر کا رس
بات کیا سانس بھی اس شخص کی زہریلی ہے
غم حسینؑ ہے پہچان آدمیت کی
حسینؑ ہی پہ نہ رویا تو آدمی کیا ہے
حق کی رضا رضائے حسینیؑ سے جا ملی
کعبہ ملا اسی کو جسے کربلا ملی

اسی کتاب کا آخری باب ''سیّد وحید الحسن ہاشمی سے مصاحبہ'' کے عنوان سے شامل اشاعت کیا گیا ہے جس میں مختلف سوالات اور ان کے جواب موجود ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ بھی ہے کہ ''بعض شعرا غزل کو'' باوضو''

کر کے نعت بنا دیتے ہیں آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے" ان کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک نعت کا اپنا مزاج اور مذاق ہے جو غزل سے مختلف ہے لہٰذا غزل "باوضو" ہو کر بھی اصلاحی و اخلاقی غزل تو بن سکتی ہے نعت ہرگز نہیں بن سکتی" منقبت نگاری اور سلام گزاری سے متعلق بھی مکالمہ معلومات افزا ہے' سید شبیہ الحسن نے اس تنقیدی اور تحقیقی کاوش میں جس عرق ریزی سے کام لیا اس کا آغاز بہت پہلے سے کیا جا چکا تھا اور اب یہ خیر عمل سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن کو تر و تازہ رکھنے میں معاون ثابت ہوگا اور بقول سہیل احمد خان ہماری جدید شاعری کا طرز احساس جدت اور اپج کا قائل ہے مگر شاعری کی ایک جہت وہ بھی ہے جس میں شاعر روایت کے دائرے کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس کے اطاعت گزار دیتے ہوئے اپنے فن کو اپنے اُسلوب کو کچھ اس طرح چمکاتا ہے کہ اس دائرے کے دوسرے شعرا میں ممتاز نظر آتے ہیں' سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کی مسلسل شعری ریاضت' شاعرانہ صنعتوں کا شعور' زبان کے مختلف لہجوں پر عبور' مذہبیت اور اخلاقیات کو شعری گداز میں ڈھالنے کا ہنر انھیں اپنے دائرے کا اہم شاعر بناتی ہے"

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ وحید الحسن ہاشمی جیسے درویش کی ہمہ جہت شخصیت کو لائف اچیومنٹ ایوارڈ کا استحقاق حاصل ہونے کے باوصف حکومت کی عدم توجہی میری طرح کھٹکتی ہے' چالیس مرثیوں اور پچاس تخلیقی کتابوں کے مصنف کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے...... بس یہی چھوٹی سی بات ...... جو غور طلب بھی ہے اور قابل عمل بھی ہے۔

◆◆◆

maablib.org

سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں

محمد فیروز شاہ

◆◆

''شام و سحر'' سے میری رفاقت خاصی قدیم ہے۔ قدامت کی اپنی ایک عظمت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ شہد، شراب اور دوستی جس قدر قدیم ہوں تاثیر میں اتنی ہی عظیم ہوا کرتی ہیں۔ خالد شفیق کی ادارت میں مجلّہ ''شام وسحر'' میرے قریب آیا اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کی قیادت میں میرا حبیب ہوگیا۔ اس دوران قلمی مسافتوں کے مختلف مراحل میں کئی نئے چراغ فروزاں ہوئے مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ادارتی محنتوں نے تخلیقی محبتوں کے مہ وانجم یوں سجائے کہ ایوان ''شام وسحر'' دل نشیں روشنیوں کی جگمگاہٹوں سے بھر گیا۔ یہ ان کی مدیرانہ کاوشوں کی داستان تھی مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی صلاحیتوں کا بیان بھی کچھ کم دل چسپ نہیں۔ انھوں نے ''مفاہیم''، ''ترجیحات''، ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار''، ''تصریحات''، ''باقیاتِ آلِ رضا''، ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی''، ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی''، ''شام وسحر کی باتیں''، ''آغا صاحب''، ''کلیات حبیب''، ''العطش''، ''منتخب مرثیے''، ''اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' اور ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' کی صورت کتب کی کہکشاں آراستہ کردی ہے اور اب ان کی نئی کتاب ''سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' سرِ کہکشاں طلوعِ ماہ کا منظر پیش کر رہی ہے۔ آغاز میں انھوں نے ''ایک چھوٹی سی بات'' کی شکل میں اَدب کش معاشرے کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے ممدوح کی عظمتِ فن کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی ہے کہ آندھیوں میں چراغ جلانے والے اور صحراؤں میں پھول کھلانے والے لوگ لمحۂ تخلیق کا اثاثۂ فخر ہوا کرتے ہیں۔ لاریب احمد ندیم قاسمی اور ناصر کاظمی اور عدم اور مجید امجد اور شکیب جلالی ایسے اکثر شعرائے کرام نے ناقدریٔ عالم کا گلہ ضرور کیا ہے لیکن قرطاسِ وقت پر اپنی تخلیقی کاوشوں کی روشنیاں بھی بطریق احسن کاشت کیے ہیں۔ ایک معطر روشنی کی اس شجرکاری میں سید وحید الحسن ہاشمی نے نعت، منقبت اور سلام کی سدا بہار خوشبو شامل کر کے اپنا نام جاوداں لمحوں کی

لوحِ زریں پر یوں رقم کر دیا ہے کہ آنے والے کا مان زمانوں کی جبیں پر خورشید کی نوید بن کر زرفشاں رہے گا۔ اس صداقت کو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے تحقیق و جستجو کی عرق ریزی سے گلاب رنگ اور خورشید صفت بنا دیا ہے۔ ''سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' وہ کتاب ہے جسے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے محنت اور اَدب کو یک جان کر کے اَمر کر دیا ہے۔ ایسی ہی کتابوں کے لیے ''فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے'' کی خوب صورت مرقع سازی کی گئی تھی۔ چھ ابواب پر مشتمل اس باوقار کتاب میں موصوف کے سوانح، نعتیہ مظاہر، منقبتوں کی مختلف جہتیں، سلام کے متنوع رُخ، مصاحبے اور منتخب کلام پیش کیا گیا ہے اور کلام بھی کس خوبی کا ہے۔ خود ملاحظہ فرمالیجیے:

انہی کا اسم گرامی زباں پہ آتا ہے
کبھی درود سے پہلے کبھی سلام کے بعد

....

کسی کے دل میں جو حُبِّ نبیؐ نہیں ہوتی
چراغ لاکھ جلے روشنی نہیں ہوتی

....

نعت کہنے کے لیے دل میں کوئی جذبہ بھی ہو
صبح سے پہلے فلک پر صبح کا تارا بھی ہو

....

نبیؐ کی سیرت و کردار ہیں حسینؑ و حسنؑ
سوال ایک تھا دنیا کا دو جواب آئے

....

میدانِ کربلا میں بہتّر نفوس تھے
اب ساری کائنات ہے لشکر حسینؑ کا

◆◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن اور سیّد وحید الحسن کی شعری جہتیں

ڈاکٹر محمد ہارون قادر

◆◆

پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے تعلقات کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب وہ صرف شبیہ الحسن تھا۔ یہ تقریباً ۲۷ سال پہلے کی بات ہے جب اس کے ساتھ مجھے ایم۔اے اُردو میں داخلہ لینے کا شرف حاصل ہوا۔ جان پہچان دوستی میں تبدیل ہوئی اور پھر صبح و شام اکٹھا گزارنا شروع ہوا۔ جب پہلی دفعہ ان کے دولت خانے پر جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں ایک بارعب' پروقار شخصیت نظر آئی جن کے مکمل سراپا سے علم و اَدب کی خوشبو آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ شخصیت آج کل کے معروف محقق' نقاد' شاعر' ماہر تعلیم اور انسانوں سے محبت کرنے والے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی اور سیّد فضل حسن عرف عرفی ہاشمی' کے والد محترم جناب سیّد وحید الحسن ہاشمی ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی نئی تصنیف ''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' مجھے عنایت ہوئی۔ جو انھوں نے اپنے والد محترم جناب سیّد وحید الحسن ہاشمی کی تین شعری جہتوں نعت' منقبت اور سلام کے حوالے سے تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب اور ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اور الحسن پبلی کیشنز کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

پہلے باب میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کے سوانحی کوائف اور اعترافات کے ضمن میں ان کے اعزازات و پذیرائی' تصانیف' وحید شناسی کے مختلف رخ' وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی تحریریں اور ملک کے ۷۰ سے زیادہ نامور ناقدین' دانش وروں اور اکابرین کی آراء پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس باب کا مطالعہ کریں تو بخوبی پتہ چلتا ہے کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی تقریباً ساٹھ برس سے علم و اَدب کی بھرپور انداز میں خدمت کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ انھیں دوسرے شاعروں' ادیبوں اور دانش وروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے اس عرصہ میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان میں سے غزل' مرثیہ' نوحہ' نظم' حمد' سلام' نعت اور منقبت ان کی مرغوب اصناف

ہیں۔ یوں اگر دیکھا جائے تو ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی کا شمار موجودہ دور کے اکابرین میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی تمام عمر شعروادب کی خدمت کے لیے وقف کردی ہوئی ہے۔ بل کہ یوں کہا جانا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ وہ اپنی ذات شریف میں ایک تحریک اور ''دبستان'' کا درجہ رکھتے ہیں۔

شخصیت کا اصل نام وحید الحسن ہے قلمی نام وحید ہاشمی اور تخلص وحید ہے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں جون پور (یوپی انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جون پور سے اور بی اے الہٰ آباد یونیورسٹی الہٰ آباد سے کیا' بعد میں ایم اے پنجاب یونیورسٹی' لاہور اور بی ٹی گورنمنٹ سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے کیا۔ ساری عمر درس وتدریس میں گزاری اور الحمد اللہ ابھی تک اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تقریباً چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ شاعری میں صفا الہ آبادی' آرزو لکھنوی' سہیل بلگرامی اور سیّد آل رضا لکھنوی سے فیض حاصل کیا۔ دس سے زائد تنظیموں میں بطور صدر' سیکرٹری' ممبر' کنوینز کے کام کیا۔ پانچ ماہ ناموں میں اعزازی مدیر رہے۔ وحید مودّت اور وحید عصر کے خطابات سے نوازے گئے اور گیارہ اعزازت بھی پائے۔ ماہ نامہ ''خواجگان'' اور ماہ نامہ ''شام وسحر'' کے گوشے ان کے لیے مختص ہوئے۔ ملک کے نامور دانش وروں کے قلم سے ان پر مضامین، مقالات اور آراء وتبصرے شائع ہوچکے ہیں۔

دوسرے باب میں سید وحید الحسن ہاشمی کے نعتیہ مظاہر کے حوالے سے نعت نگاری کے مباحث' وحید الحسن ہاشمی کے صنف نعت سے دل چسپی کے محرکات' ان کی نعتوں کی فہرست' ان کے نعتیہ مجموعے ''یاسین'' کا تعارف وحید الحسن ہاشمی کی نعت کے محاسن' اسلوب اور نعت کی تاریخ میں وحید الحسن ہاشمی کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔ سیّد شبیہ الحسن ہاشمی نے سید وحید الحسن ہاشمی کا صنف نعت سے تعلق جوڑتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی سیکڑوں نعتیں شائع ہوئیں جن میں ایک طرف رسول اکرمؐ سے والہانہ عقیدت ومحبت جلوہ گر نظر آتی ہے تو دوسری طرف ان کے ذریعہ اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے حصول کی کوششیں کی گئی ہیں۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کا نعتیہ مجموعہ ''یاسین'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا جسے اکادمی کراچی کی جانب سے اس برس کا بہترین نعتیہ مجموعہ قرار دیا گیا۔

وحید الحسن ہاشمی نے دس برس کی عمر میں غزل سے شاعری کا آغاز کیا لیکن غزل میں محبوب عارضی حسن وجمال کا حامل اور سیرت وکردار کے لحاظ سے قابل تقلید نہیں ہوتا' اس بات کے احساس نے انھیں غزل سے ناتا توڑ کر نعت سے تعلق جوڑنے پر مجبور کردیا۔ راقم الحروف نے وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت کا جتنا بھی مشاہدہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے قلب ونظر میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک سیلِ رواں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ان کا واضح عقیدہ ہے کہ جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا پرستار ہوجاتا ہے دنیا اور آخرت اس کے لیے سہل ہوجاتی ہے۔ بقول وحید الحسن ہاشمی:

نہیں ہے دولت ِ دنیا نصیب میں نہ سہی
یہ فخر کم تو نہیں ہے نبیؐ کے شاعر ہیں

سید وحیدالحسن ہاشمی کی نعتوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیدار کے متمنی ہیں، کہیں وہ خلدِ بریں کو عشق نبیؐ کے سامنے ہیچ سمجھتے ہیں اور کہیں ان کے بدن کے ساتھ ان کی روح بھی عشق محمدؐ میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں الفت محمدؐ کا مرض ایسا لطف اندوز ہوتا ہے کہ اس کے علاج سے اس مرض میں افاقہ نہیں بل کہ اضافہ ہوتا ہے:

نظر دیکھ لیتے جبیں دیکھ لیتے
تمنا تھی ان کو کہیں دیکھ لیتے

....

نبیؐ کے عشق کے بدلے کروں میں خلد قبول
وحیدؔ مجھ سے یہ سودا گری نہیں ہوتی

....

ہمارا کام ہے ڈوبے رہیں عشق ِ پیمبرؐ میں
محبت کو غذا تو روح کے اندر سے ملتی ہے

....

الفت شاہ مدینہ کا صلہ کیا مانگتے
درد میں ملنے لگی لذت دوا کیا مانگتے

سید وحیدالحسن ہاشمی کی نعتوں کا مجموعی مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ عصرِ حاضر تک سب نعت گو شاعروں میں سید وحیدالحسن ہاشمی ایک منفرد اور صاحب طرز نعت گو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی قدر کو جدید انسانوں کے افکار واحساسات کی روشنی میں پیش کیا۔ وحیدالحسن ہاشمی کی یہ انفرادیت ان کی ذہنی بصارت وبصیرت کا اعجاز ہے ان کی نعتوں میں طنزیہ رجحانات بھی ملتے ہیں۔ یہاں انھوں نے انتہائی ہنر مندی سے ہر اس چیز پر طنز کے تیر برسائے ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں رکاوٹ بننے کا موجب ہے:

ہمیں کیوں یا نبیؐ کہنے سے آخر منع کرتے ہو
نبیؐ سے تم کہو وہ چھوڑ دیں چارہ گری اپنی

سید وحیدالحسن ہاشمی کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی معجزات سے بھری ہوئی ہے۔

انھوں نے اپنی نعتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے ساتھ ساتھ شکل وشمائل پر بھی روشنی ڈالی ہے ان کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دنیا میں تشریف آوری کا بنیادی مقصد انسانوں کی ابتر حالت کو سنوارنا تھا۔ انسانوں کو آفات وبلیات سے محفوظ رکھنا تھا وہ کہتے ہیں کہ جس کسی نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افکار و نظریات پر عمل درآمد کیا وہ شخص دنیا میں سُرخرو ہوا۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی کو منفرد اور صاحب طرز شاعر مان لینے کے بعد ان کا شعری اُسلوب سادہ، رواں اور پُر تاثیر نظر آتا ہے۔ ان کی نعتوں میں جہاں ایک جانب جذبے کی جدّت موجود ہے وہاں دوسری جانب اُسلوب کی ندرت بھی نظر آتی ہے۔ راقم الحروف انھیں جب بھی ملا، وہ سادہ انسان ہی نظر آئے! ان کی یہی صفت ان کے اسلوب کا حصہ بنی۔ یہی سادگی اور سلاست ان کی نعتوں میں ایک روانی پیدا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی نعتوں میں علمِ بیان وبدیع کے ارکان سلیقے سے استعمال کیے، بحور کے انتخاب میں اپنی زندگی کا تجربہ استعمال کیا، ان کے ہاں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بحروں کا ذائقہ لطف دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی نعتوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت کا اظہار اس طرح کیا کہ صنف نعت کو اپنے جدید ترین افکار ونظریات اور سحر انگیز اسلوب سے مالا مال کر کے خود کے لیے اور دوسرے انسانوں کے لیے دنیا اور آخرت میں سرخرو ہونے کا سامان فراہم کیا۔

تیسرے باب میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کی منقبتوں کی مختلف جہتوں کے حوالے سے منقبت بطور صنف سخن اور منقبت نگاری سے وحید الحسن ہاشمی کی رغبت کے اسباب کا بیان ہے۔ وحید الحسن ہاشمی کے مناقب کے مجموعوں کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ان کی فہرست کے ساتھ ساتھ منقبت نگاری کے محاسن کا مطالعہ کرتے ہوئے اُردو منقبت کا تاریخ میں وحید الحسن ہاشمی کا منفرد مقام ومرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔

محمدؐ وآل محمدؐ کے خانوادے کے اکابرین اور ان سے منسلک احباب کی مدح سرائی کے لیے مناقب کی صنف کا سہارا لیا جاتا ہے۔ وحید الحسن ہاشمی اپنی منقبتوں کو زادِ آخرت سمجھتے ہیں ان کا واضح موقف ہے کہ ان کے یہی اشعار روزِ جزا ان کی شفاعت کا سبب بنیں گے۔ وحید الحسن ہاشمی کی مناقب کے دو مجموعے ''طاہرین'' اور ''معصومین'' شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان مجموعوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی اہل بیتؑ کے خانوادے سے والہانہ عقیدت واحترام رکھتے تھے۔ راقم الحروف نے جب سال ہا سال ان کے گھر مجلسوں میں شرکت کی تو انھیں زار وقطار روتے ہوئے پایا اور ان سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت کا اندازہ یوں لگایا کہ وہ محض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آلؑ سے ہی محبت نہیں کرتے بل کہ اس فرد سے بھی عقیدت ومحبت رکھتے ہیں جو ان سے منسلک ہیں۔ اس کا بنیادی سبب بقول سیّد وحید الحسن ہاشمی یہ ہے کہ:

کس طرح اہل بیتؑ کا گھر چھوڑ دیں وحیدؔ
پَل کر بڑے ہوئے ہیں وہیں کے نمک سے ہم

سید وحیدؔ الحسن ہاشمی کی منقبت کے بارے میں معروف نقاد و دانش ور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بیان کرتے ہیں کہ ”طاہرین کے نام سے نعتوں اور منقبتوں کا یہ مجموعہ ان کے عقائد کا اظہار بھی ہے اور فنِ شعر پر ان کی دسترس کا ثبوت بھی، لیکن ان کے اس مجموعہ کلام کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے منقبت کو جدید موضوعات سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

سید وحیدؔ الحسن ہاشمی کی منقبتوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں بلند خیالات کا ایک سمندر موجود ہے ایک سے بڑھ کر ایک خیال کو یوں خوب صورتی کے ساتھ اپنی مناقب میں سمو دیتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دریا کو کوزے میں بند کرنا بخوبی جانتے ہیں اور کوزے کو دریا میں تبدیل کر دینے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان کی مناقب میں تاریخی حقائق کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں تاریخی واقعات کا بیان کرتے ہوئے کسی مقام پر بھی شعریت کی کمی کا احساس نہیں ہوتا' ڈاکٹر شبیہ الحسن ان کے اس وصف کو خاص سید وحیدؔ الحسن ہاشمی کے لیے ہی وقف کرتے ہیں جو بجا ہے۔

سید وحیدؔ الحسن ہاشمی نے اپنے مناقب میں جہاں محمدؐ و آل محمدؐ کی مدح سرائی کی ہے اور ان کے کمالات و معجزات بیان کیے ہیں وہاں انھوں نے ان کے طرزِ عمل اور اسوۂ حسنہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ معاشرے کی حالتِ زار اس قدر غم انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ اس پر شہرِ آشوب کا گمان ہوتا ہے۔ وہ حالاتِ حاضرہ سے زچ ہو کر امام وقت کو آواز دیتے ہیں اور یقین کامل رکھتے کہ امامِ وقت مخلوقِ خدا کی مدد کرتے تھے' کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ راقم الحروف نے انھیں خود بھی امام عالی مقام سے مدد مانگتے دیکھا اور اہلِ دنیا پر بھی وہ یہی حقیقت آشکار کرتے ہیں کہ:

وہ تو سب کی مدد کو حاضر ہیں
ہاں مگر ڈھنگ ہو بلانے کا

سید وحیدؔ الحسن ہاشمی کے کلام میں ”جوشِ جذبہ“ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ انھوں نے مثبت رویوں کی ہمیشہ مدح سرائی کی اور منفی رویوں کی مذمت کی ہے۔ یہاں ان کا شعری اُسلوب سادہ اور سلیس ہے بیشتر منقبتوں کی زمینیں خود ساختہ ہیں۔ صنائع بدائع کا برمحل استعمال ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی کے بقول سید وحیدؔ الحسن ہاشمی نے استدلال' تفکر اور شاعرانہ ہنر مندیوں سے اپنی منقبتوں کو دورِ جدید سے منسلک کر دیا ہے اور جب تک صنفِ منقبت زندہ ہے سید وحیدؔ الحسن ہاشمی کا نام بھی زندہ و جاوداں رہے گا۔ وحیدؔ الحسن ہاشمی اپنی منقبت کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس قدر زمانے میں مرتضیٰ کے احساں ہیں
لاکھ منقبت کہیے حق ادا نہیں ہوتا

سید وحید الحسن ہاشمی کی منقبت کے بارے میں نامور نقاد، محقق اور ہر دلعزیز اُستاد محترم جناب ڈاکٹر سہیل احمد خان کی رائے ہے کہ ''جو شاعری مذہبی عقائد سے مربوط ہوتی ہے اس کا نمایاں ترین وصف یہ ہوتا ہے کہ شاعر جذبات کی عمومی اور بعض کثیف سطحوں سے اُوپر اُٹھ کر وجود کی اعلیٰ سطحوں کا ادراک کرتا ہے۔ ایک احتیاط البتہ لازم ہے کہ کہیں مناظرانہ سطح اور دوسرے گروہوں کی تحقیر اس کے کلام میں دوسرے انداز کی کثافت نہ پیدا کر دیں۔ فنی اعتبار سے ایسے شاعر کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد کو اپنے لسانی اور تہذیبی اظہار کی اعلیٰ سطحوں سے ہم آہنگ کر سکے۔ سید وحید الحسن کا شستہ لہجہ لکھنوی دبستان کی صفائی زبان کے عنصر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ صفائی زبان ان کی شاعری کے مقدس موضوع کے ساتھ مل کر نئے نئے رنگ بکھیرتی ہے''۔ راقم الحروف نے ڈاکٹر سہیل احمد خان کی اس رائے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت پر گہری نظر ڈالی تو دکھائی دیا کہ ان کی ذات کسی قسم کے مذہبی، لسانی اور گروہی تعصبات سے پاک ہے۔ انھوں نے کبھی بھی تحریر و تقریر میں یا اپنی نجی محفلوں میں کسی گروہ یا فرقے کی دل آزادی نہیں کی؛ جب بھی گفت گو کی ان کے منھ سے پھول ہی جھڑتے نظر آئے۔ وہ ہمیشہ شستہ اور دل پذیر انداز میں گفت گو کرتے ہیں۔

چوتھے باب میں صنف ''سلام'' کے مباحث اور انسانوں کی غم پسندی کی مختلف صورتیں بیان کی گئیں ہیں۔ پھر سید وحید الحسن ہاشمی کی صنف ''سلام'' سے دل چسپی ان کے سلاموں کا تعارف و فہرست اور ''سلام'' کے چیدہ چیدہ محاسن کا مطالعہ کرتے ہوئے اُردو ''سلام کی تاریخ'' میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔

''سلام'' وہ صنف سخن ہے جس میں اہل بیتؑ اور شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب بیان کیے جائیں۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی تک ہر صاحب دیوان شاعر نے صنف ''سلام'' میں طبع آزمائی کی ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے بھی صنف ''سلام'' کی آبیاری کی بل کہ اس کے فروغ کے لیے اپنی جملہ صلاحتیں بھی صرف کیں۔ خاص طور پر قیامِ پاکستان کے بعد ''سلام'' کی صنف کو زندہ و جاوید رکھنے میں انھوں نے اعلیٰ مقام پایا۔ ڈاکٹر وحید قریشی جن تک آتے آتے تحقیق کا کام تقریباً ختم ہو جاتا ہے وحید الحسن ہاشمی کے ''سلاموں'' کے متعلق لکھتے ہیں۔

''سیّد وحید الحسن ہاشمی نے سلام اور مرثیے میں اپنا ایک الگ طرز نکالا ہے۔ شعرا جانتے ہیں کہ جس رواج کے پیچھے صدیوں کا اَدبی سرمایہ موجود ہو وہاں نئی راہ نکالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اگر علمی بصیرت اور لگن موجود ہو اور شاعر کے پاس کہنے کے لیے مال بھی موجود ہو تو وہ اپنا الگ راستہ بھی نکال لیتا ہے سیّد وحید الحسن ہاشمی فنی بصیرت بھی رکھتے ہیں اور زبان و بیان پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے انھوں نے نئے طرزِ احساس کے ساتھ جذبے کی شدت کو بھی بحال رکھا''۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنے مذہبی اور دینی خیالات و نظریات کے اظہار کے لیے اس صنف کو اپنایا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی نے ہر صنفِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے تاہم ''سلام'' سے ان کی رغبت بڑی دیرینہ ہے اور سلام نگاری کے ساتھ اس رغبت کا سلسلہ ابھی تک جاری و ساری ہے۔ اور ان شاء اللہ جب تک رضائے الٰہی ہے اس وقت تک جاری و ساری رہے گا۔ ان کی سلام نگاری میں بے شمار خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جن میں اہم ترین خوبی ''احتجاج'' کی کیفیت کا پایا جانا ہے۔ یہ احتجاج ان استعماری و یزیدی قوتوں کے خلاف ہے جو آج بھی انسانوں کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر ظلم و ستم کا شکار بنا رہی ہیں۔

آج جو قوموں کے لب پر ہے صدائے احتجاج
یہ حسینؑ ابنِ علیؑ کے عزم کا احسان ہے

....

ہر گز یزید عصر نہ مانے گا کوئی بات
جب تک نہ گفت گو ہو حسینیؑ زبان میں

سید وحید الحسن ہاشمی کے سلاموں کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں ایک خاص طرح کی ''حزنیہ'' کیفیت بھی موجود ہے۔ وہ کربلا کے دردانگیز واقعات کو غم انگیز پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے سلاموں میں موضوعات کی ایک دنیا آباد ہے وہ کربلا کے واقع کو ایک مورخ کی بجائے ایک شاعر کی چشمِ تخیل سے دیکھتے ہیں وہ ''دشتِ کربلا'' کے مضمون کو اتنے زاویوں اور رخوں کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا کمال بخوبی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے سلاموں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پیش کش کرنے کے ساتھ ساتھ غیر اخلاقی قدروں سے لاتعلقی کا احساس بھی دلایا ہے وہ عاشقانِ حسینؑ کو ہمت و جرأت کا سبق دیتے ہیں اور بار بار یہ احساس دلاتے ہیں کہ کربلا کے میدان میں امام عالی مقامؑ نے اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جان قربان کی تھی۔

سید وحید الحسن ہاشمی کے نزدیک موجودہ دور میں وہی شخص حسینی کہلانے کا حق دار ہے جو اپنی زندگی امام عالی مقامؑ کے فرمودات کے مطابق بسر کرے اور وہ جس کے قول و فعل میں حسینیؑ مہک محسوس نہ ہو ہرگز ہرگز حسینی کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی پختہ شاعر ہونے کی وجہ سے لسانیاتی شعور بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بحور کے انتخاب، ردیفوں کے استعمال اور الفاظ کے دروبست سے اپنے سلاموں کے معیار کو بلند کیا۔ ردیفوں کے بامعنی استعمال کے ساتھ ان کے سلاموں میں قافیوں میں بھی ایک خاص طرح کی موضوعاتی پابندی ملتی ہے۔

راقم الحروف کو ان کے گھر ہونے والی بہت سی مجالس میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جن میں سید وحید الحسن ہاشمی کو سلام پڑھتے ہوئے دیکھا تو محسوس کیا کہ ان کے اُسلوب میں ایک نمایاں خوبی ''ترنم''

بھی شامل ہے۔ وہ شعوری طور پر مترنم الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور خوب صورت ترنم کے ساتھ اپنے اشعار مجلس میں موجود سامعین کی سماعتوں کی نذر کرتے ہیں، یہی ترنم ان کی فکری جولانیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے ان کے کلام میں علمِ بیان اور علمِ بدیع کے ارکان تلاش کرنا مقصود ہوں تو قاری مایوس نہیں ہوتا بل کہ خاص طور پر تشبیہات اور صنعتِ تضاد کا برمحل استعمال نے بھی ان کے سلاموں کے حسن میں بے پناہ اضافہ کیا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے مطابق ''عصرِ حاضر میں سید وحید الحسن ہاشمی کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے اس صنف کو نئے نئے موضوعات و افکار کے ذائقوں سے آشنا کر کے اسے مقبولِ عام و خاص بنانے کی کوشش کی ہے۔ جب تک اردو میں صنفِ سلام کی روشنی باقی رہے گی سید وحید الحسن ہاشمی کا نام جگمگا تا رہے گا اور ان کا یہ شعر روح تاریخ کی زینت بنا رہے گا۔

لکھتا رہوں قصیدہ ہر شہریار ملک
مداحِ حسینؑ سے فرصت کہاں مجھے

پانچویں باب میں وحید الحسن ہاشمی سے نعت، منقبت اور سلام کے حوالے سے منفرد سوالات اور پُر مغز جوابات کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ راقم الحروف کو سید وحید الحسن ہاشمی سے اپنی زندگی میں کئی بار گفت گو کرنے کا موقع نصیب ہوا اللہ انھیں سلامت رکھے، مَیں نے انھیں ایک صاحب طرز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خوش گفتار انسان بھی پایا۔ ان کی گفت گو سحر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ عالمانہ آن بان بھی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے بھی اگر اس چیز کا مزا لیا ہے تو اس میں مضائقہ کیا ہے بل کہ اچھی بات ہے۔

چھٹے باب میں جو کہ آخری ہے وحید الحسن ہاشمی کا منتخب کلام درج ہے۔ جن میں نو نعتیں، تیرہ منقبتیں اور تیرہ سلام ملک کے نامور دانش وروں کی آراء کے ساتھ شامل کتاب ہیں۔ چوں کہ سید شبیہ الحسن نے یہ کتاب صرف وحید الحسن کی نعت، منقبت اور سلام کے حوالے سے تصنیف کی لہٰذا یہ مناسب بات تھی کہ یہاں صرف نعت، منقبت اور سلام کے منتخب کلام کو ہی پیش کیا جاتا۔ لیکن ایسا کرنے میں جو خاص بات نظر آئی وہ یہ کہ ہر صنف کے منتخب کلام کو پیش کرنے سے پہلے انھوں نے نعت کے کلام کو درج کرنے سے پہلے نعت گو شاعر ڈاکٹر خورشید رضوی اور منقبت سے پہلے اُستادوں کے استاد ڈاکٹر سجاد باقر رضوی اور سلام نگاری سے قبل عصرِ حاضر کے یکتا محقق و نقاد ڈاکٹر وحید قریشی کی آراء کا انتخاب کر کے کتاب کی اہمیت بڑھانے کے لیے اپنی علمی بصیرت اور موضوعات سے لگن کا بے مثال ثبوت دیا ہے۔ چوں کہ راقم الحروف ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے خاص دوستوں میں شمار ہوتا ہے لہٰذا اگر میں اس کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ کہوں گا تو قاری یہی کہیں گے کہ دوست کی بے جا تعریف کر رہا ہے۔ لہٰذا وقت آنے پر زمانہ خود بخود اُردو ادب میں اس کی خدمات اور مقام و مرتبے کا تعین کر دے گا۔

◆◆◆

وحید الحسن ہاشمی......نعت، منقبت اور سلام

مختار علی نیئر

♦♦

عام طور پر بعض علما اور خاص طور پر اسلام کے ایک فرقے شیعہ علما میں سخن شناسی کی حس بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے بل کہ بعض علما تو شعر کہنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں البتہ منبر پر بیٹھ کر شعر پڑھنے سے گریز کرتے ہیں ہم اس روش کی شرعی حیثیت پر تو بحث کرنے سے رہے اگر چہ ہم کوئی عالم فاضل مستند شخصیت نہیں ہیں مگر پھر بھی قدیم علما کی تقلید کو اگر سامنے رکھا جائے تو شعر کے حوالے سے دعا کے مستحق ہیں وہ علما حق کہ جو شعر کہنے کو جائز سمجھتے رہے مگر پھر بھی وہی جذبہ کہ خالص مذہبی نشستوں میں شعر کے استعمال کے رواج سے قدرے پرہیز کرتے ہیں۔ شعر و سخن کے استعمال کے حوالے سے واقعات سید الشہداء علیہ السلام اَدبی اور مذہبی دنیا میں ایک مذہبی باب کا مقام رکھتے ہیں ہمارے ہاں عربی منقبت اور مرثیہ اور پھر فارسی منقبت و مرثیہ کی باقاعدہ ایک دنیا موجود ہے، انبیاء علیہ السلام کے بعد اگر دنیا کی شخصیت پر دنیا کی ہر زبان میں علمی اَدبی اور مذہبی مواد سب سے زیادہ موجود ہے تو بلا شبہ امام حسینؑ کی ذات ہے کہ جو ہر ملت و ہر قوم میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اور ہم اسے بڑے فخر سے ایک نہ رد ہونے والا ثبوت قرار دے سکتے ہیں اگر چہ مرثیہ و منقبت کی روایت اب قدرے ضعف کا شکار ہے مگر چوں کہ اس دنیا میں منقبت زندہ ہے لہٰذا نوحہ مرثیہ و منقبت کو بھی یقیناً زندہ رہنا ہے کہ اس کا تعلق جس شخصیت سے ہے اسے موت نہیں، لہٰذا ہم اس ضعف پذیر صنف کو بھی مردہ یا ناپائیدار کہتے ہوئے ڈرتے ہیں اس حوالے سے ہم نعت منقبت اور اسلام کو مدِنظر رکھتے ہوئے گزشتہ صدی میں سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتوں پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے اظہار خیال پر مبنی ایک نادر و نایاب کتاب کو کالم کی زینت بنا رہے ہیں۔ سید شبیہ الحسن کی کتاب بعنوان ''سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' اس وقت ہمارے سامنے پڑی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنے بزرگ سید وحید الحسن کے نعت منقبت اور اسلام کے حوالے سے مثبت

انداز بیان میں نہایت ہی سیر حاصل بحث کی ہے اور ایک ترتیب کے ذریعے سیّد وحیدالحسن ہاشمی کے سوانحی کوائف اور اعترافات، سیّد وحیدالحسن کے نعتیہ مظاہر، سیّد وحیدالحسن کی منقبتوں کی مختلف جہتیں سیّد وحیدالحسن ہاشمی کے سلام کے متنوع رخ، سیّد وحیدالحسن ہاشمی سے مصاحبہ اور سیّد وحیدالحسن ہاشمی کے منتخب کلام پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ آرٹس کے طلبہ کے لیے ایسی کتابیں انسانی ذہن کے کار پرداخت اور انسانی سوچ کی نوک پلک درست کرنے کے لیے نہایت ہی ضروری ہوتی ہیں۔ نسیم امروہوی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں جسے مرثیہ اور مرثیہ فہمی کہتے ہیں وہ لاہور میں آپ کے دم سے ہے واللہ ایک جملے میں بلاغت وفصاحت کے سمندر بند کر دیئے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز میں کہ سیّد وحیدالحسن ہاشمی صاحب پختہ مشق شاعر ہیں انھوں نے مختلف موضوعات کو شاعری کے ڈھانچے میں ڈھالا ہے خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے نعت ومنقبت کی طرف بھی توجہ دی ہے اور ان موضوعات پر جو کچھ کیا ہے وہ ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز معلوم ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی خوبی ہے کہ اگر کسی شاعر کے نصیب میں آجائے تو اس کی شاعری حُسن جمال سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی فرماتے ہیں کہ سیّد وحیدالحسن ہاشمی ایک کہنہ مشق اور قادرالکلام شاعر ہیں مرثیہ گوئی ان کے فن کا خاص میدان ہے اور دیگر متعلقہ اصناف میں نعت سلام اور منقبت میں بھی وہ اپنے عصر کے شعرا میں ایک الگ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بہت کم شعرا نے عقیدے اور فن کو اتنے توازن اور تناسب سے شعر کی صورت دی کہ ان کے کلام میں روانی سلاست سادگی مترازصفات ہیں۔ ان کا فن جہاں بڑے بڑے اہل علم ودانش کی تحسین کا مستحق ہے وہیں پر عام پڑھا لکھا آدمی بھی ان کے کلام سے دل کی گہرائیوں تک متاثر ہو جاتا ہے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی سیّد وحیدالحسن ہاشمی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کی شعر گوئی میں زبان کی سلاست اور بیان کی سادگی خلوص کے اظہار سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبیداللہ خان فرماتے ہیں سیّد وحیدالحسن ہاشمی اُردو مرثیہ نگاروں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ان کے مرثیوں میں قدیم وجدید رنگ کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سجاد رضوی وحیدالحسن ہاشمی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے نعتوں اور منقبتوں کے ذریعے اُردو کی مذہبی شاعری کی روایت کو اور بڑھایا ہے اور اس کی روشنی میں نمونہ ہائے جدید کی نمائش کا اہتمام بھی کیا ہے۔ ہاشمی صاحب اور ان جیسے بہت سے شعرا اپنی کاشوں کے اظہار کو چھپائے بیٹھے ہیں۔ کاش وہ بھی قدم ہمت بڑھائیں اور اپنے رشحات فکر زیور طبع سے آراستہ کر کے آنے والی نسلوں تک اپنی ثقافتی روایات کو منتقل کر سکیں۔ ہم نے سیّد وحیدالحسن ہاشمی جیسی قدآور شخصیت کے بارے میں من آنم کہ من دانم کے مصداق اپنے آپ کو کافی نہ پایا اور سیّد صاحب کے بارے میں مشاہیر نے جو کچھ فرمایا ہے اسے ہی پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے الحسن پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہونے والی یہ کتاب اپنے اندر مرثیہ منقبت اور نعت وسلام کا ایک بحرِ بےکراں لیے ہوئے ہے کہ جیسے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی نے سیّد وحیدالحسن

ہاشمی کے اس شعر سے شروع کیا ہے۔

انہی کا اسم گرامی زبان پہ آتا ہے
کبھی درود سے پہلے کبھی درود کے بعد

سبحان اللہ کتاب میں کم وبیش ڈیڑھ سو سکہ عالمان علم وادب اور بین الاقوامی شہرت کے مالک حضرات نے سید وحید الحسن کے فن اور شخصیت پر بحث کی ہے جو کہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے ہم اتنی بہترین معلومات افزا کتاب کے شائع کرنے پر ڈاکٹر شبیہ الحسن کو مبارک باد کے مستحق سمجھتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو، موجودہ صدی اور گزشتہ صدی کے مرثیہ نگار حضرات واقعہ کربلا اور فلسفہ قربانی خلیل ثانی کو دیکھتے ہیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔

(روزنامہ 'صبح' پشاور، ۲۷ مارچ ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا خاص کارنامہ

سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں

مصطفیٰ کمال

◆◆

نبیؐ کا اسم گرامی زباں پہ آتا ہے
کبھی درود سے پہلے کبھی سلام کے بعد

اس خوب صورت اور نہایت بامقصد کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ مصنف ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے مشہور و دانش ور وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں، منقبتوں اور سلام کے ساتھ ساتھ وحید الحسن ہاشمی کے سوانحی کوائف، اعزازات، اُردو نعت کی تاریخ، درود و نعت اور سلام کے چیدہ چیدہ محاسن اور آخر میں وحید الحسن ہاشمی کے حوالے سے منفرد سوالات اور ان کے پُر مغز جوابات بھی پیش کیے ہیں۔ مصنف ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ہر جگہ اَدب اور طالب علم و اَدب کی سوچ و فکر کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ ہر جملہ اور ہر پیراگراف پڑھ کر قاری کے ذہن و دماغ میں اٹھنے والے تجسس کی تشنگی دُور ہوتی جاتی ہے۔

موجودہ ''بے اَدب'' دَور میں جب کہ اَدب سے رابطہ رکھنا حیرت انگیز عمل سمجھا جاتا ہے۔ کہیں تخلیق کاروں کی پذیرائی نہیں ہوتی بل کہ دل آزاری کے سامان کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں اَدبی دنیا سے اس قدر وابستگی واقعی بڑے دل گردے اور جان جوکھوں کا کام ہے بالخصوص جب کہ دوسری جانب بے ہنر و بے اَدب دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہوں۔ مصنف نے سیّد وحید الحسن ہاشمی کی تخلیقات کے بارے میں مدلل کتاب لکھ کر گویا ان کی ساٹھ سالہ علم و اَدب کی آبیاری کرنے کی کاوشوں کو دادِ اَدب دی ہے۔ لکھتے ہیں ''علم و اُدب سے والہانہ وابستگی انھیں دوسرے تخلیق کاروں سے ممتاز کرنے کا موجب بنتی ہے۔ ان کے وقیع کارناموں کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اب وہ محض ایک فرد نہیں بل کہ ایسا علمی و اَدبی دبستان ہیں جن

سے سینکڑوں افراد مستفید ہو رہے ہیں۔ ''دبستانِ وحید الحسن ہاشمی'' سے اکتساب کرنے والوں میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔''

وحید الحسن ہاشمی نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے جن میں غزل، مرثیہ، نوحہ، نظم، حمد، سلام، نعت اور منقبت ان کی مرغوب اصناف ہیں جب کہ مرثیہ نگاری میں بھی ان کا خاص مقام ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں نعت، منقبت اور سلام جیسی اعلیٰ اصناف پر بھی تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے شروع میں ستر سے زائد علمی و اَدبی شخصیات کی وحید الحسن ہاشمی کے بارے میں گراں قدر آراء اور تبصرے پیش کیے گئے ہیں۔

سید وحید الحسن ہاشمی ۱۹۳۰ء میں جون پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ والدہ محترمہ صدیقہ بانو اور والد سید حسن الہ آبادی دونوں کے آباؤ اجداد اعلیٰ مذہبی اور اَدبی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انڈیا جب کہ بی اے، ایم اے اور بی ایڈ لاہور سے کیا۔ پھر سیدہ فراز فاطمہ سے عقد ہوا۔ ان کی ایک بیٹی شمع فاطمہ اور چار بیٹے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ وحید الحسن نے دس برس کی عمر سے شاعری کا آغاز کیا تھا پہلی غزل کے اشعار کچھ یوں ہیں:

نہ آنکھ میں آنسو نہ لب پر ہنسی ہے
عجب کشمکش میں میری زندگی ہے
مبارک مبارک شہید محبت
کہ اس راہ میں موت ہی زندگی ہے

وحید الحسن ہاشمی کے اساتذہ کرام کی بڑی طویل فہرست ہے جن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر عابد علی عابد، پروفیسر وقار عظیم بھی شامل ہیں۔ وحید الحسن پاکستان کی ایک درجن سے زائد اَدبی تنظیموں کے صدر اور سیکرٹری بھی رہے۔ بہت سے اُردو ماہ ناموں کے مدیر اعزازی رہے۔ ''وحید موت'' اور ''وحید عصر'' کے خطابات ملے جو آیۃ اللہ طالب اور ملک معراج خالد (سابق وزیر اعظم پاکستان) نے دیئے۔ اس کے علاوہ ان کے اعزازات اور تصانیف کی فہرست بے حد طویل ہے۔ جن میں سے نعتوں کے مجموعہ ''یاسین'' کو ۱۹۹۷ء میں انعام بھی ملا جب کہ ان کی چار تصانیف زیرِ طبع ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی نوکِ قلم سے قوسِ قزح پھوٹتی ہے۔ نعت، منقبت، مرثیہ، سلام، غزل، تنقید جیسے متنوع میدانوں میں انھوں نے یکساں سہولت کے ساتھ لکھا ہے۔ بقول وحید الحسن ہاشمی:

نہیں ہے دولتِ دنیا نصیب میں نہ سہی
یہ فخر کم تو نہیں ہے نبیؐ کے شاعر ہیں

وحید الحسن ہاشمی رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور ایک اچھے و سچے مومن کی طرح اپنا سب کچھ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر نچھاور کرنے کو ہر لمحہ تیار رہتے ہیں:

کسی کے دل میں جو حُبِّ نبیؐ نہیں ہوتی
چراغ لاکھ جلے روشنی نہیں ہوتی

وحید ہاشمی منافق، باطل، کافر اور شرک قوتوں پر واضح کر دیتے ہیں کہ ان کے جادو کا زور حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار اُمتِ مسلمہ پر نہیں چل سکتا۔ اس طرح وہ مسلمانوں پر واضح کرتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے بغیر وہ اسلام دشمن قوتوں کے وار کبھی نہیں سہہ سکتے۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی نے اپنی نعتوں میں محض معاشرتی مسائل پر ہی روشنی نہیں ڈالی بلکہ شعوری کوشش کی ہے کہ ان اثرات کو بھی بیان کریں جو سنتِ رسول کو اپنانے کے بعد افراد و اقوام پر مرتسم ہوتے ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ ان کا اُسلوب، سادہ رواں اور پُر تاثیر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی نعتوں میں علم و بیان بدیع کے ارکان کے بھی بڑے سلیقے سے استعمال کیے ہیں:

ازل کے روز سے اب تک نظر یہ آیا ہے
یہی ہیں صبح سے پہلے یہی ہیں شام کے بعد

وحید الحسن ہاشمی کی منقبت میں زباں سے زیادہ خیال کو اہمیت دی گئی ہے۔ عقیدت کو فن کی کسوٹی پر پرکھنا اور محبت کو فن کے ترازو پر تولنا مشکل کام ہے مگر انھوں نے اپنے کلام میں ثابت کر دیا کہ مدحتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ ایک ایسا خزانہ ہے جو ہمیشہ بھرا رہتا ہے۔ اپنے کلام میں انھوں نے حسینؑ اور حسینیت کے مختلف رموز و نکات کی ترجمانی عارفانہ انداز میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

فقط ہماری زباں بندیوں سے کیا حاصل
کہ اب حسینؑ زمانے کے دل کے اندر ہیں

....

ایوانِ انبساط میں جنت نہ کر تلاش
یہ تو غمِ حسینؑ کے آنسو میں بند ہے

....

سلاموں میں بھی انھوں نے علمی بصیرت اور لگن سے کام لیا ہے۔ ان کے سلام درد و غم میں ڈوبے ہوئے اور ندرتِ فکر سے مزین ہیں اور انھیں کسی بھی رثائی اَدب کے شاعر کے مقابلے میں بخوبی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن جو کہ وحید الحسن کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔ یہ کتاب لکھ کر نہ صرف اپنے گراں قدر والد گرامی کو ہدیہ عقیدت پیش کیا بلکہ ان کی تحریر سے ثابت ہوا کہ مصنف پر اپنے والد کی تربیت کا کس قدر گہرا اثر ہے۔

(ماہنامہ ’’مکالمہ‘‘ راولپنڈی، مارچ ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی نئی تخلیق......
''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' پر ایک تنقیدی نظر

روبینہ شاہین

◆◆

ادیب ایک ایسے مسافر کی مانند ہے جو ہر نئے دن کو بلندی کے نئے سفر کے لیے رختِ سفر باندھتا ہے۔ تخلیق کار کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اگر یہ سفر رُک گیا تو پیچھے ملال کی پرچھائیاں اور آگے زوال کے اندھیرے ہوں گے۔ اسی لیے چلتے رہنا چاہیے' آگے بہت کچھ ہے۔

ادیب کے دم سے ہی اُدب ہمیشہ زندہ رہا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے اس زمانے میں بھی اُدب کہیں کھویا نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دورِ جدید کی ترقی کے پسِ منظر میں اُدب ہی کی کاوش شامل ہے۔ سائنس اگر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زندگی کیا ہے؟ تو اُدب یہ بتاتا ہے کہ زندگی کیسے گزارنی ہے۔

اُدب کا دامن بہت وسیع ہے کسی ایک شخص کے لیے اُدب کی تمام اصناف پر قدرت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ ایک تخلیق کار کا شاہ کار اُس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کے شاہ کار کو کوئی داد دینے والا نہ ہو۔ اسی لیے تخلیق اور تنقید کا تعلق ایسے ہی ہے جیسے آسمان کا ستاروں سے' رات کا اندھیرے سے اور دن کا اُجالے سے۔

تخلیق اور تنقید کا یہ سفر نہ جانے کب تک جاری رہے۔ جب تخلیق کار کا قلم اپنا کام کر چکتا ہے تو نقاد اپنا قلم اُٹھالیتا ہے۔ اسی عمل کے بعد ہی ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اچھی تخلیق کو کلی طور پر سمجھ کر اسے دل میں اُتار سکیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی دورِ حاضر کے ایسے نقاد ہیں جنھوں نے مختلف شعرا کے کلام کا فکر انگیز' سیر حاصل اور کلی جائزہ لیا۔ تنقید میں بھی اُن کا اسلوب دل چسپ' معنی خیز اور شیریں ہے۔ اُن کی اہم تصانیف مفاہیم' ترجیحات' اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار' تصریحات' باقیاتِ آلِ رضا' آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی' جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی' شام و سحر کی باتیں' آغا صاحب' کلیاتِ حبیب' العطش' منتخب مرثیے' اسلم کولسری کا شعری

سرمایہ اور مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی۔

ان اہم تصانیف کی تحریر کا سفر انھوں نے ایک نقاد کی حیثیت سے جاری رکھا اور حال ہی میں اُن کی ایک اور اہم تصنیف ''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' (نعت' منقبت اور سلام کے حوالے سے) بھی شایع ہو چکی ہے۔

شبیہ الحسن کا انداز سہل مگر فکر انگیز ہے انھوں نے نامور شاعر وحید الحسن کی اَدبی زندگی پر گہری تحقیق کرنے کے بعد فکر و فن کا یہ خزانہ پیش کیا۔ شبیہ الحسن نے اس اہم شاعر کے کلام میں سے صرف تین اصناف کو منتخب کیا ہے یعنی نعت' منقبت اور سلام۔ یہ تینوں اصناف عقیدت' عظمت' محبت و تقدس کی علامت ہیں۔ شبیہ الحسن نے بھی انتہائی غور و فکر' محبت و احترام اور دلی وابستگی سے ان اصناف کا جائزہ لیا ہے۔

فکری و فنی خوبیوں سے مزین یہ کتاب چھے ابواب پر مشتمل ہے۔ زبان سادہ عام فہم لیکن معنی خیز ہے۔ اُسلوب انتہائی دلکش اور منفرد ہے۔ پہلا باب سیّد وحید الحسن ہاشمی کے سوانحی کوائف اور اعترافات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس سلسلے میں نہایت حزم و احتیاط اور صداقت سے کام لیتے ہوئے وحید الحسن ہاشمی کی سوانح اور اَدبی زندگی کے متعلق وسیع معلومات مختصر الفاظ میں بیان کی ہیں اُن کی شخصیت کو جاننے کے لیے یہ باب اس کتاب کا اہم ترین حصہ ہے۔ مصنف نے انتہائی باریک بینی سے کام لیتے ہوئے وحید الحسن ہاشمی کا تعارف کروایا ہے۔

دوسرے باب کو مصنف نے سیّد وحید الحسن ہاشمی کے نعتیہ مظاہر سے موسوم کیا ہے۔ اس باب میں مصنف کی نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت کا اظہار خوب نمایاں ہوتا ہے۔ اندازِ تحریر شگفتہ' شریں اور دلکش ہے۔ اس باب میں انھوں نے وحید الحسن ہاشمی کی نعت نگاری پر بحث کی ہے اور بہت سے ناقدین واکابرین کی آراء سے اس کی خوب صورتی میں اضافہ کیا ہے جس سے وحید الحسن ہاشمی کا مقام و مرتبہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اُن کی نعتیں پڑھ کر رُتر ورملتا ہے اور قاری کسی اور ہی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ دنیاوی لذتوں سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔

مصنف نے اُن کی بہت سی نعتوں کا جائزہ لینے کے بعد کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ایک خوب صورت اور محبت رسولؐ سے بھرا ہوا شعر جو مصنف نے کئی جگہوں پر استعمال کیا ہے' یہ ہے:

ہمارا کام ہے ڈوبے رہیں عشق پیمبرؐ میں
محبت کو غذا تو روح کے اندر سے ملتی ہے

تیسرے باب کو مصنف نے 'سیّد وحید الحسن ہاشمی کی منقبتوں کی مختلف جہتیں' کا نام دیا ہے اور اس میں وحید الحسن کا دلی ناطہ منقبت کے ساتھ بہت عقیدت سے جوڑا ہے۔ اُن کی منقبت نگاری پر فکر انگیز بحث کرتے ہوئے مختلف ناقدین کی آرا پیش کی ہیں۔ مناقب میں موجود تاریخی حقائق کی نشان دہی کی ہے۔ ان کے خوب

صورت لب و لہجہ کو سراہا ہے اور مناقب کی مثالیں بھی پیش کی ہیں :

ہم اس لیے تعظیم خدیجہؓ کے ہیں قائل
ایمان سے وابستہ ہے عرفانِ خدیجہؓ

چوتھا باب 'سیّد وحید الحسن ہاشمی کے سلام کے متنوع رُخ' کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ باب اس کتاب کے بنیادی موضوع کی آخری کڑی ہے۔ اس باب تک پہنچتے پہنچتے قاری پر وحیدؔ الحسن ہاشمی کی زندگی کے رُخ بھی کھلتے جاتے ہیں اور ثابت ہوتا ہے کہ سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی کے دل میں نبی پاکؐ اور اُن کی آلؑ کے لیے بے پناہ محبت اور والہانہ عقیدت موجزن ہے جس کے اظہار کا ذریعہ انھوں نے قلم کو بنایا۔ مصنف نے اس باب میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری کے مختلف رُخوں کی بھرپور عکاسی کی ہے اور بہت سی مثالیں بھی اپنے موقف کو سمجھانے کے لیے پیش کی ہیں اور ناقدین کی آرا کو بھی ساتھ ساتھ پیش کیا :

نبیؐ کے لال کا کچھ یوں خیال رکھا ہے
حسینیتؑ کی مہک کو سنبھال رکھا ہے

مصنف کا اندازِ تحریر اس قدر دل چسپ ہے کہ کتاب کا آغاز سے انجام کا سفر قاری کو محسوس ہی نہیں ہوتا۔ قاری کا نبیؐ اور اُن کی آلؑ سے محبت و عقیدت کا رشتہ اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اُس کے دل میں اس شخص کا احترام بھی پیدا ہوتا ہے جس کی نعتیں، مناقب اور سلام سچی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ قاری اُن سے ملاقات کا خواہاں ہوتا ہے تو اس کی یہ خواہش پانچویں باب میں پوری ہو جاتی ہے۔ پانچواں باب صرف ایک مصاحبہ ہی نہیں بل کہ وحیدؔ الحسن کی قاری سے ملاقات کا ایک ذریعہ ہے۔ اس باب میں مصنف نے سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی سے نعت، مناقب اور سلام کے حوالے سے سوالات کیے ہیں جن کے وحیدؔ الحسن نے متاثر کن عالمانہ جوابات دیے ہیں۔ سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی کے بارے میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ وہ اپنی عام زندگی میں بھی شگفتہ لب و لہجے کے مالک اور شیریں گفت گو کے قائل ہیں۔ عالمانہ روش پر چلنے والے خوب صورت انسان ہیں۔

باب ششم 'سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی کا منتخب کلام' ہے۔ مصنف کے لیے یہ باب تحریر کرنا مشکل ترین کام تھا کیوں کہ سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی کا سارا کلام اس قدر دل آویز تھا کہ اس سے انتخاب کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ بہر حال مصنف کی یہ کاوش قابلِ تحسین ہے۔ اس کتاب کی تکمیل میں مصنف ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ان تھک محنت، بے پناہ عقیدت اور خلوص شامل ہے۔ اُن کو سیّد وحید الحسن ہاشمی کا فرزند ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ بات اُن کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں لیکن کتاب کی کسی سطر میں بھی جانب داری یا اقربا پروری کا پہلو دکھائی نہیں دیتا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے جس عظیم شخصیت کا انتخاب کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ احترام ہے۔

شاعری کے میدان میں انھوں نے غزل' مرثیہ' نوحہ کے علاوہ نعت' منقبت اور سلام کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ ان اصناف کو صرف وہی شخص برت سکتا ہے جس کے دل اور روح میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت' غم' تڑپ' احترام اور عقیدت ہو اور بلاشبہ سیّد وحید الحسن ہاشمی ایسے شاعر ہیں جن کے لفظوں سے صداقت کے موتی جھلکتے ہیں جن کی شاعری سے غم آنسوؤں کی طرح ٹپکتا ہے جن کی ایک ایک سطر حق و صداقت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ ایسے شاعر برسوں بعد ہی پیدا ہوتے ہیں :

نبیؐ کی آل ناممکن ہے مٹ جائے زمانے سے
یہ وہ تفسیر ہے جو سورۂ کوثر میں ملتی ہے

◆◆◆

maablib.org

جس کا ہر لفظ محبت کا سبق دیتا ہے ــــ طاہرین پر ایک طائرانہ نظر

حسن عسکری کاظمی

◆◆

کسی معیاری کتاب کی اشاعت اور اس میں حُسن التزام کا لحاظ رکھنا ایسا کارنامہ ہے جو کم کم معرضِ وجود میں آتا ہے، کتابیں چھاپنا اور پیسہ کمانا پبلشروں کا عمومی رویہ ہے لیکن کتاب کی ترتیب و تدوین، صوری حُسن اور مختلف عنوانات کے تحت معتبر ناقدین کی آرا کے ساتھ کتاب کی انفرادیت کو یقینی بنانا آسان کام نہیں، اسی طرح کسی نغز گو شاعر کی عمر بھر کی ریاضت کے حاصل کو اس طرح یک جا کرنا بھی جان جوکھوں کا کام ہے جسے دیکھ کر قاری ورطۂ حیرت میں پڑ جائے کہ اس عہدِ بے تعبیر میں علمی، اَدبی اور معیاری تخلیقات کی حفاظت کا ایسا اہتمام کہ آغاز سے انجام تک پوری کتاب ہر پہلو سے اعلیٰ معیار کا نمونہ دکھائی دے، یقیناً ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سال رواں میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مراثی ''العطش'' اور نعت و منقبت و سلام کا مجموعہ ''طاہرین'' مرتب کرتے ہوئے ہمارے دعوا کی سچائی کیلئے راہ نکالی ہے۔

اس مختصر تحریر میں ''طاہرین'' پر طائرانہ تبصرہ مقصود ہے۔ جس کے ناشر ڈاکٹر سیّد محمّد باقر زیدی اور طابع سیّد اظہار الحسن رضوی ہیں۔ یہ کتاب یکے از مطبوعات الحسن پبلی کیشنز اور قیمت ۹۵۰ روپے ہے۔ اس کتاب کے صفحات کی تعداد ۶۰۸ ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ہر اس لفظ کو محفوظ کرنے پر توجہ دی ہے جو عہد موجود کے کسی نقاد نے نقد و نظر یا تبصرے کی صورت میں لکھا، ان تمام نقادوں، ہم عصر قلم کاروں یا شاعروں نے سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے رسمی یا غیر رسمی انداز میں جو کچھ کہا اسے پڑھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر باآسانی پہنچ سکتے ہیں کہ نعت، منقبت اور سلام پر گفت گو کرتے ہوئے جتنی باتیں کی گئیں ان سب کی قدر و قیمت اپنی جگہ لیکن سیّد وحید الحسن ہاشمی جو ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں ان پر آنے والے زمانوں میں ابھی بہت کچھ کہا جائے گا۔ ان

کی درویش صفت شخصیت میں جتنی دل کشی ہے اور شعر و ادب کی دنیا میں جتنی قد آور شخصیتیں موجود ہیں ان سے سید وحید الحسن ہاشمی کے روابط کا احاطہ کرنا ابھی ہمارے ذمے قرض ہے۔

''طاہرین'' میں یوں تو بہت سے احباب کی آرا کو پڑھا جا سکتا ہے لیکن ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر وحید قریشی نے جس نپی تلی اور سوچی سمجھی رائے کا اظہار کیا ہے، اسے مطالعہ کرنا ضروری ہے، ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریر میں یوں تو بہت کچھ ہے مگر یہی کہنا کافی ہے کہ ''سید وحید الحسن ہاشمی اپنی تخلیقی کارکردگی کے باعث اب ایک لیجنڈ بن چکے ہیں اور ان اصناف سے پھوٹنے والا کوئی بھی سلسلۂ خیال سید صاحب کے حوالے کے بغیر تشنہ اور ادھورا ہے۔ ان کے کلام میں جذب کا ایسا عالم ہے جس نے لفظوں کو ملائم اور دلوں کو موم کیا ہے، انھوں نے جذبات کو تلاطم آشنا نہیں کیا۔ متلاطم جذبات کی تہذیب کی ہے اور یہ ایک کارنامہ ہے!''

ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''طاہرین'' نعتیں، مناقب اور سلام کا کلیات ہے جو سید وحید الحسن ہاشمی کی عقیدت اور شاعری کا ثمر ہے۔ انھوں نے فکر و احساسات کو اس طرح بہم آمیز کیا ہے کہ ہر جگہ اپنا الگ راستہ نکالا ہے اور جدیت حسیت سے اس کا رشتہ قائم ہوا ہے''۔ اس ضخیم کتاب میں ابتدا سے آخر تک نفاست اور قرینہ اپنی جگہ لیکن جس ترتیب اور تدوین کا حُسن نمایاں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے مقدمہ لکھتے ہوئے سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں کے عنوان سے ان کے کوائف کو یک جا کیا ہے۔ وہ قاری کے لیے ان کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو کماحقہٗ سمجھنے میں رہ نمائی کرتے ہیں مثلاً نام کے علاوہ تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد، شعری سفر، اساتذہ، اَدب پروری، صحافتی خدمات، خطابات اور اعزازات غرض بہت سے رُخ سامنے آجاتے ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد، شعری اور نثری مجموعے یا ان کی شخصیت پر لکھے گئے مضامین کا اشاریہ اور چالیس مرثیوں کے عنوان اور ان پر لکھے گئے تبصرے اور تبصرہ نگاروں کی فہرست کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں۔ ان پر لکھے گئے مقالات، منظوم خراجِ تحسین اور ۸۰ اہلِ قلم، ہم عصر دانش وروں کی آرا کا مطالعہ سید وحید الحسن ہاشمی کی اَدبی کاوشوں کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوتا ہے ان دانش وروں میں احسان دانش، سید آلِ رضا، رئیس امروہوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، نسیم امروہوی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، سجاد باقر رضوی، شہزاد احمد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر خورشید رضوی، انتظار حسین اور بہت سے معروف ناقدین شامل ہیں۔

دراصل اس کلیات کی اشاعت کا مقصود بھی یہی ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی کی نگارشات کو ایک بار پھر خوب صورت گیٹ اَپ میں قارئین کے سامنے لایا جائے، ان کی نعتیں، مناقب اور سلام جہاں ایک طرف معاصر اَدبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں وہاں یہ الگ الگ مجموعوں کی صورت میں پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں لیکن اب بقول ڈاکٹر وحید قریشی بلاشبہ وہ ہمارے عہد کے ایک نہایت اہم نعت گو منقبت نگار اور سلام کے شاعر ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان کے تمام کلام کو یک جا کر کے شائع کیا جائے ان کے لائق فرزند ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ان کی

جملہ نعتیں، منقبتیں اور سلاموں کو یک جا کر کے "طاہرین" کے نام سے شائع کر دیا ہے اب وحیدالحسن ہاشمی کے صحیح شاعرانہ مرتبے کو متعین کیا جا سکتا ہے۔

"طاہرین" میں نعت نگاری کے حوالے سے وقیع آرا کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مجموعے کو اُردو نعت کی تاریخ میں سنگِ میل قرار دیا ہے۔ نعتیہ مجموعہ "یاسین" ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا جس کے فلیپ پر ڈاکٹر خورشید رضوی کی یہ رائے پڑھنے کے لائق ہے کہ سید وحیدالحسن ہاشمی کی نوکِ قلم سے قوسِ قزح پھوٹتی ہے۔" ......"شاعری میں قدرت کلام سلاست اور سادگی کے ساتھ ایک دل نشیں منطقیت اور تنقید میں ژرف نگاہی اور موضوع کی تاریخی بصیرت کو ان کے نتائج قلم کی پہچان مانا جا سکتا ہے" وہ مزید لکھتے ہیں "فن نعت تہذب اسلامی کا ایک امتیازی مظہر ہے جس کی مثال کوئی دوسری تہذیب پیش نہیں کر سکتی، ہماری روایتِ سخن میں یوں تو شاید ہی کوئی شاعر ایسا نکلے جس نے اس شرف سے کچھ نہ کچھ بہرہ نہ پایا ہو لیکن سید وحیدالحسن ہاشمی کی طرح صاحب دیوان نعت گو ہونے کی سعادت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے، عقیدے کا رسوخ اور شعور کی جدت ہاشمی صاحب کے نمایاں عناصر ہیں اور نعت گوئی ان کی نظر میں بطون ذات سے پھوٹنے والے ایک روحانی تجربے سے عبارت ہے:

ہمارا کام ہے ڈوبے رہیں عشق پیمبرؐ میں
محبت کو غذا تو روح کے اندر سے ملتی ہے

وحیدالحسن ہاشمی کے ہاں نعت میں یہ التزام خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے کہ وہ سادہ انداز اظہار کے باوصف جہانِ معانی کی آئینہ دار اور تخلیقی قوت کا شاہ کار نظر آتی ہے۔ اسی طرح ان کی مختصر بحر کی نعت کے اشعار سہلِ ممتنع کی مثال ہیں، وہ جس سلیقے اور قرینے سے عام فہم نعت کہنے کا ہنر آزماتے ہیں۔ اس کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی:

نظر دیکھ لیتے جبیں دیکھ لیتے
تمنا تھی اُنؐ کو کہیں دیکھ لیتے
نہیں دُور دل سے مگر آرزو ہے
ذرا اور دل کے قریں دیکھ لیتے
خدا اتنی توفیق اے کاش دیتا
مدینے کا منظر یہیں دیکھ لیتے

ایسی مثالیں عام ہیں کہ وحیدالحسن ہاشمی مترنم اور مختصر بحور میں نعت کہتے ہوئے جذب و مستی کے باوجود عرفان و آگہی کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں کیف و سرور میں گندھی ہوئی عقیدت کا اظہار قاری کو ایسی فضا میں پہنچا دیتا ہے جہاں سے اس کی چشم باوضو وہ منظر دیکھتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا دل عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک آئینے کی طرح صاف و شفاف ہو جاتا ہے:

دعاؤں کا اپنی اثر دیکھ لیتے
سرِ شام روئے سحر دیکھ لیتے
وضو کر کے بہتے ہوئے آنسوؤں سے
نظر کچھ نہ آتا مگر دیکھ لیتے

''یاسین'' میں ان کا اُسلوب روایت اور عقیدت کا مظہر ہے لیکن انھوں نے فنِ نعت نگاری میں قدرے ہٹ کر ایسا اندازِ نظر بھی اختیار کیا ہے جس میں عہدِ موجود کے حوالے سے دامنِ طلب پھیلا کر آشوبِ زمانہ سے محفوظ رہنے کی دعا بھی نعت میں شامل کرنے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوا مانگنے کو ضروری خال کیا ہے:

اُداس اُداس یہ دل ہے لہو لہو یہ نظر
سسک رہا ہے بشر آپؐ کچھ دوا دے دیں
زمیں لرزتی ہے انسانیت ہے خطرے میں
حیات آ گئی مقتل میں آسرا دے دیں

سیّد وحید الحسن ہاشمی کے اس ضخیم کلیات میں نعتوں کے علاوہ منقبتوں کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے، ان کی منقبت نگاری میں معتقدات اور عظیم المرتبت شخصیات کے اوصافِ حمیدہ کو جس فنی چابک دستی سے قارئین کی نذر کیا گیا ہے اسے پڑھتے ہوئے کبھی ہم ان کے عقائد کی صحت کا اقرار کرنے پر مائل ہوتے ہیں، کبھی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھرانے اور آپؐ سے نسبی رشتوں سے منسلک افراد کے سامنے سرِ عقیدت خم کر دینے میں سرخوشی محسوس کرتے ہیں اور کبھی ان کے فن کی نمایاں خوبیوں کا اعتراف کرتے دکھائی دیتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ہاشمی صاحب کمال مہارت کے ساتھ الفاظ برتنے اور نئی تراکیب تراشنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں:

کیا ہیں علیؑ یہ نطقِ پیمبرؐ بتائے گا
دریا کا سارا زور سمندر بتائے گا
ہو گا نہ کم علیؑ کی شجاعت کا تذکرہ
تاریخ چپ رہے گی تو خیبر بتائے گا

مثالیں پیش کرنے کی بجائے یہ بتانا مقصود ہے کہ طاہرین میں مناقب کا مطالعہ ایک خوشگوار روحانی تجربہ اور عقائد سے وابستگی کا بہترین وسیلہ بن جاتا ہے، وہ صحت مند اور نجاتِ اخروی کا سبب بننے والے معتقدات کی ترسیل کا شعری اظہار ہنرمندی کے ساتھ کرتے ہیں:

نبیؐ و آلِ نبی پر جو پڑھ سکے نہ درود
جبیں وہ لاکھ جھکائے ثواب کوئی نہیں
علیؑ کو چھوڑ کے جو علمِ دیں کے طالب ہیں
وہ پڑھ رہے ہیں سبق اور کتاب کوئی نہیں

حضرت سیدہ فاطمہؑ بنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح میں ان کی منقبتوں میں ولآ ویزی، پاکیزگی اور طہارت کا وہ رنگ ہے کہ ان کے اشعار آبِ زمزم سے باوضو ہو کر قاری کے قلب ونظر کو نور وفور بخش دیتے ہیں:

عرصۂ عرفانِ ایماں ہو کہ میدانِ عمل
دین کی نصرت میں شامل ہیں برابر فاطمہؑ
فاطمہؑ حق کی ضیا، مہرِ نبوت کی کرن
پیکرِ اسلام کا اوجِ مقدر فاطمہؑ

سید وحید الحسن ہاشمی نے ''طاہرین'' میں پنجتنِ پاک کی ثناخوانی میں اپنے فن کو معراج پر پہنچا دیا ہے، اسی طرح انھوں نے آئمہ اطہار خصوصاً امام زمانہؑ کی مدحت میں اپنا قلم خونِ جگر اور نورِ عقیدت میں ڈبو کر ایسی شاعری کی ہے کہ انھیں خود ہی کہنا پڑا:

کس کس کو لاؤں مدحِ شہِ ذی وقار میں
لفظوں کی ایک فوج کھڑی ہے قطار میں
جو کچھ تھا سب خدا نے تصرّف میں دے دیا
کیا رہ گیا جو ان کے نہیں اختیار میں

سلام گزاری میں وحید الحسن ہاشمی ہم عصر شعرا میں وحیدِ عصر کہلاتے ہیں، یہی اعزاز بہت ہے کہ ان کے سلام مجالس میں اپنی الگ پہچان کے سبب مقبول ہیں اور سوز خواں حضرات ان کا کلام ترنم سے پڑھتے ہیں اور داد پاتے ہیں، وہ دل سے ان کے قدر دان ہیں، اسی طرح شعرا میں ان کی شناخت بحیثیت سلام گزار اور مرثیہ نگار اتنی محکم ہے کہ ''طاہرین'' کا یہ اعلان برحق ہے:

ہر دل بنا ہوا ہے عزا خانۂ حسینؑ
لیکن کہیں یزید کا دنیا میں گھر نہیں

◆◆◆

صد جلوہ رُوبرُو ہے!

پروفیسر سیف اللہ خالد

◆◆

اَدبی ریاضت کسی زبانِ واحد سے منسلک نہیں ہوتی۔ یہ مجاہدہ، کیف وکم کے لحاظ سے، ایک طرف ماضی سے مربوط ہوتا ہے، تو دوسری جانب مستقبل کے نادیدہ مظاہر کی نامولود اکائیاں، اس پر اپنی محسوس و نامحسوس حرکات وسکنات سے پرتوفگن ہوتی ہیں۔ بحث یہ ہے کہ قلم کار کی شخصیت کیسی ہے؟...... اس کے ذہنی آفاق کی وسعتیں کیا ہیں؟...... اس کے لفظوں میں، موضوعات کے محاکے کی قوت کہاں تک ہے؟...... اور اس کا اُسلوب، کس تہذیبی سانچے میں ڈھل کر چہرہ نما ہُوا ہے؟ یہ استفسارات، کل بھی اہم تھے، آج بھی توجہ طلب ہیں اور آئندہ بھی تجزیہ وتفہیم کی کسوٹی رہیں گے۔ عہدِ رواں میں، اگر کہیں یہ میزان نصب کی جائے تو سیّد وحید الحسن ہاشمی کی ذاتِ گرامی، اس کے باوقار توازن کی ضمانت ثابت ہوگی!

بیسویں صدی میں، علمانفسیات نے خود کو محض ماڈی حدود کا اسیر کیے رکھا، مگر انسانیات کی جدید ترین دریافتوں کے دوران حقائق کے جن تازہ تر گوشوں سے نقاب اُترا ہے، ان میں مابعد الطبیعیات کو بھی بشریت کے نصاب کا سیپارۂ معنی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے درخشاں مظاہر کا سرِ عنوان حمد ونعت اور منقبت وسلام ہے۔ اَدب کی ان تماثیل کا نظام اگرچہ جداگانہ ہے، تاہم فنی خلوص انھیں اُس سلسلۃ الذہب میں پرو دیتا ہے جہاں عقیدتوں کی خوشبو، نت نئے عوالم خلق کرتی ہے اور زندگی کی تہذیبی قدریں نمو پاتی ہیں۔ تب میرؔ کا یہ قولِ فیصل بے ساختہ یاد آجاتا ہے...... عشق بن یہ اَدب نہیں آتا!

محمد حسن عسکری پہلے قوطی نقاد تھے جنھوں نے ''اَدب میں جمود'' کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ فی الاصل ان کے داخل کے کسی موہوم گوشے کی ہُوک تھی جو بظاہر ایک تجریدی اعلامیہ تھا مگر فی الواقعہ اُن کے مخصوص مکتبِ فکر کا فسوں ساز آوازہ تھا۔ اُس وقت تو چند اہلِ قلم نے انھیں اس نیم سیاسی، نیم اَدبی بیان پر دادوتحسین سے مشرف کیا

مگر موصوف اگر وحیدِ عصر کے زُبدُہ ہوتے تو یقیناً ایسے فرمودات سے گریز کرتے کیوں کہ ہمارے ممدوح، وحید مودّت نے نظم ونثر کی وقیع اصناف کو جس ہنر مندی سے برتا ہے، اس سے اَدب کو اعتبار واعتماد نصیب ہوا ہے۔ ایک دھنک ہے جو اُن کی تخلیقی کاوشوں سے پھوٹتی اور خیال زاروں پر رنگ افشانی کا اعجاز دکھا کر انھیں حیرت کدوں کی صورت دیتی ہے۔ جہاں روایتی مضامین کے جلو میں، ندرتِ اظہار کی ساحری ہمکتی ہے۔ جہاں اتباع کی کوکھ سے اختراع وابداع کا طلسم جاگتا ہے۔ جہاں بلیغ تلمیحات واستعارات، عقیدہ وفن کے خوش نما امتزاج کا جادو بکھیرتے اور بیاض کی ترتیل کو، خوش الحانی ارزاں کرتے ہیں۔

یہ طے ہے کہ بڑی بات کے لیے اعلیٰ دماغ، بلند حوصلہ اور عمدہ زبان چاہیے۔ اَدبِ عالیہ کا ایوان بھی ان ہی عناصر کے جلال و جمال سے دمکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایڈمنڈ ولسن اور بروک کے ترقی پسند نظریات کی روحِ رواں، مقصدیت (Motifs) کا حوالہ ضروری ہے جس کا ایک زاویہ تواریخیت (Historicism) ہے، یعنی ماضی کی مثبت اقدار سے حال کے ایوان میں چراغاں کیا جائے۔ تعمیری وتخریبی عناصر میں واضح خطِ فاصل کھینچ کر، آواز میں وہ توانائی پیدا کی جائے جو قلم کار کی اَنا کا اثبات کرے اور اس کے افکار کو ''للکار'' کی کرشمہ ساز تاثیر بخشے۔ غالبؔ نے تو شاید کسی باطنی ترنگ میں کہہ دیا تھا...... عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا!...... یہ تو اپنی آگ میں جل مرنے کا نام ہُوا، جب کہ فن کار کا منصب یہ ہے کہ اپنے سمیت ہر نوع کے موجودات کو بے معنی نہ جانے، بل کہ اُن کی وجودی حیثیت کو تلاش کرتے ہوئے انھیں یگانہ روزگار ایجاد کا اسم دے، کیوں کہ:

> ''روشنی، شام کی محراب پر جلتے ہوئے بے ترتیب چراغوں میں سے چند ایک کے بجھانے سے نہیں، ان چراغوں کی صفیں درست کرنے اور ان کی تعداد بڑھانے سے بڑھتی ہے!''
>
> (اختر حسین جعفری: ''فردا''، ۱۹۸۸ء)

ہم اس خطے میں بود وباش رکھتے ہیں جہاں نسلِ انسانی کا ایک معتبر طبقہ وحیدِ عصر کے منظوم جوامع الکلم اور منثور انتقادی اعتقادات سے خوش بخت ہوا ہے۔ آرزو لکھنوی، سید آلِ رضا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید عابد علی عابدؔ اور پروفیسر وقار عظیم کے تلمیذِ رشید، سید وحیدؔ الحسن ہاشمی نے کلاسیکی معارف سے مُستیز بصائر ونظائر سے استفادے کو حرزِ جاں بنایا مگر اُن کی پیش کش میں تازہ تر دل نشیں اُسلوب اختیار کیا۔ اس روش کو ان کے مزاج کا منطقی مطالبہ کہا جا سکتا ہے۔ تبھی تو وہ مقامِ عقل وشوق سے آسان گزر کر، اپنی سہ گونہ شاعری سے، قافلۂ دانش وحکمت کے لیے ایسے نشانِ منزل کی تنصیب میں کامران ہوئے ہیں:

نعت

ہمارا کام ہے، ڈوبے رہیں عشقِ پیمبر میں   محبت کو غذا تو روح کے اندر سے ملتی ہے

منقبت

بے حبِ اہلِ بیت ہے یوں دین کا سفر   جیسے کسی کی آنکھ تو ہے، روشنی نہیں

سلام

بس ایک غم، صدفِ دل میں ہے گہر کی طرح   ہم اپنا داغ دکھاتے نہیں قمر کی طرح

''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' بلاشبہ ان کی ذات و صفات کا عکس، سعادت مند زندگی کی بشارت اور آگہی کی سفارت کا منظر نامہ ہیں۔ ان اَدب پاروں کا ایک خاصہ یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے حقیقت نگار قلم سے متشکل ہوئے ہیں۔ نسبی و علمی وارث ہونے کے باعث، ان سے زیادہ وحیدِ عصر کی ذاتِ گرامی سے اور کون آگاہ ہو سکتا ہے۔ وہ ''ایک چھوٹی سی بات'' میں (جو دراصل بہت بڑی بات ہے) رقم طراز ہیں:

> ''سیّد وحید الحسن ہاشمی قابلِ صد تحسین ہیں کہ وہ تقریباً ساٹھ برس سے علم و اَدب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ان کی علم واَدب سے یہ والہانہ وابستگی، انھیں دوسرے تخلیق کاروں سے ممتاز کرنے کا موجب بنتی ہے۔ اُن کے وقیع کارناموں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اب وہ محض ایک فرد نہیں، بل کہ ایک ایسا علمی و اَدبی دبستان ہیں جن سے سیکڑوں افراد مستفید ہو رہے ہیں۔ دبستانِ وحید الحسن ہاشمی سے اکتساب کرنے والوں میں راقم الحروف بھی شامل ہے۔''

چھ ابواب میں منقسم اس صحیفے کا ابتدائیہ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے سوانحی کوائف اور اعترافات پر مبنی ہے جو اہلِ تحقیق کے لیے خوانِ نعمت سے کم نہیں۔ نعتیہ مظاہر، منقبتوں کی مختلف جہتیں، سلام کے متنوع رُخ، مصاحبہ اور منتخب کلام کا کینوس، وحیدِ مودّت کی اُن اجتہادی بصیرتوں کا مرقع ہے جن پر رُوحِ عصر ناز کر سکتی ہے!

◆◆◆

’’طاہرین‘‘ تعارف وتجزیہ

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

◆◆

ڈاکٹر سید وحید الحسن ہمارے ان معتبر اکابرین اَدب میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ہمہ نوع وہمہ گیر اَدبی صلاحیتوں کو کسی ایک دائرے تک محدود نہیں رکھا۔ ان کی نعت، منقبت، سلام، مرثیہ، غزل اور تنقید کے دل کش ونظر افروز پھول تیس کتب کے گل دانوں میں سجے رنگ ونکہت کی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں، منقبتوں اور سلاموں پر مشتمل ’’طاہرین‘‘ کے عنوان سے ۶۰۸ صفحات کی حامل پیش نظر کتاب اپنے صوری ومعنوی حُسن کے حوالے سے خوب صورت ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔

اس کتاب کی ترتیب وتدوین ہاشمی صاحب کے فرزند سعادت مند ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے جس محنت و جاں فشانی سے کی ہے اس کا جواب نہیں۔ سید شبیہ الحسن خود ان اہل قلم میں سے ہیں جو اپنی خدمات کی وجہ سے اہل علم واَدب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف حق فرزندی اَدا کیا ہے بل کہ ’’حق بحق دار رسید‘‘ کے مصداق ایک اہم ترین شخصیت کی یادگار شعری نگارشات کو شائع کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ ان کی یہ مخلصانہ کاوش بذاتِ خود ایک کارنامے سے کم نہیں۔

’’طاہرین‘‘ کا انتساب شیخ مبارک علی مرحوم اور ثریا بیگم مرحومہ وغیرہ کے نام کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ’’مقدمہ‘‘ کے عنوان سے سید وحید الحسن ہاشمی کے مکمل کوائف شائع کیے گئے ہیں۔

ان کوائف میں موصوف کے آباء و اجداد، تعلیم، ملازمت، شادی، اولاد، اساتذہ کرام، صحافتی خدمات، خطابات، اعزازات، مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف، ان کے بارے میں لکھی گئی کتب اور رسائل کے گوشوں کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ بعدازاں ان اہل قلم کے اسمائے گرامی کی ایک طویل فہرست شائع کی گئی ہے جنھوں نے وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت وفن پر اپنی رائے دی۔ ان میں ڈاکٹر آغا سہیل،

ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر عاصی کرنالی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، تابش دہلوی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، پروفیسر جعفر بلوچ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور احمد ندیم قاسمی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

اس فہرست کے بعد تقریباً بیس صفحات پر سیّد وحید الحسن ہاشمی کے بارے میں ناقدین، دانش وروں اور اکابرینِ اَدب کی آراء درج کی گئی ہیں۔

طاہرین میں نقادانِ فن اور مشاہیر علم واَدب کی آراء سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ممدوح کو قدرت نے بڑی فیاضی سے غیر معمولی اَدبی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وحید الحسن ہاشمی کے وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے نے ان کی صلاحیتوں کو نکھارا اور سنوارا ہے اور انھوں نے اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر تجربات و احساسات کی وہ پُر شکوہ داستان رقم کی ہے جسے کسی دور میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ''طاہرین'' میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کے کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) نعت (۲) منقبت (۳) سلام۔ پہلے حصے میں انھوں نے سیّد المرسلین، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو ہاشمی صاحب کی عقیدت ومحبت کا محور ومرکز قرار دیا ہے جو موصوف کے لیے یقیناً بہت بڑا اعزاز واکرام ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جس کا دل حبِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دولت سے مالا مال ہو اس سے بڑا خوش نصیب دنیا میں اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ نعت کے حصے میں وحید الحسن ہاشمی کی اب تک لکھی گئی تمام نعتوں کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن لکھتے ہیں :

> ''اُردو میں نعت گوئی کی روایت کا آغاز عربی اور فارسی کی نعتیہ روایت کے وسیلے سے ہوا۔ اُردو زبان کے شعرا نے اس میدان میں اپنے افکار ونظریات اتنے سلیقے سے پیش کیے کہ اردو نعت کی روایت آج بھی جگمگا رہی ہے۔ اس روایت کو مستحکم کرنے والوں میں ایک اہم اور معتبر نام سیّد وحید الحسن ہاشمی کا بھی ہے ان نعتوں میں جہاں ایک جانب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت ومحبت جلوہ گر ہے، وہاں دوسری طرف ان نعتوں کے ذریعے انھوں نے اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے بھی مشکور سعی کی ہے۔''

سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں پر مشتمل مجموعہ ''یاسین'' جب ۱۹۹۷ء کو شائع ہوا تو نہ صرف علمی واَدبی حلقوں بل کہ عوام نے بھی اس کی زبردست پذیرائی کی۔ ملک کے معروف اخبارات وجرائد نے اس مجموعے کے بارے میں تحسین آمیز مضامین شائع کیے۔ اہلِ نقد ونظر نے اس کتاب کو تاریخ نعت گوئی کا ایک درخشاں باب قرار دیا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی کی اس مجموعہ نعت کے فلیپ پر رائے ملاحظہ ہو۔

''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نوکِ قلم سے قوسِ قزح پھوٹتی ہے۔ نعت، منقبت، مرثیہ، سلام، غزل اور تنقید جیسے متنوع میدانوں میں انھوں نے یکساں سہولت کے ساتھ لکھا ہے۔...... عقیدے کا رسوخ اور شعور کی جدت ہاشمی صاحب کی نعت کے نمایاں عناصر ہیں۔''

سیّد وحید الحسن ہاشمی نے اگرچہ نظم ونثر کی مختلف اصناف میں رنگارنگ نگارشات پیش کر کے اپنے آل راؤنڈر ہونے کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کی اَدبی زندگی کے سفر میں اس وقت ایک اہم موڑ آیا جب انھوں نے محسوس کیا کہ نعت نگاری ہی ایک ایسی منزل ہے جہاں پہنچ کر حقیقی روحانی سکون ملتا ہے۔ اس کے بعد ہاشمی صاحب نے نعت نگاری کو زندگی کا مشن بنالیا۔ خداوندِ تعالیٰ خوش نصیبوں کو یہ توفیق دیتا ہے۔ بقول جگر مراد آبادی

میری طلب بھی اس کے کرم کا صدقہ ہے

سیّد وحید الحسن ہاشمی اپنے نعتیہ مجموعے ''یاسین'' کے مقدمے میں نعت کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''نعت کے بطن میں ایک ایسی خوبی اور حُسن پنہاں ہے جو غزل میں نہیں پایا جاتا۔ غزل کا محبوب مظہر جانِ جاناں کے یہاں خدا کی ذات ہے۔ میر کے یہاں خوب رو نوجوان ہے۔ داغ کے یہاں عورت ہے۔ جوش کے یہاں منظرِ فطرت ہے۔ اقبال کے یہاں اسلام ہے اور فیض کے یہاں معاشرہ ہے۔ محبوب کی تبدیلی سے ہیئت میں بھی تبدیلی آتی گئی لیکن نعت کا محبوب روزِ ازل سے ایک ذات محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے جس کی سیرت و کردار میں قیامت تک کوئی فرق نہیں آسکتا۔ جس صنفِ سخن کا موضوع اور محبوب ایسی خوبیوں والا ہو اس میں کب مردہ دلی، باسی پن اور انجماد ہوسکتا ہے۔''

وحید الحسن ہاشمی سے متعلق مندرجہ بالا حوالے اس لیے پیش کیے گئے ہیں تاکہ ان کی نعت نگاری کا پس منظر زیادہ واضح ہو کر سامنے آسکے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے آئندہ سطور میں وحید الحسن ہاشمی کی نعت نگاری کو اس کے سیاق وسباق کے حوالے سے جانچا اور پرکھا ہے۔ انھوں نے بڑی نقادانہ بصیرت اور کشادہ نظری سے نعتوں کے عناصرِ ترکیبی کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے ۳۱ صفحات پر محیط مفصّل جائزے میں نعتوں کے موضوعات، اسالیب اور زبان وبیاں کے محاسن پر نہایت عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اسے معروف اہلِ قلم کی آراء سے مرصّع کیا گیا ہے۔ ان اہلِ قلم میں حنیف اسعدی، پروفیسر سیّد محمد رضا زیدی، پروفیسر ظفر چشتی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی شامل ہیں۔

''طاہرین'' کے دوسرے حصے میں منقبتیں شامل ہیں۔ منقبت میں مذہبی شخصیات کے محاسن کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

خصوصاً اس صنفِ شعر میں حضرت محمدؐ و آلِ محمدؐ کے خانوادۂ بابرکات و ستودہ صفات سے متعلق افراد کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی کا پہلا مجموعہ مناقب ''طاہرین'' ۱۹۸۸ء اور دوسرا ''معصومین'' ۱۹۹۶ء کو شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے اس حصے میں ان دونوں مجموعوں کی منقبتوں کو بڑی خوب صورتی سے یک جا کر دیا گیا ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی کی اپنی منقبتوں کے بارے میں رائے ملاحظہ ہو:

> ''میں نے ان منقبتوں میں زبان سے زیادہ خیال کو اہمیت دی ہے۔ اسی طرح صنائع و بدائع سے بھی حتی الامکان گریز کیا ہے۔ منقبت کے لیے جذبہ صادق اور گہری عقیدت درکار ہے۔ میری عقیدت اور میرے جذبات جہاں تک مجھے لے گئے میں نے ان کی عکاسی کر دی ہے...... جس امر کا میں نے زیادہ خیال رکھا ہے وہ زبان کی سادگی ہے۔ جہاں تک ہو سکا عربی اور فارسی ترکیبوں سے گریز کیا ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں سادہ زبان استعمال کی گئی ہے تاکہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے اوصاف اور ان کا پیغام عوام تک پہنچ سکے۔''

بعد ازاں مختلف نقادوں کی مختلف اوقات میں وحید الحسن ہاشمی کی منقبتوں کے بارے میں دی گئی آراء درج کی گئی ہیں۔ ان اکابرین نقد و نظر میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سہیل، رئیس امروہوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر اسلم رانا، سید انوار غالب، میر سجاد حارث، پروفیسر سجاد حیدر ملک، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، نقوی اور ڈاکٹر آرزو چودھری کے اسمائے گرامی شامل ہیں:

> ''سید وحید الحسن ہاشمی اُردو کی مذہبی شعری روایت کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، جنھوں نے قدیم روایت میں اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ ان کا مجموعہ منقبت اس اعتبار سے منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں روایتی غزل کے پیمانے میں عقیدت و معرفت کی شراب طہور نئے زاویہ ہائے نظر اور پیرایہ بیان کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔''

''طاہرین'' کا تیسرا اور آخری حصہ سید وحید الحسن ہاشمی کے سلاموں پر مشتمل ہے۔ سلام وہ صنفِ شعر ہے جس میں اہلِ بیت اور شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

شبلی نعمانی ''موازنہ انیس و دبیر'' میں سلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اُردو شاعری کی اصل بنیاد غزل کی زمین پر قائم ہوئی اور اقسامِ سخن میں اس کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ عام مرثیہ گویوں نے اپنے مضمون کی نوعیت کے لحاظ سے مسدس کا طریقہ اختیار کیا لیکن غزل کی لے اس قدر کانوں میں رچ بس چکی تھی کہ لوگوں کو اس انداز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے غزل کی طرز پر سلام ایجاد کیا۔ سلام کی بحریں بھی وہی

غزل کی ہوتی ہیں۔ غزل کی طرح مضمون کے لحاظ سے ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔
سلام کی خوبی یہ ہے کہ غزل کی طرح شگفتہ اور نئی، بندش سادہ اور صاف، مضمون درد انگیز اور پُر تاثیر ہو۔''

''طاہرین'' کے آخر میں سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، منقبتیں اور سلام شائع کیے گئے ہیں۔ کلام کا آغاز بالترتیب ڈاکٹر خورشید رضوی (نعت) ڈاکٹر سجاد باقر رضوی (منقبت) اور ڈاکٹر وحید قریشی (سلام) کی آراء سے کیا گیا ہے۔

آخر میں سید وحید الحسن ہاشمی کی ''طاہرین'' میں شامل نعتوں، منقبتوں اور سلاموں سے چند منتخب اشعار نذرِ قارئین ہیں :

نعت

نہیں ہے دولتِ دنیا نصیب میں، نہ سہی
یہ فخر کم تو نہیں ہے نبیؐ کے شاعر ہیں

....

جی میں ہے اس خاکداں سے سارے رشتے توڑ کر
آپ کو دیکھا کروں دنیا سے نظریں موڑ کر

....

جس نے افکارِ نبیؐ سے نہ تعلق رکھا
اس کو دنیا کو بھری بزم میں رسوائی ملی

....

یہی طریق پیمبرؐ تمام عمر رہا
نظر خدا کی طرف، زندگی عوام کے ساتھ

....

اختلافات مٹانے کے لیے آپؐ آئے
وحدتِ فکر بڑھانے کے لیے آپؐ آئے

....

دیتے نہ دوا آ کے اگر فخرِ مسیحا
بیماری اقوام کا درماں بھی نہ ہوتا

درسِ حیات لے گی نبیؐ کی حیات سے
انسانیت کو جب بھی کبھی ہوش آئے گا

....

جو بیادِ حضورؐ رہتا ہے
اس کے سینے میں نور رہتا ہے

....

جسے بھی دیکھا وہ خود گدائی کا لے کے کشکول پھر رہا تھا
تمام دنیا سے موڑ کر رخ نبیؐ کی جانب میں اب چلا ہوں

....

منقبت

ہو گا نہ کم علیؑ کی شجاعت کا تذکرہ
تاریخ چپ رہے گی تو خیبر بتائے گا

....

کس کس کو لاؤں مدحِ شہِ ذی وقار میں
لفظوں کی ایک فوج کھڑی ہے قطار میں

....

ہم اس لیے تعظیم خدیجہؓ کے ہیں قائل
ایمان سے وابستہ ہے عرفانِ خدیجہؓ

....

جو ان کے ہو گئے وہ ہوئے منزل آشنا
جو ان سے پھر گئے وہ ابھی تک سفر میں ہیں

....

فقط ہماری زبان بندیوں سے کیا حاصل
کہ اب حسینؑ زمانے کے دل کے اندر ہیں

....

کون پائے گا اس جری کا مزاج
جس نے بدلا ہے زندگی کا مزاج

....

سوارِ دوشِ پیمبرؐ کوئی دکھاؤ تو
حسینؑ ابن علیؑ کا جواب لاؤ تو

....

ہر اک زباں پہ رہا یوں تو نامِ آلِ نبیؐ
سمجھ سکا نہ زمانہ مقامِ آلِ نبیؐ

....

سلام

آج جو قوموں کے لب پر ہے صدائے احتجاج
یہ حسینؑ ابنِ علیؑ کے عزم کا احسان ہے

....

ہے انتہا کا فرق یزید و حسینؑ میں
اک تیرگی کے ساتھ ہے، اک روشنی کے ساتھ

....

ہرگز یزید عصر نہ مانے گا کوئی بات
جب تک نہ گفت گو ہو حسینیؑ زبان میں

....

کچل کے سرحدیں باطل کی، حق کو حق کہنا
یہی ہے خوئے محمدؐ، یہی ہے خوئے حسینؑ

....

یزیدیت کا عمل آج بھی بتاتا ہے
حسینیتؑ کی ضرورت ہے ہر زمانے کو

....

بتا رہا ہے ریاست کو مُر کا ٹھکرانا
کرے ضمیر ملامت تو نوکری کیا ہے

....

باطل کی سمت آنکھ اٹھائی نہ بھول کے
شبیرؑ آدمی تھے، بڑے ہی اصول کے

سید وحید الحسن ہاشمی کی پیش نظر کتاب ''طاہرین'' اپنے موضوعات اور اُسلوب کے حوالے سے دنیائے شعر میں ایک منفرد اور یادگار اضافہ ہے۔ ہر شعر شاعر کی قادرالکلامی کا ترجمان اور ریاضتِ فن کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کے فلیپ کی تحریر میں ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''نعت، منقبت، سلام، نوحہ اور مرثیے کے میدان میں سید وحید الحسن ہاشمی اپنی تخلیق کارکردگی کے باعث اب ایک لیجنڈ بن چکے ہیں۔

اور ان اوصاف نے پھوٹنے والا کوئی بھی سلسلہ خیال سید صاحب کے حوالے کے بغیر تشنہ اور اَدھورا ہے۔ سید صاحب ایک ایسے قادر الکلام شاعر بن چکے ہیں جن کے سامنے الفاظ باادب کھڑے دکھائی دیتے ہیں......

سید وحید الحسن ہاشمی کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا جیسے معروف و عظیم شاعر و نقاد کے مندرجہ بالا تاثرات ان کی عظمتِ فن کا کھلا اعتراف ہے۔ ممتاز نقاد ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی فلیپ کی تحریر میں ہاشمی صاحب کی کتاب ''طاہرین'' کے حوالے سے ان کی شعری خدمات کو سراہا ہے۔ ان کی رائے ملاحظہ ہو:

''وحید الحسن ہاشمی آرزو لکھنوی اور آل رضا کے حلقہ تلمذ میں رہے ہیں اس لیے زبان پر عبور اور فنی پختگی کا جو معیار ان کے ہاں ملتا ہے عصرِ حاضر کے دوسرے شعرا میں کم ہی ملے گا...... بلاشبہ وہ ہمارے عہد کے ایک نہایت اہم نعت گو، منقبت نگار اور سلام کے شاعر ہیں......''

امید ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی کی پیش نظر کتاب ہر دور میں اپنے گوناگوں محاسن کے حوالے سے مقبول عوام وخواص ہوگی۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اسے مرتب کر کے اہل علم وادب پر یقیناً احسان کیا ہے۔

◆◆◆

''طاہرین'' کا تنقیدی مطالعہ

رفعت مالک

◆◆

''طاہرین'' سید وحید الحسن ہاشمی کا نعت، منقبت اور سلام پر مشتمل مجموعہ ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی شاعری کو قوسِ قزح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں مرثیہ، نعت، نظم، منقبت، سلام، غزل، قصیدہ ہر رنگ نمایاں ہے۔ مذہبی اصناف شعر کے حوالے سے ''طاہرین'' اہم کتاب ہے۔

''طاہرین'' کو ڈاکٹر سید شبیہ نے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سید وحید الحسن ہاشمی کے فرزند ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''طاہرین'' حقِ فرزندگی ادا کرنے کے لیے مرتب نہیں کی بل کہ سید وحید الحسن ہاشمی کی علمی و اَدبی بصیرت کو سراہتے ہوئے ''طاہرین'' کی ترتیب و تدوین کا فریضہ خوش اُسلوبی سے سرانجام دیا۔ عین ممکن ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''طاہرین'' مرتب کر کے والد سے والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہو مگر ''طاہرین'' کی شاعری کے معیار کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ کام اَدب کی خدمت انجام دینے کے نکتہ نظر سے کیا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تقریباً ۲۰ تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں سے زیرِ نظر کتاب ''طاہرین'' میں انھوں نے اپنے والد سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں، منقبتوں اور سلام کو اکٹھا کیا ہے۔ طاہرین اپنے درست متن کے باعث ہر دل عزیز ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے اُردو اَدب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ انھوں نے بیک وقت نظم، نعت، غزل، قصیدہ، مرثیہ، سلام اور منقبت پر طبع آزمائی کی۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی ۳۰ کے لگ بھگ کتب شایع ہوئی ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی اَدبی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کو ''وحیدِ عصر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

''طاہرین'' میں سید وحید الحسن ہاشمی نے نعتیں لکھ کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت و بڑائی کا پرچار کیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہی وہ مبارک ذات ہے جس سے مسلم اور غیر مسلم کو صراطِ مستقیم میں رہنمائی

ملتی ہے۔ مناقب لکھ کر سیّد وحید الحسن ہاشمی نے ہماری توجہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی طرف مبذول کروانے کی کوشش کی ہے اور ہمیں آگاہ کیا ہے کہ اپنی زندگی میں رہنمائی اور قربانی انبیاء کرام کی زندگیوں سے حاصل کرو اور سلام لکھ کر حضرت امام حسینؑ اور میدانِ کربلا کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''طاہرین'' کے فلیپ پر رقم طراز ہیں:

> ''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی زیرِ نظر تصنیف ''طاہرین'' جس میں ان کی نعتیں، مناقب اور سلام شامل ہیں، اذہان کو منور اور دلوں کو تسخیر کرنے والی کتاب ہے۔ جب تک آنکھ میں آنسو اور لب پر دعا باقی ہے اس کتاب کی اثر انگیزی میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔''[۵۷]

''طاہرین'' کا پہلا حصہ ''مقدمہ'' پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اپنے قلم سے آراستہ کیا۔ اس مقدمے کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ اس میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے سیّد وحید الحسن ہاشمی کے سوانحی کوائف، شخصیت اور تصانیف کا مختصر تعارف کروایا۔ اس کے بعد مختلف ناقدین کی آرا قلم بند کیں۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعت، منقبت اور سلام کی چیدہ چیدہ خصوصیات بیان کیں اور آخر میں ''طاہرین'' کے عنوان سے جو اس تصنیف کا سرِ ورق ہے، میں اپنے رفقا کار، ناقدین، محققین اور سیّد وحید الحسن ہاشمی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ''طاہرین'' میں شامل دوسرا حصہ ''نعتیں'' ہے۔ جس میں ڈاکٹر خورشید رضوی نے ''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعت نگاری'' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد سیّد وحید الحسن ہاشمی کی ۹۰ نعتیں درج ہیں۔ ''منقبتیں'' کے عنوان سے تیسرے حصے میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے ''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی منقبت نگاری'' پر اپنی رائے دی۔ اس کے بعد سیّد وحید الحسن ہاشمی کی ۲۰۹ منقبتیں شامل ہیں۔ ''طاہرین'' کا آخری حصہ 'سلام' کے عنوان سے ہے، جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری'' کو اپنے خیالات سے آراستہ کیا اور ۲۲۱ سلام پیش کیے۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی کو نعت نگاری میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی نعتوں میں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ اعلیٰ وارفع اور جدید مضامین کا بھی پرچار کیا ہے۔ ان کی نعتوں کی زبان سادہ، رواں اور بیان عمدہ ہے جن میں عہدِ حاضر کے کرب والم کو بڑی مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شاعری میں اصلاحی مقصد بھی موجود ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اسوۂ حسنہ کا کامل نمونہ ہے صرف یہی وہ ذات ہے جس پر قلم آزمائی کرتے ہوئے سیّد وحید الحسن ہاشمی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاکیزہ کردار سے رہ نمائی کا درس دیا۔ وہ خود بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح سرائی میں اس قدر مست ہیں کہ ان کو دنیا وعاقبت کی کوئی خبر نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے بدلے جنت کی سوداگری بھی قبول نہیں کرتے:

رہتا ہوں سدا مدحتِ محبوبؐ خدا میں
گل گشت جہاں کے لیے فرصت ہی نہیں ہے
نبیؐ کے عشق کے بدلے کروں میں خلد قبول
وحید مجھ سے یہ سوداگری نہیں ہوتی

سید وحید الحسن ہاشمی کا موقف ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں علوم کا بیش بہا خزانہ دیا۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اشرف المخلوقات بن کر دنیائے اسلام میں نہ آتے تو ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہ ہوتا۔ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی کمال ہے کہ انھوں نے علم کی شمع سے منور کیا:

ے
دیا حضورؐ نے ہم کو علوم کا دریا
نہ ہوتے آپ تو صحرا میں ہاتھ ملتے ہم

....

ے
حضورؐ آپ کا کتنا بڑا عمل یہ ہے
نصاب عشق و عمل دے دیا جوانوں کو

سید وحید الحسن ہاشمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ اعلیٰ اور بہترین ذات ہے جس کا ادب واحترام کرنا دل وجان پر فرض ہے اور واجب کی تو معافی ہوسکتی ہے لیکن فرض کی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے عزیز ترین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اس لیے جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص کرم ومہربانی کا حق دار ٹھہرے تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا میں راضی ہو جائے۔ اللہ اس سے خوش ہوگا اور یوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اس کے لیے نجات کا باعث بنے گی:

ے
نبیؐ کا عشق ہے راہِ نجات کا ضامن
یہ وہ سند ہے جو ہم اپنے پاس رکھتے ہیں

ے
میں تو اسی کا بندۂ بے دام ہوں وحید
جو حشر کی گھڑی میں مرے کام آئے گا

سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنی نعتوں میں جہاں سادگی اور سلاست کو مدنظر رکھا وہاں علم بیان و بدیع کے ذریعے بھی اپنے کلام کو خوب صورتی سے مزین کیا۔ مندرجہ ذیل اشعار سید وحید الحسن ہاشمی کے شعری ذوق کی ترجمانی کرتے ہیں:

۔ غضب حق کے بعد بھی حق معدوم نہیں
گل مرجھانے پر بھی گل کہلاتا ہے

(تشبیہ)

۔ چاند کا دیکھیں عشق ہے کتنا سرورؐ سے
وہ کہہ دیں، دو ہو جا، دو ہو جاتا ہے

(استعارہ)

۔ نکلتی رہتی ہے دل سے نبیؐ نبیؐ کی صدا
میں کیا کروں کہ یہی نام زندگی ہے مری

(صنعت تکرار)

۔ راز ظاہر یہ ہوا واقعۂ ہجرت سے
کام امامؑ آتا ہے جس وقت چلا جائے رسولؐ

(صنعتِ تلمیح)

۔ حُب نبیؐ کے ساتھ اگر حُب آلؑ ہو
بولے گی خود زمین کہ سجدہ قبول ہے

(صنعت مبالغہ)

۔ ہم کو تو بس یہ نظم قیادت قبول ہے
'بارہ' امام پاک ہیں اور 'اِک' رسولؐ ہے

(صنعتِ اعداد)

سید وحید الحسن ہاشمی نے بڑے سلیقے سے چھوٹی اور لمبی بحروں کو بروئے کار لاتے ہوئے نعتوں میں مختلف موضوعات کو سمویا ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی مشاق اور خلاق شاعری اس امر کی ترجمان ہے کہ کوئی ادب سے بے بہرہ انسان بھی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے لمبی بحروں میں بھی اپنے موضوع کو برقرار رکھا:

۔ ناامید کے سب مٹ گئے وسوسے، ہمت دل کو کچھ حوصلہ مل گیا
میں کہ لب تشنۂ گفت گو تھا مگر، بات کہنے کو اِک آسرا مل گیا

سید وحید الحسن ہاشمی کی شاعری دوسرے شعرا کی طرح نہیں جو روایتی مضامین کو بیان کرتے ہوئے شاعری کی نزاکتوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے روایتی مضامین میں بھی جدید مضامین کو سمو

دیا ہے اور شعری اصناف کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی کا موقف ہے کہ محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرم کی نظر کر دیں تو میرے اشعار آسمان پر تاروں کی طرح چمکیں گے جیسے تارے روشنی و اُجالا کرتے ہیں بالکل اسی طرح میرے اشعار بھی اہلِ علم اور عقیدۂ رسول کا پرچار کرنے والوں کے لیے تاروں کی مانند چمکیں گے جن کی منتشر روشنی دل و روح کو منور کرتی ہے:

؎ اپنے کرم کی ایک نظر بھی کر دیں اگر سرکارؐ مرے
تارے بن کر عرشِ ادب پر چمکیں پھر اشعار مرے

سید وحید الحسن ہاشمی کی صرف نعتیں ہی نہیں جب کہ مناقب بھی عمدہ شعری کلام کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے منقبتوں کو جدید رجحانات سے ممتاز کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی منقبتوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نا صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں بل کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آلؑ اور ان سے منسلک ہر شخص سے محبت کا اظہار کرتے ہیں:

؎ درود پڑھتے رہو مصطفےٰؐ کی عترت پر
نہ ہو نجات کا سامان تو مرا ذمہ

؎ وہ کیوں نہ کرے تذکرۂ شانِ خدیجہؑ
مل جائے جسے سایۂ دامانِ خدیجہؑ

؎ لاکھ دعوے ہوں مگر اسلام کی تاریخ میں
ایک ہی ملتی ہے بس بنتِ پیغمبرؐ فاطمہؑ

؎ اسے بھی سر پر بٹھائیں گے ہم نبیؐ کی طرح
خدا کے گھر میں وہ پیدا تو ہو علیؑ کی طرح

؎ حسنؑ حسینؑ ہو اگر صبح و شام وردِ زبان
دہائی دے جو نہ شیطان تو مرا ذمہ

؎ وہ مصطفےٰؐ کی زندگی علیؑ کا نورِ عین ہے
وہ ساری کائنات میں حسینؑ ہے حسینؑ ہے

؎ عباسؑ کو میں صاحبِ عصمت نہ کیوں کہوں
یہ بھی تو ایک پھل شجرِ انما کا ہے

سید وحید الحسن ہاشمی کا عقیدہ ہے کہ جنت کے حصول کے لیے اللہ، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آلؑ پر ایمان لانا لازمی امر ہے اور ایمان لانا سے مراد یہ نہیں کہ آپ حضرت محمد صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کو اپنا نبیؐ مان لیں لیکن ان کے عقائد کی تقلید نہ کریں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی زندگی سے سبق تو حاصل کریں لیکن خود اس پر عمل نہ کریں تو ایسی صورت میں جنت طلب کرنا مردِ مومن کو زیب نہیں دیتا:

علیؑ کو چھوڑ کے جنت کے ڈھونڈنے والے
علیؑ کے نقشِ قدم ہی کا نام جنت ہے

وجہِ نجات ہے یہ عقیدہ وحیدؔ کا
جس میں علیؑ نہیں وہ عبادت حرام ہے

نبیؐ و آلِ نبیؐ پر جو پڑھ سکے نہ درود
جبیں وہ لاکھوں جھکائے ثواب کوئی نہیں

سید وحیدؔ الحسن ہاشمی کی منقبتوں میں بلند خیالی، جوش و جذبہ، مثبت سوچ اور زبان و بیان کی سادگی جدید موضوعات میں پیوست ہو کر سامنے آتی ہے۔ سید وحیدؔ الحسن ہاشمی حضرت علیؑ کو بے مثال قرار دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ جیسی کوئی اور مثال دونوں جہانوں میں نظر نہیں آسکتی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ کو ایسے اہمیت دیتے ہیں جیسے قرآن میں سورۃ الکوثر کی اہمیت ہے:

دونوں جہاں میں یا تو علیؑ کی مثال لا
یا پھر یہ جان لے کہ علیؑ بے مثال ہے

یوں ہیں علیؑ کو دل سے لگائے ہوئے نبیؐ
قرآن جیسے سورۂ کوثر لیے ہوئے

سید وحیدؔ الحسن ہاشمی کی منقبتوں میں اصلاحی مقصد بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بھی شامل ہے۔ صنائع بدائع کے عمدہ استعمال نے منقبتوں کو خوب صورت بنایا ہے۔ اپنے موضوع کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بڑی مہارت اور عمدگی سے علمِ بیان کی چمک دمک ان مناقب میں روشن کر دی:

حرم کی گود میں اس طرح بوترابؑ آئے
نبیؐ کے قلب پہ جیسے کوئی کتاب آئے

(تشبیہ)

چار آیتیں ہیں جلوہ فگن جس کی گود میں
قرآنِ پنجتن کی وہ سورت ہیں فاطمہؑ

(صنعتِ اعداد)

- کیا ہم سے پوچھتے ہو حدیث کسا ہے کیا
جس گھر کا واقعہ ہے وہی گھر بتائے گا

(صنعت تلمیح)

- میں اس امام کا قائل ہوں جس کی محفل سے
مرے سوال سے پہلے مرا جواب آئے

(صنعت تضاد)

- یہ رازِ عشق ہے لیکن بتائے دیتا ہوں
اگر طلب ہے خدا کی علی علی کہیے

(صنعت تکرار)

سیّد وحید الحسن ہاشمی اہلِ بیتؑ کے گھر کے رکھوالے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ بیتؑ کے گھر کا نمک کھا کر ہم جوان ہوئے ہیں اس لیے ہم اس گھر کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ہماری وفاداری کا تقاضا یہی ہے کہ اہلِ بیتؑ پر اپنی ہزار جانیں قربان کر دیں:

- کس طرح اہلِ بیتؑ کا گھر چھوڑ دیں وحیدؔ
پل کر بڑے ہوئے ہیں یہیں کے نمک سے ہم

سیّد وحید الحسن ہاشمی سلام نگاری کے ماہر ہیں۔ بہت سے شعرا ایسے ہیں جنھوں نے سلام پیش کیے لیکن جو مقام و مرتبہ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے حصے میں آیا، وہ بہت کم ہی کسی کو ملتا ہے۔ سلام کی بنیاد صنفِ غزل پر رکھی گئی۔ غزل میں مختلف موضوعات کو سمویا جاتا تھا لیکن سلام میں حضرت امام حسینؑ اور واقعہ کربلا کو موضوعِ خاص بنایا گیا ہے۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے سلاموں کے مختلف مجموعے ''الصراط''، ''خون اور آنسو''، ''بہتر پیاسے''، ''اجرِ رسالت''، ''زبانِ مقتل''، ''حیاتِ غم''، ''چراغِ سحر'' اور ''تشنہ لب ہے حسینؑ'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی صنفِ سخن سلام سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے سلاموں میں سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ احتجاجی رنگ بھی موجود ہے۔ سلام میں بنیادی طور پر واقعہ کربلا سے پس منظر کا کام لیا جاتا ہے اس لیے سیّد وحید الحسن ہاشمی نے شعری کمالات کے ساتھ واقعۂ کربلا کو نمایاں کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ''سیّد وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری'' میں لکھتے ہیں:

> ''سیّد وحید الحسن ہاشمی نے اپنے سلاموں میں تغزل کا دامن بھی نہیں چھوڑا اور واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ان کے سلام درد و غم میں ڈوبے ہوئے اور ندرتِ فکر سے مزین

ہیں اور انھیں کسی بھی رثائی ادب کے شاعر کے مقابلے میں بخوبی پیش کیا جا سکتا ہے۔"

سید وحید الحسن ہاشمی کا موقف ہے کہ واقعۂ کربلا کبھی فراموش ہونے والا نہیں۔ جب تک ہم زندہ ہیں حسینؑ کی اسلام کی راہ میں قربانی اور واقعۂ کربلا تازہ رہے گا اس لیے جب حضرت امام حسینؑ کی یاد آتی ہے تو ان کی خدمت میں سلام کہتا ہوں:

فضائے عشق پہ چھاتی ہے جب حسینؑ کی یاد
غزل کا نقش مٹا کر سلام کہتا ہوں

سید وحید الحسن ہاشمی کا بیان ہے کہ جس طرح آگ اور پانی، ظالم اور مظلوم دو متضاد خصوصیت کے حامل ہیں بالکل اسی طرح حضرت امام حسینؑ کا نام زندگی ہے اور یزید کا نام موت ہے۔ حسین نیکی، اجالے اور پاکیزگی کی علامت ہے جب کہ یزید ظلم اور اندھیرے کا استعارہ ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے سلام میں صرف حضرت امام حسینؑ کی قربانی اور واقعۂ کربلا کو ہی موضوع نہیں بنایا بل کہ اس واقعہ میں شامل ان عظیم القدر ہستیوں کا بھی تذکرہ ہے، جنھوں نے اسلام کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ حضرت امام حسینؑ کا نام ایسا ہے کہ لب پہ آتے ہی دل پر شہادت کا اثر ہونے لگتا ہے:

کتنی ہمت آفریں تاثیر ہے اس نام میں
یا حسینؑ آیا لبوں پر اور کلیجے بڑھ گئے

دونوں عالم کو سنبھالے ہے شہادت کا اثر
یہ اثر مٹ جائے عالم سے تو پھر عالم نہیں

سید وحید الحسن ہاشمی کا عقیدہ ہے کہ جس گھر میں ماتم حسینؑ ہو اور جو حضرت امام حسینؑ کی قربانی کو زندہ رکھے وہی گھر حضرت امام حسینؑ کا ہے اور جس گھر میں یادِ حسینؑ نہ ہو اس گھر سے حسینؑ کو کوئی سروکار نہیں:

جس گھر میں ہو کہیں بھی بپا ماتم حسینؑ
سمجھو کہ ہے جہاں میں وہی گھر حسینؑ کا

سید وحید الحسن ہاشمی نے نعتوں اور منقبتوں کی طرح سلام میں لمبی بحروں کا اہتمام کیا ہے۔ بیان اس قدر عمدہ، واضح اور جامع ہے کہ پورا موضوع اپنے تمام رنگ و آہنگ اور رعنائی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے صنائع و بدائع کے برموقع استعمال سے سلام کے شعری حُسن میں اضافہ کیا ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی حضرت امام حسینؑ سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے دل کی بات حضرت امام حسینؑ سے کرتے ہیں کیوں کہ ان کا کامل ایمان ہے کہ جس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسوں کو فوقیت و برتری دی اس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوش کر دیا اور جس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوش کیا اس

نے اللہ کی رضا حاصل کر لی:

حسینؑ ہی سے نہ کیوں دل کا مدعا کہیے
خدا کی بات ہی ٹھہری جو گفت گوئے حسینؑ

اس کے دل کو خواہشِ جنت ستاتی ہی نہیں
منتخب جس نے نبیؐ کا خانوادہ کر لیا

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے طاہرین کو صوری اور معنوی ہر اعتبار سے معتبر بنانے کی سعی کی۔ میرے نزدیک ''طاہرین'' ایک کتاب سے زیادہ ایک ایسی قیمتی اور نادر دستاویز ہے جو ہمارے عہد کے معیارات کو خوب سے خوب تر بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

◆◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ''ترجیحات''

ڈاکٹر آغا سہیل

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کے ہاں تصنیف و تالیف کا شغف جس وافر انداز میں ملتا ہے، اس کے مظاہر اُوپر تلے شائع ہونے والی وہ کتابیں ہیں، جن میں اس کے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس کا ذہنِ رسا تاریخ اَدب کے بطن سے گوہر آب دار کی تلاش میں ہمیشہ سر گرمِ عمل رہتا ہے۔

سید شبیہ الحسن کے بارے میں میری یہ رائے محض دوستی نبھانے کا حیلہ نہیں ہے کیوں کہ یہ کام بہت سے دیگر اصحاب نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے اور وہ بڑی ''دیانت داری'' کے ساتھ ایک طویل عرصے سے کھوٹے کو کھرا دکھانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایسے ''ہر فن مولا'' اصحاب سے میری یاد اللہ نہیں۔ چناں چہ شبیہ الحسن کے فن پر رائے زنی کرتے ہوئے میری احتیاط کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ مجھے دکھ ہے کہ اس نوجوان سے میری پہلی ملاقات محض سرسری رہی اور مَیں اسے وہ اہمیت نہ دے سکا، جو ایسے علم دوست اور صاحب فہم لوگوں کے لیے ضروری قرار پاتی ہے لیکن اس میں میرا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں کہ شبیہ الحسن نے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے اپنے سارے کارناموں کو اپنی خاموش شخصیت کے پیچھے اس صفائی سے چھپا رکھا ہے کہ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس گھمبیر خاموشی کے طلسم کو توڑنا پڑتا ہے۔ اس طلسم کو توڑنے کے لیے حاتم کی طرح منزلوں پر منزلیں مارتے ہوئے کوہ و بیاں کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ جنوں، دیووں سے لڑائی لڑنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر پہلے سوال کا جواب ملتا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے معاملے میں ابھی بہت سے سوالوں کا جواب ملنا باقی ہیں۔ جن کی نوبت تب آئے گی، جب پہلے سوال کا جواب مل جائے گا۔ اس جہانِ طلسمات میں قدم رکھنا خطرات کو خود پر مسلط کرنا ہے۔ شبیہ الحسن کو خود بھی ان خطرات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ اس کا پھونک پھونک کر قدم رکھنا اس امر کی واضح نشان

وہی کرتا ہے۔ گرہستوں کی سی سلیقہ شعاری کے ساتھ وہ ہر شے کو اس کے مناسب مقام پر رکھ کر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسے جنوں، بھوتوں، پریوں، ہر قسم کی مخلوق سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ کہیں کترا کر اور کہیں آنکھیں ملا کر سفرِ شوق کے مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ تصادم کا قائل نہیں۔ مفاہمت و گریز اس کا اٹل اصول ہے کہ جس میں ٹھوکر کھا کر گرنے کا احتمال صفر رہ جاتا ہے۔ وہ ناخنِ تدبیر کو کام میں لاتا ہے اور نرم رَوی کے ساتھ ساری گرہیں کھول کر اس پنجرے تک پہنچ جاتا ہے، جس میں بند طوطے کی گردن مروڑ کر سارے طلسم کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے بارے میں میرا یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے، لیکن ایسا غلط بھی نہیں کہ اسے سرے سے نظر انداز ہی کر دیا جائے۔ ایک بات طے ہے کہ اس نے اُدبی سطح پر جو کچھ بھی کیا ہے، وہ ایک قابلِ توجہ حوالہ ضرور بنتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اُردو اَدب کی تاریخ یا اُردو کی مختصر ترین تاریخ لکھ کر ہی نام کمایا جائے، اس کے اور بھی راستے ہیں، لیکن یہ راستے جس وقت طلب سفر کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے بڑے بوڑھے (معاف کیجیے گا) ناآشنا رہے ہیں۔ یہ ''ناآشنائی'' ہمارے نوجوان ادیبوں کے لیے مہمیز کا کام دے رہی ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ دو تین دہائیوں کی نسبت آج اُردو اَدب کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے اور اس پر کام کرنے والے موجود ہیں۔ اگر بزرگانہ مشورے اور فیصلے آڑے نہ آئیں تو بات بہت دُور تک بھی جا سکتی ہے۔ ہماری آج کی غزل تو ان بوسیدہ دیواروں کو پہلے ہی ڈھا چکی ہے، افسانہ بھی پدرانہ نصیحتوں سے آزاد ہو چکا ہے۔ تحقیق و تنقید کا معاملہ دوسرا ہے کہ اس میں جواں ہمتی کا دخل بہت ہی کم رہا ہے۔ اس میدان میں ''نوراکشتی'' کی اصطلاح اگرچہ غیر مناسب ہے لیکن تحقیقی و تنقیدی اَدب کے معاملے میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ''نوراکشتی'' کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ معدودے چند محققین کو چھوڑ کر اُردو اَدب کے اکثر کھوجیوں نے مکھی پر مکھی مارنے کا کام نہایت خوش اُسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ جس کتاب کو ہاتھ لگائیں وہ محقق کی تن آسانی کا گلہ کرتی نظر آئے گی۔ تحقیق کے مروّجہ اصولوں پر ضرب لگا کر محقق اس زعم میں مبتلا ہے کہ اس نے کوئی بڑا تیر مار لیا ہے۔ رہی تنقید تو اس میں بھی ایسے اَدب ناشناسوں کی کمی نہیں، جنھیں مصرع سیدھا کرنا نہ آیا تو تنقید لکھنے بیٹھ گئے۔ رگِ گُل سے بلبل کے پَر باندھنے والی بات تو شاعروں کے لیے تھی۔ ہمارے تنقید نگار بھینس کے انڈے سے روغنِ گل نکالنے کے دَرپے ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ اسے اصلی روغنِ بادام ثابت کرنے پر مصر نظر آتے ہیں۔ لیکن خاطر جمع رکھیے یہ لوگ اتنا کچھ کرنے کے باوجود اَدب کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ خوش قسمتی سے اردو اَدب کو ہمیشہ سے تخلیق کاروں کا ایسا گروہ میسر رہا ہے، جس نے اپنے خونِ جگر سے اس کی آب یاری کی ہے اور ہاتھ قلم ہو جانے کے باوجود اَدب کے پرچم کو سربلند رکھا ہے۔ اَدب میں تحقیق و تنقید کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کا اپنا ایک مقام ہے لیکن تنقیدی بصیرت رکھنے والے ناہنے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اکثریت ان اُسترا

برداروں کی ہے، جو اَدب کا گلا کاٹنے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔

بات ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ہو رہی تھی کہ بیچ میں، دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے۔ تحقیق و تنقید کے معاملے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کو غیر اہم سمجھنا نادانی ہوگی۔ اگر چہ اس صورتِ حال میں، جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے، کھرے کھوٹے کی پہچان مشکل ہو گئی ہے، لیکن یہ نوجوان، جس والہانہ اور پختہ کارانداز میں رجوع بہ تحقیق و تنقید ہوا ہے، صرفِ نظر کرنے کے لائق نہیں۔

اس وقت تک ڈاکٹر شبیہ الحسن کی آٹھ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جن میں ''مفاہیم'' (تحقیق و تنقیدی مضامین)۔ ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)۔ ''وضاحتیں'' (ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے مضامین کا انتخاب)۔ ''العطش'' (وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)۔ اور ''اقبال شناسی اور ماہ نامہ شام وسحر'' (مقالات کا انتخاب) شامل ہیں۔ تین کتابیں ''غزل معلیٰ کے بعد'' (آلِ رضا کی غیر مطبوعہ غزلیات کی تدوین)۔ ''سلام خاک نشینوں پر'' (آلِ رضا کے سلاموں کی تدوین)۔ اور ''وزیر الحسن عابدی۔ شخصیت اور فن''۔ تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ جب کہ ''ترجیحات'' حال ہی میں شائع ہونے والا مجموعہ مضامین ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیق و تنقید اس کے طبعی رجحانات اور باطنی میلانات کی آئینہ دار ہے۔ اُوپر دی گئی کتابوں کی فہرست سے ان کے من پسند موضوعات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس نے اَدب کے وسیع میدان میں چوکڑیاں بھرنے کے بجائے ایک کنج میں بیٹھ کر دانہ دانہ جمع کرنے کو ترجیح دی ہے۔ اس کی کامیابی کی بڑی وجہ بھی ہے۔ ''مفاہیم''۔ ''بیسویں صدی کا شعری اَدب''۔ ''وضاحتیں'' اور چند ایک کتابیں چھوڑ کر اس کی تحقیق و تنقید کا نقطہ مرکزی مرثیہ اور مرثیہ گو شعرا رہا ہے۔ خاص طور پر جدید مرثیہ گو شعرا کے بارے میں، جن پر اس سے پہلے کام نہیں ہوا۔ اس نے قابلِ قدر تحقیقی معلومات فراہم کی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اہم کاوش ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' ہے۔ سیّد آلِ رضا عام طور پر ایک مرثیہ گو شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کا پہلو ناقدین کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔ آلِ رضا کی غزل گوئی پر تحقیقی و تنقیدی نقطہ نظر سے کچھ لکھنا کافی وقت طلب اور مشکل ہے، بل کہ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری :

> ''......شبیہ الحسن نے آلِ رضا کی غزل گوئی کے بہانے بیسویں صدی کی غزل گوئی اور اس کے نمائندہ شعرا کے بارے میں ایسی سیر حاصل بحث فراہم کر دی ہے کہ ہم اس کی معرفت اُردو غزل کی پوری تاریخ کے نشیب و فراز کا ادراک کر سکتے ہیں۔ ایسا ادراک جو کبھی غزل کی تفہیم و تنقید دونوں میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔'' (آلِ رضا کی غزل گوئی۔ فلیپ سرورق)

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ رائے اس لیے بھی درست ہے کہ زیرِ نظر کتاب میں اس نے جہاں غزل کی لکھنوی روایت کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد آلِ رضا کی فنی حیثیت کا تعین

کیا ہے، وہاں بعض نقادوں کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے نہایت موثر اور نپے تلے انداز میں صحیح صورتِ حال کی وضاحت کی ہے۔ مثال کے طور پر لکھنوی غزل کے بارے میں ہمارے بیشتر نقادوں کا یہ خیال رہا ہے کہ یہ روش کوئی اعلیٰ معیار قائم نہیں کرتی بلکہ محض محبوب سے میل جول، چھیڑ چھاڑ اور چوٹی کنگھی تک محدود ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اسی قبیلے کے ایک نقاد پروفیسر مسیح الزماں کی رائے درج کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''...... پروفیسر مسیح الزّماں صاحب ایسے عشق کو، جس میں لباس کی رنگینی اور محبوب کا وصال ہو، اعلیٰ معیار کا عشق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔...... اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اعلیٰ معیار کا عشق محض ہجر اور بے رنگین لباس سے معرضِ وجود میں آ جاتا ہے؟...... ظاہر ہے کہ اعلیٰ تر عشق اعلیٰ تر کیفیات سے پیدا ہوتا ہے اور یہ کیفیت ہجر کی بھی ہو سکتی ہے اور وصال کی بھی...... لہٰذا فقط خارجی معاملات کی پیش کش کے حوالے سے لکھنوی شاعری کو مطعون کرنا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے۔ اصل میں ہمیں لکھنؤ کی مجموعی شعری و عمرانی فضا کے حوالے سے چیزوں کے بارے میں فیصلے صادر کرنے چاہئیں۔ لیکن نہایت افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہم کسی ایک سے پوری فضا کے نتائج مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے غلط نتائج ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔'' (آلِ رضا کی غزل گوئی...... ص: ۸۸)

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ہاں اصل اہمیت مجموعی صورتِ حال اور وسیع تر تناظر کی ہے۔ وہ کسی بھی اَدب پارے یا تخلیق کار کو اس کے انفرادی یا ذاتی خدوخال میں دیکھنے کے بجائے اسے اَدب کے وسیع کینوس پر رکھ کر بنظرِ غائر دیکھنے کا قائل ہے۔ چناں چہ ''آلِ رضا کی غزل گوئی'' کے مطالعے میں اس نے اسی بنیاد پر کام کیا ہے اور لگ بھگ دو سو برس کی شعری روایت کے محاکمے کے بعد آلِ رضا کے شعری نظریات کا سراغ لگایا ہے۔ اور یوں نہایت خوب صورتی اور فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ آلِ رضا کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں وہ غزل کی ایک عظیم روایت کے ساتھ مربوط ہونے کے باوجود سب سے الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے الفاظ ہیں:

''...... آلِ رضا شعر گوئی میں محض سنی سنائی باتوں اور اثر پذیری کے قائل نہیں بل کہ وہ شاعری کی بنیاد شاعر کے ذاتی تجربے پر رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں واقعیت کا سچا اظہار صرف اور صرف شاعر کے اپنے تجربے کے اظہار میں ممکن ہے۔ یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کا نقطۂ نظر مولانا حالی سے جا ملتا ہے۔ کیوں کہ حالی بھی صداقت اور واقعیت کے بہت بڑے پرچارک تھے۔ مگر اس سلسلے میں آلِ رضا کو فوقیت یہ حاصل ہے کہ وہ واقعیت میں تصرف کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ واقعیت محض روزمرہ صداقت کے دائرے میں مقید نہ ہو جائے بل کہ شعری صداقت بن جائے۔'' (ص: ۱۰۹، ۱۱۰)

آلِ رضا کی غزل کے فکری وفنی جائزے میں شبیہ الحسن کا بھرپور ناقدانہ انداز اپنے جوبن پر دکھائی دیتا ہے، چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:

"......آلِ رضا اگرچہ دل کے معاملے میں بہت محتاط واقع ہوئے ہیں مگر وہ دل دیتے ہیں تو "حسن والوں" میں تمیز کر لیتے ہیں۔" (ص:۱۲۴)

"......آلِ رضا کا تصورِ محبت ارضی ہے اور انھوں نے ماورائی محبت کے بیان سے احتراز کیا ہے۔" (ص : ۱۲۵)

"......انھوں نے جرأت و مومن کی طرح محض جنس کا بے باکانہ اظہار ہی نہیں بل کہ حسن و جمال کے نظاروں کی تصویر سے مطلب رکھنے کے بجائے تاثیر سے بھی سروکار رکھا ہے۔"

(ص:۱۲۵،۱۲۶)

"...... ہر شاعر کی طرح آلِ رضا نے بھی شعوری کوشش کی ہوگی کہ ان کے کلام میں انفرادیت کے عناصر زیادہ سے زیادہ منعکس ہوں تا کہ وہ اپنے عہد کے شعرا میں بلند قد دکھائی دیں۔"

(ص:۱۲۸)

"......انھوں نے عشق و محبت کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ اگرچہ روایتی ہے، مگر بعض اوقات روایت شکنی کا ثبوت دیتے ہوئے کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ طور سے اپنی نرگسیت کو اجاگر کیا ہے۔"

(ص:۱۳۰)

"آلِ رضا صنفِ غزل میں کسی خاص انقلابی طرز کے موجد نہیں ہیں۔ لیکن اپنے نادر اُسلوبِ بیان کی وجہ سے اپنی علاحدہ پہچان ضرور رکھتے ہیں۔" (ص:۱۵۹)

"آلِ رضا کی غزل ہمارے عہد کے لیے کیا معنی رکھتی ہے؟......آلِ رضا کی غزل آرزو لکھنوی یا جلال لکھنوی کی روایتِ غزل گوئی کی آخری کڑی ہے۔ اس روایت کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے موضوع اور اُسلوب کے تقاضوں سے عہدہ برا ہو کر غزل کو بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں اہم صنف کے طور پر زندہ رکھا۔" (ص:۱۶۰)

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ان تنقیدی جملوں کے انتخاب میں، میں نے یہ احتیاط برتی ہے کہ انھیں ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے بھی پڑھا جائے تو ان کا اصلی مفہوم قائم رہتا ہے۔ ان جملوں کو درج کرنے کا مقصد ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف کرانا نہیں بل کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس نے جو ترازو تھام رکھا ہے، اس کے کسی پلڑے کو بے جواز جھکنے نہیں دیتا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا تنقیدی اسلوب اس کے فطری مزاج سے ایک حد تک ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ وہ

زندگی کے عام رویوں میں جس نرم روی اور حسن تدبیر کا قائل ہے، وہی نرم روی اور حسنِ تدبیر اپنی تنقید میں بھی بروئے کار لاتا ہے۔ وہ موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے زوردار جملوں اور دبنگ الفاظ سے کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتا بل کہ اپنی روایتی وضع داری کو قائم رکھتے ہوئے ''معاف کیجیے گا۔'' کہہ کر دودھ میں گری ہوئی مکھی نکال لیتا ہے لیکن اس احتیاط سے کہ نہ دودھ ضائع ہوتا ہے اور نہ پینے والا کراہت محسوس کرتا ہے۔

''مفاہیم'' ڈاکٹر شبیہ الحسن کے سات مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے تین مضامین مرثیے سے متعلق ہیں۔ دیگر چار مضامین اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ادب کی ان جہتوں پر حاوی ہیں، جن پر اس سے پہلے بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان مضامین میں ''طنز و مزاح۔ مقاصد و محرکات۔'' ''ایک معتبر مزاح نگار۔ فرحت اللہ بیگ۔'' ''ظفر علی خاں کی نعت نگاری۔'' اور ''حفیظ جالندھری۔ ایک منفرد گیت نگار'' جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔

''مفاہیم'' کے آغاز میں ڈاکٹر آغا سہیل کا ایک مبسوط دیباچہ شامل ہے۔ جس میں انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ تمام مضامین کا تنقیدی اعتبار سے جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار ہمارے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہیں کھل کر اور کہیں دبے لفظوں میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کو شاباش بھی دی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ انتہائی محتاط انداز میں سرزنش بھی کی ہے۔ سرزنش ان معنوں میں کہ ڈاکٹر صاحب متذکرہ مضامین (خصوصاً طنز و مزاح سے متعلق مضامین) کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ''کچھ'' نتائج کو اچھا قرار دیتے ہیں۔ گویا اکثر نتائج ان مباحث پر مبنی ہیں، جن پر شبیہ الحسن نے بقول ڈاکٹر صاحب:

''کسی دوسرے زاویے سے غور کیا ہے۔''

میں سمجھتا ہوں کہ ان مضامین میں چند نئے مباحث چھیڑ کر ان پر کسی دوسرے زاویے سے غور کرنا ہی دراصل ڈاکٹر شبیہ الحسن کا امتیازی وصف قرار پاتا ہے۔ کہ انھوں نے نقادوں کے مبینہ مفروضات اور طے شدہ نتائج کو من و عن قبول کرنے کے بجائے اپنی تنقید کے دائرہ کار کا تعین کر کے معروضی انداز میں نتائج حاصل کیے ہیں۔

ان نتائج سے اختلاف کا حق آپ کو پہنچتا ہے۔ تنقید کے طریقہ کار سے اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے لیکن مضمون نگار کو اپنے پسندیدہ دائرے میں حرکت کرنے پر مجبور کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کو فرحت اللہ بیگ کے معتبر مزاح نگار ہونے پر اعتراض ہے۔ ان کے نزدیک فرحت اللہ بیگ الفاظ سے کھیل کر لفظوں کے ہیر پھیر سے محاورے اور روزمرہ سے جو مزاح پیدا کرتے ہیں، اس کی عمر طبعی زیادہ نہیں ہوتی لیکن واقعات اور کردار سے جو مزاح پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنا دیرپا تاثر قائم کرتا ہے۔ مزاح اور ظرافت کے باریک فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو فرحت اللہ بیگؒ کو ایک اچھا مزاح نگار کہنے کے بجائے اچھا ظرافت نگار کہنا زیادہ صحیح ہے......ڈاکٹر شبیہ الحسن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ فرحت اللہ بیگ نے واقعات اور لفظی بازی گری کے ملاپ سے ایک

تیسری روایت کو جنم دیا ہے۔ ان کے ہاں لفظوں اور واقعات دونوں میں بے ساختگی دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی بات انھیں اپنے ہم عصر مزاح نگاروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کا یہ خیال نہایت معتبر ٹھہرتا ہے کہ:

''اگر مزاح، ظرافت اور طنز کی تفریق کو معنوی لحاظ سے بخوبی سمجھ لیا جائے تو بہت سی باتیں خود بخود واضح ہو جاتی ہیں۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے فرحت اللہ بیگ کو خالص مزاح نگاروں کے کھاتے میں ڈالا ہے۔ جو ڈاکٹر صاحب کے خیال کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتا۔ ضروری تھا کہ ان کی مزاح نگاری اور ظرافت نگاری کا الگ الگ جائزہ لے کر ان کا مقام متعین کیا جاتا۔

''ظفر علی خاں کی نعت نگاری۔'' ایک عمدہ مضمون ہے، جس میں ظفر علی خاں کی نعت نگاری کی دو سطحیں دریافت کی گئی ہیں۔ پہلی سطح کا تعلق ان میلاد ناموں سے ہے، جن میں شاعرانہ پیرایۂ اظہار زیادہ جلوہ گر ہے۔ جب کہ دوسری سطح کا تعلق انقلاباتِ زمانہ اور عصری آشوب سے ہے۔ جس میں التجائیہ انداز ملتا ہے۔ ان دونوں سطحوں کے تفصیلی جائزے کے بعد مضمون کے آخر میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نعت نگاری کی پہلی سطح ظفر علی خان کو کوئی منفرد مقام نہیں دیتی، جب کہ دوسری سطح پر جہاں عصری کرب اور معاشرتی آشوب ایک فریاد اور التجا کا رنگ اختیار کر گیا ہے، وہ اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تازہ ترین کتاب ''ترجیحات'' سات مضامین پر مشتمل ہے۔ جن میں ''محمود نظامی کا باطنی سفرنامہ''۔ ''آلِ رضا کے سن ولادت کا حتمی تعین''۔ ''نسیم امروہوی۔ ایک موضوعاتی مطالعہ۔'' ''مولانا مرتضیٰ حسین۔ ایک مطالعہ۔'' ''شیر افضل جعفری کی شعری تخلیقات۔'' ''قیصر اقلیم مرثیہ۔ قیصر بارہوی'' اور ''ایک معتبر مرثیہ نگار۔ سید وحید الحسن ہاشمی۔'' جیسے مضامین شامل ہیں۔ کتاب میں یہ مضامین اسی ترتیب سے سامنے آتے ہیں۔ محمود نظامی کے بارے میں لکھے گئے مضمون کو ایک طرف رکھ کر دیگر مضامین پر نظر ڈالیں تو وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔

''آلِ رضا کے سن ولادت کا حتمی تعین'' ایک خاص تحقیقی مضمون ہے۔ اگرچہ ہمارے جدید ناقدین اس نوع کے تحقیقی موضوعات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اسے بے کار لوگوں کا مشغلہ قرار دیتے ہوئے ''گورکنی'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک فاضل نقاد نے تو تحقیق کو ''مکھی گیری'' لکھا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے لیے ''مغزِ سگاں'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ وہ باتیں ہیں جو نقاد حضرات خود اپنے قبیلے کے لوگوں کے بارے میں لکھتے آتے ہیں۔ لہٰذا اگر وہ تحقیق کو بنظرِ تحقیر دیکھتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''آلِ رضا کے سن ولادت کا تعین'' کرنے کے لیے تحقیق کے مروجہ اصولوں

سے رہ نمائی حاصل کی ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ردّ و قبول کے مراحل طے کیے ہیں۔ اپنی اس تحقیق کے سلسلے میں وہ جن باتوں کو ضروری سمجھتے ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے خیال میں کسی بھی شاعر کے سن ولادت کے تعین سے قبل تحقیق و تدوین کے اصولوں سے کما حقہ آگاہی، شاعر سے متعلق تمام معلومات سے واقفیت، شاعر سے متعلق دیگر پیش کردہ مواد پر مکمل دسترس اور ذہنی تجزیے کی صلاحیت نہایت ضروری ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے نزدیک کسی شاعر کے سن ولادت کا تعین بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس کی شاعری پر تنقید و تبصرہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کام کو محض ''کار بیکاراں'' قرار دے کر ایک طرف نہیں ڈالا جاسکتا۔ چناں چہ انھوں نے دس بارہ صفحات کے اس مضمون میں ممکنہ حد تک ان تمام مآخذ تک رسائی حاصل کی ہے، جہاں سے انھیں متعلقہ مواد حاصل ہو سکتا تھا۔ مضمون کے آخر میں ۲۹ مآخذات کی فہرست مضمون نگار کی محنت شاقہ کی گواہی دیتی ہے۔ مضمون میں اس طریقہ کار کی وضاحت بھی موجود ہے، جسے اختیار کر کے حتمی نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مضمون محض ایک شاعر کے سن ولادت کا تعین ہی نہیں کرتا بل کہ اس میں تحقیق کے جملہ اصولوں کو برتنے کا سلیقہ اور خالص تحقیق کا انداز ہمارے محققین کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

''ترجیحات'' میں شامل دو مضامین ''نسیم امروہوی۔ ایک موضوعاتی مطالعہ'' اور ''مولانا مرتضیٰ حسین فاضل......ایک مطالعہ'' بنیادی طور پر تنقیدی مضامین ہیں، تاہم ان میں تحقیق کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ان مضامین کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن تنقید و تحقیق کے باہمی ربط اور تعلق سے پوری طرح آشنا ہیں۔ ان کی تحقیقی مہارت حقائق کی تلاش میں سرگرم نظر آتی ہے اور تنقیدی بصیرت فن کی جانچ پرکھ اور اقدار کے تعین میں صرف ہوتی ہے۔ ان مضامین میں انھوں نے تحقیق کو ''منشی گیری'' کی سطح سے اٹھا کر ایک اعلیٰ درجے کی شے بنا دیا ہے۔ یہی شے ان کے تنقیدی شعور کو جلا بخشتی ہے، جس کے ذریعے وہ معنی خیز نتائج تک پہنچنے میں کوئی غلطی نہیں کرتے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن یہ بات جانتے ہیں کہ اعلیٰ تحقیق کو نمایاں کرنے اور اس کی اہمیت جتانے کے لیے تنقید کا سہارا لینا کتنا ضروری ہے۔ چناں چہ وہ نسیم امروہوی اور مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کی شخصیت، حالات زندگی اور ان کے عہد کے مجموعی طرز احساس سے رہ نمائی حاصل کر کے ان کے فن کے دروں تک پہنچتے ہیں۔

مضمون ''شیر افضل جعفری کی شعری تخلیقات۔ ایک مطالعہ'' بیک وقت تنقیدی، تجزیاتی اور تبصراتی انداز لیے ہوئے ہے۔ مضمون کے آغاز ہی میں شیر افضل جعفری کا شعری رویہ بڑے مبسوط انداز میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''شیر افضل جعفری شعرا کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جو شعر میں رومانی رویوں کے

قائل ہیں اور اسی سبب سے ان کی شاعری میں بھی رومانی رویوں کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔
فطرت سے ہم آہنگی، دل چسپی اور منفرد اظہارِ ذات، یہ دونوں رویے رومانوی شعرا میں ہمیشہ مقبول رہے ہیں۔ یہی دونوں رویے یک جا ہو کر شیر افضل جعفری کا شعری منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے دیگر مضامین کے برعکس یہ اپنی نوعیت کا الگ مضمون ہے جس میں یہ بات براہِ راست شیر افضل جعفری کے فن سے شروع کی گئی ہے۔ اور ان کی شاعری پر ایک مضبوط فکری اور تنقیدی محاکے کے بعد ان کے شعری مجموعوں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اور یوں نہ صرف شاعر کے فن سے قاری کا تعارف ہوتا ہے۔ بل کہ فن کی مختلف جہتوں سے شاعر کی قلندرانہ اور وسیع المشرب شخصیت ایک غیر محسوس انداز میں نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے شیر افضل جعفری کے شعری مجموعوں پر بات کرتے ہوئے اپنا مخصوص تحقیقی اُسلوب بھی قائم رکھا ہے اور ان کے بارے میں نہ صرف جملہ معلومات بہم پہنچائی ہیں بل کہ مضمون کے آخر میں حواشی کا اہتمام بھی کیا ہے۔

''ترجیحات'' کا ایک اہم مضمون علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد رشید وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری پر تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اہم اس لیے ہے کہ اس میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے سامنے ان کے والد گرامی کی شخصیت ہے۔ ایسے موقعوں پر عموماً ایک نقاد کو کئی مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے تنقید کے منصب پر جم کر قائم ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن اس مضمون میں بیٹے کے بجائے پورے نقاد نظر آتے ہیں اور اپنے والد سید وحید الحسن ہاشمی کے بجائے شاعر وحید الحسن ہاشمی کے تمیں مرثیوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کی فکری و فنی خوبیوں اور شاعرانہ محاسن کو اجاگر کر کے ان کے مقام و مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری پر درج ذیل سطور ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقیدی بصیرت کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں اسالیب کے مختلف ذائقے اور پیرائے ملتے ہیں۔ کہیں تو وہ آل رضا کی طرح سادہ اُسلوب اختیار کرتے ہیں اور کہیں جوش ملیح آبادی کی طرح ان کے فن میں لکھنوی مرصع کاری ملتی ہے۔ یہ بات بہر حال طے ہے کہ موصوف لفظ شناس ہیں اور الفاظ کو قرینے سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اُسلوب بیان واضح اور جچا تلا ہے سادگی، سلاست اور روانی کے حوالے سے ان پر انیس کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ وہ تشبیہ اور استعارے کے رسمی استعمال کے قائل نہیں ہیں۔ بل کہ اس فن میں ان کا مؤقف واضح طور پر یہ ہے کہ علم بیان و بدیع اگر شعری حسن میں اضافہ کریں تو ان کا استعمال برحق، ورنہ لفظوں کا الٹ پھیر بے مصرف ہے۔''

میرے خیال میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اس مضمون کو اعلیٰ مضامین میں شمار کیا جانا چاہیے، جس میں انھوں نے معروضی انداز میں دورِ جدید کے ایک اہم مرثیہ گو کی شخصیت اور فن کا جائزہ لے کر آنے والے نقادوں اور محققین کا کام آسان بنا دیا ہے۔

اور اب آیئے اس مضمون کی طرف جسے ہم نے دیگر مضامین سے الگ ایک طرف رکھا ہے۔ ''محمود نظامی کا باطنی سفرنامہ'' اپنے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے ''ترجیحات'' کا ایک منفرد مضمون ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس مضمون کو محض منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن بات اگر منھ کا ذائقہ بدلنے کی ہوتی تو اس کے لیے سفرنامہ ہی کیوں؟...... میرے خیال میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے یہاں اس کا باقاعدہ جواز موجود ہے۔ وہ محمود نظامی کے سفرنامے کو ان کے باطنی سفر کی روداد قرار دیتے ہیں اور اس مضمون کو کتاب کے آغاز میں رکھ کر وہ اس باطنی سفر کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> ''نظر نامہ ایک مسافر کی سفر در سفر کی روداد ہے۔ محمود نظامی نے اس ایک سفر میں جس طرح دو سفر کیے ہیں، وہ بذاتِ خود ایک خاصے کی چیز ہے۔ بیشتر ناقدین نے اسے تخیل کی کارفرمائی قرار دیا ہے، جب کہ ہمارے خیال میں یہ ماضی سے ایک تہذیبی رابطہ تھا جو کسی طرح بھی منقطع نہیں ہو سکا تھا۔''

محمود نظامی نے اپنے ظاہری سفر میں جو باطنی سفر کیا ہے اور ایک گم شدہ، تہذیب کی کڑیاں تلاش کر کے انھیں حال سے ملا دیا۔ اس نوع کا باطنی سفر ان شاعروں کے یہاں ملتا ہے، جنھوں نے مرثیے کی درد انگیز فضا کربلا کے لہو کی خوشبو بکھیری ہے۔ مدینہ سے کربلا تک کا سفر حیاتِ انسانی ہی نہیں، پوری کائنات کے سفر کی روداد ہے۔ جس میں قدم قدم پر ان قلبی وارداتوں اور باطنی کیفیات سے ملاقات ہوتی ہے جو صدیوں سے اسی طرح زندہ اور سلامت ہیں، جیسی شبِ عاشور کارِ گہِ کربلا میں تھیں۔ محمود نظامی مصر، لندن، پیرس کے بجائے کربلائے معلیٰ گیے ہوئے تو ان کے لفظوں کو آنسو بہانے سے کون روک سکتا تھا۔ چناں چہ ''ترجیحات'' کے اولین مضمون کا دیگر مضامین سے ایک باطنی ربط ہے جو اگر چہ بہت مہین ہے لیکن اسے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقیدی نظر صاف دیکھ سکتی ہے۔

◆◆◆

''ترجیحات'' کی حیرت سامانیاں

ڈاکٹر عاصی کرنالی

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ''ترجیحات'' کا مطالعہ میں نے دل چسپی اور انہماک سے کیا۔ اس سے پہلے بھی ان کی کئی تحریریں میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کا میدان تحقیق و تنقید ہے اور تخلیق کے افق سے بھی وہ نمودار ہو کر ہماری نگاہ کے لیے حیرت سامانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ وہ نوجوان ہیں لیکن بڑی پختہ فکری کے ساتھ قرطاس و قلم کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ان کی تا حال مطبوعات آل رضا کا فن غزل گوئی، مفاہیم، بیسویں صدی کا شعری اُدب، آیاتِ آمنہ، بجھی وہ شمع، العطش اور وضاحتیں اُدبی حلقوں میں متعارف ہو چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتابیں، باقیاتِ آل رضا، وزیر الحسن عابدی، حروف بدن، اقبال شناسی اور شام و سحر وغیرہ ہیں۔ ایک ماہ نامہ ''شام و سحر'' جب سے ان کے زیر ادارت آیا ہے، وقیع اور لائق مطالعہ نثری و شعری تخلیقات پیش کر رہا ہے، بل کہ بعض شمارے تو اُدب کی اہم دستاویزوں کی صورت میں مرتب ہوئے ہیں اور ''ریفرنس'' کا درجہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا یہ مجموعی کام، جس کا اُوپر اجمالاً تذکرہ ہوا اور اس کے علاوہ وہ کام جو ان کے گرد و پیش بکھرا ہوا ہے یا ان کے ذہن میں آئندہ منصوبوں کی صورت میں محفوظ ہے، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شبیہ الحسن اُدب کے اُفق پر ایسا نو طلوع ستارہ ہے، جس کی روشنی میں دم بدم بڑھ کر اُدب کے بہت سے دوائر اور محاذات کو اپنے احاطے میں لے کر رہے گی اور بہت سے تاریک گوشے یقیناً روشن ہوں گے۔ ان کا اب تک کا مفید کام ان کے آئندہ قلمی امکانات کی تائید کرتا ہے۔

اس مجموعی کام کے تناظر میں، نیز ''ترجیحات'' کے چھ سات مقالات کو نظر میں رکھتے ہوئے، ان کے بارے میں پہلی بات جو نہایت اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے، یہ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا خاصا تنوع ہے اور وہ کئی سطحوں پر تحقیق، تنقید اور تخلیق کے کام میں منہمک ہیں۔ تنوع کا عمل وہیں مل سکتا ہے جہاں لکھنے والے

کی اپنی اُدبی بنیاد ہو۔ وہ ہمہ جہت مطالعے کا خوگر ہو۔ بہت سا علم اس کی گرہ میں ہو۔ اس کا ایک (ادبی) خاندانی پس منظر ہو۔ وہ مکتب کی کرامت سے زیادہ فیضانِ نظر کو ایک سرچشمہ قرار دے کر اپنے ذہن کو سیراب اور اپنی فکر کو شاداب رکھتا ہو۔ فنی ریاضت اور دلی خلوص اس کی ذات کا جوہر ہو۔ سچائی اور بے خوفی اس کے خمیر و ضمیر میں رچی بسی ہو اور وہ اعتماد کے ساتھ اپنی بات کہنے اور اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے اعلیٰ وصف کا حامل ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ شبیہ الحسن کو یہ تمام وہبی اور اکتسابی نعمتیں بہت وسعت و کثرت کے ساتھ فراہم ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُدب کے اس مسافر نو نے دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا راستہ طے کر لیا ہے کہ بہت سے رہروانِ سست رفتار کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم کا ظہور ہے، کیوں کہ وہ سعی کا پورا پورا اجر عطا کرتا ہے۔

''ترجیحات'' میں یہی تنوع پسندی کا عمل نظر آتا ہے۔ یہ ہماری چند وقیع اور قد آور اُدبی شخصیات پر ایک تحقیقی و تنقیدی جائزے کا خوب صورت ''ریاضت نامہ'' ہے۔ ان مشاہیر اُدب کی شخصیت ان کے فن اور ان کے اُدبی کارناموں کا ایک ''آئینہ دار'' ہے، جس کے عکوس و نقوش کی ایک ایک تجلی کو اُبھارنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ محمود نظامی، آلِ رضا، مولانا مرتضیٰ حسین، رئیس امروہوی، شیر افضل جعفری، قیصر بارہوی اور وحید الحسن ہاشمی اپنے اپنے افق پر بہت تابناک بل کہ تابندگی بخش شخصیات ہیں۔ ان کے علمی و اُدبی احسانات ہماری تاریخ و تہذیب کی آبرو، ہمارے دین و ثقافت کا تشخص اور ہمارے ملی کارناموں کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ اپنے جوہرِ تخلیق، اپنے جذبۂ تحقیق اور اپنے ذوقِ تنقید کو ان مشاہیر اُدب کی خدمت میں صرف کر کے شبیہ الحسن نے یقیناً ایسا فرض اُدا کیا ہے، جس پر وہ تمام اُدبی حلقوں کی جانب سے شکریے کے مستحق اور دعا کے حق دار ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے یہاں کسی بھی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہوئے یہ اہتمام ہوتا ہے کہ پورا مضمون ایک منطقی ترتیب اور استدلالی تنظیم میں منسلک نظر آتا ہے۔ اسی تنظیمی وحدت کا یہ اثر ہے کہ کہنے کے لائق کوئی بات، اور ظاہر کرنے کے لائق کوئی گوشہ نظر سے مخفی نہیں رہتا۔ مضمون پڑھنے کا آغاز کرتے ہوئے قاری چاہتا ہے کہ کاش یہ بات بھی ہو، اور یہ بات بھی ہو، اور مضمون کے اختتام پر اسے راحت کا احساس ہوتا ہے کہ الحمد للہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہی۔ یوں تو اُدبی مباحث اور تحقیقی مسائل ایسے بیج کی طرح ہوتے ہیں، جن میں بے شمار شاخ و برگ اور گل و ثمر مخفی ہوتے ہیں اور ہر شاخ کے بہت سے شاخسانے ہوتے ہیں، بل کہ شبیہ الحسن کے یہاں ان مخفیات کو پردۂ ظہور پر لانے کی بھرپور ریاضت بالعموم قاری کو تسکین بخشتی ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن جس شخصیت کا ذکر آغاز کرتے ہیں، اس کا مختصر سوانحی خاکہ شروع میں پیش کر دیتے ہیں، جس میں ولادت، بچپن اور عمر کے مختلف مدارج کے احوال، تعلیم و تربیت، اساتذہ اور اہلِ کمال سے اَخذ و مطالعہ کا تعارف، خاندان کا اُدبی، تہذیبی اور معاشرتی پس منظر اور اس شخصیت کے ذاتی جواہرِ استعداد کا ذکر ہوتا

ہے۔اس سوانحی مرحلے سے گزرنے کے بعد یا اسی کے ضمن میں شبیہ الحسن اس شخصیت کے مولد و مسکن کے اس عہد کے علمی، اَدبی اور تہذیبی اثرات و مظاہر کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اس علاقے کے ماحول اور فضا کا کیا کیا تاثر اس شخصیت نے قبول کیا اور وہ غنچہ کس باغ و بہار میں پل بڑھ کر اور کس مخصوص فضا میں نمو پا کر چمن کا گل انتخاب بنا۔ ساتھ کے ساتھ شبیہ الحسن ایک اور اہم گوشے کی بھی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اس شخصیت نے مرتبہ کمال پر قدم رکھ کر اس مخصوص عہد اور اس کی تہذیب کو کیا دیا۔ یعنی جب وہ پھول کھلا تو اس نے اس فضا کو کیا رنگ و رعنائی بخشی اور اس نکہت میں کتنا اضافہ کیا۔ استفاضہ و فیض اور استفادہ و افادہ کے یہ دو طرفہ مناظر شبیہ الحسن کی مقالہ نگاری میں توازن بھی پیدا کرتے ہیں اور وزن بھی۔ اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد شبیہ الحسن اس شخصیت کے علمی و اَدبی کارناموں کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ اس کی تصانیف و تالیفات کا حصار کرتے ہیں۔ انھیں موضوعات کو تقسیم کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جہاں جہاں مناسب سمجھتے ہیں مختلف تصانیف پر اپنی رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ نثر و نظم کے نمونے بھی شامل مقالہ کرتے ہیں۔ غیر مطبوعہ کتب (قلمی مسودوں) کا بھی سراغ لگاتے ہیں اور بہت سا دکھ جھیل کر اپنی تنقید و تحقیق کا حاصل نذر قارئین کر دیتے ہیں۔ اس سارے عمل میں کہیں کوئی پندار ان کا دامن نہیں تھامتا، کوئی شائبہ غیر و رحرف و بیاں کی شکل میں ان کے قلم سے مترشح نہیں ہوتا۔ نہایت سعادت مندی اور نیاز کیشی کے ساتھ بل کہ ایک علمی انکساری کے ساتھ اپنا ذخیرۂ تحقیق ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ:

ع یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر

مقالہ نگاری میں اسناد، آراء اور حوالہ جات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور یہی وہ منزل ہے، جہاں مسافر تحقیق کی پونجی ٹٹولی جاتی ہے کہ اس کے پاس مال کتنا اور کیسا ہے اور اس کے ذہن و فکر اور حافظہ و استحضار میں کتنی وسعت، کتنی رفعت اور کتنی گہرائی ہے۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ اس اعتبار سے شبیہ الحسن بہت مال دار آسامی ہیں۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے بے شمار ادیبوں، مفکروں، نقادوں اور محققوں کے حوالوں اور اسناد کے انبار کے انبار لگا دیتے ہیں اور اس طرح اپنی بات پر مہر تصدیق و توثیق ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی اُن کے یہاں ایک حسنِ ترتیب ہے۔ یعنی وہ حوالہ و سند کے موقعے پر سب سے پہلے خود اس شخص کا جو زیر تحقیق ہے، حوالہ فراہم کرتے ہیں، کیوں کہ صداقت و شہادت کے اعتبار سے معتبر ترین حوالہ وہی بنتا ہے، جو اس شخص نے خود اپنے بارے میں رقم کیا ہو۔ پھر اس کے بعد اس کے اقربا، احباب اور معاصرین کے حوالوں سے استفادہ کرتے ہیں اور آخر میں دوسرے اہل نقد و نظر کی رائے پیش کرتے ہیں۔ حوالہ و سند کا عمل بہ کثرت ہے تا کہ تحقیق و تفحص کا حق اَدا ہو سکے۔

لیکن ان کے یہاں حوالہ آرائی اور سند طرازی کا یہ عمل آنکھ بند کر کے چلنے کا عمل ہرگز نہیں ہے، بل کہ

یہ سب کچھ نہایت احتیاط، بصیرت اور محققانہ صداقت کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔ شبیہ الحسن صحت مندانہ اختلاف کا حق ہر جگہ محفوظ رکھتے ہیں اور جہاں جس رائے کو محلِ نظر پاتے ہیں، وہاں نہایت بے باکی اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ وہ کسی شخص کی رائے سے اس لیے مرعوب نہیں ہوتے کہ یہ کسی ''بڑی توپ'' کی رائے ہے۔ مباحث و مسائل میں کوئی رائے قطعی نہیں ہوتی اور کوئی بھی ناقد یا محقق اپنی رائے کو فیصلہ یا محاکمہ بنانے کا مجاز نہیں ہے۔ اس لیے جہاں وہ کسی رائے میں وزن نہیں پاتے، برملا اپنی رائے کا اظہار کر کے اس موضوع یا مسئلے کو وقیع بنا دیتے ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی کے مقالے میں آپ ایسے ہی ایک مقام کا مطالعہ کر سکتے ہیں...... اگر مقالہ تنقید کے پردے میں تحسین و توصیف ہو تو پھر وہ ایک جانب دارانہ اور غیر عادلانہ تحریر ہوتی ہے اور اس کی حیثیت ایک دفترِ بے معنی سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ شبیہ الحسن نے کسی شخصیت کی مناسب اور فی الواقع خوبیاں اُجاگر کرتے ہوئے اس کی فنی اور اَدبی خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنی تحریر میں عدل و اعتدال پیدا کیا ہے، جیسا کہ شیر افضل جعفری کی شاعری پر بات کرتے ہوئے ایسی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس اندازِ عمل نے ہر مقالے کو ایک متین اور معتبر کاوش کی صورت بخش دی ہے۔

مقالہ نگاری ایک تحقیقی اور علمی سطح کا بلند پایہ عمل ہوتا ہے، اسی کے مطابق ایسی زبان برتی جاتی ہے، جس میں علمی شان اور فاضلانہ شکوہ و طمطراق ہو۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ بالعموم مقالے کی زبان ثقیل اور بیان پیچیدہ ہوتا ہے، جس کی تفہیم محنت طلب ہوتی ہے۔ شبیہ الحسن کے مقالوں کی زبان آسان اور بیان سادہ ہوتا ہے۔ ان کے بہت سے اَدبی جملے اور عبارتیں دامن کشِ نگاہ ہوتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے کہ وہ تحقیق و تنقید کے عمل کو تخلیقی سطح پر لے آتے ہیں۔ ہر مقالے کی تمہید میں یہ جمال نظر آتا ہے۔ ان کی تمہید کسی شخصیت کے مخصوص کارناموں سے مربوط ہو کر اساس کا کام دیتی ہے۔ جیسا محمود نظامی کے ''نظر نامے'' سے قبل سفرناموں کی تعارفی سطور، یا آلِ رضا کی شاعری سے پہلے غزل اور نظم کا تذکرہ، یا شیر افضل جعفری کے مقالے کی ابتدا میں یہ پُر معنی سطور:

> ''فطرت سے ہم آہنگی اور دل چسپی اور منفرد اظہارِ ذات، یہ دونوں رویے رومانی شعرا میں ہمیشہ مقبول رہے ہیں۔ یہی دونوں رویے یک جا ہو کر شیر افضل جعفری کا شعری منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔''

یہ تمہیدیں بہت خوب صورت اور بہت جان دار ہیں۔ اور پہلی ہی نظر میں قاری کو اس شخصیت سے ذہنی قرابت مہیا کرتی ہیں۔ جس کا وہ مطالعہ کرنے والا ہے۔ یہ تمہیدیں موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے ایک فکری فضا مہیا کرتی ہیں۔ جی چاہا کہ ''آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین'' سے قبل بھی ایک ایسی تمہید ہوتی، جو مشاہیر کی تاریخ ولادت و وفات کی اَدبی اور تاریخی اہمیت کو واضح کرتی...... تمہید کے علاوہ بھی مقالے کے سیاق میں ایسے

اَدبی ٹکڑے ملتے ہیں، جن میں انشائی جمال نظر آتا ہے۔ مثلاً مولانا مرتضیٰ حسین لکھنوی کے مقالے میں:

''اس قبیل کے لوگ ایسی آگ کی طرح ہوتے ہیں، جو دھیرے دھیرے سلگنے کے باوجود دنیا کو دانش و بینش کی گرمی پہنچاتی رہتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں مولانا مرتضیٰ حسین صدر الافاضل کا نام بھی لیا جاسکتا ہے، جن کے یہاں متانت، بُردباری اور خاموش لگن کی قندیلیں روشن نظر آتی ہیں۔''

''اسی خوش بودار فضا میں ایک نہال بھی پروان چڑھ رہا تھا، جس نے رفتہ رفتہ ایک چھتنار درخت کی شکل اختیار کر لی اور آج اس کے سائے میں شائقین علم واَدب کے قافلے ستا رہے ہیں۔''

شبیہ الحسن کے مقالوں میں جہاں کسی کی فنی شخصیت سے تعارف ہوتا ہے، وہاں اس کی ذاتی شخصیت کی پوری تصویر بھی ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ ایسے مواقع پر شبیہ الحسن خاکہ نگاری اور کردار نویسی کی ''مہارتِ عمل'' سے ہمیں حیران کر دیتے ہیں۔ انھیں چند لفظوں میں تصویر آفرینی کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ پہلے اس شخصیت کو قاری کے ذہن اور دل میں اُتار دیتے ہیں، پھر اس کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ مثلاً شیر افضل جعفری کے متعلق:

''ان کی شخصیت میں ایک قلندرانہ بانکپن تھا، وہ ایک قناعت پسند درویش تھے، ان کا مزاج بوذرانہ تھا۔ اس قلندری اور درویشی کا اظہار ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں جو طنطنہ اور والہانہ پن ملتا ہے۔ وہ دراصل ان کی اس طرح دار شخصیت کی دین ہے۔''

ہم اپنی گفت گو تمام کرنے سے قبل اسی خوشی اور اطمینان کا اظہار کرنا چاہیں گے کہ شبیہ الحسن کے یہ مقالے ان کی ریاضت، صداقت، دیانت اور لیاقت کا عمدہ ثبوت ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اہلِ نقد اور اہلِ تحقیق جب انھیں اپنے اپنے انداز میں پڑھیں تو انہیں کہیں نہ کہیں کسی کمی کا احساس ہو۔ ایک اچھی تحریر کی یہ بھی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اتنی مکمل نہ ہو کہ اس میں اضافہ نہ ہوسکے۔ مسائل و مباحث کا در باز کرنے والے مضامین ہی اصل میں ''سوچ'' کو متحرک رکھتے ہیں اور نئے نئے گوشوں اور زاویوں کو ابھارنے کا موجب بنتے ہیں۔ تاہم میرے خیال میں مقالہ نگاری (تحقیق وتنقید کے دائرے میں) اضطراب سے اطمینان اور تشکیک سے تیقن کی جانب ایک سفر ہے اور شبیہ الحسن اس سفر کو بھرپور اعتماد سے طے کر رہے ہیں!!

(ترجیحات، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۹۸ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ''تصریحات'' فن کے آئینے میں

ڈاکٹر عبدالستار نیازی

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار موجودہ عہد کے دانش وروں میں ہوتا ہے۔ وہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ہراول دستے کے خاموش سپاہی ہیں۔ جو ہر لحہ اُردو زبان کی اشاعت اور ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کی کتب کی تعداد ہاتھوں کی انگلیوں سے تجاوز کر چکی ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی اہم کتاب ''تصریحات'' منظرِ عام پر آئی تو اُستادِ محترم جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی نے باکمال محبت ایک نسخہ مرحمت فرمایا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ ہمیشہ علم و اَدب کے شائقین پر ایسی نوازشات کرتے رہتے ہیں تاکہ معاشرے کے دوسرے افراد پڑھ لکھ کر اچھے انسان بن سکیں۔ یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ نے ''تصریحات'' میں بزرگ اور ہم عمر شعرا و اُدبا کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں ''تصریحات'' کے یہ مضامین دراصل میرے محسنین اور کرم فرماؤں کی خدمت میں میری جانب سے ''کلماتِ خیر'' ہیں۔! ہمارے ہاں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ ہم دنیا سے کوچ کر جانے والے شعرا اُدبا پر واوا کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ ان کی جھوٹی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور انھیں میر تقی میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے پائے کا شاعر بتاتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن ''تصریحات'' کے آئینے میں روایت شکن نظر آتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے زندہ شعرا و اُدبا کو غیر جانب دارانہ خراجِ تحسین پیش کر کے اس روایت سے انحراف کیا ہے۔ حالاں کہ زندہ ادیبوں پر لکھنا تلوار کی تیز دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''کتاب چھپتے ہی نزاعی بن گئی۔ اَدبی تواریخ ہمیشہ تحقیقی اغلاط کی بنا پر جنم لیتے ہیں۔ لیکن یہاں اَدبی یا تحقیقی مسئلہ نہ تھا۔ بل کہ سراسر ذاتی اور خالص نجی میرا نام کیوں نہیں...... اس ضمن میں مجھے خطوط بھی ملے۔ ڈرایا دھمکایا بھی گیا۔ اخبارات میں جلے دل کے پھپھولے گئے اور چائے پی پی

کرگو سا گیا۔ حتیٰ کہ میری کانفی ڈینشل رپورٹ خراب کی گئی۔"[۲]

"تصریحات" میں پہلا مضمون "ڈاکٹر آغا سہیل کی اَدبی جہتیں" ہے۔ یہ مضمون ان کا آغا سہیل سے عقیدت کا اظہار ہے اس کے ایک ایک لفظ سے خلوص و محبت کا اظہار ہو رہا ہے۔ ہر لفظ محبت کی صحرائی سے نکل کر عقیدت میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ عقیدت اور محبت اندھی نہیں۔ بل کہ باہوش ہے۔ اسی لیے غیر جانب دارانہ تجزیہ کرتی چلی جاتی ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں کھری کھری باتیں کہی ہیں۔ ان کے نزدیک عظیم تخلیق کار کسی عہد یا خطے تک محدود نہیں ہوتا "بل کہ اس کی تخلیق میں پوری کائنات کے مسائل موجود ہوتے ہیں اور وہ تخلیق پوری دنیا پر اثرات مرتب کرتی ہے"[۳] ان کی اس بات میں آفاقی صداقت پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ ہومر کی اوڈیسی، ایلیڈ، افلاطون کی "ریپبلک" اور ارسطو کی "بوطیقا" نے پوری دنیا کے اَدب پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ "تصریحات" میں شامل تمام مضامین کا شمار تحقیق و تنقید کے زمرے میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ان شعرا و اُدبا پر لکھتے ہوئے تحقیق سے ان کی سوانح پر کسی قدر روشنی ڈالی ہے۔ تا کہ یہ مضامین آنے والے محققین کے لیے ایک اساس کا کام دے سکیں۔ وہ آغا سہیل کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "ڈاکٹر آغا سہیل لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور زوال آمادہ لکھنؤ کی رونقوں کو اپنی نگاہوں میں سمیٹ کر پاکستان آگئے۔ یہاں آ کر انھوں نے لکھنوی تہذیب و ثقافت کو حرزِ جاں بنائے رکھا۔ مگر جلد انھیں معلوم ہو گیا کہ پاکستانی تہذیب و ثقافت لکھنوی مزاج کو برداشت نہیں کر سکتی۔ آغا سہیل کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے پاکستانی ثقافت کو تو دل و جان سے قبول کر لیا۔ لیکن لکھنؤ کی نفاست اور ثقافت کو ترک نہ کیا۔ اس طرح آغا سہیل کی شخصیت میں لکھنؤ اور لاہور کی ثقافت کے جوہر یک جا ہو گئے ہیں"۔[۴]

انھوں نے آغا سہیل کی زندگی اور فن کے متعلق گراں قدر معلومات اکٹھی کی ہیں۔ انھیں شاید آغا سہیل بھی نہ جانتے ہوں۔ اس لیے کہ ادیب کی زندگی کے بھولے بسرے دریچوں میں جھانکنا، اس کی تخلیقات کا سراغ لگانا، عائلی زندگی کے متعلق معلومات مرتب کرنا، ملازمت سے سبک دوشی کے بعد اس کی علمی و اَدبی کاوشوں پر نظر رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی محنتِ شاقہ سے یہ مشکل کام بھی کر دکھایا ہے۔ آغا سہیل پر معلومات ان کی تحقیقی صلاحیتوں کا کھلا اعتراف ہے۔ انھوں نے آغا سہیل کی تمام کتب کا عرق ریزی سے مطالعہ کیا۔ پھر حقائق کی روشنی میں ان کا فنی و فکری جائزہ "تصریحات" میں قارئین کے لیے پیش کر دیا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ مگر انھوں نے آرام و سکون کی پروا کیے بغیر اسے، پایہ تکمیل تک پہنچا کر دراصل اُدب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ وہ آغا سہیل کے افسانوی مجموعوں "بدلتا ہے رنگ آسماں، شہر نا پرساں، تل برابر آسماں، اگن کنڈی، بوند بوند پانی" کے فنی و فکری تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے۔

''جس طرح غالب نے مغلیہ تہذیب کو اپنی شاعری میں محفوظ کر دیا اسی طرح آغا سہیل نے لکھنوی تہذیب و معاشرت اور عادات و معلومات کو اپنے افسانوں میں محفوظ کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔آپ آغا سہیل کے ابتدائی افسانے دیکھیے۔ زندہ لکھنؤ سے ملاقات ہو جائے گی۔''[۵]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے نزدیک آغا سہیل کے افسانوں میں عصری تحاریک معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی اُتار چڑھاؤ کے سارے اثرات ملیں گے۔ اور ان کے افسانوی کردار مخصوص دائرے میں کام کرتے نظر آئیں گے۔ جس بنا پر ان کے افسانے مقامی رنگ و بو کے دائرے سے نکل کر آفاقی سطح پر نظر آئے ہیں۔ کیوں کہ کائنات کا کوئی پہلو بھی آغا سہیل کی قلم رو سے باہر نہیں آتا وہ آغا سہیل کے افسانوں کا فنی تجزیہ کرتے ہوئے ان پہلوؤں کو سامنے لے آتے ہیں جو خود آغا کے ذہن میں بھی نہیں ہوتے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''آغا سہیل کے افسانوں میں نفسیاتی کشمکش، کبھی جنسی الجھاؤ کے سبب سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس محرک معاشرتی ہیجان خیزی بنتی ہے''۔[۶]

انھوں نے آغا سہیل کی پانچویں تنقیدی کتب ''معارف سہیل، اَدب اور عصری حیثیت، اُردو لسانیات کا خاکہ، سرور سلطانی اور دبستان لکھنؤ کے داستانی اَدب کا ارتقا کا تفصیلی ذکر کیا ہے اور ان میں سے شامل علمی و ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین پر خوب بحث کی ہے۔ انھوں نے آغا سہیل کے ان تنقیدی مضامین کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً آغا سہیل کی قلم سے نکلے اور کن کن رسائل و جرائد میں کب کب شائع ہوئے۔ ان کے بقول ''معارف سہیل'' کی اشاعت نے علمی و اَدبی حلقوں میں ڈاکٹر آغا سہیل کو ایک نقاد کے طور پر روشناس کرایا۔ ان کی تنقید قاری کے ذہن رسا، عصری حیثیت اور تخلیق کار کی متخیلہ کی مثلث پر استوار ہے۔ انھوں نے آغا سہیل کی تحقیقی و تنقیدی کتب کا غائر مطالعہ کیا اور تحقیق کرتے ہوئے ان کے بنیادی مصادر تک پہنچے، وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں ''اُردو کے کلاسیکی اَدب میں رجب علی سرور کی معروف تصنیف ''سرور سلطانی'' کو ایک معتبر مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بعض مقامات پر ناقدین و محققین سے اختلاف کرتے ہوئے نئے تحقیقی مباحث چھیڑے ہیں۔ آغا سہیل نے انتہائی تلاش و جستجو کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے۔ سرور سلطانی کو ڈاکٹر آغا سہیل کی تحقیق کی خشت اول قرار دیا جا سکتا ہے۔[۷]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن آغا سہیل کے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''دبستان لکھنؤ کے داستانی اَدب کا ارتقا'' کی ضمن میں لکھتے ہیں: ''آغا سہیل کے رگ و پے میں لکھنؤ اور اس کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ انھیں داستانی اَدب سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اس مقالے میں لکھنؤ اور داستان کا حسین ملاپ ہو گیا ہے۔ اور رغبت یہ ہے کہ اسی بنا پر آغا سہیل کا ذہن اس انتہائی فعال طریقے سے نتائج کا استنباط کرتا ہے۔[۸] ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے آغا سہیل کے

افسانوں کے وجود میں آنے ، سن اشاعت ، افسانوں کے موضوعات ، ان کے فکری کینوس کا پھیلاؤ ، فکرِ فرد کا احساس ، کرداروں کی خواہش ، ناکامیاں ، محرومیاں اور افسانوی مجموعوں کے صفحوں کی تعداد تک پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن خود اعلیٰ ذوق اور نفیس طبیعت کے مالک ہیں اور انھیں خدا کی طرف سے حسن کی جانچ پرکھ کا شعور ملا ہے۔ ان کی نظر جہاں فن کی باریکیوں پر جاتی ہے۔ وہیں افسانوی مجموعوں کی کتابت ، شیرازہ بندی اور کاغذ کی نفاست کا ذکر بھی خوب کرتے ہیں۔ آغا سہیل کے افسانوی مجموعوں کے متعلق ان کے چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"بدلتا ہے رنگ آسماں" یہ مجموعہ صوری اعتبار سے دل کش ہے۔

"شہرِ نا پرساں" افسانوی مجموعہ صوری اعتبار سے انتہائی جاذبِ نظر ہے۔

"تل برابر آسمان" طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ دوسرے مجموعوں سے زیادہ جاذبِ نظر ہے۔

"اگن کنڈلی" اس مجموعہ کی کتابت و طباعت سطحی ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے آغا سہیل کے افسانوں پر لکھتے ہوئے ناقدین کی اُردو اور انگریزی تحریروں کو بھی مدِنظر رکھا۔ کیوں کہ کسی ادیب پر لکھنے کے لیے اس کی ساری کتب اور ان سے متعلق تمام آراء کو پڑھ کر ہی تو کوئی رائے دی جا سکتی ہے۔ پھر وہی رائے حرفِ آخر ٹھہرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں آغا سہیل کی تنقید کا بھی جائزہ لیا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں "ڈاکٹر آغا سہیل ایک خلاقانہ ذہن کے مالک ہیں چیزوں کو معروضی انداز سے پرکھنے کے ہنر نے انھیں تحقیق ، تنقید اور تدوینی صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔"[۹] وہ آغا سہیل کے سفرناموں کا تجزیہ اور ان کے اسفار کی وضاحت کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے:

"ایک سفر دیس سے پردیس تک کا ہوتا ہے اور تہذیب سے دوسری تہذیب تک کا سفر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں نہ تو نسوانی کرداروں کی ٹھونس ٹھانس سے چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی محیر العقول واقعات کے بیان سے اپنے سفرناموں کو ماورائے حقیقت بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے سفرنامے مشرقی تہذیب و تمدن کے علم بردار سفر کی روداد ہیں..... انگلستان اور ایران کی سیر میں پاکستان اور پاکستانیوں کو فراموش نہیں کرتے بل کہ وقتاً فوقتاً وہ پاکستانیوں کے طرزِ عمل کے محاسن گنواتے ہیں اور کہیں ان کے قبیح اعمال پر طنز کے تیر برساتے ہیں انھوں نے اپنے ذاتی سفر کو اجتماعی سفر بنا دیا ہے۔ اور قارئین کو بھی اپنے ہم راہ انگلستان لے گئے۔ یورپ والے اپنی بغل میں بائبل لے کر برصغیر میں وارد ہوئے تھے اور آغا سہیل اپنے دل و دماغ میں برصغیر کی تہذیب و روایات سجائے یورپ پہنچے۔"[۱۰]

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے آغا سہیل پر قلمی سفر طے کرتے ہوئے ان کی ناول نگاری "غبار کوچہ جاناں" کہانی

عہد زوال کی تک جا پہنچے، غبار کوچہ جاناں تشکیل پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا۔ جب کہ کہانی عہد زوال کی میں لکھنو کی اجڑتی ہوئی تہذیب کے نقش و نگار محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے بقول ''یہ ناول اصل میں ایسے شخص کا المناک قصہ بیان کرتا ہے۔ جو ایک خاص تہذیبی روایات کا علم بردار ہے۔لیکن اسے اس تہذیب و تمدن کو الوداع کہنا پڑتا ہے نئی تہذیب اسے قبول نہیں کرتی اور وہ پرانی تہذیب سے کوشش کے باوجود پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔"

یہ ناول فکر، فن ہر دو اعتبار سے انتہائی وقعت کا حامل ہے اور اُردو ناول کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ آغا سہیل پر ان کی اس تحریر کو اعلیٰ مضمون کا درجہ دیا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس میں آغا سہیل کی شخصیت و فن کا کوئی پہلو کمزور نہیں۔ انھوں نے اسے عرق ریزی اور جاں فشانی سے لکھ کر ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ یہ آغا سہیل پر کام کرنے والوں کے لیے اساسی نوعیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں آغا سہیل پوری آب و تاب کے ساتھ چلتے پھرتے اور علمی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا یہ مضمون آغا سہیل سے محبت کرنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں'' صاحب مضمون کی بصیرت و حکمت کے ساتھ ساتھ یہ تحقیق کی بھی ایک روشن دلیل ہے۔ ''تصریحات'' میں دوسرا مضمون ڈاکٹر طاہر تونسوی پر ہے۔ اُردو زبان میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ اُردو زبان سے شناسا کم لوگ ہی ایسے ہوں گے جو طاہر تونسوی کے نام اور کام سے واقف نہ ہوں۔ تونسہ شریف میں پیدا ہونے والے انسان (حفیظ الرحمٰن طاہر) نے طاہر تونسوی کے نام سے شعر و اَدب میں اپنی پہچان بنائی۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے بقول:

> ''عصر حاضر میں قارئین کی حقیقی معنوں میں رہ نمائی کرنے والوں میں ایک معتبر نام طاہر تونسوی کا بھی ہے۔ جو خاموش دریا کی طرح علم و اَدب کی کھیتیوں کو سیراب کر رہے ہیں۔ جب وہ ان لہلہاتے کھیتوں کو دیکھتے ہیں تو مسکرا کر کسی دوسرے خشک صحرا کی آبیاری کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو یہ علمی سمندر تھکتا ہے اور نہ اس کی جولانیوں میں کمی آتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے عمر بھر بے غرضی کے ساتھ علم و اَدب سے ربط رکھا ہے جو شخص علم و اَدب کا دامن تھام لے وہ معاشرے میں سرخرو ہو جاتا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تو اختصاص یہ ہے کہ علم و اَدب نے اُن کا دامن تھام رکھا ہے۔''[۱۳۰]

دو چار کتابوں کی اشاعت جہاں تحقیق کاروں کا پڑاؤ آجاتا ہے۔ وہاں سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کی علم و اَدب سے دل چسپی کے محرکات، خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، ملازمت، اسفار، علمی و اَدبی تخلیقی اداروں کی رکنیت، اعزازات، انعامات، قومی اور بین الاقوامی سیمینارز میں شمولیت اور تصانیف و تالیف کو انتہائی جاں فشانی سے مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ نہ صرف

خوب ہے بل کہ دوسروں کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ اور نقطۂ آغاز بھی۔ یہ طاہر تونسوی کے تمام کمالات و اعزازت اور تحقیقات کا مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے بقول:

"اس کوائف نامہ کی ترتیب و تسوید میں شعوری طور پر کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی علمی و اَدبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کا سفر نامہ بھی مرتب ہو جائے"[۱۳] وہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے علمی و اَدبی کام کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اگر انھوں نے یہ "جان جوکھوں" کا کام نہ کیا تو پھر شاید کوئی اس بارگراں کو نہ اٹھا سکے۔ انھوں نے ایک اَدبی مسیحا کا روپ دھار کر ادیبوں اور شاعروں کو اپنے عصائے لفظی سے حیات تازہ عطا کرنے کا جو ہنر اپنا لیا ہے۔ اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی جس بے لوثی، انہماک اور فنی چابک دستی کے ساتھ علم واَدب کے ایوان کو سجا رہے ہیں۔ آنے والا وقت اس کی نہ صرف قدر کرے گا بل کہ جبینِ وقت پر ان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔"[۱۴]

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا مرتب کردہ یہ کوائف نامہ ڈاکٹر طاہر تونسوی سے عقیدت کا اظہار ہے۔ ہم ان کوائف کے تناظر میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے اشہب قلم کی برق رفتاری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تیسرا مضمون "اشفاق حسین کے شعری مجموعے "ہم اجنبی ہیں" پر ہے۔ اشفاق حسین بسلسلہ روزگار پردیس میں مقیم ہیں مگر انھیں ہر لحہ وطن سے دُوری کا احساس ہے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اسی دوری کو ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ قرار دیا ہے۔ پھر یہی احساس کبھی کرب اور کبھی غم کا روپ دھار کر انھیں شاعری کے لیے تپش آمادہ رکھتا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"ہم اجنبی ہیں" وطن سے دُور ایک دوست شاعر کا اہل وطن کے لیے خوشبودار ارمغان ہے۔..... اشفاق حسین نے اجنبیت کے اس دکھ کو نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اس کرب سے گزرے ہیں اور اسی بنا پر ان کی شاعری میں ہجرت ایک استعارہ بن کر ابھری ہے اور درد مند قارئین ان کی شاعری میں اس کا ذائقہ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اشفاق حسین نے ذاتی کرب کو آفاقی کرب میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری ذاتی حدود سے نکل کر آفاقی قدروں کی حامل ہو گئی ہے۔"[۱۵]

"تصریحات" میں ان کا اگلا مضمون نسیم سیّد کے شعری مجموعے "آدھی گواہی" پر ہے۔ نسیم سیّد اپنی شاعری میں عورتوں کے مسائل پر کھری کھری اور سچی سچی باتیں کرتی ہے اور بحثیت عورت کے اس معاشرے پر نظر ڈالتی ہے۔ تو کچے دھاگے، گزراوقات، نرسنگ ہوم، سمجھوتہ، سانولی رنگت، ایشیاء کی مزدور عورت، کچی بستی اور عصاء کی ضرورت نہیں مجھے، معرض وجود میں آتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ان کی شاعری کا فنی تجزیہ کرتے

ہوئے اس نتیجے پر پہنچے۔ ''ان نظموں کے عمیق مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض عورت کی مظلومیت کا رونا نہیں روتیں اور نہ ہی ان کی سطحی اور جنسی مسائل و معاملات کو نمک مرچ لگا کر پیش کرتی ہے۔ بل کہ انھوں نے عورت کے حقیقی مسائل کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔[۱۶]

''تصریحات'' میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا مضمون ''ڈاکٹر طارق عزیز کی شاعری میں خواب آ گہی'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں طارق عزیز کی شاعری کے فنی و فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو اس بات کا بھی شدید قلق ہے کہ ٹی وی نے ان سے ایک شاعر چھین لیا ہے۔ ان کے بقول ''ڈاکٹر طارق عزیز پہلے شاعر ہیں اور پھر ڈرامہ نویس، کیا یہ ہمارے معاشرے کا المیہ نہیں ہے کہ اس نے ہم سے ایک اچھے شاعر کو چھین لیا ہے؟؟؟[۱۷]

ڈاکٹر طارق عزیز کا برسوں پہلے ایک شعری مجموعہ ''جلاوطن'' شائع ہوا تھا۔ تو بہت سی جگہوں پر اس کی تقریب رونمائی ہوئی، کسی نے بھی ان کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا شعری مجموعہ بھی ماضی کا قصہ بن گیا۔ نواز شریف کی جلاوطنی کے ساتھ ہی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی توجہ ''جلاوطن'' پر جا کر مرکوز ہوگئی ان کے بقول ''جلاوطن'' کا لفظ سوتے ذہنوں پر ایک مرتبہ پھر بیدار ہوا اور اس لفظ نے ڈاکٹر طارق عزیز کے شعری مجموعے ''جلاوطن'' کی یاد دلائی۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو قدرت کی طرف سے زرخیز ذہن عطا ہوا ہے۔ وہ علم و ادب کے بند دروازوں کو اسی ذہن سے کھولتے ہوئے ڈاکٹر طارق عزیز کے لاشعور تک پہنچے اور اپنے ہم علم سے ''جلاوطن'' کے لفظوں سے ان کے ذہن کی تحلیل نفسی کر کے اس لفظ کو ان کے شعر و ادب اور زندگی کی کامیابیوں کی کلید قرار دیا۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں ''ڈاکٹر طارق عزیز جیسے نوجوان شاعر نے اپنے شعری مجموعے کا نام ''جلاوطن'' کیوں رکھا......؟؟ میرے نزدیک یہ نام ڈاکٹر طارق عزیز کی دانش مندی سوچ ہی کا مظہر نہیں بل کہ یہ ان کی شعری کائنات کے قفل کی کلید بھی ہے اور میں اسی کے ذریعے ان کی سلطنت شعر میں داخل ہو رہا ہوں۔[۱۸]

انھوں نے جلاوطن کی خوب وضاحت کی اور بتایا کہ یہ لفظ اُردو ادب میں کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ طارق عزیز اپنے آپ کو اسی معاشرے میں خود کو جلاوطن متصور کرتے ہیں۔ یہی احساس ان کی پوری شاعری کی متاع ہے۔ مگر وہ نامساعد حالات میں رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ہر لمحہ خوابی دنیا میں سانس لیتے ہیں بقول سید شبیہ الحسن ''خواب'' ان کی شاعری کی کلیدی علامت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طارق عزیز نے یہ خواب سوتی ہوئی نہیں جاگتی آنکھوں سے دیکھے ہیں،..... یہ خواب ایک نئی معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ خواب ہمیں ایک ایسے جہانِ آ گہی میں لے جاتے ہیں جہاں ہمیں اپنی نادیدہ تعبیریں دست بستہ نظر آتی ہیں[۱۹] ڈاکٹر طارق عزیز کی شاعری کا مرکز محور ''خواب'' کو مرکزی استعارہ قرار

دے کر جلاوطن کا جو فکری تجزیہ کیا ہے۔اس سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔انھوں نے اپنے مضمون میں اشعار اور نظموں کے ٹکڑے شامل کر کے اپنے مضمون کو وقیع بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا اگلا تحقیقی مضمون ''ڈاکٹر فخر الحق نوری'' پر ہے۔ان کا تعلق لاہور کے ایک علمی و اَدبی گھرانے سے ہے اور ایمفل کالج میں اُستاد ہیں۔انھوں نے محنت شاقہ سے تھوڑی سی عمر میں جو علمی اَدبی مقام بنایا ہے۔اس میں ان کا خونِ جگر شامل ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''شعر واَدب سے متعلق افراد کو معاشرے میں ثانوی درجے کی مخلوق تصور کیا جاتا ہے۔اس صورت حال میں شعر واَدب سے ناتا جوڑنا کارزیاں کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ان ناگفتہ بہ حالات میں بھی چند مجنوں ایسے ہیں۔جو ایوانِ علم واَدب کی تزئین وآرائش میں مصروف ہیں۔ ان افراد نے علم واَدب کی ترویج کو اپنا مطمعِ نظر بنالیا ہے اور وہ شبانہ روز اپنے کام میں مصروف ہیں۔ان چند افراد میں سے ایک ڈاکٹر فخر الحق نوری بھی ہیں۔جو جلب اور دفعِ مضرت سے بے نیاز ہو کر علم واَدب کی ترویج کے لیے خونِ جگر صرف کیے جارہے ہیں۔''[۲۰]

انھوں نے اس مضمون میں ڈاکٹر فخر الحق نوری کی علم و اَدب سے دل چسپی ن۔م۔راشد پر ڈاکٹریٹ، انتخاب نظم ونثر، ان کی کتب، توضیحات، مطالعات اور تعبیرات کے موضوعات فن اور اُسلوب پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر فخر الحق نوری نے ''توضیحات'' میں شامل گوشہ مجید امجد میں مجید امجد کے فکروفن کے حوالے سے جو گفت گو کی ہے۔وہ اپنی جگہ نہ بہت اہم ہے بل کہ قارئین اس بحث میں تازگی اور جدت خود محسوس کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اس ضمن میں لکھتے ہیں: ''اس گوشے میں ڈاکٹر صاحب نے بعض ایسے حقائق ونکات اُجاگر کیے ہیں۔جو ایک عرصے سے تاریخِ اَدب کی آنکھ سے مخفی تھے۔''[۲۱] ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے اُسلوب کا یہ ہے کہ جب فن کار کا تعارف کراتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس شخصیت کا تعارف دوسرے ناقدین کے لفظوں ہی سے کرائیں۔پھر ان تعارفی لفظوں کو سیڑھی بنا کر اپنے ذہنِ رسا سے اس کے لاشعور میں اترتے ہیں اور اس شخصیت کے تحقیقی سوتوں کا سراغ لگا کر ان سارے پہلوؤں کو قارئین کے سامنے لاتے ہیں اور وہی تعارف اس شخصیت کے لیے سند ٹھہرتا ہے۔وہ ڈاکٹر فخر الحق نوری کے تنقیدی مرتبے کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر فخر الحق نوری ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت سازی میں ان کے اجداد کی شرافت ودیانت داری کو خاص دخل ہے۔حقیقت یہی ہے کہ ڈاکٹر نوری کی شخصیت کے یہی جوہر ان کی تنقید کا خمیر تیار کرتے ہیں۔جب وہ تنقیدی مسند پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔تو ہر اک خورد کلاں میں انصاف کرتے ہیں۔.....وہ ایسے نقادوں میں ہیں جو شبانہ روز نئے امکانات کی تلاش میں مگن رہتے ہیں۔ڈاکٹر نوری صاحب کو تفہیم کے نئے در وا کرنے میں بڑا لطف آتا

ہے۔اپنے تحقیقی مزاج کی وجہ سے وہ چپکے سے کوئی نئی بات کہہ دیتے ہیں اور خاموشی سے لوگوں
کا ردِعمل دیکھتے ہیں۔انھوں نے کسی بیساکھی کے بغیر اپنی تحریروں سے نام اور مقام بنایا ہے۔
ڈاکٹر صاحب عصرِ حاضر کی تنقید کا ایک روشن ستارہ ہیں۔''۲۲

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو اس احساس سے عاری اور بنجر معاشرے میں زندگی گزارنے کا شدید احساس ہے چوں کہ وہ دردِ دل کی دولت سے مالا مال ہے انھیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ ہم قلم سے رشتہ توڑ کر اپنی تہذیب سے دُور ہوتے جا رہے ہیں وہ قلم کے اعجاز سے اس بنجر معاشرے میں علم و اَدب اور شعرا و اُدبا سے عقیدت کی فصلیں بو رہے ہیں اور بعض اوقات اپنے قلم سے ایسی ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری انگشت بدنداں ہو کر اس ڈرامائی منظر کا تماشائی بن جاتا ہے۔مصنف پردہ سکرین کے پیچھے جاگتی آنکھوں سے فن کاروں کو عالمِ بالا میں سرخرو ہوتے دیکھنے میں مصروف ہے۔وہ اختر ہاشمی کے متعلق یوں رقم طراز ہیں :

''حرفِ مدحت کے شاعر اختر ہاشمی افلاطون کے عہد میں ہوتے تو وہ ان کے مذہبی و اخلاقی شعری افکار کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی ریاست کا ''درباری شاعر'' بنا لیتا اور ان کی شعری کاوشوں کے اعتراف میں ''اختر شعرا'' کے خطاب سے بھی نوازتا۔میں کہیں دُور کھڑا اس صورت حال سے لطف اندوز ہوتا اور اس حقیقت پر میرا یقین مزید پختہ ہو جاتا کہ اختر ہاشمی کو یہ پذیرائی ان نفوسِ طاہرہ کی برکت سے ملی ہے جو خود بھی پارس ہیں اور کنکروں کو بھی پارس بنا دیتے ہیں۔''۲۳

''انھوں نے اس کتاب ''سید وصی الحسن نقاش'' کی شاعری کا بے لاگ تجزیہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے ''نقاش آج کے انسانوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جاوداں زندگی کے طلب گار ہیں تو انھیں بے گناہ قتل ہونا پڑے گا اور اس بے گناہی کی گواہی وہ قتل گاہ کہ جہاں انھیں شہید کیا گیا۔''۲۴

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''تصریحات'' میں خوب صورت جملے تراشے ہیں اور یہ جملے موتیوں کی طرح اپنی چکاچوند دکھانے میں مصروف ہیں۔چوں کہ لفظ شناس ہیں اور موقع محل کے مطابق لفظوں کا انتخاب کر کے فن کاروں کی تحریروں کے اسٹوپے بناتے چلے جاتے ہیں۔قارئین ان لفظی اسٹوپوں میں اپنے فن کا ہنر دیکھتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو ایسی تحریریں لکھنے کی دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔جن میں سچائی کٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اشراف کو دولت و شہرت سمیٹنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔(ص۔۱۷۵)

مجھے دانش مندوں کی یہ بات بڑی پسند ہے کہ اگر شکیل جاذب کی شاعری سے زندہ نہیں رکھ سکتی تو شبیہ الحسن کی رسمی تعریف شکیل جاذب کو کیسے حیاتِ جاوداں عطا کر سکتی ہے۔ (ص ۱۸۴)

اگر آپ کے کام میں قوت اور تاثیر ہے تو وہ باقی رہے گا ورنہ گھاس پھوس کی طرح ہوا میں اُڑ جائے گا۔ (ص ۱۹۱)

بعض شعرا کے دواوین کا کل وزن ان کے اپنے وزن سے بھی زیادہ بن جاتا ہے۔ کاش انھیں خبر ہو جائے کہ۔

''شہرت معیار سے حاصل ہوتی ہے مقدار سے نہیں'' (ص ۱۹۵)

اب تو الیہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ میرؔ و غالبؔ کے مطالعے کے بغیر صاحب دیوان شاعر بن گئے ہیں۔ (ص ۲۰۳)

ضیاء الرحمٰن فاروقی ایک طویل عرصے سے شعر و سخن کے ایوان کو اپنے ''مدھم'' نظریات سے سجانے میں مصروف ہیں۔ ''مدھم'' کا لفظ میں نے اس لیے عملاً استعمال کیا ہے کہ وہ شاعری کو لطیف جذبوں کا اظہار سمجھتے ہیں۔ (ص ۲۲۰)

شاعر اور سپہ گر دونوں جذبات کی زلفوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ سپہ گر کو ارنے سے زیادہ ''جذبہ ایمانی'' تیغ سے دشمن کو زیر کرتا ہے۔ جب کہ شاعر بحرِ جذبات میں غوطہ زن ہو کر شاعری کے آب دار موتی تلاش کرتا ہے۔ سپہ گر کو ار اور شاعر کا قلم نظریاتی سرحدوں کا محافظ ہوتا ہے۔ (ص ۲۲۹)

قارئین ان خوب صورت جملوں کے تناظر میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی لفظ شناسی، جملہ سازی اور تراکیب سازی کے ہنر سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے ''تصریحات'' میں قلم کاروں کو مشورے بھی دیتے ہیں۔ مگر ان مشوروں میں شائستگی، رکھ رکھاؤ اور تہذیبی رچاؤ نظر آتا ہے۔ وہ شکیل جاذب کو مشورے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب ضرورت اس امر کی ہے کہ شکیل جاذب عمیق نگاہی اور دقتِ نظری سے ان شعرا کا بار دگر مطالعہ کریں اور اپنی شاعری کو سوداؔ، آتشؔ، یگانہؔ اور شکیبؔ کے فکری و فنی جواہر سے مالا مال کریں۔ (ص ۱۹۰)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''تصریحات'' میں شعرا و ادبا کی تخلیقات کے ناموں کی توجیہہ بھی خوب کی ہے وہ مشفق خواجہ کی طرح ناموں کی توجیہہ کرتے ہوئے لفظوں کے گولے نہیں برساتے۔ فن کاروں کے چہروں کو لہولہان نہیں کرتے۔ اپنی بات کو باوزن بنانے کے لیے دُور کی کوڑیاں نہیں لاتے اور نہ اپنی باتوں کو ہواؤں میں اُڑاتے ہیں وہ صدیق بھٹی کے شعری مجموعے ''پانی پر تصویر'' کی توجیہہ یوں کرتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ پانی پر سجائی جانے والی تصویر ناپائیداری کی علامت ہوتی ہے۔ دراصل جاوید بھٹی نے احساس دلایا ہے کہ ہم سب کائنات میں ''نقش برآب'' ہیں جس طرح پانی پر بننے والی تصویر کو لہریں تاراج کر دیتی ہیں۔ اس طرح کف کائنات پر ابھرنے والے انسان کو وقت کا طاقت ور پہیہ کچل دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پانی پر تصویر بنانے کا عمل وقت کے ضیاع کی علامت بھی ہے۔ گویا تصویر کاری ایک عبث کام قرار دیا ہے۔''[۲۵]

سید شبیہ الحسن نے ''تصریحات'' میں جن شعرا و ادبا کے فن پر جو آرا دی ہے وہ ان تخلیق کاروں کے سارے فن کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے ایک ایک جملے میں معانی و مفاہیم کا ایک دریا بند ہے۔ ایسا تبصرہ وہی کر سکتا ہے جس نے اپنی عمر شعر و ادب کی سیاحی میں گزاری ہو۔ اس ضمن میں ان کے تبصرے ملاحظہ ہوں:

''آفتاب کاوش کا یہ مجموعہ 'احساس' اس کی طویل فنی ریاضت کا بے مثال ثمر ہے۔ پانی پر تصویر کے بعد 'یاس' ان کے شعری سفر کا پڑاؤ ہے منزل نہیں۔ (ص ۲۱۸)

ضیاء الرحمٰن فاروقی ایک طویل عرصے سے شعر و سخن کے ایوان کو اپنے ''مدھم'' نظریات سے سجانے میں مصروف ہیں۔ ''مدھم'' کا لفظ میں نے اس لیے عملاً استعمال کیا ہے۔ اختر سدھو نے اپنے شعری افکار کا چراغ تاریخ کی آگہی سے روشن کیا ہے۔

میرے نزدیک یہی رویہ انھیں فرد اور روش دونوں سے منسلک کر دیتا ہے۔ (ص ۲۴۸)

اختر ہاشمی اس عہد نا پرساں میں شاعروں کی صف میں ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ جو معاشرے میں معتبر شعری روایات کو اپنے خونِ جگر سے فروزاں کرنے میں مصروف ہیں۔ (ص ۱۴۲)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ذہن کی تحلیل نفسی کی جائے تو ان کی ذہنی سائیکی دوسرے ادیبوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ عام ناقدین شعرا و ادبا کی تخلیقات پر آرا دینے تک محدود رہتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ان روایتی ادیبوں سے ایک قدم آگے ہیں۔ وہ شعرا و ادبا سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی مزید شعری کاوشوں کو منظر عام پر لائیں اور قبولیت کے مرتبے پر فائز ہو جائیں ان کا یہ دعائیہ انداز نہ صرف اپنی جگہ خوب صورت ہے بل کہ یہ شاعر کے لیے بھی حوصلہ افزا ہے۔ ان کا دعائیہ انداز ملاحظہ فرمائیں:

''ہم سب مل کر ڈاکٹر طارق عزیز سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی شعری تخلیقات کا دوسرا مجموعہ جلد از جلد طبع سے آراستہ کریں تاکہ ان کے شعری سفر کا دوسرا پڑاؤ ہمارے سامنے آ جائے۔[۲۶]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''تصریحات'' کی شکل میں قارئین کو شخصی پذیرائی کا جیتا جاگتا مرقع عطا کیا ہے۔ جس کی خوشبو کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ اس میں بڑے آدمی پوری آب و تاب کے ساتھ شہرت عام بقائے دوام کے دربار

میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب بعض شعرا و ادبا) کے فکر وفن پر ایک بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''تصریحات'' ہم عصر اہل قلم کے اَدبی کارناموں کو متعارف کرانے کے لیے ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاصرین کے بارے میں اظہارِ خیال آسان کام نہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس سے بخوبی عہدہ براہ ہوئے ہیں [۲۷] میرے خیال میں تصریحات کے مضامین دورِ حاضر کے نوجوان اہل قلم پر مزید تحقیق وتنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

....

حواشی وتعلیقات

۱۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ''تصریحات''، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۰۔

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر: اُردو اَدب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۱ء، ص: ۱۲۔

۳۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ''تصریحات'' ص: ۱۱۔

۴۔ ایضاً ص: ۱۳۔

5۔ ایضاً ص: ۲۳۔

۶۔ ایضاً ص: ۲۵۔

۷۔ ایضاً ص: ۵۱۔

8۔ ایضاً ص: ۵۳۔

9۔ ایضاً ص: ۴۰۔

۱۰۔ ایضاً ص: ۵۴۔

۱۱۔ ایضاً ص: ۶۶۔

۱۲۔ ایضاً ص: ۷۳۔

۱۳۔ ایضاً ص: ۷۵۔

۱۴۔ ایضاً ص: ۹۰۔

۱۵۔ ایضاً ص: ۹۳۔

۱۶۔ ایضاً ص: ۱۰۳۔

۱۷۔ ایضاً ص: ۱۰۹۔

۱۸۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن تصریحات، ص: ۱۱۰۔

۱۹۔ ایضاً ص: ۱۱۱۔

۲۰۔ ایضاً ص: ۱۲۵۔

۲۱۔ ایضاً ص: ۱۲۹۔

۲۲۔ ایضاً ص: ۱۴۰۔

۲۳۔ ایضاً ص: ۱۵۰۔

۲۴۔ ایضاً ص: ۱۵۸۔

۲۵۔ ایضاً ص: ۲۱۰۔

۲۶۔ ایضاً ص: ۱۲۳۔

۲۷۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا: تصریحات، فلیپ، ملاحظہ ہو۔

(ماہنامہ ''کتاب'' لاہور، اپریل۔ مئی ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ''تصریحات''

رابعہ سرفراز

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار وطنِ عزیز کی قابلِ قدر علمی و ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف کے ساتھ ساتھ ''شام و سحر'' جیسا معیاری علمی و ادبی جریدہ زبان و ادب سے ان کی گہری وابستگی کا عکاس ہے۔ ''تصریحات'' سیّد شبیہ الحسن کا ایک عمدہ تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ یہ تصنیف پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ تمام مضامین اپنے موضوعات اور اُسلوب کے حوالے سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین میں عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں کا بھرپور تذکرہ ہے۔ اس اعتبار سے ''تصریحات'' میں مختلف تخلیق کاروں کے تخلیقی رویوں کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے نمایاں اُدبی رجحانات بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔

''تصریحات'' کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کے مضامین ان شخصیات کے حوالے سے ہیں جو حیات ہیں۔ اس طرح ہماری اُدبی بے حسی کا وہ تسلسل ٹوٹتا نظر آتا ہے جو صرف اور صرف مرحومین پر تنقید و تحقیق کے لیے رائج تھا۔ ''صرف ایک بات'' میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ''کسی بھی شخص کی پذیرائی کا سب سے بڑا طریق یہ ہے کہ اس کی حیات میں اس کے فن کے اسرار و رموز اجاگر کیے جائیں''۔

''تصریحات'' کے تفصیلی جائزہ سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ اس کتاب کے مندرجات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

پہلا مضمون: آغا سہیل کی اُدبی جہتیں

دوسرا مضمون: اَدب کا مسیحا۔ طاہر تونسوی

تیسرا مضمون: ایک مانوس اجنبی۔ اشفاق حسین

چوتھا مضمون: نسیم سیّد کی مکمل گواہی

پانچواں مضمون: ڈاکٹر طارق عزیز اور خواب آگہی
چھٹا مضمون: کچھ ڈاکٹر محمد فخرالحق نوری کے بارے میں
ساتواں مضمون: اختر ہاشمی کا شعری منظرنامہ
آٹھواں مضمون: سید وصی الحسن نقاش کی شاعری
نواں مضمون: ڈاکٹر محمد صالح کے طاہر مضامین
دسواں مضمون: شکیل جاذب کی شعری کھنک
گیارہواں مضمون: بے حس معاشرے میں آفتاب کاوش کا تحفہ احساس
بارہواں مضمون: جاوید صدیق بھٹی کا شعری سفرنامہ
تیرہواں مضمون: ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر۔ضیاالرحمٰن فاروقی
چودھواں مضمون: تلوار اور قلم کی حرمت کا امین۔خالد محمود امر
پندرہواں مضمون: فطرت شناس شاعر۔اختر حسین سندھو

سید شبیہ الحسن صاحب نے ان مضامین کی صورت میں مستقبل کے ان محققین کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کی ہے جو محولہ بالا کسی بھی شخصیت کے فکروفن پر کلی یا جزوی طور پر کام کرنے کے خواہش مند ہوں۔تخلیق کار کی تخلیق میں اس کی شخصیت کے بہت سے پہلو شعوری یا لاشعوری طور پر محفوظ ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ''تصریحات'' میں شامل مواد سے تخلیق کاروں کے جذبات ونظریات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔کسی بھی مصنف کی تصانیف کے تعارف کے ساتھ ساتھ بہت سے مصنفین کا مکمل سوانحی خاکہ اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔

زندہ قومیں اپنے اَدبی سرمائے سے پہچانی جاتی ہیں۔اگر کسی معاشرے میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو سب سے پہلے وہاں کے اَدب پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد کے اٹھاون برس میں اُردو اَدب نے بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔آج کا اَدب اور ادیب جس ہمت' حوصلے اور مہارت کے ساتھ عصرِ حاضر کے مسائل اور رجحانات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنارہا ہے وہ یقینی طور پر قابلِ ستائش ہے۔سید شبیہ الحسن کی ''تصریحات'' کا بنیادی مقصد ان میں سے چند کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے۔یہ حوصلہ افزائی اور داد وتحسین چند گنے چنے افراد کے لیے نہیں بل کہ درحقیقت ہر اس تخلیق کار کے لیے ہے جو معاشرتی بے حسی کے باوجود اپنے باطن کے درد اور کرب کو اپنی تخلیقات میں سمو رہا ہے۔

''تصریحات'' بارش کا وہ پہلا قطرہ ہے جو آنے والے قطروں کے لیے مثال بنتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں معاشرتی کرب کے ساتھ ساتھ موجودہ اَدبی صورت حال کا دیانت دارانہ تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔مختلف اہلِ قلم کی کتابوں کی اندرونی فہرستیں' فلیپ اور دیباچوں کے حوالے سے اہم اَدبی

شخصیات کی آرا اور سید شبیہ الحسن کا خوب صورت اُسلوب اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اہم اخبارات اور رسائل میں مذکورہ ادیب یا تصنیف کے حوالے سے بے لاگ تبصروں کے مختلف اقتباسات بھی ''تصریحات'' میں شامل کیے گئے ہیں۔

''ڈاکٹر آغا سہیل کی اُدبی جہتیں'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے :

> ''ڈاکٹر آغا سہیل ایک خلاقانہ ذہن کے مالک ہیں۔ چیزوں کو معروضی انداز سے پرکھنے کے ہنر نے انھیں تحقیق، تنقید اور تدوین کی صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ آغا سہیل کے بے شمار تحقیقی اور تنقیدی کارنامے ان کے استدلالی فکر اور معروضی نقطہ نظر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے ذاتی عناد اور مصلحت کوشی سے قطع نظر کرتے ہوئے عمر بھر تنقید و تحقیق کی خدمت کی ہے اور اسی بنا پر عصرِ حاضر کے تمام ناقدین ان کی صلاحیتوں کے معترف نظر آتے ہیں''۔ (ص ۴۰)

سید شبیہ الحسن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ تحقیق و تنقید کے عمل کے دوران متعلقہ مصنف یا تصنیف کے حوالے سے کوئی نہ کوئی ایسا دائرہ یا موضوع تلاش کر لیتے ہیں جو اس کی سوچ کا محور و مرکز ہوتا ہے اور پھر اس کو ایسی دیانت داری سے بیان کرتے ہیں کہ اکثر مقامات پر قاری ان کا ہم نوا ہو جاتا ہے۔ یہی ایک اچھے محقق اور ناقد کی اہم خوبی ہے۔ ''تصریحات'' اُدب کے عروج اور معاشرت کے زوال کی کہانی ہے۔ جن اہلِ علم و ہنر نے ناقص تقلید سے بچتے ہوئے صاف اور رشتہ انداز میں اُدبی خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف ناقدین اُدب پر واجب ہے۔ ایسے ہی معتبر افراد میں سے چند ایک کے حوالے سے شبیہ الحسن کی اس اُدبی خدمت کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

''تصریحات'' اُردو اُدب میں قابلِ قدر اضافہ ہے جو افراد زبان و اُدب کی ترقی اور فروغ میں کوشاں ہیں وہ ضرور اس کتاب کی اشاعت کی پذیرائی کریں گے۔

کسی بھی ملک کا اُدب اس کے تمدن کے تابع ہوتا ہے۔ جو معاشرہ جس رنگ میں ڈوبا ہو اس کی جھلک اس کے اُدب میں نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے ''تصریحات'' کو عصرِ حاضر میں ہونے والی ان کاوشوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جن کا ایک مقصد اپنے دور کے تہذیبی و تمدنی سرمائے کی حفاظت بھی ہے۔ یہی تہذیبی رنگ ہمارے اُدب کے تنوع اور ''تصریحات'' کی افادیت کا باعث ہے۔ ''اُدب کا مسیحا...... ڈاکٹر طاہر تونسوی'' میں سید شبیہ الحسن نے اُدب میں ''سطحیت'' اور ''ابہام'' کا سب سے بڑا سبب واضح نقطہ نظر کے فقدان کو قرار دیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ہمیں اِدھر اُدھر کی تمہیدات کے بجائے براہ راست اپنا مدّعا پیش کرنا چاہیے۔ کیوں کہ براہِ راست گفت گو سے بات کی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

> ''عصرِ حاضر میں قارئین کی حقیقی معنوں میں سمت نمائی کرنے والوں میں ایک معتبر نام ڈاکٹر طاہر تونسوی کا بھی ہے جو خاموش دریا کی طرح علم و اُدب کے کھیتوں کی سیرابی کر رہے ہیں۔

جب وہ ان لہلہاتے کھیتوں کو دیکھتے ہیں تو مسکرا کر کسی دوسرے خشک صحرا کی آبیاری کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو یہ علمی سمندر تھکتا ہے نہ اس کی جولانیوں میں کمی آتی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے عمر بھر بے غرضی کے ساتھ علم و ادب سے رابطہ رکھا ہے۔ جو شخص علم و ادب کا دامن تھام لے وہ معاشرے میں سُرخرو ہو جاتا ہے جب کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تو اختصاص یہ ہے کہ علم و ادب نے ان کا دامن تھام رکھا ہے۔''

(ص ۴۷)

ڈاکٹر طاہر تونسوی کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات کو جدید تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کے عمل کو سید شبیہ الحسن نے ''طاہر شناسی'' قرار دیا ہے۔ وہ علم کی قدر افزائی کا بہترین طریق عالم کی عزت افزائی کو سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کے اوصاف کا احاطہ بھی ان کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ سیّد شبیہ الحسن ''تصریحات'' کے ہر مضمون کے آغاز میں ایک مفروضہ پیش کرتے ہیں اور پھر اس مفروضے کو اپنے دلائل کی روشنی میں ثابت کرتے ہیں۔ اس انداز تحریر نے ان کے مضامین کو ایک معتبر تحقیقی و تنقیدی جہت عطا کی ہے۔

ڈاکٹر طارق عزیز وطنِ عزیز کے ایک مقبول و معروف ڈرامہ نویس ہیں اور بہت کم لوگ ان کی شاعرانہ حیثیت سے واقف ہیں۔ ''تصریحات'' میں ڈاکٹر طارق عزیز کی شاعری کے حوالے سے ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ جس میں ان کی شاعری کی سنجیدہ تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بھرپور ناقدانہ جائزہ ہے جو ڈاکٹر طارق عزیز کے شعری مجموعے ''جلاوطن'' کے محاسن کو منظرِ عام پر لایا ہے۔ مضمون کے آغاز میں مجموعے کے عنوان ''جلاوطن'' کے انتخاب کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے شاعر کی دانش مندانہ سوچ کا مظہر اور شعری کائنات کے قفل کی کلید قرار دیا گیا ہے۔ طارق عزیز نے اپنے شعری نظام میں جلاوطنی کی جو شکلیں اُجاگر کی ہیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے انھیں سات اقسام میں بیان کیا ہے:

ا) وہ شخص جسے جبراً ملک بدر کر دیا جائے۔

ب) وہ شخص جو حالات سے مجبور ہو کر وطن چھوڑ دے۔

ج) وہ شخص جو اپنے گھر میں بھی اجنبی ہو جائے۔

د) وہ شخص جو ملکی معاملات سے کنارہ کش ہو جائے۔

ر) وہ شخص جو اپنے ہی دیس میں مسافر کہلائے۔

س) وہ شخص جسے اپنے خواب کی تعبیر نہ ملے۔

ص) وہ شخص جو اپنے تہذیبی اقدار سے کٹ گیا ہو''۔ (ص ۱۱۰، ۱۱۱)

اسی مضمون میں ایک مقام پر سید شبیہ الحسن لکھتے ہیں کہ ہمارا المیہ ہے کہ ہم آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ہم نے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک ایسی الم ناک صورت حال ہے جو ہمیں بڑھتے ہوئے معاشی،

معاشرتی اور تہذیبی مسائل کے باعث درپیش ہے۔ شبیہ الحسن کا مؤقف ہے کہ بے دار آنکھوں کے خواب معاشرے کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری والے مضمون میں ان کی تازہ تصانیف ''توضیحات'' ''مطالعات'' اور ''تعبیرات'' کے حوالے سے خصوصی گفت گو کی گئی ہے۔ اس مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''......وہ اپنے موضوع کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کی دل شکنی انھیں کسی صورت میں گوارا نہیں لیکن جب وہ تنقیدی مسند پر جلوہ آرا ہوتے ہیں تو ہر ایک خورد و کلاں میں انصاف کرتے ہیں۔ وہ معاصر تنقیدی رویوں سے اچھی طرح باخبر ہیں لیکن وہ بے خبروں پر بھی اپنی علمیت کا رعب نہیں جماتے''۔ (ص ۱۴۰)

''سید وصی الحسن نقاش کی شاعری'' میں ادب اور مذہب کے باہمی ربط کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ شعر و ادب کے لیے اعلیٰ اقدار کو بنیاد کا درجہ دیا گیا ہے اور شاعری میں عقیدے کے بھرپور اظہار کی حمایت کی گئی ہے۔ سید شبیہ الحسن نے شاعری کو خاندانوں اور قبیلوں سے اوپر کی شے کہا ہے جسے کسی تعریف کے شکنجے میں پابند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔ اسی مضمون میں اجتماعی عقیدت کو انفرادی عقیدت پر فوقیت دیتے ہوئے اجتماعی عقیدت کی حمایت کی گئی ہے۔ سید شبیہ الحسن ''ڈاکٹر محمد صالح کے'' طاہر مضامین'' میں لکھتے ہیں:

''دانش مندوں نے مہذب معاشرے کی ایک نشانی یہ بھی بتائی ہے کہ وہاں علم و ادب کی پذیرائی ہوتی ہے اور اشراف شعر و ادب تخلیق کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بل کہ ناز برداری کرتے ہیں''

(ص ۱۷۵)

ان مضامین کے ذریعے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تحقیقی و تنقیدی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مضامین میں متعلقہ تخلیق اور تخلیق کار کے ساتھ ساتھ شبیہ الحسن کے ذاتی تجربات و احساسات کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ وہ صاف اور سیدھے انداز میں بات کرتے ہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ اور جدید تنقیدی اصطلاحات کے لیے ان کے اُسلوب میں کوئی جگہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کے لیے ان مضامین کے حوالے سے سید شبیہ الحسن کے تنقیدی نظریات واضح ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں بارہا ادب اور روایت کے تعلق کی اہمیت بیان کی ہے۔ وہ جدت کی تلاش میں ماضی کی روشن اقدار کو فراموش کرنے کے قائل نہیں۔

''تصریحات'' کے مضامین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ سید شبیہ الحسن نے معاشرتی کرب کو ادبی صورتِ حال کے ساتھ مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے آج کے ادبی اُفق کے اسرار کی تفہیم کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور تہذیبی رجحانات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ''تصریحات'' ایک ایسی بنیاد ہے جس پر مستقبل کا محقق ایک بلند اور مضبوط تحقیقی عمارت قائم کرے گا اور عصرِ حاضر کے علمی و ادبی رجحانات سے بہتر انداز میں متعارف ہو سکے گا۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن "تصریحات" کے آئینے میں

سعید احمد سعید

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ماہ نامہ 'شام و سحر' کے مدیر کے طور پر اُدبی حلقوں میں مقبول و معروف ہیں۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کے کٹھن شعبوں سے اپنی گہری وابستگی کا ثبوت ایم۔ فل اور پی۔ ایچ ڈی کے مقالات کی صورت میں فراہم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی طبع زاد اور مرتبہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ گویا کہ انھوں نے بطور ایک محقق اور نقاد علمی و اُدبی حلقوں کے اندر پورے ملک میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص اپنی پہچان کرالی ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی کتاب "تصریحات" تحقیق و تنقید سے ان کی گہری وابستگی کا ایک منھ بولتا ثبوت ہے جو پندرہ مضامین پر مشتمل دو سواڑتالیس صفحات کی ایک خوب صورت اور نفیس کتاب ہے۔ کتاب کے سرورق پر سورج تاریکی دُور کرتے ہوئے طلوع ہوتا دکھایا گیا ہے۔ مجھے ایسے لگا جیسے صاحب زادہ سید شبیہ الحسن علم و اُدب کے مشرقی اُفق پر سے نئی جہتوں اور نئی سوچوں کے ساتھ طلوع ہو رہے ہیں جب کہ کتاب کی پشت پر منفرد انداز سے بحیثیت "Orator" تھری پیس کے ساتھ ایک خوب صورت تصویر چھپی ہے جس سے ان کی بھرپور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اُدبی اصناف میں تحقیق و تنقید کو ایک مشکل صنف تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے تنقیدی مضامین کو ایسے دل کش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایسے لگتا ہے کہ قاری نے کڑوی دوائی کے کئی کیپسول نگل لیے ہیں جس کا اندازہ اُس کو نگلنے کے بعد ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنی کتاب 'تصریحات' کا پہلا مضمون آغا سہیل کی اُدبی جہتیں سے شروع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی طاہر تونسوی کو اُدب کا مسیحا کہتے ہیں تو کبھی اشفاق حسین کو ایک مانوس اجنبی کی نظر سے

دیکھتے ہیں۔ جہاں وہ نسیم سید کی مکمل گواہی دیتے نظر آتے ہیں تو وہاں قارئین ڈاکٹر طارق عزیز اور خواب آگہی کو "Compare" کرتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ کچھ ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں تو اختر ہاشمی کا شعری منظر نامہ بھی تنقیدی نقطۂ نظر سے منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ آٹھویں مضمون میں سید وصی الحسن نقاش کی شاعری کو شاعر کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے فکر و اسلوب پر ایک خوب صورت بحث کرتے ہیں۔ صاحب کتاب نے نواں مضمون ڈاکٹر محمد صالح کے طاہر مضامین کو طہارت کی نظر سے دیکھا ہے جب کہ دسویں مضمون میں صاحب مضمون نے آفتاب کاوش کی شاعری کو بے حس معاشرے میں تحفۂ احساس کا نام دیا ہے۔ بارھویں مضمون میں جاوید صدیق بھٹی کے شعری سفر نامے کا جائزہ لیا ہے اور تیرھویں مضمون میں ضیاء الرحمٰن فاروقی کو ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں ''ان کی شاعری میں ترقی پسندوں کی طرح معاشرے سے زور آزما ہونے یا لڑائی جھگڑا کرنے کی کوشش نہیں ملتی وہ تو اپنے سادہ لوح دل کی باتیں اپنے دل رُبا محبوب اور ہر دلعزیز قارئین دونوں تک پہنچانے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے چودھویں مضمون میں خالد محمود امر کو تلوار اور قلم کی حُرمت کا امین قرار دیا ہے اور کتاب کے آخر میں جاتے ہوئے آخری مضمون میں اختر حسین سندھو کو فطرت شناس شاعر کا لقب عنایت فرمایا ہے کہ ''اختر سندھو نے اپنے خونِ جگر سے جو شعری افکار روشن کیے ہیں اُن سے ایوانِ شاعری کے دَر و بام جگمگاتے رہے ہیں ان کا درج ذیل شعر ان کا منشور شاعری قرار دیا گیا ہے:

اَشک قہر طاس پر بکھر جائیں
دل سے نکلے جو شاعری اچھی ہے

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی کتاب 'تصریحات' اپنے افکار و اسالیب کے باعث ایک اہم دستاویز ہے اور امکان ہے کہ اُردو شعر و اَدب کی تاریخ اس کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گی۔

◆◆◆

کارنامۂ خاص ''تصریحات''......ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

پروفیسر وحید عزیز

◆◆

ہماری بنیادوں میں محبت، اخوت، بھائی چارہ اور اسی قسم کی یک جہتی کے عناصر شامل ہیں۔ ہماری روایات، رسم ورواج، رہن سہن، تہذیب وتمدن غرضیکہ ہر بات میں محبت شامل ہے کیوں کہ ہمارے مذہب کی بنیاد بھی اسی پر ہے محبت جذبات کے ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے اور جذبات شعروادب کے بغیر ادھورے محسوس ہوتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں ہمارے شعروادب کا حال اگرچہ کچھ بہتر نہیں ہے مگر اس کے باوجود کچھ کندھے ایسے مضبوط ہیں جنھوں نے اُدب کو اس کے روایتی اقدار کے ساتھ سنبھالنے اور عام لوگوں تک اسے جدید رنگ مگر مکمل اور اصل روایت کے ساتھ پہنچانے کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے اگرچہ ایسے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں مگر ان کے عزائم اس قدر مضبوط ہیں کہ جب ان لوگوں کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو عاشقان شعروادب کو حوصلہ دیتا ہے کہ ہمارا شعروادب ناتواں نہیں ہے اور نہ ہی بے آسرا ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن، ایسے ہی عظیم لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے عصرِ حاضر کے اُدب کی ڈوبتی ناؤ کو اپنے علم کے چپوؤں کا سہارا دیا ہے تاکہ شعروادب کی ناؤ طوفانی تھپیڑوں کا مقابلہ کر سکے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہمارے اُدب کا ایسا نام ہے جنھوں نے تعصب سے پاک ہو کر اُدب کی خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تقریباً ۱۵ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر کتابیں تحقیق وتنقید کے حوالے سے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اپنے کام میں اس لیے بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک نظر آتے ہیں کیوں کہ آپ سیّد وحید الحسن ہاشمی، جیسے محقق کے ہاں پیدا ہوئے جنھیں عصرِ حاضر کے اُدب کا بادشاہ بھی کہا جاتا ہے آپ وحید عصر سیّد وحید الحسن ہاشمی کے سائے میں پل کر جوان ہوئے اُدب کے رموز سیکھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر

مٹی ذرخیز ہوتو فصل عمدہ ہوتی ہے اس کی بڑی مثال ڈاکٹر شبیہ الحسن ہیں سید وحید الحسن ہاشمی کی تربیت اور اَدبی انداز کی جھلک فرزند وحید عصر میں بھی نظر آتی ہے۔

۲۰۰۵ء میں شائع ہونے والی کتاب ''تصریحات'' آپ کی اَدب پر تحقیق وتنقید کا منھ بولتا ثبوت ہے آپ نے مذکورہ کتاب میں اپنے ہم عصر قلم نگاروں کے کارناموں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ متعارف کروانے کی کوشش کی ہے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن متحرک انسان ہیں جنھوں نے ہمیشہ صرف اَدب کی بہتری کے بارے میں سوچا ہے اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ کو فہم وفراست سے نوازا ہے جانشین وحید عصر سید وحید الحسن ہاشمی نے ''تصریحات'' میں بھی ایسے تنقیدی وتحقیقی مقالے قلم بند کیے ہیں جس کی مثال آسانی سے نہیں ملتی ہے اپنے ہم عصر قلم نگاروں کے بارے میں کچھ بھی تحریر کرنا آسان نہیں بل کہ بہت ہی مشکل ہے اور کسی حد تک تو ناممکن بھی نظر آتا ہے مگر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے یہ کام ''تصریحات'' میں اس قدر خوش اُسلوبی اور بہتری کے ساتھ کیا کہ دل بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ آپ عصر حاضر کے اَدب کے شہزادے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہر وقت جدوجہد میں رہتے ہیں ہمیشہ مسکراتے چہرے کے ساتھ ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں اور یہ ہی خوش خلقی اور خوش اُسلوبی آپ کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا ذکر کرتے ہیں تو حال ہی میں آپ کی شائع ہونے والی کتاب سید وحید الحسن ہاشمی کی جہتیں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے ڈاکٹر صاحب نے وحید عصر پر کتاب بیٹا بن کر نہیں بل کہ ایک محقق اور تنقید نگار بن کر لکھی ہے یہ کتاب سید وحید الحسن ہاشمی پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے بہتر کتاب ہے آپ کے قلم سے نکلنے والے الفاظ آپ کے اندر کے علم وفن کی عکاسی کرتے ہیں اور اس مادی دَور میں کچھ دیر کے لیے انسان کو پریشانیوں سے بے خبر کر دیتے ہیں ایسا لکھنے کا ہنر اللہ تبارک وتعالیٰ بہت کم لوگوں کو عطا کرتا ہے اور جسے یہ ہنر مل جائے تو وہ اَدب کی دنیا کا شہزادہ بن جاتا ہے اور ناقابلِ فراموش ہو جاتا ہے۔

جہانِ اَدب کو انٹرویو دیتے ہوئے ۱۱ جنوری ۲۰۰۶ء کو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ عصرِ حاضر میں علامہ اقبال سا شاعر اس لیے پیدا نہ ہو سکا کیوں کہ میر حسن جیسا اُستاد نہ دستیاب ہو سکا۔ آپ اُردو غزل گوئی کو ہمارے شعری معاشرے کی آبرو قرار دیتے ہیں ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ اچھا تنقید نگار ہی اچھا تخلیق کار ہوتا ہے کیوں کہ ہر انسان تنقید نگار ہی اچھا تخلیق کار ہوتا ہے کیوں کہ ہر انسان تنقید کرتا ہے اور اسی تنقید کے دوران وہ تخلیقی صلاحیتوں سے بھی واقف ہوتا ہے ۲۰۰۶ء میں ڈاکٹر صاحب کی تقریباً سات کتابیں شائع ہونے والی ہیں ان میں سے کچھ تو منظر پر آ کر تہلکہ بھی مچا چکی ہیں۔

اپنے منفرد انداز تحریر اور تحقیق کی بدولت بلاشبہ ڈاکٹر شبیہ الحسن اَدب کے اس مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی خواہش ہر تنقید نگار محقق شاعر اور ادیب کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شاعری بھی عام شاعروں سے قدرے ہٹ کر ہے بہترین ناقد ہونے کی بدولت آپ بہترین تخلیق کار ہیں آپ کی ایک غزل کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

سنو گے تم میری آواز گنبدوں کی طرح
میں فرش خاک پہ بھاری ہوں پربتوں کی طرح
میں اپنے کعبہ دل کو سجا کے بیٹھا ہوں
اُتر کے آئے گا وہ شخص آیتوں کی طرح

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن 'شام وسحر' رسالے کے اعزازی مدیر بھی ہیں اس مادی دَور میں اَدبی رسالہ شائع کرنا جہاد کے مترادف ہے، اس لیے کہ اَدب کی ناقدری نے اَدب سے جڑی ہر چیز کی قدر و قیمت کم کر دی ہے مگر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اپنے اس فرض کو بھی بخوبی نبھا رہے ہیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تصانیف پر ایک نظر ڈالتے ہیں......

مفاہیم (تحقیقی وتنقیدی مقالات) ترجیحات (انعام یافتہ) (تحقیقی وتنقیدی مقالات) اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (تحقیقی وتنقیدی مقالات) باقیاتِ آلِ رضا (سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین) آلِ رضا کا فن غزل گوئی (تحقیق وتنقید) جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی شخصیت وفن شام وسحر کی باتیں (ماہنامہ شام وسحر لاہور کے اداریے) آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن) کلیاتِ حبیب (حبیبؔ جون پوری کے کلام کی تدوین) العطش (سید وحیدالحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین) منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین) مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحیدالحسن ہاشمی (تحقیق وتنقید) سید وحیدالحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (نعت، سلام، نوحہ، منقبت) تصریحات (تحقیق وتنقید) اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق وتنقید) زیر طبع کتابوں میں لکھنؤ کی اُردو شاعری (بیسویں صدی میں) اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف (تحقیق وتنقیدی مقالات) درج بالا کتب ہمارے شعر واَدب پر ایسی تحقیقات ہیں جنھوں نے ہمارے شعر واَدب کو سہارا دیا ہے ڈاکٹر سید وحیدالحسن آج بھی اَدب کو اس کا اصلی مقام دلوانے کے لیے دن رات مصروفِ عمل ہیں اور انتھک کوشش کر رہے ہیں کہ اَدب کو اس کا اصل مقام مل جائے آخر میں عصرِ حاضر کے شہزادہ اَدب کو اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تبارک تعالیٰ آپ کو لمبی اور خیر والی عمر عطا کرے اور آپ یوں ہی اَدب کی خدمت کرتے رہیں۔ (آمین)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۴ فروری ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تصریحات

نعیم فاطمہ علوی

◆◆

اللہ تعالیٰ نے جب کسی اثاثے کو بچانا ہو۔ انسانیت کو جھنجوڑنا ہو۔ تنبیہ کرنا ہو۔ یا راستہ دکھانا ہو۔ تو لوگوں میں سے ہی کچھ لوگ ایسے پیدا کر دیتا ہے۔ جو انسانیت کا درد دل میں بسائے۔ سود و زیاں سے مبرا ہو کر اپنی ذات سے بے پرواہ ہو کر لوگوں کی فلاح کا سوچنے لگتے ہیں۔ مختلف شعبوں میں مختلف لوگ ہاتھوں میں شمع اٹھائے انسانیت کی اندھیر نگری کو منور کرتے چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن بھی انہی لوگوں میں سے ہیں دیکھنے کو تو وہ ایک فرد ہیں۔ مگر اپنے اندر ایک ادارہ سمیٹے ہوئے اندھیر نگری کو منور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ اُردو کی اَدبی حیثیت کو اس کا جائز مقام دلوانے کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں...... اس خود غرض زمانے میں جہاں لوگوں کے پاس اپنے لیے وقت نہیں ہوتا وہ نو آموز ادیبوں اور شاعروں کا ہاتھ تھامے انھیں اپنے شانہ بشانہ چلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں...... ہم نے تو صرف لوگوں کو ٹانگ کھینچتے، مذاق اُڑاتے، پھبتیاں کستے، زخمی کرتے، کیچڑ اچھالتے، حسد۔ بغض۔ عداوت اور پچھاڑتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔ کسی کی تعریف کرنا، کسی کے فن کو سراہنا، ہاتھ تھام کر آگے بڑھانا۔ بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے...... وہ اس بے حس اور بنجر معاشرے میں پھول کاشت کرتے ہیں اور خزاں کے موسم میں املتاس کے پھولوں کی مہک سے نہ صرف خود معطر ہوتے ہیں۔ بل کہ قاری کو بھی گل و گلزار کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک درد مند انسان اور روشن فکر تخلیق کار ہیں ان کی روشنی خیالی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ مایوس نہیں ہوتے بل کہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں سے بھی اُمید کی کرنیں ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ بحیثیت قوم ہمارے اخلاقی رویوں کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ ہم کسی کو داد دینا تو درکنار کسی کی طرف مسکرا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب کے تخلیق کردہ مضامین کو دیکھیے کہ انھوں نے اپنے معاصرین کی تخلیقی کاوشوں کو

نہ صرف دل کھول کر سراہا ہے بل کہ ان کی اُدبی جہتوں کو نئے نئے زوایے اور معنی عطا کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سچے اور کھرے نقاد کی حیثیت سے ان کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا۔ جو ان کی مثبت سوچ کا آئینہ دار ہے۔

وہ ''اُدب کا مسیحا'' میں فرماتے ہیں کہ اُدب کا بنیادی مقصد قارئین کی سمت نمائی کرنا ہوتا ہے۔ یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ ہمارے بیشتر تخلیق کار اپنے تخلیقی سفر کی سمت سے نا آشنا ہیں۔ اور جب تخلیق کاروں کی اپنی سمت متعین نہ ہو تو وہ کسی قاری کا قبلہ کیسے درست کر سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں اُدب میں ''سطحیت'' اور ''ابہام'' کا سب سے بڑا سبب واضح نقطہ نظر کا فقدان ہے، ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''وہ تو ایسے اُدبی مسیحا ہیں۔ جنھوں نے اُدبی گورستان میں پڑے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کو حیات تازہ عطا کی اب آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ جو دوسروں کو اُدبی زندگی عطا کر سکتا ہے اس کی اُدبی وفات کس طرح ہو سکتی ہے۔''

اُدب کے معیار کے حوالے سے انھوں نے بہت اچھی بات کی ہے کہ بعض تخلیق کار خود اپنی تخلیقات کے بوجھ تلے پس کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔

میں سوچ رہی ہوں اگر میں تصریحات کا مطالعہ نہ کرتی۔ تو مجھے نسیم سید سے متعارف ہونے کا موقع نہ ملتا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن خواہش کو ایک خاص احترام اور فاصلے سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ خواتین کو ان کی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ پرکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مرد اور عورت کی ذہنی صلاحیتوں میں تفریق کے قائل نہیں۔ نسیم سید کا تعارف کرواتے ہوئے کتنی سچی۔ صاف اور کھری بات کی ہے کہ:

> ''وہ اُردو کے معتبر اور سنجیدہ ناقدین نے اُردو شاعرات کی فنی حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، اس صورت حال کے برعکس بعض ناقدین نے گل رو شاعرات کے دیدہ زیب شعری مجموعوں پر جو آراء پیش کی ہیں۔ وہ ان کی حیثیت اور مقام کو مجروح کرنے کا سبب بنی ہیں۔''

نسیم سید کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے ان کے طرزیہ لب ولہجے۔ غم کی آفاقیت ان کے متنوع معاشرتی مسائل...... عورت کی انانیت۔ اخلاقی اقدار کے خاتمے کا نوحہ غرض رنگارنگ پہلو نمایاں کیے ہیں۔ اور ان کی شاعری کے متنوع موضوعات کو بڑی ہی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر طارق عزیز جنھیں لوگ ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے انتہائی مہارت کے ساتھ ان کی شاعرانہ جہتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ یہ مضمون پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ایک اچھے نقاد کی نظر کس طرح سمندروں میں چھپے موتیوں کو تلاش کر لیتی ہے۔ اُدب کی بے حرمتی اور ادیب کی ناقدری کا احساس ڈاکٹر صاحب کے مضامین میں جابجا نظر آتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ ''تخلیق کار کا نشتر قارئین سے اقداری اور

مقداری دونوں سطحوں پر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔" میں سمجھتی ہوں ایسے حالات میں اگر چند مردِ مجاہد فکر کی آبیاری کا بیڑہ اُٹھاتے ہیں۔ تو وہ یقیناً جہاد کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر فخر الحق نوری کا تعارف کرواتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ان کی اُدبی خدمات کو جس طرح متعارف کروایا ہے۔ یہ ان ہی کا خاصہ ہے۔ اپنے ہم عصروں سے کسی قسم کی مسابقت کا رویہ ان کے مزاج میں نظر نہیں آتا۔ وہ دل کھول کر اپنے ہم عصروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو سراہتے ہیں۔ اور یہی ان کا بڑا پن ہے۔ جو انھیں باقی لوگوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چند مجنوں ایسے ہیں جو ایوانِ علم اُدب کی تزئین و آرائش میں مصروف ہیں۔ نہ تو انھیں اُدب کش ہوائیں خوف زدہ کرتی ہیں۔ اور نہ منفعت طبع انھیں اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر کرتی ہے۔ ان افراد نے علم واَدب کی ترویج کو اپنا مطمع نظر بنالیا ہے۔ اور وہ شبانہ روز اپنے کام میں مصروف ہیں۔"

میرے مزاج میں ایک چیز بہت حاوی ہے کہ جب تک میرا ماحول۔ اجلا۔ نکھرا سنورا نہ ہو گردو پیش ترتیب و توازن نہ ہو میں کوئی تخلیقی کام نہیں کر سکتی۔ مگر تصریحات کے مطالعے کی محویت کا یہ عالم تھا...... دودھ اُبلا...... ہنڈیا جلی مگر کتاب ہاتھ سے نہ چھٹی...... ہر مضمون کا پہلا پیراگراف...... اتنا جامع اتنا جان دار اتنا معنی خیز ہے۔ کہ قاری کو اپنے طلسم میں جکڑ لیتا ہے...... آپ اختر ہاشمی کا شعری منظر نامہ دیکھیں...... سید وصی الحسن نقاش کی شاعری دیکھیں ڈاکٹر محمد صالح طاہر کے مضامین ہوں۔ یا شکیل جاذب کی شعری کھنک۔ آفتاب کاوش کا تحفہ احساس ہو یا جاوید صدیق بھٹی کا شعری سفر نامہ ضیا الرحمٰن فاروقی ہوں یا خالد محمود اُمر...... ہر ایک کا انتخاب لاجواب اور تعارف مکمل اور جامع ہے......

وہ معاشرے کی بے حسی کا گلہ کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ انھیں زمانے سے معاشرے سے لوگوں سے شکوہ بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم ایک ایسے بنجر معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جہاں سنجیدہ شعر واَدب سے ربط رکھنا جگ ہنسائی کا موجب بن گیا ہے۔"

"لوح وقلم کو چھوڑ کر ہمارا رشتہ اپنی پُر جمال تہذیب سے ٹوٹ گیا ہے۔"

پھر ایک جگہ مذکور ہے:

"ہم ایک ایسے بنجر اور غیر تخلیقی عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں تخلیق کار کی پذیرائی تو دور کی بات ہے ان کا وجود بھی معاشرے پر گراں گزرتا ہے۔"

انھیں اپنے معاشرے سے گلہ، شکوہ اور شکایت بھی ہے۔ جس میں یقیناً اپنائیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ ان اقدار کو اپنانا چاہتے ہیں۔ جو ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہیں۔ وہ اُدب کو اس کا جائز مقام دلانا چاہتے ہیں۔ وہ مایوسی کی اتھاہ

گہرائیوں میں بھی روشنی کی کرنیں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''ہمارا شعری و نثری اَدب وقیع بھی ہے اور پائیدار بھی اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عصر حاضر کا اَدب لوگوں میں شعور بھی پیدا کر رہا ہے اور ذوق بھی۔ اب یہ کام ناقدین اَدب کا ہے کہ وہ اَدبی ذخار میں سے جوہر قابل تلاش کر کے قارئین کے سامنے لائیں اور ان کی فکری تربیت کریں۔''

وہ نو آموز کی فکری تربیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب نظریہ نعرہ بن جاتا ہے تو اس کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے''

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں:

''شہرت معیار سے حاصل ہوتی ہے مقدار سے نہیں''

قاری کو فکری تربیت کے سلسلے میں ان کا واضح نقطہ نظر کچھ یوں ہے:

''شعروادب میں دھڑے بندی۔ خودنمائی اور سطحی سیاست کے کوئی معنی نہیں ہوتے میرا واضح نقطہ نظر یہ ہے کہ منافقانہ سیاسی، سطحی دھڑے بندی یا دیدہ زیب اشتہارات کسی بھی معمولی تحریر کو ارفع سطح تک نہیں پہنچا سکتے اگر آپ کے کام میں قوت اور تاثیر ہے تو وہ باقی رہے گا ورنہ گھاس پھوس کی طرح اڑ جائے گا۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن اَدب میں معنویت کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کیا کہتے ہیں:

''مذہب اور شاعری کی ازلی اور ابدی رفاقت ہے۔ اور عظیم شاعری مذہب کے سائے میں نشوونما پاتی ہے۔ اگر کوئی شاعر دینی روایات کے حوالے سے مقدس صداقتوں کا ذکر کرے تو اس کی شاعری لافانی ہو جاتی ہے''

وہ جدید ناقدین کا موقف رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جدید ناقدین کا موقف یہ ہے کہ مذہب اخلاقی موعظت کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے لیکن اَدب و شعر کے لیے مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔''

یہ نقطہ نظر دو سطحوں پر رد کیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اَدب اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اعلیٰ مذہبی اقدار نے شعر و اَدب کو جو مواد فراہم کیا ہے اہل بینش اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔

میں ڈاکٹر صاحب کی مذہب کے بارے میں اس رائے سے میں اتفاق نہیں کرتی کیوں کہ مذہب اور دین میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مذہب پوجا پاٹ کا نام ہے۔ اور دین دستور حیات۔ پوجا پاٹ سے جنم لینے والا اَدب میرے خیال میں امر نہیں ہو سکتا۔ اس سے سطحی جذبات جنم لیتے ہیں۔ مگر دین سے وابستہ افراد اخلاق اور

فکری تربیت میں بہتر معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اس مجموعے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''عصرِ حاضر میں انسان ذاتی تشہیر اور خود نمائی کے لیے تو تن، من، دھن قربان کر دیتا ہے لیکن دوسروں کی عزت افزائی کے لیے نہ تو اس کے پاس وقت ہے، نہ لفظ نہ سرمایا۔''

میں ڈاکٹر صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں کہ انھوں نے ''تصریحات'' میں اپنے احباب اور دوستوں کی عزت افزائی کے لیے سامانِ راحت فراہم کیا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ انھوں نے ان مضامین کی تخلیق کے لیے وقت بھی نکالا۔ ان مضامین کی اشاعت کے لیے سرمایا بھی خرچ کیا اور بیش قیمت الفاظ بھی استعمال کیے۔ اس صورتِ حال میں مجھے کہنے دیجیے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہمارے عہد میں رہتے ہوئے بھی ہمارے عہد کے انسانوں سے مختلف ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنے مجموعۂ مضامین 'تصریحات' میں ڈاکٹر آغا سہیل سے لے کر اختر حسین سندھو تک تمام اہلِ قلم کا تعارف جس جامع انداز میں کرایا ہے اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ ان کے مضامین کی ایک ایک سطر سے خلوص، محبت اور دوستی کی مہک آتی ہے تاہم انھوں نے اپنی ناقدانہ بصیرت و بصارت کو پیشِ نگاہ رکھا ہے اور ہر تخلیق کار کے بارے میں دُور اندیش رائے پیش کی ہے۔ معاصرین کے بارے میں ان کے مثبت خیالات جاننے کے بعد میں تو یہی کہہ سکتی ہوں کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن عصرِ حاضر میں اُدب کے راجہ اندر ہیں۔

◆◆◆

maablib.org

تصریحات......ایک جائزہ

پروفیسر آصف وٹو

◆◆

عصرِ حاضر میں ایسے معتبر ناقدین بہت کم ہیں جو اپنے فرائض کو بطریق احسن اُدا کر رہے ہیں۔ اُن میں ایک نام ڈاکٹر شبیہ الحسن کا بھی ہے۔ وہ شب و روز اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں کہ اب قارئین اُدب تک کوئی ایسا ثمر پہنچایا جائے جو قابلِ اعتبار ہو۔ تصریحات بھی اُن کی شبانہ روز کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے فرائض بطور نقاد اُدا کیے ہیں اور اُردو اُدب کے معروف مصنفین کی حیات و تخلیقات کا خوب صورت جائزہ پیش کیا ہے۔ اور جائزہ میں انھوں نے جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ اختصار سے بھی کام لیا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا مضمون آغا سہیل صاحب کی تصنیف و تالیف اور سوانح کے بارے میں ہے اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے آغا صاحب کی حیات کا جائزہ پیش کیا جو اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس میں آغا صاحب کی متنوع جہات کا غایت نظر جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون جناب طاہر تونسوی کے بارے میں ہے اس میں انھوں نے جناب طاہر تونسوی کی ذہنی، فکری اور فنی جہات پر روشنی ڈالی ہے اور اُن کی حیات تازہ کے بارے میں مکمل، موثر اور شگفتہ تبصرہ قلم بند کیا۔ چوتھا مضمون جناب اشفاق حسین کی تصنیف و تالیف پر خوب صورت تبصرہ ہے اس میں انھوں نے اشفاق حسین صاحب کی شاعری کے مختلف رخوں کو زیر بحث لا کر محاسن کو نمایاں کیا ہے۔ پانچواں مضمون نسیم سیّد کے بارے میں ہے۔ اس میں نسیم سیّد کی شاعری کے موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اُن کی شاعری میں تمام موضوعات کو زیر بحث لانے کی کامیاب شعوری سعی کی ہے۔ چھٹا مضمون جناب ڈاکٹر طارق عزیز صاحب کے بارے میں ہے۔ حلقہ شعر و اُدب میں ڈاکٹر طارق عزیز کا نام بطور ڈرامہ نگار زیادہ جانا جاتا ہے۔ لیکن اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ

صرف ایک اچھے ڈرامہ نگار ہی نہیں بل کہ ایک پر تاثر لہجے کے شاعر بھی ہیں اس میں انھوں نے ڈاکٹر طارق عزیز کی شاعری میں خواب کی مختلف صورتوں اور مختلف مفاہیم کو اُجاگر کیا ہے۔ چھٹا مضمون جناب ڈاکٹر فخر الحق نوری صاحب کے بارے میں ہے اس میں انھوں نے نوری صاحب کی معتدی حیات کا جائزہ لیا ہے اور انھوں نے ان کی تصانیف پر مدلل تبصرہ قلم بند کیا ہے۔ اس میں انھوں نے نوری صاحب کی حیات کے مختلف گوشوں کو بڑی خوب صورتی سے دائرہ اختصار میں قلم بند کیا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ دریا کوزے میں بند ہے۔ ساتواں مضمون جناب اختر ہاشمی صاحب کے بارے میں ہے۔ اس میں اختر ہاشمی صاحب کی نعتیہ شاعری کی جلوہ گری کی ایک خوب صورت جھلک دکھائی گئی ہے آٹھواں مضمون جناب وصی الحسن نقاش کی شاعری کے بارے میں ہے۔ اس میں انھوں نے وصی الحسن کی آل محمدؐ سے عقیدت اور شاعری کے مختلف گوشوں کی جلوہ گری پیش کی ہے۔ نواں مضمون جناب ڈاکٹر محمد صالح کے بارے میں۔ اس میں انھوں نے ڈاکٹر محمد صالح کے مضامین پر سیر حال بحث کی' دسواں مضمون جناب شکیل جاذب کے بارے میں ہے اس میں انھوں نے جناب جاذب صاحب کی مخصوص لہجے کی موثر شاعری کے تمام رخوں پر اس طرح نظر ڈالی ہے کہ شکیل جاذب کی انفرادیت اوران کا شعری وقار و معیار سامنے آ گیا ہے۔ گیارھویں مضمون میں آفتاب کاوش کی شعری تخلیق پر ایک نظر ڈالی گئی ہے بارھویں مضمون میں جاوید صدیق بھٹی کی شعری خوب صورتی کی جھلک نمایاں کی گئی ہے تیرھویں مضمون میں ضیا الرحمٰن کی دردمندانہ شاعرانہ کا تبصرہ پیش کیا گیا ہے چودھویں مضمون میں خالد محمود امر کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے اور پندرھویں مضمون میں اختر حسین سندھو کی شاعری کے بارے میں اپنی رائے انھوں نے قلم بند کی ہے۔

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی نئی تخلیقی کاوش ''تصریحات''

پروفیسر میر حماد الرحمنٰ میرؔ

◆◆

یہ مضمون دراصل میری اس ناقص رائے کی ترجمانی ہے جو میں نے اُستاد الاساتذہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مضامین پر مشتمل کتاب ''تصریحات'' کو پڑھنے کے بعد قائم کی ہے۔ یہ مجموعہ عصرِ حاضر کی اُن پندرہ عظیم نابغۂ روزگار اَدبی شخصیات کا جامع تذکرہ ہے، جنھوں نے اپنی غیر معمولی شعری یا نثری تخلیقات کی بدولت اُردو اَدب کے اُفق پر کہکشاں کا سا مقام حاصل کرلیا ہے اور یہ آسمان کی سیر کرنے والی اَدبی سڑک پندرہ ستاروں پر مشتمل ہے جن میں ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر طاہر تونسوی، اشفاق حسین، نسیم سیّد، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر فخر الحق نوری، اختر ہاشمی، سیّد وصی الحسن نقاش، ڈاکٹر محمد صالح، شکیل جاذب، آفتاب کاوش، جاوید صدیق بھٹی، ضیاء الرحمٰن فاروقی، خالد محمود امر اور اختر حسین سندھو شامل ہیں۔ اگر کوئی کمی محسوس ہوئی ہے تو صرف ''چاند'' کی۔ یعنی اس ''سُبحۃ المرجان'' میں ''امام'' کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میری مراد اُستادِ محترم ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہیں۔ اب یا تو کسرِ نفسی مانع ہوگئی کہ موصوف بھی روایت پرستی کا شکار ہیں یعنی دوسروں کے اَدبی محاسن اور اسالیب اُجاگر کرتے کرتے اپنی ذات اور شخصیت کی بات کرنا یہاں ''اپنے منھ میاں مٹھو'' سمجھا جاتا ہے۔ کیا خوب فرما گئے ہیں حضرت امام ناسخ کہ ''شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں۔''

بہرحال حقیقت تو یہ ہے کہ قبلہ ڈاکٹر صاحب اس قحط الرجال کے دور میں علم و اَدب کی بے لوث خدمت کسی ستائش کی پرواہ اور صلے کی تمنا کے بغیر سرانجام دے رہے ہیں۔ میری خدا سے یہ دُعا ہے کہ وہ محترم المقام میر کاروانِ اَدب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب کی علمی و اَدبی خدمات کا سلسلہ اسی آب و تاب سے جاری و ساری رکھے۔ اب میں اپنے اصل موضوع ''تصریحات کا جائزہ'' پر آتا ہوں۔ ''تصریحات'' میں صاحبِ مضامین نے اپنی ممدوح شخصیات کے فنی اسرار و رموز اُجاگر کیے ہیں اس طرح گزشتہ ربع صدی میں نمایاں

ہونے والے محققین و معاصرین اُدب میں منفرد حیثیت کے حامل صاحب قلم نے جو ایک علمی و اُدبی خانوادے کا لائق فرزند ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع المطالعہ اور کثیر الجہات شخصیت بھی ہے۔ اپنی تازہ ترین تنقیدی تصنیف ''تصریحات'' رقم کر کے نہ صرف معاصرین کے بارے میں اظہار خیال کر کے حق اُدا کر دیا ہے بل کہ ساتھ ہی آئندہ اہلِ قلم نوجوان نسل پر تحقیق و تنقید کے لیے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے۔

تصریحات کا پہلا مضمون ''آغا سہیل کی اُدبی جہتیں'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں ڈاکٹر آغا سہیل کے سوانحی کوائف کے ذیل میں اُن کی ولادت' خاندان' تعلیم' ملازمت' تصانیف' اسفار' اعزازات' اُدب پروری اور علم پروری کا احاطہ کرنے کے ساتھ اُن کی زندگی میں پیش آنے والے اہم واقعات کو بھی زمانی ترتیب سے پیش کر دیا گیا ہے۔ جس سے یہ مضمون اُدبی اہمیت کا حامل ہونے کے علاوہ تاریخی عنصر بھی اپنے اندر رکھتا ہے جب کہ مضمون نگار کی رائے کو معتبر علمی و اُدبی شخصیات کی تائید کے علاوہ مختلف موقر جرائد کے اعتراف کی حمایت بھی شامل ہے۔

یہی انداز انھوں نے ڈاکٹر طاہر تونسوی کے بارے میں اختیار کیا ہے جب کہ یہ انداز دیگر مضامین میں مفقود ہے جس سے یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ موصوف کو ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر طاہر تونسوی سے خصوصی عقیدت ہے اور وہ ان دو شخصیات کی زندگی کا کوئی بھی اہم گوشہ ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتے۔

''تصریحات'' اُدبی نظر سے بھی جدید اُردو اُدب میں خاص اور ممتاز حیثیت کی حامل ہوگی کہ اس کا طرزِ بیاں نرالا اور زبان شستہ ہے۔ منتخب اشعار میں بھی چستی اور روانی پائی جاتی ہے۔ موصوف کا اشہب قلم سادگی اور بے تکلفی سے حسن اور توانائی کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا ہے اس کا رُخ زمانے کی تسلیم شدہ معیاری نثر کی طرح ہے۔ ''انداز بیان اگر چہ بہت شوخ نہیں ہے'' مگر باتیں دل میں اُتر جانے والی ہیں اور باتیں بھی کیا ہیں کہ موتی کی لڑیاں ہیں یا مصری کی ڈلیاں ہیں۔

''تصریحات'' کے مضامین کی مثال ایسے ہے جیسے ریشم کا کیڑا اپنے لعاب سے ریشم تیار کرتا جاتا ہے یعنی بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور مضمون بن جاتا ہے۔ گویا خیالات کا تانتا بندھا ہوا ہے اور وہ بھی مسلسل اور مترتب جو بناوٹی نہیں ہے اس بات کا مشاہدہ ''نسیم سید کی مکمل گواہی'' ''ڈاکٹر طارق عزیز اور خواب آگہی'' اور ''اختر ہاشمی کا شعری منظر نامہ'' میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ''تصریحات'' ایک عظیم اُدبی کارنامہ ہے کہ کسی دور میں بھی اس سے چشم پوشی نہ کی جا سکے گی۔ قدم قدم پر اُدب کے گل بوٹوں کی مہک ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ صاحب ''تصریحات'' اپنی تحریر میں خوددار اور مخلص ہیں وہی لکھا جسے ان کے ضمیر نے قبول کیا۔ اپنے قلم کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ کرایہ کا ٹٹو بن کر رہ جائے اور جس کا جو جی چاہے فرمائش کر کے لکھوا لے۔ اس سلسلے میں خود ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب کا اپنا بیان ''صرف ایک بات'' میں ملاحظہ ہو جائے'' میں عام

طور پر ستائش باہمی قسم کی تقریبات میں کم کم شریک ہوتا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میں فرمائشی قسم کے مضامین لکھنے سے اجتناب کرتا ہوں۔"

محض سیدھے سادے لفظ جمع کر دینا اور سپاٹ اور بے لطف' بے جان تحریر لکھنا نہ لکھنے سے بہتر ہے' یقیناً "تصریحات" میں جو سلاست کے ساتھ لطفِ بیان اور اثر ہے قبلہ ڈاکٹر صاحب کے باکمال ادیب ہونے کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کے یہ مضامین اُردو اَدب میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سیرت نگاری کے لمحے بھی ہیں اور اَدبی تنقید اور تبصرہ نگاری بھی اپنے شباب پر دکھائی دیتی ہے نیز کردار نگاری' سماجی پس منظر' ذاتی واقفیت' معروضی اندازِ بیان اور زبان و بیان کی صحت اور وضاحت کی بنا پر یہ مرقع بہت اہم اور دل کش ہیں جو دورِ حاضر کے ادبیات کا قرینہ ہیں۔ میں اپنی گزارشات سید شبیہ الحسن صاحب کے اس شعر پر تمام کرتا ہوں کہ جس کے مصداق اُن کی "تصریحات" بھی ہے :

نگاہِ اہلِ قلم نے گرا دیا تھا جسے
کتاب میں اُسی مضموں کا اقتباس ملا

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی نئی تخلیق...... ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' مختصر تاثر

ڈاکٹر سلیم اختر

◆◆

اگر مرثیہ کو ام الاصناف قرار دیا جائے تو اسے مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس میں مثنوی جیسی طوالت کے ساتھ واقعات گوئی سے منسوب تفصیلات و جزئیات کا موثر بیان اسے Epic کی سطح تک لے جاتا ہے جب کہ ''درد و غم کتنے کیے جمع'' کی صورت میں واقعہ کربلا اور امام عالی مقام کی شہادت کا بیان مرثیہ کو ارسطو کے ''بوطیقا'' میں بیان کردہ تصورِ المیہ کے مماثل ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں شہادت کے واقعات پر آہ و بکا کرنے والے حاضرین کے لیے یہ کیتھارسس کا موجب بھی بنتا ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی کی بنا پر مرثیہ، قصیدے کی تشبیب کا رنگ اختیار کر لیتا ہے تو حضرت امام حسینؑ کی اصول پرستی، مستقل مزاجی اور باطل کے آگے سر نہ جھکانے کے باعث، مرثیہ عام انسانوں کو اعلیٰ مقاصد کی خاطر جان قربان کر دینے کی تلقین بھی کرتا ہے اور ان سب پر مستزاد مرثیہ میں اظہار و اُسلوب کی کوملتا جو اسے غزل کا ہم پلہ بنا دیتی ہے۔ اسی لیے عقیدہ و مسلک سے قطع نظر، ہر زمانہ کے شعرائے اگر مرثیہ قلم بند کیا تو ہر عہد کے ناقدین نے اس کی فنی خوبیوں کی تحسین کی۔ میری اس بات پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' (تحقیق و تنقید) میں یوں اضافہ کیا کہ اگر ایک طرف ''مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں'' تلاش کیں دوسری طرف ''مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ'' بھی لیا۔ یوں دیکھیں تو واقعی مرثیہ ہمہ جہت صنف اور جامع الاصناف قرار پاتا ہے اور درحقیقت اسی میں اس کی توانائی اور کشش مضمر ہے۔

بپا پر پوت کی ضرب المثل اگر صحیح صورت میں دیکھنی ہو تو پھر سید وحید الحسن ہاشمی اور ان کے فرزند ارجمند شبیہ الحسن کو دیکھیے کہ یہاں نسلی تفاوت کے برعکس بپا اور پوت یک رنگ نظر آتے ہیں۔ جن کرداری اوصاف نے وحید الحسن ہاشمی صاحب کو مقبول و منظور بنایا، اطوار کے وہی انداز صاحب زادہ میں بھی نظر آتے ہیں

اور اسی لیے باپ بیٹا دونوں کی شخصیت دل نواز ہے۔ جہاں تک ان دونوں کی مرثیہ سے دل چسپی کا تعلق ہے تو بقول شبیہ الحسن:

"میں ایک ایسے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں مرثیہ سننا محض ثواب اخروی ہی نہیں بل کہ اس کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنا بھی مرثیے کے فروغ کا ایک ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔"

اس لیے باپ نے اگر مرثیہ گوئی میں سند فضیلت حاصل کی اور "وحید عصر" قرار پائے تو بیٹے نے میزان نقد اٹھالی اور تحقیق کا محدب شیشہ سنبھالا اور تازہ تالیف "اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار" اس کا ثبوت ہے۔ جیسا کہ نام سے مغالطہ ہوتا ہے کہ نہ یہ کتاب اُردو مرثیہ کی مفصل تاریخ ہے اور نہ ہی یہ اُردو مرثیہ نگاروں کا تذکرہ یا تنقیدی محاکمہ یا تحسین ہے۔ پہلے دو ابواب مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں اور مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ...... مرثیہ کے فن، تکنیک، موضوعات اور اسالیب سے متعلق فنی مباحث کے لیے وقف ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کثیر المطالعہ نقاد اور محقق ہیں (کہ مطالعہ کے بغیر نقاد اور محقق بننا ناممکن ہوتا ہے) اور انھوں نے ان ابواب میں ٹیکنیکل مباحث کو بڑے سلیقہ سے سمیٹا ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس ضمن میں کوئی انقلابی بات یا چونکا دینے والے نتائج نہیں نکالے لیکن ایک اچھے اُستاد (کہ یہ ان کا پیشہ ہے) کی مانند "موضوع سے وابستہ" معلومات اور کوائف بڑے سلیقہ اور مہارت سے پیش کرتے ہوئے اپنے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ بحیثیت ایک سُنّی، جو بات مجھے بہت اچھی لگی وہ یہ کہ شبیہ الحسن نے کسی موقعہ پر بھی حقائق اور منطق پر عقیدہ کو حاوی نہیں ہونے دیا (ویسے عام زندگی میں بھی پدر و فرزند کا یہی رویہ ہے کہ تعصب (اور اس کے پیدا کردہ غلو سے بے گانہ ہیں) یوں سمجھیے کہ ایک شیعہ نے مرثیہ پر ایسی کتاب لکھ دی جسے سُنّی بھی بلا خوف و کھٹکے پڑھ سکتا ہے اور اسی غیر متعصبانہ اور علمی انداز میں شبیہ الحسن نے اُردو دنیا کے بعض معروف مرثیہ نگاروں کے فن کا تحقیقی مطالعہ اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ مقالات کی تفصیل یوں ہے:

۱۔ مرزا دبیر...... چند حقائق، چند معروضات
۲۔ آلِ رضا کا سنِ ولادت...... چند معروضی حقائق
۳۔ نسیم امروہوی کی تخلیقات کا موضوعاتی منظر نامہ
۴۔ قیصر اقلیم مرثیہ...... قیصر بارہوی
۵۔ ایک معتبر مرثیہ نگار...... سید وحید الحسن ہاشمی
۶۔ سیف زلفی...... مرثیے کی ایک توانا آواز۔

ظاہر ہے کہ اس مختصر تحریر میں تمام مقالات پر بحث ممکن نہیں تاہم واردات مطالعہ جو چمک دار فقرے ملے ان میں سے چند پیش ہیں:

- ''توحید پر ہمارے ایمان نے ہمیں فنون کے ایک خاص وصف سے نوازا ہے اور وہ وصف یہ ہے کہ ہم ایک کو مختلف صورتوں میں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (ص:۵۴)
- ''شعروادب میں ایسے واقعات زیادہ اہم قرار پاتے ہیں جو انسان کی اجتماعی زندگی اور معاشرت پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔'' (ص:۱۵۵)
- ''عصر حاضر کے انحطاط پذیر معاشرے میں اخلاقی قدروں کی آبیاری کرنا جہاد سے کم نہیں۔'' (ص:۲۲۷)
- ''جدت روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔'' (ص:۲۳۶)

ڈاکٹر پروفیسر سیّد شبیہ الحسن نے بڑی محنت اور ریاضت سے ناقدین اور محققین میں نام اور مقام پیدا کیا ہے، وہ ''کاتی، اور لے بھاگی، کے برعکس ''بیچ پکے سوبیٹھا'' کا قائل ہے اسی لیے زود نویس نہیں بل کہ جو لکھتا ہے سوچ سمجھ کر، نہ جانے کب سے وہ اس کتاب پر کام کر رہا ہوگا۔ بہر حال محنت رنگ لائی اور ایسی کتاب تالیف کرنے میں کامیاب رہا جو جدید مرثیہ سے دل چسپی رکھنے والے ناقدین کے لیے لازمی مطالعہ ضرور پاتی ہے۔

◆◆◆

اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار

حسن عسکری کاظمی

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا اشہبِ قلم تحقیق اور تخلیق کی سرزمینوں میں جس برق رفتاری کے ساتھ دوڑ رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بہت کم وقت میں اُردو شعر و ادب کی مختلف اصناف کے حوالے سے جتنا کام کیا اس کا احاطہ کرنے میں معقول وقت درکار ہے۔ صرف صنفِ مرثیہ پر ان کی اہم تصانیف اور تالیفات کی بھی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین کے علاوہ سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں ''العطش'' کی تین جلدیں مدون کیں، ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا، نقد و نظر کا معیار دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سید شبیہ الحسن گہرائی اور گیرائی کے ساتھ محاکمہ کرتے ہوئے ان تمام فنی اور معنوی محاسن سے بحث کرتے ہیں جو ان مرثیوں کے ادبی مقام کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، ابھی چند کتابیں زیرِ طبع ہیں جن میں اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف، لاہور کا دبستانِ مرثیہ اور سیف زلفی کے مراثی ان کے تحقیقی اور تخلیقی کارناموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہوں گے، فی الوقت ان کی تازہ ترین تصنیف ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' پر گفت گو کرنا مقصود ہے۔ یہ خوب صورت کتاب اظہار سنز لاہور نے شائع کی، یہ ادارہ معیاری اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرنے کی روایت پر قائم ہے اور کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' تحقیق اور تنقید کے معیار پر کس حد تک پورا اُترتی ہے اس پر اُردو اَدب کا ہر قاری اپنی رائے اور تبصرہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ سید شبیہ الحسن کا یہ کہنا درست ہے کہ اس کتاب میں صنفِ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے بیشتر ہم عصر ناقدین کی آراء کو شاملِ اشاعت کرتے ہوئے اس کتاب کو نہ صرف وقیع بنایا بل کہ اپنے قاری کو ان ناقدین کی ژرف بینی، صحتِ رائے اور سندِ اعتبار کا حوالہ پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا ان میں شبلی نعمانی، رام بابو سکسینہ،

عشرت رحمانی، احسن فاروقی، وقار عظیم، فراق گورکھ پوری، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سید صفدر حسین، خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر عبیداللہ، آغا سہیل، اسلم قریشی، میمونہ انصاری، وحید قریشی، مظفر عباس، احمد عقیل روبی، وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر سلیم اختر، انتظار حسین اور ڈاکٹر حسن رضوی جیسے معتبر نام اس امر کی شہادت ہیں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تحقیق کرتے ہوئے اپنا دامن مطالعہ کشادہ رکھا۔ اس طرح انھوں نے کراچی کے قلم کاروں اور نقادوں کی تحریریں بھی پیش نظر رکھیں ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نسیم امروہوی، ہلال نقوی، ضمیر اختر، طاہر کاظمی، جون ایلیا، تصور حسین نقوی اور بہت سے دوسرے اہل قلم کا حرف حرف پڑھا۔ ہندستان اور انگلستان کی معروف شخصیتوں کی آراء کو بھی زیر مطالعہ رکھا، ان میں مہدی نظمی، ڈاکٹر شارب ردولوی، عاشور کاظمی اور اکبر حیدری جیسے ناقدوں تک رسائی حاصل کی۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا مگر سید شبیہ الحسن کی ہمت اور بلند حوصلگی نے یہ کام آسان کر دیا اور وہ زیر تبصرہ کتاب ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اس کتاب میں مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں تلاش کرنے کی خاطر لکھنؤ کی شعری فضا اور اس کے اثرات وثمرات پر تفصیلی جائزہ، مرثیے کے فروغ وعروج کے حوالے سے بحث اور مرثیے اور ڈرامے کے تہذیبی فرق اور مرثیے کی منفرد حیثیت کا تعین ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی شعور کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس صنف شاعری کا دوسرا کوئی نعم البدل نہیں، حقیقت بھی یہ ہے کہ بقول ڈاکٹر سید صفدر حسین ''اودھ کی تہذیب بھی ہندستان کی اس عظیم تہذیب کا عکس تھی جس نے کبھی دلی میں عروج پایا تھا لیکن اب دلی ماند پڑ رہی تھی اور لکھنؤ عروج پر تھا''۔ اس طرح رام بابو سکسینہ نے سچ کی بات کہی کہ مرثیے میں اس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے اس کی اَدب آموزی ایسے وقت میں جب دنیائے شاعری عیش پسند درباروں کی خوشامد اور تتبع میں نہایت ادنیٰ اور رکیک جذبات کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی قابل صد ہزار آفرین ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ بھی نہایت عمدہ صورت میں ہمارے سامنے رکھا۔ اور یہ ثابت کیا کہ مدح کا مشترکہ عنصر اپنی جگہ لیکن درحقیقت مرثیہ اپنی وسعت کے اعتبار سے قصیدے کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اگر یہ دونوں اصناف اپنی قدامت میں عہد موجود کی نسل کے ذوق مطالعہ کے معیار پر رکھی جائیں تو یقیناً صنف مرثیہ میں وہی تازگی اور ندرت نظر آئے گی جو کسی دوسری صنف شاعری کا طرۂ امتیاز کہلاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جدید مرثیہ ایجاز واختصار کا آئینہ دار ہے اور اس میں غیر ضروری تفصیل کی بجائے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر کام کی باتیں بیان کی جاتی ہیں، تلوار اور گھوڑا یا مبارز طلبی جیسے مضامین مرثیے سے خارج ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جہاں ایک طرف مفاہیم، ترجیحات، آلِ رضا کا فن غزل گوئی، جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی، کلیاتِ حبیبؔ اور لکھنؤ کی اُردو شاعری جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا اور تنقید وتحقیق کا حق ادا کیا وہاں

''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' جیسی کتاب مرتب کر کے اپنے تنقیدی شعور کا لوہا منوایا۔ البتہ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شبیہ الحسن نے کتاب کے عنوان کو سامنے رکھتے ہوئے جو کچھ لکھا اس میں مرزا دبیر، آل رضا، نسیم امروہوی، قیصر بارہوی، وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی کے مرثیوں پر گفت گو کی اور یوں ان کی نگاہ دوسرے نہایت معتبر، ہم عصر اور مستند مرثیہ نگاروں پر نہیں پڑی حالاں کہ ان کا یہ اعتراف بھی ہے کہ ''میں نے نجم آفندی، جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، آل رضا، شاہد نقوی، قیصر بارہوی، سیف زلفی اور وحید الحسن ہاشمی جیسے منفرد مرثیہ نگاروں کے مرثیے سنے اور مرثیے کی فکری وفنی حیثیت کے حوالے سے پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید سجاد رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسے بلند پایہ ناقدین ومفکرین کی گفت گو سنی ہے''۔ کتاب میں مرزا دبیر پر صفحہ ۵۳ سے ۷۲ صفحے پر کل ۲۰ صفحے، آل رضا پر ۷۳ سے ۸۶ کل ۱۴ صفحے، نسیم امروہوی پر ۸۷ سے ۱۱۶ کل ۳۰ صفحے، قیصر بارہوی پر ۳۰ صفحے، وحید الحسن ہاشمی پر ۹۰ صفحے اور سیف زلفی پر کل ۲۰ صفحے صرف ہوئے، یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا زورِ تحقیق وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی پر تمام ہوا۔ جہاں یہ کتاب ہماری معلومات میں بعض امور سے متعلق اضافہ کرنے کا باعث بنی وہاں تشنگی کا احساس غالب رہا کہ ان کا دائرہ تحقیق بہت سے ہم عصر شعرا کے گرد نہ کھنچا ان میں امید فاضلی، ڈاکٹر صفدر حسین، سردار نقوی، ہلال نقوی اور دوسرے بہت سے مرثیہ نگار جن کی فہرست طویل ہے مگر غیر معتبر نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن آئندہ اپنی تحقیق کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے دوسرے مرثیہ نگار شعرا کو بھی اسی طرح متعارف کروانے میں اخلاص عمل کا ثبوت فراہم کریں گے۔

شہزاد احمد نے ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ کتاب جدید اور کلاسیکی مرثیے پر ایک جامع کتاب ہے...... چناں چہ یہ کتاب مرثیے کا ایک تعارف بھی ہے، مرثیے پر تنقید بھی ہے اور ان امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو مستقبل قریب میں رونما ہونے والی ہیں''۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مرثیہ فہمی کا مظہر۔ اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار

ڈاکٹر نواز حسن زیدی

◆◆

"اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار" پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ۲۰۰۴ء میں شائع ہونے والی اوّلین تخلیق ہے جسے اظہار سنز نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتاب کا سرورق نہایت دیدہ زیب، جاذبِ نظر اور موضوع کا عکاس ہے۔ ۳۳۶ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی قابلیت، تخلیقی صلاحیت، تنقیدی شعور اور اَدب دوستی کا ایک اور ثبوت ہے جسے انھوں نے اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر عبادت بریلوی (مرحوم) اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی (مرحوم) کے نام مسنون کیا ہے۔

کتاب کا عنوان پڑھتے ہی ذہن میں یہ تصور اُبھرتا ہے کہ "اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار" مرثیہ کی تاریخ ہو گی لیکن ڈاکٹر صاحب نے دیباچے ہی میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے یہ سطور لکھ دی ہیں:

> اس کتاب میں صنفِ مرثیہ اور مرثیہ نگاری کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔"

ڈاکٹر شبیہ الحسن اس خانوادے کے مرتبہ دان ہیں جو صدیوں سے شعر و اَدب کے فلک پر قوس قزح کے رنگ بکھیر رہا ہے۔ ان کے دادا صفا الٰہ آبادی، تایا حبیب جون پوری، چچازاد اختر ہاشمی اپنے اپنے شعری مدار میں محوِ سفر ہیں اور والدِ محترم سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نصف صدی کو محیط علمی و اَدبی خدمات کے اعتراف میں انھیں "وحیدِ عصر" کا خطاب بھی دیا جاچکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھیں اپنے عہد کے معروف مرثیہ نگاروں نجم آفندی، نسیم امروہوی، قیصر بارہوی، جوشؔ ملیح آبادی، سیّد آلِ رضا، سیف زلفی اور شاہد نقوی کی زبانی ان کے مرثیے سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ علاوہ ازیں ان کے اساتذہ میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر

وحید قریشی، ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سہیل احمد خاں جیسے اُدب کے نوگزے شامل ہیں۔ موصوف کی بیسیوں دیگر تصانیف کی طرح زیرِ مطالعہ تصنیف بھی ان کے بحرِ علمی، تحقیقی ذوق، مرثیہ سے قلمی لگاؤ اور اُدب کی خدمت کے ذوق کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

کتاب کا آغاز مرثیہ کی تاریخ سے کیا گیا ہے۔ مرثیہ کے خالصتاً ہندستانی صنف ہونے کے حوالے سے معتبر کتب سے اقتباس درج کیے گئے ہیں۔ جنوبی ہند میں آنکھ کھولنے والی یہ صنف لکھنؤ کی مٹی میں پروان چڑھی۔ ڈاکٹر صاحب تحقیقی اصولوں سے فائدے اٹھاتے ہوئے اُردو مرثیہ کو دیگر اصنافِ سخن کے ہم پلہ قرار دینے کے لیے معتبر حوالے تلاش کیے ہیں۔ اس سلسلے میں مرثیے اور ڈرامے کے چند مشترکہ عناصر کی مثالیں انیسؔ و دبیرؔ کے کلام سے پیش کی گئی ہیں۔ تاہم ڈاکٹر صاحب محض چند داخلی اور خارجی مماثلتوں کی بنیاد پر مرثیے اور ڈرامے کو ایک ہی صنف قرار دینے کو ظلم اور ناانصافی پر محمول کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مرثیے اور قصیدے میں موجود مماثلتوں کے باوجود دونوں اصناف علاحدہ علاحدہ تشخص کی حامل ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں منطقی انداز اپناتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدح کے عناصر کی موجودگی میں یہ صنف قصیدے کے ذیل میں آتی ہے تو غزل جس میں محبوب کی مدح سرائی جزو لاینفک ہے قصیدہ کیوں نہیں۔''

مرثیے پر سیر حاصل بحث کے بعد مرزا دبیرؔ کی شخصیت اور ان کے فن مرثیہ گوئی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک شبلی کا موازنہ انیسؔ و دبیرؔ بلاجواز اور غیر ضروری کوشش تھی۔ ان کا موقف ہے کہ انیسؔ نے دبیرؔ کی شعری مشعل سے اپنے چراغِ مرثیہ کو روشن کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مرزا دبیرؔ کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ موقف پیش کیا ہے کہ:

> ''اُردو کلاسیکی مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کے تمام محاسن مرزا دبیرؔ کے مراثی میں مجتمع ہو گئے ہیں۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بیسویں صدی کے معروف مرثیہ نگار آلِ رضاؔ کی متنازع تاریخ پیدائش کے تعین میں بہت عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے تحقیق کے بنیادی اصولوں پر کاربند ہو کر سید آلِ رضاؔ کے سنِ ولادت کا سراغ لگایا ہے اور اس سلسلے پر بنیادی اور ثانوی مآخذ سے خوب کام لیا گیا ہے۔ کسی شخصیت کی تاریخ پیدائش کے تعین کے لیے جس خاص قسم کے ذہنی تجزیے کی جس صلاحیت کا ہونا ضروری ہے، وہ صلاحیت ڈاکٹر صاحب میں بدرجۂ اُتم موجود ہے۔

جدید دور کے مرثیہ نگاروں میں نسیمؔ امروہوی کا ایک معتبر نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ تخصیص بھی حاصل ہے کہ انھوں نے نسیمؔ امروہوی کی وفات پر ''بجھی وہ شمع'' کے عنوان سے ۱۹۸۳ء میں ایک کتاب شایع کی

تھی جو ان کی وفات کے بعد شایع ہونے والی اولین تخلیق تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے نسیم امروہوی کی شخصیت ان کے حالات زندگی اور تخلیقات کو معنی خیز حوالوں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔نسیم امروہوی اپنی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔''نسیم اللغات'' ان کا عظیم لسانی کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے غزل، سلام، قصیدے اور رباعی کی صنف میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ان کی شعری ونثری تخلیقات کی فہرست کی شمولیت نے کتاب کی وقعت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

قیصر بارہوی نے اُردو مرثیہ کو اپنی ذہنی اپج سے نئے حالات وواقعات سے ہم آہنگ کیا لیکن مرثیت کے عنصر پر آنچ نہ آنے دی۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کو ان کے مرثیوں میں موجود مقصد لے کر حوالے سے نجم آفندی، آلِ رضا، جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، جمیل مظہری اور علی سردار جعفری کے قبیلے کا فرد قرار دیا ہے۔ قیصر بارہوی نے اقلیم مرثیہ کی حدود میں وسعت کے لیے جس طرح اپنا خونِ جگر دیا ہے ڈاکٹر صاحب نے انھیں ان کی ان کاوشوں پر خراج تحسین پیش کیا ہے۔ قیصر بارہوی کے کلام کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کے شعری محاسن سے قارئین کو آگاہ ہونے کا موقع عطا کیا گیا ہے اور کل کے اُدبی مؤرخ کے لیے مستند حوالہ بھی رقم کر دیا ہے۔

یہاں ڈاکٹر صاحب کا اُسلوب ایک نئے انداز سے سامنے آتا ہے۔ وہ خود سوال پیدا کرتے ہیں پھر اپنے سوال کا مدلل جواب دیتے ہوئے علم وحکمت کی ہفت اقلیم کے دروازے کھولتے چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تحسین شعری کرتے ہوئے ان کی فنی نزاکتوں کی نشان دہی کی ہے اور قیصر بارہوی کو دبیر کا پیروکار ثابت کیا ہے۔

وحید عصر سید وحید الحسن ہاشمی کے اڑتیس جدید مختصر مرثیوں کی فہرست اور ان کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ کتاب کی ادبی وقعت اور ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ سانحہ کربلا کے اثرات سے اُردو شعروادب میں موضوعات اور اصناف کے حوالے سے جو گراں قدر اضافے ہوئے وحید عصر نصف صدی سے ان کی آبیاری میں مصروف ہیں۔

وحید عصر نے اپنے اجتہادی شعور سے کام لیتے ہوئے جدید مختصر مرثیہ کی بنیاد رکھی جو رفتہ رفتہ مقبول تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے اور بیشتر معاصرین مختصر مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے وحید عصر کے اڑتیس مرثیوں کا جو تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اس کی بدولت اس کتاب کی اُدبی حیثیت میں گراں قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ یہ جواہر ریزے جدید اُردو مرثیے کی روایت میں اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مرثیوں کے بارے میں ناقدین کی معتبر آرا اور محققین کے خیالات کو اپنی تحریر میں جگہ دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش

سے تحریر کے تحقیقی معیار میں اضافہ ہوا ہے۔

وحید عصر کا شمار نجم آفندی، جمیل مظہری، جوش، آل رضا، صفدر حسین، قیصر بارہوی ایسے جدید مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے لیکن انھوں نے وقت کے تقاضوں کے ساتھ نباہتے ہوئے مرثیے کے اختصار کی جانب توجہ دلائی ہے۔ اس اجتہادی کاوش سے اُردو مرثیے کے زندہ رہنے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس سلسلے میں اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ سید وحید الحسن ہاشمی محض مرثیے کے بندوں کی تعداد گھٹانے پر زور نہیں دیتے بل کہ وہ عصری تقاضوں کے پیش نظر مرثیے کی مرثیت کو قائم رکھتے ہوئے اس کے مجموعی مزاج کو تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس لیے کہ نیا ذہن فکری ذوق کی آبیاری چاہتا ہے۔

وحید عصر نے مختصر مرثیہ کی جس تحریک کا آغاز کیا اس کے بارے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اسے محض تجربہ قرار دیا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے موصوف کے موقف کو نہایت دل چسپ دلیل کے ساتھ رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اگر انھوں نے اس تحریک سے متاثر ہونے والے شعرا کی فہرست تشکیل دی انھیں اپنے آپ کو بھی یقیناً اس فہرست میں شامل کرنا پڑے گا۔''

کتاب کے آخری مرثیہ نگار سیف زلفی ہیں۔ سیف زلفی کے مرثیے کے علاوہ شاعری کی گونج میں مرثیہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے سیف زلفی کی سوانح اور اس کی تخلیقات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ سیف زلفی وقت کی عدم توجہی کا شکار ہو کر قعرِ گمنامی میں چلے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس عظیم شاعر کے چہرے پر پڑی ہوئی وقت کی گرد کو ہٹاتے ہوئے ان کے غیر مطبوعہ مرثیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کاوش سے یہ مرثیے اہلِ نظر کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے منظرِ عام پر نہ آنے کے دو المیے بیان کر دیئے ہیں۔ پہلا المیہ یہ تھا کہ وہ زیادہ مرثیے لکھنا چاہتے تھے لیکن چار سے زائد مرثیے لکھ نہیں پائے۔ دوسرا المیہ مرثیوں کے مجموعے کی عدم اشاعت ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے مرثیوں کی اشاعت میں تاخیر کو ایک اُدبی نقصان قرار دیا ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اُردو اُدب میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بالخصوص مرثیے سے دل چسپی رکھنے والوں کے ذوقِ طبع کے لیے اس کتاب کی تحقیقی و تنقیدی جہت ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا اُسلوب نگارش دل نشیں، سادہ، شگفتہ اور رواں ہے۔ انھوں نے ابلاغ کے تقاضوں کو اہمیت دی ہے اور تحقیق کے مسلم اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مواد کو امتیاز بخشا ہے۔ امید ہے ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کی سابقہ کتب کی طرح یہ تخلیق بھی اہلِ علم و فن سے پذیرائی کا خراج وصول کرے گی۔

◆◆◆

صراطِ مستقیم پر چلنے والا

ڈاکٹر سلیم اختر

◆◆

اچھا خاکہ لکھنے کی ترکیب کیا ہے؟

گرو نے اس کے لیے یہ نسخہ بتایا۔ سب سے پہلے اپنے آپ پر خاکہ کی ہنڈیا اُسلوب کے چولہے پر چڑھا دو اس کے بعد اس میں خاکہ کا موضوع بننے والی شخصیت کی خامیوں بوالعجبیوں اور حماقتوں کا گرم مصالحہ ڈالو اور پھر لطیفوں کا تڑکا لگا دو...... خاکہ کی لذیذ ڈش تیار۔

شبیہ الحسن پر خاکہ قلم بند کرنے کا ارادہ باندھا تو خاکہ نگار کا یہ نسخہ کارآمد نہ پایا۔ اس لیے کہ میں خاک نشین اپنا خاکہ لکھ نہیں سکتا ہاں اپنا خاکہ اُڑا سکتا ہوں۔ یہ کام وقتاً فوقتاً میں اپنی تنقید کے ذریعہ سے بطریق احسن انجام دیتا رہتا ہوں۔ رہی شبیہ الحسن کی شخصیت کی خامیوں بوالعجبیوں اور حماقتوں کے گرم مصالحہ کی بات تو...... یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں! جب یہ گرم مصالحہ ہی دستیاب نہیں تو پھر لطیفوں کا تڑکہ کیسے لگے؟

پھر میں سوچتا ہوں کہ دراصل شبیہ الحسن ایسی شخصیت ہی نہیں جس پر فارمولا ٹائپ خاکہ قلم بند کیا جا سکے اس کی شخصیت کی مناسبت سے تو اس کے خاکہ کے لیے نیا فارمولا ساخت کرنا پڑے گا۔ ایسا فارمولا جس میں خامیوں کی جگہ مقصد کی دھن والا پختہ ذہن ہو جب یہ سب ہو تو لطیفوں کے تڑکے کی بھی ضرورت نہیں کہ شبیہ الحسن زبان سے لے کر کردار تک ہر نوع کی لکنت سے پاک ہے۔

سعادت حسن منٹو نے معاصر خاکہ نگاری پر یہ اعتراض کیا تھا کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا شخصیت دھوبی سے دھل کر آئی ہو لیکن کیا کیا جائے کہ شبیہ الحسن منٹو کے اس اعتراض کے عین مطابق ہے۔ واقعی یہ دھوبی سے دھلی ہوئی شخصیت کا حامل ہے۔

سفید اور اُجلے کپڑے کے ساتھ سب سے بڑی یہ خرابی ہوتی ہے کہ گندگی کی ایک چھینٹ اور سیاہی کا

ایک دھبہ بھی اس کی سفیدی کے لیے بدنما ثابت ہوتا ہے تو دوستو شبیہ الحسن بھی ایسی ہی لش لش کرتی اُجلی شخصیت ہے جس نے خود کو بڑی کاوشوں سے گندگی کی چھینٹوں اور کردار کی سیاہی سے بچائے رکھا۔

اس ضمن میں مَیں یہ بھی نہ کہوں گا۔

لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا

شبیہ الحسن صرف لٹھے دی چادر ہے' سفید اجلی اور چمکیلی چادر جس پر نہ سلیٹی' نہ سرخ' نہ پیلا...... کسی طرح کا بھی رنگ نہیں......نا ہی سفیدی۔

جب ہم اہلِ قلم چائے کی میز کے گرد گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں تو غیر حاضر دوستوں کی غیبت چائے کے ساتھ پیسٹری کا کام کرتی ہے۔ یوں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنا اعصاب کو شانت رکھنے کے لیے خاصہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ یہ بندۂ خدا اس آزمودہ نسخہ سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ برسوں کی دوستی میں مجھے ایک بھی ایسا واقعہ یاد نہیں آ رہا جب اس نے اُلی اتارنے کے بہانے اپنی زبان کو مزید آلودہ کر لیا ہو۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ ادیب ہو اور قلم کو دشنام آلودہ نہ کرے اور زبان کو پاک رکھے مگر یہ مشکل کام بھی شبیہ الحسن ہی کر سکتا ہے۔ یہ سب سے خوش' سب اس سے خوش۔ ادیب ہو کر اس شہرِ غدر میں زیست کرنا اور غیر متنازعہ ہونا بڑا کمال ہے۔

دراصل شبیہ الحسن بنیادی طور پر بیبا انسان ہے۔ پاکستان میں بس دو ہی اور بجنل بیبے بستے ہیں ایک مَیں اور دوسرا شبیہ الحسن۔ اپنا نام تو مَیں نے یوں ہی بطور تعلّی لے دیا اصلی تے وڈا بیبا تو بس شبیہ الحسن ہی ہے۔

بزرگوں اور اساتذہ کا احترام' انکساری' وضع داری اور شریف النفسی یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر سید شبیہ الحسن۔ یہ کرداری اوصاف اس کی شخصیت میں یوں آمیز ہوئے کہ بڑے دل والا شبیہ دلدار بن گیا اور یہ بڑی بات ہے۔

شبیہ الحسن بنیادی طور پر یک رخے ذہن کا حامل ہے۔ ایسے افراد مقصد کی دھن میں نہر والی پن چکی میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو دھن کی ہے پوری کام کی پکی۔ شبیہ ایک کامیاب اور مقبول اُستاد ہے'' شام وسحر'' کا مدیر ہے' پبلک سلوشن جیسا ادارہ چلا رہا ہے۔ جب رات گئے وہ گھر آتا ہے تو...... لیکن ٹھہریئے رات کو گھر آنے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ سرِ شام گھر آتا ہے' ٹی وی دیکھتا ہے اور جی بہلاتا ہے۔ رات کو گھر آنے کے اُسلوب کا مجھے اس وقت اندازہ ہوا جب ایک شام مَیں نے گھر فون کیا تو ان کی صاحب زادی نے فون اٹھایا۔ حسبِ معمول شبیہ گھر میں نہ تھا۔

میں نے پوچھا۔

''ابو کب آ جائیں گے۔''

جواب ملا۔

"انکل! جب ابو رات کو گیارہ بجے تک آ جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ابو آج جلد گھر آ گئے ہیں۔"

رات گئے گھر آتے کے بعد وہ خراٹے لینے کے بجائے لکھنے پڑھنے کا کام کرتا رہتا ہے۔ بے خواب راتوں کا ثمر اسے تیس کتابوں کی صورت میں حاصل ہوا۔ رات کے پچھلے پہر سویا اور اگلی صبح وقت پر تیار۔ نئے سورج کے استقبال کے لیے۔

مقصد بل کہ مقاصد کی اسی دُھن نے شبیہ الحسن کو راہِ زیست پر گامزن بل کہ تیز گام رکھا ہے لیکن ایسی تیز گامی بھی نہیں کہ خانہ اور اہلِ خانہ کو بھول جائے۔ شبیہ الحسن جس احسن طریقہ سے گھر والوں کے حقوق ادا کر رہا ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔ جس لگن سے والد محترم قبلہ سید وحید الحسن ہاشمی کی خدمت کر رہا ہے وہ فقید المثال ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی خوش قسمت ہیں کہ ان کے تین بیٹوں شبیہ، عرفی ہاشمی اور نقاش ہاشمی کا قلم و قرطاس سے رشتہ استوار ہے۔ ایں ہمہ خانہ آفتاب است!

یہاں تک لکھ کر سوچ رہا ہوں کہ میں نے شاید کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی، یہی نہیں بل کہ تحلیل نفسی کی چھلنی سے شبیہ الحسن کی شخصیت بھی نہ چھانی، نہ کردار کی کجروی اُجاگر کی نہ اس کی فرسٹریشن کا تجزیہ کیا اور نہ ہی اسے ابنارمل ثابت کیا۔ یہ خاکہ تو میرے انداز و اُسلوب کا حامل نہیں۔ میں جب تک شاخِ گل میں افعی نہ دیکھ لوں مجھے تو مزا ہی نہیں آتا مگر کیا کروں یہ مردِ شریف صراطِ مستقیم پر گامزن ہے۔ اس لیے اس کی نفسیات، غیر نفسیاتی طریقوں سے ہی اُجاگر ہو سکتی ہے۔

محمد آصف وٹو کی تالیف "ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات" کے فلیپ کے لیے جو لکھا اس خاکہ کا اختتام کر رہا ہوں کہ اس میں شبیہ الحسن جیسی بڑی کتاب کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر سید شبیہ الحسن کی شخصیت کئی جہات کی حامل ہے۔ معلم، محقق، ناقد تو ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ نفیس طبیعت انسان اور لطیف مزاج ادیب بھی ہیں، دوستوں کی دل داری اور دل نوازی اضافی صفات ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے لیے زندگی کام کے مترادف ہے۔ متنوع مصروفیات کے باوجود انھوں نے تحقیق تنقید کی اتنی کتابیں کیسے تحریر کر لیں اور ان پر مستزاد سلیقے سے مرتب کی گئیں کتب۔ یقیناً ان کے قبضے میں کوئی جن ہے اگر ایسا نہیں تو پھر وہ خود ایک جن ہے، بوتل میں بند نہیں بل کہ بوتل سے باہر، اب یہ جداگانہ بات کہ سید شبیہ الحسن نے محنت ہی کو اپنے لیے "بوتل" بنا لیا ہے...... جہاں یہ کتاب ایک مردِ شریف کا تعارف کراتی ہے وہیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ زندگی میں روشنی کا باعث محنت ہی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی تو روشنی کی مثال ہیں۔

◆◆◆

سمندر کی طرح کشادہ شبیہ الحسن

ڈاکٹر اجمل نیازی

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے دل میں ایک بہت خوب صورت، کشادہ اور بامعنی دنیا رکھتا ہے۔ اس دنیا میں کئی دنیائیں آباد ہیں، اَدبی دنیا، علمی دنیا، اُستادانہ دنیا اور دوستانہ دنیا۔ اس کے علاوہ بھی اُس کے دل میں کئی دنیائیں آباد ہیں جن کا مجھے علم تو ہے لیکن میں اُن کا ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے اُس کے سارے گھر سے ایک نسبت اور وابستگی ہے۔ یہ وابستگی وارفتگی میں ڈھلتی گئی ہے۔ اس کے والدِ محترم وحیدِ عصر سیّد وحید الحسن ہاشمی صاحب ایک بہت بڑی اور بیش بہا شخصیت ہیں۔ اُن کی مہک دُور دُور تک بکھری ہوئی ہے۔ مَیں نے اُن سے علمی آسودگی کے بے شمار مزے لیے ہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور کبھی کبھی کہتے ہیں کہ نہ جانے مَیں تم سے کیوں محبت کرتا ہوں۔ میں انھیں کہتا ہوں کہ میں اس میدان میں بھی آپ سے بہت پیچھے ہوں لیکن مجھے علم ہے کہ میں آپ سے کیوں محبت کرتا ہوں۔ اس اُجڑتے ماحول میں اُن کا وجود علمی واَدبی لحاظ سے غنیمت بل کہ نعمت ہے۔ انھوں نے جو ماحول اپنے گھر میں دیا ہوگا اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ عرفی ہاشمی اور نقاش ہاشمی اپنے مزاج کے شاعر ہیں اور شریف ہاشمی شاعر دوست ہیں۔ اس خانوادے کا سب سے زیادہ نمایاں اہم اور دل کش منظر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ وہ منظر ہے جو کئی منظروں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ نوجوانی کے عالم میں بھی یہ شخص ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت رکھتا ہے۔ یہ وسیع وعریض سمندر بہت پھیلا ہوا ہے اور خود کو مزید پھیلاتا جارہا ہے۔ میں نے کام سے اتنی گہری اور سچی لگن بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ اس لگن کے ساتھ جب بے پناہ تھکن شبیہ الحسن کے ساتھ ملتی ہے تو وہ کوئی اور لگن بن جاتی ہے۔ اس لگن کی روشنی اُس کے دوستوں کی آنکھوں میں بھی مچلتی رہتی ہے۔ اُس نے ''بہت'' کام کیا ہے۔ یہاں یہ لفظ بہت اپنے پورے معنی دے رہا ہے۔ اُس نے اپنے دوستوں سے بھی بہت کام کرالیا ہے۔ وہ ایک عالی چشم اور عالی ظرف آدمی ہے۔ وہ اپنے

سارے دوستوں کو اپنے سارے راستوں پر چلنے کی اجازت دیتا ہے اور اُن کی کامیابیوں پر اپنی کامیابی سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔ یہ وہ کشش ہے جو کششِ ثقل کی طرح فطری ہے۔ دوست اسی کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور شاید وہ اس طرح کسی دوسرے کے ساتھ محبت نہیں کرتے۔ کتابیں لکھنا اور لکھوانا ڈاکٹر شبیہ الحسن کا مشغلہ ہی نہیں مسئلہ بھی ہے۔ جب کوئی مشغلہ اور مسئلہ ملتے ہیں تو ایسا مرحلہ آتا ہے کہ منزل بالکل سامنے نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دھڑا دھڑ تقریبات بھی کرتا ہے اور ان تقریبات کے انعقاد میں اس کے دوست اس سے دو قدم آگے ہوتے ہیں۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ اُس کی اپنی تقریب ہے۔ مجھے بھی یہ احساس ہے کہ مَیں شبیہ الحسن کا دوست ہوں سو مَیں نے زندگی میں بہت سی تقریبات میں شرکت کی ہے اُن میں شبیہ الحسن کی تقریبات کی تعداد زیادہ ہے۔

وفا میں استقامت اب دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی ہے۔ اس میں شبیہ الحسن کو کمال حاصل ہے اور اس نے یہ کمال اپنے ساتھیوں کے لیے سنبھالا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے مجھے ہمیشہ اس پر رشک آتا ہے۔ وہ ایسا پارس ہے جس کے ساتھ مَیں نے بے شمار نوجوانوں کو مَس ہو کر سونا بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ محنت اور محبت بیک وقت اپنا پورا کام کسی دل والے آدمی کے ساتھ ہی دکھاتی ہے۔ اِس وفا کے دائرے میں اب بہت سے لوگ آتے ہیں اور اُن کا شاید سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ شبیہ الحسن کے دوست ہیں اور کمال یہ ہے کہ مجھے بھی وہ اپنے دوست لگتے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی آدمی یا طالب علم نے اپنے کسی مسئلے کے حوالے سے کوئی بات شبیہ الحسن سے کی ہو اور وہ پوری نہ کی گئی ہو۔ وہ تکمیل کی خواہش میں مبتلا انسان ہے اور اس کے خیال میں یہ تکمیل دوستوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن بہت اچھا ادیب ہے۔ شاعر بھی ہے مگر کم کم۔ شاعری تو اس کے گھر میں اُگے ہوئے تازہ پھولوں کی بہار کی طرح ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ اُس کے سارے بھائی شاعر ہیں اور وہ سارے بھائی پہلے شبیہ الحسن کے دوست ہیں اور دوستی کا راز یہ ہے کہ بھائی ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے بڑے بھائی کے دوستوں پر رشک کرتے ہیں۔

میں اہلِ سنت کے گھر پیدا ہوا مگر مجھے شیعہ ہونے کی اصل حقیقت سے آگاہ بڑے ہاشمی صاحب نے کیا۔ شیعہ دوست کو کہتے ہیں اور ہمیں تو زیادہ دوست ہونا چاہیے کہ مولا علی بہادروں کے قبیلے کے سردار ہیں اور اس قبیلے میں شامل ہو کر بہادر اور زیادہ بہادر ہو جاتا ہے۔ شبیہ الحسن اعلیٰ درجے کا محقق ہے، نقاد بھی ہے اور یہاں میں کم کم کا لفظ استعمال نہیں کرتا کہ تحقیق میں تخلیق شامل ہوتی ہے تو وہ تنقید بن جاتی ہے۔

اللہ نے شبیہ الحسن کو ایک سچا اُستاد بنا کر بھیجا ہے اور جو لوگ بھیجے جاتے ہیں وہ منتخب لوگ ہوتے ہیں۔ شبیہ الحسن کے لیے میری رائے یہی ہے کہ وہ دوستوں اور دوسروں کی مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس مدد سے مراد

یہ ہے کہ دل میں کوئی تخلیقی خوشبو پیدا کی جائے۔ میرے قبیلے کا سردار منیر نیازی کہتا ہے کہ جب کسی معاشرے میں تخلیق نہیں ہوتی تو تخریب ہوتی ہے۔ تخریب کاروں کے مقابلے کے لیے تخلیق کاروں کا ہونا ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ "کارآمد" کارروائی ہے۔ یہی نیک عمل ہے، یہی عملِ خیر ہے جسے عملِ کثیر بنایا جا رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شبیہ الحسن نے بڑا کام کیا ہے اور اچھا کام کیا ہے۔ خدا اُسے سلامت رکھے۔ اُس کی بے شمار کتابوں، خوابوں، تحریروں اور تقریروں کے علاوہ اُسے نجانے کیسے خیال آیا کہ کوئی اَدبی رسالہ بھی ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ چناں چہ وہ بیس برس سے مسلسل 'شام و سحر' کے نام سے خالصتاً تحقیقی و تہذیبی رسالہ شائع کر رہا ہے۔ اس کی ادارت شبیہ الحسن ایسے ہی کرتا ہے جیسے وہ زندہ ہے اور وہ اس طرح زندہ ہے کہ زندگی اُس کی دوست بن گئی ہے۔ چناں چہ زندگی سے کسی اور زندگی کی طرف جانے والے دوستوں کے لیے یادوں کا ایک انوکھا سلسلہ ہمیشہ وہ جاری رکھتا ہے۔ مرحوم دوست سیف زلفی اور قیصر بارہوی کے لیے اُس کی کتابیں دیکھتے ہوئے میرے دل سے اُس کے لیے بہت سی دعائیں نکلتی ہیں۔ سیف زلفی میرا بھی دوست تھا مگر شبیہ الحسن بازی لے گیا۔ دوستی میں بازی لے جانے والے کو ہمیشہ محبتوں سے دیکھا جاتا ہے۔ شبیہ الحسن صرف خود ہی کام نہیں کرتا بل کہ وہ اپنے دوستوں سے بھی ایسے کام کرا لیتا ہے۔ میرے اچھے اور بہترین مضمون صرف شبیہ الحسن کے تقاضوں کے باعث لکھے جا سکے ہیں۔ خاص طور پر آغا صاحب کے بارے میں اُس نے مجھ سے جو مضمون لکھوایا ہے وہ بڑے خاصے کی چیز ہے اور اگر شبیہ الحسن مسلسل تقاضے نہ کرتا تو میں ایسا مضمون لکھ ہی نہ پاتا۔

شبیہ الحسن نے اپنے والد سیّد وحید الحسن ہاشمی کے لیے بھی بہت کام کیا ہے۔ اب تو ان کا بے شمار کام سامنے آیا ہے اور اُن پر ہونے والا بے شمار کام بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس طرح وحید الحسن ہاشمی ایک شاندار بوڑھے آدمی ہوتے ہوئے زندہ رہنے کی ایک انوکھی لگن کا چراغ اپنے اندر جلتا ہوا محسوس کرنے لگے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ شبیہ الحسن جیسا بیٹا ہو تو اُس کا باپ مر نہیں سکتا۔ میں مر جانے کو مرنا نہیں کہتا۔ عجیب بات ہے کہ آدمی مر کر ہی امر بنتا ہے اور فرق صرف "الف" کا ہے۔ الف کی حقیقت کو جانے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ شاید یہ وہی الف ہے جس کے لیے صوفی شاعر بلھے شاہ نے کہا ہے:

تینوں اِکو الف درکار

عجیب بات یہ ہے کہ 'الف' کی معنویت میں ڈوب کر شبیہ الحسن 'الف' سے 'ی' تک پہنچنا چاہتا ہے۔ شاید وہ پہنچ بھی گیا ہو۔ میں یہ بات پورے دل اور وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ کم کم لوگ شبیہ الحسن جیسے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کچھ زیادہ ہوں تو یہ زندگی کوئی اور زندگی ہو جائے۔ خدا اسے نظرِ بد سے بچائے تا کہ یہ اسی طرح کے انہونے کام کرتا رہے۔

◆◆◆

شبیہ الحسن کی شبیہ

ڈاکٹر عبدالکریم خالد

◆◆

گول کشادہ چہرہ، پھولے ہوئے گال، خشخشی ڈاڑھی، جس میں ٹھوڑی کا خم بھی دکھائی دے جاتا ہے، موٹی ناک، بھاری پپوٹے، کھلی آنکھیں، سنہرے فریم کی عینک، جس کی چمک ماند پڑ چکی ہے۔ عینک اُتار کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے، جیسے تھکن اُتار رہے ہوں۔

نام ڈاکٹر شبیہ الحسن۔ بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہیں۔ والد گرامی نے شعر و ادب میں جو عروج حاصل کیا اس کے آثار ان میں بھی موجود ہیں۔ پیدا ہوئے تو اذان کے بعد مرثیے کی آواز کان میں پڑی۔ خود تو مرثیہ نہیں لکھا لیکن مرثیے اور مرثیہ گو شاعروں پر کتابوں کی کتابیں لکھ ڈالیں۔ کتاب بنانے اور اسے سلیقے سے چھاپنے میں ان کا جواب نہیں۔ کتاب لکھنے سے جلد بندی تک سارے مراحل ذاتی توجہ سے سرانجام دیتے ہیں۔ کتاب اتنی خوب صورت ہوتی ہے کہ اسے مقابلہ حسن میں رکھا جا سکتا ہے۔ کتاب چھاپنے کے بعد اسے باذوق لوگوں تک پہنچانے کا فریضہ بھی بنفس نفیس ادا کرتے ہیں۔ ہماری ذاتی لائبریری میں زیادہ تعداد ان ہی کتابوں کی ہے جو انھوں نے ہمیں بڑی محبت سے عطا کی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے ہمیں ابھی تک فراغت نہیں مل سکی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اگر ہم ان کی دستیاب کتابوں کو فی صفحہ روزانہ کے حساب سے پڑھنا شروع کریں تو اس کے لیے تقریباً دس برس درکار ہوں گے۔ مگر اس دوران میں ان کی اتنی ہی اور کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہوں گی اور یہ سلسلہ یوں ہی دراز رہے گا۔ سو ہم اس طویل سلسلے کے آغاز کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں ہیں۔

ان سے ہماری پہلی ملاقات بہت پہلے ایف سی کالج میں ہوئی۔ تب یہ ڈاکٹر نہیں تھے، محض شبیہ الحسن تھے۔ شاعری سے شغف رکھتے اور اس محترمہ کی زلف گرہ گیر سنوارنے کے سبب ایک عدد تخلص بھی فرماتے تھے۔

تخلص بھی بے ضرر سا تھا۔ یعنی حامی۔ حالاں کہ اس عمر میں لڑکے بالے پر تپی، زخمی، صبوحی، روحی اور روبی وغیرہ تخلص کیا کرتے ہیں اور ہجر و وصال کے قصے چھیڑتے ہوئے تخلص کی رعایت سے مقطع میں سخن گسترانہ بات کہہ جاتے ہیں۔ لیکن حامی تخلص میں اس نوع کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔ شریفانہ مزاج اور معصومانہ سادگی (یہ تب کی بات ہے) بھی انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کوئی چھوٹی موٹی ہامی بھرلیں اور لڑکیوں کی کلاس پڑھاتے ہوئے اگر کبھی دل مچل جائے تو اسے مچل جانے دیں۔ ان کے شاگرد بتاتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر جو اکثر بلائے بے درماں کی طرح ان پر وارد ہوتے تھے، بل کہ وارد کیے جاتے تھے وہ انیس و دبیر یا آل رضا کے مرثیے کا بکا یہ بند پڑھ کر سیل جذبات کا رخ بدل دیتے تھے اور ناکامی محبت پر رونے والوں کو کسی اور غم پر رونے کا قرینہ سکھاتے تھے۔

ہمیں کبھی کبھی گمان ہونے لگتا ہے کہ ان پر وہ جوانی آئی ہی نہیں جو راتوں کی نیندیں اُڑا دیتی ہے اور پورے وجود کی ٹہنیاں ہلا ہلا کر بُور جھاڑتی رہتی ہے۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ جوانی کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے یہ کسی وقت بھی آسکتی ہے اور کہہ کر نہیں آتی۔ زندگی کے ایک خاص دور میں بھی، جسے عرف عام میں عہد جوانی کہا جاتا ہے وہ مزاجاً کوئی بزرجمہر قسم کی شے لگتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اندر اسی نوے سال کا کوئی بابا بیٹھا ہوا ہے جس کی سفید ریش ناف کو چھو رہی ہے اور وہ ریش لہرا لہرا کر زمین پر ٹھک ٹھک عصا مارتا ہوا لڑکیوں کے آنچل درست کراتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ایسا کوئی کام نہیں بل کہ عشق کا مفہوم سمجھاتے ہوئے بھی مجازی معنے ہی بتائے لیکن اس کے باوجود ان میں نہ جانے کیا بات تھی کہ دوست احباب بھی ان کے سامنے اپنی کئی وارداتیں چھپا جاتے تھے مبادا ان کے اندر کا بابا ریش لہراتا ہوا باہر نکلے اور اپنا بھاری بھر کم عصا گمدر کی طرح گھمانا شروع کر دے۔

ایف سی کالج میں ہم لگ بھگ تیرہ برس اکٹھے رہے۔ اس دوران انھوں نے بڑے بڑے معرکے سَر کیے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اہداف طے کر کے چلتے ہیں اور پھر مجال ہے کہ کوئی ہدف نگاہ سے اِدھر اُدھر ہو جائے۔ جس کام کا ارادہ کیا اسے کر کے چھوڑا اور ایسی خوبی اور صفائی سے کیا کہ اس میں کوئی رخنہ نہ رہنے دیا۔ وفاداری بشرط استواری کے قائل ہیں۔ جس کا عملی مظاہرہ دوستوں میں کرتے ہیں۔ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، دوستی نبھائے چلے جائیں گے۔ ان کے اس یکساں رویے سے بعض اوقات اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ کبھی تو منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہلکی پھلکی ناراضی، ایک آدھ تو تکار، سرسری سی سر پھٹول ہونی چاہیے کہ دوستی اس نوع کے نشیب و فراز میں خوب چمکتی ہے۔ مگر وہ دوستی کے اس ڈھب سے ہی ناواقف ہیں۔ قدرت نے انھیں برداشت کا بے مثال حوصلہ بخشا ہے۔ مشکل حالات میں کمال حوصلگی سے کوہِ باوقار کی طرح مضبوطی سے قدم جمائے یورش زمانہ کی بے بسی کا تماشا دیکھتے ہیں۔ پُرسکون چہرہ لیے حالات کی برہمی پر ایک نظر ڈالتے

ہیں اور کسی نئے منصوبے پر کام شروع کردیتے ہیں۔

وہ اپنی اَت سنجیدہ شخصیت میں لطافت وظرافت کی پیوندکاری بھی کرتے ہیں مگر اس صفائی سے کہ سوزنِ ظرافت اسی مقام پر ٹانکا بھرتی ہے جہاں وہ چاہتے ہیں۔ ہمیں ان کی زبان فصاحت بیان کے معارف سے بھی آشنائی ہے۔ پاٹ دار آواز اپنی گھن گرج کے ساتھ سماعتوں میں لرزش پیدا کرتی اور سننے والوں کو سانس روک لینے پر مجبور کرتی ہے۔ بڑی بڑی محفلوں، اَدبی جلسوں اور ذکر وفکر کی مجلسوں میں انھیں سننے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ اپنے نثری بیان میں وہ اس ہنرمندی سے اشعار کی کرن ٹانکتے ہیں کہ ایک کوندا سا لپکتا ہے۔ برمحل اشعار کے استعمال اور موقع کی مناسبت سے معانی اخذ کرنے کا سلیقہ ان سے بہتر کون جانتا ہے۔ ان کے ذوق کی داد دینا پڑتی ہے کہ اشعار میں تنوع کا تکلف برتنے کو حیلہ رائیگاں تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں شعر کی اصل تاثیر یہ ہے کہ ایک ہی شعر عمر بھر کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور غمی خوشی ہر موقع پر کام آتا ہے۔ وہ ایک شعر اکثر پڑھتے ہیں۔ ہم وہ شعر ان کی زبانی اتنی بار سن چکے ہیں کہ اب جیسے ہی وہ اسے سنانے کا موقع پیدا کرتے ہیں تو ایک عجیب سی لہر ہمارے بدن میں سرایت کرجاتی ہے اور ہم دل ہی دل اس شعر کے ٹلنے کی دعا مانگتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنی بار سننے کے باوجود وہ شعر ہمیں یاد نہیں ہوسکا۔

ان کے شعر پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے۔ شعر پڑھنے سے پہلے ایک دو تمہیدی جملے ارشاد فرماتے ہیں۔ پھر آدھا مصرعہ پڑھ کر توقف کرتے ہیں، اس دوران میں سامعین کی توجہ جذب کرنے کے لیے ان پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ ''شعر سنیے گا، توجہ چاہوں گا'' کہہ کر پورا مصرعہ پڑھتے ہیں۔ پہلا مصرعہ مکمل کرنے کے بعد انھیں احساس ہوتا ہے کہ ابھی فضا نہیں بنی۔ چناں چہ پھیپھڑوں پر پورا زور دے کر مصرعہ دوبارہ پڑھتے ہیں۔ پھر وقفہ دیتے ہیں اور سامعین کی کیفیت کو بھانپنے کی کوشش میں صَرف ہوتے ہیں۔ اب سامعین کی یہ شدت سے خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ دوسرا مصرعہ بھی پڑھیں۔ شاید انھیں سامعین کا امتحان مقصود ہوتا یا پھر وہ خود شعر کی گرفت میں ہوتے ہیں جو انھیں دوسرا مصرعہ پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر وہ سہ بارہ مصرعہ اولیٰ پڑھتے ہیں اور ساتھ ہی مصرعہ ثانی ایک وجدانی انداز میں سنا کر شعر مکمل کرتے ہیں اور سامعین کا دَم میں دَم آتا ہے۔

ان کی تقریر دل پذیر کا احوال بھی شعر ایسا ہے۔ اکثر مثالوں اور حکایتوں سے اپنے بیان کو رونق بخشتے ہیں۔ لکھا ہوا مضمون پڑھ رہے ہوں تو ایک ایک جملے کو پورے ہِک سِک سے درست تلفظ میں ادا کرتے ہیں۔ کسی جملے پر تالی بج جائے تو اسے مکرّر ارشاد فرماتے ہیں۔ موضوع، اَدب کا ہو یا سائنس کا، خوب نبھاتے ہیں۔ البتہ سامعین کی سہولت کے لیے اکثر و بیشتر مانوس مثالیں ہی پیش کرتے ہیں تاکہ تفہیم میں آسانی رہے۔

گزشتہ چند برسوں میں ان کے اَدبی کارناموں میں یک دم اضافہ ہوا ہے جس نے ان کی شہرت اور مقبولیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ملک کے ہر چھوٹے بڑے اخبار میں ان کی کامیابیوں کے تذکرے ہیں۔ بعض

اخباروں میں تو پورے کے پورے کالم ان کی تعریف وتوصیف سے مزین ہوتے ہیں۔ شہر کی بیشتر اَدبی تقریبات کی وہ یا تو صدارت فرماتے ہیں یا مہمانِ خصوصی ہوتے ہیں۔ قد آور، اَدبی شخصیتیں ان کے اَدبی کارناموں کا ذکر کر کے ان کی شان میں رطب اللسان ہوتی ہیں۔ اور ان کے قد میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے قد بڑھنے کا عمل جس رفتار سے جاری ہے، لگتا ہے کہ آئندہ چار پانچ برس میں وہ زمین پر کھڑے کھڑے آسمان سے ستارے توڑ لائیں گے۔ اور اس کے بعد ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

وہ اُردو اَدب کی ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہیں۔ انھیں اس بات کا قلق رہتا ہے کہ اَدب میں چھوٹی چھوٹی گروہ بندیوں نے اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہیں۔ چناں چہ ''شام وسحر'' میں، جس کے وہ مدیر اعزازی ہیں، ان گروہ بندیوں کے خلاف کھل کر لکھتے ہیں۔ ان کے اداریوں کی ایک معقول تعداد صرف اسی موضوع پر ہے۔ اَدبی گروہ بندیوں کے سدباب کے لیے انھوں نے ایک اَدبی انجمن قائم کی۔ جس کا نام عالمی مجلس اَدب پاکستان رکھا ہے۔ اس کے لیے وہ پاکستان میں بیٹھ کر عالم تمام حلقہ دام خیال کرنے کی کوشش میں ہیں اور اس کام کے لیے تنِ تنہا مصروفِ کار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس انجمن کی مساعی سے ایک نئے اَدبی گروہ کے قیام میں مدد ملے گی جو کُل عالم کو محیط ہوگا اور چھوٹے چھوٹے اَدبی گروہ خود بخود اس میں ضم ہو جائیں گے۔ سردست عالمی مجلس اَدب پاکستان کے جلسے لاہور میں ہوتے ہیں۔

انھوں نے زندگی کا اصول بنا رکھا ہے۔ کام، کام اور کام۔ اسی لیے ہر وقت مصروفِ کار نظر آتے ہیں۔ محنت پر یقین رکھتے ہیں سو محنت کیے جاتے ہیں مگر اس محنت میں انھوں نے محبت کا رس ٹپکا کر اسے ثمر بار بنا دیا ہے۔

وہ اپنے اور ہمارے اُستادِ گرامی کا یہ مقولہ اکثر سناتے ہیں کہ محنت اور محبت میں ایک نقطے ہی کا تو فرق ہے۔ اُوپر آ جائے تو محنت بن جاتا ہے اور نیچے آ جائے تو محبت ہو جاتا ہے۔ بات واقعی درست ہے محنت اُوپر اُٹھاتی ہے۔ اور محبت کے لیے آدمی کو نیچے خاک پر اُترنا پڑتا ہے۔

◆◆◆

سُنو میرے بندھورے

ڈاکٹر طارق عزیز

◆◆

بات واقعی پریشانی کی تھی۔ لڑکا جوان ہو جائے، برسرِ روزگار ہو، کو ایجوکیشن میں پڑھتا اور کو ایجوکیشن میں پڑھاتا رہا ہو تو شادی فوراً ہو جانی چاہیے۔ لیکن نہ جانے کن حاسدوں نے دائرہ کھینچ دیا، کیا پڑھ کے پھونک دیا، گھر کے کس کونے میں کیا دبا دیا کہ نجیب الطرفین سید، جناب سید شبیہ الحسن کی شادی ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کئی رشتے دیکھے، بعض میں تو مَیں بھی ساتھ گیا۔ مجھے اپنے لالے پڑ گئے، بات اِن سے شروع ہوتی تھی، لگتا تھا ختم مجھ پر ہوگی...... ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اسبابِ بغاوتِ نسواں پر غور کیا گیا، کچھ نتائج سامنے آئے اور طے یہ ہوا کہ اب کی بار براہِ راست لڑکا دکھانے کی بجائے پہلے تصویر دکھائی جائے۔

فوٹو گرافی میرا شوق ہے اور یہ شوق میں نے ایسے ہی نوجوانوں کے لیے اپنایا تھا جن کی شیو بے ترتیب بڑھی ہوتی ہے اور جو اس مہذب احتجاج کے ذریعے والدین کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے بارے میں بھی کچھ سوچیں۔ اگر میرے ہنر سے کسی ایسے ہی نوجوان کی داڑھی کا باقاعدہ خط کٹتا ہے تو :

ع   نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ

کے مصداق یہ کارِ خیر کر گزرنا چاہیے۔

گورنمنٹ ایف۔ سی کالج کے لان میں شبیہ الحسن کا فوٹو سیشن ہوا۔ یہ تصویریں موسیٰ کا عصا ثابت ہوئیں۔ حاسدین کے سارے سانپ اِن تصویروں نے نگل لیے۔ آناً فاناً ہر معاملہ طے ہو گیا بلکہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا محاورہ سراپا دولہا بن کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ گاڑی سجانے اور دولہا کو لے جانے کا قرعہ بھی میرے نام نکلا۔ بارات جس راستے سے گئی تھی، اُسی راستے سے واپس آئی لیکن دولہا نے اپنی گاڑی کا روٹ تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ رات کافی بیت گئی تھی۔ مَیں سمجھا شاید کوئی شارٹ کٹ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مَیں نے کہا" اتنی

بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی گھر پہنچ جائیں گے......'' بولے'' وہ بات نہیں۔ سلام کے لیے پہلے کربلا گاہے شاہ جانا چاہتا ہوں......'' میرا سر عقیدت سے جھک گیا۔ سبحان اللہ، کیا صبر ہے، کیا جبر ہے کہ کس حالت میں کہاں کی بجائے کہاں جا رہے ہیں۔ چوں کہ شادی کے دن دولہا کے سامنے کوئی بول نہیں سکتا، سو میں بھی نہیں بولا۔ صرف اتنا کہا کہ اگر اُنھوں نے پوچھا کہ گھوڑے کی بجائے گاڑی پر کیوں آئے ہو تو؟'' بولے'' میں سنبھال لوں گا۔'' بہر حال دولہا اور دلہن نے اندر جا کر سلام پیش کیا۔ پارکنگ سے اندر کے راستے تک اندھیرا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے واچ کرتا رہا کہ جاتے یا آتے ہوئے شبیہ الحسن دلہن سے کوئی نازیبا حرکت تو نہیں کرتے۔

شادی کے بعد شبیہ الحسن کی عادات یک سر تبدیل ہو گئیں۔ پہلے بہانے بہانے سے اورینٹل کالج جاتے تھے، اب نہ جانے کے بہانے ڈھونڈنے لگے۔ اپنی شاگردوں کو اس تواتر سے بیٹی کہنے لگے کہ عمر اور تعلق کی سُدھ بُدھ نہ رہی حتیٰ کہ ایک موقع پر اپنی ایم۔اے کی ایک پرانی ہم جماعت کو بھی ''بیٹی'' کہہ دیا۔ بعد میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کیا۔ شکر ہے یہ عادت یہیں پر ختم ہو گئی، سلسلہ بھابھی تک دراز نہیں ہوا۔

اس موقع پر شبیہ الحسن کی انگوٹھیوں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ شادی کی انگوٹھی پہنتے ہی ان کی جھجک اُتر گئی۔ انگلیوں کو انگوٹھیوں سے یوں سجا لیا جیسے اپنے سسرال والوں کو باور کرانا چاہتے ہوں کہ ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہمیں انگوٹھیاں پہنانے والے اور بھی کئی لوگ ہیں، یہ دیکھیں، یہ......'' آج بھی اُن کے ہاتھ انگوٹھیوں سے خالی نہیں لیکن اب یہ انگوٹھیاں پتھر دل دنیا کو سعد پتھروں کے بارے میں بتاتی اور اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ تم سے اچھے تو یہ پتھر ہیں۔

''پڑھانا پڑھانا'' شبیہ الحسن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ صبح سویرے سے صبح سویرے تک درس و تدریس میں مصروف رہتے ہیں۔ صحرائی اونٹ کے پانی کی طرح چھٹی کے دن چند لمحے سو کر ہفتے بھر کی نیند پوری کر لیتے ہیں۔ اس محنتِ شاقہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کا ریفریجریٹر کبھی مٹھائی سے خالی نہیں ہوتا کیوں کہ ہر مہینے کسی نہ کسی کلاس کا نتیجہ نکلتا رہتا ہے۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا ہے، پڑھانا شبیہ الحسن کا فیشن نہیں، پیشن (passion) ہے۔ میری بیٹی کنزہ نویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ چوں کہ میں اُردو کا پروفیسر ہوں لہٰذا اُس کی اُردو کافی کمزور تھی۔ میں نے شبیہ الحسن سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے فوراً حکم دیا کہ میری اکیڈمی بھیجنا شروع کر دیں۔ مَیں نے اگلے ہی دن بیٹی کو اردو سمیت چار مضامین کی فیس دے کر اکیڈمی بھیج دیا۔ بیٹی نے فیس اکیڈمی کے دفتر میں جمع کرا دی۔ اُردو کی کلاس شروع ہوئی۔ شبیہ الحسن کلاس میں آئے، انھوں نے ایک بند لفافہ میری بیٹی کو دیا اور کہا یہ اپنے ابو کو دے دینا۔ لفافہ موصول ہونے کے بعد مَیں نے اُسے کھولا تو اُس میں شبیہ الحسن کی طرف سے ایک رقعہ موجود تھا

جس پر درج تھا ''مجھے آپ سے یہ اُمید نہ تھی۔ میں کنزہ اور ایما میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں تو بھلے فیس بھیج دیں۔'' ساتھ ہی لفافے میں اُردو کی ساری فیس اور دیگر مضامین میں اچھی خاصی رعایت کے بعد بچنے والی رقم موجود تھی۔ کنزہ چار سال تک وہاں پڑھتی رہی۔ اس دوران شبیہ الحسن نے واقعی کنزہ اور ایما میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔ وہ ہر ہفتہ کی شب اسے اکیڈمی سے اپنے ساتھ گھر لے جاتے اور چار پانچ گھنٹے اضافی طور پر پڑھاتے رہتے۔ رات بہت ہو جاتی، مَیں فون کر کے پوچھتا ''میں کنزہ کو لے جاؤں؟'' تو وہ کہتے ''آپ اتنی رات گئے کیسے آئیں گے، مَیں خود چھوڑ جاتا ہوں۔'' مَیں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوچتا کہ اگر مَیں نہیں جا سکتا تو وہ کیسے آئیں گے لیکن وہ آ جاتے، بیٹی کو بحفاظت گھر پہنچانے وہ خود آ جاتے۔ اب میرا بیٹا ان کے پاس پڑھتا ہے۔ فیس کی ادائیگی کا طریقہ وہی ہے یعنی اب وہ احمد اور وجیہ الحسن میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔

جہاں تک میرے علم میں ہے، شبیہ الحسن نے کبھی مارشل لاء کو پسند نہیں کیا، اس کے باوجود انھیں گھر میں مارشل کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس عرفیت کی کوئی خاص وجہ ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق اُس دور بینی اور مستقبل شناسی سے ہو جو ابھی آپ پر ظاہر ہو سکتی ہے۔ ذرا شبیہ الحسن کی داڑھی صاف کر کے، مونچھوں کو صحیح طرح سے تراش کر دیکھیے، اندر سے جنرل پرویز مشرف نکل آئے گا۔ اس کے بعد مارشل اور مارشل لاء کا جو تعلق بنتا ہے اُسے مابعد الطبیعاتی نظام کے ساتھ جوڑ کر مزید تحقیق کی جا سکتی ہے۔

ہمارے مارشل کے اندر مارشل لاء کی جھلکیاں اُس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں جب وہ کالج کے اندر یا کالج سے باہر کسی تقریب کا اہتمام کر رہے ہوں۔ ایسے موقع پر اُن کا ہر حکم حتمی ہوتا ہے جب کہہ دیا کہ کمرے کے باہر اور سیڑھیوں کے پاس بڑے بڑے سبز پتوں والے گملے رکھے جائیں گے تو کس کی مجال ہے کہ چھوٹے پتوں والے گملے تجویز کر سکے۔ جب کہہ دیا کہ بینر پر ''تقریب پذیرائی'' لکھا جائے گا تو کون ہے جو عبارت میں حرف برابر تبدیلی کر سکے۔ جب کہہ دیا کہ تواضع میں کیک پیس، نمکو، چپس اور ٹھنڈے شامی کباب ہوں گے تو کس میں تاب ہے کہ ساتھ پیٹیز کا نام لے سکے، اور جب کہہ دیا کہ دورانِ نظامت میں نے یہ شعر پڑھنا ہے۔

دل میں مرے اب تک ہے مستی اُس بچھڑے متوالے کی
باسی پھول میں جیسے خوشبو پھول پہننے والے کی

تو کون ہے جو کہہ سکے کہ یہ شعر تو بوڑھوں سے لے کر ماؤں کی گود میں موجود بچوں تک کو یاد ہو گیا ہے، خدا کے لیے کبھی پڑھ بھی لیا کریں تا کہ کوئی اور شعر نظر سے گزر جائے۔

ہمارے ایک ڈپٹی کمشنر دوست سعید ظفر، ایس اینڈ جی اے ڈی میں ڈپٹی سیکرٹری لگ گئے۔ اُن کے پاس جو بھی دوست کسی بھی محکمے میں، کسی بھی کام سے جاتا، وہ کبھی انکار نہ کرتے۔ سارا دن مختلف محکموں میں

اپنے دوستوں کے کاموں کے لیے فون کرتے رہتے اور سفارش میں زور پیدا کرنے کے لیے آخر میں یہ جملہ ضرور کہتے "Its more than personal" دوستوں کے لیے اُن کے اس اخلاص کو دیکھتے ہوئے یار لوگوں نے اُنھیں ڈپٹی سیکرٹری سفارشات کہنا شروع کر دیا۔ شبیہ الحسن ایسوسی ایٹ پروفیسر تقریبات ہیں۔ یہ بھی دوستوں کے لیے جس محبت اور توجہ سے تقریباتِ پذیرائی کا اہتمام کرتے ہیں، اس سے ان کا بے پناہ خلوص اُمنڈتا نظر آتا ہے۔ یہ بہت اعلیٰ ظرف کی بات ہے کہ کوئی شخص دوسرں کی نمود اور شہرت کے لیے اپنا وقت، توجہ اور پیسہ خرچ کرے۔ یہ جذبے کی وہ دین ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ آج کل موبائل فونز پر ایک بہت بامعنی میسج گردش کر رہا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''سب سے عظیم تحفہ جو آپ کسی کو دے سکتے ہیں وہ آپ کا وقت ہے کیوں کہ جب آپ کسی کو وقت دیتے ہیں تو آپ اسے اپنی عمر کا ایک ایسا حصہ دے رہے ہوتے ہیں جو آپ کو کبھی واپس نہیں ملے گا۔''

شبیہ الحسن یہ عظیم تحفہ نہ جانے کتنے دوستوں میں کتنی سخاوت سے بانٹ چکے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ سخاوتِ شاہانہ، یہ ظرفِ درویشانہ یوں ہی عطا ہو جاتا ہے؟ جی نہیں، سونا اُس وقت تک کندن نہیں بن سکتا جب تک ایک مخصوص عمل کی بھٹی سے نہ گزرے۔ اب یہ عمل اور بھی دشوار ہو گیا ہے۔ پہلے ایک کمرے کا گھر ہوتا تھا جس میں آٹھ دس افراد رہتے تھے اور مہمانوں کے لیے بھی جگہ ہوتی تھی۔ پھر دس کمروں کا گھر بنا، ہر فرد علاحدہ علاحدہ کمرے میں رہنے لگا اور مہمانوں کے لیے جگہ ختم ہو گئی۔ پہلے بیٹے کہتے تھے ''ہم اباجی کے ساتھ رہتے ہیں'' اب کہتے ہیں ''اباجی میرے ساتھ رہتے ہیں۔'' ٹوٹتی اور بین کرتی ہوئی اِن قدروں کے بیچ ایک گھر شبیہ الحسن نے بھی بنایا ہے۔ لیکن انھوں نے علاحدہ گھر نہیں بنایا بل کہ پہلے سے متصل نیا گھر بنایا جسے فرنشڈ ہوسٹل کہا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ اب بھی اپنے ابوجی کے ساتھ رہتے ہیں، سارا دن، آدھی رات...... نئے گھر میں تو وہ صرف سونے کے لیے آتے ہیں۔ بھابھی نے ایک دن میری ہمشیرہ سے کہا ''میری جان تو میری ساس اور سسُر میں ہے۔ میں ان کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتی......'' اس محبت کی گہرائی میں ایک تہذیب رچی بسی نظر آتی ہے۔ میرا ہمیشہ اس بات پر یقین رہا ہے کہ ہر ملک کے اندر دو تہذیبیں بستی ہیں، ایک وہ جو بظاہر نظر آتی ہے اور دوسری وہ جو نظر نہیں آتی، گھروں کے اندر کہیں چھپی ہوتی ہے۔ تہذیب کی ایک اور تہہ بھی ہے جو ظاہر و نہاں سے آگے، فرد کے باطن میں کہیں پروان چڑھتی ہے۔ حالاتِ زمانہ و اثراتِ بہیمانہ اس پر مؤثر نہیں ہوتے...... شبیہ الحسن کا تعلق اس تیسری تہذیب سے ہے جو ان کے باطن میں رچی بسی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا ''بعض چھوٹی باتیں صرف بڑے لوگ سوچ سکتے ہیں۔'' شبیہ الحسن بھی بعض چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنی گہری نظر رکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کسی دوست پر کوئی کڑا وقت آ جائے تو اس کی کرتے ہیں کہ

دوسرے کو احساس تک نہیں ہوتا......

''ایک شاگرد کئی من چاول دے گیا تھا، سوچا کہاں سنجالتا پھروں گا۔ کچھ دوستوں میں بانٹ دوں۔''

''ایک دوست نے کوکنگ آئل کی ایجنسی لی ہے، کافی سارا لے آیا۔ آپ بھی استعمال کر کے بتائیں، کیسا ہے؟''

یہ انداز ہے شبیہ الحسن کا۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

بات شبیہ الحسن کی شادی سے شروع ہوئی تھی۔ مولا نے بڑا کرم کیا کہ شبیہ الحسن کو تین خوب صورت بچوں ایما، اشنا اور وجیہہ الحسن سے نوازا۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے طویل عمر عطا کرے، وجیہہ الحسن کی شادی پر گاڑی سجانے کا قرعہ پھر میرے نام نکلے، بارات کی واپسی پر میں ازخود گاڑی کا رُوٹ تبدیل کر دوں اور کربلا گامے شاہ میں جب دولہا دلہن سلام پیش کرنے کے لیے حاضر ہوں تو اب کی بار میں بھی اُن کے ساتھ موجود ہوں۔

۲۵ر دسمبر ۲۰۰۶ء

''زمیں کے اندر بھی روشنی ہو
چراغ مٹی میں رکھ دیا ہے''

۵ر اپریل ۲۰۱۳ء

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے لیے چند تحسینی کلمات

ڈاکٹر علی شیر طور

◆◆

سب سے پہلے تو میں شفیق الرحمن الہ آبادی اور اُن کے رفقائے کار اور ڈان پبلک سکول کی انتظامیہ کا شکریہ اَدا کرتا ہوں کہ جنھوں نے مل بیٹھنے کا موقع فراہم کیا اور پھر عزت مآب جناب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس قدر دور دراز علاقے میں تشنگانِ علم و فن کی حوصلہ افزائی کے لیے تشریف لائے۔

پیشتر اس کے کہ میں آج کی تقریب کے صدرِ مجلس ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے بارے میں اظہارِ خیال کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میلسی شہر کے بارے میں ایک اجمالی سا خاکہ پیش کردوں۔ میلسی شہر کو آج سے تقریباً ۲ صدی پہلے کھچی خاندان کے دو بزرگوں میلسے خان اور فدہ خاں نے آباد کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد سے اس شہر کی آبادی میں بڑا اضافہ ہوا۔

یہ زرعی علاقہ ہے۔ کپاس اور گندم یہاں کی خاص فصلیں ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کی آمدنی کا ذریعہ بھی زراعت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس علاقہ میں Pajaro Culture نے خوب فروغ پایا۔ قیامِ پاکستان کے وقت صرف ایک ڈسٹرکٹ بورڈ کا ہائی سکول تھا۔ آہستہ آہستہ تعلیمی میدان میں بھی خوب ترقی ہوئی اور آج دو ڈگری کالجز، آرمی انٹر کالج، متعدد ہائر سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سکول فروغِ علم کے لیے کوشاں ہیں۔ حکومتی اداروں کے ساتھ پرائیویٹ ادارے خاص کر ڈان پبلک سکول، ہاکس پبلک سکول، دی انگلش سکول، میلسی سکول اور بہت سے دوسرے تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ آج کی تقریب کیوں کہ شعروشاعری کے حوالے سے ہے۔ اس لیے میں روئے سخن کو اس پہلو ہی کی طرف لاتا ہوں۔

اس شہر میں مولوی رجب علی کے خاندان کے ایک فرزند سیّد علی اطہر شاہ صاحب نے بزمِ اَدب کی بنیاد رکھی۔ حشمت دہلوی نے اِس بزم کے لیے بطور سیکرٹری کام کیا اور بڑے عرصہ تک یہ دونوں حضرات شعروسخن کی آبیاری کرتے رہے۔ اُس دور میں نعمت علی جگر، ماسٹر نذر محمد نذر، الطاف بسمل، جناب مومن، منظور حسین اسد، عبدالرحمٰن خالد،

نواز جری اور نذیر ناز فر جیسے شعرا کرام پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے کلام کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی۔

آج کے نوجواں طبقے میں خورشید میلسوی، جناب نجمی، مرید عباس خاور، عباس تابش، ندیم بھابھہ، راشد تبسم، شاکر علوی، تحسین یزدانی، مظہر حسین مظہر، علی حسین جاوید، جناب راشد کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی کچھ نوجوانوں نے اپنے جوہر دکھائے ان میں مرید عباس، ناول، سعید احمد سعید، افسانہ علی حسین جاوید نے سوانح حیات جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ جناب شفیق الرحمٰن اور مشتاق بھٹہ صاحب مضمون نگاری اور روداد نویسی میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہاں جناب غلام مصطفےٰ نجمی فنِ خطاطی کے اُستاد ہیں۔ اُن کے ایک عظیم شاگرد جناب سعید انجم نے پورٹریٹ بنانے میں عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ جیسے عظیم المرتبت حضرات کی طرف سے یوں ہی حوصلہ افزائی ہوتی رہی تو یقیناً ان نوجوانوں کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع ملتے رہیں گے۔

اب میں جناب پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب کے اوصافِ حمیدہ کی طرف آتا ہوں۔ اُردو زبان و اَدب کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ صاحبِ علم ہونے کے ساتھ ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور اِن کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ تصنیفی، تحقیقی اور تنقیدی میدان کے شہسوار ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں:

> ''میں ایک تحقیقی مزاج کا حامل طالب علم ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میرے مقالات میں تنقیدی افکار کے ساتھ ساتھ تحقیقی رویوں کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔''

عصرِ حاضر کے نوجوان شعرا سے انھیں پیار ہے۔ وہ اس کی کاوشوں کو دوام دینا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جہاں اس دور کا نقاد میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کی شاعری اور میر امّن دہلوی اور ہادی رسوا کی تخلیقات سے استفادہ کرتا ہے۔ وہاں اُسے عصری رجحانات و میلانات کے حامل شعرا اور نثر نگاروں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اور اُن کی تخلیقات سے معاشرے کو فیض یاب کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا اُسے زندہ جاوید بنا دیا۔ بات چاہے آغا سہیل کی اُدبی خدمات کی ہو یا اشفاق حسین کی تحریروں کی۔ ڈاکٹر نے اِن کی خدمات کو اِس انداز سے پیش کیا ہے کہ کوئی گوشہ پوشیدہ نہیں رہا۔ طاہر تونسوی پر قلم اٹھایا تو اُسے اُدب کا مسیحا بنا دیا۔ میری اور طاہر تونسوی صاحب کی طویل عرصہ تک رفاقت رہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے تو کمال کر دیا جیسے ہر لمحہ اور ہر گھڑی دونوں ساتھ رہے ہیں۔ جناب خالد محمود امر اور اختر حسین سندھو کی شاعری پر بھرپور رائے کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام کا بہترین انتخاب بھی ڈاکٹر صاحب کا حصہ ہے۔ شاعروں کی شخصیت و فن۔ مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کی تدوین۔ بیسویں صدی میں لکھنؤ کی اُردو شاعری، اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف پر ان کے قلم کی جولانیاں اپنا جواب آپ ہیں۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں۔

◆◆◆

ایک نابغۂ روزگار شخصیت۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

پروفیسر فرقان احمد قریشی

◆◆

پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن میرے عزیز ترین، مہربان دوستوں اور کرم فرماؤں کی فہرست میں اوّلین مقام پر فائز ہیں۔ ایسے پُر خلوص دوست جن سے کچھ عرصہ رابطہ نہ ہونے کی صورت میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو یا تشنگی باقی ہو۔

آج سے کم و بیش دس برس قبل ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی باضابطہ ملاقات گورنمنٹ ایف۔ سی کالج لاہور کے شعبۂ اُردو میں ہوئی تھی۔ اُس کے بعد اُن سے گاہے بگاہے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور یوں میں ان کے حلقۂ احباب میں داخل اور شامل ہو گیا۔ انھوں نے نہ صرف میری اوّلین تصنیف ''حرف ریزے'' کے لیے بطور تقریظ اپنی قیمتی رائے سے نوازا جو شاملِ کتاب ہے بل کہ اُس کی تقریب رونمائی میں اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار بھی فرمایا۔ پھر نجانے کیا ہوا؟ کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ وقت کا بہتا ہوا ریلا کب ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا۔ میری دوسری تصنیف ''لرزشِ حرف'' کی تقریب رونمائی ڈاکٹر شبیہ صاحب کے دستِ مبارک سے انجام پائی اور یوں اُن کی بیش قیمت عنایات، بے پایاں اخلاص اور بے کنار کرم فرمائیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہا اور تادمِ تحریر جاری ہے۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران کچھ مقام تو ایسے آئے کہ یوں لگا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ضرورت سے بڑھ کر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے ایم۔ اے (اُردو) میں جس نابغہ شخصیت کا سب سے اہم، فعال اور کلیدی کردار ہے وہ جناب ڈاکٹر شبیہ الحسن ہی ہیں کیوں کہ وہ نہ صرف میرے لیے تموّج اور تحرک ثابت ہوئے بل کہ یہ مشن کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اگر ان کی رہ نمائی، کرم فرمائی، نگرانی اور مہربانی شاملِ حال نہ ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی خاص بات اُن کی سادگی، خلوص، محبت، شفقت، خوش اخلاقی، عاجزی، انکساری اور بے تکلفی ہے۔ اُن کی محفل میں انسان بور نہیں ہو سکتا۔ میں نے اُنھیں کم ہی رنجیدہ اور سنجیدہ ہوتے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کسی بات کو ازراہِ تفنن اتنے دل چسپ اور ڈرامائی انداز میں کرنے کے ماہر ہیں کہ

انسان مذاق کو بھی سچ سمجھتے ہوئے قائل اور مائل ہو جاتا ہے۔ وہ دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو عام ملنے والوں کا کہا بھی نہیں ٹالتے اور حتی المقدور ان کی رہ نمائی فرماتے ہیں۔ دوست تو پھر دوست ہیں ان کے لیے تو اُن کے گھر کے اور دل کے دروازے ہمیشہ فراخ، کشادہ اور کھلے پائے جاتے ہیں۔ کسی دوست کے لیے کبھی انھیں ایک قدم بھی پیچھے ہٹتے نہیں دیکھا بل کہ کسی کام کے سلسلے میں انھیں بڑھ چڑھ کر آگے ہی آگے پایا ہے اور جس کے لیے دن رات یا صبح شام کی کوئی قید نہیں۔ وہ دوستوں کے کاموں کی بھی بڑے احسن طریقے سے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ وہ ذاتی دل چسپی لیتے ہوئے اپنی قیمتی آراء اور پُر خلوص مشوروں سے نوازتے ہیں۔ تقاریب کے انعقاد میں انھیں خاص مہارت حاصل ہے جس کے نہ صرف جملہ تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہیں بل کہ ایسا سٹیج سجاتے ہیں جیسے دل کی محفل سجی ہو۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کا تعلق اَدبی خانوادے سے ہونے کی بنا پر اُن کے مزاج اور عادات واطوار میں قدیم اور جدید تہذیب اور روایات کا حسین امتزاج، گہرا املاپ اور مخصوص رچاؤ شامل ہے۔ وہ تجربہ کار اُستاد، کہنہ مشق صحافی، معروف ادیب، نامور شاعر، بہترین محقق، ماہر نقاد، اعلیٰ کمپیئر اور مستند منتظم ہیں۔ ان کی ایک ذات میں اتنی خوبیاں، اوصاف اور صفات پائی جاتی ہیں کہ انسان حیران اور ششدر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کی تعداد لگ بھگ تین درجن ہونے کو ہے۔ وہ کسی کام کے لیے دن رات ایک کر دینے، شبانہ روز اور ان تھک محنت پر یقین رکھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک تقریب میں ڈاکٹر سلیم اختر اُن کے بارے میں اظہار خیال فرما رہے تھے کہ ''مَیں نے رات گئے جب شبیہ صاحب کے گھر فون کیا تو اُن کی بیٹی سے بات ہوئی، معلوم ہوا کہ وہ ابھی لوٹ کر نہیں آئے۔ بیٹی نے کہا کہ انکل جس رات بابا جان گیارہ بجے گھر آ جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بہت جلد آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر اجمل نیازی ایک دوسرے سے محوِ گفت گو ہوئے کہ شبیہ الحسن انسان نہیں بل کہ جن ہے تو دوسرے نے فرمایا کہ جن تو ہے لیکن وہ اب بوتل سے باہر آ گیا ہے۔

گزشتہ دنوں میری ڈاکٹر عباس رضا صاحب سے فون پر بات ہوئی، باتوں باتوں میں، مَیں نے کہا کہ شبیہ الحسن صاحب، رات گئے کمپوزر کے پاس بیٹھے اپنی آئندہ کتاب کا کام کروا رہے تھے جب کہ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہ تھی۔ میں نے ملال انگیز انداز میں کہا کہ وہ اپنی صحت اور آرام کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ عباس رضا صاحب کہنے لگے ہم اُن کے شاگرد ہیں، اُن کا ہاتھ تو بٹا رہے ہیں چوں کہ ہمارے حصے کے کام شبیہ صاحب کرتے ہیں اور اُن کے حصے کا آرام ہم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب اپنے مزاج، شخصیت اور فن میں منفرد، یکتا، بے مثال اور باکمال ہیں۔ انھوں نے ہر لحہ کام، کام اور صرف کام کے لیے وقف کر رکھا ہے جس میں طلبا کے امور میں دل چسپی، دوستوں کے ساتھ تعلق، کاروباری مصروفیات اَدبی تقریبات کا انعقاد، صحافتی خدمات اور کالج کی سرگرمیاں شامل ہیں۔ وہ یہ

سب کام اتنی خوب صورتی، خوبی اور خوش اُسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

اُدب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شناخت بطور صاحب نظر نقاد اور خوش فکر محقق کی ہے جس میں مرثیہ شناسی اُن کا اختصاصی موضوع ہے...... میں نقاد نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے فنی محاسن پر اپنی رائے کا اظہار کر سکوں یا اُس پر روشنی ڈال سکوں...... لیکن اپنی کم علمی کے دائرے میں رہتے ہوئے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جن مرثیہ گو شعرا پر ڈاکٹر صاحب نے بطور ناقد اور محقق، عمیق اور دقیق انداز میں تبصرہ اور تجزیہ کیا ہے یا اُن کے کلام کو یکجا اور مرتب کیا ہے...... وہ نہ صرف ان ہی کا خاصا ہے بل کہ اُن شعرا کو ڈاکٹر صاحب نے قبولِ عام اور بقائے دوام عطا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انھوں نے آنے والی نسلوں کے سامنے ان مرثیہ نگاروں کو بڑے سلیقے سے پیش کر دیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے موشگافی، دیدہ ریزی، ژرف نگاہی، نکتہ آفرینی پرکاری اور فنی کمال سے اُن شعرا کو لازوال بنا دیا ہے...... ورنہ بعید از قیاس نہیں کہ اُن کا غیر مطبوعہ کلام اور فن ماضی کی دُھول میں گم ہو جاتا یا زمانے کی آنکھ سے اوجھل رہتا۔

میں دعا گو ہوں کہ خداوند کریم، ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کو تمام تر عملی، علمی اور اَدبی حیثیتوں میں کامیاب و کامران اور سرخرو فرمائے...... اور وہ ابد تک اَدبی فلک پر روشن ستارے کے مانند جگمگاتے رہیں۔ (آمین) آخر میں آپ ان کا ایک شعر سنیے جو میرے درج بالا موقف کی بھرپور گواہی دے رہا ہے۔

کوئی بھی آئے میں دل میں اُتار لیتا ہوں
مرے شعور کے رشتے ہیں خندقوں کی طرح

....

مطبوعہ

۱۔ روزنامہ ''مساوات'' لاہور، ۲ر اکتوبر ۲۰۰۶ء۔
۲۔ ہفت روزہ ''عزم'' لاہور، ۲۲ تا ۲۸ر اکتوبر ۲۰۰۶ء۔
۳۔ پندرہ روزہ ''سائبان'' لاہور، ۱۶ تا ۳۱ر اکتوبر ۲۰۰۶ء۔
۴۔ پندرہ روزہ ''ذوالفقار'' پشاور، یکم نومبر ۲۰۰۶ء۔
۵۔ ہفت روزہ ''کھلی عدالت'' وہاڑی، ۲۲ تا ۳۰ نومبر ۲۰۰۶ء۔
۶۔ سنڈے میگزین ''کرنیں'' لاہور، ۳ تا ۹ دسمبر ۲۰۰۶ء۔
۷۔ روزنامہ ''انصاف'' لاہور، ۲۱ دسمبر ۲۰۰۶ء۔
۸۔ پندرہ روزہ ''سہیل'' واہ کینٹ،

◆◆◆

اَدب کا تابندہ چراغ۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

پروفیسر حماد الرحمٰن میرؔ

◆◆

قلم چلانے اور ڈھول بجانے میں بظاہر کوئی قدر مشترک نہیں، لیکن فی زمانہ، یہ دونوں فن لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ ہماری اُدبی دنیا میں ایسے حضرات کی کمی نہیں، جو کام کم کرتے ہیں اور ڈھول زیادہ پیٹتے ہیں۔ جو ستائش باہمی کی بیساکھیوں سے اُوپر اٹھنے اور کہنیاں مار کر آگے بڑھنے کے فن میں اس قدر طاق ہیں کہ بڑے بڑے لکھنے والے ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور وہ اگلی صفوں میں دندناتے پھرتے ہیں، اس کے برعکس ایسے قلم کار انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر تمام عمر خدمت فن میں لگے رہتے ہیں۔

اُستادِ گرامی حضرت جناب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بھی ایسے ہی خدام اُردو، ادیبوں اور شاعروں کے زمرے میں آتے ہیں جنھوں نے اپنی عمر زبان، اُدب اور فن کی بے لوث خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہے لیکن انھیں ملکی سطح پر وہ حقیقی مقام ابھی تک نہیں ملا جس کا وہ استحقاق رکھتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کا انھیں کوئی ملال نہیں لیکن ہمیں شدید احساس ہے۔ دراصل وہ موجودہ وقت میں ''بلند'' ہونے کے ان حربوں کو استعمال نہیں کرنا چاہتے جن سے آگے بڑھا جاتا ہے وہ اپنی خدمت اُردو اور شاعرانہ زندگی پر مطمئن ہیں اور ایک محب وطن کی طرح زبان اور اُدب کی مفید اقدار کو آگے بڑھانے میں شبانہ روز کوشاں ہیں۔ موصوف کی زندگی کی سب سے بامعنی سرگرمی اُدب ہے۔ اپنے لیے جینا کوئی کمال نہیں دوسروں کے لیے جینا شرفِ انسانیت کا جوہر ہے جو قبلہ ڈاکٹر صاحب کی ذات میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کو اُدب کی منزل پر چلایا۔ آج جب اُستادِ محترم یہ کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو خدا گواہ ہے بہت کچھ یاد آ رہا ہے اور ایک اچھا خاصہ مقالہ ان کی ذات پر تحریر کیا جاسکتا ہے۔ یہ چند سطور حرف اپنے دردِ محرومی کو چھپانے کے لیے لکھ رہا

ہواں ورنہ :

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے" جن ادیبوں اور شاعروں نے مجھے گہرے طور پر متاثر کیا ہے ان میں قبلہ ڈاکٹر صاحب کی ذاتِ گرامی سرِ فہرست ہے جو ایک عظیم سرمایہ ہیں کہ اس مادی، حرص و لالچ کے دور میں بھی شمعِ شعر و اَدب روشن کیے ہوئے ہیں جس کی تابندگی ہی قوم کے مستقبل کو نکھارنے اور سنوارنے کی ضامن ہے خدا کرے یہ روشنی تادیر روشن رہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بیک وقت معلم، ادیب، صحافی اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے منفرد دانش ور بھی ہیں جنھیں بعض حوالوں سے اپنے ہم عصروں پر فوقیت حاصل ہے۔ مثلاً انھوں نے مرثیہ، سلام اور دیگر مذہبی اصناف پر اپنی توجہ مرکوز کی اور تاریخی تناظر میں ان کو دریافت کر کے ان کے بدلتے ہوئے آہنگ اور اطوار کو ہر جہت سے دیکھنے کی سعی فرمائی ہے۔ ان کے مضامین نقد و نظر اور ان کی کتب ان کے بلند پایہ تنقیدی و تحقیقی ذوق کا ثمرہ نہیں۔ اُردو اَدب کی کلاسیکی روایت کے باوصف عالمی اَدب میں رونما ہونے والے جدید رجحانات اور ان کے اثرات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اَدب میں ان کے پسندیدہ موضوعات تحقیق اور تنقید ہیں ان کی بیس سے زائد تحقیقی اور تنقیدی کتب شائع ہو کر اہلِ علم و اَدب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کو بھی اَدب سے مربوط کر رکھا ہے۔ آپ ایک عرصے سے "شام و سحر" کے اعزازی مدیر ہیں جہاں آپ نے مختصر اداریے کے ذریعے بھرپور بات کہنے کا طریق استعمال کیا وہاں مضامین کے انتخاب میں بھی ایک معیار قائم کر کے اَدب کو فروغ اور پروان چڑھانے میں نہایت اہم کردار اَدا کیا ہے۔ ان کے نزدیک اَدبی دھڑے بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اچھا لکھنے والا کوئی بھی ہو ان کے پرچے میں باآسانی چھپ سکتا ہے۔ ان کے مربی اور استاد الشعرا سیّد وحید الحسن ہاشمی صاحب موجودہ دَور کے ایک بلند پایہ مرثیہ گو سلام نگار اور غزل گو ہیں اور "وحیدِ عصر" کا خطاب بھی حاصل کر چکے ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں بھی "وحیدِ عصر" کا پرتو اور عکس کسی حد تک پایا جاتا ہے جب کہ ساتھ ہی ان کی شاعری میں جدید لہجے کی کھنک بھی موجود ہے خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہنے والے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اُردو اَدب کی تنقیدی اور تحقیقی روایت میں اکیسویں صدی کے ذہن کو شامل کر کے نہ صرف اسے تروتازہ رکھا ہے بل کہ اپنے خوب صورت انداز سے اسے عام قاری سے قریب تر بھی کر دیا ہے۔

"حسن ہاشمی" کے نام سے قلم کاری کا آغاز کرنے والے سیّد شبیہ الحسن نے گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا تھا جب کہ اسی عظیم مادرِ علمی سے آپ نے ایف۔ اے اور بی۔ اے بھی کیا تھا اور جب اس کالج کی نج کاری کی گئی تو اس وقت ڈاکٹر صاحب ایسوسی ایٹ پروفیسر تھے۔ جب کہ اس سے قبل آپ گورنمنٹ کالج فیصل آباد اور گوجراں والہ کالج میں صدر شعبہ کی حیثیت سے بھی تدریسی فرائض

سرانجام دے چکے تھے۔ آپ نے جن نام ور اساتذہ اکرام سے فیض حاصل کیا ان میں سرفہرست آپ کے والد گرامی وحید عصر جناب سیّد وحید الحسن ہاشمی کے علاوہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ڈاکٹر آغا سہیل احمد، ڈاکٹر سہیل احمد خان کے نام نمایاں تر ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی اور تنقیدی سفر ربع صدی پر محیط ہے۔ مقام مسرت یہ ہے کہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ 'تصانیف' اور تحقیقی مقالات کے میدان میں وہ ''سنچری'' کرنے کے قریب ہیں اور کچھ ایسا ہی معاملہ اعزازات صحافتی خدمات اور اہم ذمہ داریوں پر فائز ہونے کے سلسلے میں بھی ہے۔ جب کہ آپ کے تنقیدی اور تحقیقی کام کے حوالے سے ممتاز دانش وروں اور ناقدین کی فہرست بھی طویل ہے جنھوں نے آپ کے کام کو سراہتے ہوئے اپنی قیمتی آراء اور تبصروں سے سرفراز کیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی، شہزاد احمد، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سہیل احمد خان، پروفیسر سجاد حارث، پروفیسر کرار حسین، میرزا ادیب، ضمیر جعفری، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خیال امروہوی، محترمہ بانو قدسیہ، ڈاکٹر سعادت سعید، پروفیسر سجاد حارث، پروفیسر مظہر صدیقی، خالد اقبال یاسر، اصغر ندیم سیّد، سلطان رشک، سلطان جمیل نسیم، ڈاکٹر صدیق شبلی، پروفیسر غلام حسین ساجد، ڈاکٹر نواز حسن زیدی، ڈاکٹر قاسم جلال، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، آثم فردوسی اور ڈاکٹر عباس رضا نمایاں ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو صرف اور صرف تحقیق و تنقید کی سربلندی کے لیے وقف کر رکھا ہے بلاشبہ موصوف ایک بالغ اور دُور اندیش محقق ہیں۔

مَیں اپنے معروضے کا اختتام برصغیر کے ممتاز شاعر اور ادیب جناب ظہیر کاشمیری (مرحوم) کے الفاظ پر کرنا چاہتا ہوں کہ ''شبیہ الحسن ہر موضوع کو گہری ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں نیا پن ہی نہیں فکری اضافوں کی جھلک بھی ملتی ہے۔ وہ بعض جگہ اُدب کے گنجلک مسئلوں کو بڑی سادگی اور شستگی سے بیان کر جاتے ہیں اور یہ سادگی اور شستگی ان کے اظہار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان کے مضامین تنقید کے نئے امکانات کی نشان دہی ہی نہیں کرتے بل کہ ہمارے تنقیدی اُدب میں ایک خوش گوار اضافہ بھی ہیں۔''

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی متنوع شخصیت

مشتاق احمد

◆◆

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیئے گا
پڑھتے کسی کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

شہرت کی دیوی کو رام کرنے کے لیے صحرا نوردی شوق کرنا، سوچ کی چتاؤں کو جلانا، درد کی ہواؤں کو چھونا، فکر کے شبستانوں میں دُکھوں کے دیپ روشن کرنا، جہد مسلسل کو شعار بنانا، مقصدیت سے لگاؤ رکھنا، انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن اُردو اَدب کے اُفق پر شہرت کی بلندیوں کو چھوتا ہوا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اَدب کے میدان میں برسوں ریاضت کی ہے۔ یہ عصرِ حاضر میں اَدبی کارہائے نمایاں سرانجام دینے والی Multidimensional Personality کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بیک وقت معلم، شاعر، ادیب، نقاد، محقق اور ایڈیٹر شام وسحر ہیں۔ ان کی تحریر قرطاس ذہن پر منقش ہوتی چلی جاتی ہے، تنقید نگاری کرتے ہیں تو خوبیوں اور خامیوں کو الگ الگ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ تحقیق کرتے ہیں تو تمام خفیہ گوشوں کو افشا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ گویا ان کی تحقیقی کتب میں Treasure of Knowledge بدرجہ اُتم موجود ہے جو عصرِ حاضر کے دیگر ریسرچ سکالرز کے ہاں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے قلم میں پانی کی سی روانی اور تلوار کی سی کاٹ دکھائی دیتی ہے۔ ان کا اَدبی کام اُفق پر دکھائی دینے والی دھنک کے دل کش رنگوں کی طرح پھیلتا ہوا نظر آتا ہے اور قاری کی نگاہوں کو توانا، ذہنوں کو متحرک اور قلوب کو منور کرتا چلا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو جو بلند مرتبہ ملا ہے وہ ان کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے کیوں کہ

ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ایک ہمہ جہت اَدبی شخصیت

شفیق الرحمٰن الہ آبادی

••

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ایک علمی اَدبی اور مذہبی خانوادے میں آنکھ کھولی اور اَدبی ذوق ورثے میں پایا۔آپ کے والد محترم وحید العصر سید وحید الحسن ہاشمی قادر الکلام اور صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں،ڈاکٹر صاحب کو زمانہ طالب علمی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر عبید اللہ خان، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور سید وحید الحسن ہاشمی ایسے مایہ ناز اور جید اساتذہ کرام کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔کالج لائف میں آپ نے بہترین مقرر، سوشل ورکر اور بہترین کھلاڑی ہونے کے اعزازات بھی حاصل کیے،اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔اے اُردو کیا اور ''آل رضا کی غزل گوئی'' کے موضوع پر ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی زیرنگرانی تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ایم۔فل میں آپ نے آل رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین پر تحقیق کی اور مقالہ قلم بند کیا،ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی زیرنگرانی ''لکھنؤ کی اُردو شاعری'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی جو آپ کی علمی قابلیت، تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی شعور کا ثبوت ہے۔آپ نے ۱۹۸۲ء میں گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور سے بحیثیت لیکچرار اُردو اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور اب گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ لاہور شعبہ اُردو میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر تدریسی فرائض احسن طریقے سے سرانجام دے رہے ہیں، مختلف کالجوں میں دوران تدریس بے شمار طلبا نے آپ سے علمی فیض حاصل کیا، علم و اَدب کی ترویج و اشاعت کے لیے آپ اہم عہدوں پر فائز رہے۔گورنمنٹ ایف سی کالج میں آپ انچارج سیمینار کمیٹی، سیکرٹری تقریبات، سٹاف سیکرٹری شعبۂ اُردو اور نگران سیمینار لائبریری ایم۔اے اُردو۔اس وقت گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ میں کئی اہم مناصب

پر فائز ہیں۔ ۱۹۸۸ء سے تا حال آپ اَدبی جریدہ ماہ نامہ ''شام و سحر'' لاہور کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور اپنے ذوقِ سلیم کی بدولت اس ماہ نامے کے فنی اور اَدبی حُسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ میرے لیے یہ بات باعث اعزاز ہے کہ اس ماہ نامے میں میرے دو مضامین شائع ہو چکے ہیں اور بالعموم مکتوبات بھی جگہ پاتے رہتے ہیں۔ ''شام و سحر'' کے خصوصی نمبر ڈاکٹر صاحب کی مدبرانہ اور مدیرانہ خوش اسلوبیوں کا مظہر ہیں، آپ کے تحریر کردہ فکر انگیز اداریے 'شام و سحر کی باتیں' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''شام و سحر'' کے اداریے بنیادی طور پر مسائل کے اداریے ہیں یعنی جن سے دنیا فی الوقت دو چار ہے اور جو اَدب کے صحت مند ارتقا میں رکاوٹ بن رہے ہیں بالفاظ دیگر مدیر 'شام و سحر' نے ہمیں مصائب سے آگاہ کرنے اور اَدب کے راستے سے خار و خس ہٹانے کا مشورہ دیا ہے۔''

آپ کی زیرِ نگرانی ایم۔ اے کی سطح پر دو مقالے (۱) ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق مماثلتیں و اختلافات (۲) عصمت چغتائی اور منٹو مماثلتیں اور اختلافات اور ایم فل اُردو کی سطح پر تین مقالہ جات (۱) ڈاکٹر ظہیر فتح پوری۔ شخصیت و فن (۲) عبیداللہ علیم۔ احوال و آثار اور (۳) نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کے عنوانات سے تحریر کیے جا چکے ہیں۔

اَدب میں ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ موضوعات تحقیق اور تنقید ہیں آپ کی پچیس سے زائد تحقیقی و تنقیدی کتب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر اہل دانش اور ناقدین فن سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں جن میں ترجیحات، مفاہیم، تصریحات، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی، باقیاتِ آلِ رضا، جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ، سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں، بیسویں صدی کا شعری اَدب، شام و سحر کی باتیں اور طاہرین بہت معروف ہیں۔ مذکورہ کتب آپ کے علمی تفکر، تنقیدی و تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت ہیں جو روایتی طریقوں سے مختلف انداز سے تخلیق کاروں اور ان کے تخلیقی روّیوں سے متعارف کراتی ہیں اور قاری کو غور و فکر کا موقع فراہم کرتی ہیں، میں ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی اس رائے سے متفق ہوں کہ:

> ''میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو ایک شائستہ اطوار اور خوش بیاں نقاد اور ایک دردمند اور رحم دل محقق کا درجہ دیتا ہوں۔ تنقید اور تحقیق دونوں میں وہ خوب رواں ہیں مگر یوں کہ چڑھتے ہوئے پانی کی شوریدہ سری کو جوئے نغمہ خواں بنا کے چھوڑتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب مصنف اور مؤلف ہونے کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار بھی ہیں آپ کے مختلف اَدبی و تنقیدی موضوعات پر مشتمل مقالات ماہ نامہ ''افکار'' کراچی، سہ ماہی ''صحیفہ'' لاہور، ماہ نامہ ماہِ نو لاہور، سہ ماہی

''دبستان'' لاہور، ماہ نامہ ''شام و سحر'' اور روزنامہ ''جنگ'' وغیرہ کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ آپ کی عظمتِ فن کا اعتراف کرنے اور آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں ملک کے ممتاز اُدبا اور ناقدینِ فن ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر وزیر آغا، سید وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر قاسم جلال و دیگر دانش ورانِ اُدب شامل ہیں، مجھے اُمید ہے کہ محترم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب اس بے اُدب معاشرے میں حسبِ سابق خلوص و صداقت کے ساتھ اُدب کے دیپ روشن رکھیں گے۔

(مطبوعہ)

پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، ۱۶ تا ۳۰ نومبر ۲۰۰۶ء

◆◆◆

آراء

(ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے بارے میں ناقدین، دانش وروں اور اکابرین کی آراء)

- **احمد ندیم قاسمی**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور علم وفن کے بارے میں، متعدد صاحب الرائے اہل قلم کے افکار کو کتابی صورت میں یک جا کر کے پاکستان کی ادبی تاریخ کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل کے علم وفضل اور فکر وفن کی متنوع جہات ہیں۔ ان سب کو ایک کتاب میں اس سلیقے سے سمیٹنا، آغا صاحب سے مرتب کی عقیدت کے علاوہ، ان کی توانا اور ہمہ گیر لگن کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے آغا صاحب کی شخصیت کے علاوہ ان کے افسانوں، سفرناموں، ناول، تنقید اور تحقیق کے الگ الگ عنوانات کے تحت دورِ حاضر کی بڑی بڑی شخصیات کے وقیع مضامین اس مجموعے میں شامل کیے ہیں۔ یوں یہ مجموعہ آغا صاحب کی سوانح عمری کا کردار بھی ادا کر رہا ہے اور دورِ حاضر کی ایک اہم اَدبی شخصیت کے کمالاتِ فن کے متوازن اذکار سے تاریخِ اَدب کا ایک الگ باب بھی تکمیل پذیر ہو گیا ہے۔ اس کامیابی کے لیے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھرپور تحسین کے مستحق ہیں۔

- **ڈاکٹر وزیر آغا**

ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک باصلاحیت اور ہوش مند نقاد ہیں، اُنھوں نے اسلم کولسری کے حوالے سے ایک ایسی منفرد کتاب پیش کی ہے جو بیک وقت شاعر کی غزلوں کا خوب صورت انتخاب بھی ہے، اُس کے سوانحی کوائف اور شعری کارکردگی کا بیان بھی اور اُس کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی۔

اسلم کولسری کے ہاں کلاسیکی اُسلوب کے بجائے جدید لب ولہجہ اُبھرا ہے جو اُس کے معاصرین کے اُسلوبِ شعر سے مختلف ہے۔ اُس کے ہاں اردگرد کی اشیا اور مظاہر کو ایک بچے کی سی حیرت سے دیکھنے کا انداز ملتا ہے جو ایک نادر و نایاب عطیہ ہے۔ اُس کے اندر ''بچپن'' پوری طرح آباد ہے اور چوں کہ یہ

بچپن دیہاتی فضا میں پروان چڑھا ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُس کی شاعری میں "بچپن" اور "گاؤں" ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ یہی گاؤں جب شہر کے رُوبرو آیا ہے تو عکسوں کے ایک ایسے سلسلے نے جنم لیا ہے جو اسلم کولسری کی شاعری کی پہچان ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنی اس قابلِ قدر کتاب میں اسلم کولسری کو متعدد سطحوں پر دریافت کر کے ایک اہم اَدبی خدمت انجام دی ہے۔ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"

- **ڈاکٹر عبادت بریلوی**

"ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کی شاعری پر قابل قدر کام کر کے اُردو زبان واَدب کے باقاعدہ طالب علم ہونے کا حق اَدا کیا ہے۔ جناب حبیب جون پوری کا کلام اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے اور پڑھنے والے ان کی شاعری اور انداز سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ "کلیاتِ حبیب" مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھے شاعر سے ہمیں متعارف کرایا ہے اور ایک جوہر قابل کو مٹی میں ملنے سے بچا لیا ہے۔

- **پروفیسر ممتاز حسین**

"شبیہ الحسن صاحب کا تنقیدی شعور بہت واضح، بنچا تلا اور تیکھا ہے۔ وہ نہ تو اس رجحان کو پسند کرتے ہیں کہ کلام تمام تر لفظی شعبدہ گری کا حامل ہو یا تمام تر روایتی ہو اور اس میں روایت سے سرمو انحراف نہ پایا جائے اور نہ وہ اس جدت پسندی کے قائل ہیں کہ جدید غزل کو اپنی فضا، معنویت اور ساخت میں ماضی کے تجربات سے بالکل ہی بے نیاز ہو جانا چاہیے۔ اس کے برعکس جہاں وہ غزل میں نئی معنویت یا انفرادی تجربات کے اظہار کو پسند کرتے ہیں وہاں وہ غزل میں ایک ایسا رچا ہوا انداز بیان بھی دیکھنا چاہتے ہیں جو ماضی میں اچھی غزلوں کا طرہ امتیاز تھا اور جسے اس دَور میں فراقؔ، فیضؔ اور دوسرے شعرا نے برتا ہے۔"

- **ڈاکٹر فرمان فتح پوری**

یہ بات باعث مسرت ہے کہ "شخصے از غیب بیرون آمد و کارے کرد" میری مراد سید شبیہ الحسن صاحب سے ہے جنھوں نے آلِ رضا کی غزل گوئی کو موضوعِ گفت گو بنایا۔ اس کے رموز و نکات کو اُجاگر کیا۔ خصوصیات و امکانات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا اور یہ سب کچھ انھوں نے ایسی دقتِ نظر، خلوصِ دل اور وسعتِ مطالعہ کے ساتھ کیا کہ ہم عصر غزل گو شعرا میں سید آلِ رضا کا وہ رتبہ خاص جو ناقدین کے بعض تحفظات و تعصبات کی بنا پر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا۔ پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آ

گیا۔ یہی نہیں سید شبیہ الحسن نے آلِ رضا کی غزل گوئی کے بہانے بیسویں صدی کی غزل گوئی اور اس کے نمائندہ شعرا کے بارے میں ایسی سیر حاصل بحث فراہم کر دی ہے کہ ہم اس کی معرفت اُردو غزل کی پوری تاریخ کے نشیب و فراز کا ادراک کر سکتے ہیں' ایسا ادراک جو کہ غزل کی تفہیم و تنقید دونوں میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

- **ڈاکٹر جمیل جالبی**

''خوشی کی بات ہے کہ سید شبیہ الحسن نے ''جناب آلِ رضا کے فنِ غزل گوئی'' پر کتاب لکھ کر ان کی شخصیت' ماحول اور شاعری کو متعارف کرانے کے لیے اتنا مواد فراہم کر دیا ہے کہ اب دوسرے نقاد بھی ان کی شاعری پر توجہ دیں گے۔''

- **میرزا ادیب**

ایک باشعور اور فرض شناس مدیر کی صرف یہی کوشش نہیں ہوتی کہ وہ اپنے رسالے کے قارئین کے لیا چھے اور مفید مضامین ''نظم و نثر'' فراہم کرے۔ یقیناً یہ اس کا ادارتی فریضہ ہوتا ہے مگر یہ فریضہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اداریوں میں اُن تحریکات پر روشنی ڈالے جو عہدِ حاضر میں اُدب پر اپنے اثرات مرتب کی رہی ہیں اور دنیائے اُدب میں جو کچھ ہو رہا ہے اُدب پر ان کے نتائج کا بھی تجزیہ کرے۔

''شام و سحر'' کا پرچہ دیکھتے ہی مَیں سب سے پہلے 'باتیں' کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پروفیسر شبیہ الحسن نے اپنے ہر اداریے میں کوئی نہ کوئی ایسا موضوع ضرور چھیڑا ہے جو اَدبی مسائل کے حوالے سے اہم بھی ہے اور بھرپور توجہ کا متقضی بھی: پروفیسر صاحب ایک باخبر، حساس اور بڑے ذمہ دار مدیر ہیں۔ صرف یہی نہیں، اُن کے پہلو میں ایک دل دَردآشنا بھی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے اداریے میں کم سے کم لفظ استعمال کرتے ہیں مگر جو لفظ بھی اُن کے قلم سے نکلتا ہے اُس کی اتنی اہمیت ہوتی ہے کہ اگر اس لفظ کو تحریر سے الگ کر دیا جائے تو ایک نمایاں خلا محسوس ہونے لگے گا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی باتیں، حکیمانہ باتیں ہیں، یہ گہری سوچ کی شاہد ہیں اور یہ گہری سوچ پڑھنے والوں کو کچھ سوچنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ان کی بڑی افادیت ہے اور اسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

- **انتظار حسین**

قیصر بارہوی (مرحوم) تو ہمارے ہی زمانے کے شاعر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد لازم تھا کہ ان

کے سارے کام کو سمیٹا جاتا اور اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کر کے ان کے مرثیے کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم کی جاتی۔ بہت اچھی بات ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے بارہوی (مرحوم) کے سارے مرثیوں کو سمیٹ کر اولاً سرسری تعارف کروایا ہے، ہر مرثیے کا ایک مختصر تعارف پیش کیا ہے اور پھر دقتِ نظر کے ساتھ ان کا ایک تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ قیصر بارہوی مرثیے کے میدان میں اپنے مقام و مرتبے کے اعتبار سے یقیناً اس مطالعہ کے مستحق تھے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی اپنے اس مطالعہ کے لیے جو ان کی تنقیدی بصیرت کا غماز ہے، داد کے مستحق ہیں۔

• **شہزاد احمد**

''یوں تو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ادب کی کئی جہات میں کام کیا ہے مگر ان کا محبوب موضوع مرثیہ ہے اور پھر اسی حوالے سے مرثیہ نگار بھی۔ مرثیے سے ان کا یہ لگاؤ صرف ادب کی حد تک نہیں ہے بل کہ اس میں دنیا بھر کے موضوع شامل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ مرثیے میں صرف مصائب ہی بیان کیے جائیں، مرثیے کی یہ توجیہ انسان کی پوری زندگی کا احاطہ بھی کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے مرثیے کے سلسلے کے بہت سے موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی یہ کتاب جدید اور کلاسیکی مرثیے پر ایک جامع کتاب ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد آپ اگر چاہیں تو کسی بھی موضوع کا مطالعہ اپنے ذوق کے مطابق تفصیلی طور پر کر سکتے ہیں چناں چہ یہ کتاب مرثیے کا ایک تعارف بھی ہے، مرثیے پر تنقید بھی ہے اور ان امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو مستقبل قریب میں رونما ہونے والے ہیں۔

• **ڈاکٹر وحید قریشی**

آلِ رضا خوش نصیب شعرا میں ہیں جنھیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جیسا مخلص نقاد ملا ہے، جو اپنے اجداد کی روایت کا پاسدار ہی نہیں بل کہ اس کا بہت بڑا مبلغ بھی ہے۔ شبیہ الحسن کے والد سید وحید الحسن صاحب آلِ رضا کے حلقہ شاگردی میں شامل تھے، اس لیے شبیہ الحسن نے ضروری جانا کہ آبائی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے بزرگوں کی متاعِ بے بہا کو قارئین تک پہنچانا چاہیے۔ یہ ایک کٹھن کام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دس برس کی مسلسل محنت سے اخبارات، رسائل اور بیاضوں سے ریزہ ریزہ کلام جمع کیا اور اس طرح آلِ رضا کے کلام کی باقیات یک جا ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام میں تدوین کے جدید اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے اور جا بجا حوالوں اور حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ آج کل تدوینِ متن کا کام اُردو کے محققین کے بس کا نہیں رہا کہ اکثر نقاد علمِ عروض میں پیدل ہیں اور تدوینِ متن میں عجیب و غریب غلطیاں کرتے ہیں۔ شاعری شبیہ الحسن کے گھوارۂ تربیت کا حصہ ہے اس لیے یہ متن صحت کے اعتبار سے

کئی معاصرین کے کام سے بازی لے گیا ہے۔ انھوں نے محض ایک مرحوم شاعر کے کلام ہی کو یک جا نہیں کیا بل کہ لکھنوی روایت کے اس آخری زمانے کو بھی محفوظ کر دیا ہے۔ اب آل رضا کے شعری مرتبے کے تعین میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ اس اہم علمی کام پر مَیں عزیز موصوف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

- **ڈاکٹر سلیم اختر**

"مَیں جب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو دیکھتا ہوں تو مجھے "پتا پر پوت" والی ضرب المثل یاد آتی ہے۔ نیک باپ کا نیک اطوار فرزند۔ باپ نے مرثیہ نگاری میں نام پیدا کیا اور وحید العصر کا خطاب پایا جب کہ بیٹے نے مرثیے کی تحقیق و تنقید سے امتیاز پایا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تازہ تالیف "مختصر مرثیہ کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی" اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت کے مطالعہ کے ساتھ بطور مرثیہ نگار ان کے فن کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے مگر اس انداز اور اُسلوب میں کہ مرثیہ کے فن سے وابستہ تخلیقی اُمور اور فنی جزئیات کا بھی احاطہ ہو گیا ہے۔ مرثیہ سے سنجیدہ دل چسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ باعث افادہ ہوگا۔"

- **ڈاکٹر آغا سہیل**

"انتخاب کا کام عطر کشید کرنے کے مترادف ہے جس میں ذوقِ سلیم کی رہبری، مذاقِ سخن کی استواری، شستہ لطیف اور وجدان کی سلامت روی کے ساتھ ساتھ شعری تربیت سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ سید شبیہ الحسن میں مذکورہ اوصاف حمیدہ بدرجہ احسن موجود ہیں۔"

- **ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا**

"گزشتہ ربع صدی میں نمایاں ہونے والے محققین و ناقدین اَدب میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ اور کثیر الجہات شخص ہیں۔ ایک علمی و اَدبی خانوادے کے لائق فرزند ہیں اور مختلف النوع موضوعات پر قابلِ قدر تصنیفی و تنقیدی سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ ان کی تازہ ترین تنقیدی تصنیف "تصریحات" ہم عصر اہلِ قلم کے اَدبی کارناموں کو متعارف کرانے کے لیے ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاصرین کے بارے میں اظہارِ خیال آسان کام نہیں مگر ڈاکٹر صاحب اس سے بخوبی عہدہ برا ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں "تصریحات" کے مضامین دورِ حاضر کے نوجوان اہلِ قلم پر مزید تحقیق و تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو بھی اَدبی حلقوں میں اسی طرح پذیرائی حاصل ہوگی جو ان کی دیگر تصانیف کو اس سے قبل حاصل ہو چکی ہے۔"

- **ظہیر کاشمیری**

شبیہ الحسن نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''مفاہیم'' میں بعض اہم اور نازک اَدبی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ ہر موضوع کو گہری ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور نتائج اَخذ کرنے سے پہلے ہر موضوع کے داخلی، خارجی اور زمانی پہلوؤں کو عموماً پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں نیاپن ہی نہیں فکری اضافوں کی جھلک بھی ملتی ہے۔ وہ بعض جگہ اَدب کے گنجلک مسئلوں کو بڑی سادگی اور شستگی سے بیان کر جاتے ہیں اور یہ سادگی اور شستگی ان کے اظہار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ مضامین تنقید کے نئے امکانات کی نشان دہی ہی نہیں کرتے بل کہ ہمارے تنقیدی اَدب میں ایک خوش گوار اضافہ بھی ہیں۔

- **ڈاکٹر سجاد باقر رضوی**

اسے آلِ رضا کا روحانی فیض کہیے کہ سید شبیہ الحسن ان کے حوالے سے ایک وسیع تر تناظر کے حامل ہو گئے ہیں۔

- **پروفیسر سجاد حارث**

''پروفیسر شبیہ الحسن نے متن کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھتے ہوئے جس ڈھنگ سے یہ کام انجام دیا ہے وہ ان کی سلیقہ مندی، وسعت مطالعہ اور ژرف بینی کو ظاہر کرتا ہے۔''

- **ڈاکٹر سہیل احمد خان**

''ڈاکٹر شبیہ الحسن ماہ نامہ ''شام و سحر'' کے مدیر کے طور پر اَدبی حلقوں میں معروف ہیں۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کے شعبوں سے اپنی گہری وابستگی کا ثبوت ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالات کی صورت میں فراہم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کئی طبع زاد اور مرتبہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ گویا انھوں نے بطور محقق اور نقاد علمی حلقوں میں اپنی شناخت کرائی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تازہ ترین تصنیف ''ترجیحات'' تحقیق و تنقید سے ان کی وابستگی کا ایک ثبوت فراہم کرتی ہے۔ شبیہ الحسن ان نقادوں اور محققین میں سے ہیں جو اَدب کو ایک وسیع تر تہذیبی پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ تہذیبی اقدار سے ان کی علمی وابستگی ان کی تحقیق و تنقید کو ایک نہج عطا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پامال موضوعات پر قلم اٹھانے کے بجائے زیادہ تر ان شخصیات کو تنقید و تحقیق کا موضوع بناتے ہیں جن پر پہلے بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کوشش میں بسا اوقات وہ نئی معلومات فراہم کرتے ہیں یا کسی ایسے زاویے کو سامنے لاتے ہیں جس میں تنقیدی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ تحقیقی مجموعہ ''ترجیحات'' ڈاکٹر شبیہ الحسن کے علمی سفر کا ایک نیا مرحلہ ثابت ہوگا۔

- **سیّد ہاشم رضا**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے میرے برادرِ محترم و مرحوم سیّد آلِ رضا کے فنِ غزل گوئی کے بارے میں جو کچھ اور جس طرح لکھا ہے، اسے میں Labour of Love سمجھتا ہوں، میں ان کی اُدبی کاوش اور شعری ذوق کی داد دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ان کی تصنیف ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' کے پڑھنے والے میری طرح ان کے تخیلات اور نتائج سے متفق ہوں گے۔

- **پروفیسر عتیق احمد**

''میں اس وقت اُردو تنقید میں ایک نئے نام کو خوش آمدید کہنے کا خوش گوار فریضہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نیا نام شبیہ الحسن کا ہے جن کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''مفاہیم'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ شبیہ الحسن معلّمی سے وابستہ ہیں اور مزاجاً شعر کے تخلیق کار ہیں۔ شعری وابستگی انھیں بھی ہمارے ایسے تنقید نگاروں کی صف میں لے جاتی ہے جنھیں صرف ''نقاد'' نہیں کہا جاتا۔ معلّمی کے پیشے سے وابستگی البتہ ہمیں ان کے ذوقِ مطالعہ اور ''جبریہ'' مطالعہ کی طرف دھیان دلاتی ہے۔''

- **ڈاکٹر عاصی کرنالی**

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی 'ترجیحات' کا مطالعہ مَیں نے دل چسپی اور انہماک سے کیا۔ اس سے پہلے بھی ان کی کئی تحریریں میری نظر سے گزری ہیں۔ ان کا میدان تحقیق و تنقید ہے اور تخلیق کے اُفق سے بھی وہ نمودار ہو کر ہماری نگاہ کے لیے حیرت سامانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ وہ نوجوان ہیں لیکن بڑی پختہ فکری کے ساتھ قرطاس و قلم کا حق اُدا کر رہے ہیں۔

- **پروفیسر رضی عابدی**

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ان اداریوں میں اُدب کے تقریباً تمام مسائل پر بحث ہے اور زیادہ اہم بات یہ ہے ان میں اُدب کو زندگی سے علاحدہ کر کے نہیں بل کہ خود زندگی کے ایک فعال شعبہ کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ اداریے اُدب کے حوالے سے زندگی کے متعلق اہم سوالات اُٹھاتے ہیں اور صحیح سوالات کا اُٹھانا ہی اصل دانش وری ہے۔

- **پروفیسر حسن عسکری کاظمی**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا اشہب قلم تحقیق اور تخلیق کی سرزمینوں میں جس برق رفتاری کے ساتھ دوڑ رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بہت کم وقت میں اُردو شعر و اُدب کی مختلف اصناف کے حوالے سے جتنا کام کیا اس کا احاطہ کرنے میں معقول وقت درکار ہے۔ صرف صنف

مرثیہ پر ان کی اہم تصانیف اور تالیفات کی بھی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین کے علاوہ سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں ''العطش'' کی تین جلدیں مدون کیں، ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا، نقد و نظر کا معیار دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سید شبیہ الحسن گہرائی اور گیرائی کے ساتھ محاکمہ کرتے ہوئے ان تمام فنی اور معنوی محاسن سے بحث کرتے ہیں جو ان مرثیوں کے اُدبی مقام کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، ابھی چند کتابیں زیر طبع ہیں جن میں اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف، لاہور کا دبستان مرثیہ اور سیف زلفی کے مراثی ان کے تحقیقی اور تخلیقی کارناموں میں شمار کیے جانے کے لائق ہوں گے، فی الوقت ان کی تازہ ترین تصنیف ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' پر گفت گو کرنا مقصود ہے۔ یہ خوب صورت کتاب اظہار سنز لاہور نے شائع کی، یہ ادارہ معیاری اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرنے کی روایت پر قائم ہے اور کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

- **احمد عقیل روبی**

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے وحید صاحب کے یہ گیارہ مرثیے مرتب کر کے عہد حاضر اور مستقبل کے قارئین کو العطش (جلد سوم) کی شکل میں ایک ایسا چشمۂ سخن دے دیا ہے جس سے وہ اپنی علمی، فکری اور شعری پیاس بجھاتے رہیں گے۔

- **ڈاکٹر معراج نیّر**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تعلق اس علمی و اُدبی خانوادے سے ہے جس نے ہمیشہ علم و اُدب کی بے لوث خدمت انجام دی ہے۔ صلے کی پروا سے بے نیاز، ترویج علم کے لیے ہمیشہ کوشاں۔ یہی رویہ ذاتی طور سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ہے۔

- **ڈاکٹر سیّد قاسم جلال**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اُن اہلِ قلم میں سے ہیں جنھیں مبدائے فیض سے غیر معمولی اُدبی صلاحیتوں سے نوازا جاتا ہے۔ ایسی شخصیات اپنے علمی و اُدبی کارناموں سے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کرتی ہیں بل کہ آئندہ زمانوں کے لیے بھی روشنی کا مینار بن جاتی ہیں۔ موصوف کی ذہنی تشکیل میں تین عوامل اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ (ا) خاندانی علم دوست و اُدب پرور ماحول (ب) ذہنی اُپج (ج) تدریس اُردو۔ ان تین عوامل کا مطلعِ تاباں پر تحقیقی لگن، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی رعنائی کی قوسِ قزح اپنے بوقلموں کی بہار دکھا رہی ہے۔ بقول جوش ملیح آبادی:

کچھ میرے ظرف نے بھی دیا ہے سبُو کو رنگ
کچھ عنصرِ نوازشِ روحانیاں بھی ہے

- **ڈاکٹر ہلال نقوی**

مَیں اپنی ابتدائی اَدبی زندگی سے گوشہ نشینی کی طرف مائل رہا ہوں لیکن آپ جگمگاتی فضاؤں میں میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لیے چلے جا رہے ہیں۔ یہ خلوص، یہ التفات اور پھر یہ انتساب۔ میرے لیے یہ قرض چکانے بہت مشکل ہوں گے۔ کیا مَیں اس قابل تھا کہ 'قیصرِ اقلیمِ مرثیہ' کا انتساب آپ نے میرے نام کیا؟ اب دُور دُور تک سنجیدہ لکھنے پڑھنے والے نظر نہیں آتے۔ کہیں نہ کہیں کوئی گرہ ضرور پڑی ہے۔ جو لوگ مرثیے کی تخلیق و تنقید میں اپنی محبتوں سے اب ایک نئی دنیا تعمیر کر رہے ہیں ان میں آپ کے نام پر لکیر نہیں پھیری جا سکتی۔ آپ کے نام کو کاٹا نہیں جا سکتا۔ آپ مسلسل لکھ رہے ہیں، مسلسل کتابیں سامنے آ رہی ہیں۔ 'قیصرِ اقلیمِ مرثیہ' میری لائبریری میں بھی رہے گی اور میرے دل کے نہاں خانے میں بھی۔ اس میں آپ کے خلوص کی خوشبو بھی ہے اور ایک بزرگ مرثیہ نگار شاعرِ سخن کی بھی۔

- **ڈاکٹر اجمل نیازی**

میں سمجھتا ہوں کہ شبیہ الحسن جیسے بندے بہت ہونے چاہئیں جو ایسی محفلیں آباد کریں کہ جہاں اپنے اندر گم ہونے والے لوگوں کو بھی تلاش کیا جا سکے۔ لوگوں نے کیسے کیسے لوگ اپنے اندر ہی کھو دیے ہیں۔ مَیں نے سیف زلفی کے یہ مرثیے پڑھے تو اُسے اپنے سامنے مرثیے پڑھتے ہوئے دیکھ لیا۔ ایسے شخص کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ اُسے یاد بھی کیسے رکھ سکتے ہیں۔ بھلانے اور یاد کرنے کے درمیان کوئی لمحہ کہیں ہے جہاں سیف زلفی جا کر آباد ہو گیا ہے۔ ہم وہاں پہنچیں تو اُس سے ملیں۔

- **ڈاکٹر مظفر عباس**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہمارے ان نوجوان لکھنے والوں میں شامل ہیں جن کے قلم میں ٹھہراؤ، فکر میں گہرائی اور رائے میں وزن ہے۔ اس سے پیشتر ان کی کئی کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور نقادانِ اَدب کی داد و تحسین کی مستحق ٹھہری ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے روایت انیس کے اس اہم اور جدید مرثیہ نگار و مرثیہ خواں کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ قیصر بارہوی کے گیارہ غیر مطبوعہ مرثیوں پر مشتمل ہے جسے ''معتبر مرثیے'' کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

- **پروفیسر سجاد مرزا**

محدود ضخامت کے پرچوں کے اداریے اختصار اور اجمال کی ایک خوب صورت مثال ہوتے ہیں۔ ''شام و سحر'' کے اداریے اس قبیل میں شامل ہیں۔ کسی رسالے کے مدیر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عصری مسائل کی شدت سے اپنے قارئین کو آگاہ کرتا رہے۔ مدیر ''شام و سحر'' ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے اس

فریضے سے غافل نہیں ہیں اور وہ اپنے قارئین کو ہم راہ لے کر چل رہے ہیں۔

- **ڈاکٹر عبدالکریم خالد**

ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کے کے ہاں تصنیف و تالیف کا شغف جس وافر انداز میں ملتا ہے، اس کے مظاہر اُوپر تلے شائع ہونے والی وہ کتابیں ہیں، جن میں اس کے تخلیقی اور تحقیقی جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اُس کا ذہنِ رسا تاریخِ اَدب کے بطن سے گوہرِ آب دار کی تلاش میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتا ہے۔

- **ڈاکٹر خورشید بیگ میلسوی**

معروف شاعر اور محقق ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اپنے اسلاف کی وراثت، اَدبی روایت اور ناقدانہ انفرادیت کی بنا پر اُردو اَدب کا اہم سرمایہ ہیں، جو کردار کو فن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ایک نقاد اگر انجمنِ ستائشِ باہمی کا رُکن بن جائے یا وہ ذہنی برہمی کے اظہار کے لیے کسی اہلِ فن کے فن پر ناخن تیز کرے تو یقیناً وہ پاک باز اور باکردار نقاد نہیں کہلا سکتا۔ یہ سیّد شبیہ الحسن کی خوش بختی ہے کہ وہ سیّد وحید الحسن ہاشمی جیسے نابغۂ عصر، نادر اُسلوب کے حامل مرثیہ گو شاعر کے گھر پیدا ہوئے۔ انھیں اپنے تایا حبیبؔ جون پوری اور دادا سیّد شبیر حسن صفاؔ کا اَدبی ورثہ نصیب ہوا۔ یہ گھرانہ شروع ہی سے لفظ کو زندگی کا گراں قدر اثاثہ سمجھتا تھا اور سچ کے لیے کبھی غزل، کبھی نثر تو کبھی مرثیے کی صنف کو اظہار کا ذریعہ بناتا رہا اور پھر اس گھرانے کا اہلِ بیتِ عظام سے تعلق بھی نشانِ ظفر مندی بنا جس نے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے فن اور شخصیت دونوں کو عرفان و آگہی اور غیبی مدد عطا کی کہ آج وہ بیسیوں کتابوں کے مصنف اور صاحبِ اُسلوب شاعر کے طور پر اپنی مثال ڈھونڈتے ہوئے اَدب کے مطالعے اور پھر تجزیے کے اور بجنل بیان پر قادر نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی شخصیت علم و مطالعے سے مزید تابناک ہوئی۔

- **ڈاکٹر عبدالستار نیازی**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا شمار موجودہ عہد کے دانش وروں میں ہوتا ہے۔ وہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ہراول دستے کے خاموش سپاہی ہیں جو ہر لمحہ اُردو زبان و اَدب کی اشاعت اور ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ اُن کی کتب کی تعداد ہاتھوں کی اُنگلیوں سے تجاوز کر چکی ہے۔ پچھلے دنوں اُن کی اہم کتاب ''تصریحات'' منظرِ عام پر آئی تو اُستادِ محترم جناب ڈاکٹر طاہر تونسوی نے باکمال محبت ایک نسخہ مرحمت فرمایا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ ہمیشہ علم و اَدب کے شائقین پر ایسی نوازشات کرتے رہتے ہیں تاکہ معاشرے کے دوسرے افراد پڑھ لکھ کر اچھے انسان بن سکیں۔ یہی اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔

- **پروفیسر سید محمد رضا زیدی**

وہ محقق جس کی جبیں میں شمع صداقت کا نور، نفس میں سوز، نظر میں شعور اور دل میں ذوقِ یقین ہے اُس کا نام ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہے۔ دیکھنے میں تنہا ہے لیکن اپنے آپ میں ایک انجمن، ایک ادارہ بل کہ چلتا پھرتا دارالعلوم ہے۔ جنابِ فیض جھنجھانوی کا ایک مصرع کتنا صادق آتا ہے:

ع تیرے دم سے گلشنِ شعر و سخن شاداب ہے

ان کے علاوہ مسلسل اشاعت کے انتیسویں سال میں داخل جدید و قدیم اَدب کا حسین سنگم، علم واَدب کی خدمت پر کمربستہ ماہ نامہ ''شام و سحر'' لاہور کے مدیر اعزازی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہیں۔ اس اَدبی پرچے کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ بہت سے ادیبوں کے اعتراف ہنر پر خصوصی نمبر شائع کر کے اَدبی صحافت میں ایک نئی روایت پیدا کی۔ حلقۂ شعرائے اہلِ بیت ہو یا عالمی مجلسِ اَدب، حلقۂ حمد و نعت و سلام پاکستان لاہور، انجمن اُردو مصنفین پاکستان لاہور ہو یا انجمن معراج اَدب لاہور ہو یا سید آلِ رضا میموریل کمیٹی پاکستان ہو ان سب میں:

رفیع ایوانِ جستجو ہے، وسیع دامانِ آرزو ہے

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اُردو اَدب کی ایسی خدمت کر رہے ہیں جو آج کے دورِ نا پرساں میں ایک عجیب سا کام لگتا ہے۔ ایک شخص اُردو اَدب کو ایسے ایسے گوہرِ نایاب تحقیق و ترتیب و تدوین اور تجزیوں کے حوالے سے اَدبی دنیا کو عطا کر رہے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

- **ڈاکٹر طارق عزیز**

'شام و سحر' باقاعدگی سے مل رہا ہے لیکن کوتاہی قلم کہ میں کبھی اظہار تشکر نہ کر سکا، استدعا ہے کہ درگزر فرمایئے۔ دسمبر ۲۰۰۴ء کا شمارہ نظر افروز ہوا۔ آپ کے حسن قدردانی کا قدردان ہوں کہ آپ نے یہ شمارہ عصرِ حاضر کی سب سے معتبر اَدبی شخصیت جناب سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کے نام کیا ہے۔ بلاشبہ وہ ان قرطاس سپاس کے حق دار ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی ذات گرامی بے انتہا وسعتوں کی حامل ہے۔ شمارہ میں شامل مندرجات نظم و نثر کے ذریعے سے ہم اس بحرِ بیکراں سے چشیدۂ نگاہ ہوئے ہیں۔ سیر چشمی کے لیے تو اس نوع کے کئی خاص نمبر درکار ہیں۔

- **امجد علی شاکر**

یہ مقالے اسی اجمال کی تفسیر تھے، جسے شبیہ الحسن نے بڑی محنت اور دانش سے مرتب کرنے اور پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی شبیہ الحسن کا کارنامہ بھی ہے۔ اس مقالے میں بعض مقامات کھٹکتے ہیں۔

بعض جگہ زبان و بیان کی کمزوری نظر میں کھٹکتی ہے اور بعض جگہ کلیشے کا استعمال جھنجھلا بھی دیتا ہے، مگر زیادہ تر اسی کے مثبت پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، کیوں کہ تکمیل کا دعوا یا خامی سے مبرا ہونا تو ناممکن سی بات ہے، جس کا کسی محقق سے مطالبہ کرنا نامناسب سا لگتا ہے۔

بہرحال، کتاب شبیہ الحسن کا تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ہے، جو اس کے مستقبل کی طرف سفر کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔

- **ناصر زیدی**

اُدب میں تحقیق و تنقید و تدوین کے ضمن میں ڈاکٹر شبیہ الحسن منفرد ہیں۔ دھڑا دھڑ کتابوں کی اشاعت اور وہ بھی خوب صورتی و دل کشی کے ساتھ، ان میں ایک اور تخصیص ہے۔ سب کچھ اپنی جگہ، تاہم ان کا مضبوط حوالہ جناب وحید الحسن ہاشمی ہی کا ہے۔ ایک اُستاد نے، مدرس نے، معلم نے تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی ایسی تربیت کی کہ باید و شاید! فخر ہوتا ہے گھرانے میں سدا ایک ہی شخص!

- **ڈاکٹر جواز جعفری**

ڈاکٹر شبیہ الحسن مانے ہوئے شاعر، نقاد اور محقق ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ''شام و سحر'' جیسے معروف اُدبی رسالے کے ایڈیٹر بھی ہیں جب کہ ان کی تدریسی ذمہ داریاں اس کے علاوہ ہیں۔ اتنے سارے شعبوں میں بیک وقت کام کرتے دیکھ کر انھیں اُدبی جن کہنے کو جی چاہتا ہے ورنہ ہمارے ہاں بہت سے ادیب ہیں، جنھوں نے اپنی زندگیاں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر ''زبانی ادب'' تخلیق کرتے ہوئے گزار دیں مگر شبیہ الحسن عملی آدمی ہیں، گزشتہ کئی سالوں سے ہر سال ان کی کئی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ عملاً یہ بہت سے لوگوں کے کرنے کا کام ہے جسے وہ اکیلے ہی انجام دے رہے ہیں۔

- **ڈاکٹر ریاض قدیر**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے چار غیر مطبوعہ مراثی کو ''سیف زلفی کے مرثیے'' کے نام سے تجزیہ و تدوین کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کیا ہے۔ مرثیہ کے حوالے سے اُردو تنقید میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اپنی متعدد تصانیف اور مضامین کے ذریعے ایک ممتاز مقام پیدا کر چکے ہیں۔ سیف زلفی کے مراثی کی تدوین نے اُن کے تحقیقی و تنقیدی اعتبار میں مزید اضافہ ہوگا۔ مراثی کے متون سے قبل لکھے گئے ایک سو چار صفحات جہاں صنفِ مرثیہ کے فنی اور تخلیقی اسرار و رموز کی گرہ کشائی کرتے ہیں وہاں اُردو مرثیے کے تہذیبی محرکات اور سیف زلفی کے مرثیوں کے امتیازی اوصاف کو بھی نمایاں

کرتے ہیں۔ کتاب کا نصف اول حصہ جو صنفِ مرثیہ اور سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کی تحقیق اور انتقاد پر مبنی ہے اپنی جگہ وقعت کا حامل ہے۔

- **ڈاکٹر ہارون قادر**

اپنے مقالے ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' میں شبیہ الحسن نے اپنے قارئین کو بے ساختہ اعتراف نگارش پر مجبور کرتے ہوئے اس یقین کا حامل بنا دیا کہ شبیہ الحسن کا تنقیدی شعور تنقید کے مسلمہ اصولوں سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہمارے کانوں تک ایک تازہ خوش گوار تنقیدی آواز پہنچ رہی ہے اور ایک ایسا تنقیدی لہجہ متعارف ہوا ہے جو روایت کے اعلیٰ اوصاف کے ساتھ عصری مزاج کے فنی تقاضوں سے ہم آہنگی کا اہتمام لازم گردانتا ہے۔ موصوف نے سیّد آلِ رضا کو پوری آب و تاب کے ساتھ ہماری فنی تاریخ کے شعری منظر کا ایک مستقل حصہ بنا دیا۔

- **محمد فیروز شاہ**

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ادارتی محنتوں نے تخلیقی محبتوں کے محور یوں سجائے کہ ایوانِ شام و سحر دل نشیں روشنیوں کی جگمگاہٹ سے بھر گیا۔ یہ اُن کی مدیرانہ کاوشوں کی داستان تھی مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی صلاحیتوں کا بیان بھی کچھ کم دل چسپ نہیں۔

- **سیّد اعجاز ثقلین بخاری**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی کئی پشتیں علم و اَدب اور عرفان و آگہی کی منزلیں سر کرتی رہی ہیں۔ ان کے والد گرامی سیّد وحید الحسن ہاشمی گذشتہ نصف صدی سے شاعری کے میدان میں جم کر کھڑے ہیں اور مرثیہ گوئی میں حدِ کمال کو چھو رہے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے شاعری کے ساتھ ساتھ وہ تمام تہذیبی اور اَدبی اقدار بھی ورثے میں پائی ہیں جن کی لطافت اور نفاست نے ان کی شخصیت میں توازن اور گداز پیدا کر دیا ہے۔ علم و اَدب اور تہذیبی قدروں سے والہانہ وابستگی کی جھلک ان کی ان تمام تحریروں میں دیکھی جا سکتی ہے جس کے انبار لگا کر بھی وہ اپنے طالب علمانہ عجز و انکسار کا اظہار کیے جاتے ہیں اور اپنے علمی و اَدبی کارناموں کی طویل فہرست پر احساسِ تفاخر سے سر اٹھانے کی بجائے سر جھکا دیتے ہیں۔ بے نیازی اور درویشی کا یہ رویہ انھیں اپنے والد گرامی سے عطا ہوا ہے جن کا اپنا یہ عالم ہے کہ جدید مرثیے کی مسندِ اعلیٰ پر براجمان ہونے کے باوجود وہ اپنے اساتذہ کا نام لینا نہیں بھولتے اور ان کے کہے ہوئے کو سند مانتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن چاہتے تو اپنے والد کی طرح شاعری میں نام پیدا کر سکتے تھے کہ شاعری کے تقاضوں سے باخبر بھی ہیں اور اچھا شعر کہنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے لیے تحقیق و تنقید کا میدان پسند

کیا اور تفکر و تعقل کی راہ سے گزر کر سوچنے اور مغز کھپانے کے خار مغیلاں و چننے کو اولیت دی۔ شاعری کے چمنستان میں پھلنے اور مصرعوں کی عطر بیز ہواؤں میں سانس لینے کی بجائے وہاں صحراؤں کی جانب چل دیئے جس کے گرم بگولوں کی تمازت حواس ہی نہیں جھلستی بل کہ اچھے بھلے انسان کی مت مار کر رکھ دیتی ہے۔ تحقیق اور تنقید کے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علو ہمتی اور جرأت مندی نے اس مسئلے کو بڑی خوب صورتی سے اپنے دام میں اسیر کر رکھا ہے اور کتاب پر کتاب چھاپے جا رہے ہیں۔

- **پروفیسر ذوالفقار علی**

ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ''آغا صاحب'' کی ترتیب و تدوین کے بعد ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنے بڑے ناقدین اور صائب الرائے ادبا سے یہ فن پارے تخلیق کروائے اور اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر آغا سہیل کو ایک تحفہ پیش کیا۔ اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں آغا سہیل پر صرف تعریفی کلمات ہی نہیں بل کہ تنقیدی آراء بھی موجود ہیں۔ بعض متنازعہ ہی سہی، شبیہ الحسن صاحب نے ان کو بھی اعتراض کے باوجود شامل کتاب کیا ہے، جو ان کی غیر جانبداری کا بین ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے مضامین [illegible] اخبارات اور پرانے رسائل سے تلاش کیے گئے ہیں، جن کے لیے بڑی ہمت اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے، لیکن ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے اس کام کو پورا کر دکھایا اور یوں ''آغا صاحب'' کی صورت میں انھوں نے اُردو ادب کو ایک تحفہ پیش کیا ہے۔

- **پروفیسر فرقان قریشی**

''ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کا تعلق اَدبی خانوادے سے ہونے کی بنا پر اُن کے مزاج اور عادات و اطوار میں قدیم اور جدید تہذیب اور روایات کا حسین امتزاج، گہرا ملاپ اور مخصوص رچاؤ شامل ہے۔ وہ تجربہ کار اُستاد، کہنہ مشق صحافی، معروف ادیب، نامور شاعر، بہترین محقق، ماہر نقاد، اعلیٰ کمپیئر اور مستند منتظم اعلیٰ ہیں۔ ان کی ایک ذات میں اتنی خوبیاں، اوصاف اور صفات پائی جاتی ہیں کہ انسان حیران اور ششدر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

- **جاوید صدیق بھٹی**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن متنوع صفات کے مالک ہیں لیکن ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ وہ طلبہ و طالبات کی دست گیری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں ان کے سیکڑوں شاگرد ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان کے روابط بہت زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اگر ان کا

بیس سال پہلے کا بھی کوئی شاگرد آ جائے تو وہ اسے مع اس کے سیاق وسباق کے یاد رکھتے ہیں وہ اپنے طلبہ سے محبت کرتے ہیں اور طلبہ وطالبات ان پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ وہ سنجیدہ فکر گفت گو کرتے ہیں اور بے معنی بولنا ان کے نزدیک ایک عیب ہے اسی طرح ان کی تحریروں میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور تمکنت ہے وہ مقدار سے زیادہ معیار پر توجہ دیتے ہیں انھوں نے کم لکھا جتنا بھی لکھا معیاری لکھا اس برس ان کے پندرہ سے زیادہ مضامین طبع ہو کر اہلِ دانش سے داد وصول کر چکے ہیں، اہم بات یہ ہے کہ یہ مضامین جدید وقدیم شعرا اور ادیبوں کی شخصیات اور فن کا کماحقہٗ احاطہ کرتے ہیں۔

- **مصدق لاکھانی**

ڈاکٹر شبیہ الحسن ان نقادوں اور محققین میں سے ہیں جو اَدب کو ایک وسیع تر تہذیبی پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ تہذیبی اقدار سے اُن کی علمی وابستگی ان کی تحقیق وتنقید کو ایک نہج عطا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پامال موضوعات پر قلم اٹھانے کی بجائے زیادہ تر ان شخصیات کو تحقیق وتنقید کا موضوع بناتے ہیں جس پر پہلے بہت کم لکھا گیا ہو۔ اس کوشش میں بسا اوقات وہ نئی معلومات فراہم کرتے ہیں یا کسی ایسے زاویے کو سامنے لاتے ہیں جس میں تنقیدی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

- **یعقوب تصور**

ڈاکٹر شبیہ الحسن آسمانِ اَدب پر ایک درخشاں ستارے کی حیثیت سے نمودار ہو کر بتدریج نظام شمسی ہی کی طرح نظام اَدب کے سیارگانِ ضوفشاں میں نمایاں تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس کا سبب یقیناً صرف اور صرف ان کی اَدبی ریاضت، مسلسل مطالعہ، علمی بصیرت، جذبۂ تحقیق اور پُر خلوص و حقیقی انہماک ہے اس مختصر وقت میں ان کے اَدبی ذخائر کا خاطر خواہ جائزہ پیش نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کی توضیح واظہار بہ طریقِ احسن اور بہ حد کمال ممکن ہے سو اس محفل میں جس میں امارات کے شائقین اُردو اَدب تشریف فرما ہیں مختصراً کچھ حقائق پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اب تک کتنی کتابیں لکھی ہیں لیکن جن کا علم ہے ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں: مفاہیم، ترجیحات، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، وہ کتابیں ہیں جو تنقیدی و تحقیقی مقالات اور مطالعہ پر مشتمل ہیں۔

- **پروفیسر وحید عزیز**

عصرِ حاضر میں ہمارے شعر واَدب کا حال اگرچہ کچھ بہتر نہیں ہے مگر اس کے باوجود کچھ کندھے ایسے مضبوط ہیں جنھوں نے اَدب کو اس کے روایتی اقدار کے ساتھ سنبھالنے اور عام لوگوں تک اسے جدید رنگ میں مکمل اور اصل روایت کے ساتھ پہنچانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اگرچہ ایسے لوگ بہت کم نظر

آتے ہیں مگر ان کے عزائم اس قدر مضبوط ہیں کہ جب ان لوگوں کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو عاشقانِ شعروادب کو حوصلہ ہوتا ہے کہ ہمارا شعروادب ناتواں نہیں ہے اور نہ ہی بے آسرا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، ایسے ہی عظیم لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے عصرِ حاضر کے اَدب کی ڈوبتی ناؤ کو اپنے علم کے چپوؤں کا سہارا دیا ہے تاکہ شعروادب کی ناؤ طوفانی تھپیڑوں کا مقابلہ کر سکے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہمارے اَدب کا ایسا نام ہے جنھوں نے تعصب سے پاک ہو کر اَدب کی خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تقریباً ۲۵ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں زیادہ تر کتابیں تحقیق و تنقید کے حوالے سے ہیں۔

- **مشتاق احمد**

''ڈاکٹر شبیہ الحسن اُردو اَدب کے اُفق پر شہرت کی بلندیوں کو چھوتا ہوا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اَدب کے میدان میں برسوں ریاضت کی ہے۔ یہ عصرِ حاضر میں اَدبی کارہائے نمایاں سرانجام دینے والی Multidimensional Personality کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بیک وقت معلم، شاعر، ادیب، نقاد، محقق اور ایڈیٹر ''شام وسحر'' ہیں۔ ان کی تحریر قرطاس ذہن پر منقش ہوتی چلی جاتی ہے۔ تنقید نگاری کرتے ہیں تو خوبیوں اور خامیوں کو الگ الگ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ تحقیق کرتے ہیں تو تمام خفیہ گوشوں کو افشا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ گویا ان کی تحقیقی کتاب میں Treasure of Knowledge بدرجہ اُتم موجود ہے جو عصرِ حاضر کے دیگر ریسرچ سکالرز کے ہاں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔''

- **پروفیسر صفدر نعیم**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک معروف محقق اور مستند نقاد ہیں۔ وہ ایک علمی اور اَدبی گھرانے کے فرد ہیں۔ اُنھیں شعری ذوق ورثے میں ملا ہے۔ ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی سحر انگیز شخصیت اور علمی تجربے نے اُن کی شخصیت کو نکھارنے میں اساسی کردار اَدا کیا ہے۔ وہ اُردو تحقیق، تنقید اور تدریس میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُنھوں نے بہت کم عرصے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر صاحبانِ علم و اَدب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے۔ اُن کی ۲۵ سے زائد تصنیفات و تالیفات شائع ہو کر قارئین اَدب سے داد وصول کر رہی ہیں۔

- **مظہر حسین مظہر**

''ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جدید روایت اور جدت کے اشتراک سے ایک ایسا تنقیدی نقطۂ نظر اپنایا سب سے منفرد اور جدا ہونے کے ساتھ توازن اور اعتدال جیسے اوصاف سے متصف ہے سب

کر اُن کا اُسلوبِ بیان ہے وہ کسی قیمت پر بھی فنِ تنقید اور اصولِ نقد و نظر کو قربان نہیں ہونے دیتے بل کہ نفیس اور لطیف پیرائے میں ایسی اچھوتی بات کر جاتے ہیں جو نہ تو آئین کے منافی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی تخلیق کار کی دل آزاری کا باعث، اس طرح کلمۂ خیر کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حقِ تنقید بھی ادا ہو جاتا ہے۔ اُن کے ذہنِ رسا، عصری حسیت، قوتِ متخیلہ، تنقیدی بصیرت، لسانیات پر عبور، منطقی اور مدلل اندازِ فکر، وسعت اور بالغ نظری، نظم و نثر پر دسترس اور بعض دیگر موروثی خواص نے نہ صرف اُنھیں باشعور نقاد بنا دیا ہے بل کہ ان تمام محاسن کے سبب اُن کی حیثیت ایک صاحبِ طرز اور قادر الکلام ادیب سے کسی طور کم نہیں انھوں نے ایک نئے تنقیدی دبستان کا سنگِ بنیاد رکھ کر سطحی اور ستائشی تنقید کے بند توڑ دیے ہیں ایسے میں اُن کے مقالے اور مضامین نثر کا شاہ کار بن گئے ہیں جس سے منزلِ انتقاد کو ڈھونڈنے میں کافی حد تک آسانی پیدا ہو گئی ہے۔"

- **سعید احمد سعید**

"ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی کتاب "تصریحات" تحقیق و تنقید سے ان کی گہری وابستگی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ کتاب کے سرورق پر سورج تاریکی دُور کرتے ہوئے طلوع ہوتا دکھایا گیا ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے صاحب زادہ سید شبیہ الحسن علم و ادب کے مشرقی اُفق سے نئی جہتوں اور نئی سوچوں کے ساتھ طلوع ہو رہے ہیں جب کہ کتاب کی پشت پر منفرد انداز سے بحیثیت "Orator" تھری پیس کے ساتھ ایک خوب صورت تصویر چھپی ہے جس سے ان کی بھرپور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔"

- **نجم الحسن رضوی**

"ڈاکٹر شبیہ الحسن کو ایسے اعزاز کی طلب نہیں، ایک تو وہ ہر معاملے میں اپنی واضح رائے رکھتے ہیں اور دوسری خاص بات جو ان کی اَدبی ترجیحات میں شامل ہے، یہ ہے کہ وبائے عام سے انھوں نے اپنا دامن بڑی حد تک بچائے رکھا ہے۔ مختلف اَدبی موضوعات کے جن مفاہیم تک وہ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں وہ عام نہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہی نہیں جن پر پہلے ہی بہت سے لوگ خامہ فرسائی کر چکے ہوں اگر چہ انھوں نے مرثیے کی صنف کے بارے میں تواتر سے لکھا ہے مگر ان کے فکری موقف سے خود مرثیے کی تفہیم اور اس کے مختلف فنی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح قاری کو شعر و اَدب کے باب میں ان کے مضامین کے ذریعے مختلف تہذیبی آفاق تک رسائی کا موقع ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا سب سے نمایاں تحقیقی کام یہ ہے کہ انھوں نے بعض ایسی اہم اَدبی شخصیتوں کے بڑے کامیاب شخصی اور فنی خاکے تیار کیے ہیں جن کے بارے میں لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔

- **مرید عباس خاور**

''ہمارے رویوں کی سنگ دلی میں اضافہ ہو رہا ہے اَدب کو ایسے ہی ماحول میں زندہ رہنا ہے۔ایسا ماحول جس میں زمین سے نمی غائب ہو رہی ہے بڑا شاعر کہاں ہے؟اس تلاش میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن دوسرے نقادوں کی نسبت زیادہ متحرک ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اور یجنل نقاد لفظوں کے اندر سخن کے موتی بھی دیکھ لیتا ہے اور وہ اضافی الفاظ بھی جو موتی تو ہوتے ہیں مگر سچے موتی نہیں ہوتے جس طرح ماہر فلکیات کو اب پلوٹو کے بونے سیارہ ہونے کا پتہ چل رہا ہے۔جس طرح کلوننگ سوسائٹی ایمان سے خالی نظام کا نتیجہ بن چکی ہے وجہ ہر عمل میں تعجیل بھی ہے اور اپنی پیشواؤں کی تعلیمات سے دُوری بھی انسان نجانے کب سے خدا کو لیبارٹری میں ٹیسٹ کرنے کے جنون میں مبتلا ہے یا ایسے بھی ہے کہ تصویر اپنے مصور بارے گمان کرے۔ایسے بے سخن عہد میں جب لفظ کی حرمت سے زیادہ لفظ کا بارا سے حسن سے دُور لے جا رہا ہے۔ رثائی،نعتیہ اَدب نہ صرف ہر جہان میں ہمارا نجات دہندہ بن سکتا ہے بل کہ ہمارے افکار کو آلودگی سے بچا سکتا ہے۔''

- **محمد افضل ثاقب**

''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب کے دل میں نہ صرف تخلیق کاروں سے پیار اور محبت ہے بل کہ وہ ان کے لیے بہت سے عملی کام بھی کرنا چاہتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کا تعلق اس قلم قبیلے سے ہے جو نہ صرف بڑے شہروں میں رہتے ہیں بل کہ دُور دراز مضافات میں اپنی جھوکیں آباد کر کے اور یجنل اور خالص اَدب تخلیق کر رہے ہیں اور ایسے لوگ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا ہے۔''

- **ڈاکٹر علی شیر طور**

''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو عصرِ حاضر کے نوجوان شاعروں سے پیار ہے وہ ان کی کاوشوں کو دوام دینا چاہتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ جہاں اس دور کا نقاد میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کی شاعری اور میر امنؔ دہلوی اور ہادی رسواؔ کی تخلیقات سے استفادہ کرتا ہے وہاں اُسے عصری رجحانات و میلانات کے حامل شعرا اور نثر نگاروں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اور اُن کی تخلیقات سے معاشرے کو فیض یاب کرنا چاہیے۔''

- **ڈاکٹر شہناز مزمل**

بعض ہمہ جہت شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوتا ہے۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار بھی ان ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔یوں تو اُردو اَدب کی بیشتر اصناف سخن پر آپ کو عبور حاصل ہے مگر مرثیہ آپ کا خاص موضوع ہے شاید یہ آلِ رضا کا روحانی فیض ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اس موضوع پر ایک مضبوط گرفت ہے۔انھوں نے اُردو مرثیہ نگاری میں اپنی نئی اور توانا

آواز کو شامل کیا ہے۔ عصرِ حاضر کی تاریخ کے نہایت نازک، دردناک اور خوں چکاں دور کو آپ نے اپنے اُسلوب سے مزید نمایاں کر دیا ہے اور اس کی ہیئت کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی سفر جاری ہے۔ آپ کا نام اُردو کے رثائی اَدب کا ایک معتبر حوالہ ہے۔

- **ثمر بانو هاشمی**

'شام وسحر' با قاعدگی سے آتا ہے شکریہ! اَدبی رسالوں کے حوالے سے یہ بھی ایک روشن چراغ ہے، روشنی کا اپنا ایک مقام کہ تاریکیوں میں راستہ دکھاتی ہے۔

- **مختار علی نیّر**

ہم ڈاکٹر شبیہ الحسن کی توجہ ایک خاص نقطے کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ متحدہ ہندستان کے زمانے میں لکھنؤ میں با قاعدہ ایک کالج تھا جو اس زبان کے لہجے کا تحفظ اور ادائیگی سکھایا کرتا تھا۔ بٹوارا ہونے کے بعد ہم اس ادارے سے محروم ہو گئے اور پھر کسی کو اس طرف خیال نہ آیا کہ اس قومی زبان کی شناخت اور اس کی خوشبوؤں کو محفوظ کیا جائے تا کہ اس زبان کے جتنے لہجے بھی کیوں نہ بنیں اپنا انداز بھی محفوظ ہو اس لیے کہ اس زبان کے اپنے بولنے والوں میں سے اس کا مزاج ختم ہوتا جا رہا ہے بل کہ ہم تو یہ کہہ گئے کہ اس زبان کے بولنے والے بھی اب خاصے بوکھلائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ وہ بے چارے اس زبان کے مختلف لہجوں میں پھنس گئے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن چوں کہ اُردو اَدب و الفاظ و نثر و نظم کے خود بڑے ماہر ہیں لہٰذا ہمیں امید ہے کہ اگر وہ سنجیدگی سے اس بات پر غور کریں تو صرف زبان اُردو ہی کیا ہم سب کی اس میں بھلائی ہو گی ہم عالمی مجلس اَدب کے اس کارنامے کو بنظرِ تحسین دیکھتے ہیں اور انھیں ایسے تاریخی سیمینار کو کامیابی سے ہم کنار کرنے اور اتنے مشکل عنوان سے انصاف کرنے پر تہِ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔

- **علامه سیّد انوار ظهوری**

شبیہ الحسن تعارف رضا میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوصف اتنے محتاط ہیں کہ ہر عنوان کو حوالوں کے لیے حواشی سے مزین کرنا ضروری جانتے ہیں۔ اس طرح ترتیب و تہذیب کا حُسن کچھ اس طرح نکھر سنور کر نمایاں ہوا کہ آئندہ کوئی محقق شبیہ الحسن کی تحقیقی کاوش کا حوالہ دیے بغیر سیّد آلِ رضا پر قلم نہیں اُٹھا سکتا۔

- **اختر سعیدی**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن عصرِ حاضر کے معروف محقق اور نقاد ہیں۔ شعر و اَدب کے حوالے سے بھی اُن کی ایک

شناخت ہے۔ وہ ایک علمی واَدبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے دادا صفا الہ آبادی، تایا حبیبؔ جون پوری اور والد سید وحید الحسن ہاشمی شعری دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُردو تحقیق، تنقید اور تدریس میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں اپنی تحقیقی صلاحیتوں سے صاحبانِ علم واَدب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

• اظہر غوری

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن دبستانِ لاہور کی ایک نابغہ روزگار شخصیت ہیں، درس وتدریس ان کا پیشہ ہی نہیں، ذوق بھی ہے اور یہ رحمت کئی ہزار میں سے کسی ایک آدھ پروفیسر صاحب کو ہی ارزاں ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں خود کو الجھایا نہیں بل کہ باقاعدگی سے خود کو تحقیق وتالیف کے کارہائے گراں مایہ میں منہمک رکھا ہے۔

• ڈاکٹر ندیم گیلانی

ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بہت واضح، جچا تلا اور تیکھا ہے۔ باتیں حکیمانہ سوچ کی آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ''آلِ رضا کی غزل گوئی'' کو موضوعِ سخن بنایا اور اس کے رموز ونکات کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے خلوصِ دل، وسعتِ مطالعہ اور گہری نظر سے ان کے کلام کی خصوصیات اور امکانات کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور علم وفن کے بارے میں متعدد صائب الرائے اہلِ قلم کے افکار کو کتابی شکل میں یک جا کر کے پاکستان کی اَدبی تاریخ کا ایک تقاضا پورا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی قابلِ قدر کتاب ''اسلم کولسری'' کو کئی سطحوں پر دریافت کر کے ایک اہم اَدبی فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب قابلِ تعریف ہے۔

• ڈاکٹر سید زوار حسین شاہ

ڈاکٹر شبیہ الحسن نہایت معزز علمی واَدبی گھرانے کے چشم وچراغ ہیں۔ آپ کے والد وحیدؔ الحسن ہاشمی معروف مرثیہ نگار ہیں، چچا حبیبؔ جون پوری شاعر، بھائی وصی الحسن نقاش شاعر، چچازاد بھائی اختر ہاشمی شاعر، خود محقق ونقاد اور اَدبی رسالے کے مدیر ہیں، کہنا چاہیے کہ شبیہ الحسن ہاشمی شعر واَدب کے ماحول میں سانس لیتے ہیں کہ ان کے چاروں اَور یہی ماحول ہے۔ ہاشمی صاحب کے مضامین و مقالات کی طویل فہرست ان کے ذوقِ سلیم اور ہمہ جہت ادیب ونقاد ہونے پر دال ہے۔ یوں تو شبیہ الحسن ہاشمی اَدب وشعر کے ہر موضوع پر قلم اٹھا سکتے ہیں کوئی صنف شعر واَدب ایسی نہیں جس کے بارے میں ان کے تنقیدی خیالات پڑھنے کو نہ ملے ہوں البتہ گھر کے حسینیت نواز ماحول نے انھیں

فطری طور پر نعت، منقبت اور مرثیے سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ چناں چہ انھوں نے بطور محقق و نقاد مدحیہ شاعری اور مرثیہ کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔

- **ڈاکٹر غلام یسین**

الغرض شبیہ الحسن نے ''شام وسحر'' کو ایک اَدبی تحریک بنا دیا ہے۔ علم واَدب کی سرپرستی از خود ایک کٹھن راہ ہے مگر اس سنگلاخ راستے پر شبیہ الحسن اب تک بڑی خوبی اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔ ایک جانب مستند اُدبا اور شعرا کی تحریریں اس کے اَدبی معیار کو فزوں تر بناتی ہیں تو دوسری جانب نو آموز لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اس اَدبی مجلّے کی اہم شناخت ہے۔ ''شام وسحر'' کے پرچے اپنے علمی و اَدبی معیار کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ ان میں کلاسیکی اور جدید رویوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ''شام وسحر'' نے مختلف ادیبوں اور شاعروں پر مضامین اور خاص نمبر شائع کیے ہیں، جو تاریخی اور مستند حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شبیہ الحسن مدیر اعزازی کی حیثیت سے ''شام وسحر'' کا اداریہ ''باتیں'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ دس پندرہ سطروں میں اہم اَدبی مسائل اور معاملات کو اس خوبی سے سمیٹتے ہیں کہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے اور ایک گہرا اثر بھی قائم رہتا ہے۔

اس طرح شبیہ الحسن کا بحیثیت مدیر اپنے معاصرین میں اختصاص یہ ہے کہ:

اول: ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اداریے مختصر اور جامع ہیں۔

دوم: یہ اداریے بڑے پُر اثر اور جاذب نظر ہیں۔

سوم: ان اداریوں کے اُردو اَدب پر دُور رس اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

چہارم: یہ اداریے گہرے ناقدانہ شعور کے حامل ہیں۔

- **سرفراز سید**

سیف زُلفی بڑے شاعر، بڑے انسان تھے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے انھیں اور بھی زیادہ بڑا بنا دیا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم کچھ لوگوں کے ساتھ طویل وقت گزارتے ہیں ان کی باتیں، ان کا کلام سنتے ہیں اس کی داد بھی دیتے ہیں مگر اکثر اکٹھے رہنے کے باعث ان لوگوں کی اس بڑائی اور فطرت کا کماحقہٗ احساس نہیں ہوتا مگر کسی روز اچانک وہ لوگ ہم سے دُور، بہت دُور وہاں چلے جاتے ہیں جہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ تب ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے کہ جانے والا تو بہت بڑا انسان تھا، بہت اچھا شخص تھا، وہ بھرپور زندگی آمیز باتیں کرتا تھا، ہماری خوشیوں اور دُکھوں میں یکساں شریک ہوتا تھا۔ وہ ہمیں اپنا کلام سنا کر آسودہ کر دیتا تھا۔ پھر یہ بھی یاد آتا ہے کہ جانے والا ہم سے کچھ بھی تو نہیں مانگتا تھا سوائے محبت کے دو جملوں، پیار اور خلوص کے دو بولوں کے!

- **پروفیسر حسین سحر**

ڈاکٹر صاحب ایک تازہ فکر محقق و نقاد ہیں اور خیال و فن کی پختگی کے اعتبار سے ایک وقیع مقام کے حامل ہیں۔ یوں تو تنقید کے مختلف دبستانوں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے مگر تہذیبی تنقید ان کا وصفِ خاص ہے کہ اپنی اکثر تحریروں میں انھوں نے تہذیب کے مختلف رویوں کو اُجاگر کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ وہ ایک باشعور نقاد ہیں اور ان کی تنقید میں ہمیں فکر و شعور کی بازیافت ملتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عصری تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان کے تفکر و تدبر میں ایک منطقی انداز ہے اور سماجی رویوں کی بھرپور ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں ہمیں عصری حسیت کے مظاہر عام ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیق و تنقید میں نفسیاتی عوامل کا کھوج لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان کے یہاں تاثراتی تنقید کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان خصائص کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کی تنقید میں جہاں وسعتِ نظر دکھائی دیتی ہے۔ وہاں ایک گہرائی اور گیرائی کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ مختصراً ان کے تنقیدی اُسلوب کو ہم جدید رویوں کی آئینہ دار سمجھتے ہوئے انھیں ایک ایسا جدید نقاد کہہ سکتے ہیں جس کے فن میں روایت کا مکمل احترام بھی ہے اور لمحۂ حاضر کا ادراک و شعور بھی۔

- **پروفیسر کلثوم طارق برنی**

ڈاکٹر شبیہ الحسن کم سے کم الفاظ میں نثر پارے کے مصنف کے بارے میں آرائش گفت گو کے بغیر کھل کر بات کرتے ہیں۔ تنقید میں بھی اُن کا مطمعِ نظر تحقیق ہے۔ اُن کے اُسلوب بیان سے کسی بھی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ معاملہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ اس کی تفاصیل کے بیان میں جزوی انحراف بھی روا نہیں رکھتے۔

- **محمد شفیع بلوچ**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیق و تنقید کا نقطہ مرکزی اور مرغوب موضوع مرثیہ اور مرثیہ گو شعرا رہا ہے، خاص طور پر جدید مرثیہ گو شعرا۔ مرثیے کی تحقیق و تنقید ڈاکٹر شبیہ کا امتیاز یوں ٹھہرتی ہے کہ رثائی ادب کے سلسلے میں ان کی اب تک شائع ہونے والی کتب میں نصف کے قریب مرثیے کی تدوین، تحقیق، تفہیم اور تفسیر سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد امکانی موضوعات پر مباحث کے درِ وا کیے ہیں۔ انھوں نے لکیر کو نہیں پیٹا بل کہ ایسا فکری موقف اختیار کیا ہے جو مرثیے کے کئی نئے زاویے سامنے لاتا ہے یوں مرثیے کی تفہیم اور اس کے فنی پہلوؤں کو مزید نکھارا ہے۔

- **عمران نقوی**

اُردو تحقیق اور تنقید کی دنیا میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی بیس سے زیادہ مطبوعہ کتب ان کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے آہستہ آہستہ اُردو شعر و اَدب کے سرمائے میں جو اضافہ کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ خاص طور پر درست متن کی تدوین کے حوالے سے ان کے ہر کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے العطش اور طاہرین کے عنوان سے سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں، نعتوں، سلاموں اور منقبتوں کو جس معیار اور سلیقے سے ترتیب دیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ معروف مرثیہ نگار قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کی تدوین ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' کے عنوان سے کر کے ایک گراں قدر علمی و اَدبی کارنامہ انجام دیا ہے۔

- **آفتاب احمد ملک**

ڈاکٹر صاحب کی فکر انگیز کتب کی خوشبو ہر سو حساس فکر و نظر کو معطر کر رہی ہے۔ جدید تنقیدی میدان میں انفرادی رجحانات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال محنت و محبت، کہنہ مشق شعرا و ادبا اور اہلِ قلم کی گم شدہ میراث کو صفحۂ قرطاس پر لا کر دم لیا ہے اور بکھری تنقیدی تاریخ کو یک جا کر دیا ہے۔ وسیع مطالعہ و عمیق تجربہ کی بنا پر بوسیدہ اوراق کو تحریراً کتب کی شکل میں اربابِ علم و کمال کو مطالعے کے لیے تحفتاً دی ہیں۔ ہر کتاب ایک چلتی پھرتی تاریخ ہے گو اس سیم زدہ بے حس معاشرہ میں کتب بینی نہ سہی اُس کے باوجود قومی و اَدبی جذبوں سے سرشار، مردِ قلندر نے بلا چوں و چرا اس یادگار کارنامے سرانجام دے کر تحقیق و تنقید کی نئی راہیں وا کی ہیں، بقول شاعر کے :

مجھے تنقید کی بوچھاڑ سے بجھنا نہیں آتا
مری آزادگی شعلہ مقالی ساتھ لائی ہے

- **محمد افضل ثاقب**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک ہشت پہلو نگینہ ہیں اور ان کی ذات کا ہر رُخ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ معروف شاعر، مقبول ادیب، مستند نقاد، بے مثال محقق اور دانش ور ہونے کے ساتھ ساتھ اس ہاشمی قبیلے کے جواں مرد ہیں جہاں قرطاس و قلم ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید علمی و فکری نظریات کے مبلغ جریدے 'شام و سحر' کے مدیر بھی ہیں جس نے قیامِ پاکستان کے بعد اَدب کی صورتِ حال کو بدلنے میں اپنا مثبت کردار ادا کیا

ہے اور میں یہ بات بلا مبالغہ و بلا شک کہہ رہا ہوں کہ نوجوانوں کی جتنی حوصلہ افزائی اس ماہ نامہ نے کی ہے کسی دوسرے رسالے نے نہیں کی۔ اس کے ساتھ ساتھ مضافات میں بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی جتنی قدر ڈاکٹر شبیہ الحسن کے وسیلے سے اس رسالے میں ہوتی ہے کسی دوسرے اَدبی جریدے میں نہیں ہوئی اور شاید آج میرا قلم اسی لیے ڈاکٹر صاحب کی مدیرانہ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے بے چین ہے۔

- **رابعہ سرفراز**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا شمار وطنِ عزیز کی قابلِ قدر علمی و اَدبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف کے ساتھ ساتھ ''شام و سحر'' جیسا معیاری علمی و اَدبی جریدہ زبان و اَدب سے ان کی گہری وابستگی کا عکاس ہے۔ ''تصریحات'' سیّد شبیہ الحسن کا ایک عمدہ تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے۔ یہ تصنیف پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ تمام مضامین اپنے موضوعات اور اُسلوب کے حوالے سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین میں عصرِ حاضر کے تخلیق کاروں کا بھرپور تذکرہ ہے۔ اس اعتبار سے ''تصریحات'' میں مختلف تخلیق کاروں کے تخلیقی رویوں کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے نمایاں اَدبی رجحانات بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔

- **سلیم احسن شیخ**

تعلیمی حوالے سے معلومات حاصل کرنے نکلا تو میری ملاقات ماہرِ تعلیم، عالمی اَدبی کونسل کے صدر اور پیک سلوشن (Peak Solutions) کے بانی ڈاکٹر شبیہ الحسن سے ہوگئی جن کا شمار اہلِ دانش میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے بیک وقت تعلیم و تعلم، ادب، صحافت اور شاعری کو اپنی پہچان کا ذریعہ بنایا۔ ایک خالص علمی اور مذہبی گھرانے سے تعلق کی بنا پر علمی اور اَدبی ذوق انھوں نے ورثے میں پایا اور اپنی محنت، ریاضت اور لگن کی بنا پر اسے عروجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے اُستاد ہیں۔ انھوں نے روایتی تدریس کے طریقوں سے الگ اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی جس میں طالب علم کے لیے نصابی سطح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید فکر و فلسفے سے اکتساب کا سامان بھی موجود ہے۔ اُردو اَدب کی کلاسیکی روایت کے باوصف عالمی اَدب میں رونما ہونے والے جدید رجحانات اور ان کے اثرات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ وہ مختلف زبانوں کے اَدب کے تقابلی مطالعے کے ہنر سے واقف ہیں اور اس مطالعے کی روشنی میں نئے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

- **رابعہ عرفان**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار جدید ناقدین اور محققین میں ہوتا ہے۔ مرثیے کی صنف سے ان کو خصوصی لگاؤ ہے۔ مرثیے کے حوالے سے ان کی اہم تصانیف میں ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' (تحقیق و تنقیدی مقالات)، ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحیدالحسن ہاشمی'' (تحقیق و تنقید)، ''سیف زلفی کے مرثیے'' (تجزیہ و تدوین) اور ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' (قیصر بارہوی کے ترپن مرثیوں کا تجزیہ و تدوین) شامل ہیں۔ مرثیے کے حوالے سے ان کی کتابوں کی یہ تعداد ان کی اس صنف سے خصوصی وابستگی کی غماز ہے۔

- **سعدیہ انور**

عام طور پر کلاسیک کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کلاسیک سے مراد وہ فن ہے، جو نہ صرف اُس دور میں، جب وہ تخلیق پایا، بل کہ آنے والے دَور میں بھی اتنی ہی ضرورت و اہمیت کا حامل ہو، اور اس کی مقبولیت کا گراف گرنے کے بجائے مائل بہ ارتقا ہو۔ ''آغا صاحب'' ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جس کی ضرورت و اہمیت نہ صرف دورِ حاضر میں ہے بل کہ آنے والے دَور میں بھی تشنگانِ اَدب کی تشنگی دُور کرتی رہے گی۔

- **سیّد اختر ہاشمی**

ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک منجھے ہوئے اُستاد اور مانے ہوئے محقق اور نقاد ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی اُردو شاعری پر ۱۹۹۶ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اپنی پینتالیس سالہ عمر میں تقریباً پندرہ اہم کتابیں تصنیف کیں اور آج بھی ان کی چار کتابیں زیرِ طبع ہیں انھیں اہلِ پاکستان کی طرف سے کئی اَدبی ایوارڈ مل چکے ہیں اور ان کی دو کتابیں انعام یافتہ ہیں۔ اب انھوں نے مختصر مرثیے کی تاریخ اور اس کی تکنیک پر ایک اہم کتاب لکھ کر ایک نزاعی باب کا خاتمہ کر دیا ہے چوں کہ مختصر مرثیے کے بانی جناب وحیدالحسن ہاشمی مانے جاتے ہیں اس لیے مصنف نے ہاشمی صاحب کے حالات و واقعات کے ساتھ ان اسباب پر بھی بحث کی جو مختصر مرثیے کی ترویج و ترقی کا سبب ہے۔

- **عابد منہاس**

شعر و اَدب کی اچھوتی صنف مرثیہ نگاری میں غوطہ زن ہو کر نظر دوڑائی جائے تو ایک طویل قطار نظر آتی ہے جس میں میر ببر علی انیسؔ، میرزا دبیرؔ، میرزا اوسؔ، سوداؔ، سکندرؔ، فیض احمد فیضؔ، جوشؔ ملیح آبادی،

پروفیسر احتشام حسین' نیاز فتح پوری' آلِ عباس' سیّد آلِ رضا' نجم آفندی' نسیم امروہوی' ڈاکٹر سلیم اختر' طاہر تونسوی...... سرخیل نظر آتے ہیں مگر اس حسین و جمیل جھرمٹ میں جناب ''سیّد وحید الحسن ہاشمی'' واضح اور منفرد نظر آتے ہیں۔ جن کی مرثیہ نگاری پر مجھ جیسے ناتواں قلم نگار کا لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ جناب وحید العصر پر قلم بند شدہ دیگر تحقیقی کتب سے قطع نظر ہوتے ہوئے میرے سامنے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تخلیق ''مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی'' پڑی ہے۔ جسے ابھی ابھی مکمل طور پر نگاہوں میں اُتارا ہے۔ ۲۲۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد دل و نگاہ نے سیّد وحید الحسن ہاشمی کو میر انیس ثانی تسلیم کرلیا ہے گو میر انیس کے مراثی نہایت طویل ہیں کئی تو ہزار کے لگ بھگ بند پر محیط ہیں۔ اس کے برعکس وحید العصر کے مراثی مختصر ہیں مگر سمندر کو کوزے میں سمویا گیا ہے۔ معانی اور مطالب یکساں ہیں۔ تحریر اور معانی کی چاشنی اور مٹھاس مساوی محسوس ہوتی ہے۔

- **امتیاز حسین**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نکتہ شناس، پختہ شعور، کہنہ مشق اور مستند محقق ہیں۔ بلاشبہ آپ اُردو اَدب پر بڑی عمیق نظر رکھتے ہیں۔ آپ کو معلوم تھا کہ بیسویں صدی کی شعری تاریخ میں سیّد آلِ رضا اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ اور غیر مدوّن ہے، جس کو طبع کرانے کی کئی ایک کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوسکیں۔ اس کی وجہ اس کام کا انتہائی دشوار گزار اور وقت طلب ہونا ہے۔

- **تاج سعید**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ''باقیاتِ آلِ رضا'' کی تلاش و جستجو کا مرحلہ بڑی کامیابی سے سر کرلیا۔ اس بھاگ دوڑ میں ان کے ہاتھ جو کچھ آیا وہ بڑا ہی قیمتی سرمایہ ہے اور سیّد آلِ رضا کے بارے میں یہ کتاب ایک یادگار کا درجہ رکھتی ہے۔ بڑی محنت اور خوب صورتی سے اس کتاب کی تزئین و آرائش کی گئی ہے جو صحیح معنوں میں سیّد آلِ رضا کے شایانِ شان ہے۔

- **فرح ناز**

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ایک طویل محنت و کاوش کا ثمر باقیاتِ آلِ رضا کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ آلِ رضا کی غزلوں کے دو مجموعے ''نوائے رضا'' اور ''غزل معلی'' ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بھی طبع ہوا لیکن اس کے بعد سے وفات تک انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا مکمل ریکارڈ نہ تھا۔ ان کی مطبوعہ تصانیف کے علاوہ ان کا قابلِ لحاظ غیر

مطبوعہ کلام بھی تلف ہوتا جا رہا تھا۔ ایک عرصے سے اس تمام بکھرے ہوئے کلام کو مدوّن کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے دس برس کی کڑی محنت اور ریاضت سے اس ہفت خواں کو طے کیا اور باقیاتِ آلِ رضا میں وہ تمام کلام اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو دست بردِ زمانہ کی وجہ سے ضائع ہونے والا تھا۔ تدوین کے دوران ڈاکٹر شبیہ کو جن جاں گسل حالات سے گزرنا پڑا اس کا احوال ان کے تحریر کردہ مقدمے میں ملتا ہے۔ بہر حال اس محنت کا ثمر ڈاکٹر صاحب کو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طرف سے ایم۔فل کی ڈگری کی صورت میں ضرور مل چکا ہے۔

- **روبینہ شاہین**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی دورِ حاضر کے ایسے نقاد ہیں جنھوں نے مختلف شعرا کے کلام کا فکر انگیز سیر حاصل اور کلی جائزہ لیا۔ تنقید میں بھی اُن کا اُسلوب دل چسپ، معنی خیز اور شیریں ہے۔ اُس کی اہم تصانیف مفاہیم' ترجیحات' اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار' تصریحات' باقیاتِ آلِ رضا' آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی' جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی' شام و سحر کی باتیں' آغا صاحب' کلیاتِ حبیب' العطش' منتخب مرثیے' اسلم کولسری کا شعری سرمایہ اور مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی۔

- **پروفیسر سجاد مرزا**

کسی رسالے کے مدیر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عصری مسائل کی شدت سے اپنے قارئین کو آگاہ کرتا رہے۔ مدیر ''شام و سحر'' ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے اس فریضے سے غافل نہیں ہیں اور وہ اپنے قارئین کو ہم راہ لے کر چل رہے ہیں۔

- **شفیق الرحمن الہ آبادی**

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار ان چند خوش نصیب ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی شخصیت اور فن کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کیا گیا، بل کہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ جدید نقادوں میں جس شخصیت کو سب سے زیادہ منظوم خراجِ تحسین پیش کیا گیا وہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہیں۔ آپ کی پوری زندگی علم و اَدب اور اس کی ترویج سے عبارت ہے۔ آپ ایک اچھے معلم، ادیب، محقق، نقاد، مدیر، منتظم اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ بحیثیت انسان بھی بہت خلیق ہیں۔

- **محمد اصغر انیس**

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی رثائی اَدب کے حوالے سے تمام تصانیف کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیں تو ایک خاص بات اُن کا اُسلوبِ نگارش ہے۔ وہ حتی المقدور سادہ اور رواں الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جس سے

اُن کے مافی الضمیر کی تفہیم نہایت آسان ہو جاتی ہے۔اس طرح دراصل وہ عام قاری کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ ناقدین کو اس اُسلوب میں عالمانہ شان کی کمی محسوس ہوتی ہو گی لیکن ایسی تحریریں جو اپنے اندر معانی کی گہرائی رکھنے کے بجائے صرف شکوہِ الفاظ کی پیش کش تک محدود ہوتی ہیں اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحریریں بات کو سادہ لیکن استدلال اور حوالے سے پیش کرنے کی عمدہ مثال ہیں۔اُن کا اپنا منفرد انداز ہے۔وہ مقلد بننے کے بجائے مخترع بننا پسند کرتے ہیں۔ کسی تخلیق کار کے فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت وہ ٹی ایس ایلیٹ کے اس قول کی پاسداری کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کے تحت تنقید کا مقصد اَدب پارے کی تنقیص کے بجائے تحسین کرنا ہے۔تنقید کرتے وقت وہ تند و تیز لب و لہجہ اختیار نہیں کرتے بلکہ دھیمے انداز میں اپنی بات قاری کے دل و دماغ میں اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں ہم طوالت کے خوف سے اُن کے اُسلوب کی صرف ایک مثال اُن کی معروف تحقیقی تصنیف ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' سے کریں گے۔

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے

ماہ نامہ شام و سحر لاہور

کے حوالے سے دانش وروں کی آرا

◆◆

- **پروفیسر کرار حسین**

"مجھے یہ رسالہ پسند ہے اور آپ کی اس کوشش پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

- **ڈاکٹر فرمان فتح پوری**

"شام و سحر" کی زیارت سے قلب و ذہن سیراب ہوتے رہتے ہیں، آپ کے لطفِ خاص کے سبب، آپ کی ادارت اور استقامت کی داد دیتا ہوں کہ پرچہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

- **پروفیسر ممتاز حسین**

"شام و سحر کا اداریہ پڑھ کر جی بہت خوش ہوا۔ ہارس ٹریڈنگ کا فقرہ خوب چسپاں کیا ہے اور پھر اَدب کے قاری حضرات کو بھی صورت حال کی تبدیلی سے متعلق خاصا چونکایا ہے۔"

- **ڈاکٹر وزیر آغا**

"خدا آپ کو ہمت دے کہ "شام و سحر" کو اسی طرح جگمگاتے رہیں۔"

- **میرزا ادیب**

"آپ "باتیں" میں سچی باتیں مخلصانہ انداز میں کہتے ہیں فوراً دل میں اُتر جاتی ہیں۔"

- **ظہیر کاشمیری**

"میرے خیال میں آج کل آپ "شام و سحر" ہی مرتب نہیں کر رہے بل کہ علمی و اَدبی دنیا میں کارنامے انجام دے رہے ہیں۔"

- **ضمیر جعفری**

"شام و سحر" میں وہ سب کچھ ہے جو زندگی کی شام و سحر میں موجود ہے۔"

- **سیّد وحیدالحسن ہاشمی**

''آپ کے رسالے 'شام وسحر' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر ماہ تسلسل اور تواتر سے شائع ہو رہا ہے جب کہ اکثر جریدے پوری شان وشوکت سے نمودار ہوئے اور پھر ابدی نیند سو گئے۔ رسالے کا جنم لینا کوئی اہم خوبی نہیں ہے اُس کی عظمت و بڑائی اُس مواد پر ہے جو رسالے کے بطن میں موجود ہوتا ہے۔ 'شام وسحر' میں نثری مضامین بھی ہیں اور قدیم و جدید شعرا کا کلام بھی۔ افسانے، تنقیدی مضامین، تبصرے، اداریے اور ادیبوں کے لائق توجہ خطوط بھی دل چسپی سے خالی نہیں ہوتے۔ رسالہ شام وسحر کئی برسوں سے ادیبوں کی شخصیت اور فن پر نمبر نکال رہا ہے۔ ان نمبروں سے ہمیں کسی ادیب وشاعر کی زندگی اور اُس کی فنی خصوصیات کا ادراک ہو جاتا ہے مثلاً پچھلے چند مہینوں میں عمر فیضی نمبر، جعفر بلوچ نمبر اور حمید کوثر نمبر شائع ہوئے جن سے کئی پوشیدہ گوشوں کا علم ہوا ہے۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ آئندہ بھی لاہور سے دُور دراز بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کے تفصیلی حالات پر مبنی نمبر شائع ہوں گے۔ اگرچہ یہ کام مشکل ہے مگر لگن ہو تو جوئے شیر نکالی جا سکتی ہے۔

- **ڈاکٹر آغا سہیل**

''شبیہ الحسن کے مرقوم مختصر اداریے انتہائی پُر مغز اور اہم موضوعات پر قارئینِ اَدب کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہیں۔ اگر بہ یک نظر از اول تا آخر ان پر توجہ کی جائے تو آئندہ کے لیے اصلاحی راستے کُھل سکتے ہیں۔''

- **ڈاکٹر انور سدید**

''شام وسحر'' کے اداریے بنیادی طور پر مسائل کے اداریے ہیں۔ یعنی جن سے دنیا فی الوقت دوچار ہے اور جو اَدب کے صحت مند ارتقا میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر مدیر ''شام وسحر'' نے ہمیں مصائب سے آگاہ کرنے اور اَدب کے راستے سے خاروخس ہٹانے کا مشورہ دیا ہے۔''

- **ڈاکٹر صدیق شبلی**

''آپ کی ہمت قابلِ داد ہے کہ اس کساد بازاری کے دور میں آپ ایک اَدبی رسالہ تسلسل کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔''

- **ڈاکٹر خیال امروہوی**

دعائے ہنر وعلم اندوزی۔ آپ کی جانب سے ایک جہازی ملفوف ابیض میں آپ کی تفصیلی خدمات کا مجموعہ موصول ہوا۔ موسمی شدت، علالت کی صحت نے صریر خامہ سے آب وتواں چھین کر بے مقصد انسان

بنادیا۔ ملک معراج خالد ایکسلینس ایوارڈ ملنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

- **پروفیسر محسن احسان**

مجھے 'شام وسحر' کے چار شمارے اکٹھے ملے جی خوش ہو گیا کہ آپ نے غیر حاضری پر بھی یاد رکھا۔ میں آپ کا پرانا مدّاح ہوں اور جانتا ہوں کہ آپ جن مشکل حالات میں علم واَدب اور زبان وتہذیب کی خدمت کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ ہر شمارے میں مضامین بڑے عمدہ ہوتے ہیں اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔

- **محترمہ بانو قدسیہ**

''اس عہد میں جب رسالے رنگوں سے اور رنگ سیاست سے اور سیاست شخصیت کے اشکال میں ڈھلتی رہتی ہے آپ کا رسالہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ابھی کچھ لوگوں کو ادب' ادیب اور قاری کی فکر ہے۔''

- **قاضی جاوید**

''آپ کی بندہ نوازی سے ''شام وسحر'' کے ساتھ رابطہ برقرار ہے۔ شکرگزار ہوں۔ آپ کی صحت اور مسرتوں کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ بہت سے دوستوں کی طرح میں بھی سب سے پہلے آپ کی ''باتیں'' پڑھتا ہوں اور پھر ''نامے مرے نام'' اس بار ''باتیں'' دوبارہ پڑھنی پڑیں۔ واقعی یہ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود آپ کے جریدے نے بائیس برس مکمل کر لیے ہیں اور تیئسویں میں قدم رکھ دیا ہے۔ ازراہ کرم میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے۔ خدا کرے کہ آپ کا یہ سفر جاری رہے اور آپ ہر ماہ اسی طرح دلوں پر دستک دیتے رہیں۔ بائیس برس کا طویل سفر آپ اور آپ کے معزز ساتھیوں کی پُرخلوص کومٹ منٹ کی یاد دلاتا ہے۔ اس وابستگی نے 'شام وسحر' کو اس کی انفرادیت بھی عطا کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش وخرم رکھے۔

- **جعفر شیرازی**

سال کے اختتام کے بعد آپ جو کچھ قارئین کی نذر کرتے ہیں وہ دوسرے لوگ نہیں کر پاتے۔ اَدب میں ایسی اختراعات، اَدب میں ایک ہی روش پر چلنے والے تھکے ہوئے لوگوں کو چونکا دینے کے لیے ضروری ہیں۔ جمود کو بہرحال توڑنا چاہیے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب آپ میں بھرپور صلاحیتیں ہوں۔ یہی زندگی ہے۔

- **ڈاکٹر شوکت زرّیں چغتائی**

مَیں نے دیکھا ہے کہ آپ ہر لکھنے والے کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، کوئی آپ کی نظر میں خاص و عام نہیں ہوتا۔ ہر ایک کو 'شام و سحر' میں کوئی نہ کوئی موقع ضرور فراہم کیا جاتا ہے۔ اس سے بہتر علم و اَدب کی سرپرستی ہو ہی نہیں سکتی جو آپ 'شام و سحر' کے ذریعے فرما رہے ہیں۔

- **جعفر بلوچ**

'شام و سحر' ماشا اللہ بہت خوب جا رہا ہے اور اپنے معیارِ انتخاب و ترتیب کے حُسن کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ سال کے آخر میں آپ جو کارروائیاں فرماتے ہیں وہ بہت اچھی ہیں۔ خصوصاً سال بھر کی اشاعتوں کا جائزہ شائع کرنا ایک اچھی اور مفید روایت ہے۔ لیکن گزشتہ نگارشات کی مکرر اشاعت میرے خیال میں تجاوزات کی ذیل میں آتی ہے۔

- **ڈاکٹر سعادت سعید**

آپ کی ادارت میں منظرِ عام پر آنے والے "شام و سحر" کے پرچے اپنے علمی واَدبی معیار کے اعتبار سے منفرد اور ممیّز ہیں۔

- **پروفیسر سجاد حارث**

جس لگن اور "کاسموپولیٹن" انداز سے "شام و سحر" شائع کر رہے ہیں یقیناً یہ ایک قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔

- **پروفیسر نظیر صدیقی**

آپ ادیبوں اور شاعروں پر محدود صفحات کے نمبر نکال کر ایک مفید خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔

- **حمایت علی شاعر**

"شام و سحر پابندی سے ملتا ہے۔ آپ ماشا اللہ بڑے قرینے سے اپنی مخصوص روایت کے ساتھ رسالہ ترتیب دیتے ہیں۔ مطالعے کے لیے مواد بھی خوب ہوتا ہے۔ بعض مضامین فکر انگیز بھی ہوتے ہیں۔"

- **خالد اقبال یاسر**

زیرِ نظر شمارہ فن و شخصیت پر آپ کے خصوصی شماروں کے نہ رکنے والے سلسلے کی حالیہ کڑی ہے۔ یہ آپ ہی کا حصہ ہے کہ آپ نامور شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ اُن پر بھی خصوصی نمبر شائع کرتے ہیں جو زیادہ معروف نہیں ہیں لیکن ان کا کام متنوع اور وقیع ہے۔ آپ کی نیک نیتی بہرحال قابلِ توجہ ہے اور آپ اس پر تحسین کے مستحق ہیں۔

- **ساحر لکھنوی**

میں ’’شام وسحر‘‘ کے عملۂ ادارت کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے ہاشمی صاحب کے بارے میں خصوصی نمبر شائع کر کے ایک ضروری فریضہ اُدا کیا۔

- **شریف کنجاھی**

حمید کوثر نمبر ملا اور اس میں وہ سب کچھ پایا جو کسی میں ہو سکتا ہے۔ پھر بھی انسانی کاموں کو کسی طرح مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے ایک چیز کھٹکتی ہے کہ کوثر صاحب نے کیوں حفیظ صاحب کی وفات پر نثر میں یا نظم میں اظہارِ غم نہیں کیا اور کیوں ۱۹۷۷ء کے بعد کا کوئی خط نہیں مل سکا۔

- **ڈاکٹر علی محمد خاں**

آپ نے ’شام وسحر‘ کا ’عمر فیضی نمبر‘ نکال کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ فیضی صاحب نے اگرچہ بہت کم کہا ہے لیکن وہ اتنے پائے کا ہے کہ ان کا شمار شعر واَدب کے اساتذہ میں ہو۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ایک مربی ومحسن کا نام زندہ رکھنے میں راست قدم اُٹھایا ہے اور آپ میرے نزدیک مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ’شام وسحر‘ آپ کی ادارت میں راہِ ترقی پر گامزن ہے۔

- **سلطان رشک**

آپ سے ملاقات کم کم، محبت بہت زیادہ ہے۔ مَیں آپ کے علمی، اَدبی اور فکری کاموں سے آگاہ ہوں اور اندرونِ قلب سے آپ کا مداح ومعترف ہوں۔

- **اصغر ندیم سیّد**

’’شام وسحر‘‘ سچے اور دیانت دار رویوں کا ترجمان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے نئے نقادوں کو راستہ دکھایا ہے اور اَدب میں ان کی جائز حوصلہ افزائی کی ہے۔ خدا آپ کو علم دوستی کی مزید توفیق دے۔‘‘

- **سلطان جمیل نسیم**

’’شام وسحر‘‘ کے اداریے اگرچہ مختصر ہوتے ہیں لیکن غزل کے فکر انگیز اشعار کی طرح دل میں اُتر جاتے ہیں۔‘‘

- **پروفیسر غلام حسین ساجد**

’’آپ نے ’’شام وسحر‘‘ کے اداریے میں تخلیق کاروں کی باہمی آویزش پر کڑی گرفت کی ہے۔‘‘

- **ڈاکٹر ریاض قدیر**

یہ امر مسرت افزا ہے کہ آپ اُردو زبان واَدب کی خدمت کا سفر مستقل مزاجی اور بلند حوصلگی کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ’شام وسحر‘ کا خاص وصف جو ہمیشہ مجھے متاثر کرتا رہا ہے، یہ ہے کہ اپنی مختصر

ضخامت کے باوجود یہ شمارہ ہر ماہ جہاں اُردو کے بڑے ادیبوں کی نمائندہ تحریروں سے مزین ہوتا ہے، وہاں بساطِ اَدب کے نوواردان کی تربیت کا فریضہ بھی نہایت ذمہ داری سے انجام دے رہا ہے۔

- **پروفیسر منیر قصوری**

''آپ کا مجلہ شام وسحر، جعفر بلوچ نمبر نظر نواز ہوا۔ اس کا سرورق دیکھتے ہی دل کو انتہائی مسرت ہوئی:

ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

جو علم واَدب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے حق دار کو اُس کا حق دے کر تاریخ اَدب میں ایک بڑا کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ آپ کا مجلہ مذکورہ نعت نمبروں کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں شہرتِ دوام پا چکا ہے۔ نعت کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھانے والا کوئی لکھاری بھی اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

- **ڈاکٹر نواز حسن زیدی**

''عصرِ حاضر کے اَدب کُش ماحول میں ''شام وسحر'' کا شائع ہونا اور مسلسل شائع ہونا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ 'شام وسحر' میں شائع ہونے والی ہر تحریر اپنی نوعیت کے اعتبار سے وقیع اور قابلِ قدر ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس جریدے کے مختلف شخصیات پر نکالے گئے نمبر انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اَدبی رسائل کی تاریخ میں 'شام وسحر' ایک اہم دستاویز ثابت ہوگا۔

- **ڈاکٹر قاسم جلال**

''دلی خوشی ہوئی کہ آپ نے زندہ اہلِ قلم پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا آغاز کر دیا ہے۔ جعفر بلوچ نمبر شائع کر کے آپ نے اُن حقیقی اہلِ علم واَدب کی خدمات کو اُجاگر کرنے کی طرح ڈالی ہے جو 'لابیوں' گروہ بندیوں اور جوڑ توڑ سے بے نیاز ہو کر قرطاس وقلم سے رشتہ استوار کیے ہوئے ہیں۔ آپ کی مساعی سے وہ حقیقی ٹیلنٹ سامنے آئے گا جس کے رشحاتِ فکر کی ملک وقوم کو اشد ضرورت ہے اور جسے ذرائع ابلاغ نے بُری طرح نظر انداز کر رکھا ہے۔''

- **ڈاکٹر اشفاق احمد ورک**

''آپ نے شخصیات کے بارے میں تفصیلی کوائف کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ آنے والے دَور میں تحقیق کے میدان میں یقیناً خاصا وقیع ثابت ہوگا۔ پھر آپ نے شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا بھی خوب صورت سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔''

- **آثم فردوسی**

''اس طوفانی ماحول میں ''شام وسحر'' کا عرق ریزی کے ساتھ شائع ہونا اَدبی دنیا کا معجزہ ہے۔''

- **پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد بیگ**

میں آپ کی علمی واَدبی کاوشوں کا ہمیشہ قدر دان رہا ہوں۔ آپ علم واَدب کے فروغ کے لیے جو کوششیں کرتے ہیں میں انھیں تحسین کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ماہ نامہ 'شام وسحر' آپ کے تعاون سے ہر ماہ دردل پر دستک دیتا ہے۔ گزشتہ ماہ ''حمید کوثر'' نمبر نکال کر آپ نے علم واَدب دونوں کی خدمت کی ہے۔ آپ کی اس کاوش کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

- **ڈاکٹر مرغوب حسین طاہر**

خدا آپ کو اجر عطا فرمائے کہ آپ ایسی شخصیات کے لیے بھی اپنا شمارہ مختص کرتے ہیں جن کی کوئی لابی نہیں ہوتی۔ حمید کوثر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں ۷۴۔۱۹۷۳ء میں میرے اُستاد رہے۔ رسالہ میں ان کی زندگی، شخصیت اور علمی واَدبی سرگرمیوں کے کئی پہلو سامنے آگئے ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد کم ہے لیکن انھوں نے اصل سرمایا ان لاتعداد شاگردوں کی صورت میں چھوڑا ہے جو ان سے فیض یاب ہوئے۔ حمید کوثر صاحب طلبا میں صرف اَدبی ذوق ہی پیدا نہیں کرتے تھے بل کہ ان کی ذہنی، فکری اور نظریاتی تربیت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے۔ ایسے لوگ جو نئی نسل کی اخلاقی اور روحانی رہنمائی کرتے ہیں مسیحا کا درجہ رکھتے ہیں مگر آپ جیسے چند ایک لوگوں کے سوا کسی کو ایسی شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی کیوں کہ اس عمل سے مالی اور مادی منفعت کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

میں آپ کو اس کارِ خیر پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

- **پروفیسر جمیل احمد عدیل**

''شام وسحر'' کے بغیر اب شام وسحر کی گردش بے معنی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ سچی بات ہے آپ کے مختصر سے مگر مکمل اَدبی جریدے کی اس عاجز کو ''عادت'' ہوگئی ہے۔ آپ کا ممنون ہوں کہ باقاعدگی سے آپ مجھے ''شام وسحر'' بھجوا رہے ہیں۔ محکمہ ڈاک والے بھی شاباش بل کہ تحسین کے مستحق ہیں کہ نادانستگی میں بھی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتے، اس طرح شام وسحر کی روایت میرے ہاں تو قوی بھی ہے اور مرفوع بھی۔ یہ بھی عجیب کرم ہے اُوپر والے کا کہ یہ رسالہ مرفوع القلم اصحاب قلم سے محفوظ ہے۔

- **ڈاکٹر ریاض کامل**

ماہ نامے کی دو تین خصوصیات نے خاص طور پر متاثر کیا۔ اولاً تو یہ کہ تقریباً تمام مضامین تنقیدی ہیں۔

افسانوی اَدب تو اکثر رسالوں میں مل جاتا ہے مگر تنقیدی مواد عموماً مفقود ہوتا ہے مثلاً اقبال کی شاعری کا کلاسیکی پہلو پہلے کبھی میری نظر سے نہ گزرا تھا۔ ثانیاً ایک ہی شخصیت پر مضامین ایک ہی جگہ پر دستیاب ہو جانا بھی بہت اعلیٰ خصوصیات ہے۔

- **ڈاکٹر ضیاالحسن**

آپ نے 'شام وسحر' کو تسلسل سے ایک اہم اَدبی رسالہ بنانے میں جو کاوش کی ہے، وہ بے حد قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے حوالے سے خصوصی شمارہ دیر تک زیر بحث رہے گا۔ سلیم اختر کا شمار اُردو کے اہم افسانہ نگاروں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کے فن اور شخصیت پر آپ نے وقیع مضامین شامل کیے ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر زندہ ادیبوں پر کام کرنے کا رواج کم ہے۔ آپ جیسے صاحب بصیرت لوگ ہیں جو بڑے لوگوں کے کام کا اعتراف یوں کھلے دل سے کرتے ہیں۔

- **ڈاکٹر محمد کامران**

''شام وسحر'' کے تازہ شمارے میں آپ نے عمر فیضی کی یاد میں جو کہکشاں سجائی ہے لائق تحسین ہے۔ ایسے مرنجاں مرنج، نستعلیق، وضع دار اور اعلیٰ تخلیقی جوہر کے حامل شاعر کو اَدبی برادری نے جس طرح نظرانداز کیا اس پر ہمیں بجا طور پر ندامت ہونی چاہیے۔ آپ نے اَدبی برادری کی اجتماعی فروگذاشت کا ''کفارہ'' ادا کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ اَدبی مراکز اور ہر قسم کے سودوزیاں سے بے نیاز، پرورش لوح وقلم کرنے والے ایسے بے مثل شاعر کو ڈھونڈنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔ خدا ان کے درجات بلند کرے اور آپ کو اس اَدبی نیکی کی جزا دے۔

- **پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال**

آپ کی اَدبی، صحافتی خدمات تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ''شام وسحر'' کی صورت انھیں جاری و ساری رکھے اور آپ کو درازیٔ عمر کے ساتھ سدا صحت مند رکھے۔ آمین!

- **ابرار حامد**

ماہ نامہ ''شام وسحر'' کو آپ نے اَدبی دنیا میں جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے، یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں آپ کی اَدبی خدمات کو سلام کرتا ہوں۔ اس میں شامل شاعری، افسانے، خاکے اور دیگر مضامین کا انتخاب ایک بہترین انتخاب کے زمرے میں آتا ہے۔ آپ کی یہ مسلسل کاوشیں یقیناً بار آور ہوں گی بل کہ ہو چکی ہیں۔ اب تو ''شام وسحر'' کا انتظار رہتا ہے۔

- **کرامت بخاری**

مَیں نے ''شام وسحر'' پہلی ہی نشست میں ختم کر لیا اور سوچا کہ فوراً جواب لکھ دیا جائے۔ اس دفعہ اشاریہ

اور جائزہ دونوں بہت خوب رہے۔ مختصر، جامع اور مؤثر ''شام وسحر'' کئی اَدبی جرائد سے کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ آپ ان تمام شخصیات کے حوالے سے مضامین اور تنقیدی تخلیقات پیش کرتے ہیں، جن کو دانستہ طور پر بھلا دیا گیا ہے۔

- **سید مسعود زیدی**

''شام وسحر'' نہایت باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ آپ جہادِ مسلسل کر رہے ہیں۔ اس ناقدری کے دور میں اس قدر مستقل مزاجی سے اَدبی رسالے کا اجرا و کرنا صرف آپ کا حوصلہ و ہمت ہے۔

- **موسیٰ نظامی کلیم**

یہ شاعرانہ تعلّی نہیں بل کہ حقیقت ہے کہ ماہ نامہ ''شام وسحر'' اب اپنے معیاری مضامین اور ''گیٹ اپ'' کے لحاظ سے عالم گیر، ہمایوں، ساقی وغیرہ کا ہم پلہ نظر آرہا ہے۔ اس عظیم الشان کامیابی اور ترقی پر آپ کو تہہ دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ ''گر قبول افتد زہے عز و شرف۔''

- **پروفیسر عباس تابش**

''شام وسحر'' جس باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے اُس کا تو میں آغاز ہی سے معترف ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اس اَدبی جریدے کا معیار بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ کچھ تخلیق کار تو ایسے ہیں، جو صرف ''شام وسحر'' میں شائع ہوتے ہیں۔ ان شعرا و اُدبا کے تخلیقی مزاج سے ''شام وسحر'' ایک الگ دبستان کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

یہ جو آپ نے سال بھر کی تخلیقات کے انتخاب کی روایت قائم کی ہے، یہ 'شام وسحر' کے علاوہ کہیں نہیں۔ اس پر آپ کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ مَیں آپ کی ہمہ جہت شخصیت پر کبھی کبھی رشک کرتا ہوں۔ آپ اتنی مصروفیات کے باوجود 'شام وسحر' کو جس توجہ اور محبت سے مرتب کرتے ہیں، وہ صرف اور صرف آپؐ ہی کا حصّہ ہے۔ ایک اور بات جس کی طرف توجہ دینا انتہائی ضروری ہے، وہ آپ کا غیر جانبدارانہ روّیہ ہے۔ آپ کے جریدے میں مجھے ہر گروپ کا ادیب دکھائی دیتا ہے، یقیناً یہ آپ کی شخصی خوبی ہے کہ آپ متضاد سوچوں کے حامل لوگوں کو یک جا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ ''شام وسحر'' کی ضخامت بڑھا دیں۔''

- **ڈاکٹر اسد عباس**

مئی کا 'شام وسحر' ملا۔ اداریہ بہت خوب ہے۔ آپ نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ گزشتہ پندرہ بیس برس کے دوران کسی بڑی اَدبی تحریک کا پیدا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ آپ کے اس سوال کے جواب میں انور سدید، حسن عسکری کاظمی، سہیل عباس خان، اظہر جاوید، خیال امروہوی، عبدالکریم خالد، ناصر زیدی،

محمد حامد سراج، جعفر بلوچ، محمد فیروز شاہ، ظفر الحق چشتی، شہزاد احمد جیسی شخصیات دے سکتی ہیں۔ ہر چند یہ بڑے لوگ ہیں۔ ایک عہد ان کا معترف ہے، میرے بھائی آج کل ہمارے ملک میں چند ایک تحریکیں چل تو رہی ہیں لیکن ان پر مخصوص لوگوں کا قبضہ ہے۔ اگر وہ رسالہ نکالتے ہیں تو محض اپنا ہی کلام شائع کرتے ہیں کوئی مشاعرہ ہو تب بھی وہی نام، میں کافی دنوں سے اس غور و فکر میں ہوں کہ پندرہ بیس برس تو کیا صرف دس برس قبل بھی کوئی بڑی تحریک پیدا ہو جاتی تو آج ہمارا اَدب منافقوں کی زد میں نہ ہوتا...... آگے جا کر آپ نے اداریے میں لکھا ہے کہ ”خاص طور پر مضافات میں رہنے والے تخلیق کاروں کو چاہیے کہ وہ اس حوالے سے اجتماعی اَدب تخلیق کریں تا کہ ان کی تخلیقات سے اَدبی تاریخ کی ایک سچی اور کھری دستاویز مرتب کی جا سکے“ بھئی مَیں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے مضافات میں بہت موثر اَدب تخلیق ہو رہا ہے، میں زیادہ باہر نہیں جانا چاہتا کہ ہمارے علاقے (مضافات) میں ”شفیع بلوچ“ جیسا افسانہ نگار، حسین اُلفت بلوچ جیسا غزل گو موجود ہے۔ ان کا مضافاتی اَدب میں نام ہے بل کہ یہ کمال لوگ ہیں، اس سلسلے میں پچھلے دنوں جدید اُردو نظم کے عمدہ ترین نظم نگار عامر عبداللہ سے میری بات ہوئی وہ کہہ رہے تھے کہ مَیں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل شہروں کی نسبت مضافات میں بہت موثر اور احتجاجی اَدب تخلیق ہو رہا ہے لیکن نئے لکھنے والوں کے ساتھ تعاون نہیں کیا جا رہا۔ ان کی چیزیں نام نہاد گروپوں والے شائع نہیں ہونے دیتے اور انھیں بغیر پڑھے سوچے سمجھے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مضافات میں بہت کم لوگ ہیں جو آج کل رسائل میں چھپ رہے ہیں۔ بھئی آپ جو بھی اداریہ لکھتے ہیں لفظ لفظ دعوت دیتے ہیں۔

- **محمد ہارون عثمانی**

اکتوبر کے 'شام وسحر' نے بہت متاثر کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر ہمارے عہد کے ایک بڑے ادیب اور دانش ور ہیں۔ اُن کے اَدبی کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن اُستاد کی حیثیت سے ان کی علمی شخصیت عام لوگوں کی نگاہوں میں اوجھل تھی۔ آپ نے ڈاکٹر سلیم اختر کی اُستاد کی حیثیت کو اُجاگر کرتے ہوئے 'شام وسحر' کا شمارہ خصوصی طور پر شائع کیا ہے جو یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ اس خصوصی شمارے کی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ اس وقت چھپا جب ۵ اکتوبر کو پوری دنیا میں ”سلام ٹیچر“ کا دن منایا جا رہا تھا۔ اس خوب صوت کاوش پر میری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے۔ اس نوعیت کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے کیوں کہ اہلِ اَدب کی ناقدری ہمارا معاشرتی المیہ بن گیا ہے جس کی مذمت کرتے ہوئے ہمیں اُن کی علمی عظمتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی علمی شخصیت کے

بہت سے پہلو عیاں ہوئے ہیں۔ جناب وحید الحسن ہاشمی صاحب کی نظم کا تو جواب ہی نہیں ہے۔

- **رائے نوید الحسن**

کسی بھی معاشرے میں ادبی سرِ احساس کو پھیلانے میں رسائل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی وساطت سے نئے نئے شاعروں، ادیبوں، محققوں اور نقادوں کے لہجوں کی شناسائی ہوتی ہے۔ یہاں اُن کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اُدبی ذوق کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے معیار کو بھی بڑھائیں۔ ''شام و سحر'' کا باقاعدہ قاری ہونے کی حیثیت سے یہ بات کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس نے اپنا معیار کبھی گرنے نہیں دیا۔ اس نے جہاں تخلیق کے لیے نمونے پیش کیے ہیں وہاں تخلیق کاروں کی بھی مختلف جہات کو ہمارے سامنے لایا ہے۔

- **شبہ طراز**

نومبر اور دسمبر ۲۰۰۱ء کے شماروں میں آپ کے اداریے بہت درست ہیں لیکن جس طرح مُلّا کا تمام اسلام عورت کے پردے کے گرد گھومتا ہے اسی طرح آپ کا غصہ خواتین شاعرات پر زیادہ لگا۔ دراصل مرد حضرات اس طرح کی شاعرات کو ایک جانب تو ہوا دیتے ہیں اور دوسری جانب شاید اُن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جھوٹی سچی تعریفوں کے ساتھ ساتھ امداد بھی کرتے ہیں۔ امدادی شاعری پر انحصار کرنے والے مرد شاعروں کی تعداد بھی کافی ہے لیکن چوں کہ میڈیا بذاتِ خود ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے بات دب جاتی ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں نقصان اُدب کو پہنچتا ہے بل کہ اُدب سے زیادہ اُدب کا قاری نقصان میں رہتا ہے۔

- **محمد حامد سراج**

علم و آگہی کے اس روشن جریدے میں شامل تمام اصناف سخن نے روح کو جلا بخشی۔ آپ کا اداریہ خاصا فکر انگیز ہے اور صاحب علم کو جھنجوڑنے کو کافی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس عہد میں ہم سانس لینے کے عذاب سے گزر رہے ہیں وہاں توقیر کا معیار دولت ہے۔ وہ عہد خواب و خیال ہوئے جس میں صاحبانِ علم کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔

- **مسز عقیلہ کاظمی**

''شام و سحر'' کے ہفت رنگ دلوں پر دھنک برساتے رہتے ہیں۔ آپ کی کاوشیں اس کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا ''نقطہ نظر'' اور پروفیسر حسن عسکری کا مضمون قابلِ تعریف ہے۔ افسوس اور حیرت اس نہج پر ہوتی ہے کہ یہ اُدبی دنیا کے قد آور لوگ ہیں جو ہم جیسوں کے لیے رول ماڈل

ہیں مگر جب ایسے رویئے دیکھنے کو ملتے ہیں تو سوا اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

تنگ تنگ دیدم نہ کشیدم

اللہ انھیں محبت کا رستہ دکھائے اور اس پُر آشوب زمانے میں یہ لوگ اچھی روایت قائم کر سکیں۔

- **علی حسین جاوید**

آپ جیسے اہلِ قلم کا دم غنیمت ہے جو اَدبی پرورش کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہیں اور یہ تحریک آپ اور آپ جیسے دیگر اہلِ قلم ہی کی مرہونِ منت ہے کہ آج ہمارے سامنے ایک ایسا اَدب پروان چڑھ رہا ہے جو معاشرتی فلاح کا راستہ بھی دکھا رہا ہے اور ایک فن کار کے احساسات کی ترجمانی بھی کر رہا ہے۔ مزید براں اَدب کے روشن امکانات کا مظہر بھی ہے۔

- **پروفیسر ظفر الحق چشتی**

ایک بات برادرم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے اداریوں کے حوالے سے یہ ہے کہ اُن کی باتیں ایک دردمند دل کی آواز ہیں۔ وہ علم و دانش اور شعر و اَدب کو عصرِ حاضر کے حالات و واقعات کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر پر اُن کی گہری اور کڑی نظر کا ثبوت یہ ہے کہ اس سال کے بارہ شماروں میں سے آٹھ شماروں کی باتیں ''عصرِ حاضر'' سے شروع ہوتی ہیں۔

- **انجم چودھری**

شام و سحر میں کہنہ مشق اُدبا اور شعرا کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ نوآموز لکھاریوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔ 'شام و سحر' کی وساطت سے نہ صرف نوآموز لکھاریوں کی اَدبی تشنگی دُور ہوتی ہے بل کہ اُن کے اُسلوب میں بھی چاشنی پیدا ہوتی ہے۔

- **پروفیسر شبیر قادری**

عمر فیضی نمبر شائع کر کے آپ نے ایک اور کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کے کوائف پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کتنی بھرپور زندگی گزاری۔ آپ نے اُن کے وضع دار، سادہ لوح، پُرخلوص اور نیک نفس ہونے کی گواہی دی ہے۔ میں عمر فیضی کو ایک مدت سے پڑھتا چلا آ رہا ہوں مگر سچی بات یہی ہے کہ اُن کی متنوع اور رنگا رنگ شخصیت سے اتنا بھرپور تعارف پہلی مرتبہ ہوا ہے۔

- **پروفیسر فیض رسول فیضان**

یہ رسمی ستائش نہیں بل کہ منہ بولتی حقیقت ہے کہ آپ لوگ خلوص اور تن دہی کے ساتھ اُردو زبان و ادبیات کی بے لوث خدمات کر رہے ہیں، جس کا اظہار 'شام و سحر' کے عام شماروں سے بالعموم اور خاص نمبروں

سے بالخصوص بطریق احسن ہوتا رہتا ہے۔ تازہ شمارے کے انتخابی مشمولات اور مندرجات کی اکثریت معیار کی 'کڑی اور بے لحاظ' چھلنی سے چھنے ہوئے مواد پر مبنی محسوس ہوتی ہے تاہم کیا ہی اچھا ہوتا کہ بعض مخصوص ناموں کو دہرانے اور 'تہرانے' کی بجائے چند دوسرے لوگوں کو بھی اس وسیع و معتبر اور مؤثر و موقر انتخاب نامے میں شامل کر لیا جاتا ہے تا کہ اسی بہانے زیادہ سے زیادہ اربابِ قلم کی نمائندگی ہو جاتی۔

- **پروفیسر حماد میر**

بلاشبہ 'شام و سحر' نہ صرف قابل اساتذہ کرام کی خوب صورت اور علمی تحریروں کا مرقع ہے بل کہ یہ مادرِ گیتی کے اُدب سے تعلق رکھنے والے اُن طلبہ و طالباتؒ کی کاوشوں کا بھی ترجمان ہے جو سنجیدگی سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتے ہیں خصوصاً موجودہ حالات میں جہاں معیاری تو در کنار کسی اُدبی کام کو منظرِ عام پر لے آنا ہی کسی معرکے سے کم نہیں۔ 'شام و سحر' کے مدیران بھرپور مبارک باد کے مستحق ہیں، جو نہ صرف اُدبی پرچہ نکال رہے ہیں بل کہ معیار کو بھی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس بات کا زندہ ثبوت ایک تو پرچے کی بلند پایہ اور مایہ ناز اُدبی شخصیت جناب محترم شبیہ الحسن صاحب کی زیرِ ادارت جاری و ساری ہونا ہے اور دوسرا اس پرچے کے لکھاریوں میں عظیم محقق، اساتذہ، مفکر، صحافی اور شعرا کی باقاعدہ شمولیت ہے۔

- **صدف چنگیزی**

اس دورِ بے اماں میں آپ اتنی محبت سے ہم جیسے ہیچمداں سے اتنی محبت سے رشتہ قائم رکھتے ہیں اور یاد کرتے رہتے ہیں کہ جواب میں سوائے شرمندگی کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یقیناً اسی کا نام تہذیب محبت ہے۔ سبحان اللہ۔ کیا خوب کہا ہے:

کوئی بھی آئے میں دل میں اُتار لیتا ہوں
مرے شعور کے رشتے ہیں خندقوں کی طرح

- **مراد جعفری**

کتاب 'باقیاتِ آلِ رضا' موصول ہوئی۔ ہم آپ کے جذبۂ محبت اور خلوص کے شکرگزار ہیں۔ کتاب کو بڑے سلیقے سے شائع کیا ہے۔ یہ بات حرف بہ حرف حقیقت ہے کہ آلِ رضا اُن خوش نصیب شعرا میں ہیں، جنھیں آپ جیسا نقاد اور محسن ملا ہے۔ یقیناً یہ ایک صبر آزما کام ہے لیکن آپ نے بقول شاعر:

خیال و فکر کی سچائیاں بھی شامل ہیں
مرے لہو میں میرے شجرۂ نسب کی طرح

◆◆◆

عہدِ جدید کا منفرد کالم نگار......ڈاکٹر شبیہ الحسن

پروفیسر صدیق اظہر

◆◆

اُدب کا نصاب ان کرداروں سے بنتا ہے جو ایک باب کی حیثیت سے اس نصاب میں موجود ہوتے ہیں۔ ہر اہلِ دل کو محسوسات اور وجدان کے ذریعے حالات حاضرہ سے متاثر ہو کر اپنے افکار کے ذریعے مشاہدات کے حوالے سے فکر انگیز تحریر پیش کرنا انتہائی جان جوکھوں کا کام ہے۔ اہل خرد جب اہلِ جنوں بنتے ہیں۔تو ان میں یہ فکر توانا ہوتا ہے۔ اور ان کی تحریر میں تنوع ہوتا ہے۔ دریائے راوی کی قدیم تہذیب سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے سپاہ گر، کاری گر، ماہرینِ فنون لطیفہ، تخلیق کار، شاعر، ادیب دانش ور، سادھو سنت فقیر، ریاضتوں اور عبادتوں کے ذریعے منزلِ مراد کے متلاشی، صوفی، ولی اور داتا علی ہجویری جیسی روحانی ہستیاں یہاں آ کر نہ صرف آباد و شاد ہوئے بل کہ انھوں نے اتنے کاملین کے ذریعے راہِ سلوک کی ان منازل کو طے کیا اور فنا فی اللہ سے بقاباللہ کا مقام حاصل کیا۔ ایسی ہی سرزمین لاہور میں طالبانِ علم و فضل کو درس و تدریس جیسے مقدس پیشے سے منسلک ایک ایسی شخصیت جن کا اسم گرامی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہے۔ انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی ناتا جوڑا ہوا ہے۔ ماہ نامہ شام و سحر کے مدیرِ اعزازی ہیں۔ روزنامہ دن لاہور میں اُدبی بیٹھک کے عنوان سے مستقل کالم لکھ رہے ہیں۔ تخلیق کاروں کی کثیر تعداد کے ہم راہ اُن کا قافلہ علم و اُدب رواں دواں ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا نام حُب اہل بیتؑ کا استعارہ ہے۔ بقول وحید عصر وحید الحسن ہاشمی:

کیا ہیں علیؑ یہ نطقِ پیمبرؐ بتائے گا
دریا کا سارا زور سمندر بتائے گا

قیصر بارہوی کے مرثیے اور قیصر اقلیم مرثیہ جیسی کتب ڈاکٹر شبیہ الحسن کی محبتوں اور عقیدتوں کا اعتراف ہے۔ ان کی بابت ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے معائب ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا سب سے بڑا اختصاص یہ ہے کہ وہ ان

لوگوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو زمانے کی آنکھوں سے پوشیدہ ہو گئے ہیں، ڈاکٹر عبدالکریم خالد کی رائے یہ ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک ماہر محقق اور مستند اُستاد ہیں۔ پروفیسر حسنؔ عسکری کاظمی کا مشاہدہ یہ ہے کہ پنجاب میں اُردو مرثیے کو فروغ دینے والوں میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ معروف دانش ور ناصر زیدی فرماتے ہیں کہ پنجاب میں ایسے ناقدین اور محققین کی کمی ہے۔ جو مرثیے کی صنف میں محنت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین کے بعد پنجاب میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن وہ واحد نقاد ہیں۔ جنھوں نے اس صنف پر کما حقہ کام کیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی اُدبی قدر آور شخصیت کے یوں تو بے شمار اہل علم و ہنر معترف ہیں۔ لیکن ڈاکٹر طاہر تونسوی کی پُر خلوص محبت اور عقیدت منفرد ہے۔ انھیں ڈاکٹر صاحب کے علم و فن شخصیت، ان کی تمام تخلیقی اصناف خاص طور پر صحافت و کالم نگاری سے طاہر تونسوی بے حد متاثر ہیں۔ وہ اپنے حلقہ احباب میں اکثر ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ذکر خیر کرتے رہتے ہیں۔ راقم کو بھی ڈاکٹر صاحب سے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے متعارف کرایا ہے۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں ہاں تو بات ہو رہی تھی ڈاکٹر شبیہ الحسن کے کالموں کی بابت۔ جس طرح ان کے کالموں کے عنوان اُدبی بیٹھک سے عیاں ہے۔ کہ ان کے کالم خالصتاً اُدبی ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کالموں کے ذریعے قارئین کو لکھنؤ کی اُدبی تہذیب سے روشناس کرایا اور بیسویں صدی میں لکھنؤ زوال آمادہ تھا اور وہاں کی عظیم تہذیبی روایات دم توڑ رہی تھیں، لیکن انھوں نے انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیے کے حوالے سے اہل علم و دانش کو آ گہی دی ہے۔ انھوں نے پروفیسر حسنؔ عسکری کاظمی کو ایک ہمہ جہت تخلیق کار اپنے کالم کے آئینے میں ثابت کیا۔ ٹکڑے ٹکڑے...... کالم لکھ کر سیف زلفی کی شخصیت کو اَمر کر دیا۔ شعر و اُدب کا مسیحا...... ڈاکٹر طاہر تونسوی کا کالم لکھ کر طاہر تونسوی کی محبتوں کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بل کہ ان کی اُدبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر معراج نیرؔ، نسیم امروہوی، مولانا مرتضی حسین فاضل، عبدالکریم خالد، شیر افضل جعفری، محمود نظامی، ڈاکٹر سلیم اختر، طارق عزیز، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر قاسم جلال، ڈاکٹر محمد صالح طاہر جیسی مقتدر ہستیوں پر انھوں نے بھرپور کالم لکھے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا اُدبی خدمت ہو سکتی ہے۔ کہ ان کی اُدبی بیٹھک میں بے شمار ادیب، شاعر، دانش ور، محقق، نقاد، اساتذہ موجود ہیں۔ اور ڈاکٹر شبیہ الحسن قلم و قرطاس کے ذریعے ان کی شخصیتوں کے خدو خال کو نوک قلم سے سنوار رہے ہیں۔ یہ چاہتے تو سیاسی، معاشی، معاشرتی، موضوع پر اپنے کالم لکھتے اور دوسرے سرکاری درباری کالم نقادوں کی طرح حکومتی ایوانوں میں نظر آتے اور ڈھیروں دنیاوی فائدے اٹھاتے لیکن انھوں نے کرب و بلا کی مٹی کو اپنے لیے خاکِ شفا سمجھا اور مدحت اہل بیت کو اپنی اور اپنے اہلِ خاندان، دوست، احباب اور معتقدین، معاجبین کی بخشش کا ذریعہ جانا:

ہم گنہ گار ہیں لیکن یہ تسلی بھی تو ہے
آپؐ نے عفو کا دروازہ کھلا رکھا ہے

مانا کہ میں ہاری ہوں اس کشت محبت کا
اب کاٹ کے فصل غم حیراں سا لگتا ہوں

....

یزید وقت سے کہہ دو کہ یوں نہ کھل کھیلے
ابھی جہان میں باقی ہیں کربلا والے

....

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے کالم قارئین کو موضوع کے اعتبار سے بھرپور ابلاغ دیتے ہیں۔ قاری انھیں پڑھ کر اس قدر محویت کا اسیر ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی جہت میں کالم پڑھ لیتا ہے۔ ان کے کالموں کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے موضوع کے اعتبار سے کتنی کتابوں سے اکتساب فیض کیا اور اپنے مطالعہ کا نچوڑ بھرپور انداز میں اختصار سے ایک کالم میں سمویا تاکہ قاری اس سے بھرپور استفادہ کر سکے۔ راقم نے ڈاکٹر صاحب کے پندرہ کالم منتخب کیے ہیں۔ ان کے اقتباسات نذر قارئین ہیں:

ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے تحریر کردہ کالم ''اقلیم مرثیہ'' میں لکھتے ہیں۔ ''دانش مند کہتے ہیں۔ کہ جب چراغ بجھنے لگتا ہے تو اس کی لو تیز ہو جاتی ہے۔ کچھ یہی صورت حال لکھنو میں بھی تھی۔ کہ زوال آمادگی کے باوجود یہاں متداولہ علوم وفنون ترقی کر رہے تھے اور یہاں کی چمک دمک نوواردان کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس صورت حال میں ایک علمی ادبی خاندان کا چشم و چراغ قیصر عباس لکھنو میں ہوا۔ ماحول اور ذہنی استعداد کے باعث کم سنی ہی میں قیصر بارہوی کے نام سے مقبول ہو گیا یہی قیصر بارہوی سلطنت مرثیہ کے قیصر بن کر نصف صدی تک دنیائے مرثیہ پر حکمرانی کرتے رہے۔'' ''جب معاشرے میں نشتر قوتیں فروغ پا رہی ہوں تو انسان اپنے اندر سمٹنا شروع کر دیتا ہے۔ چیزوں میں اختصار کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور اصناف شعر بھی مختصر سے مختصر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشی مسائل، سماجی حالات اور اندرونی بے چینیاں بھی انسان کو بے کل کر دیتی ہیں۔'' ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جس خوب صورتی سے ''قیصر بارہوی'' سے متعارف کرایا ہے وہاں موجودہ دور میں مرثیہ نگاری پر تخلیقی عمل سے گزرنے والے مرثیہ نگاروں سے روشناس کرایا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''موجودہ دور میں صبا اکبر آبادی، شاہد نقوی، سہیل بنارسی، شائق زیدی، سردار نقوی، ظہور جارچوی، وحید الحسن ہاشمی، سیف زلفی، عبدالروف، عروج، افسر عباس زیدی، ظفر شارب، اثر ترابی، حسن عسکری کاظمی، اثر جلیلی، سید فیضی، ہلال نقوی، امید فاضلی، نسیم امروہوی، اسیر فیض آبادی، شہید احسن زیدی، میر رضی میر، عارف امام، احمد ندیم، کوثر امروہوی، عرفی ہاشمی وغیرہ کے مرثیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے، کہ ان شعرا نے فنی اور فکری سطح پر مرثیہ کو عہد جدید سے پیوست کر دیا ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں جس شاعر نے مرثیہ میں فکر انگیز اور اجتہادی

تبدیلیاں کیں۔ اور اسے مقبول خاص و عام بنایا۔ وہ قیصر بارہوی تھے۔ انھوں نے مرثیے کو واقعہ کربلا کی خیرہ کر دینے والی روشنی میں ایک عالی شان فتح کا نقارہ بنا دیا ہے۔[۱]

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے
مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے

ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے کالم ''ایک ہمہ جہت تخلیق کار...... پروفیسر حسن عسکری کاظمی کی علمی اَدبی شخصیت کا یوں احاطہ کرتے ہیں ''پروفیسر حسن عسکری کاظمی عصرِ حاضر کے نامور جدید مرثیہ نگار ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر پانچ مرثیے تخلیق کیے ہیں۔ اور ہر مرثیہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوسرے سے مختلف اور ممتاز ہے ''پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے شاعری کے ساتھ ساتھ صنف نثر کو بھی اپنے ارفع خیالات و نظریات سے مالا مال کیا۔ انھوں نے نظری مضامین لکھ کر معاشرے کی سمت نمائی کی اور علمی مضامین کے ذریعے ادیبوں اور شاعروں کی قدر افزائی فرمائی۔'''' حسن عسکری کاظمی کا شمار ان نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ جو آپ اپنی تحریروں سے شرمندہ نہیں ہیں۔ ان کا نثری اُسلوب رواں اور دلوں پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ وہ اپنے ''حرف ہنر'' سے قارئین کے دلوں کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ ان کے مضامین و مقالات اور کالموں کے عمیق مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ حسن عسکری کاظمی ایک صاحب طرز نثر نگار ہیں اور ان کی نثری کاوشیں آسمان اَدب پر جگمگا رہی ہیں۔''[۲]

احمد فراز نے کیا خوب شعر کہا ہے کہ:

ڈھونڈ اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
ممکن ہے کہ یہ خزینے تجھے خرابوں میں ملیں

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' کے خالق سیف زلفی کی رحلت کے عبد گوہر نایاب اَدبی شخصیت سیف زلفی کو اپنے کالم کی زینت بنایا۔ اور ان کی بابت کچھ اس انداز میں اظہار خیال کیا۔ کہ انھیں نہ جاننے والا اَدب کا طالب علم بھرپور انداز میں ان سے متعارف ہو سکے۔ لکھتے ہیں کہ: ''کسی بھی مہذب معاشرے میں اَدب، ادیب اور قاری کی مثلث کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ مثلث جتنا مضبوط ہوتا ہے۔ قوم کی فکری اڑان اتنی ہی بلند ہو جاتی ہے۔ ہم ایک ایسے پُر آشوب معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں اس مثلث کے تینوں کنارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم قاری، اَدب اور ادیب کی مثلث کو قوی تر بنانے کے لیے ان معتبر ادیبوں اور شاعروں کے فکری چراغ سے ہم اپنے چراغ فکر روشن کر سکتے ہیں۔ اُردو شعر و اَدب کو فکری طور پر مالا مال کرنے والوں میں ایک معتبر نام سیف زلفی کا بھی ہے۔ سیف زلفی نے اُردو اَدب کی شمع کی لو کو تیز کرنے کے لیے اپنا خونِ جگر صَرف کیا اور ان کے لہو کی تابانی سے اُردو شعر و اَدب پر ایک نکھار آ گیا ہے''، ڈاکٹر شبیہ الحسن سیف زلفی کی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ''سیف زلفی کو ذاتی اور

معاشرتی غموں نے ذہنی طور پر الجھا دیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں جگر کا عارضہ ہو گیا تھا جو ابتدائی طبی امداد کے باعث وقتی طور پر تو دب گیا۔ لیکن اس نے پھر ۱۹۹۰ء میں سر اُبھارا۔ اور سیف زلفی کو نحیف تر کر دیا۔ زلفی موت وحیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد آخر کار ۲۱ مئی ۱۹۹۱ء کو اس دارِ فنا سے دارِ بقا کو کوچ کر گئے انا للہ وانا الیہ راجعون'' کالم کا تسلسل ملاحظہ فرمائیں لکھتے ہیں کہ ''سیف زلفی کا تخلیقی سرمایہ ان کی شعری عظمت پر گواہی دیتا نظر آتا ہے۔ ان کی معروف کتابوں میں ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' (غزلیں) ''لہو چاند اور سویرا'' (غزلیں، نظمیں، دوہے، نغمے) ''روشنی'' (نعتیں) ''نور'' (نظمیں) ''ہمارے ہیں حسینؑ'' نظمیں شامل ہیں۔ راقم الحروف (ڈاکٹر شبیہ الحسن) نے ان کی شخصیت اور فن پر پہلی کتاب ''جدید لہجے کا شاعر...... سیف زلفی'' ترتیب دی جس میں پچاس سے زیادہ معروف اہلِ قلم کی آراء شامل تھیں۔ اسی طرح (راقم الحروف) (شبیہ الحسن) نے سیف زلفی کے چاروں مرثیے ''سیف زلفی کے مرثیے'' کے عنوان سے شائع کر دیئے ہیں۔ ان کا تمام غیر مطبوعہ کلام بھی رفتہ رفتہ شائع کرنے کا منصوبہ ہے۔ ان کے صاحب زادے رضا انتخاب اس سلسلے میں جو کاوشیں کر رہے ہیں وہ لائق ستائش ہیں۔'' ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اس کالم سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ انھیں مرحوم تخلیق کاروں کی حرمت کا کتنا خیال ہے۔ اور جس جذبہ سے انھوں نے سیف زلفی کی تخلیقات کو یکجا کر کے شائع کیا ہے۔ اور مزید بھی یہ کام جاری ہے ان کا یہ عمل قابلِ صد تحسین وستائش ہے۔''۳

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا کالم شعر و اَدب کا مسیحا...... ڈاکٹر طاہر تونسوی کی علمی اَدبی کاوشوں اور ان کی اَدب نوازکوششوں کی نظر ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''عصرِ حاضر میں قارئین کی حقیقی معنوں میں سمت نمائی کرنے والوں میں ایک معتبر نام ڈاکٹر طاہر تونسوی کا بھی ہے۔ جو خاموش دریا کی طرح علم واَدب کی کھیتیوں کو سیراب کر رہے ہیں۔ جب وہ ان لہلہاتی کھیتیوں کو دیکھتے ہیں تو مسکرا کر کسی اور دوسرے خشک صحرا کی آب یاری کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے عمر بھر بے غرضی کے ساتھ علم واَدب سے ربط رکھا ہے۔ جو شخص علم واَدب کا دامن تھام لے وہ معاشرے میں سُرخرو ہو جاتا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کا تو اختصاص یہ ہے کہ علم واَدب نے ان کا دامن تھام رکھا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی کے رگ وپے میں علمی اَدبی لہو گردش کر رہا ہے۔ ایک تو ان کا اپنا اَدبی شعری مذاق بے حد بلند ہے اور دوسرے اجداد کے خون کی گرمی نے انھیں حد سے زیادہ متحرک بنا رکھا ہے، یہی سبب ہے کہ دو چار کتابوں کی اشاعت کے بعد جہاں دوسرے تخلیق کاروں کا پڑاؤ آ جاتا ہے۔ وہاں سے ڈاکٹر طاہر تونسوی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک متنوع الجہات تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے نثر اور شعر دونوں میدانوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بھرپور جوہر دکھائے اور اہلِ بنیش سے خوب خوب داد حاصل کی۔ نثر کے میدان میں انھوں نے تحقیق وتنقید میں طبعی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور شاعری میں انھوں نے نظم و غزل کے حوالے سے خوب خوب داد سمیٹی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کی ہر جہت کو جدید تناظر

میں سمجھا اور سمجھایا جائے تاکہ ''طاہر شناسی'' کا حق اَدا ہو سکے۔ انھوں نے ایک اَدبی مسیحا کا روپ دھار کر ادیبوں اور شاعروں کو اپنے عصائے لفظی سے حیات تازہ عطا کرنے کا جو ہنر اپنا لیا ہے۔ اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی جس بے لوثی، انہماک اور فنی چابک دستی کے ساتھ علم واَدب کے ایوان کو سجا رہے ہیں۔ آنے والا وقت اس کی نہ صرف قدر کرے گا۔ بل کہ جبینِ وقت پر ان کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔[۴]

ایک باطنی خاکہ نگار...... ڈاکٹر معراج نیّر کے علمی اَدبی سفر کا احاطہ کرتے ہوئے معروف کالم نگار ڈاکٹر شبیہ الحسن لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر معراج نیّر نے کمال ہنر سے ''پلک بسیرے'' میں منتخب شخصیات کو درج ذیل تین عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا ہے۔ (الف) بزرگانِ خوش خصال (ب) یارانِ ہم سفر (ج) جو آشنا نہ تھے، انھوں نے بزرگان ''خوش خصال'' میں نام ور اور عہد ساز علمی اَدبی شخصیتوں کو یکجا کر دیا ہے، آپ سیّد وحید الحسن ہاشمی سے لے کر منظور عباس ازھر تک کے تمام خاکوں کا مطالعہ فرمالیجیے آپ دیکھیں گے ڈاکٹر معراج نیّر نے ہر ممدوح کو ایک نئے تناظر میں دیکھا ہے۔ ان کے خاکوں کے مجموعہ کا دوسرا حصہ ''یارانِ ہم سفر'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر معراج نیّر کے خاکوں کے مجموعہ کا تیسرا حصہ ان لوگوں کے خاکوں سے مزین ہے۔ جن سے وہ کماحقہ، آشنا نہ تھے۔ ''خدیجہ ماں'' سے لے کر وادی کاغان کے پہلے مسافر عبدالرحمٰن'' تک ان کا ہر ممدوح اپنی ذات کے اعتبار سے ایک انجمن محسوس ہوتا ہے۔ '' آخر میں لکھتے ہیں کہ: ''ڈاکٹر معراج نیر کی سحر انگیز اور ہمہ جہت شخصیت کا باطنی سفر کریں تاکہ ہمیں بھی گوہر آب دار اور دُرِ شہوار حاصل ہو سکیں۔ مگر یہ مشکل سفر دل کی بینائی کے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہے:

اہل باطن بھی نظر آ جائیں گے
کاش ہم کو دل کی بینائی ملے[۵]

ڈاکٹر شبیہ الحسن جس محبت سے اَدب کو اُجالنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اس کی اس پُر آشوب دور میں مثال نہیں ملتی۔ ایک ادیب، شاعر اور دانش ور کو جاننے پرکھنے اور سمجھنے کے لیے اس کی تخلیقات کا مطالعہ کرنا اور پھر دریا کو کوزے میں بند کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ انھوں نے جس مشنری جذبے سے یہ اَدق کام کیا ہے۔ اس کا کریڈٹ یقیناً ان کی ذات کو جاتا ہے۔ انھوں نے نسیم امروہوی پر مدلل کالم تحریر کیا ہے۔ انھوں نے جتنی چابک دستی سے نسیم امروہوی کو متنوع علوم کا دبستان ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ قابل ستائش ہے۔ یاد رہے نسیم امروہوی پر ڈاکٹر سیّد زوار حسین نے پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے کالم میں نسیم امروہوی کی علمی اَدبی شخصیت پر لکھتے ہیں کہ ''نسیم امروہوی کا خاندان امروہہ میں علم واَدب کا گہوارہ قرار دیا جاتا تھا۔ حضرات کا تو کیا کہنا خواتین بھی علم واَدب سے آراستہ اور پیراستہ تھیں اسی سبب سے نسیم امروہوی کی

ابتدائی تعلیم کا بندوبست گھر پر کیا گیا۔ فارسی اور عربی کے ابتدائی اسباق منشی حمید حسن اور مولانا باقر حسین سے پڑھے۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم اپنے نانا سید ذکی حسن سے حاصل کی۔ وہ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ نسیم امروہوی نے اپنی زندگی کو علم و ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ اور ہر صنف ادب کو اپنے افکار و نظریات سے مالا مال کیا۔ ان کی دو سو سے زیادہ تصنیفات و تالیفات شائع ہوئیں جن میں مراثی نسیم دو جلدیں، برق و باراں، فرہنگ اقبال، (اردو فارسی) (فارسی اردو) تسہیل القواعد، نسیم اللغات، گلزار نسیم (بچوں کی نظمیں) ساز حریت (اتحاد و اصلاح رسوم پر نظم) چراغ زندگی (افسانے) دوست بنو دوست بناؤ (نفسیات) تاریخ خیر پور، معراج العروض وغیرہ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ نسیم امروہوی نے اردو مرثیہ کو مواد اور ہیئت ہر اعتبار سے جدید عہد کے تقاضوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ اس طرح نسیم امروہوی اس صنف سخن کے شاعر نہیں بل کہ دبستان قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ نسیم امروہوی کا نام ان کے سنہرے کام کی وجہ سے ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اور طالبان علم اس سے اپنی تشنگی بجھاتے رہیں گے۔[۶]

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ایک اور کالم جس میں انھوں نے مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کی بابت آگہی دی ہے۔ اس کا اقتباس پیش خدمت ہے۔ ''مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے شاعری سے اغماض برتا اور نثر نگاری کی جانب متوجہ ہوئے ان کی ادبی تعمیر و تشکیل میں ان کی خاندانی وجاہت و ثقاہت کے ساتھ لکھنؤ کی اس فضا کو بھی بہت عمل دخل تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے۔ جن کی بناء پر مولانا مرتضیٰ شاعری سے ترک تعلق کر کے اردو نثر کی جانب توجہ دینے لگے۔ ان کی علمی، مذہبی، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی تصانیف کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ بیروت، ہندستان، مشہد، تہران، بنگلہ دیش اور افغانستان سے نکلنے والے جریدوں میں مولانا کی تحریریں چھپتی رہتی تھیں۔ اور اسی سبب سے اعلیٰ تر ادبی اور مذہبی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں مولانا کی شمولیت کی دعوت ضرور دی جاتی تھی۔ انھوں نے ملکی اور غیر ملکی تقریباً دو سو سے زیادہ کانفرنسوں میں شرکت فرمائی اور متعدد مقالات پڑھے۔ مولانا نے اپنی چونسٹھ سالہ زندگی میں تین سو سے زیادہ تصنیفات و تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔'' کالم نگاری ایک فن ہے۔ اسے لکھنے کے لیے وسیع مطالعہ چاہیے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا مطالعہ اتنا وسیع ہے۔ وہ جس موضوع پر لکھنا چاہتے ہیں۔ سیاق و سباق کے حوالے سے اپنی بات کو آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ قاری کے لیے دل چسپی کا سبب وہ سچا تخلیقی عمل ہے جو تحقیق کے ساتھ جڑا ہو، اور واقعات حقائق پر مبنی ہوں۔[۷]

اب ادبی بیٹھک میں عبدالکریم خالد پر بات ہوگی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن لکھتے ہیں کہ ''عصر حاضر میں ایسے تخلیق کاروں کی کمی بے حد محسوس کی جارہی ہے۔ جو سنجیدگی سے علم و ادب کی آبیاری میں مصروف ہوں۔ اس کا بنیادی سبب شاید یہ ہو کہ علم و ادب کے شیدائیوں کے لیے اب ہمارے تجارتی معاشرے میں کوئی جگہ سرے سے

موجود ہی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جہاں الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہاں پرنٹ میڈیا سے منسلک لکھاریوں کے رویوں سے آگاہ کیا ہے۔ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے یہ تجزیہ کیا ہے کہ بظاہر ہم گلوبل ولیج میں رہ رہے ہیں۔ لیکن معاشرتی ناہمواری، تنگ نظری، تعصب اور دیگر عوامل جن کی وجہ سے اخلاقی، معاشی اور مذہبی سطح پر ہم ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ یقیناً یہ ناہمواری تخلیقی عمل کے لیے نقصان دہ ہے۔ عبدالکریم خالد کی شخصیت، اوران کی علمی اَدبی کاوشوں کی بابت لکھتے ہیں۔'' ڈاکٹر عبدالکریم خالد حالات کی یورش سے کبیدہ خاطر تو ہوتے ہیں۔ لیکن مایوس نہیں۔ ان کی یہی رجائیت پسندی انھیں عزم وحوصلہ عطا کرتی ہے۔ اوران کا قلم صفحہ قرطاس پر دوڑنے لگتا ہے۔ آپ بالغ النظر نقاد ہیں۔ ان کی تنقید کے پیچھے ربع صدی کا مطالعہ، برسوں کی تحریری ریاضت، اجداد کی ذہانت اور کاوش پیہم کا ہاتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک ایسا دستِ ہنر دیا ہے کہ وہ اپنی تنقیدی تحریر کے ذریعے قاری کو ایک ایسے جہان طلسمات میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ اس حیرت زدہ کیفیت سے واپس آتا ہے۔ تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے ہوتے ہیں۔ اور وہ عبدالکریم خالد کا مدح سرا ہوتا ہے اوران کی تنقیدی تحریروں کا بھی۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد ایک صاحب طرز نقاد ہیں۔ ان کا اُسلوب بھی ان کے موضوعات کی طرح ہمہ گیر ہے وہ زبان و بیان پر قدرت ومہارت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے قاری پر سحر انگیز کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔''[۸۰۰]

جھنگ کا ملنگ شاعر افضل جعفری کے فن اور شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن رقم طراز ہیں کہ: ''شیر افضل جعفری فعال ذہن کے حامل ایک رنگارنگ شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے تمام عمر مختلف اصناف نظم و نثر میں اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔ نثری میدان میں بھی ان کے کارنامے اپنی نوعیت اور اہمیت کے حوالے سے قابل توجہ ہیں۔ تاہم ان کی فنی اور فکری صلاحیتوں کا اعلیٰ ترا ظہار ان کی شعری تخلیقات میں دکھائی دیتا ہے۔ شیر افضل جعفری آخری عمر تک مشقِ سخن کرتے رہے، ان کے تین شعری مجموعے ''چناب رنگ'' ''سانولے من بھانولے'' اور ''شہر سدا رنگ'' ان کی زندگی میں طبع ہو گئے تھے۔ چوتھا مجموعہ کلام ''موج موج کوثر'' ان کی زندگی میں مرتب ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت ان کی رحلت کے بعد ممکن ہو سکی۔ اس کے علاوہ شیر افضل جعفری نے تین مجموعے ''حمد و نعت و سلام'' ''نظمیں'' اور ''نثریں'' اپنی زندگی ہی میں ترتیب دے گئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ان کی اشاعت کا اہتمام نہیں ہو سکا ہے:

ندی کنارے جو نغمہ سرا ملنگ ہوئے
حباب موج میں آ آ کے جل ترنگ ہوئے
ارم کے پھول، ازل کا نکھار طور کی لو
تری چناب کی وادی میں آ کے جھنگ ہوئے

یہ ریگ زار یہ ٹیلے یہ خشک ویرانے
ہمارے لطف نظر سے گلاب رنگ ہوئے[9]

اُردو سفرنامہ پر اظہار خیال کرتا ہو یا نظر نامہ پر اس بابت محمود نظامی کو ملکہ حاصل ہے، ڈاکٹر شبیہ الحسن نے محمود نظامی کی تحریروں کو پڑھ کر جس طرح اپنے کالم میں رنگ بھرا ہے وہ آپ کی نذر ہے۔ ''نظر نامہ کو محمود نظامی نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، پہلے باب کا نام بازار مصر ہے، جس میں انھوں نے مصر کے قاہرہ ودیگر جلیل القدر اور تاریخی شہروں کی سیر کی روداد بیان کی ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ان کیفیات کا تذکرہ نہایت خوش کن انداز میں کیا ہے۔ جو ان کی شخصیت پر اثر انداز ہوئیں۔ دوسرے باب میں ''روم نامچہ'' کے عنوان سے اٹلی کے مختلف شہروں اور تاریخی عمارتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محمود نظامی نے وہاں کی مجلسی زندگی اور تہذیبی نقوش کا تذکرہ نہایت دل کش انداز میں کیا ہے، تیسرا باب ''بر سبیل لندن'' کے عنوان سے سفرنامے میں شامل کیا گیا ہے، جس میں انگلستان کے سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔ اس باب کی خاص بات انگریزی معاشرے کی عکاسی بیان کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ''شب طلوع پیرس'' کے عنوان سے فرانس کا سفرنامہ پیش کیا گیا ہے، اس میں محمود نظامی نے فرانس کی تاریخ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس کے جزوی سیاسی حالات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

پانچویں باب کا عنوان ''بالآخر میکسیکو'' ہے۔ جس میں انھوں نے امریکا اور کیوبا کا تذکرہ کیا ہے، مجموعی طور پر یہ پانچوں ابواب ایک مسلسل اور متواتر سفر کی کڑی معلوم ہوتے ہیں، اور ہر باب دوسرے کے لیے راہ ہموار کرتا نظر آتا ہے۔ محمود نظامی نے نظر نامے کے بارے میں ایک بڑے پتے کی بات یہ لکھی ہے۔ کہ یہ دستاویز ''سفرنامہ'' نہیں ''مسافر نامہ'' ہے۔[10]

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی میں جگ بیتی کے عنوان سے کالم لکھ کر قاری تک ان حقائق کو پہنچایا ہے۔ جن کے تحت ڈاکٹر سلیم اختر کی اَدبی خدمات اور ان کے تخلیقی تواتر کے نتیجہ میں ان کی آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ'' کی اشاعت کے بعد ان کی ان تھک محنت اور کاوش کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی بابت اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر سلیم اختر ایک متنوع الجہات تخلیق کار ہیں، ان تخلیقات کا مرکزی نقطہ نفسیات ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے افسانوں، مضامین، انشائیوں اور آپ بیتی میں نفسیاتی ژرف بینی دکھائی دیتی ہے۔ وہ تخلیق اور معاشرے کو نفسیاتی دوائر میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور ان دونوں کے مسائل کا علاج بھی نفسیات میں تلاش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا کمال ہے کہ انھوں نے سماجیات اور نفسیات کے حسین امتزاج سے اَدب کو پرکھنے کی بلیغ سعی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ماہر و مشاق تخلیق کار ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنی آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ'' میں ماضی و مستقبل کو حال میں اکٹھا کر دیا ہے۔ اس طرح اس آپ بیتی کے مطالعہ سے ہم

تین زمانوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ''نشانِ جگر سوختہ'' محض آپ بیتی ہی نہیں بل کہ جگ بیتی بھی ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ بیتی نگار اپنی آپ بیتی میں اپنی ذات کی پیش کش کو ہر چیز پر فوقیت دیتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے کائنات کی نگاہوں سے خود کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے معاشرے کے منفی رویوں پر شدید طنز کیا ہے۔

''ڈاکٹر شبیہ الحسن نے قاری کے لیے اپنے کالم میں بہترین معلومات فراہم کی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر سلیم اختر شاعر تو نہیں ہیں۔ مگر شعر فہم اور شعر شناس ضرور ہیں۔ وہ اس راز سے بخوبی آگاہ ہیں کہ شاعری نثر کا زیور ہوتی ہے۔''[۱۱]

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے کالموں کے ذریعے قارئین کو بہتر سے بہتر معلومات فراہم کی ہیں۔ اور انھوں نے بار بار معاشرے کی بے حسی اور تخلیق کار کی ثانوی حیثیت کو سخت ناپسند کیا ہے۔ اَدب پڑھنے والوں کو انھوں نے باخبر رکھا ہے انھوں نے ڈاکٹر طارق عزیز کی اَدبی خدمات تخلیقی منظر نامہ پیش کرنے کے لیے اپنا کالم بعنوان ''جلاوطنی کا دکھ اور طارق عزیز کے خواب میں ان کے بارے میں معلومات دی ہیں آپ لکھتے ہیں۔'' ہم لوگ ڈاکٹر طارق عزیز کو ایک معروف اور مقبول ڈرامہ نویس کے طور پر تو جانتے ہیں۔ لیکن شائد انھیں خبر نہیں کہ ڈاکٹر طارق عزیز پہلے شاعر ہیں اور پھر ڈرامہ نویس۔ کیا یہ ہمارے بنجر معاشرے کا المیہ نہیں ہے، کہ اس نے ہم سے ایک اچھے شاعر کو چھین لیا ہے۔ ڈاکٹر طارق عزیز کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل پہلا مجموعہ جلاوطن کے نام سے ۱۹۸۷ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ کا نام ''جلاوطن'' کیوں رکھا:

ہجر کا موسم بھی آنکھوں سے بہا، اچھا ہوا
اب مَیں اپنے آپ میں اچھا ہوا، اچھا ہوا
کیا پتہ کل ہم کو یہ دن بھی میسر ہوں نہ ہوں
آج جو گزرا سو گزرا جو ہوا اچھا ہوا

ڈاکٹر طارق عزیز خواب کو حیات و کائنات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خواب تمناؤں کی ایک ایسی دلدل ہے، جس سے باہر نکلنے کی کوشش میں انسان مزید دھنستا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر طارق عزیز بے دار آنکھوں سے خواب دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہ خواب میں سلگتے ماضی کو دیکھتے ہیں تو اداس ہو جاتے ہیں۔''[۱۲]

ادیبوں، شاعروں، دانش وروں کو ایک لڑی میں پرونے کا اگر کوئی فن سیکھے تو اسے چاہیے وہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا شاگرد بن جائے۔ جن کا مطمع نظر ہی یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ملک بھر کے ادیبوں شاعروں، دانش وروں کا ایک کارواں بنا دیا جائے اور اس کارواں میں شامل سارے احباب اپنی اپنی تخلیقات کی سوغات طالبانِ علم و فضل تک پہنچائیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بہاول پور کے شاعر، ادیب اور دانش ور قاسم جلال جنھیں انھوں نے

گلستان اُدب کا جمال قرار دیا ہے۔ انھوں نے ان کی علمی اُدبی شخصیت کے ان گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔ جو عام قاری کی دسترس میں نہیں تھے۔ آپ ان کی بابت لکھتے ہیں کہ ''بہاول پور کے نخلستان میں ایک ایسا ہیر وصفت انسان موجود ہے۔ جس نے علم کے حصول کے لیے اپنی پوری زندگی بسر کردی ہے۔ اور ہمیشہ محنت کو اپنا مطمع نظر بنا کر علم وادب کی دنیا کو فتح کیا ہے۔ اس فرد فرید کا نام ڈاکٹر قاسم جلال ہے۔ جو ایک طویل عرصے سے صحرائے اُدب میں اپنے خونِ جگر سے لالہ وگل لگانے میں مصروف ہے۔ ڈاکٹر قاسم جلال اس لحاظ سے خوش بخت ہیں کہ انھوں نے اپنی محنت کو علم اور علم کو محنت سے متصل کردیا ہے۔ اور اسی باعث آج وہ شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں مقام بلند پر فائض نظر آتے ہیں۔''[۱۳]

بعض اوقات اُدب کا جوہری ڈاکٹر شبیہ الحسن دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتنائی کا نوحہ بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ ہم ایک ایسے بنجر عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں! جہاں تخلیق کار کی پذیرائی تو دُور کی بات ہے ان کا وجود بھی معاشرے پر گراں گزرتا ہے۔ ان کے خیال میں پورا معاشرہ ایک بے نام منزل کی طرف سفر کر رہا ہے۔ لیکن اس باہمت دانش ور نے بے نام منزل کے سفر سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے لمحہ موجود کے نقاد ڈاکٹر محمد صالح طاہر کو اپنے کالم اُدبی بیٹھک کی زینت بنایا۔ اور ثابت کیا کہ اس دور میں جہاں علم و اُدب کو اجالنے والے گوشہ نشینی اختیار کرتے جا رہے ہیں وہاں انھوں نے دانش وروں کی ایک بڑی تعداد سے علم واَدب کے متوالوں کو روشناس کرایا ہے۔ یہ واقعی ان کا علمی اُدبی کارنامہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر محمد صالح طاہر کا تخلیقی سفر بیس برس کے عرصہ پر محیط ہے۔ وہ طنز ومزاح کے میدان میں اپنی تخلیقی ہنر مندیوں کا اعتراف ''میری محبوبہ'' کے ذریعے کرا چکے ہیں۔ انھوں نے بیسیوں افسانے بھی لکھے ہیں۔ جن میں معاشرے کے درد و آلام کو بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری حب وطن کے جذبات سے مالا مال ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مجموعہ مقالات کی جس چیز نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ وہ اس کا تنوع ہے۔ آپ کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ وہ ہر ایک موضوع پر بے تکان لکھتے ہیں۔ وہ موضوع کو احاطہ تحریر میں لانے سے قبل اپنا ایک واضح نقطہ نظر وضع کرلیتے ہیں۔ آپ ان کے مضامین کا مطالعہ فرمایئے آپ دیکھیں گے کہ وہ معاشرے کی بنجر قوتوں کے خلاف کس طرح اپنے طاہر مضامین اور صالح اُسلوب سے اُدبی جہاد میں مصروف ہیں۔''[۱۴]

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی گدڑی سے ایک اور ہیرہ نکالا ہے۔ اور ان پر اپنا کالم ''لکھنوی اور لاہوری ثقافت کا حسین امتزاج ڈاکٹر آغا سہیل کی علمی اُدبی کاوشوں کی ہمارے جیسے قارئین تک رسائی کو آسان بنایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں ''ڈاکٹر آغا سہیل لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اور زوال آمادہ لکھنؤ کی رونقوں کو اپنی نگاہوں میں سمیٹ کر پاکستان آگئے۔ اور یہاں آکر انھوں نے لکھنوی تہذیب وثقافت کو حرز جاں بنائے رکھا۔ آغا سہیل کی شخصیت میں لکھنؤ اور لاہور کی ثقافت کے جوہر یک جا ہوگئے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اہلِ لاہور کی علمی اُدبی خدمت

کرتے گزر گیا۔ ان کی معروف تصانیف میں دو ناول (غبار کوچہ جاناں، کہانی اہل زوال کی) پانچ افسانوی مجموعے (بدلتا ہے رنگ آسماں، شہر نا پرساں، تل برابر آسماں، اگن کنڈلی، بوند بوند پانی) آپ بیتی (خاک کے پردے) اور تحقیقی و تنقیدی کتب (معارف سہیل، اُدب اور عصری حسیت، دبستان لکھنؤ کے داستانی اُدب کا ارتقا اُردو کا لسانیاتی خاکہ) شامل ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل کا یہ تخلیقی سفر اسی آب و تاب سے آج بھی جاری و ساری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں ڈاکٹر آغا سہیل جیسے متنوع الجہات تخلیق کار نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔"[15]

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا علمی اُدبی کام ہم سب پر عیاں ہے۔ انھوں نے جس خلوص اور محبت سے علم واُدب کی آبیاری کی ہے۔ اور قلم و قرطاس سے جو تعلق قائم کیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں علم واُدب کی بحرانی کیفیت میں آپ نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعے جو علمی تحقیقی کام کیا ہے اسے تا قیامت یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے روزنامہ "دن" لاہور میں یہ کالم لکھے ہیں۔ اور ان کالموں کے ذریعے عام قاری تک ملک کے نامور ادیبوں شاعروں، دانش وروں سے روشناس کرایا ہے۔ آپ نے بڑی احتیاط سے حد اُدب کا پاس رکھا ہے۔ اور سب کی عزت و توقیر میں اضافہ کیا ہے۔ ایک کالم میں ایک دانش ور کی بابت واضح معلومات فراہم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ آپ کی تحریروں میں شگفتگی اور تنوع ہے۔ ہم بلاشبہ ان کے تخلیقی اور تحقیقی سفر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھیں عہد جدید کا منفرد کالم نگار کہہ سکتے ہیں۔

....

حوالہ جات

(۱) روزنامہ 'دن' لاہور، ۴ جولائی ۲۰۰۷ء

(۲) روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۵ جون ۲۰۰۷ء

(۳) روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۶ مئی ۲۰۰۷ء

(۴) روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۴ مئی ۲۰۰۷ء

(۵) روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۲ مئی ۲۰۰۷ء

(۶) روزنامہ 'دن' لاہور، ۷ امئی ۲۰۰۷ء

(۷) روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۶ اپریل ۲۰۰۷ء

(۸) روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۹ اپریل ۲۰۰۷ء

(۹) روزنامہ 'دن' لاہور، ۹ اپریل ۲۰۰۷ء

(۱۰) روزنامہ 'دن' لاہور، ۳ اپریل ۲۰۰۷ء

(۱۱) روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۸ مارچ ۲۰۰۷ء

(۱۲) روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۲ مارچ ۲۰۰۷ء

(۱۳) روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۳ مارچ ۲۰۰۷ء

(۱۴) روزنامہ 'دن' لاہور، ۵ مارچ ۲۰۰۷ء

(۱۵) روزنامہ 'دن' لاہور، یکم مارچ ۲۰۰۷ء

◆◆◆

میزانِ فکر و نظر

شبیر احمد قادری

◆◆

اخبارات اب زیادہ تر سیاسی کالموں کے لیے وقف ہیں مگر اَدب کے حصارِ بے دیوار میں رہ کر کالم لکھنے والے ناپید ہیں جو چند اَدبی کالم نگار تھے اُن میں سے بیش تر سیاست کی دلدل میں پھنس اور دھنس چکے ہیں مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن اُن معدودے چند کالم نگاروں میں شامل ہیں، ادب، ادیب اور کتاب جن کی توجہات خاص کا مرکز ہے۔ ان کے کالم کا عنوان ''اَدبی بیٹھک'' ڈاکٹر صاحب کی سنجیدگی کا مظہر ہے۔ یہ سوچ بجائے خود اس درجہ اہم ہے کہ اسے لازماً سراہنا چاہیے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن متوازن فکر کے حامل ہیں۔ اس کا عکس ان کے کالموں پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو کالم کی حدود سے باہر قدم رکھنا گوارا نہیں۔ بالفاظ دیگر انھوں نے کالموں کو تنقید یا تحقیق نہیں بننے دیا تاہم یہ دونوں زاویے ان کالموں کی زیریں سطح پر موجود ضرور ہے وہ مدلل مداحی بھی نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ تخلیقی اَدب پر لکھتے لکھتے خود بھی تخلیقی عمل سے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ موصوف کالم برائے کالم لکھنے کے حق میں نہیں بل کہ ان کالموں میں ان کی مکمل Involvement ہوتی ہے۔ وہ سرسری نہیں لکھتے بل کہ اَدب اور ادیب اور تصانیف و تالیفات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد حاصل مطالعہ کو کالم کے دائرے میں سمو دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک معروف و معتبر اَدبی ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور کے مدیر گرامی بھی ہیں۔ اُنھیں اَن گنت کتب موصول ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے ان ساری کتابوں پر ''شام و سحر'' کے صفحات پر رائے نہیں دی جا سکتی۔ میرے خیال میں اخبار کا سہارا انھوں نے اس لیے لیا ہوگا کہ وہ تصانیف بھیجنے والوں کو اُن کا حق لوٹا سکیں۔ اس مقصد کے لیے اَدبی کالم ایک موثر و مقبول ذریعہ قرار پاتا ہے۔ شبیہ الحسن جن کی عمر عزیز کا بڑا حصہ توشت و خواند میں گزرا ہے۔ یہ کالم ان کے اَدبی تجربات کا عکسِ لطیف اور نقشِ جمیل ہیں۔ دیکھا جائے تو اُن کے یہ کالم 'آثار المعاصرین' کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی ڈاکٹر صاحب کے معاصرین کی خدمات و نشانات۔

'ادبی بیٹھک' کے نام سے لکھے گئے کالموں میں جذبات کی گرمی اور خلوص کی آنچ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اُسلوب میں شگفتگی، تراکیب میں چستی اور معنی میں بلندی پائی جاتی ہے۔ ان خوبیوں کو ڈاکٹر صاحب کی طبع رسا نے اور بھی چمکا دیا ہے۔ اس معاملے میں شبیہ الحسن فورٹ ولیم کالج کے ادیب اساتذہ کے رنگ میں رنگے دکھائی دیتے ہیں جو سیدھے سجاؤ بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی انداز سر سید احمد خاں کا تھا جو قبولِ عام کے درجے کو پہنچا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے مصیقل کالموں کے رگ و پے میں عصری حسیت خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ وہ مسلمہ اخلاقی اقدار کی پامالی، سیاسی مکاریوں، طبقاتی کشمکش، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام اور ظلم و تعدی کی مذمت کرتے ہیں اور ایسا وہ اپنے کالم کی ابتدا میں کرتے ہیں جب یہی صورت حال وہ اہلِ قلم کے ہاں دیکھتے ہیں تو اضطراب دو چند ہو جاتا ہے۔ ان کے الفاظ اس اضطراب کی چغلی کھاتے ہیں۔ وہ ادیبوں کے ہاں یک جہت، پیار محبت اور ایک دوسرے کے احترام کے پیغام کو عام کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اپنے ممدوحین کے مختصر خاندانی پس منظر اور تصانیف کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ شعروں کے اندراج سے بھی دل چسپی پیدا کرتے ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کالم کے لوازم سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ ان کے کالموں میں فکری تبحّط پایا جاتا ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ انھوں نے مرحوم اہلِ علم کے بارے میں بھی کالم لکھے ہیں ان میں قیصر بارہوی، سیف زلفی، نسیم امروہوی، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل، ڈاکٹر عبیداللہ خاں، شیر افضل جعفری، محمود نظامی، پروفیسر مختار ترابی اور رحمٰن مذنب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعینہٖ بقیدِ حیات شعرا و اُدبا میں سینئرز کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کو بھی اپنے کالموں میں جگہ دی ہے۔ ان میں شاعرات بھی شامل ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو ان کے ہاں توازن کی صورت نمایاں ہے۔ ان کے کالموں کو ایک ایسی 'میزانِ فکر و نظر' قرار دیا جا سکتا ہے جس کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔

افسانوں کی طرح کالموں کا آغاز اور اختتام بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کالم ان دونوں خوبیوں کی بنا پر زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کالم لکھتے وقت ان دونوں خوبیوں کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ بیش تر کالموں کے آخری پیراگراف کی ابتدا ڈاکٹر صاحب ''اس معروضے کے آغاز'' کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اکثر و بیشتر اختتام کو ابتدا سے ملا دینے کا ہنر آزماتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے کالموں کی ایسی خوبی ہے جو دوسرے کالم نگاروں کے کالموں میں کم ہی نظر آتی ہے یعنی ڈاکٹر کالم لکھتے لکھتے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل جائیں، ابتدائی حصے کو بہر کیف اہمیت دیتے ہیں اور اپنی تحریر کو ثمر بار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک کالم کی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:

> ''لکھنؤ برصغیر کی تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز تھا یہی سبب ہے کہ جملہ فنونِ لطیفہ یہاں اوجِ کمال تک پہنچے۔ نثر ہو یا شاعری یہاں کے تخلیق کاروں نے ہر میدان میں اپنی صناعانہ تخلیقی

ہنر مندیوں کا ثبوت دیا۔ فن کے اظہار کے لیے نئے نئے راستے تلاش کیے جانے لگے۔ خارجیت اور ڈرامائی عناصر کے امتزاج سے لکھنؤ میں ایک منفرد شعری فضا تشکیل پانے لگی۔ اسی صورت حال میں خارجیت اور ڈرامائی عناصر اور واقعہ کربلا کے مثلث نے صنفِ مرثیہ کا تخلیق نامہ مرتب کیا۔ برصغیر کی سرزمین کا طرزِ احساس اور اس کے تہذیبی اثرات نیز عرب کے تاریخی واقعات و عوامل انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں میں یک جا ہو کر فن کی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگے۔''[۱]

اب اسی کالم کا اختتامی پیراگراف نقل کرتا ہوں:

''اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ انیسؔ و دبیرؔ نے برصغیر کے تہذیبی اثرات کو نہایت فن کاری کے ساتھ ملا جلا کر اپنے مرثیوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ اب اسی معروضے کی روشنی میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قیصر بارہوی نے بھی پاکستانی طرزِ احساس اور کربلا کے اثرات کو ایک دوسرے میں جذب کر کے مرثیوں کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب اگر ہم چاہیں تو ان مرثیوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ پاکستانی اسلامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔''[۲]

کالم کی ابتدا اور اختتام کے جملوں میں مماثلت کا شعوری سطح پر مطالعہ ضروری ہے۔ اس نوع کی ایک اور مثال دیکھیے:

''عصرِ حاضر میں ہمارا معاشرہ جن معاشرتی مسائل سے دوچار ہے اس کا اظہار اب لفظوں میں ممکن نہیں ہے۔ دہشت گردوں نے پورے معاشرے کو یرغمال بنا لیا ہے اور اربابِ حکومت ذاتی تحفظات کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ محلاتی سازشیں عروج پر ہیں اور حکومت کی غلام گردشوں میں پرورش پانے والے اَدیب، صحافی اور تخلیق کار کا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر بھی اس سماجی افراتفری کے اثرات مرتسم ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تخلیق کار کو ذہنی سکون ہی نصیب نہ ہو تو وہ شعر و اَدب کی تخلیق پر کیسے آمادہ ہو سکتا ہے۔''[۳]

اسی کالم کا اختتامیہ ملاحظہ ہو:

''اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جب تک تخلیق کار کو پُرسکون ماحول میسر نہیں آتا وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر معراج نیر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے بعد دنیاوی جاہ و منصب سے بے نیاز ہو کر تخلیقی کاموں میں پُرسکون طریقے سے منہمک ہو چکے ہیں اور مختصر وقت میں ان کی شائع ہونے والی کئی اہم کتب اُن کے تخلیقی فعال ہونے کا بین ثبوت ہے۔''[۴]

کے نز یک بڑا اہم ہے وہ ان ادیبوں کے حوالے سے تحفظات کٹر

رکھتے ہیں جن کا رشتہ اَدب سے کم زور پڑتا جا رہا ہے اور ان کی توجہ ایوارڈز پر جمی رہتی ہے۔ ایک کالم میں وہ رقم طراز ہیں کہ:

''اَدیب ذاتی نمود و نمائش اور جلب منفعت کے لیے ہنگامی اَدب تخلیق کر رہے ہیں۔ باشعور قارئین نے اَدب کی کم قدری اور بے سروسامانی دیکھ کر فلمی رسائل اور ڈائجسٹوں میں پناہ ڈھونڈ لی ہے۔ صحافیوں اور کالم نگاروں کو اعزازات و انعامات سے نواز کر پوری قوم کو کالم نگار بننے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور اَدب سرِ عام رسوا ہو رہا ہے۔''۵

وہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال چند برس مزید جاری رہی تو ہمارے معاشرے میں اَدب اور ادیب کی وقعت ختم ہو جائے گی اور ہمارا معاشرہ بے ادبی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب کر اپنی شناخت کھو بیٹھے گا۔ ایسے میں وہ چاہتے ہیں کہ اَدب، ادیب اور قاری کے مثلث کو قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایسے شعرا کی تخلیقات منظرِ عام پر لائی جائیں جو اپنے افکار عالیات کے ذریعہ معاشرے کو توانا اور تابندہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔''۶

ڈاکٹر صاحب اہلِ قلم سے مایوس نہیں ہیں۔ وہ صرف ان خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں جو اجتماعی مفادات اور معیارات کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ اس ضمن میں وہ قاری کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ان کے نزدیک قاری کے اَدب سے دُور ہونے کی وجہ ادیب کی ہنگامی نوعیت کا اَدب تخلیق کرنے کی روش ہے۔ دوسرا مسئلہ عدم ابلاغ کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اَدب ادیب اور کتاب کے مثلث پر تو زور دیتے ہیں مگر قاری کو شامل کیے بغیر چارہ نہیں۔ یوں یہ مثلث مربع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن 'اَدبی بیٹھک' کے ذریعے دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔ یہ مثال دیکھیے:

''عصرِ حاضر سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اَدبی تخلیق کار بھی اپنا چولا بدلنے کی فکر میں ہیں۔ آپ اس صورتِ حال کو 'اَدبی ہارس ٹریڈنگ' قرار دے سکتے ہیں۔ نظریات کی تعمیر و تشکیل ادیب، اَدب اور قاری تینوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اَدبی تخلیق کار ذاتی منفعت کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نظریات پیش کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ قارئین کا اولین فرض ہے کہ وہ ان تخلیق کاروں پر کڑی نگاہ رکھیں جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی وابستگیاں تبدیل کر لیتے ہیں۔''۷

ایک اور مثال پیش کرتا ہوں:

''ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم کھوٹے کھرے میں پہچان نہیں کر پاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اَدب میں بھی 'تعداد' کو 'معیار' ترجیح کی کثیر

آج بھی موجود ہے۔ صاحبانِ دانش اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ عزت و وقار کا تعلق ہمیشہ معیار سے وابستہ رہا ہے، 'مقدار' سے نہیں۔ اپنی کتابوں پر اترانے والے تخلیق کار آج 'ادبی گورستان' میں پڑے ہیں۔ ان کی قبریں ویران ہیں، ان کے مقبروں پر چراغ جلانے والے اور پھول چڑھانے والے بھی ناپید ہو گئے ہیں۔ ان کی تخلیقات سے کوئی استفادہ نہیں کرتا اور اب وہ بے بوگل کی طرح طاقِ نسیاں کی زینت بن چکی ہیں۔ دراصل مقدار کے حوالے یہ بھول گئے تھے کہ دنیاوی اعمال کی جزا سزا تو روزِ حشر ملے گی لیکن الفاظ کے بے محل استعمال کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔''[۸]

فارسی میں کہتے ہیں:

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ڈاکٹر شبیہ الحسن دیگر ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ کالم نگاری کا جو فریضہ ادا کر رہے ہیں اس کی اہمیت و افادیت، قدر شناس ہی جان سکتے ہیں۔ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کے قدر شناسوں کی کمی نہیں ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے کالموں میں رثائی ادب کے حوالے سے خاص طور پر گفت گو کی گئی ہے۔ جدید مرثیے کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا تاہم ۱۹۷۰ء میں اسے زیادہ اہمیت ملی اور اسے رواج دینے والے معتبر شعرا میسر آ گئے۔ ڈاکٹر عباس رضا کے بارے میں لکھے گئے کالم میں وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے حوالے سے سلام نگاری پر بھی بات کرتے ہیں۔ اس طرح وہ متعلقہ شخصیات کے اختصاصی پہلوؤں کو اُجاگر کر کے قاری کو خاطر خواہ معلومات بہم پہنچاتے اور شخصیت کا بھرپور تعارف کراتے ہیں۔ ڈاکٹر عباس رضا[۹] کے بارے میں لکھے گئے کالم سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''انھوں نے پہلی مرتبہ اُردو سلام کی فکری فنی جہتوں کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے سلام کے ارتقا پر جو معروضات پیش کیے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے لائق توجہ ہیں۔''[۱۰]

عرفی ہاشمی کے چار مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔ (i) میزان خرد (ii) سیاست تبسم (iii) محنت اور ادیب (iv) اکیسویں صدی اور کربلا۔ ڈاکٹر صاحب نے عرفی ہاشمی کے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد ان کی مرثیہ نگاری کی دو خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کے نزدیک یہی ان کے مرثیوں کا ماحصل ہے:

(۱) جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے نظریات کا اظہار

(۲) جدت اور کلاسیکیت کا حسین شعری امتزاج

ڈاکٹر صاحب کی عرفی ہاشمی کے بارے میں یہ رائے ملاحظہ ہو:

''عرفی ہاشمی کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے کے پرانے سبو میں تازہ مے ڈال

دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرقعے علم و اَدب کے شیدائیوں کے لیے دعوتِ فکر کا
سامان فراہم کرتے ہیں۔''[۱۱]

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان کالموں کی ایک دل کش اور پُر شکوہ بزم تشکیل دی ہے جس کے بارے میں میر امداد علی آشوب نے برسوں پہلے کہہ دیا تھا:

دل کو سمجھے تھے کہ اس بزم سے لے آئیں گے
ہائے اپنا بھی ہوا واں سے پھر آنا مشکل [۱۲]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے کالم لکھتے ہوئے رخشِ احساس کی باگ پر اپنی گرفت کو کمزور نہیں پڑنے دیا۔ اپنے سلجھے ہوئے خیالات پختہ ہنر کی بدولت ان کے کالموں کے صورونقوش بڑے واضح اور روشن ہیں۔ اس فنِ سلیم کے خطے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد خوش گوار جھونکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خطہ اَدب کے نوجوان ڈاکٹر کے اثمارِ ہنر سے فیض اٹھائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے دُر ہائے ناسُفتہ کو بھی اَدب کی سلکِ پُر وقار میں پرونے کی کامیاب سعی کی ہے۔

....

حواشی

(۱) قیصرِ اقلیمِ مرثیہ، مشمولہ: روز نامہ ُدن ُلاہور، ۴ جولائی ۲۰۰۷ء۔
(۲) ایضاً۔
(۳) ایک باطنی خاکہ نگار.....ڈاکٹر معراج نیر، مشمولہ: روز نامہ ُدن ُلاہور، ۲۲ مئی ۲۰۰۷ء۔
(۴) ایضاً۔
(۵) ٹکڑے ٹکڑے آدمی۔ سیف زلفی، مشمولہ: روز نامہ ُدن ُلاہور، ۲۶ مئی ۲۰۰۷ء۔
(۶) ایضاً۔
(۷) ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر۔ ضیاء الرحمٰن فاروقی، مشمولہ: روز نامہ ُدن ُلاہور، ۲ جون ۲۰۰۷ء۔
(۸) شعروادب کا مسیحا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، مشمولہ: روز نامہ ُدن ُلاہور، ۲۳۔ مئی ۲۰۰۷ء۔
(۹) ڈاکٹر عباس رضا کو پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ''اُردو میں سلام نگاری کی روایت'' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی۔ نگران ڈاکٹر سہیل احمد خاں تھے۔
(۱۰) اجداد کی وراثت کا امین۔ ڈاکٹر عباس رضا، مشمولہ روز نامہ ُدن ُلاہور ۱۳ جون ۲۰۰۷ء۔
(۱۱) بجھے چراغوں کی روشنی، مشمولہ روز نامہ ُدن ُلاہور ۱۲۔ جولائی ۲۰۰۷ء۔
(۱۲) میر امداد علی آشوب، بحوالہ تذکرہ ُگلستانِ سخن ُجلد اول، مولف قادر بخش، صابر دہلوی، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی اَدب لاہور، ۱۹۶۶ء، صفحہ ۲۳۵۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک معتبر کالم نگار

شفیق الرحمٰن الہ آبادی

◆◆

عصرِ حاضر میں کالم نویسی دنیا بھر کے اخبارات میں نہ صرف ایک مقبول صنف ہے بل کہ جدید صحافت کا مابہ الامتیاز بھی ہے۔ کالم (Column) انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ستون، کھمبا وغیرہ کے ہیں، اصطلاح میں کسی اخبار یا رسالے میں مستقل عنوان کے تحت باقاعدہ شائع ہونے والی ایسی تحریر کالم کہلاتی ہے جو مستقل لکھنے والے کے نام سے شائع ہوتی ہے اور اس میں لکھنے والا اپنے پسندیدہ اُسلوب کے مطابق مسائل و افکار کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ صحافت میں جو مقام کالم نگار کو حاصل ہے وہ نہ اداریہ نویس کو ہے اور نہ ہی فیچر نگار کو۔ جب خبروں پر حکومتی احکامات کے مطابق سنسر شپ نافذ ہو تو کالم نگار ہی اپنے خاص اُسلوب اور علامتی طرزِ تحریر کے ذریعے حالات و واقعات کی صحیح تصویر قارئین تک پہنچاتا ہے۔

عہدِ جدید میں صحافت کو ایک فن کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور کالم نگاری صحافت کا ایک مستقل شعبہ قرار پا چکا ہے۔ فنِ صحافت سے تعلق رکھنے والے دانش وروں نے کالم کی بے شمار اقسام پر روشنی ڈالی ہے۔ کالم فکاہی بھی ہوتے ہیں اور سنجیدہ بھی۔ اس سے تبصرے، تنقید اور تجزیے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ زندگی اور معاشرے کے ہر پہلو کو کالم کا موضوع بنایا جا سکتا ہے تاہم ناقدین کے پیش کردہ معروضات کی روشنی میں کالم کو بنیادی طور پر تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱۔ اُسلوبیاتی کالم
(جس میں مزاحیہ، سنجیدہ، اقتباسی، ترکیبی، مکتوباتی اور علاقائی کالم شامل ہیں)

۲۔ مشاہداتی کالم
(جس میں سیاحتی اور ڈائری نما کالم شامل ہیں)

۳۔ موضوعاتی کالم

(جس میں طبّی، قانونی، دینی، نفسیاتی، سائنسی اور اُدبی کالم شامل ہیں)

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مختلف کالموں کے اسالیب ایک دوسرے سے منفرد اور جدا ہوتے ہیں۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے بھی اس پر کوئی پابندی نہیں ہوتی اور نہ عاید کی جاسکتی ہے۔

برصغیر میں اُردو کالم نگاری کا آغاز کس نے کیا......؟؟ اس کا حتمی جواب تو نہیں دیا جاسکتا تاہم مولانا ظفر علی خان نے اسے حتمی اور عملی شکل دی۔ ان کے بعد چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر اور حمید نظامی وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ عصرِ حاضر میں جہاں انتظار حسین، جمیل الدین عالی، عطاالحق قاسمی، بشریٰ رحمٰن، ڈاکٹر اجمل نیازی، اشرف شریف، جمیل احمد عدیل، امجد اسلام امجد، حسن عسکری کاظمی، ارشاد احمد حقانی، کشور ناہید، ظفر اقبال، منو بھائی، حسن نثار، جاوید چودھری، ناصر زیدی اور امجد قریشی وغیرہ نے قومی اخبارات میں کالم نگاری کے ذریعے اپنا نام اور مقام بنایا ہے وہاں ان میں ایک ممتاز نام پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا بھی ہے جو معروف ادیب، نقاد، محقق اور مدیر بھی ہیں۔ آپ کی تیس سے زیادہ کتب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور ان کا اشہبِ قلم آج بھی علمی و اَدبی میدان میں رواں دواں ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے باقاعدہ کالم نگاری کا آغاز روزنامہ ''دن'' لاہور سے کیا۔ آپ کا اولین کالم بعنوان 'بالا خانے کا مسافر۔ رحمٰن مذنب' مورخہ ۲۶ فروری ۲۰۰۷ء کو شائع ہوا، آپ کے کالم کا مستقل عنوان ''اُدبی بیٹھک'' ہے۔ مختلف اَدبی شخصیات پر آپ کے پچاس سے زائد کالم شائع ہو کر قارئین و ناقدین سے دادو تحسین پا چکے ہیں۔ یہ بات محلِ نظر رہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے کالم روزنامہ 'مساوات' لاہور میں ''مشاہیر'' کے عنوان سے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کے شہر میلسی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار 'سردار' میں بھی آپ کے کالم بعنوان ''اُدبی دستک'' شائع ہو رہے ہیں۔

اب ذیل میں ''اُدبی بیٹھک'' میں شائع ہونے والے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے کالموں کی فہرست پیشِ خدمت ہے:

۱۔	بالا خانے کا مسافر۔ رحمٰن مذنب	۲۶ فروری ۲۰۰۷ء
۲۔	لکھنوی اور لاہوری ثقافت کا حسین امتزاج۔ ڈاکٹر آغا سہیل	یکم مارچ ۲۰۰۷ء
۳۔	جاپان میں اُردو زبان کا سفیر۔ ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری	۴ مارچ ۲۰۰۷ء
۴۔	بڑے افسروں میں بڑا نقاد۔ ڈاکٹر محمد صالح طاہر	۵ مارچ ۲۰۰۷ء
۵۔	گلستانِ اُدب کا جمال۔ ڈاکٹر قاسم جلال	۱۳ مارچ ۲۰۰۷ء
۶۔	افلاطون کا درباری شاعر۔ اختر ہاشمی	۱۹ مارچ ۲۰۰۷ء

۷۔	یادوں کی مہک۔ پروفیسر مختار ترابی	۲۰ مارچ ۲۰۰۷ء
۸۔	جلاوطنی کا دکھ اور طارق عزیز کے خواب	۲۲ مارچ ۲۰۰۷ء
۹۔	کومل جذبوں کا شاعر۔ جاوید صدیق بھٹی	۲۵ مارچ ۲۰۰۷ء
۱۰۔	سانس کی گرہیں اور شکیل جاذب	۲۷ مارچ ۲۰۰۷ء
۱۱۔	ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی میں جگ بیتی	۲۸ مارچ ۲۰۰۷ء
۱۲۔	پاکستان اور اسلام کا شیدائی۔ پروفیسر حمید کوثر	۲۹ مارچ ۲۰۰۷ء
۱۳۔	امریکا میں چراغِ مصطفویؐ روشن کرنے والا شاعر۔ نقاش ہاشمی	یکم اپریل ۲۰۰۷ء
۱۴۔	اُردو سفرنامہ اور محمود نظامی کا 'نظرنامہ'	۳۔ اپریل ۲۰۰۷ء
۱۵۔	جھنگ کا ملنگ۔ شیر افضل جعفری	۹۔ اپریل ۲۰۰۷ء
۱۶۔	اختصاریوں کی روایت اور فرقان احمد قریشی	۵۔ مئی ۲۰۰۷ء
۱۷۔	جدید تنقیدی رویوں کا علم بردار۔ عبدالکریم خالد	۲۹۔ اپریل ۲۰۰۷ء
۱۸۔	وجاہت حسین کا تخلیقی کارنامہ۔ ''فرد، معاشرہ اور شعور''	۳۰۔ اپریل ۲۰۰۷ء
۱۹۔	بجھ کر بھی چراغ جل رہا ہے (ڈاکٹر عبیداللہ خان)	۳ مئی ۲۰۰۷ء
۲۰۔	'حرفِ قدس' کی دھیمی دھیمی دستک اور نصرت زیدی	۴ مئی ۲۰۰۷ء
۲۱۔	ایک ہمہ جہت تخلیق کار۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل	۱۶ مئی ۲۰۰۷ء
۲۲۔	متنوع علوم کا دبستان۔ نسیم امروہوی	۱۷ مئی ۲۰۰۷ء
۲۳۔	تلوار اور قلم کا امتزاج۔ خالد محمود اَمر	۱۸ مئی ۲۰۰۷ء
۲۴۔	ایک باطنی خاکہ نگار۔ ڈاکٹر معراج نیر	۲۲ مئی ۲۰۰۷ء
۲۵۔	آسمان شاعری کا روشن ستارہ۔ طاہر ناصر علی	۲۳ مئی ۲۰۰۷ء
۲۶۔	شعر و اَدب کا مسیحا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی	۲۴ مئی ۲۰۰۷ء
۲۷۔	ایک محقق اور نقاد۔ ڈاکٹر نواز حسن زیدی	۲۵ مئی ۲۰۰۷ء
۲۸۔	ٹکڑے ٹکڑے آدمی۔ سیف زلفی	۲۶ مئی ۲۰۰۷ء
۲۹۔	میلسی کے اُفق کا روشن آفتاب۔ شفیق الرحمٰن الہ آبادی	۲۸ مئی ۲۰۰۷ء
۳۰۔	فطرت شناس شاعر۔ اختر حسین سندھو	یکم جون ۲۰۰۷ء
۳۱۔	ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر۔ ضیاء الرحمٰن فاروقی	۲ جون ۲۰۰۷ء
۳۲۔	اُردو شاعرات میں ایک معتبر نام۔ نسیم سیّد	۱۲ جون ۲۰۰۷ء

۳۳۔	اَجداد کی وراثت کا امین ۔ ڈاکٹر عباس رضا	۱۴ جون ۲۰۰۷ء
۳۴۔	وطن سے دُور چراغِ اَدب جلانے والا ۔ اشفاق حسین	۱۵ جون ۲۰۰۷ء
۳۵۔	ایک ہمہ جہت تخلیق کار ۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی	۲۵ جون ۲۰۰۷ء
۳۶۔	رفعت خانم کی شاعرانہ ہنرمندیاں	۲۶ جون ۲۰۰۷ء
۳۷۔	بے حس معاشرے میں ''احساس'' کا تحفہ ۔ آفتاب کاوش	۲۸ جون ۲۰۰۷ء
۳۸۔	قیصرِ اقلیم مرثیہ ۔ قیصر بارہوی	۴ جولائی ۲۰۰۷ء
۳۹۔	''بجھے چراغوں کی روشنی'' اور عرفی ہاشمی	۱۲ جولائی ۲۰۰۷ء
۴۰۔	زبان واَدب کے فروغ میں میڈیا کا مثبت کردار	۱۸ جولائی ۲۰۰۷ء
۴۱۔	ایک تہذیبی نقاد ...... ع۔س۔ مسلم	۲۳ جولائی ۲۰۰۷ء
۴۲۔	شاعری میں حزن وملال کی کیفیات اور تسنیم عابدی	۳۰ جولائی ۲۰۰۷ء
۴۳۔	ایک صاحب طرز تخلیق کار ۔ جعفر بلوچ	۲۲۔ اگست ۲۰۰۷ء
۴۴۔	پاکستانی اَدب کے قافلہ سالار ۔ خالد اقبال یاسر	۵ ستمبر ۲۰۰۷ء
۴۵۔	ایک منفرد افسانہ نگار ۔ جمیل احمد عدیل	۸ ستمبر ۲۰۰۷ء
۴۶۔	اُردو منقبت کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی (قسط ۱)	۱۰ ستمبر ۲۰۰۷ء
۴۷۔	اُردو منقبت کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی (قسط ۲)	۱۱ ستمبر ۲۰۰۷ء
۴۸۔	عرفانہ عزیز کی شعری کائنات	۲۰ ستمبر ۲۰۰۷ء
۴۹۔	ڈاکٹر حسن رضوی ۔ چند یادیں، چند باتیں	۳۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء
۵۰۔	ایک منفرد تخلیق کار ۔ پروفیسر وحید عزیز	۷۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء
۵۱۔	ایک نظریاتی نقاد ۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۹۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء
۵۲۔	تصوف کی کہانی ڈاکٹر نفیس اقبال کی زبانی	۱۲۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء
۵۳۔	نسیم الحسن زیدی کی مدحیہ شاعری	۲۰۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء
۵۴۔	جدید اُردو غزل اور اسلم کولسری	

آپ کو درج بالا کالموں کے عنوانات کے مطالعہ سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے کتنے متنوع اور رنگا رنگ موضوعات اور ہمہ جہت شخصیات پر قلم اُٹھایا ہے۔

آج کا دَور سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں معجز نما پیش رفت کا دَور ہے۔ سائنس نے جدید وسائل سے کرۂ ارض کو تسخیر کر لیا ہے اور اب یہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ ایک دُوسرے سے باخبر رہنے کا

ایک موثر ذریعہ پرنٹ میڈیا ہے، جس میں اخبارات، رسائل اور میگزین وغیرہ شامل ہیں لیکن ان سب میں اخبار کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ یہ روزانہ شایع ہو کر ملک کے تمام شہروں میں پہنچتا ہے اور اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اُدب اور اُدیب شناس ہونے کے ساتھ ساتھ میڈیا شناس بھی ہیں اور اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ زبان واَدب کے فروغ میں میڈیا کا کردار بہت اہم ہے اسی لیے آپ نے تدریسی، تصنیفی اور تالیفی مصروفیات کے باوجود کالم نگاری کا آغاز کیا اور اخبارات کے ہجوم میں ایسے اخبارات کا چناؤ کیا جو قارئین میں بے حد مقبول ہیں اور کراچی سے خیبر تک روزانہ لاکھوں قارئین ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے کالم میں روزانہ ایک ممتاز اَدبی شخصیت پر قلم اُٹھاتے ہیں اور مختصر کالم میں اس کی شخصیت وفن کا بھرپور تجزیہ پیش کر دیتے ہیں۔ آپ کی کالم نگاری کا ایک اختصاص یہ ہے کہ آپ زیادہ تر عہدِ موجود کی زندہ اَدبی شخصیت پر لکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہماری قوم مردہ پرست ہوتی جارہی ہے زندہ شخصیات کے تخلیقی کارناموں کا اعتراف اور ستائش برائے نام ہے بالخصوص سرکاری سطح پر ادیبوں کی پذیرائی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ بقول ڈاکٹر شبیہ الحسن :

ستم کی دھوپ میں اس کا بدن چٹختا رہا
وہ مر گیا تو اُسے ریشمی لباس ملا

ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ :

''کسی بھی شخص کی پذیرائی کا سب سے بڑا طریق یہ ہے کہ اس کی حیات میں اس کے فن کے اسرار ورموز اُجاگر کیے جائیں۔''

ہمارے ملک میں ایسی بے شمار اَدبی شخصیات موجود ہیں جو ہر لحاظ سے صاحب علم و دانش ہیں مگر بد قسمتی سے اَدبی مراکز سے دُور مضافات میں مقیم ہیں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا تک ان کی رسائی بہت دشوار ہے اگر وہ رسائی ممکن بنا بھی لیں تو کرسی پر براجمان مفاد پرست اور تنگ نظر طبقہ ان کو اور ان کی تخلیقات کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب جو وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع القلب شخصیت کے مالک ہیں مضافات میں مقیم ایسے ادیبوں پر کھلے دل سے لکھتے ہیں اور ان کے فن کا اعتراف کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتے مثلاً راقم الحروف کے علاوہ چند ایسے ادیبوں کے نام ملاحظہ فرمائیں جن کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے کالموں کا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، خالد محمود اُمر، اختر حسین سندھو، قاسم جلال، جمیل احمد عدیل، آفتاب کاوش وغیرہ۔ مضافات کے علاوہ آپ نے ایسے ادیبوں پر بھی کالم تحریر کیے ہیں جو لاہور میں مقیم ہیں اور بہت معیاری اَدب تخلیق کر رہے ہیں مگر پبلک ریلیشن نہ ہونے کے باعث اس مقام و مرتبے سے محروم ہیں جس کے وہ مستحق تھے مثلاً رحمن مذنب، ڈاکٹر حسن نواز زیدی، ڈاکٹر عباس رضا، طاہر ناصر علی، فرقان قریشی، عبدالکریم خالد اور قیصر بارہوی وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب کی دُور اندیش نظریں غیر ممالک میں مقیم ایسے پاکستانی ادیبوں کو بھی تلاش لیتی ہیں جو وطن سے دُور رہ کر بھی وطن کی محبت سے سرشار ہیں مثلاً نقاش ہاشمی، اشفاق حسین، نسیم سیّد اور رفعت خانم وغیرہ، آپ نے چند مرحوم اُدبی شخصیات مثلاً ڈاکٹر عبیداللہ خاں، مختار ترابی، نسیم امروہوی اور شیر افضل جعفری پر کالم لکھ کر اُدبی دنیا میں ان کو زندہ جاوید کردیا ہے۔ ان کے کالموں سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''ڈاکٹر عبیداللہ خان مشرقی تہذیب و تمدن کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ ان کا لباس، گفت گو، رہن سہن بل کہ پورا اُسلوبِ حیات ہی مشرقی تھا۔''

(بجھ کر بھی چراغ جل رہا ہے۔ ۳ مئی ۲۰۰۷ء)

''قیصر بارہوی کی یوں تو تمام شاعری ان کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے تاہم ان کے مرثیوں میں داخلی اور خارجی دونوں کرب ٹھاٹھیں مار رہا ہے وہ خود تو تنہا دنیا سے رخصت ہوگئے لیکن انھوں نے اقلیم مرثیہ میں خود کو قیصر منوالیا۔'' (قیصر اقلیم مرثیہ۔ ۴ جولائی ۲۰۰۷ء)

خواتین اہلِ قلم خاص طور پر شاعرات کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان میں خود سے لکھنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے معتبر شاعرات عرفانہ عزیز، تسنیم عابدی، نسیم سیّد اور رفعت خانم پر کالم لکھ کر یہ ثابت کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے کہ خواتین بھی اچھی تخلیق کار ہوسکتی ہیں بشرطیکہ وہ اپنی شاعری کی بنیاد سطحی جذبات اور عامیانہ خیالات پر نہ رکھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کالم نگاری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ آپ نے ادیب کی شخصیت و فن کے علاوہ عصرِ حاضر کے اُدبی و معاشرتی مسائل کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور ان کا حل بھی پیش کرتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں جوہرِ قابل کی کمی کا رونا تو روتے رہتے ہیں لیکن دستیاب جوہر کی قدر افزائی نہیں کرتے اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہماری ترجیحات تبدیل ہوگئی ہیں۔ آج کا تخلیق کار ذاتی نمود و نمائش کا طلب گار ہے۔''

(بالا خانے کا مسافر۔ رحمٰن مذنب)

''عصرِ حاضر کے نوجوان شعرا کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے جدّت کے شوق میں روایت سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نوجوان شعرا مطالعے کے ذوق سے عاری ہوگئے ہیں۔''

(کومل جذبوں کا شاعر۔ جاوید صدیق بھٹی)

''تخلیق کاروں میں سنجیدگی کے مفقود ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ قاری، اُدب اور ادیب کی مثلث ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ اُدب زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں، ادیب کا قلم

احباب کی خوشنودی کے لیے وقف ہو گیا ہے۔"

(جدید تنقیدی رویوں کا علم بردار۔عبدالکریم خالد)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے کالموں میں اگرچہ کسی علمی و اَدبی شخصیت کو موضوع بنایا جاتا ہے لیکن بعض کالم نظری موضوعات پر بھی رقم کیے گئے ہیں۔ ان کا ایک کالم "زبان و اَدب کے فروغ میں میڈیا کا کردار" اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم اور وقیع ہے۔ اس کالم میں انھوں نے صاحبانِ دانش سے اُردو زبان و اَدب کے فروغ کے لیے میڈیا کو استعمال کرنے کی استدعا کی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ کالم منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر بھی ہے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ ہمارے تخلیق کار ڈاکٹر صاحب کے اس کالم سے کماحقہٗ استفادے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے کالموں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے زیرِ مطالعہ موضوع کو ہمیشہ آغاز، عروج اور انجام سے پیوست رکھا ہے۔ وہ تمہید میں جو نقطۂ نظر اُبھارتے ہیں اسے اپنے ممدوح پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر میں بڑے سلیقے سے اسے حتمی نتائج تک لے آتے ہیں۔ اس طرح پورا کالم اپنے اندر ایک مجموعی تاثر لیے ہوتا ہے جو پرلطف بھی ہوتا ہے اور اثر انگیز بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ پورے کالم میں ایک معنویت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو لائق صد تحسین ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک ہمہ جہت ادیب ہیں جب ہم ان کی تحقیقی کاوشوں کو دیکھتے ہیں تو وہ باصلاحیت اور ثقہ محقق کے رُوپ میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں، جب ہم ان کی تنقیدی کتب اور مقالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ایک صاحب الرائے نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ جب ہم ان کے مجلّے ماہ نامہ "شام و سحر" کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ بہترین مدیر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور جب ہم ان کے کالموں کو پڑھتے ہیں تو وہ ایک معتبر کالم نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں کہہ لیجیے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو اَدب کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے کالموں کا سب سے بڑا وصف ان کا منفرد اُسلوب ہے۔ عصرِ حاضر کے تمام کالم نگاروں کے اسالیب صحافیانہ زبان پر استوار ہیں لیکن ڈاکٹر سید شبیہ الحسن خالص علمی و اَدبی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اَدب و صحافت کے درمیان ایک رابطہ قرار پاتے ہیں۔ زبان و بیان پر دسترس کے باعث ان کا اُسلوب تند و ترش ہو جاتا ہے جو معاصر اَدبی صورتِ حال کو بہتر بنانے کا موجب بنتا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں اپنے منفرد اَدبی موضوعات و اسالیب کے باعث ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے کالم اُردو اَدب میں گراں قدر اضافے کا باعث ہیں۔

◆◆◆

آلِ رضا سے اہلِ وفا تک

(ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیق اور تنقید)

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مختلف الجہات تنقید اور تحقیق کاوشوں کے حوالے سے ان کی شخصیت اور فن کے علاوہ ان کے تنقیدی رجحانات پر تبصرہ یا گفت گو کرنا خاصا دشوار کام ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے لیے زندگی کام کے مترادف ہے، متنوع مصروفیات کے باوجود انھوں نے تحقیق وتنقید کی اتنی کتابیں کیسے تحریر کرلیں اور ان پر مستزاد یہ کہ سلیقے سے مرتب کیں یقیناً ان کے قبضے میں کوئی جن ہے اگر ایسا نہیں تو پھر وہ خود جن ہیں، بوتل میں بند نہیں بل کہ بوتل سے باہر۔ اب یہ جداگانہ بات ہے کہ سیّد شبیہ الحسن نے محنت ہی کو اپنے لیے ''بوتل'' بنالیا ہے۔'' اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کیا اور انھیں کام کرنے اور اسے سمیٹنے کا سلیقہ آتا ہے۔ دوسرے وہ کام کی اہمیت کے پیشِ نظر مداومتِ عمل کے قائل ہیں، ان کے لیے آرام اُڑتے ہوئے پرندے کا بھاگتا ہوا سایہ ہے جو کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ مراد یہ ہے کہ وہ آرام کی بجائے کام کو ترجیح دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ بہت کم عرصے میں بہت زیادہ کام کیے جب کہ اور لوگ بڑے عرصے میں بہت کام کر پائے۔ بہر حال ان کے مختلف النوع کاموں کو دیکھتے ہوئے ان پر کام کرنے کا حوصلہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ محمد آصف وٹو کی تالیف ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف ان کے سوانحی کوائف اور اعترافات نیز برصغیر پاک وہند کے معروف ناقدین، دانش وروں اور اکابرین کی آراء کو یکجا کیا گیا ہے۔ وہاں ان کی ادبی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ آصف وٹو نے جہاں شبیہ الحسن کے تحقیقی اور تنقیدی سفر کی جزئیات، آغاز سے اب تک ان کے اُدبی کارناموں کا احاطہ کیا کے نا شعرا

کی تخلیقات اوران کی خدمات سے متعلق تفصیل کے ساتھ کام کو یک جا کیا۔ آصف وٹو کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُردو زبان وادب میں تنقید کی اہمیت اوراس حوالے سے اعلا ادب کی تخلیق کے لیے معیاری تنقید کی ضرورت پر بھرپور گفت گو کی ہے، انھوں نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقید میں فکروشعور کی بازیافت کو دریافت کیا اور تنقید میں عصری حسیت جیسے نازک اور پیچیدہ موضوع پر تنقید میں نفسیاتی عوامل کو زیرِ بحث لاکر اس کتاب کو نہ صرف دل چسپ بنایا بل کہ اس کی افادیت سے متعلق قاری کو آگاہ کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں میں ان کے ہاں تہذیبی رچاؤ اور شائستہ نگاری کا حسین امتزاج سب سے زیادہ نمایاں ہے، ان کی تنقید میں کسی تخلیق کار سے گہرے لگاؤ اور قربت کا لحاظ رکھنے کے باوجود تنقیدی معیار کو بحال رکھنا اور قاری کے سامنے حقائق کا تسلسل اور اپنے زاویۂ نظر کے علاوہ نتیجہ خیز گفت گو کو آگے بڑھانا شامل رہتا ہے۔ وہ بے کم وکاست سب کچھ ضبطِ تحریر میں لانا ضروری سمجھتے ہیں جو کسی تخلیق اور اس کے خالق کے بطون میں عام قاری کی نظر سے پوشیدہ رہتی ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''شاعر ہو یا ادیب وہ عوامی شعور سے اپنا ذاتی شعور منسلک رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں معاشرتی حالات و واقعات وسماجی عیوب ومحاسن اور تہذیب وثقافت کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔''

اسی طرح آغا سہیل کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''آغا سہیل کے افسانوں میں نفسیاتی ژرف بینی بھی ملتی ہے ان کے بیشتر افسانے نفسیاتی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ نفسیاتی کشمکش کبھی جنسی الجھاؤ کے سبب سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کا محرک معاشرتی ہیجان خیزی بنتی ہے۔''

''شبیہ شناسی'' کو موضوعِ سخن بنانے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ انھوں نے اقبال شناسی اور ''فرہنگِ اقبال'' کے عنوان سے ماہ نامہ 'جدید ادب' لاہور دسمبر ۱۹۸۹ء میں اپنا مقالہ بھیجا، گویا یہ ایک مرحلہ طے کرنے میں انھیں ۱۹۸۶ء سے ۲۰۰۷ء تک قریباً ۱۷برس لگے اور اس عرصۂ زندگی میں ان کے مضامین یا مقالوں کی تعداد ۶۷ بنی، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ شبیہ شناسی پر گفت گو کی جائے۔ یوں تو آل رضا کی غزل گوئی کے بارے میں چند معروضات کے عنوان سے علامہ سید انوار ظہوری نے ''شام وسحر'' لاہور جنوری ۱۹۹۱ء میں بھرپور انداز میں شبیہ الحسن کی شناخت کروائی لیکن اصل کام نئی صدی کے آغاز سے ہوا۔ روشنی کا سفر کے عنوان سے آل رضا پر شبیہ الحسن کی کتاب کا تجزیہ ڈاکٹر عارف ثاقب نے بھی کیا بل کہ یوں کہا جائے یہ تجزیہ نومبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا لیکن سید شبیہ الحسن کی ادبی خدمات ان کے پی ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد اور ان خدمات کا اعتراف ۱۹۹۵ء سے شروع ہو کر اس کتاب تک آپہنچا ہے، ہم شبیہ شناسی کے عہد میں داخل ہو چکے ہیں، ان کی شخصیت اور

فن نیز ان کی تحقیق وتنقید کے معیارات پر ۷۰ سے زائد افراد نے لکھا۔ ان میں نامور نقاد، شعرا اور نثر نگار غرض سبھی نے ان کی اَدبی خدمات کو سراہا۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر آغا سہیل، شہزاد احمد، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر نواز حسن زیدی اور ڈاکٹر معراج نیر کے علاوہ بہت سے دوستوں نے ان کی کتابوں پر جو کچھ لکھا اس کا لب لباب یہی ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن انتھک محنتی اور مخلص صاحب قلم، کثیر الجہات اور وسیع المطالعہ نقاد اور محقق ہیں، زم خو اور مستقل مزاج، علمی و اَدبی کارنامے سرانجام دینے میں اپنی مثال آپ ہیں، مشکل حالات میں علم واَدب اور زبان وتہذیب کی خدمت بجالانا آسان کام نہیں اس لیے ان کی تنقیدی اور تحقیقی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔ انھیں ہر لحظہ اَدب، اَدیب اور قاری کی فکر لاحق رہتی ہے۔ نامساعد حالات کے باوجود مختلف اَدبی محاذوں پر ڈٹے رہنا ان کا وصفِ خاص ہے۔ جو کام دوسرے نہیں کر پائے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بخیر وخوبی انجام دیے مثلاً مرثیے کو دوسری اصناف کے مقابل لا کھڑا کرنے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جتنا کام کیا شاید اتنا کام پہلے کسی فردِ واحد نے انجام نہ دیا ہو۔ انھوں نے مرثیے کے حوالے سے تنقیدی امکانات کو ربط وضبط کے ساتھ اور تہذیبی اقدار کی روشنی میں اس طرح اُجاگر کیا کہ عہدِ موجود میں مرثیہ نئے احوال میں سانس لینے لگا، ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جدید لہجے کے شاعر سیف زلفی کو وقت کے گرد وغبار سے باہر نکالا اور نئی زندگی کا مژدۂ جانفزا سنا کر ان کی مرثیہ نگاری کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور اب سیف زلفی کی شخصیت اور فن نکھر کر ہمارے اور آئندہ آنے والے ہر صاحب ذوق کے لیے وجہ دل بستگی بنے گا۔ اسی طرح سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کو یک جا کر کے (ہر مرثیے پر معروف ناقدین کی آراء سمیت) شائع کیا اور خود بھی ان کی زندگی پر نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھا اور بتایا کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی نے ان مرثیوں میں ہمارے عہد کے انسانی اوصاف اور اقدار کو مہارتِ فن کے ساتھ پیش کیا اور مرثیے کو ارضی حوالے سے روشناس کروایا اور ثابت کیا کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں پر مشتمل ''العطش'' نے پاکستان میں مرثیہ نگاری کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری سے متعلق قیصرِ اقلیم مرثیہ کتاب لکھ کر تحقیق اور تنقید کا حق اَدا کیا، اس کتاب کو معروف مرثیہ نگار اور مرثیہ شناس ڈاکٹر ہلال نقوی کے نام معنون کیا گیا ہے، انھوں نے قیصر بارہوی جیسے مردِ درویش کو یہ لکھ کر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا کہ پاکستان میں جدید اُردو مرثیے کو عظمت دلانے میں قیصر بارہوی کو خاص مقام حاصل ہے، اس سلسلے میں انتظار حسین کا تبصرہ لائق مطالعہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ایک زمانے تک صورت یہ رہی کہ ہمارے مرثیے کی تنقید انیس ودبیر پر آ کر ختم ہو جاتی تھی، کلاسیکی عہد کے بعد کے مرثیے کو لائق توجہ نہیں سمجھا گیا مگر اب شاید اسی پر زیادہ توجہ ہے۔ قیصر بارہوی مرحوم تو ہمارے ہی زمانے کے شاعر تھے ان کے انتقال کے بعد لازم تھا کہ ان سارے کام کو سمیٹا جاتا اور اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کر کے ان کے مرثیے کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم کی جاتی بہت اچھی بات ہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ

الحسن نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔''

شبیہ الحسن کی طبیعت میں نت نئے کارنامے انجام دینے اور ہر وقت متحرک رہنے کی خواہش مچلتی رہتی ہے۔ ان کا قلم تازہ دم رہتا ہے اور ''شام وسحر'' صفحۂ قرطاس کے مساموں کو روشنی فکر سے بھرتا رہتا ہے، ان کی جولانیٔ طبع کا یہ عالم ہے کہ جدید غزل کے چہرے سے گھونگھٹ اُلٹنے کی خاطر ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' جیسی کتاب حجلۂ عروسی نکال کر اس کی رونمائی کا اہتمام بھی کر ڈالا۔ کہاں مرثیے جیسی صنفِ شاعری جس میں آہ و بکا، نالہ وفریاد اور رثائی فضا نے ہمیں تصویرِ غم بنایا اور دوسری طرف ہمارے عہد کی کوکھ سے پھوٹنے والی ''المیہ غزل'' جس میں ماؤں نے اپنے زیور بیچ کر بچوں کو پڑھانے کا عزم ظاہر کیا، یہی غم ذات ہمارے اندر شکست وریخت کا عمل جاری رکھنے اور عصری مسائل کا شعور پیدا کرنے کا بڑا وسیلہ قرار پاتا ہے، شبیہ الحسن نے عقیدت اور ارادت کے ساتھ اس آفاق گیر درد وکرب کے پہلو میں محبت اور مروت ناپید ہونے کے نتیجے میں معاشرتی عدم توازن کو بھی اپنی فکر پرور تحریروں میں جگہ دی ہے اور یوں وہ ایسے نقاد، محقق اور حساس قلم کار کہلائے کہ ہمارے اَدبی، تنقیدی اور تحقیقی سرمایے میں ان کی جملہ نگارشات کو وقیع، بلند پایہ اور مجموعۂ ہفت اقلیم ہونے کا اعزاز ملے گا۔ وہ مستقبل میں اپنے مطالعے کی بنیاد پر آگے بڑھتے جائیں گے اور اُردو اَدب کے دامن میں گُل ہائے رنگارنگ اور گلدستہ ہائے نوع بہ نوع رکھتے چلے جائیں گے۔ آلِ رضا سے تحقیق کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اہلِ وفا تک جاری رہنا مقدر ہو چکا ہے۔ بقول غالب

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے جو قطرہ وہ گوہر نہ ہوا تھا

(روزنامہ ''دن'' لاہور ۲۶ جنوری ۲۰۰۷ء)

◆◆◆

شاعرِ حسینیت...... قیصؔر بارہوی کے مرثیے

پروفیسر حسنؔ عسکری کاظمی

◆◆

مرثیہ جیسی صنفِ سخن کے فنی اور معنوی خصائص کا احاطہ کرنا اور اس کے ارتقا سے متعلق تمام تفصیلات کو یک جا کرنا آسان کام نہیں، اس کے علاوہ نامور مرثیہ نگاروں کے احوال صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا بھی محنت طلب کارِ ہنر ہے خصوصاً تحقیق کے بنیادی اُصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کام کو انجام تک پہنچانا ایک سوئی کا متقاضی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہمارے عہد کے ایسے محقق اور نقاد ہیں جو ایسے کام لگ لپٹ کر اور اپنی پوری توانائی صرف کر کے بطریقِ احسن پورے کرنے کے حق میں ہیں چناں چہ انھوں نے مرثیے کے حوالے سے جتنا تحقیقی اور تدوینی کام کیا وہ لائقِ ستائش بھی ہے اور اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ عہدِ موجود کے بلند قامت مرثیہ نگاروں کے مقام و مرتبہ کو واضح انداز میں ہمارے روبرو رکھ کر ان کے تمام مرثیوں کی اشاعت کا اہتمام کیا، ان میں سید وحید الحسن ہاشمی کے مراثی کا مجموعہ 'العطش' اور شاعرِ حسینیت حضرت قیصؔر بارہوی کے مرثیے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے تحقیقی کاموں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے تنقید اور تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے کے بعد مختصر عرصے میں سترہ کتابیں 'مفاہیم' سے 'سیف زلفی کے مرثیے' تک مکمل کیں اور اب قیصؔر بارہوی کے مرثیے (ایک ضخیم اور مستند تالیف) پیش کر کے ناقدین اور محققین کی صف میں نمایاں مقام پالیا اور مرثیے کے حوالے سے نہایت وقیع اور مستند کام سرانجام دیا کہ جس پر وہ لائق مبارک باد ہیں۔ انھوں نے قیصؔر بارہوی کے ترپن مرثیے اس کتاب میں جمع کر دیے، ان کا مقدمہ' کتاب اس کتاب کی جان ہے جس میں قیصؔر بارہوی کے سوانحی کوائف اور اعترافات کے ذیل میں دیدہ ریزی کے ساتھ ہر رُخ سے مطالعۂ قیصؔر کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان کا یہ کہنا درست ہے کہ ''بیسویں صدی میں ہندستانی معاشرت پر طرح طرح کے بین الاقوامی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی اثرات مرتب ہو رہے تھے، انیؔس اور دبیؔر کا لکھنؤ زوال آمادہ تھا اور عظیم تہذیبی روایات دم توڑ رہی تھی تاہم بقول سید عاشور کاظمی:

"۱۸۵۷ء کے بعد اودھ کی تہذیب کو مٹانے کی کوششوں کے باوجود لکھنؤ گہوارۂ علم و اَدب تھا ......میر انیس کا شہر لکھنؤ رثائی اَدب کا شہر لکھنؤ، تہذیب و سیادت کا شہر لکھنؤ، وہ شہر جو دماغ وضع کرتا تھا، وہ شہر جو پتھروں کو دل بنا دیتا تھا۔"

یہی وہ زمانہ تھا جب ایک علمی اور اَدبی خاندان سادات بارہہ کا چشم و چراغ قیصر عباس لکھنؤ میں وارد ہوا اور ماحول اور ذہنی استعداد کے باعث کم سنی ہی میں قیصر بارہوی کے نام سے مقبول ہو گیا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا انداز نقد و نظر اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مرثیہ نگار کے کوائف، تعلیم، ملازمت، آغاز سخن وری، تصانیف، اعزاز و خطاب غرض سب کچھ سمیٹ کر نذر قارئین کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ ہم عصر ناقدین، مبصرین اور ممتاز شخصیتوں کی آراء کو یک جا کر کے صحت مند روایت کو آگے بڑھاتے ہیں چناں چہ "قیصر بارہوی کے مرثیے" میں کم و بیش تیس نامی گرامی ادیبوں نے قیصر شناسی کا حق اَدا کیا ہے لیکن یہ کام ڈاکٹر شبیہ الحسن کے لیے خاصا دشوار ہوگا کہ مختلف اَدبی جریدوں سے اقتباسات جمع کیے، ان میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر سرفراز قاضی، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر عبیداللہ خان، ڈاکٹر طارق عزیز اور ڈاکٹر فخرالحق نوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، اسی طرح قیصر فہمی کے حوالے سے وہ کتب جن میں قیصر بارہوی کا تذکرہ موجود ہے قریباً سولہ ایسی مستند کتابیں ہیں جن میں قیصر بارہوی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا یا ان پر خوب صورت ناقدانہ تبصرے کیے گئے۔ ان میں "اُردو مرثیے کا سفر" سید عاشور کاظمی، اُردو مرثیے کی سرگزشت ڈاکٹر اسد اریب، تذکرہ مرثیہ نگاران اُردو مرزا امیر علی جون پوری بیسویں صدی اور جدید مرثیہ ڈاکٹر ہلال نقوی، اُردو مرثیہ پاکستان میں ضمیر اختر نقوی، قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری ڈاکٹر محمد ہارون قادر، اُردو مرثیہ انیس کے بعد ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی اور ان کے علاوہ دوسرے تحقیق نگاروں نے قیصر بارہوی کے مرثیوں پر بہت کچھ لکھا، اسی طرح ان کے مرثیوں پر جتنی آراء مختلف صورتوں میں سامنے آئیں ان کو جمع کرنا ایک محقق کے لیے ضروری تھا اس لیے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر وحید قریشی، سید وحید الحسن ہاشمی، پروفیسر سجاد رضوی، ڈاکٹر مسعود رضا خاکی، پروفیسر سجاد حارث، سید انوار ظہوری، سید عاشور کاظمی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر میمونہ انصاری، پروفیسر حق نواز، ڈاکٹر نواز حسن زیدی، ڈاکٹر عارف ثاقب، ڈاکٹر عباس رضا، پروفیسر شاہین ہارون، پروفیسر شمیم انوار الحق، نقاش ہاشمی اور حشمت علی قیصر قابل ذکر ہیں۔

جناب قیصر بارہوی کو ان کی زندگی میں بڑا منفرد مرثیہ نگار شاعر تسلیم کرتے ہوئے ان کی گولڈن جوبلی منائی گئی، لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل میں ملک کے ممتاز نقادوں نے انھیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کے مرثیوں کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا، یہ اعزاز کسی دوسرے ہم عصر مرثیہ نگار کا مقدر نہیں ٹھہرا، قیصر بارہوی کے

اعزازات میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جہاں ان کے خطاب شاعر حسینیت (علامہ رئیس الحفاظ حافظ کفایت حسین مرحوم کا عطا کردہ) کا ذکر کیا وہاں قیصؔر بارہوی کی گولڈن جوبلی کا انعقاد لاہور ۱۹۹۰ء اور ماہ نامہ شام وسحر کا قیصر بارہوی نمبر جون ۱۹۹۰ء، قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری ڈاکٹر ہارون قادر (مقالہ ایم۔ فل اُردو) اور اپنی تصنیف قیصر اقلیم مرثیہ (تحقیق وتنقید) کا حوالہ بھی دیا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے جن معتبر نقادوں کی تحریروں کو ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' کے آغاز میں رکھا ہے ان میں سے چند آراء کا پیش کرنا ضروری ہے، سب سے پہلے سید وحید الحسن ہاشمی کی تحریر کا اقتباس پڑھیے۔

> ''قیصر (مرحوم) اپنی مرثیہ گوئی کو کلام انیس کا صدقہ قرار دیتے تھے، اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان کے کلام پر مرزا دبیر اور جوش ملیح آبادی کے طرز کی چھاپ ہے، یہ صحیح ہے کہ ابتدا میں انھوں نے میر انیس کا تتبع کیا لیکن جتنا وقت گزرتا گیا ان کے فکری نظام میں تشبیہات، استعارات اور صنائع بدائع کا عمل دخل زیادہ ہوتا گیا، یہ درست ہے کہ مرثیہ کہنے سے قبل وہ مرثیے کا اجمالی پلاٹ تیار کرتے تھے لیکن اکثر مرثیوں میں ان کی توجہ شعریت پر مرکوز ہو جاتی تھی۔''

ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا کہ قیصر بارہوی نے بھی اظہار عقیدت کے لیے مسدس ہی کو اپنایا اور اسی بے حد آزمائے گئے انداز سخن میں فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے حسن اُدا اور حسن معنی کی مساوات برقرار رکھی ہے۔

ڈاکٹر عبیداللہ خان کا یہ کہنا ہے کہ وہ طرح طرح کے الفاظ کے انتخاب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ تراکیب سے اپنے شعری سرمایہ کی محفل آراستہ کرتے ہیں اس حسنِ انتظام کی وجہ سے ان کے مرثیے میں سلاست وروانی اور غنائیت پیدا ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس نغمگی کی کیفیت اور روانی میں ''کوئی چیز حائل نہیں ہونے دیتے۔''

ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی کی تجزیاتی تحریر قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے قابل قدر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قیصؔر کے مراثی میں زبان کی سادگی، لطائف اور شیرینی کے ساتھ شعور کی گہرائی موجود ہے۔ مصائب کے بیان میں زود گوئی سے کام لیا ہے۔ جس سے سوز والم اور یاس وحسرت کا ماحول پیدا ہوا ہے ان کا شمار پاکستان کے نمائندہ مرثیہ گوشعرا میں ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کے مرثیے یک جا کر کے (ایک ضخیم کتاب کی صورت میں) ہمارے ذوقِ شعری کی تسکین کا سامان پیدا کیا ہے، یہ کام ہر اعتبار سے لائق صد افتخار ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ قیصر بارہوی کا نام مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ بحیثیت مرثیہ نگار پاکستان کا وقار بن کر اکیسویں صدی پر اپنے اثرات مرتب کریں گے، اُن کا اُسلوب اظہار ہم عصر مرثیہ نگاروں میں سب سے الگ اور طرز اُدا جداگانہ ہے، ان کے ہاں محاکات، منظر نگاری اور جزئیات نگاری

عہدِ موجود سے مناسبت رکھتی ہے، وہ ہواؤں اور فضاؤں سے گفت گو اور ریگ زاروں سے ہم کلام ہونے کا ہنر جانتے ہیں، قیصرؔ بارہوی زمان و مکان کی وسعتوں سے ماورا، ایسا مقام بھی ہمارے مشاہدے میں لانے پر قدرت رکھتے ہیں جسے وجدان کی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے، قدرتِ بیان کے حوالے سے وہ کسی بھی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتے بل کہ اظہار کی سنگلاخ وادی میں پا بہ جولاں گزرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور اپنے قاری کو ہم رکاب لے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، وہ مرثیے میں انسانی نفسیات کی باریکیوں کو شعریت کا جامہ پہنا کر داد وصول کرنے کے ہنر آزماتے ہیں، انھیں لفظ برتنے اور معنویت میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کا سلیقہ آتا ہے، ان کے ایک مرثیے سے دو شعری بند ملاحظہ کیجیے :

مقتل میں لہو روتی ہوئی شامِ غریباں — سناٹے کی آغوش میں ہر گردشِ دوراں
لاشوں کی طرح دشت میں بکھرے ہوئے قرآں — اور خاک پہ سر کھولے ہوئے عظمتِ انساں
منظر جو خیالات کو بے چین کیے ہیں
اک قافلہ سالار کی تصویر لیے ہیں

اک رہ گذر جس پہ تڑپتا ہوا اسلام — مظلوم مسافر سے گلے ملتا ہے ہر گام
زنجیر کی جھنکار نئی صبح کا پیغام — کوفے کی مصیبت سے زیادہ سفرِ شام
کانٹوں پہ مسافر کا سفر دیکھ رہا ہوں
یا منزلِ معراجِ بشر دیکھ رہا ہوں

قیصرؔ بارہوی کلاسیکل مرثیے کی جزئیات سے پہلو بچا کر اُسلوبِ خاص سے کام لینے کا ہنر اختیار کرتے ہیں اس لیے وہ ایجاز و اختصار کا ایسا قرینہ اپنا لیتے ہیں کہ آج کا قاری اپنی مصروف زندگی سے اتنا وقت ضرور نکال سکتا ہے کہ وہ مرثیے کے انجام تک پہنچ سکے، یہی وجہ ہے کہ اس مرحلے میں آج کا مرثیہ نگار محتاط رویہ اختیار کرتا ہے کہ تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ منظر پر مکمل گرفت رہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے قیصرؔ بارہوی کے تمام مرثیوں پر الگ الگ تبصرہ کرتے ہوئے ہر مرثیے کا معرضِ تخلیق میں آنے کا سال دریافت کیا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۷ء تک ان کے مرثیوں کی تعداد ترپن شمار کی گئی، ان کے بقول اب یہ بات کسی حد تک یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ قیصرؔ بارہوی کے مرثیوں کی یہ کتاب جہاں ایک طرف قیصرؔ بارہوی کے متنوع اور ہمہ گیر رنگ موضوعات رنگ اور ذائقوں کا احاطہ کرتی ہے وہاں دوسری طرف اس کتاب کے ذریعہ قیصرؔ شناسی کے نئے نئے در ہمارے سامنے وا ہو رہے ہیں۔

◆◆◆

موازنہ انیس ودبیر اور ڈاکٹر سلیم اختر

ناصر زیدی

◆◆

''ہونہار'' بروا کے چکنے چکنے پات''......ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے والد گرامی قدر جناب وحید الحسن ہاشمی مدظلہ کے ایسے نامور سپوت ہیں جو کئی لحاظ سے باپ سے آگے بڑھ گئے ہیں مثلاً ایک فوقیت تو یہی ہے کہ یہ پی ایچ ڈی ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی نے کتنے ہی شاگرد پی ایچ ڈی کرادیے، خود پی ایچ ڈی نہیں ہوئے۔ ادب میں تحقیق وتنقید وتدوین کے ضمن میں بھی ڈاکٹر شبیہ الحسن منفرد ہیں۔ دھڑا دھڑ کتابوں کی اشاعت اور وہ بھی خوب صورتی ودل کشی کے ساتھ، ان میں ایک اور تخصیص ہے۔ سب کچھ اپنی جگہ، تاہم ان کا مضبوط حوالہ جناب وحید الحسن ہاشمی ہی کا ہے۔ ایک اُستاد نے، مدرس نے، معلم نے، تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی ایسی تربیت کی کہ بایدوشاید! فخر ہوتا ہے گھرانے میں سدا ایک ہی شخص!

گزشتہ دنوں ''عالمی مجلس اَدب پاکستان'' کے اہتمام سے اُردو کے معروف غزل گو اور ممتاز مرثیہ نگار شاعر حضرت قیصر بارہوی مرحوم ومغفور کی یاد میں ایک پُروقار اَدبی سیمینار کا اہتمام پیک سلوشن کالج لاہور کے ہال میں کیا گیا۔ صدرِ محفل محبت گرامی پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر تھے کہ جن کی بے شمار تصانیف میں سے ایک کتاب ''اُردو اَدب کی مختصر ترین تاریخ'' ایڈیشن پر ایڈیشن شائع کیے جانے کے ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ غالباً ۲۷واں ایڈیشن اس وقت مارکیٹ میں ہے۔ آج تک کسی اور تنقیدی وتحقیقی کتاب کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہو سکا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر عباس رضا نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ مہمانانِ خصوصی میں بیگم خدیجہ قیصر بارہوی اور ڈاکٹر شبیہ الحسن تھے۔ اس تقریب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی دو تازہ ترین کتابیں ''قیصرِ اقلیم مرثیہ'' اور ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' زیرِ گفت گو رہیں۔ ان کتابوں کے حوالے سے مرتب ومولف ومصنف ڈاکٹر شبیہ الحسن اور قیصر بارہوی کا تذکرہ مشترک رہا۔ صاحبِ صدارت کا خطاب ظاہر ہے کہ سب سے آخر میں تھا، مگر ان کے ایک اہم تنقیدی جملے کے سبب، پہلے درج کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا "قیصر بارہوی کے مرثیے" کے عنوان سے عظیم و ضخیم کتاب کی صورت میں دراصل ڈاکٹر شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کا اَدبی انسائیکلو پیڈیا مرتب کر دیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ وہ موجودہ خالصتاً مادی و تجارتی دَور میں خسارے کا سودا کرتے رہتے ہیں اور ایسی ہستیوں کو موضوعِ ذکر و فکر بناتے رہتے ہیں جو زمانے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اُردو مرثیے کے سلسلے میں عمومی و خصوصی کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیّد آلِ رضا، وحید الحسن ہاشمی، سیف زلفی اور قیصر بارہوی پر وقیع کام کرنے کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے مرزا دبیر پر بھی نئی جہت سے کام کا آغاز کیا ہے، تا کہ "موازنہ انیس و دبیر" کی شکل میں "مولانا شبلی نعمانی نے دبیر کے سلسلے میں جو "ڈنڈی ماری ہے" اس کا ازالہ ہو سکے......!

قارئین کرام! یہ "ڈنڈی مارنے" والا وہ جملہ ہے جو ڈاکٹر سلیم اختر کو اُردو اَدب میں اسی طرح زندہ رکھے گا جیسے ڈاکٹر کلیم الدین احمد کا غزل کے بارے میں یہ جملہ کہ: "غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے"......!

خدشہ ہے کہ جواب میں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ "ڈاکٹر سلیم اختر نے متذکرہ جملے کی صورت میں مولانا شبلی نعمانی کو "ڈنڈا دے مارا ہے"......!

بہرحال ذکر تھا ڈاکٹر شبیہ الحسن اور ان کی تصانیف کی تقریب پذیرائی کا، سو اس تقریب میں پروفیسر احمد عقیل روبی، ناصر زیدی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، بیگم خدیجہ قیصر بارہوی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر جواز جعفری، کلیم حیدری، ڈاکٹر عباس رضا، پروفیسر انیقہ سلیم، مظفر نقوی اور راقم الحروف نے اظہار خیال کیا۔

تقریب کے مرکز و محور ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کہا:

"قیصر بارہوی بیسویں صدی کے نامور شاعر تھے، تاہم انھوں نے صنفِ مرثیہ میں اپنے بھرپور طبعی جوہر دکھائے، افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان کے مرثیے یک جا نہیں ہو سکے تھے، جس کے باعث ان کے اَدبی مقام و مرتبے کے تعین میں مشکل پیش آ رہی تھی۔"

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کہا کہ انھوں نے گزشتہ دس برس کی محنتِ شاقہ کے بعد قیصر بارہوی کے کل ۵۳ مرثیے ایک جلد میں اکٹھے کر دیے ہیں۔ سب سے بڑا مرحلہ الحاقی کلام کو الگ کرنا تھا اور مختلف کاغذوں، ڈائریوں کو کتابی شکل میں ڈھالنا تھا۔ ساڑھے گیارہ سو صفحوں کے لگ بھگ کتاب "قیصر بارہوی کے مرثیے" میں اڑھائی سو صفحات کا تو مقدمہ ہی ہے جو اپنی جگہ الگ سے مکمل کتاب ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے توقع ظاہر کی ہے کہ اب اربابِ علم و دانش اور محققین و ناقدینِ اَدب کو قیصر بارہوی کے مقام و مرتبے کے تعین میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ پروفیسر احمد عقیل روبی نے مصنف کا خاکہ پڑھ کر سنایا، جس میں کہا گیا کہ "ڈاکٹر شبیہ الحسن یونان

کے اس دیوتا کی مانند ہیں جو مُردوں کو زندہ کرنے کا ہنر جانتا ہو، یہی سبب ہے کہ انھوں نے ''اُدبی قبرستان'' میں پڑے ہوئے اکثر ادیبوں، شاعروں کو حیاتِ نو عطا کی ہے، جو ناقدینِ فن کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے کہا کہ ''فاضل مصنف مولف کتب ایک ماہر محقق اور مستند نقاد ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے مروجہ معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے قیصر بارہوی کے مرثیوں کو مرتب کر کے مرثیے کی تاریخ میں ایک یادگار کارنامہ انجام دیا ہے۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے کہا: ''واقعی یہ بہت بڑی علمی و اَدبی خدمت ہے۔'' ڈاکٹر طارق عزیز نے کہا: ''قیصر بارہوی ایک وسیع المشرب انسان تھے، انھوں نے اپنی شاعری میں انسانی حقوق کی بات کی ہے۔'' ڈاکٹر عباس رضا نے کہا: ''قیصر بارہوی ایک صاحب طرز شاعر تھے، انھوں نے اپنے لحن کے ذریعے بھی اُردو مرثیے کو ایک نئی جہت دی۔ کراچی سے آئے ہوئے شاعر کلیم حیدری نے خالص قیصر بارہوی کے لحن میں ان کا کلام سنا کر بے حد داد حاصل کی۔ ڈاکٹر جواز جعفری نے کہا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن طویل مدت سے بھولے بسرے شاعروں کو یاد کرنے کا خوش گوار فریضہ انجام دے رہے ہیں اور اب تو خود ان کی پذیرائی میں پوری پوری کتابیں لکھی اور چھاپی جا رہی ہیں۔ پروفیسر انیقہ سلیم نے ''قیصر اقلیم مرثیہ'' کو ڈاکٹر شبیہ الحسن کی بہترین تخلیقی و تنقیدی کتاب قرار دیا۔ بیگم خدیجہ قیصر بارہوی نے اپنے عظیم ''شاعر شوہر'' کے ساتھ گزارے ہوئے ۱۳ برس کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے فخر ہے کہ مَیں ایسے شوہر کی بیوی ہوں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شبانہ روز کاوشوں کا انھوں نے شکریہ اَدا کیا کہ ان کی خصوصی توجہ اور برسوں کی محنت سے قیصر بارہوی مرحوم کا کُل کلام مرثیوں کی صورت میں سامنے آ سکا۔ غزل پر کام ہنوز ہو رہا ہے۔ اس خاک سار ناصر زیدی نے کہا کہ ''پنجاب میں ایسے ناقدین اور محققین کی خاصی کمی ہے جو صنف مرثیہ کے سلسلے میں سنجیدگی سے کام کر رہے ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سیّد صفدر حسین (مرحوم) کے بعد ڈاکٹر شبیہ الحسن کا دم بہت ہی غنیمت ہے۔ وہ اس صنف پر کماحقہٗ توجہ دے رہے ہیں۔ یقیناً ان کا نام اور کام شہدائے کربلا کے خدمت گزاروں میں زندہ رہے گا...... اس موقع پر ''قیصر بارہوی اور ڈاکٹر شبیہ الحسن'' کو منظوم خراج تحسین راقم الحروف کی جانب سے یوں پیش کیا گیا:

تصنیفِ مرثیہ میں گزارے ہیں ماہ و سال
قیصر تھے شاعری کے حوالے سے باکمال

تھے مُبتلائے عشقِ شہیدانِ کربلا!
رہتا تھا اُن کے ذہن میں بس ایک ہی خیال

مظلوم کربلا کی شہادت کی شان میں
وہ شعر ہوں رقم کہ جو کہلائیں بے مثال

عہدِ رواں میں مرثیہ کہتے تھے منفرد
یہ مرثیے ہیں یا کہ ہیں زخموں کا اِندمال

پڑھنے میں اُن کا ثانی و ہم سر کوئی نہ تھا
کیا شان تھی، شکوہ تھا اور کس قدر جلال

عُقدہ کھلا بہ حقِ مُحبّانِ بارھوی
رَشحاتِ فکر کو نہیں اُن کے کبھی زوال

ہے بے عدیل ''قیصرِ اقلیمِ مرثیہ''
حاصل قبولِ عام ہو یا ربِّ ذوالجلال

ترتیب دے دیے ہیں جو قیصؔر کے مرثیے — ہے ڈاکٹر شبیہ کا یہ کام لازوال

ناصؔر مَیں گرچہ کوئی مقالہ نہ لکھ سکا

منظوم شکل میں تو نمایاں ہے عرضِ حال

تقریب کے اختتام سے قبل سید محمد رضا زیدی نے اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں کلامِ قیصؔر بارہوی پڑھ کر سنایا۔ بعض علمی و ادبی اداروں کی جانب سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کو تحائف و گل دستے پیش کیے گئے۔ پیک سلوشن کالج کی جانب سے تمام اظہار خیال کرنے والے شعرا و ادبا کو بھی تحائف دیے گئے۔ قیصؔر بارہوی کے لیے دعائے مغفرت کی گئی اور حاضرین کی تواضع کے ساتھ یہ روح پرور تقریب اختتام کو پہنچی......!!

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی و اَدبی خدمات

جمیل احمد عدیل

◆◆

کتاب سے بڑھ کر خوب صورت چیز، کتاب سے زیادہ خوش بودار شے ہماری نظر میں تو اور کوئی نہیں ہے۔ حسنِ اتفاق گزشتہ دنوں ایک نہیں چار کتب ہمیں ایک ساتھ ملیں۔ ان چاروں کتابوں کا تعلق نہایت محترم دوست اور ملک کی نامور اَدبی شخصیت ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک منفرد اَدبی جریدے کے مدیر بھی ہیں۔ مذکورہ مجلّے یعنی ماہ نامہ ''شام و سحر'' کی انفرادیت یہ ہے کہ پاکستان کا یہ واحد اَدبی رسالہ ہے جو باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ باقاعدگی کے ساتھ تو باقی اَدبی جرائد بھی اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔ ماہ نامے ہر تین ماہ بعد، سہ ماہی، سال میں ایک بار، سال نامے پانچ سال بعد۔ ''شام و سحر'' ہر چند ضخامت کے حوالے سے زیادہ مثالی تندرستی کا مالک نہیں ہے۔ سچ زہاد اور حقیقی عباد کی طرح جسمانی ضعف کا شکار ہے مگر اس کی روح بے طرح توانا ہے۔ ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں یہ مردِ دو ہفتہ اپنے مستقل قارئین کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ بے ادبیوں کے ریگ زار میں یہ دھان پان سا جریدہ ہمیں نہرِ فرات ایسا لگتا ہے۔ بھلے اس تفصیلی تشبیہ پر کوئی مہربان علامہ اقبالؒ کا یہ مشہور مصرعہ ہم پر چست کر دے۔ '' ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا۔'' تو ہمیں پرواہ نہیں کہ یہ بہرحال سچ ہے۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ!!
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اگر ہم مسلمانوں کی کوئی تاریخ ہے تو اس کے منور ترا جزا میں سیدنا علیؓ، ان کی اہلیہ سیدہ فاطمہؓ اور ہمارے صاحب زادے حسنینؓ بھی شامل ہیں۔ ہمیں تو یہ تصور ہی بے حد وجد آفریں محسوس ہوتا ہے کہ متذکرہ مبارک ہستیاں اس پُر نور عہد سے وابستہ ہیں جب اللہ کے آخری کتاب قرآن مجید اپنے سو فیصد صحیح مفاہیم کے ساتھ نہ صرف قلوب و اذہان کا حصہ تھی بل کہ اکثریت کے اعمال کے لیے یہی کتاب بمنزلہ قبلہ تھی۔ اس قرآنی معاشرے

کا عام فرد بھی لائقِ تکریم ہے اور محولہ پاکیزہ وجود تو غایت درجہ قابلِ تعظیم ہیں کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام اور نبوی سماج کی تشکیل میں ان کا کردار بے نظیر و بے عدیل ہے۔ ظاہر ہے ان امتیازات کی اصل اساس بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہِ راست نسبت ہے۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بلاواسطہ جن خوش نصیبوں نے دینی تربیت حاصل کی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں روحِ قرآن کو اپنے شعور کا جزو بنایا تھا ان میں یہ جید و معظم اصحاب نمایاں تر مقام کے حامل ہیں۔

مسلمانوں کی درخشاں علمی روایت جن کے تذکار سے روشن ہے، ان میں حضرت علیؑ اور ان کے خانوادے کو بڑا درجہ اس لیے بھی حاصل ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت قریبی ساتھی جناب علیؑ اپنے دور کی بہت بڑی علمی شخصیت تھے۔ نغز گو شاعر تھے۔ قرآن مجید کے مدونین میں آپؑ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ''نہج البلاغۃ'' میں آپ کے خطبات پڑھ کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ آپ کو زبان و بیان پر عدیم النظیر قدرت حاصل تھی۔ فصاحت و بلاغت واقعتاً آپؑ پر ختم تھی۔ حکمت کا یہ بے مثل اثاثہ یقیناً فیضان رسولؐ ہے۔ بہرطور کہنا ہمیں یہ ہے کہ ان تیرہ چودہ صدیوں میں جن عالی قدر صاحبان نے حضرت علیؑ اور ان کی عترت کو تلفیظی فنون کے ذریعے اپنے اپنے دور کی نسلِ نو کو تعارف کا ارمغان عطا کیا ہے، انھیں حریمِ علم واَدب میں محترم تشخص حاصل رہا ہے۔

عصرِ حاضر بھی ایسی نابغہ شخصیات سے تہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سید وحید الحسن ہاشمی کا نام آج اسی اہمیت کا مالک ہے جی ہاں جو مقام ستاروں کی دنیا میں خورشید جہاں تاب کو حاصل ہے۔ سید صاحب موصوف کو بجا طور پر وحید العصر کہا جاتا ہے۔ آپ خوش طالع بھی بے پناہ ہیں کہ انھیں خدا نے ایسا علمی وارث عطا کر دیا ہے کہ رشک آتا ہے وگرنہ یہ عاجز دس نہیں دیسوں بے حد معتبر نام گنوا سکتا ہے کہ کام بھی غیر معمولی کیا مگر نہ صلب میں اس سرمائے کا محافظ مل سکا اور نہ متاثرین میں ہی وراثت کا جائز حق دار میسر آ سکا۔ نتیجہ معلوم یا تو وہ علمی اَدبی اثاثہ محفوظ ہی نہ ہو سکا، اگر کتابی صورتوں میں شیرازہ بند، ہوا بھی تو زمانے کی دستبرد نے اس طرح ان نگینوں کو گم کر دیا کہ پھر نشان بھی نہ مل سکا۔ بھلے کسی کو معتزلہ کی فکری تحریکوں سے لاکھ اختلاف ہو مگر کیا دنیا میں آج ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جس کے پاس کسی معتزلی مفکر کی ایک بھی کتاب مصئون ہو؟ زندہ اقوام علمی میراث کی رضاعت کبھی برداشت نہیں کرتیں۔ مگر افسوس کہ ہم نے بہت کچھ گنوا دیا۔

اس افسوس ناک پس منظر میں جب ہماری نگاہ سید وحید الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن پر پڑتی ہے تو سکھ کا سانس نصیب ہوتا ہے کہ چلیے کوئی تو اس چراغ کو اپنی ہتھیلی پر روشن کیے ہوئے ہے۔ صاحبو! پہلے تو ہمیں ''العطش'' کے صوری حسن کی جی بھر کے تعریف کر لینے دیجیے کہ دیکھتے ہی من کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ قلب و نظر سیراب ہو جاتے ہیں۔ ساڑھے چھ سو صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی یہ کتاب طباعتی جمالیات کی جگمگاتی مثال

جناب سید وحید الحسن ہاشمی کے چالیس جدید مختصر مرثیوں کو حیران کن حد تک جاذب نظر مجموعے میں ڈھالنے والے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہیں۔ جہاں تک ان مرثیوں کے فنی مقام کا تعلق ہے تو ہم کیا عرض کریں کہ کتاب میں جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی ایسے اَدبی اکابر کی آراء درج ہیں، نیز ہر مرثیے کا تنقیدی تجزیہ الگ الگ ناقد کے رشحۂ قلم کے طور پر جلوہ آراء ہے۔ تجزیہ نگار کوئی عامی شامی تبصرہ نگار نہیں ہیں بل کہ مسلم الثبوت نقادانِ فن ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر عبیداللہ خان، پروفیسر مشکور حسین یاد، ڈاکٹر نیرّ صمدانی، ڈاکٹر عارف ثاقب، ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر ظفر چشتی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر ناہید شاہد، ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد، شہزاد احمد، ڈاکٹر مرغوب حسین طاہر کس کس کا نام لکھیں۔ ''ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا۔''

اسی طرح ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی مرتب کردہ دوسری کتاب کا ٹائٹل ہے۔ ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی۔'' ۲۲۴ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب میں صرف ہاشمی صاحب کے مرثیوں کا انتقادی تذکرہ نہیں ملے گا بل کہ صنف مرثیہ کے حوالے سے مباحث بھی عام قاری کی رہبری کے لیے موجود ہیں۔ اگر چہ یہ رہ نمائی اجمالی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے مفصلات کا اہتمام بھی کیا ہوا ہے کہ ان کی ایک مستقل کتاب ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' کے سرورق سے اس سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس تحقیقی تنقیدی تصنیف میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اُردو کی شعری اصناف میں معروف تر شعری صنف یعنی مرثیہ نگاری کو ایک مختلف زاویے سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے مرثیے کو روایت سے جدا کیے بنا مروج رسمیات، سے ضرور منفصل قرار دے دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شبیہ الحسن صاحب کا ایک کارنامہ ہے کہ انفکاک کا یہ عمل وقفے وقفے سے ہوتے رہنا چاہیے وگرنہ غلافوں کی کثافت ایک متحجر ثقافت کی پرستش شروع کروا دیتی ہے۔ مرثیہ نگاری، مرثیہ گوئی سے ہوتی ہوئی جب عامتہ الناس تک پہنچی تو اس کی روح یقیناً مجروح ہوئی۔ جذبات کے غلبے کے لیے اتنا غلو کیا گیا کہ واقعے کی واقعیت اور شاعری کی لطافت دونوں کو زک پہنچی۔ درآں حالیکہ مرثیہ بنیادی طور پر الیے کی معنویت کو اجاگر کر کے پہلے مرحلے میں گداز کی ثروت عطا کرتا ہے، پھر ذات کی ان خطوط پر نشوونما کرتا ہے کہ قاری، سامع اپنے ممدوح کو رول ماڈل یقین کر کے اپنے فکر و نظر، طرز احساس اور اسالیب اعمال میں بالآخر ایک انقلابی تبدیلی لے آتا ہے۔ اس تناظر میں اگر مرثیہ کیریکٹر کی تعمیر نہیں کرتا تو پھر وہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔

۱۴ کتب پر محیط ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تصنیفی کارناموں کو چودہ ستارے کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ان میں سے ایک تاباں ستارہ ''تصریحات'' بھی ہمارے روبرو ہے۔ ''تصریحات'' ڈاکٹر صاحب موصوف کے خالص تنقیدی مضامین کا خالص مجموعہ ہے۔ فی الاصل عملی تنقید اور وہ بھی اپنے معاصرین پر نقاد کا سخت امتحان ہوتی ہے کہ

معروضیت (Obgectinity) عموماً رخصت لے لیتی ہے۔ افراط و تفریط سے دامن بچانا دشوار ہو ہی جاتا ہے۔ اس امتحان میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی سرخ روئی کا ایک ہی سبب سمجھ میں آتا ہے اور وہ ہے ان کی پیہم اَدبی تربیت۔ جن تیغوں کے سایوں میں وہ پل کر جوان ہوئے ہیں وہ خاصی بے رحم واقع ہوئی ہیں، اسی لیے ان کے ہاں ''لے سانس بھی آہستہ'' کا نظام فعال دکھائی دیتا ہے۔ باون تولے پاؤ رتی کے حسابی کلیئے کو انھوں نے بالعموم اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ سو ''تصریحات'' کا مطالبہ اس ناچیز کے ذہنی افق میں وسعت کا بہر نوع موجب بنا ہے۔ ''تصریحات'' میں آفتاب کاوش پر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے خوب صورت مضمون لکھا ہے جو تخلیقی مزاج اور تخلیقیت کے علم کو ایک بار پھر اَوج پر لے گیا ہے۔ گویا شبیہ الحسن صاحب نے وہ ذمہ داری اَدا کر دی ہے جو ان کے پرکھوں نے ان کے سپرد کی تھی۔ آخر میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی نذر آفتاب کاوش کا ہی ایک شعر:

چاند کا منظر، صبح کا تارا دیکھ لیا
تم کو دیکھ کے عالم سارا دیکھ لیا

◆◆◆

آسمانِ اَدب کا درخشندہ ستارہ۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر ندیم گیلانی

◆◆

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ سوچ کا خوگر ذہن سمندر سے زیادہ وسعت کا حامل ہوتا ہے۔ ہمہ وقت سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن لوگ رفعت افلاک کو سرنگوں ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان ہی عمیق سوچوں کی بنا پر وہ عجزِ پرواز لوگ علم واَدب سے خالی حسین ترین نظاروں کو بھی اپنی نگاہ میں پست محسوس کرتے ہیں۔سوچ سمندر میں چلنے والے علم واَدب کے ان ملاحوں سے بے علمی اور بے اَدبی کے طوفان بھی پریشان ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔امر واقعہ یہ ہے کہ ایسے عظیم الشان لوگوں کے قلم کی جنبش سے وقت کے سلطان کا مہربان ہونا بھی لازم ٹھہرتا ہے۔ان کے قلم سے جاری ہونے والے توحید کے نعروں سے دہریت کے بھگوان بھی کانپنے لگتے ہیں۔اسی خوبو کا حامل شہر اَدب کا ایک عظیم سپوت،لفظ جس کے قلم کے محتاج اور معانی اس کے افکار کے مرہون منت ہیں۔وہ اعلیٰ پائے کا نقاد اور عظیم اُستاد،ایک سنجیدہ ناقد،غیر جانبدار محقق،اُردو اَدب کا سچا عاشق اور ہردلعزیز بدرس اس کا شجرہ نسب اس اَدب دوست خاندان سے جا ملتا ہے۔جس کے گھر کی دہلیز پر لفظ اپنے منصب کو پہچاننے کے لیے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔ایسے باپ کا بیٹا کہ جس کی زبان پر نثر منظوم کلام میں بدل جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔وہ معانی کو الفاظ کا لباس پہنانے اور لفظوں سے معانی کو ہم آہنگ کرنے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔ماں باپ نے اس کا نام شبیہ الحسن رکھا۔لوگ انھیں آسمان اَدب کا درخشندہ ستارہ کہہ کر پکارتے ہیں۔

ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ان کا تنقیدی شعور بہت واضح،جچا تلا اور تیکھا ہے۔باتیں حکیمانہ سوچ کی آئینہ دار ہیں۔ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ''آلِ رضا کی غزل گوئی'' کو موضوع سخن بنایا اور اس کے رموز ونکات کو اُجاگر کیا۔انھوں نے خلوصِ دل،وسعتِ مطالعہ اور گہری نظر سے ان کے کلام کی خصوصیات اور امکانات کا جائزہ لیا۔ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور علم وفن کے بارے میں

متعدد صائب الرائے اہلِ قلم کے افکار کو کتابی شکل میں یک جا کر کے پاکستان کی اُدبی تاریخ کا ایک تقاضا پورا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی قابلِ قدر کتاب ''اسلم کولسری'' کو کئی سطحوں پر دریافت کر کے ایک اہم اُدبی فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب قابلِ تعریف ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اُدب کی کئی جہات میں کام کیا ہے مگر ان کا محبوب موضوع ''مرثیہ'' ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مرثیے کے سلسلے میں بہت سے موضوعات پر بحث کی ہے اس لحاظ سے ان کی یہ کتاب جدید اور کلاسیکی مرثیے کا ایک تعارف بھی ہے اور مرثیے پر تنقید بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک وسیع المطالعہ اور کثیر الجہات شخص ہیں۔ ایک علمی و اُدبی خانوادے کے لائق فرزند ہیں اور مختلف النوع موضوعات پر قابلِ قدر تصنیفی و تنقیدی سرمایہ فراہم کر چکے ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف ''تصریحات'' ہم عصر اہلِ قلم کے اُدبی کارناموں کو متعارف کروانے کے لیے ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب بے مثال ہے۔ انھوں نے بعض ایسی اہم اُدبی شخصیتوں کے بڑے کامیاب شخصی اور فنی خاکے تیار کیے ہیں جن کے بارے میں لوگ جاننے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ شبیہ الحسن تجربہ کار اُستاد، کہنہ مشق صحافی، معروف ادیب، نامور شاعر، بہترین محقق، ماہر نقاد، اعلیٰ کمپیئر اور مثالی منتظم اعلیٰ ہیں۔ دراصل ان کی ذات ایک انجمن ہے بل کہ ایک ادارہ اور چلتا پھرتا دارالعلوم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پیغمبری کے پیشے کو نہ صرف اپنایا ہے بل کہ اسے اپنی ذات سے نکھارا بھی ہے۔

طلبا و طالبات کی مدد کے لیے ان کے گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ان کے سیکڑوں شاگرد ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حصولِ علم کے پیاسے دل و جان سے ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے اندازِ تدریس کو اپنانے کی سعی کرتے ہیں اور اپنے لیے اس بات کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں کہ وہ شبیہ الحسن جیسے لائق، کہنہ مشق اور عظیم اُستاد کے شاگرد ہیں۔ راقم الحروف نے کسی محفل میں شبیہ الحسن کی ایک لائق شاگردہ جو کہ کسی کالج میں پروفیسر ہے کو یہ کہتے سنا کہ وہ اتنا مدلل، معیاری، پُر تاثیر اور جدید معلومات پر مبنی لیکچر دیا کرتے تھے کہ ایف۔ سی کالج کی دیواریں تک مسحور ہو جایا کرتی تھیں۔ تمام طلبا و طالبات پورے انہماک سے ان کی آواز کے جادو میں ڈوب جاتے تھے اور پھر معلومات کے خزانے میں سے گوہر نایاب چن کر فیض یاب ہوتے تھے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن سنجیدہ فکر گفت گو کرتے ہیں۔ بے معنی بولنا ان کے نزدیک ایک برائی ہے۔ ان کی ذات میں ایک رکھ رکھاؤ اور تمکنت ہے اور یہی خوبیاں ان کے اندازِ تحریر میں دَر آئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تنقید کے میدان میں روایت اور جدت کے اشتراک سے ایک ایسا نقطۂ نظر اپنایا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی تنقید میں ایک توازن اور اعتدال ہے۔ تنقید دراصل نام ہی کھرے اور کھوٹے کی پہچان کا ہے۔ تنقید میں اگر صرف تعریف ہی کی جائے تو وہ تنقید نہیں رہتی بل کہ ''ستائشِ باہمی'' بن کر رہ جاتی ہے۔ شبیہ الحسن صرف کلام کی تعریف ہی نہیں کرتے بل کہ جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ حقِ تنقید ادا کرتے ہوئے خامیوں کی نشان دہی

بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ بات کو اتنے نپے تلے اور دل نشیں انداز میں کرتے ہیں کہ وہ کسی تخلیق کار کی دل آزاری کا باعث نہیں بنتی بل کہ وہ ادب کی بھلائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ دراصل ان کے ذہنِ رسا، عصری حسیت، قوت متخیلہ، تنقیدی بصیرت، لسانیات پر عبور، منطقی اور مدلل اندازِ فکر، وسعت اور بالغ نظری، نظم ونثر پر دسترس اور بعض دیگر موروثی خواص نے انھیں باشعور نقاد بنا دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے ایک نئے تنقیدی دبستان کا سنگِ بنیاد رکھ دیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقید کا ایک خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک ماہر اُستاد اور ایک زیرک وکیل کی طرح اپنے ممدوح کے محاسن کو خوب اُجاگر کرتے ہیں لیکن جہاں ضرورت ہو وہ ان کے نقائص کی نشان دہی بھی کرتے ہیں اور یہی ایک مستند نقاد کی خوبی ہوتی ہے۔ وہ ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جن کی طرف دیگر ناقدین دیکھنا گوارہ نہیں کرتے۔ انھوں نے معروف ادیبوں اور شاعروں کی نسبت غیر معروف اور غیر مقبول ادیبوں کو اپنا موضوع سخن بنایا اور ان کی شخصیت اور فن کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کوشش کی کہ اپنے ممدوحین کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر بھی کریں اور انھیں دادو تحسین بھی دیں تا کہ ان کے اندر مزید اچھی تخلیقات پیدا کرنے کا حوصلہ پیدا ہو اور وہ مزید بہتر لکھیں انھوں نے ہمیشہ نوآموز لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے اشعار کو نئے معانی عطا کیے اور ان کی نثری کاوشوں کی مدح سرائی کی۔ یہی چیز اَدب پروری ہے۔ دراصل وہ محض نوآموز تخلیق کاروں کی تعریف نہیں کرتے بل کہ وہ موجودہ زمانے کے تمام اہلِ نظر ناقدین کی توجہ عصرِ حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ دراصل بڑے ناقدین کو میر و غالب اور اقبال سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اس وجہ سے نئے تخلیق کاروں کی تخلیقات وہ پذیرائی حاصل نہیں کر پاتیں جن کی وہ مستحق ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہ خوبی ہے کہ وہ گمنام تخلیق کاروں کی تخلیقات کا کھوج لگانے اور ان کی تخلیقات پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ تخلیق و تحقیق کے کٹھن مراحل سے گزرتے ہیں اور تخلیقات کو ان کا صحیح مقام عطا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات میں دوسروں کے لیے نیکی، پیار، محبت، شفقت اور دل لگی کے جذبات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ یہی خیر کے جذبات ان کے فنِ تنقید میں نظر آتے ہیں۔

(مطبوعہ)

١۔ روزنامہ 'صحافت' لاہور، ۶ فروری ۲۰۰۷ء
۲۔ روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳ فروری ۲۰۰۷ء
۳۔ روزنامہ 'جناح' لاہور، ۲۹ جنوری ۲۰۰۷ء
۴۔ روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۹ جنوری ۲۰۰۷ء
۵۔ روزنامہ 'پاکستان' لاہور، ۱۵ جنوری ۲۰۰۷ء
۶۔ روزنامہ 'انصاف' لاہور، ۱۳ جنوری ۲۰۰۷ء
۷۔ روزنامہ 'خبریں' لاہور ۱۲ جنوری ۲۰۰۷ء
۸۔ روزنامہ 'جرأت' لاہور، ۲۹ جنوری ۲۰۰۷ء
۹۔ روزنامہ 'ہلچل' لاہور، ۳ فروری ۲۰۰۷ء
۱۰۔ پندرہ روزہ 'سائبان' لاہور، ۱۶ تا ۳۱ جنوری ۲۰۰۷ء

◆◆◆

عالمی مجلسِ اَدب اور مرزا دبیرؔ

مختار علی نیّر

••

لاہور کی عالمی مجلس اَدب پاکستان نے پچھلے دنوں لاہور میں اقلیمِ سخن کے بے تاج بادشاہ اور مرثیہ کی دنیا کے ناخدا حضرت مرزا سلامت علی دبیر کی یاد میں ایک عالمی اجلاس منعقد کیا بیرونی دنیا سے بے شمار مہمانوں میں دبیرؔ شناسی کے حوالے سے صف اول کے تنقید نگار ڈاکٹر تقی عابدی بھی کینڈا سے تشریف لائے ہوئے تھے تا کہ برصغیر کی اَدب اور خاص طور پر مرثیہ کی صنف کے حوالے سے ایک بھرپور عالمی کانفرنس کا انعقاد ہو سکے اور ماشاء اللہ ایک مدت کے بعد اگرچہ ایسا اجلاس دیکھنے میں آیا لیکن بہت کامیاب اجلاس رہا تقریب کے آغاز میں عالمی مجلس اَدب کے چیئر مین ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اجلاس کی غرض وغائت بیان کرتے ہوئے فرمایا عصر حاضر میں دبیرؔ فہمی اور دبیر شناسی کی بے حد ضرورت ہے ہم ڈاکٹر عابدی کی اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتے ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں کام آخر کون کرے گا ہمارے نزدیک تو آج کے عوام اس حوالے سے تیار نوالہ کھانے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے اور پھر مرزا سلامت علی دبیرؔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ناخدائے سخن حضرت انیسؔ سے ہی قدرے مشکل پڑتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ حضرت دبیرؔ اس دور کی مجالس عزا میں بھی بہت کم پڑھے جاتے ہیں سوز میں دبیرؔ کا کلام تو چلئے کسی بزرگ سے سننے میں برداشت کر لیا جاتا ہے مگر تحت اللفظ خدا کی پناہ، آج کے ابلاغ کے اداروں میں بھی ڈھنگ سے پڑھنے والے نہیں ملتے ایک انیسؔ و دبیرؔ پر ہی کیا موقوف آج کے پڑھنے والے تو انیسؔ و دبیرؔ سے پہلے اور انیسؔ و دبیرؔ کے بعد کے شعرا کو بھی نہیں پڑھ سکتے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان کو ہر علاقے نے اپنے لہجے میں بولنا شروع کر دیا ہے مگر پھر بھی چند ہستیاں اب بھی ایسی موجود ہیں جن کی وجہ سے اُردو زبان کا اپنا منفرد انداز اور لہجہ قائم ہے خواہ وہ لکھنؤ مکتبہ فکر سے ہو کہ دہلی اسکول آف تھاٹس سے متعلق رکھتا ہو کاش اس سیمینار میں کسی نے آگے بڑھ کر یہ بھی کہا ہو کہ بھائی پاکستان میں انیسؔ و دبیرؔ کو پڑھنا سکھانے کا بندوبست کیا جائے حالاں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت سخت منزل ہے اس حوالے

سے تو ان کی زندگی میں بھی شور اٹھتا تھا اس لیے تو دو اسکول آف تھاٹس کا قیام عمل میں آیا پشاور کے پندرہ روزہ اخبار ذوالفقار میں جب یہ خبر پڑھی تو ہم بڑے خوش ہوئے کہ شاید کہ دبیر و انیس سکھانے والا پڑھانے والا اس مجلس ادب کے توصل سے میسر آجائے کیوں کہ یہ بات مسلم ہے کہ جب تک اس ملک میں عزاداری قائم ہے بھلا انیس و دبیر کو کون بھول سکتا ہے اس تاریخی سیمینار میں ڈاکٹر عبدالکریم، ڈاکٹر سلیم اختر، اور ڈاکٹر عباس رضا نے مرزا سلامت علی دبیر کی شخصیت اور ان کے مرثیہ کے حوالے سے کیے گئے کام پر روشنی ڈالی کینیڈا سے تشریف لائے ہوئے مہمان کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے مرزا سلامت علی دبیر پر مختلف موضوعات پر جو کام کیا ہے وہ لائق صد تحسین اور قابل فخر ہے تقریب کے صدر انتظار حسین نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی ایک شخص نہیں بل کہ ایک ادارے کا نام ہے جوابی طور پر ڈاکٹر تقی عابدی کی جو باری آئی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے مرزا سلامت علی دبیر کے کلام کو بائیس جلدوں میں مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا ہے انھوں نے مزید فرمایا کہ چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی جلدیں بھی اسی برس شائع ہو جائیں گی اس موقعہ پر پیک سلوشن ادبی کی جانب سے ڈاکٹر تقی عابدی کو بہترین ثقافتی شیلڈ پیش کی گئی جب کہ دیگر نمائندہ ادبی تنظیموں نے ڈاکٹر تقی عابدی کی خدمت میں تحائف پیش کیے اگر چہ ہمارا کالم خبر کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ بات ہی کچھ ایسی ہو رہی ہے مرزا سلامت علی دبیر کا اردو ادب پر اتنا حق بنتا ہے کہ اگر ہند و پاک کے سارے اخبارات و رسائل پر اشاعت کے ماتھے پر ان کے اقوال کا ایک مصرعہ لکھے تو کہیں جا کر صدیوں میں ان کا حق ادا ہو تو مندرجہ بالا تقریر و بحث کی روشنی اور ہنگامے میں اگر کوئی ہمارے نحیف و نزار دل کی آواز غور سے سنے تو یقین جانیے ہمیں یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ اس دور میں کوئی دبیر کو بھی یاد کرتا ہے جب کہ مرثیے کے حوالے سے ہمارے وطن کا ہر دوسرا شخص اپنے آپ کو انیس و دبیر سمجھتا ہے یقین فرمایئے اس دور کی علمی ادبی صورت حال ابلاغ کے اداروں میں تو بے حد پتلی ہے ایک زمانہ تھا کہ لوگ شعر کہتے تھے اب تو ٹیلی ویژن ریڈیو پر ہر دوسرا شخص یہ کہتا پھرتا ہے یہ شعر میں نے بنایا ہے یا پاک پروردگار شعر بنایا کیسے جاتا ہے بس یہ نقطہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے تو جناب بات مرزا سلامت علی دبیر کی ہو رہی تھی اور ہم اس لیے بھی خوش ہیں کہ پہلے تو مرزا سلامت علی دبیر طاقوں میں رکھی ہوئی اپنی جلدوں میں ہی محفوظ و محدود ہو کر رہ گیا تھا بہت کچھ ہوتا تو کہیں کسی مجلسِ عزا میں ایک آدھ سلام سننے کو ملتا ورنہ اللہ اللہ خیر سلا لیکن جب سے عالمی مجلس ادب کی کارگزاری پڑھی تو معلوم ہوا کہ ابھی دبیر شناس لوگ موجود ہیں اور ظاہر ہے اس حوالے سے دبیر فہم بھی ہوں گے یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے کہ نئی نسل کو انیس و دبیر سے روشناس کرایا جائے ان کی یادگار قائم کی جائے ان کے نام کا کوئی مستقل ادارہ قائم کیا جائے۔

ہم اس موقعہ پر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی توجہ ایک خاص نقطے کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ متحدہ ہندستان کے زمانے میں لکھنؤ میں باقاعدہ ایک کالج تھا جو اس زبان کے لہجے کا تحفظ اور ادائیگی سکھایا کرتا تھا

بٹوارا ہونے کے بعد ہم اس ادارے سے محروم ہو گئے اور پھر کسی کو اس طرح خیال نہ آیا کہ اس قومی زبان کی شناخت اور اس کی خوشبوؤں کو محفوظ کیا جائے تاکہ اس زبان کے جتنے لہجے بھی کیوں نہ بنیں اپنا انداز بھی محفوظ ہو اس لیے کہ اس زبان کے اپنے بولنے والوں میں سے اس کا مزاج ختم ہوتا جارہا ہے بل کہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس زبان کے بولنے والے بھی اب خاصے بوکھلائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ وہ بے چارے اس زبان کے مختلف لہجوں میں پھنس گئے ہیں بہر حال یہ ایک علاحدہ موضوع ہے جس سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہم تو پورے ملک کے عوام کو خواہ وہ کسی قوم قبیلے اور خطے سے تعلق رکھتے ہوں اپنی قومی زبان کے ان ہیرو کو نہ بھولیں اور اس کا کلام پڑھتے وقت اسی طرح بولیں کہ جس طرح وہ خود بولتے تھے تاکہ کلام کے معنی و مفہوم سے ہم آشنا ہو کر پاکستان میں اب بھی ایسی شخصیات موجود ہیں جو ادائیگی کے حوالے سے سند مانے جاتے ہیں اگر ان حضرات کو بھی اکٹھا کر کے ایک شعبہ قائم کیا جائے تو بہت بڑا کارنامہ ہوگا ڈاکٹر شبیہ الحسن چوں کہ اُردو اَدب والفاظ نثر و نظم کے خود بڑے ماہر ہیں لہٰذا ہمیں امید ہے کہ اگر وہ سنجیدگی سے اس بات پر غور کریں تو صرف زبان اُردو ہی کیا ہم سب کی اس میں بھلائی ہوگی ہم عالمی مجلس اَدب کے اس کارنامے کو بنظر تحسین دیکھتے ہیں اور انھیں ایسے تاریخی سیمینار کو کامیابی سے ہم کنار کرنے اور اتنے مشکل عنوان سے انصاف کرنے پر تہہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔

(روزنامہ 'صبح' پشاور، ۷ مئی ۲۰۰۵ء)

◆◆◆

حق بہ حق دار رسید

جاوید صدیق بھٹی

••

جب اس دکھ بھرے زمانے میں کوئی اچھی خبر سننے کو مل جاتی ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم معاشرے سے دکھ وصول کرتے ہیں اور یہی درد و غم آگے تقسیم کر دیتے ہیں اب تو صورت حال یہاں تک گھمبیر ہو گئی ہے کہ انسان کی سانس بھی دہائی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ بقول شاعر:

گردشیں ساتھ رہیں آ یہ سائی کی طرح ۔۔۔ سانس بھی مَیں نے لیا ہے تو دہائی کی طرح

ہم سب دہائی دے رہے ہیں یا جی رہے ہیں؟ اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا، لیکن ایک بات ہر ذی ہوش تسلیم کرتا ہے کہ زیادہ غم بھی خوشی پر منتج ہوتے ہیں جس طرح ہر سیاہی کا انجام سفیدی ہے اسی طرح غم کے بطن سے خوشی پھوٹتی ہے، اسی لئے خواجہ میر درد نے غم و طرب کو جڑواں بچے قرار دیا ہے:

دل پہ چاک ہے گل خنداں ۔۔۔ شادی و غم جہاں میں توام ہے

آج جس بات نے میرے قلب و نظر کو مسرور کر دیا، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب کو "نسیم لیہ ایوارڈ" سے نوازا گیا ہے پنجاب کے مختلف شہروں نے اپنے اپنے طور پر شعر و ادب کے کئی دبستان پیدا کیے ہیں جن کی مہک دُور و نزدیک محسوس ہوتی رہی ہے لیکن پنجاب کا ایک دُور اُفتادہ علاقہ لیہ ہے۔ یہاں علم و دانش کی ایک ایسی فضا قائم ہو گئی ہے جو بڑے بڑے علمی مراکز سے بھی پُر عظمت و پُر تجمل ہے۔ یہاں بے شمار ادیب اور شاعر پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنے افکار عالیات سے اس علاقے کو مزید زرخیز بنایا اس کے ساتھ ساتھ یہاں تحقیق اور فلسفہ کے بھی کئی نامور نام حافظے میں حلاوت کا باعث ہیں۔ اس وقت میں صرف دو شخصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں پہلی شخصیت حضرت نسیم لیہ کی ہے جنھوں نے اس بنجر علاقے کی فکری آبیاری کی اور ان کی کاوشوں سے یہ علاقہ شعر و ادب کا گہوارہ بن گیا دوسری عظیم المرتبت ہستی ڈاکٹر خیال امروہوی کی ہے۔ ڈاکٹر خیال نے تحقیق، تنقید، شاعری، تدریس غرض ہر شعبہ حیات میں ایسے نقوش روشن کیے جن کی تابانی سے یہ علاقہ آج بھی ہمدوش ثریا ہے آج اس علاقے میں علم و ادب کے جو چراغ روشن ہیں وہ ان دونوں حضرات کی نوازشات ہے

پایاں کے باعث ہیں یہ دونوں شخصیتیں ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کے ساتھ اس لیے یاد آ گئیں کہ ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹر نسیم لیّہ مرحوم کی خدمات کے حوالے سے ایوارڈ عطا کیا گیا ہے اور خیال امروہوی صاحب اس لیے یاد آ گئے کہ انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے یہ ایوارڈ عطا کیے۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ نسیم لیّہ ایوارڈ ایک ایسے شخص کو عطا کیا گیا جس نے واقعی علم واَدب کی بے خدمت کی ہے اور ایسے شخص کو عطا کیا گیا ہے جو علم واَدب کا مینار ہے اس طرح یہ بات سچ ثابت ہو جاتی ہے کہ ''حق بہ حق دار رسید''۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایف سی کالج لاہور سے بی اے، اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی کیا انھوں نے گورنمنٹ کالج وزیر آباد، گورنمنٹ کالج لاہور، گورنمنٹ کالج وزیر آباد، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، گورنمنٹ ایجوکیشن کالج فیصل آباد، اسلامیہ کالج قصور اور گورنمنٹ ایجوکیشن کالج لوئر مال لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیے اور آج کل گورنمنٹ کالج لاہور ٹاؤن شپ میں سینئر پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض تندہی سے اَدا کر رہے ہیں۔ ان کی معروف کتاب ''ترجیحات'' کو ۱۹۹۸ء کی بہترین تنقیدی کتاب کا اعزاز بھی حاصل ہوا تھا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب نے اُردو کے اَدبی رسائل کو ایک نئے ذائقہ اور تواتر سے آشنا کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی جریدے کو بھی ذاتی مسائل ومعاملات کے لیے استعمال نہیں کیا۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن متنوع صفات کے مالک ہیں لیکن ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ وہ طلباو طالبات کی دستگیری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں ان کے سیکڑوں شاگرد ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں کمال کی بات یہ ہے کہ ان کے روابط بہت زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اگر ان کا بیس سال پہلے کا بھی کوئی شاگرد آ جائے تو وہ مع اس کے سیاق وسباق کے یاد رکھتے ہیں وہ اپنے طلبہ سے محبت کرتے ہیں اور طلبہ وطالبات ان پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ وہ سنجیدہ فکر گفت گو کرتے ہیں اور بے معنی بولنا ان کے نزدیک ایک عیب ہے اسی طرح ان کی تحریروں میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور تمکنت ہے وہ مقدار سے زیادہ معیار پر توجہ دیتے ہیں انھوں نے کم لکھا جتنا بھی لکھا معیاری لکھا اس برس ان کے پندرہ سے زیادہ مضامین طبع ہو کر اہلِ دانش سے داد وصول کر چکے ہیں، اہم بات یہ ہے کہ یہ مضامین جدید وقدیم شعرا اور ادیبوں کی شخصیات اور فن کا کما حقہ احاطہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک علمی واَدبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد ماجد سیّد وحید الحسن ہاشمی اپنے عہد کے نامور شاعر اور ادیب ہیں اور ان کی پچاس سے زیادہ کتابیں شائع ہو کر اہلِ دانش سے داد وصول کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب کو یہ ایوارڈ مبارک ہو لیکن اس قسم کے اعزازات وانعامات ڈاکٹر صاحب کے وقار کو کیا بڑھائیں گے ڈاکٹر صاحب نے یہ اعزاز وصول کر کے اس ایوارڈ کی وقعت بڑھائی ہے۔

(روزنامہ 'صحافت' لاہور، ۲۳ نومبر ۲۰۰۴ء)

◆◆◆

مردہ پرستوں میں روشنی کی لکیر

جاوید صدیق بھٹی

••

زمانہ کروٹیں بدلتا ہے۔ آسمان کی گردشیں سب کچھ تبدیل کردیتی ہیں۔ وقت کا پہیہ اتنا قوی، مہیب اور طاقت ور ہے کہ یہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ عروج وزوال کی داستانیں بھی اسی باعث جنم لیتی ہیں۔ عروج وزوال کی کہانی بھی عجیب ہے۔ جو عروج پر آنا چاہتے ہیں انھیں زمانہ ٹھکرا دیتا ہے اور جو زمانے کو خاطر میں نہیں لاتا زمانہ ان کے قدم چومتا ہے۔ عروج ہو یا زوال یہ عارضی چیزیں ہیں۔ بقول خواجہ میر درد:

ترقی اور تنزل کو یاں کے کچھ عرصہ
مثالِ ماہ زیادہ نہیں مہینے سے

ہمارے عہد میں قدر افزائی کے بھی کئی پیمانے ہیں۔ کسی کو دولت دے کر خوش کردیا جاتا ہے اور کوئی سرکاری عہدہ پاکر پھولے نہیں سماتا۔ کسی کو شہرت مل جائے تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے اور کوئی حقیر سا سرکاری تمغہ پاکر مسرور ہو جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک عزت کا انحصار دولت یا انعامات پر نہیں ہوتا بل کہ اس محبت پر ہوتا ہے جو اعزاز عطا کرنے والے کے دل میں موجزن ہوتی ہے اور کسی کا دل جتنا کشادہ ہوتا ہے اتنی ہی محبت میں شیرینی اور مٹھاس ہوتی ہے۔

ہم اس عہدِ بے سروسامان میں زندگی بسر کررہے ہیں جہاں ہم عزت سمیٹنے کے تو قائل ہیں مگر کسی کو عزت ووقار دینے کے روادار نہیں ہیں۔ زندوں کو تو ہم کسی شمار قطار ہی میں نہیں رکھتے بل کہ ہم تو وہ تمام اسباب بھی چھیننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں جو دوسروں کی توقیر کا باعث ہیں۔ مردہ پرستی ہمارا شیوہ بل کہ چلن ہے۔ ہم مُردوں کی پرستش کرتے ہیں بل کہ مُردوں کو زندوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم زندہ رہنے والے کو غذا سے محروم کر دیتے ہیں مگر مرنے کے بعد اس کو ریشمی کفن عطا کرتے ہیں اور اس کا غم زور شور سے مناتے ہیں:

ستم کی دھوپ میں اس کا بدن جھلستا رہا
وہ مر گیا تو اسے ریشمی لباس ملا

ہمارے معاشرے میں ایک عجیب وغریب انسان ڈاکٹر شبیہ الحسن ہے جو زندوں کی قدر کرتا ہے۔ ان پر مضمون لکھتا ہے۔ ان پر کتابیں لکھتا ہے اور ان کی پذیرائی کے لیے تقاریب منعقد کراتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس سارے کام میں اسے ذاتی نمود و نمائش کی ہرگز طلب نہیں ہوتی۔ اس کا یہ طرز عمل ولیوں جیسا ہے۔ وہ زندوں سے بھی محبت کرتا ہے اور مُردوں سے بھی۔ اس نے کئی مردہ ادیبوں کی تخلیقات کو شائع کر کے انھیں حیات نو عطا کی۔ وہ ایسا عجیب شخص ہے کہ مُردوں اور زندوں سب کا رفیق اور دوست ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس ہماہمی کے زمانے میں بھی لوگ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی عزت کرتے ہیں۔ اس کے لیے حرفوں کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ پروفیسر آصف وٹو کی تخلیق ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' کی اشاعت اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ابھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔

پروفیسر آصف وٹو ایک مشہور نقاد اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کو خراج تحسین پیش کرنے کا انوکھا طریقہ وضع کیا ہے۔ انھوں نے پہلے تو ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن کے تمام رُخوں کو انتہائی مہارت سے بیان کیا ہے اور اس کے بعد ان کے فن کے سب سے اہم رُخ ''تنقید'' کو اپنا موضوع تخلیق و تحقیق بنایا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تمام کتابوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ایک ایک نکتے کو اتنی وضاحت سے بیان کیا ہے کہ قاری کو ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آخری دو ابواب میں انھوں نے تنقید کے مروجہ دبستانوں کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر شبیہ الحسن کے امتیازات اُجاگر کیے ہیں۔ انھوں نے احساس دلایا ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن اکیسویں صدی کے وہ منفرد محقق اور نقاد ہیں جن کا تخلیقی سفر کبھی رُکا نہیں۔ وہ ایک ایسے سمندر کی مانند ہیں جو مسلسل رواں دواں ہے اور تشنگانِ علم و اَدب اس سے متواتر سیراب ہو رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر آصف وٹو نے یہ کتاب لکھ کر محض اپنے اُستاد اور عصر حاضر کے نقاد کو خراج تحسین ہی پیش نہیں کیا بل کہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب محض اَدبی اعتبار سے ایک دستاویز ہی نہیں ہے بل کہ یہ احساس بھی دلاتی ہے کہ ہم صرف مردہ پرست ہی نہیں زندوں کی قدر بھی کرنا جانتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی غزل کے ایک شعر میں یہ شکوہ کیا تھا کہ:

اپنے گھر میں بھی اجنبی ہوں میں
جرم یہ ہے کہ روشنی ہوں میں

پروفیسر آصف وٹو کی یہ کتاب اس ''شکوہ'' کا جواب ہے اور احساس دلاتی ہے کہ ہم کل بھی روشنی کے قدردان تھے اور آج بھی روشنی پرست ہیں۔

◆◆◆

نظر انداز کیے گئے ادیبوں کا نقاد

ڈاکٹر جواز جعفری

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن مانے ہوئے شاعر، نقاد اور محقق ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ''شام و سحر'' جیسے معروف اَدبی رسالے کے ایڈیٹر بھی ہیں جب کہ ان کی تدریسی ذمہ داریاں اس کے علاوہ ہیں۔ اتنے سارے شعبوں میں بیک وقت کام کرتے دیکھ کر انھیں اَدبی جن کہنے کو جی چاہتا ہے ورنہ ہمارے ہاں بہت سے ادیب ہیں جنھوں نے اپنی زندگیاں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر ''زبانی ادب'' تخلیق کرتے ہوئے گزار دیں مگر شبیہ الحسن عملی آدمی ہیں، گزشتہ کئی سالوں سے ہر سال ان کی کئی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ عملاً یہ بہت سے لوگوں کے کرنے کا کام ہے جسے وہ اکیلے ہی انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اگرچہ بیسویں صدی کے نئے اَدب کو خوش دلی سے پروموٹ کیا ہے مگر ان کی تنقید اور تحقیق کا خصوصی میدان مرثیہ ہے۔ مرثیے سے ان کی خصوصی دل چسپی کا باعث ان کا خاندانی پسِ منظر ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے دادا شبیر حسن صفا الٰہ آبادی، تایا حبیب جون پوری، والد وحید الحسن ہاشمی اور بھائی عرفی ہاشمی سب مرثیے کے شاعر ہیں۔ شبیہ الحسن نے آلِ رضا سے لے کر نسیم امروہوی، قیصر بارہوی، سیف زلفی اور وحید الحسن ہاشمی تک کے رثائی کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا۔ انھیں ایک کریڈٹ اور بھی جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے عظیم باپ وحید الحسن ہاشمی کی سرپرستی میں مرثیے کی مٹتی ہوئی صنف کو زندہ رکھنے کے لیے پوری تحریک چلائی جس کے نتیجے میں بہت سے غزل گو شعرا نے مرثیے کا رُخ کیا۔ شبیہ الحسن نے صرف تحریک ہی نہیں دی بل کہ نئے لکھنے والوں کے مراثی کو کتابی صورت میں شائع کرانے کا جتن بھی کیا۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مرثیے کے روایتی مصاحب کے ساتھ ساتھ نئی تنقیدی بحثوں کا بھی آغاز کیا۔ ایک طرف ان کے والد وحید الحسن ہاشمی جدید مختصر مرثیے کے بانی قرار پائے تو دوسری طرف ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے والد کے اس

کارنامے کو علمی و اَدبی حلقوں میں مقبول بنانے کے لیے تنقیدی میدان سنبھالے رکھا۔ کہنے کو تو ہر ادیب کی اولاد موجود ہے مگر بے شمار اہلِ قلم ایسے ہیں کہ جن کے مرنے کے بعد ان کے تخلیقی سرمایے کو محفوظ کرنا تو درکنار ان کی اولاد کو ان کے لیے تعزیتی ریفرنس منعقد کرانے کی بھی توفیق نہ ہوئی مگر اس سلسلے میں وحید الحسن ہاشمی خوش نصیب ہیں کہ انھیں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن جیسا بیٹا ملا جس نے اپنے باپ کی زندگی ہی میں ان کا سارا کام شائع کر دیا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقید میں رچاؤ، ثقافتی شائستگی اور علمی استدلال نظر آتا ہے۔ ان کے قلم میں ٹھہراؤ، فکر میں پختگی اور رائے میں اعتدال ہے۔ ان کا خصوصی کمال یہ ہے کہ وہ فن پارے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس تہذیب کی داستان بھی کہتے ہیں جس میں اس فن پارے نے جنم لیا۔ یوں دیکھا جائے تو ان کا سارا تنقیدی و تحقیقی کام اپنے اندر ایک مخصوص تہذیبی زاویہ رکھتا ہے۔

ہمارا موجودہ اَدبی منظر نامہ مفاداتی سرگرمیوں سے اٹا پڑا ہے۔ بڑے بڑے مناصب پر فائز اہلِ قلم کو اَدبی ایوارڈز سے نوازا جا رہا ہے، اندرون و بیرونِ ملک ان کے جشن منائے جا رہے ہیں، بڑے بڑے ناقدین ان کے قصیدے لکھنے اور اَدبی پرچوں کے مدیر ان کے خصوصی نمبرز شائع کرنے میں مصروف ہیں مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تخصیص یہ ہے کہ وہ عموماً ایسے فن کاروں پر قلم اٹھاتے ہیں جنھیں ہمارے فرعون مزاج ناقدین آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے ماہ نامہ ''شام و سحر'' کے پلیٹ فارم سے ایسے ایسے جینوئن لکھنے والوں کے خصوصی نمبر شائع کیے جنھیں بھلانے میں ہم نے بہت جلدی سے کام لیا۔ یوں ڈاکٹر صاحب اَدبی برادری کی اجتماعی کوتاہیوں کا کفارہ اکیلے ہی اَدا کر رہے ہیں۔

جب بھی ڈاکٹر شبیہ الحسن کی نئی کتاب منظرِ عام پر آتی ہے تو ہم انھیں خراجِ تحسین پیش کرنے کا ارادہ باندھتے ہیں مگر ہر بار اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہتے ہیں یوں ہم ہمیشہ کی طرح ارادے ہی باندھتے رہ گئے اور بازی آصف وٹو لے اُڑا ہے اور اس نے ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' نامی کتاب لکھ کر شبیہ شناسی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ آصف وٹو نوجوان نقاد ہے اور وہ اپنی پہلی کتاب سمیت اَدبی حلقوں میں وارد ہوا ہے۔ اس کتاب کو اس نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ نوجوان مرتب نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کا سوانحی خاکہ، مقالات کی تفصیلات، خاندان اور اساتذہ کے کوائف، کتابوں کی فہرست حتیٰ کہ ان پر لکھے گئے کالموں اور مضامین کی تفصیلات بھی فراہم کر دی ہیں۔ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ یہاں وہ سب کچھ موجود ہے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے لکھا اور وہ بھی جو دوسروں نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ کتاب، کتاب سے زیادہ ایک ویب سائٹس کا تاثر پیش کرتی ہے۔ آصف وٹو نے ڈاکٹر شبیہ الحسن پر خود لکھنے کی بجائے دوسروں کے لکھے پر اکتفا کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے ہم اس کتاب کو سہل پسندی کے زمرے ہی میں رکھیں گے کہ ہمارے خیال میں

ڈاکٹر شبیہ الحسن پر اس طرح قلم اٹھایا جانا چاہیے تھا جیسے وہ خود دوسروں پر اٹھاتے ہیں۔ مگر نوجوان نقاد آصف وٹو کی مشکل یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر موصوف کے شاگرد ہیں اور ایک شاگرد اس سے زیادہ اپنے اُستاد کے لیے اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ یہ کتاب پہلے سے جانے پہچانے ڈاکٹر شبیہ الحسن کو ہمارے سامنے لاتی ہے انھیں نئے زاویے سے دریافت کرنے کا جتن نہیں کرتی۔ تاہم آصف وٹو کی یہ کتاب پڑھنے کے بعد اَدب کا قاری ڈاکٹر شبیہ الحسن کی عظمت کا مزید قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(روزنامہ "ڈان" لاہور، ۲۰۔ جنوری ۲۰۰۷ء)

◆◆◆

میں کائنات کے پیکر میں ہوں رگوں کی طرح

پروفیسر وحید عزیز

◆◆

ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے جو رجحان ساز ہوں خاص طور پر تنقید کا میدان تو اس لحاظ سے بالکل ہی خالی ہے کہ اس میں نئے نظریات، رجحانات تخلیق کرنے والے تقریباً ناپید ہو گئے ہیں وہ شے جو ہمارا ورثہ تھا۔ اس طرزِ عمل کا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہم اپنے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اس ابتر صورتِ حال میں اگر کوئی نقاد نئے نظریات پیش کرے تو خوش گوار حیرت ہوتی ہے۔ دل کو طمانیت بھی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی تو ہے جس نے اس اہم کام کے متعلق سوچا ہے۔ جس کے بغیر ہمارا اُدب ادھورا ہے اور اُدب کے بغیر ہمارا معاشرہ کبھی بھی مکمل نہیں ہوتا۔ دل چاہتا ہے کہ ایسے نقاد کی پذیرائی ہونی چاہیے اور اسے مکمل، خاص جذبے کے ساتھ داد و تحسین پیش کرنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ بے اُدب معاشرے میں جب کوئی نقاد تنقیدی رجحانات تخلیق کرے اور اس کے فروغ کے لیے عملی کاوش کرے تو خوشی دو چند ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے تنقیدی نظریات شعر و اُدب کے حوالے سے وضع کیے تھے۔ ان کی خدمات کا اعتراف تو اَدبی حلقے کرتے ہی رہے ہیں۔ مگر ان کے ایک پرستار پروفیسر آصف وٹو نے ان پر ایک شاندار کتاب ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ''تنقیدی رجحانات'' تحریر کی ہے جو حال ہی میں شائع ہو کر اَدبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر رہی ہے۔ آصف وٹو بھی اس حقیقت کو پا گئے تھے۔ کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن بہترین نقاد ہیں۔ اور اُدب سے محبت رکھنے والے مخلص ادیب و محقق ہیں۔

پاکستان میں جدید تنقید کے معماروں میں محمد حسن عسکری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، مظفر علی سید اور ڈاکٹر سجاد باقر ایسے ناقدین تھے، جنھوں نے تنقید کے معیار کو وسعت و ترقی بخشی اور اُدب میں اس کی راہیں کشادہ کیں اگر عصرِ حاضر کی بات کریں تو ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر وزیر آغا دو ایسے ناقدین ہیں جو عصرِ حاضر کی صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اُدب کی خدمات بھی بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ اگر بیسویں صدی کی آخری دہائی کو سامنے رکھیں اور اُدبی صورتِ حال کو پیشِ نگاہ رکھ کر نقادوں کے متعلق سوچیں تو

ایک نام فوراً ہی دماغ کی پردہ سکرین پر موٹے حروف میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اور وہ نام ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن، ڈاکٹر صاحب کا نام اُدب میں انتہائی وقیع اور معتبر ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کے مختلف دبستانوں سے ربطہ و تعلق رکھا مگر کسی مخصوص دبستان سے خود کو وابستہ نہیں ہونے دیا ان کی یہ ایسی خوبی ہے جس نے انھیں اُدبی حلقوں میں ایک ایسا اعلیٰ و شاندار مقام فراہم کر دیا ہے۔ جس کی خواہش ہر ادیب و ناقد رکھتا ہے۔ پروفیسر آصف وٹو نے اپنی کتاب میں کمال مہارت سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر آصف وٹو کی کتاب "ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے "تنقیدی رجحانات" بنیادی طور پر چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سوانحی کوائف اور برصغیر کے معروف دانش وروں، ناقدین کی آرا اور معروف شعرا کو خراج تحسین پیش کیا ہے دوسرے باب میں انھوں نے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی اور تحقیقی سفر کی داستان بیان کی ہے اور ان کی ۲۵ کتابوں کا تجزیہ کیا ہے۔ تیسرے کلیدی باب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی زاویوں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے تہذیبی، عمرانی، نفسیاتی، تاثراتی، تاریخی اور اُسلوبیاتی تنقید کے مختلف مراحل پر کمال فن و مہارت سے روشنی ڈالی ہے۔ چوتھے باب میں انھوں نے اُردو تنقید میں ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی اختصاص کو اُجاگر کیا ہے اور عصرِ حاضر میں ان کے امتیازات و اعزازات پر اپنے قلم سے روشنی ڈالی ہے۔ اُدب کی آبیاری و خدمت کرنے والے عظیم شخص کی خدمات کا اعتراف پروفیسر آصف وٹو نے نہایت خوب صورتی سے کیا ہے اور مجموعی طور پر پروفیسر آصف وٹو نے انتہائی ذہانت و مہارت کے ساتھ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی اور سوانحی حالات کو اچھے طریقے سے قلم بند کیا ہے۔

اگر جدید تنقید کا ذکر کریں تو ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک ایسے ناقد ہیں جن کے حصے میں بہت سے امتیازات ہیں۔ لیکن ایک سب سے اہم امتیاز جس کی طرف مَیں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انھوں نے خود کو عظیم ناقد کے طور پر ہی اُدبی حلقوں میں نہیں منوایا بلکہ اپنے ساتھ علم و اُدب میں لکھنے والوں کا ایک ایسا دبستان و کاروان بنایا ہے جو آج اُدب میں ایک خاص مقام و پہچان اور حیثیت و اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی واضح مثال پروفیسر آصف وٹو ہیں۔ جنھوں نے اس اُدب کے بے قدر دور میں بھی اس مصرعے پر عمل کرتے ہوئے "پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ" ڈاکٹر شبیہ الحسن پر بے مثال و شاندار کتاب لکھ کر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اگر انسان ہمت کرے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن بلاشبہ بہترین نقاد، بہترین ادیب کے علاوہ بہترین شاعر بھی ہیں اور آپ کی شاعری دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے یہ انفرادیت ڈاکٹر شبیہ الحسن حقیقت میں اُدب کی خدمت کر رہے ہیں۔ حقیقت میں ڈاکٹر صاحب کائنات اُدب کے پیکر میں رگوں کی طرح شامل ہیں۔ آپ ان کا یہ شعر سنیے اور لطف اُٹھایئے:

مرا وجود ہے تخلیق زندگی کا بھرم
میں کائنات کے پیکر میں ہوں رگوں کی طرح

(روزنامہ 'جرأت' لاہور ۱۱ دسمبر ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

اَدب کی شمع جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

پروفیسر وحید عزیز

◆◆

عصرِ حاضر میں اَدب کھیل تماشہ بن کر رہ گیا ہے۔ اَدب کی ناقدری نے ادیبوں کی حیثیت و مقام میں بھی بہت فرق ڈالا ہے۔ شعر واَدب جن پر ہمارے معاشرے کی بنیاد ہے آج معدوم ہوتا جارہا ہے۔ جس طرح موسیقی روح کی غذا ہے اسی طرح شعر واَدب جذبات وخیالات وسوچ کی بنیاد ہے۔ اب لوگ اَدب محافل میں جانے کی بجائے تھیٹروں کا رخ کرتے ہیں اور غیر معیاری قسم کے کلمات وانداز دیکھ کر خود اپنا اور معاشرے کا نقصان کر رہے ہیں۔ یہ دکھ وکرب کا مقام ہے کہ ہماری نوجوان نسل کتابوں سے دُور ہو کر سکون تلاش کرنے کی ناکام کوشش میں مبتلا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اور ان میں ایک بڑی وجہ اَدب سے دُوری بھی ہے اسی اَدب کی دُوری نے انھیں کتابوں سے دُور کر دیا ہے اور کتابوں کی دوری نے ان کی نظر میں ادیبوں اور دانش وروں کی قدر کو کم کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ناقدری ولا پروائی کے دَوْر میں بھی کچھ لوگ ایسے اداروں کو چلا رہے ہیں جو شب وروز اَدب کی آبیاری وبہتری کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ اور تند ہواؤں کے سامنے پختہ عزم وارادے کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں اپنی مصروفیات ومعاشی کوششوں کے باوجود بھی غرض و لالچ سے پاک ہو کر اَدب کے گلشن کو سجانے کی کوشش میں مصروفِ عمل ہیں۔ اَدب کی آبیاری کرنے والوں میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا نام سرِفہرست ہے۔ انھوں نے عالمی مجلس اَدب کی چیئرمین کی حیثیت سے اَدب کی بہت خدمت کی ہے اور کرنے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن عصرِ حاضر کے بہترین نقاد، محقق ودانش ور ہیں آپ نے تحقیق کے ذریعے کئی پوشیدہ ادیبوں اور دانش وروں کو لوگوں میں متعارف کروایا۔ اور انھیں اَدب کے فلک کا چمکتا ہوا تارا بنا دیا۔ مگر یہ سب کرنے میں کبھی سرکاری طور پر یا کسی اہلِ کار نے خاطر خواہ توجہ اور ساتھ نہیں دیا تھا۔ لیکن اب قابلِ مسرت بات یہ ہے کہ ہر دل عزیز گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول نے عالمی مجلس اَدب کے چیئرمین ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے ملاقات کی اس شاندار بیٹھک میں اُستاد الشعرا وحید الحسن ہاشمی بھی موجود تھے۔

گورنر پنجاب نے کہا کہ کسی بھی معاشرے میں ادیب کا کردار بنیادی ہوتا ہے اور اگر ادیب اپنے فرائض صحیح طریقے سے ادا کر رہا ہے تو معاشرہ ترقی کی جانب گامزن ہو جاتا ہے ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے نے پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھوں سے قلم چھین کر ہتھیار تھما دیئے ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن چیئرمین عالمی مجلس اُدب نے گورنر پنجاب کو ادیبوں کی مالی مشکلات و حالات کے متعلق بتایا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے گورنر پنجاب کو یہ بھی بتایا کہ ادیبوں کے لیے ایک بڑی مشکل اپنی کتابیں شائع کروانا ہے۔ ان کی کتابیں شائع نہ ہو پاتی اگر ہو بھی جائیں تو کتابوں کی رونمائی کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ادیبوں کو درپیش مسائل گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول کو گوش گزار ہے۔ گورنر پنجاب خالد مقبول نے کہا کہ انھوں نے پختہ ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ پنجاب کو ادبی، علمی، اور تعلیمی اعتبار سے بہتر سے بہتر بنائیں گے۔ انھوں نے کہا پاک ٹی ہاؤس کی بندش کے بعد "الحمرا میں اُدبی بیٹھک" قائم کی جا رہی ہے ادیبوں کو اُدبی تقریبات کے لیے الحمرا ہال نمبر ۳ بالکل مفت دیا جائے گا اور کمیٹی بنائی جائے گی جو مضافات میں بسنے والے ادیبوں کی مالی معاونت بھی کرے گی اور ان کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کرے گی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے گورنر پنجاب کی تعلیمی ترقی کے لیے کی گئی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہمارے معاشرے کو دانش مندی کی ضرورت ہے اور جب تک ہم دانش مندی کی روایت کو قائم نہیں کرتے ہماری تعلیمی ترقی کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بتایا کہ حکومت کی عدم توجہی کے باعث اخلاق کو خراب کرنے والے ڈائجسٹوں، اور رسائل کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے۔ جنرل (ر) خالد مقبول نے کہا کہ حکومت اُدبی رسائل و جرائد کے مسائل سے آگاہ ہے اور بہت جلد ان کے حل کے لیے واضح حکمت عملی کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت پنجاب ادیبوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی قدر کرتی ہے اور بہت جلد معروف ادیبوں اور شاعروں کی تقاریب پذیرائی بھی منعقد ہوں گی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی بیس سے زیادہ کتب گورنر پنجاب کی خدمت میں پیش کیں گورنر پنجاب نے ان کتب کے سرسری مطالعہ کے بعد ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تخلیقات کی تعریف کی اور انھیں عالمی مجلس اُدب کی کارگزاریوں پر مبارک باد دی۔ یہ واقعی مقام مسرت ہے کہ سرکاری طور پر بھی اُدب کی بہتری اور ترقی کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچا جا رہا ہے اور حقیقت میں گورنر پنجاب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے نفسا نفسی کے اس دور میں بھی اُدب کی بہتری کے متعلق سوچا ہے۔ ہمارا معاشرہ بے راہ روی کا شکار اس لیے ہوا ہے کہ ہم اُدب و علم سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں ہماری نوجوان نسل چٹ پٹی اور مصالحے دار خبروں اور باتوں میں الجھ کر رہ گئی ہے ایسی خوف ناک صورت حال میں گورنر پنجاب کا مثبت رویہ حوصلہ افزا ہی نہیں ہے بل کہ ملک و قوم کے لیے بہترین و یادگار تحفہ بھی ہے۔ چیئرمین عالمی مجلس اُدب ڈاکٹر شبیہ الحسن بھی مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے اُدب کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ان ہی کی کوششوں کی بدولت انشاء اللہ تعالیٰ ادیبوں کو ان کا اصلی و صحیح حق نصیب ہو جائے گا کیوں کہ وہ اُدب کے لیے خلوص دل

اور نیک نیتی سے کام کرتے ہیں اور نیک نیتی سے کام کرنے والوں کا ساتھ مالک کائنات ضرور دیتا ہے۔ آخر میں یہ کہوں گا کہ اللہ رب العزت کرے کہ ہمارا ملک عظمت وشان کے ساتھ قائم ودائم اور چمکتا دمکتا رہے۔
ادیب ہمارے ملک وقوم کا سرمایہ ہیں اللہ کرے انھیں ان کا جائز مقام بھی ملے جس کے امکانات اب نظر آ رہے ہیں کیوں کہ گورنر پنجاب نے مکمل خلوص ومحبت کے ساتھ ادیبوں اور اُدب کی آبیاری کے متعلق سوچا ہے اللہ ان کے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچائے اور ہمارا ملک علم واَدب کا گہوارہ بن جائے۔ (آمین)
اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کے ارباب حل وعقد گورنر صاحب کے احکامات کی کس حد تک پاسداری کرتے ہیں اور مزید یہ کہ دیگر اعلیٰ حکومتی شخصیات بھی اُدب کے فروغ کے لیے کیا کرتی ہے۔

(ہفت روزہ 'ارباب جہاں' لاہور، ۲۸ جولائی تا ۳۔ اگست ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

اُدب کا رہبر و رہ نما......ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

پروفیسر وحید عزیز

◆◆

عصرِ حاضر میں اُدب کی آبیاری کرنے والے لوگوں کی تعداد حقیقتاً آٹے میں نمک کے برابر ہے لوگ اُدب کے نام و تصور سے بھی بھاگتے ہیں ان تمام بے اعتنائیوں اور لاپروائیوں کے باوجود بھی اُدب کو تقویت بخشنے والے لوگ اگرچہ کم تعداد میں تھے اور ہیں لیکن انھوں نے اپنا کام جامع اور مکمل طریق سے سرانجام دیا اور اُدب کی زینت بن گئے۔ انھیں عظیم و برتر اُدبی ناموں میں سے ایک نام جناب سیّد ذوالفقار حسین رضوی المعروف سیف زلفی کا بھی ہے آپ ۳۱ مئی ۱۹۳۱ء کو بریلی میں سیّد مقبول حسین رضوی کے ہاں پیدا ہوئے سیف زلفی ایک تخلیقی ذہن کے مالک تھے انھوں نے تمام عمر اُدب کی خدمت کی اور اپنے فن سے گلشنِ اُدب کی آبیاری کی اور کئی نثری و شعری تخلیقات یادگار چھوڑیں۔ سیف زلفی کی تخلیقات کو دنیائے اُدب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ سیف زلفی کی شاندار تخلیقات کے باوجود بھی لوگ ان کے فن سے بہت حد تک واقف نہ ہو پائے تھے کیوں کہ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہ معاشرہ نفسانفسی و کشمکش کا شکار ہے اور نفسانفسی کے اس دور نے اُدب اور اُدبی شخصیات کو تقریباً نگل لیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں مردہ لوگوں کی کوئی توقیر نہیں کرتا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس آج زندہ و جاوید لوگوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ اُدبی محافل میں لوگ آنے سے کتراتے ہیں کیوں کہ ہماری ثقافت وتہذیب تباہی کے دہانے پر ہے۔ اس وقت ہم اُدب کی ترقی چاہتے ہیں اس لیے ہمیں اس اُدبی ذخیرے کا بھی کھوج لگانا چاہیے جو صندوقوں اور ردی کے ڈھیروں میں پڑا ہوا ہے۔ ہمیں اپنی ثقافت کی مضبوطی کے لیے اُدب کو مضبوط کرنا ہوگا تاکہ معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہونے کی بجائے اُدب کو سمجھنے کی طرف لوٹ آئے اور اُدبی کھوج لگانے کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ کئی دبے ہوئے اُدب کے خزینے منظرِ عام پر آجائیں گے۔ اگرچہ اس طرح اُدب کا کھوج لگانے کے متعلق کوئی بھی نہیں سوچتا۔ مگر لاہور میں ایک ایسا زندہ دل شخص موجود ہے کہ جو زندوں کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی رکھتا ہے۔ انھوں نے حال ہی میں سیف زلفی کے چار مرثیے دریافت کر کے مکمل صحت

کے ساتھ سیف زلفی کے مرثیے کا نام سے شائع کردیئے ہیں وہ اس سے پہلے بھی سیف زلفی کے فن پر ایک کتاب "جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی" شائع کر چکے ہیں۔

سیف زلفی بلاشبہ اُردو اَدب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں ان کا انداز جدت آمیز اور دل میں اترنے والا ہے۔ شاعری کی تقریباً ہر صنف میں کامیاب و کامران طبع آزمائی کی ہے سیف زلفی جدید لہجے کا شاعر ہے جن کے مرثیے اور شاعری کے دوسرے رموز انھیں اپنے فن میں ممتاز و یکتا بناتے ہیں حال ہی میں عصر حاضر کے عظیم و برتر محقق ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے سیف زلفی کے مرثیے شائع کی اور اس کتاب کی تقریب رونمائی بھی کی تا کہ لوگ عظیم شاعر و مرثیہ نگار سیف زلفی کی شخصیت اور فن دونوں سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ سیف زلفی کے مرثیے کی تقریب رونمائی کی صدارت عصر حاضر کے عظیم مرثیہ نگار وحید عصر جناب سیّد وحید الحسن ہاشمی نے کی جب کہ مہمانانِ خصوصی میں ڈاکٹر سلیم اختر، رضا انتخاب اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن شامل تھے۔

اس عظیم الشان تقریب کے منفرد اور عصر حاضر کے بہترین دانش ور و ماہر تعلیم ڈاکٹر اجمل نیازی نے اپنے خوش رنگ اندازِ بیان میں کہا کہ شبیہ الحسن جنوں کی طرح کام کرتے ہیں اور ان کا معیار تحقیق کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے سیف زلفی کی شخصیت کو سراہا اور شبیہ الحسن کے کام کی دل کھول کر تعریف کی اور کہا کہ سیف زلفی کے مرثیوں کو یک جا کر کے شبیہ الحسن نے ایک بہت بڑا علمی و اَدبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ رضا انتخاب جو کہ سیف زلفی صاحب کے صاحب زادے ہیں نے کہا کہ سیف زلفی کی شاعری میں جو جوش و ولولہ ہے دراصل وہ ان کی ذات کا عکس ہے۔ تقریب کے صدر وحید الحسن ہاشمی نے کہا کہ عصر حاضر میں جدید مرثیہ کے خدوخال متعین ہو چکے ہیں۔ سیف زلفی کے مرثیے کی رونمائی وحید الحسن ہاشمی صاحب نے کی اس موقع پر حاضرین کی بڑی تعداد موجود تھی جو سیف زلفی کی شاعری کی پسندیدگی کا ایک منھ بولتا ثبوت اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت کا کمال ہے کہ اس عالم نفسانفسی میں بھی اَدبی محافل سجالیتے ہیں۔

سیف زلفی نے ابتدائی تعلیم پنجابیاں پرائمری سکول بریلی سے حاصل کی اور میٹرک اور ایف اے کے امتحانات اسلامیہ ہائی سکول بریلی سے پاس کیے یہاں انھیں دیگر اساتذہ کے ساتھ شوکت سبزواری، خواجہ احمد فاروق اور حامد بریلوی جیسے اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاک سرزمین کی طرف آئے اور ریلوے کے محکمے میں شعبہ اکاؤنٹس میں ملازمت کر لی اور یہیں سے اکاؤنٹس آفیسر کے طور پر قبل از وقت ریٹائرڈ ہو گئے۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن پر بطور سکرپٹ رائٹر ملازمت کی۔ عارضی طور پر اور یہ سلسلہ تا دم مرگ جاری رہا۔ سیف زلفی عمر بھر علم و اَدب کی ترقی اور بہتری کے لیے سرگرم عمل رہے۔ انھوں نے رسالہ "عکسِ نو" اور "گل فشاں" میں بطور مدیر کام بھی کیا اور علم و اَدب و شاعری کی ترویج کے لیے شب و روز ان تھک کوششیں کیں۔ ان کی محنت رنگ لائی رسالہ "گل فشاں" اپنی نوعیت اہمیت کے لحاظ سے اپنے عہد کا رجحان ساز رسالہ بن گیا۔ اسی طرح انھوں نے اَدب کی آبیاری کے لیے حلقہ اہلِ علم کی بنیاد رکھی اور

جلد ہی اس حلقے نے بہت کم عرصے میں زیادہ مقبولیت حاصل کر لی اور اس حلقے کے اثرات آج بھی علم و ادب پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک لمبے عرصے تک سیف زلفی حلقہ ارباب ذوق لاہور پاکستان پروگریسو رائٹرز اور حلقہ شعرائے اہلِ بیت کے سیکرٹری رہے اور اس حیثیت میں انھوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

سیف زلفی کی ادبی و علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۸۹ء میں انھیں ''جمہوریت ایوارڈ'' سے نوازا۔ اسی طرح پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک انعامی مقابلے میں ان کا ملی نغمہ '' ہمارا پرچم ...... یہ پیارا پرچم'' انعام کا مستحق قرار پایا۔ اس طرح بعض تنظیموں کی جانب سے بھی انھیں علمی و ادبی خدمات کے عوض مختلف قسم کے ایوارڈز سے نوازا گیا۔

سیف زلفی کی شادی سید محمد تقی کی دختر نیک اختر محترمہ توفیق فاطمہ سے ہوئی۔ اللہ رب العزت نے آپ کو دو بیٹوں رضا انتخاب، رضا شباب اور چار بیٹیوں عفت مریم، نگہت فاطمہ، نزہت فاطمہ اور گلناز فاطمہ سے نوازا۔ سیف زلفی ایک شریف النفس انسان تھے جو ہمیشہ دوسروں کے بارے میں بہتر اور مثبت رائے رکھتے تھے مگر معاشرے کے غموں، دکھوں اور تکلیفوں نے اس عظیم اور حساس طبیعت کے مالک شخص کو الجھا دیا۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں جگر کا عارضہ ہوا جو ابتدائی طبی امداد کے باعث وقتی طور پر تو دب گیا لیکن ۱۹۹۰ء میں اسی دبے ہوئے عارضے نے پھر سر ابھارا اور سیف زلفی کو کمزور کرتا چلا گیا۔ سیف زلفی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلاء رہنے کے بعد آخر کار ۲۱ مئی ۱۹۹۱ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) سیف زلفی کی موت کی خبر نے لاہور کے ادبی حلقوں کو سوگوار بنا دیا کئی تنظیموں نے تعزیتی قرار دادیں منظور کیں اور:

زندہ رہا غضنفر و کرار کی طرح — باتوں میں اس کی کاٹ تھی تلوار کی طرح
آئی جو موت ہنس کے گلے سے لگا لیا — زندہ رہا زمانے میں خوددار کی طرح

سیف نے غزل، منقبت، سلام، نوحہ، مرثیہ غرضیکہ شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور اسے اعتبار بخشا، اگرچہ آج سیف زلفی ہمارے بیچ موجود نہیں ہیں مگر ان کا شعری سرمایہ سخن ان کے ہونے کا احساس دلا دیا ہے اور ان کا ہر شعر ہمارے دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق کار کبھی نہیں مرتا۔ سیف زلفی بھی ایسے ہی تخلیق کاروں میں سے ہیں جن کی تخلیقات انھیں زندہ جاوید رکھے ہیں۔ آخر میں سیف زلفی کا ایک شعر جو محبت اہل بیتؑ سے بھرپور ہے:

مجھ کو بھی فن ملا ہے انیسؔ و دبیرؔ کا — شاعر ہوں خاندان جناب امیرؔ کا

اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندان امیرؔ کا شاعر کبھی نہیں مرتا اور سیف زلفی بھی آج ہمارے بیچ اپنی تخلیق کی صورت میں موجود ہیں۔ اللہ رب العزت ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

(روزنامہ سعادت لاہور، ۴ جولائی ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

قیصر شناسی کی کلیدِ اوّل

پروفیسر وحید عزیز

◆◆

کہا جاتا ہے کہ جب کوئی معاشرہ بے ربط اور منتشر ہو جاتا ہے تو اس سرکش گھوڑے کی باگیں تخلیق کار اپنے مضبوط و توانا ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور اسے اپنے قلم کے ہنر کے ساتھ راہِ راست پر لے آتے ہیں۔ تخلیق کار کسی بھی مہذب معاشرے میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے کہ تخلیق کار انسانی جذبات کو حسین لفظوں کے عرق میں ڈبو کر زندگی کو معطر بنانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ان کا یہ عمل معاشرے کی خاطر اس لیے بھی اہم ہے کہ ہمارے معاشرے کی بنیاد ہی اخوت و محبت پر قائم ہے اور اخوت و محبت کا جتنا بہتر اظہار تخلیق کار کرتے ہیں کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ایسے معاشرے میں رہتے ہیں۔ جہاں تخلیق کاروں کی باگیں کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہیں یوں کہہ لیں کہ دماغ تو ان کا اپنا ہوتا ہے لیکن اس میں سوچ کسی اور کی ہوتی ہے۔ الفاظ تو ان کے اپنے ہوتے ہیں، مگر لہجہ کسی اور کا ہوتا ہے اسی طرح پاؤں تو ان کے اپنے ہوتے ہیں لیکن سفر کسی اور کا ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ زندگی تو ان کی اپنی ہوتی ہے مگر بسر کوئی اور کر رہا ہوتا ہے۔ بقول رئیس امروہوی :

ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیسؔ
یہ کس کی عمر ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم

تخلیق کار معاشرے کو سنوارنے میں بہترین کردار ادا کرتا ہے اور اگر تخلیق کار ہی کو محکومیت کے خول میں بند کر لیا جائے یا تخلیق کار خود ہی مادی خواہشات کی زنجیروں میں اپنے خیالات کو جکڑ لیں تو معاشرہ سنورنے کی طرف کس طرح جا سکتا ہے؟ اور اس معاشرے میں اَدبی دریا بھرپور روانیوں سے کیوں کر بہہ سکتا ہے؟

اسی معاشرے میں جہاں تخلیق کار کسی اور کے خیالات اپنے الفاظ میں ڈھال کر عوام الناس تک پہنچانے میں مصروفِ عمل ہیں، جہاں یہ جبر بے سمت رواں دواں ہے ترتیب کی تعریف معدوم سی نظر آ رہی ہے،

اُدب کی شمع بے اُدبی کی تند ہواؤں کے سامنے پھڑ پھڑا رہی ہے اور یہ پھڑ پھڑاہٹ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ میری لو ماند پڑ گئی تو ہر سو اندھیرا ہو جائے گا۔ اس عالم مایوسی میں کچھ تخلیق کار ایسے بھی ہیں جو اس شمع کو تند ہواؤں کے مقابل ٹھہرنے کی قوت و سکت بخشنے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ عظیم لوگ منضبط زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے افکار عالیات کے ذریعے معاشرے میں مثبت رویوں کو فروغ و ترقی دیں۔ ان تخلیق کاروں میں ایک شخص ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی ہیں جو معاشرے میں اعلیٰ وشان دار اخلاقی قدروں کے مالک ہیں۔ عصرِ حاضر میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن میدانِ اُدب میں سب سے کامیاب سوار ہیں جو گھوڑے کو سرپٹ اُدبی راہوں میں دوڑاتے ہوئے کامیابی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں اور ان کے گھوڑے کی ٹاپوں سے اٹھنے والی دھول بے اُدبی کو اپنے پاؤں تلے دباتی جا رہی ہے۔ اُدب کو نئی تازگی اور رنگ بخشنے میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت نے عصرِ حاضر میں بلاشبہ سب سے اہم کردار اُدا کیا ہے۔ عظیم محقق وادیب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے مفادات سے بالاتر ہو کر اُدب کی خدمت کرتے ہوئے ۲۵ سے زائد کتب مختلف موضوعات پر تحریر کیں اور ان کی ۲۵ سے زائد کتب ارباب دانش سے دادو تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی تصانیف کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ بیک وقت زندہ تخلیق کاروں اور مرحوم شعرا اور ادبا پر لکھتے ہیں اور انھیں متعارف کروانے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ وصف ایسا ہے کہ جس نے انھیں اُدبی حلقوں میں کمال کو پہنچا دیا اور مٹے ہوئے اُدب کو پختگی مل گئی۔ جہاں ایک جانب تو انھوں نے آلِ رضا، دبیر، سیف زلفی، قیصر بارہوی کی شخصیت وفن پر کئی کتابیں تخلیق کی ہیں وہاں انھوں نے اسلم کولسری، ڈاکٹر آغا سہیل اور وحید الحسن ہاشمی اور اسی قبیل کے کئی شعرا و اُدبا پر کتابیں اور مضامین سپرد قلم کیے ہیں۔ اسلم کولسری پر لکھی گئی کتاب نے بلاشبہ اسلم کولسری کو اُدب کے تمام حلقوں میں مکمل واقفیت بخشی اور یہ سہرا عظیم محقق وادیب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے سر جاتا ہے اس عالم رفتار میں جب ہر شخص مادہ پرستی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے اور ادیب بھی مادی اغراض کے لیے قلم کے فن کو مادیت کی دوکان پر گروی رکھ چکا ہے مگر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے فنِ قلم صحیح طور پر استعمال کیا ہے اور وہ شعرا جو گم نام تھے انھیں زینتِ بزم، رونقِ محفلِ اُدب بنا دیا ہے۔

عصرِ حاضر کے مخلص و عظیم محقق، نقاد، ادیب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے حال ہی میں اُردو کے معروف غزل گو، قصیدہ نگار اور مرثیہ نگار شاعر قیصر بارہوی کی شخصیت وفن پر دو گراں قدر کتب نذر قارئین کی ہیں۔ پہلی کتاب کا نام ''قیصرِ اقلیم مرثیہ'' ہے جس میں انھوں نے قیصر بارہوی کی شخصیت اور مرثیہ نگاری پر بحث کی ہے دوسری کتاب ''قیصر بارہوی کے مرثیے'' ہے جس میں انھوں نے قیصر بارہوی کے ۵۳ مرثیے یک جا کر دیے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں کتابیں قیصر شناسی اور قیصر فہمی کے لیے انتہائی مفید و اہم ثابت ہوں گی۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ متحرک رہتے ہیں کچھ نیا کرنے کا سوچتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ واقعی کچھ نیا کر گزرتے ہیں کہ ناقدین وقت بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

ایک ماہر محقق اور مستند نقاد ہیں اور پنجاب میں اُردو مرثیے کو فروغ دینے والوں میں انھیں ممتاز مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ مرحوم ادیبوں اور شعرا کی تخلیقات کو دستِ بردِ زمانہ سے بچائیں۔ وہ بہت حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے یہی اوصاف ہیں جن کی بدولت آج کے اَدب میں انھیں بلند و اعلیٰ مقام حاصل ہے اور وہ اَدب کے چمن کے لیے بہار کی مانند ہیں جن کی خوش طبعی سے پھول کھلتے جا رہے ہیں اور معاشرہ اَدب کی خوش بو کو پھر سے تر و تازہ محسوس کرنے لگا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کی شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کریں تا کہ یہ جوہرِ قابل اسی طرح شعر و اَدب کی خدمت کرتا رہے اور ان کی تخلیقات معاشرے کی سمت نمائی کرتی رہیں اور ان کا وجود شعر و اَدب کے گلشن کو مہکائے رکھے اور اس گلشن کو اتنی تازگی مل جائے کہ پھر خزاں کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

◆◆◆

maablib.org

معروف شاعر اور محقق۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے گفت گو

انٹرویو: اختر سعیدی

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن عصرِ حاضر کے معروف محقق اور نقاد ہیں۔ شعر و اَدب کے حوالے سے بھی اُن کی ایک شناخت ہے۔ وہ ایک علمی و اَدبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے دادا صفا الٰہ آبادی، تایا حبیبؔ جون پوری اور والد سید وحید الحسن ہاشمی شعری دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُردو تحقیق، تنقید اور تدریس میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں اپنی تحقیقی صلاحیتوں سے صاحبانِ علم و اُدب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ان کی بیس سے زیادہ تصنیفات و تالیفات شائع ہو کر اہلِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اُن کی اہم کتابوں میں مفاہیم (مقالات)، ترجیحات (مقالات)، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (مقالات)، تصریحات (مقالات)، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق)، باقیاتِ آلِ رضا (تدوین)، کلیاتِ حبیبؔ جون پوری (تدوین)، مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحیدؔ الحسن ہاشمی (تحقیق و تنقید)، آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت و فن)، جدید لہجے کا شاعر (سیف زلفیؔ)، العطش (سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین)، ''شام و سحر'' کی باتیں اور قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ۲۰ برس سے ماہ نامہ ''شام و سحر'' نکال رہے ہیں جو اَدبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے ہونے والی گفت گو کی تفصیلات نذرِ قارئین ہیں:

س: **کیا شخصیت کی تعمیر سازی میں اسلاف کا بھی کوئی کردار ہوتا ہے؟**

ج: میں ایک تہذیبی آدمی ہوں اور اسلاف کے کارناموں کو ہمیشہ معترف رہتا ہوں۔ معروف نقادوں کی

طرح میرا واضح موقف یہ ہے کہ شخصیت سازی میں وراثت، روایت اور انفرادیت کی ایک مثلث ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص انفرادیت کے بل بُوتے پر شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وقتی طور پر تو شاید اُسے شہرت نصیب ہو جائے، لیکن دیرپا عظمت اُسی وقت نصیب کا حصہ بنتی ہے، جب اسلاف کی عظمتیں بھی اُس پر سایہ فگن ہوں۔ میں اس سلسلے میں سب سے پہلے تو آپ کی خدمت میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا یہ شعر پیش کرنا چاہتا ہوں، جو میرے موقف کی بھرپور تائید کرے گا:

میں کچھ بھی نہیں فرحتؔ، اُس قوم کا ہوں، لیکن
فغفوروں کے سر جس نے، پیمانے بنا ڈالے

اس کے ساتھ ساتھ میں اس بات کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ محض اسلاف کے کارناموں پر فخر کر لینے سے کام نہیں بنتا، اگر حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اچھے اسلاف رکھنے کے باوجود گم راہ ہو گیا تو اس کا بنیادی سبب صرف اور صرف اُس کی انفرادی سطح تھی۔ اسی بات کو اَدبی تناظر میں یوں سمجھ لیجیے کہ ایک بڑا اور عظیم شاعر اسلاف کی روایات کا امین بھی ہوتا ہے، لیکن وہ اس میں اپنی انفرادیت کا جوہر بھی شامل کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک وراثت، روایت اور انفرادیت یک جانہ ہوں، اُس وقت تک کوئی بڑا شاعر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ بڑی شاعری۔

س: شعر و اَدب سے آپ نے کب سلسلہ قائم کیا؟

ج: جیسا کہ مَیں نے پہلے کہا کہ مَیں ایک علمی و اَدبی خانوادے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے دادا سیّد شبیر حسن صفا تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میرے والد سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی صاحب طرز شاعر اور مستند نثر نگار ہیں۔ میرے تایا حبیبؔ جون پوری صاحب دیوان شاعر ہیں اور آرزو لکھنوی کے براہِ راست شاگرد رہے ہیں۔ میرے دونوں بھائی سیّد نقاشؔ ہاشمی اور عرشؔی ہاشمی صاحب دیوان ہیں۔ اس صورتِ حال میں حرف سے ناتا خود بخود جڑ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے گھر میں شاعری میں گفت گو ہوتی ہے۔ والد صاحب سے شعری ذوق ورثے میں ملا۔ ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے میری شخصیت کی ترتیب و تہذیب میں اساسی کردار ادا کیا۔ ان دونوں اصحاب نے مجھے نثر کی جانب متوجہ کیا۔ مَیں نے سات برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا اور دس برس کی عمر سے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا۔ اس طرح اوائل عمر ہی سے حرف سے میرا ناتا قائم ہو گیا۔

س: کیا ہمارے معاشرے میں نقاد کی کوئی ضرورت ہے؟

ج: دو باتیں پیشِ نگاہ رکھنا ہوں گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تخلیق اور تنقید کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے بل کہ مَیں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ادیب یا شاعر پہلے نقاد ہوتا ہے، بعد میں تخلیق کار۔ اگر کسی تخلیق میں سے نقد

کا مادہ ختم کر دیا جائے تو تخلیق کی حیثیت کمزور ہی نہیں، بل کہ کم تر رہ جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تنقید اُدب کا فلسفہ ہوتی ہے، اگر کسی اُدبی محفل سے نقاد کی کرسی اُٹھا دی جائے تو شاعر یا ادیب کی تخلیق یک سطحی، بل کہ بے بوگل کی مانند ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر محفل اُدب میں صدر نشینی کا اعزاز نقاد ہی کو زیب دیتا ہے۔ تخلیق کے حُسن و قبح کے جتنے رویّوں کی نشان دہی با صلاحیت نقاد کر سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ ہمیں باکردار ناقدین کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔

س : **کیا عصرِ حاضر کے ناقدین اپنے فرائض صحیح طور پر اُدا کر رہے ہیں؟**

ج : جب روپے کی قدر میں کمی ہوتی ہے تو ہر چیز کی حیثیت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا آج کا سیاست دان اپنا فرض ادا کر رہا ہے......؟؟ اسی طرح آپ زندگی کے ہر معاملے پر غور و فکر کر سکتے ہیں۔ ایک بڑا نقاد بیک وقت دو کام کرتا ہے اولاً اسے تخلیق کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور دوم اسے اس تخلیق کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے اور اس کی حیثیت اور قدر کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ عصرِ حاضر میں ہر کام میں سہل پسندی ہے تاہم اچھے ناقدین کی بھی کمی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں ڈاکٹر وزیر آغا ایک با صلاحیت اور دانش مند نقاد ہیں۔ ان کی تخلیقات میں اوریجنل سوچ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بھی تنقید اور تخلیق کا حسین امتزاج تلاش کیا جا سکتا ہے۔

س : **آپ ماہ نامہ "شام و سحر" کے مدیر ہیں، بتایئے اس دور میں اُدبی رسالہ نکالنا اتنا مشکل کیوں ہو گیا ہے؟**

ج : ایک زمانہ تھا کہ اُدبی رسائل اپنی نوعیت اور اثرات کے اعتبار سے قابلِ توجہ بل کہ باعثِ رشک تھا۔ زمانے کی ناقدری کے باعث اب ہر ماہ نامہ سال نامہ کی شکل میں شائع ہوتا ہے۔ آپ یقین جانیے کہ رسالہ نکالنا ایک جہاد ہے۔ کاغذ کی گرانی، حکومت کی عدم توجہی، ڈاک کے محکمہ کی ہٹ دھرمی، اشاعت کے مسائل اور ادیبوں کی گروہ بندیوں نے اُدبی رسالے کا مستقبل مشکوک کر دیا ہے۔

س : **عصرِ حاضر میں اُردو غزل کے نمائندہ شاعر کون کون سے ہیں؟**

ج : اُردو غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے۔ اس صنف کی رنگا رنگی، وقعت اور ہمہ گیری سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا۔ ہر غزل گو نے اپنے ذوق اور مذاق کے باوصف اس صنف کو مالا مال کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ لمحۂ موجود میں جہاں ایک طرف جدید غزل کے علم بردار نظر آتے ہیں، وہاں دوسری جانب کلاسیکی شاعری کے وارث بھی نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک لمحہ موجود میں اُردو غزل کے چار معمار یہ ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان چاروں کے شعری ذائقے ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں...... شہزاد احمد، احمد فراز، ظفر اقبال، خالد احمد۔

س : **کیا آپ تحقیق کے موجودہ معیار سے مطمئن ہیں؟**

ج : ہمارے ہاں تحقیق کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں ہماری جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ہونے والی تحقیق ہے جس کا معیار انتہائی پست اور کمزور ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک ہی موضوع پر ہماری جامعات میں ایک ہی وقت میں مقالات منظور ہو جاتے ہیں۔ نقل شدہ پی ایچ ڈی کے مقالات جمع کرا کے ڈگریاں حاصل کر لی جاتی ہیں۔ اس صورت حال کے ذمہ دار ہمارے اساتذہ اور یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد ہیں۔ تحقیق کی دوسری صورت یہ ہے کہ اصحاب جلب منفعت سے دور رہ کر حق و سچ کی تلاش میں اپنی زندگیاں صرف کر دیتی ہیں۔ خدا زندگی عطا کرے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو کہ ان کے دم سے پاکستان میں تحقیق کا معیار قائم ہے۔ نوجوانوں میں تحقیق سے رغبت نہ ہونے کے برابر ہے۔ تحقیق جان کاہی کا عمل ہے اور اس کیلئے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ عصرِ حاضر میں محققین نہ ہونے کے برابر ہیں۔

س : آپ موجودہ مجموعی اَدبی صورت حال سے مطمئن ہیں؟

ج : موجودہ اَدب زوال آمادہ ہے۔ آپ عصرِ حاضر کی شاعری کا مطالعہ کیجیے۔ ہر شاعر کے شعر کے دونوں مصرعے دولخت ملیں گے۔ شاعرات کا حال تو اس سے بھی بدتر ہے۔ کئی شعری مجموعوں کی خالق ہونے کے باوجود وہ مشاعروں میں بے وزن اشعار بڑے دھڑلے سے پیش کر کے مبتدیوں سے داد وصول کرتی ہیں۔ نوجوان شعرا کا حال یہ ہے کہ وہ دھڑا دھڑ اپنے شعری مجموعے شائع کروا کے خود کو میر و غالب کا ہم پلہ تصور کر رہے ہیں۔ افسانوں اور ناولوں کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ سطحی تجربات کو سادہ زبان میں افسانے کی شکل دی جا رہی ہے اور ذاتی تجربات کو عشق کے نمک مرچ سے مالا مال کر کے ناول تخلیق کیے جا رہے ہیں۔ سفرناموں کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے ہوٹلوں کے بند کمروں میں بین الاقوامی سفر نامے تشکیل دیئے جا رہے ہیں۔ خدا بھلا کرے نثری نظم کا جسے کچھ نہیں آتا وہ نثری نظم کا بانی مبانی بن بیٹھا ہے۔ اس اَدبی صورت حال نے ہمارے اَدب کو تباہ حال کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت حال میں ہمیں اَدب کی نہیں بل کہ قاری کی ضرورت ہے۔ اچھا قاری اَدب سے منہ موڑ کر ڈائجسٹوں میں پناہ تلاش کر رہا ہے۔ اگر ہم نے معیاری اَدب تخلیق نہ کیا یقین جانیے کہ ہم علمی و اَدبی بحران میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ کم لکھیں گے لیکن معیاری لکھیں گے۔ اسی میں ہماری کامیابی ہے۔

س : موجودہ دَور میں اچھے اُستاد ناپید کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟

ج : آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہر شعبے سے ماہرین رفتہ رفتہ غائب ہو رہے ہیں۔ کیا اپنے تمام تر وسائل کے باوجود ہم آج تاج محل جیسی عمارت بنا سکتے ہیں؟ کیا جدید سہولتوں کے باوجود ہم میر جیسا شاعر پیدا کر سکتے ہیں؟ کیا داستانِ امیر حمزہ جیسی کتاب لکھی جا سکتی ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب نفی

میں ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں زندگی کا ہر شعبہ رُو بہ زوال ہے۔ پڑھانا ایک معزز پیشہ ہے، بل کہ یہ تو کارِ پیمبری ہے۔ آج کا اُستاد اپنے فرائض سے بھی غافل ہے اور حقوق سے بھی نا آشنا ہے۔ عصرِ حاضر میں اقبالؔ جیسا شاعر اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ میر حسنؔ جیسا اُستاد دستیاب نہیں ہے۔ آج کے دور میں اُستاد جن مسائل سے دوچار ہے۔ شاید اس سے پہلے کبھی نہ ہو۔ عارضی نوکری، ماحولیاتی دباؤ، غیر منطقی نصاب، طلبہ کی سیاسی چپقلشیں اور سب سے بڑھ کر ٹرانسفر کا خوف، یہ ایسے عوامل ہیں جنھوں نے اُستاد کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ اب تو اُستاد شاگردوں سے خوف کھاتے ہیں اور طالب علم یہ کہتے پھرتے ہیں کہ:

اہلِ اَدب سے طفل اب سیکھیں گے کیا بھلا سبق
روز نئی نئی کتب، روز نیا نیا سبق

س : آپ کے آئندہ منصوبے کیا ہیں؟

ج : ۲۰۰۶ء کے اوائل میں ان شا اللہ میری سات کتابیں شائع ہو جائیں گی، جن کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (تنقید)، جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تنقید)، ترغیبات (تحقیقی اور تنقیدی مضامین)، اوصاف (تحقیق اور تنقیدی مقالات)، طاہرینؑ (سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں، منقبتوں اور سلاموں کے مجموعے کی ترتیب وتدوین)، لکھنؤ کی اُردو شاعری (تحقیق وتنقید)، اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف (تحقیق وتنقید)، حروفِ بدن (شاعری)۔

س : کیا عصرِ حاضر میں اصلاحِ سخن کی روایت کی ضرورت ہے؟

ج : میں شاعری کو الہامی چیز تصور نہیں کرتا ہوں لیکن میرا پختہ یقین ہے کہ شاعری کے جراثیم انسان کے اندر پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ انسان اپنی کوشش اور کاوش سے شاعری کو جلا بخشتا ہے۔ شاعری کے لیے بے شمار مفید چیزوں میں سے ایک ''اچھے اُستاد'' کا دستیاب ہونا بھی ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعری میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنا مفید ہوتا ہے لیکن مشورے کے نام پر دوسروں کے شعری مال پر قبضہ کرنا کسی بھی صورت میں درست نہیں۔ اُردو میں اصلاحِ فن کی روایت بہت قدیم ہے۔ شاعری کی اصلاح کے لیے متشاعر اپنا کلام کسی مستند شاعر کی خدمت میں پیش کرتا تھا اور اُستاد کمالِ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے محاسن وعیوب پر روشنی ڈالتا تھا اور اصلاح کر کے سرخرو ہو جاتا تھا۔ شاگرد کے لیے سیکھنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ آہستہ آہستہ اس اصلاحِ فن کی روایت میں میرے مزاج کا دخل بھی شروع ہوا اور اصلاح کا بھی ایک خاص مزاج متعین ہونا شروع ہوا۔ اس کی بہترین مثال ''انیسیے'' اور ''دبیریے'' کی اصطلاح ہے۔

عصرِ حاضر میں نہ سیکھنے والے رہ گئے اور نہ سکھانے والے، ہر نوآموز کی تمنا ہوتی ہے کہ اُسے اُستاد کی ''دستِ کرم'' سے کچھ اشعار مل جائیں، تا کہ وہ مشاعرے کو گرما سکے۔ اُلٹا سیدھا لکھ کر اُستاد کی مہربانی سے شاعر بن جانے کی روایت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے، اب تو ''سادے کاغذ کی اصلاح'' کی اصطلاح رائج ہو چکی ہے۔ اب آپ خود بتائیے کہ ایسے شاعر کی عمر کیا ہوگی، جو دوسروں کے کلام پر زندہ ہے۔ میرے نزدیک ایسے اُستاد اور شاگرد دونوں لائقِ تعزیر ہیں۔ کلام کی اصلاح کوئی بُری چیز نہیں، لیکن بغیر کلام کے اصلاح باعثِ استعجاب ہے۔

س: کیا آپ موجودہ تنقیدی رویوں سے مطمئن ہیں؟

ج: تنقید کارِ طفلاں نہیں۔ میرے خیال میں مبصر، محقق، صحافی، انشاء پرداز اور نقاد میں فرق ہوتا ہے۔ نقاد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت تخلیق کے محاسن وعیوب پر نگاہ رکھے۔ عصرِ حاضر کی تنقید، یا تو تحسین بے جا ہے، یا کسی برہمی کا نتیجہ۔ خاص طور پر ممدوح کے سامنے تقاریب میں پڑھے جانے والے مضامین کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ موجودہ عہد میں تنقید تو لکھی جا رہی ہے لیکن معتبر تنقید کم ملتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوان ناقدین تخلیق کے بطون میں موجود حقائق دریافت کریں اور تحریر کے حُسن وقبح پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کا حقیقی مرتبہ متعین کرنے کی بلیغ سعی کریں۔ اگر ہم نے یہ طریقہ نہ اپنایا، تو آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔

س: آپ نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: نئی نسل کو فخر کرنا چاہیے کہ ان کے آباؤ اجداد نے ان کے لیے بہترین ذرائع فراہم کر دیے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ نئی نسل اجداد کے ورثے کے تحفظ اور فروغ کے لیے اپنی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ نیا زمانہ بین الاقوامی مقابلے کا ہے۔ اگر ہم نے بدلتے ہوئے حالات کو مدِ نظر نہ رکھا، تو ہم جدید دنیا سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ ہمیں محنت اور ہمت سے کام لینا چاہیے۔

(جنگ مڈ ویک میگزین، ۱۱ جنوری ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

madlib.org

ڈاکٹر شبیہ الحسن سے بات چیت

انٹرویو: سلیم احسن شیخ

◆◆

علم شخصیت کو جلا، صلاحیتوں کو روشنی، شعور کو نئی منزلیں عطا کرتا ہے، اسی کی بدولت آج انسان دنیا دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ آسمان کی وسعتوں کو بھی اپنے دو ہاتھوں میں سمیٹنے کی سعی کر رہا ہے۔ یہ علم ہی ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں ہے، کائنات میں چھپے ہزاروں راز قدرت کی عطا کردہ لاکھوں عنائتیں حاصل کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے علم، اسی لیے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید نازل کیا تو پہلی وحی یہی نازل کی "کہ پڑھ اپنے رب کے نام سے" اللہ تعالیٰ نے زمین کے حقائق اور آسمان کے رازوں کے متعلق تمام پیغمبروں کو بتایا مگر علم کا مینارہ صرف نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی بنایا، اسی لیے وہ مسلمانوں پر حصول علم کے لیے زور دیتے رہے، انھوں نے فرمایا کہ "علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین جانا پڑے"۔ ایک وہ وقت تھا جب مسلمانوں میں علم کے حصول پر بہت توجہ دی جاتی تھی اس دور میں بڑے بڑے سائنس دان اور قابل لوگ پیدا ہوئے، یہ وہ دور تھا جب پوری دنیا میں مسلمانوں کا نام اور مقام تھا لیکن جوں جوں مسلمان علم سے دور ہوتے گئے ان کے نام اور مقام میں کمی آتی گئی، آج یہ صورت حال ہے کہ علم سے دوری کی وجہ سے دنیا بھر میں مسلمانوں کو بُرے لفظوں سے یاد کیا جاتا ہے انھیں کم تر اور پس ماندہ سمجھا جاتا ہے، اس کی وجہ صرف علم کی کمی ہے اگر وہ علم سے دور نہ ہوتے تو آج مسلم دنیا عالمی طاقت ہوتی۔

تعلیمی حوالے سے معلومات حاصل کرنے نکلا تو میری ملاقات ماہر تعلیم، عالمی اَدبی کونسل کے صدر اور پیک سلوشن (Peak Solutions) کے بانی ڈاکٹر شبیہ الحسن سے ہوگئی جن کا شمار ان اہلِ دانش میں ہوتا ہے جنھوں نے بیک وقت تعلیم و تعلم، اَدب، صحافت اور شاعری کو اپنی پہچان کا ذریعہ بنایا۔ ایک خالص علمی اور مذہبی گھرانے سے تعلق کی بنا پر علمی اور اَدبی ذوق انھوں نے ورثے میں پایا اور اپنی محنت، ریاضت اور لگن کی بنا پر اسے عروج کمال تک پہنچایا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے اُستاد ہیں۔ انھوں نے روایتی تدریس کے طریقوں سے الگ اپنے لیے ایک

نئی راہ نکالی جس میں طالب علم کے لیے نصابی سطح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید فکر و فلسفے سے اکتساب کا سامان بھی موجود ہے۔ اُردو اَدب کی کلاسیکی روایت کے باوصف عالمی اَدب میں رونما ہونے والے جدید رجحانات اور ان کے اثرات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ وہ مختلف زبانوں کے اَدب کے تقابلی مطالعے کے ہنر سے واقف ہیں اور اس مطالعے کی روشنی میں نئے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

انھوں نے اپنی صحافتی وابستگی کو بھی اَدب سے مربوط کر رکھا ہے۔ ایک اَدبی جریدے ماہ نامہ 'شام وسحر' کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے انھوں نے جہاں مختصر اداریے کے ذریعے بھرپور بات کہنے کا طریق استعمال کیا وہاں مضامین کے انتخاب میں کڑا معیار قائم کر کے معیاری اَدب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے نزدیک اَدبی دھڑے بندیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اچھا لکھنے والا کوئی بھی ہو، ان کے پرچے میں آسانی کے ساتھ چھپ سکتا ہے۔

وہ شاعری کے جملہ رموز سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی تربیت ہی شاعرانہ ماحول میں ہوئی ان کے والد گرامی اُستاذ الشعرا سید وحید الحسن ہاشمی صاحب موجودہ دور کے ایک بلند پایہ مرثیہ گو، سلام نگار اور غزل گو ہیں چناں چہ انھوں نے بھی سلام اور غزل میں طبع آزمائی کی ہے اور بے شمار غزلیں اور سلام کہے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنے کسی ایک اَدبی کارنامے پر خوش ہو کر داد و تحسین کے انتظار میں نہیں رہتے بل کہ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کام میں سرگرم ہو کر خود کو ایک تسلسل کے ساتھ متحرک رکھتے ہیں اور یوں ہر آن ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ انھوں نے اَدبی سطح پر جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے وہ ان کی بے پایاں محنت اور ریاضت کا حاصل ہے۔ تلاش و جستجو کی اُمنگ سینے میں بیدار رکھنے والے ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنی بات کہنے اور اسے منطقی نتیجے پر پہنچانے کے ڈھنگ سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان سے کی گئی گفت گو زیر نظر ہے:

س : ڈاکٹر صاحب آپ کو پیک سلوشن (Peak Solutions) تعلیمی ادارہ بنانے کا شوق و خیال کیوں کر پیدا ہوا؟

ج : پس ماندہ علاقوں کے ایسے طلبا و طالبات جو Talented تو ہیں لیکن مالی طور پر اتنے کمزور ہیں کہ وہ تکنیکی اور IT کی تعلیم سے محروم رہ رہے ہیں ان کی حالت دیکھ کر مجھے بے حد دُکھ ہوتا تھا تو میں نے صدر کے پس ماندہ علاقے کا انتخاب کیا اور یہ ادارہ پیک سلوشن عزّی ہاشمی صاحب کے تعاون سے قائم کیا۔ اس ادارہ کی تشکیل کا مقصد تکنیکی تعلیم اور IT کو مڈل کلاس طلبا و طالبات میں مؤثر فروغ دینا ہے۔

س : علاقے کے لوگوں کا کیا ردِعمل ہے آیا وہ تعاون کر رہے ہیں؟

ج : اس علاقے میں اس سے پیشتر کوئی اس طرز کا انسٹی ٹیوٹ نہ تھا جہاں بچوں کو انتہائی کم فیس پر تکنیکی تعلیم دی جا رہی ہو۔ علاقے کے لوگوں کا ہم سے پورا تعاون ہے۔ لوگ بچوں کے مستقبل سے مطمئن ہیں نہ صرف

ہمیں ستائیشی پیغام بھجواتے ہیں بل کہ دعائیں دے رہے ہیں کہ ہمارے اس مستحسن اقدام سے ان کے بچوں کا مستقبل تاریک ہونے سے بچ گیا۔

س : آپ کن کن شعبوں میں بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں؟

ج : ہمارے ہاں شارٹ کورسز، کمپیوٹر سائنس، فیشن و ٹیکسٹائل ڈیزائننگ، آئی کام، بی کام اور ڈگری کلاسز، ایم اے انگلش و ایم اے اکنامکس کی تعلیم کا باقاعدہ اہتمام ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب آپ کے ادارہ کی فیس کا دوسرے اداروں سے کتنا فرق ہے؟

ج : ہمارے ہاں دوسرے اداروں کی نسبت بہت کم فیس ہے جو ادارے ۱۲,۰۰۰ روپے فیس لے رہے ہیں ہم نے ان سے بہتر ٹیوشن، پریکٹیکل اور تعلیمی ماحول و سرگرمیاں مہیا کر کے ۳,۰۰۰ روپے فیس لے رہے ہیں۔ اس سے فرق صاف ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے ہمارے ادارے کامیابی سے چل رہے ہیں۔

س : ڈاکٹر صاحب صدر کے علاوہ بھی کوئی کیمپس ہے اور کتنے طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟

ج : جی ہاں! ہمارے تین کیمپس بن چکے ہیں۔ صدر کے بعد دوسرا کیمپس مغل پورہ برلب نہر تاج پورہ سکیم کے پاس ہے اور تیسرا لوئر مال نزد سیکریٹریٹ ہے۔ ہمارے ہر کیمپس میں ایک ہزار کے لگ بھگ طلبا و طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

س : کیا آپ کے اداروں سے فارغ التحصیل طلبا کو با آسانی Job مل جاتی ہے؟

ج : ہمارے ہاں کے فارغ التحصیل بچوں، بچیوں کو ادارے کی اچھی کارکردگی، نیک نامی اور شہرت کی وجہ سے نہ صرف حکومتی اداروں میں پذیرائی ملی ہے بل کہ معروف پرائیویٹ کمپنیوں اور انسٹی ٹیوشن میں بھی انھیں معقول تنخواہوں پر Jobs مل رہی ہیں۔ ہمارے ادارے کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے حکومتی اور نیم حکومتی و پرائیویٹ ادارے اپنے ملازمین کو Skill کورسز کروانے کے لیے ہمارے ادارے میں بھجوا رہے ہیں جن میں واپڈا، پاکستان منٹ، UBL، MCB، پاکستان رینجرز اور سول سیکرٹریٹ شامل ہیں۔

س : ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ آپ کے ہاں تعلیم کے علاوہ طلبا و طالبات کے کیا مشاغل اور سرگرمیاں ہیں؟

ج : شیخ صاحب! ہم بچوں کی ذہنی نشوونما بہتر کرنے اور تہذیب و ثقافت میں دل چسپی پیدا کرنے کے لیے مختلف مواقع پر بڑی نوعیت کے فنکشن کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ربیع الاول کے مہینے میں نعت خوانی، ۱۴؍ اگست جشنِ آزادی کے حوالے سے گرینڈ میوزیکل پروگرام، بچوں کی تعلیم اور دیگر اُمور میں اچھی کارکردگی پر میڈل ایوارڈز اور دیگر انعامات دینے کے لیے ٹیلنٹ ایوارڈ شو کا انعقاد کرواتے ہیں۔

س : ڈاکٹر صاحب آپ کی مستقبل کی پلاننگ کیا ہے؟

ج : میری خواہش ہے کہ اس وطنِ عزیز کا کوئی نوجوان ناخواندہ نہ ہو اس لیے کوشش کر رہا ہوں کہ لاہور کی ہر

پس ماندہ آبادی میں تعلیمی ادارہ کھولوں تاکہ غریب اور سفید پوش لوگ اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر سکیں۔ وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی بھی اس سلسلے میں کافی متحرک ہیں کہ پنجاب کے پس ماندہ علاقوں میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے کھولے جائیں اور پنجاب کا ہر بچہ سکول جائے اور تعلیم حاصل کرے۔ اس طرح ہم حکومتی پالیسی کو کامیاب کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔

س : ڈاکٹر صاحب پاکستان میں معیار تعلیم دن بدن گھٹتا کیوں جا رہا ہے؟

ج : جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان اور بھارت ایک ساتھ آزاد ہوئے لیکن حقائق پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت تعلیمی میدان پر توجہ دے کر عالمی طاقتوں کے برابر جا بیٹھنے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے جب کہ پاکستان آج بھی اپنا وجود تسلیم کرانے کی کوششوں میں ہے۔ بھارت کی آبادی پاکستان کی نسبت بہت زیادہ ہے لیکن پاکستان اس کے لٹریسی ریٹ تک آئندہ دس سال تک نہیں پہنچ سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں ۵ دہائی سے غریب عوام کو لوٹ کر کھانے والوں نے تعلیم کو بھی نہیں بخشا اور اس میں بھی کرپشن کا زہر اتنا زیادہ بھر دیا ہے کہ اس نے علم کی جڑوں کو ہی کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن موجودہ حکومت خاص طور پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب پرویز الٰہی کی تمام تر توجہ چوں کہ تعلیم کی طرف ہے۔ جس سے کافی بہتری کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب یہ بتائیں کہ کیا نظام تعلیم کی خرابی ہے جو معیار تعلیم ناقص ہے؟

ج : جناب آج پاکستان میں ۴ طرح کے تعلیمی نظام رائج ہیں۔ ایک امیر طبقے کے لیے، دوسرا اپر مڈل، تیسرا مڈل اور چوتھا لوئر مڈل کلاس کے لیے۔ ان چاروں نظاموں کا معیار سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ آج کل معیار کا تعین فیسوں سے ہوتا ہے۔ جس تعلیمی ادارہ کی فیس سب سے زیادہ ہوا سے سب سے معیاری اور جس کی فیس سب سے کم ہو غیر معیاری تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے، اداس لہجے میں کہا شیخ صاحب یہ تو دل دُکھانے والا موضوع ہے کہ جس پر جتنا چاہے بولو جتنا چاہے سوچو کم ہے۔ لیکن یہ بہر حال افسوس ناک ہے کہ پاکستان پہلا ترقی پذیر ملک ہے جہاں تعلیم کے لیے صرف تین فی صد بجٹ مختص کیا جاتا رہا ہے۔ اب جو کئی طرح کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے منظر عام پر آ رہے ہیں ان میں سے اکثر انتہائی غیر معیاری ہیں اور ان کا مقصد صرف اور صرف نوٹ چھاپنا ہے حکومت کو اس طرف ضرور توجہ دینا چاہیے ورنہ تعلیم بھی ایک انڈسٹری کا روپ دھار لے گی۔

س : ڈاکٹر صاحب آپ اپنے تجربہ کی بنا پر بتائیں کہ پاکستان میں معیار تعلیم کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے؟

ج : شیخ صاحب! کسی بھی نظام کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کڑی نظر رکھی جائے۔ پاکستان میں معیار تعلیم اچھا نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ اگر کرپشن ہے تو دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اداروں پر کوئی

چیک نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں ایسی باڈیز تشکیل دی جاتی ہیں جو خود مختار ہوتی ہیں ہر تعلیمی ادارہ کی براہِ راست انسپکشن سے مالکان کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اس لیے انھیں ہر حال میں اپنے ادارے کا تعلیمی معیار بلند کرنا ہی ہوتا ہے۔ میری رائے ہے کہ کوالیفائیڈ یعنی بی ایڈ، ایم ایڈ یا ماسٹر کی ڈگری رکھنے والوں کے علاوہ کسی ایرے غیرے کو تعلیمی ادارہ کھولنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تعلیم کا کوالٹی سسٹم بہتر بنانے کے لیے پریشر گروپس بنائے جائیں اس وقت حالت یہ ہے کہ بی ایس سی یا ایم ایس سی پاس کرنے والے طلبا میں بھی اعتماد کا فقدان ہے۔ یہاں اس وقت یہ صورت حال ہے کہ نالج ہے مگر اعتماد نہیں جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں نالج ہو یا نہ ہو اعتماد ضرور ہوتا ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب آخری سوال ہے کہ نظام تعلیم کس طرح بہتر بنایا جاسکتا ہے؟

ج : نمبر ا تو یہ کہ تعلیمی اداروں پر سخت چیک رکھا جائے تا کہ کوئی بھی پیسہ کمانے کے لیے تعلیمی ادارہ کو انڈسٹری نہ بنا سکے۔ نمبر ۲ تعلیمی حکام سے درخواست کروں گا کہ اگر آپ اپنا نظام تعلیم نہیں بنا سکتے تو امریکا یا برطانیہ کا نظام دیکھ کر اسے اپنا کرلیں اگر بلدیاتی نظام کاپی کیا جاسکتا ہے تو تعلیمی نظام کاپی کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ باہر کے لوگوں سے مل کر نظامِ تعلیم میں بہت بہتری لائی جاسکتی ہے۔ ایک اور اہم بات کہنا چاہوں گا کہ تعلیمی شعبہ میں فنڈنگ دی جائے۔ نمبر ۳ ہر کسی کو سکول، کالج کھولنے کی اجازت نہ دی جائے ان کے لیے باقاعدہ اجازت نامہ کا حصول لازم کیا جائے۔ اور اس کے لیے طریقہ کار وضع ہونا ضروری ہے۔ نمبر ۴ ہر تعلیمی ادارہ کی سال میں کم از کم ۳ بار انسپکشن لازم بنائی جائے۔

آخری بات یہ ہے کہ ہر تعلیمی ادارہ کو Written Procedure دیا جائے۔ تمام اداروں اور ان کی برانچوں میں ایک ہی Procedure ہو اور اسی کے تحت ٹیچرز کو کنٹرول کیا جائے۔

س : ڈاکٹر صاحب کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟

ج : کسی بھی ملک کی ترقی وخوش حالی اور استحکام میں پڑھے لکھے نوجوانوں کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے اس لیے اقبالؔ نے بھی ہمیشہ نوجوانوں کو ہی مخاطب کر کے کوئی پیغام دیا ہے، جیسا کہ :

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں، تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اور پھر نوجوانوں سے متعلق ہی کہا کہ :

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

میں بھی نوجوانوں سے ہی کہوں گا کہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے جو ہمیں کثیر قربانیاں دینے کے عوض ملی

ہے۔ قائداعظم کی اس امانت پاکستان کی حفاظت تمہارے ذمے ہے اور تم تبھی اس فرض کو نبھا سکتے ہو اگر زمانے کی دوڑ میں آگے نکلو اور یہ تبھی ممکن ہے کہ تم تکنیکی علوم سے لیس ہو جاؤ۔

قائداعظم کا خواب ''پڑھا لکھا پاکستان'' اور وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی کا خواب ''پڑھا لکھا پنجاب'' اور اس خواب کی تعبیر آج کا نوجوان۔

آخر میں حکومتِ پاکستان اور خاص طور پر حکومت پنجاب کو دست بدستہ درخواست کروں گا کہ خدارا! تعلیمی اداروں کو چیک کے ذریعے کرپشن سے پاک کریں اور خصوصی توجہ سے مضبوط و مستحکم بنائیں تاکہ یہاں سے فارغ التحصیل آج کے نوجوان کل کے جناح اور پرویز مشرف ہوں۔

(ہفت روزہ 'نئی آوازیں' لاہور، یکم اکتوبر تا ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی باتیں

نوائے وقت رپورٹ

◆◆

اُردو میں تحقیق، تنقید اور تدریس میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں اپنی تحقیقی بالغ نظری کے باعث شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی بیس سے زیادہ تصنیفات و تالیفات شایع ہو کر اہلِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ معروف تصنیفات و تالیفات میں مفاہیم (مقالات)، ترجیحات (مقالات)، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (مقالات)، تصریحات (مقالات)، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق)، باقیاتِ آلِ رضا (تدوین)، کلیاتِ حبیبؔ جون پوری (تدوین)، مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی (تحقیق و تنقید)، آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت و فن)، جدید لہجے کا شاعر (سیف زلفیؔ)، العطش (سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین)، ''شام و سحر'' کی باتیں اور قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ۲۰ برس سے ماہ نامہ ''شام و سحر'' نکال رہے ہیں جو اَدبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے ہونے والی گفت گو کی تفصیلات نذرِ قارئین ہیں:

س: حرف سے ناتا کب اور کیسے جڑا......؟؟

ج: آپ جانتے ہیں کہ میں ایک علمی و اَدبی خانوادے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے دادا سیّد شبیر حسن صفاؔ زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میرے والد سیّد وحیدؔ الحسن ہاشمی صاحب طرز شاعر اور مستند نثر نگار میرے تایا حبیبؔ جون پوری صاحبِ دیوان شاعر ہیں اور آرزوؔ لکھنوی کے براہِ راست شاگرد ہیں۔ میرے دونوں بھائی سیّد نقاشؔ ہاشمی اور عرفیؔ ہاشمی صاحبِ دیوان ہیں۔ اس صورتِ حال میں

سے ناتا خود بخود جڑ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے گھر میں شاعری میں گفت گو ہوتی ہے۔ والد صاحب سے شعری ذوق ورثے میں ملا۔ ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے میری شخصیت کی ترتیب و تہذیب میں اساسی کردار اَدا کیا۔ ان دونوں اصحاب نے مجھے نثر کی جانب متوجہ کیا۔ میں نے سات برس کی عمر سے لکھنا شروع کیا اور دس برس کی عمر سے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا۔ اس طرح اوائل عمری سے حرف سے میرا ناتا قائم ہوگیا۔

س : **ایک صاحب کا کہنا ہے کہ ''محفلِ اَدب سے نقاد کی کرسی اُٹھا دی جائے تو بہتر ہے''...... اس سلسلے میں آپ کا کیا موقف ہے؟**

ج : دو باتیں پیشِ نگاہ رکھنا ہوں گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تخلیق اور تنقید کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے بل کہ مَیں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ادیب یا شاعر پہلے نقاد ہوتا ہے بعد میں تخلیق کار۔ اگر کسی تخلیق میں سے نقد کا مادہ ختم کر دیا جائے تو تخلیق کی حیثیت کمزور ہی نہیں بل کہ کم تر رہ جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تنقید اَدب کا فلسفہ ہوتی ہے۔ اگر کسی اَدبی محفل سے نقاد کی کرسی اُٹھا دی جائے تو شاعر یا ادیب کی تخلیق یک سطحی بل کہ بے بوگل کی مانند ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر محفلِ اَدب میں صدر نشینی کا اعزاز نقاد ہی کو زیب دیتا ہے۔ تخلیق کے حُسن و قبح کے جتنے رویوں کی نشان دہی باصلاحیت نقاد کر سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ ہمیں باکردار ناقدین کی ہمت افزائی کرنا چاہیے۔

س : **کیا عصرِ حاضر کے ناقدین اَدبی صورتِ حال کے صحیح عکاس ہیں؟**

ج : جب روپے کی قدر میں کمی ہوتی ہے تو ہر چیز کی حیثیت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اب میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا آج کا سیاست دان اپنا فرض اَدا کر رہا ہے......؟؟ اسی طرح آپ زندگی کے ہر معاملے پر غور و فکر کر سکتے ہیں۔ ایک بڑا نقاد بیک وقت دو کام کرتا ہے اولاً اسے تخلیق کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور دوم اسے اس تخلیق کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے اور اس کی حیثیت اور قدر کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ عصرِ حاضر میں ہر کام میں سہل پسندی ہے تاہم اچھے ناقدین کی بھی کمی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں ڈاکٹر وزیر آغا ایک باصلاحیت اور دانش مند نقاد ہیں۔ ان کی تخلیقات میں اوریجنل سوچ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بھی تنقید اور تخلیق کا حسین امتزاج تلاش کیا جا سکتا ہے۔

س : **ماہ نامہ ''شام و سحر'' کے مدیر کی حیثیت سے بتایئے کہ اس دَور میں اَدبی رسالہ نکالنا اتنا مشکل کیوں ہو گیا ہے؟**

ج : ایک زمانہ تھا کہ اَدبی رسائل اپنی نوعیت اور اثرات کے اعتبار سے قابلِ توجہ بل کہ باعثِ رشک تھا۔ زمانے کی ناقدری کے باعث اب ہر ماہ نامہ سال نامہ کی شکل میں شائع ہوتا ہے۔ آپ یقین جانیے کہ

رسالہ نکالنا ایک جہاد ہے۔ کاغذ کی گرانی، حکومت کی عدم توجہی، ڈاک کے محکمہ کی ہٹ دھرمی، اشاعت کے مسائل اور ادیبوں کی گروہ بندیوں نے اَدبی رسالے کا مستقبل مشکوک کر دیا ہے۔

س : لمحۂ موجود میں اُردو غزل کے چار نمائندہ شاعر کون کون سے ہیں؟؟

ج : اُردو غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے۔ اس صنف کی رنگارنگی، وقعت اور ہمہ گیری سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا۔ ہر غزل گو نے اپنے ذوق اور مذاق کے باوصف اس صنف کو مالا مال کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ لمحۂ موجود میں جہاں ایک طرف جدید غزل کے علم بردار نظر آتے ہیں، وہاں دوسری جانب کلاسیکی شاعری کے وارث بھی نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک لمحہ موجود میں اُردو غزل کے چار معمار یہ ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان چاروں کے شعری ذائقے ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں...... شہزاد احمد، احمد فراز، ظفر اقبال، خالد احمد۔

س : آپ تحقیق کے موجودہ معیار سے مطمئن ہیں؟

ج : ہمارے ہاں تحقیق کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں ہماری جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر ہونے والی تحقیق ہے جس کا معیار انتہائی پست اور کمزور ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک ہی موضوع پر ہماری جامعات میں ایک ہی وقت میں مقالات منظور ہو جاتے ہیں۔ نقل شدہ پی ایچ ڈی کے مقالات جمع کرا کے ڈگریاں حاصل کر لی جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہمارے اساتذہ اور یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد ہیں۔ تحقیق کی دوسری صورت یہ ہے کہ اصحاب جلب منفعت سے دور رہ کر حق و سچ کی تلاش میں اپنی زندگیاں صَرف کر دیتی ہیں۔ خدا زندگی عطا کرے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو کہ ان کے دم سے پاکستان میں تحقیق کا معیار قائم ہے۔ نوجوانوں میں تحقیق سے رغبت نہ ہونے کے برابر ہے۔ تحقیق جان کاہی کا عمل ہے اور اس کے لیے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ عصرِ حاضر میں محققین نہ ہونے کے برابر ہیں۔

س : آپ موجودہ مجموعی اَدبی صورتِ حال سے مطمئن ہیں؟

ج : موجودہ اُدب زوال آمادہ ہے۔ آپ عصرِ حاضر کی شاعری کا مطالعہ کیجیے۔ ہر شاعر کے شعر کے دونوں مصرے دولخت ملیں گے۔ شاعرات کا حال تو اس سے بھی بدتر ہے۔ کئی شعری مجموعوں کی خالق ہونے کے باوجود وہ مشاعروں میں بے وزن اشعار بڑے دھڑلے سے پیش کر کے مبتدیوں سے داد وصول کرتی ہیں۔ نوجوان شعرا کا حال یہ ہے کہ وہ دھڑا دھڑ اپنے شعری مجموعے شایع کروا کے خود کو میرؔ و غالبؔ کا ہم پلہ تصور کر رہے ہیں۔ افسانوں اور ناولوں کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ سطحی تجربات کو سادہ زبان میں افسانے کی شکل دی جا رہی ہے اور ذاتی تجربات کو عشق کے نمک مرچ سے مالا مال کر کے ناول تخلیق

کیے جا رہے ہیں۔ سفرناموں کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے ہوٹلوں کے بند کمروں میں بین الاقوامی سفر نامے تشکیل دیئے جا رہے ہیں۔ خدا بھلا کرے نثری نظم کا جسے کچھ نہیں آتا وہ نثری نظم کا بانی مبانی بن بیٹھا ہے۔ اس اَدبی صورت حال نے ہمارے اَدب کو تباہ حال کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت حال میں ہمیں اَدب کی نہیں بل کہ قاری کی ضرورت ہے۔ اچھا قاری اَدب سے منھ موڑ کر ڈائجسٹوں میں پناہ تلاش کر رہا ہے۔ اگر ہم نے معیاری اَدب تخلیق نہ کیا یقین جانیے کہ ہم علمی و اَدبی بحران میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ کم لکھیں گے لیکن معیاری لکھیں گے۔ اسی میں ہماری کامیابی ہے۔

(روزنامہ ''نوائے وقت'' ۲۰ مئی ۲۰۰۵ء)

◆◆◆

محقق اعظم ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر خیال امروہوی

◆◆

سب سے پہلے راقم کو محمد آصف وٹو صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ موصوف نے سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت علمی نقد و نظر کی مختلف جہتوں پر کمال ژرف نگاہی سے ناواقفانِ اَدب و تنقید سے روشناس کرایا، پھر ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی ظہر (عقب) کتاب پر بالغ رائے کو بھی سلام کرنا چاہیے کہ سلیم اختر صاحب نے وحید العصر سید وحید الحسن ہاشمی سے لے کر شبیہ الحسن کے طرز ادقام و رنگ ترقیم پر ربع صدی سے اپنی ہمہ جہت آراء سے جہانِ اَدب کو منور کیا۔

اَدب اور تنقید ایک زاویہ نظر کے توام علمی اجزاء ہیں۔ اَدب خود تنقید ہوتا ہے اور تنقید فی نفسہ اَدب ہی کہلاتی ہے۔ شبیہ الحسن بے پناہ صاحب مطالعہ اہلِ فکر و قلم ہیں۔ گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ خاموشی کے ساتھ تخلیقی گہرہائے آب دار ڈھونڈ لاتے ہیں۔ جناب محمد آصف وٹو نے زیرِ نظر اپنی بالغ تصنیف و تالیف میں شبیہ الحسن کی خدمات کے اجزاء کو نہایت مستند اور دقتِ نظر کے ساتھ جمع کیا۔ اس طرح شبیہ الحسن کا علمی عکس مبارک لفظوں کے آئینوں میں ہمیشہ جھلملاتا رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصی اور علمی خصوصیت یہ بھی ہے کہ موصوف نے مدرسہ فوقانیہ (ہائی سکول) سے تا دانشگاہ پنجاب اپنا وقت ضائع نہیں کیا بل کہ اپنی عالی ہمتی سے معروف و غیر معروف کو ملک کی علمی کارگاہوں میں روشناس کرایا۔ فنِ تنقید کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جس موضوع پر نقاد قلم اٹھاتا ہے سب سے پہلے، رُوحِ عصر کو جانچتا، پرکھتا ہے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ تمدنی شکست و ریخت میں تخلیق کار کے لفظی کارہائے نمایاں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات میں سب سے اہم بات جذبہ تعمیر ملت، ارتقائے شعور ہے، ظاہر ہے کہ وطن سے محبت ملی شعور کی سربلندی، زبان و بیان کی رافت، شہامت وغیرہ ہی اَدبی تنقید کا حصہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے مولائے کائنات کے حوالے سے اپنے والد ماجد کی جس قدر عظیم رثائی خدمت کی، ''العطش'' جیسے مجموعے میں اپنے والد ماجد (انیسؔ و دبیرؔ) ثانی کی

جتنی ناقدانہ خدمت انجام دی یہ ان کی دعاؤں کی تاثیر ہے کہ آج شبیہ الحسن کا ہر طرف چراغ علم وفن اپنی روشنی سے ظلمات جہل کو منور کر رہا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ ماشاء اللہ اتنی کم عمری میں درجنوں کتابیں، صدہا مقالات، ہزاروں اشعار کہے۔ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کی رحمت، آئمہ اطہار کی شفقت و عنایات اور ان کے والدین کا نتیجہ ہی ہے جس کے لیے دنیائے علم وادب ہمیشہ ممنون رہے گی۔

جناب محمد آصف ڈٹو نے زیرِ نظر کتاب بعنوان 'ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات' تحقیق وتلاش کی نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ اس کتاب میں اب تک جن اربابِ علم وتحقیق وتنقید نے شبیہ الحسن کی فکری معرکہ آرائیوں پر اظہارِ خیال کیا وہ کئی ڈاکٹریٹ کا Synopsis ہیں۔ شبیہ الحسن کے جدید تنقیدی رجحانات، کلاسیکی طرزِ تنقید سے ایک ایسے طرزِ تحریر کے حامل ہیں کہ اگر ان سب کو دنیا کی معروف اور بڑی زبانوں میں منتقل کیا جائے تو پورا یورپ مستفید ہو سکتا ہے۔

موصوف کے تنقیدی رجحانات مزید بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں سچائی کی تلاش مسلسل جاری رہتی ہے۔ ظاہر واقعہ کربلا نے علامتوں، استعاروں کو جس قدر مالا مال کیا ہے۔ اس لحاظ سے سچائی ہی ایک ایسی لازمی شے ہے جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اسالیب بیان میں خواہ مرثیہ ہو، سلام ہو یا نوحہ، کوئی صنف بھی ایسی نہیں جس میں افراط وتفریط یا دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہو جہاں تک منظر نگاری کا تعلق ہے یہ ذاتی عقیدت اور اپج پر منحصر ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے محض مذہبیت کے حوالے سے رثائی تخلیقات پر ہی ہر کام نہیں کیا بل کہ خالص اَدبی رجحانات بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہمہ وقتی صاحب مطالعہ اور صاحب خامہ عنبر شامہ کے حامل محقق، ادیب وشاعر ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جن نامور اہلِ تحقیق نے ڈاکٹر صاحب کی علمی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے قلم فرسائی کی ہے وہ اپنی جگہ دائرہ المعارف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اہلِ دانش کی جانب سے اعتراف، مدح، موقتی نہیں ہے بل کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی محنت کی توصیف ہے۔ یہ توصیف بھی تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تنقید کیا ہے، کیسی ہونی چاہیے۔ اس کا معیار کیا ہے کیوں ہے۔ کیوں کر ہونا چاہیے۔ یہ الگ موضوع ہے فی الحال جناب ڈاکٹر شبیہ الحسن کی خدمت میں نیازمندانہ مبارک باد اور جناب محمد آصف ڈٹو کے لیے ہدیہ تبریک وتہنیت کہ موصوف نے انتہائی علمی تنقیدی ذوق وشوق کے ساتھ دنیائے اَدب میں اضافہ کیا۔

◆◆◆

محمد آصف وٹو کا اَدبی کارنامہ

خورشید بیگ میلسوی

••

۲۰۰۷ء کی تخلیقات کا آغاز بلاشبہ تنقیدی حوالے سے محمد آصف وٹو کی تازہ ترین تالیف ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' کے حوالے سے اہم ترین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تنقید کے ارتقا میں سید شبیہ الحسن کا اہم کردار ہے۔ یہ اپنی قابلیت وریاضت اور فنی دسترس سے موجودہ مقام پر پہنچے۔ اس قبولیتِ عام ودوام کی بنیادی وجہ تو رثائی اَدب ہی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے غزل، نظم اور دیگر کاوشوں پر تنقیدی مقالات لکھے۔ اس امر کا اَدب کے قاری کو اس مذکورہ تالیف سے پتہ چلتا ہے۔ ان کی تحریر میں کھجوروں کے دیس مدینہ کی خوش بو سفر کرتی ہوئی کربلا کے ریگ زاروں تک پہنچتی ہے تو یہ خوش بو انسانوں کے لیے تخلیق کی گئی زبان کے وسیلے کی بالائی منزل پر مقیم اہلِ زبان و بیان ادیبوں کی تخلیقات کی روشنی سے آگاہ کرتی ہے۔ چوں کہ یہ روشنی دراصل مُستعار ہوتی ہے اور ابدیت واقعۂ کربلا سے مُستعار ہے۔ اس لیے اس کے حُسن وقبح پر لکھنا کارے دارد ہے۔ اس پُل صراط سے خود کو سید صاحب نے جس خرم واحتیاط سے گزارا ہے وہ ان کے اَدبی تقویٰ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

زیرِ نظر کتاب ایک تجزیہ نگار اور نقاد کی زندگی کے تمام پہلوؤں، کامرانیوں، ترجیحات اور اَدبی خدمات کے علاوہ اعزازات پر احاطہ کرتی ہے۔ دراصل اسے ہم مینارۂ نور قرار دیں گے جس میں بتایا گیا ہے کہ روشنی کے سات رنگ مدغم ہو کر سفید میں ڈھلے ہیں۔ تو تب ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن کی نمود ہوئی ہے۔ اُفق کی بارہ دری سے روشنی کی تقسیم کرنے والے سورج نے بہت کم ایسے دیکھے ہوں گے جو موصوف کے ہم عصر بھی ہوں اور اس قدر ممتاز بھی ہوں۔ یہ کتاب اس حقیقت کو بیان کرتی ہے اور کیوں نہ کرے کہ سانچ کو آنچ نہیں اور رہروانِ اَدب کو تو ایک راستہ درکار ہے جہاں آبلہ پائی کے بعد خارشناسی کا ذوق رکھنے والا ہراول دستہ نظر آئے۔ اگر رہبری کا معیار اور نقاد ہونے کی کسوٹی کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو یہ خوب صورت کتاب ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' منصۂ شہود پر نہ آتی۔

دراصل میکانیات کے عہد میں پہیے کی ایجاد نے جس طرح وسعت پکڑی اور پھر اس کو کمپیوٹر کی ایجاد نے بٹن کے کور میں چھپا دیا اسی طرح جدید اَدب نے رثائی مقام کو وہ ارتقا عطا کیا ہے کہ جہاں میر انیس کے مراثی پڑھ کر بابِ حیرت کھلتا ہے وہاں اس باب کی توسیع میں وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ گوئی سمیت سید آلِ رضا اور دیگر ثنا خوانِ نواسۂ رسولؐ، دل بندِ بتول نے مرثیے کو جس جدّت کا حُسن دیا ہے وہ اگرچہ اَدبی عرصے کی طوالت کے راست متناسب ہے تاہم غزل کی نسبت اس کے ارتقا میں امکانات کے بہت کم ہونے کے تناظر میں ہی سہی حیرت انگیز جدّت آئی ہے جو غزل کے ارتقا سے مرثیہ کے ارتقا کو جہاں ہم آہنگ کرتی ہے وہاں مُحیّر وحیثیت بھی عطا کرتی ہے۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو جدید مرثیہ نگاروں پر مقالات سے علمی ڈگریاں ملیں۔ پہلے باب ہی میں ان کی روشن شخصیت عکس ریز ہو کر قاری کو وُرطۂ حیرت میں لے جاتی ہے اور پھر نئی گرہیں کھلتی ہیں۔ کہیں اس شخصیت کے عکس سے غزل کے آسمان پر ستارے روشن نظر آتے ہیں تو کہیں عہد کے سخت گیر نقاد اس عظیم ادیب کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ آنکھ ٹھہرے تو کس مقام پر۔ جلوہ گاہوں کی دسترس اس قدر ہے کہ جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب کے اَدب پر احسانات کا مشاہدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

مذکورہ کتاب میں جہاں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے فنی و فکری پہلوؤں کو اہلِ فن کی زبانی اُجاگر کیا گیا ہے وہاں ان کی شخصیت کے متعلق وہ بنیادی نکات نظر آتے ہیں جن کی روشنی میں محنت، ریاضت اور اَدب سے ان کی لگن کے جوہر کی نمو میں ان کی فضیلت دکھائی دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم عصر ہوں یا پیش رو۔ عہدِ پر آشوب میں ادیب کو مقام منوانے میں دانتوں پسینہ آتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا حضرت حفیظ جالندھری کو یہ نہ کہنا پڑتا:

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

یہ ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے چاہنے والے بڑی تعداد میں ان کے ہم راہ ہیں جو ان کی اَدبی خوبیوں سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی شخصیت ایک دبستان کا روپ دھار رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی انفرادی تخلیقی خوبیاں، اچھا شاعر ہونا، اور بے مثل نقاد ہونا ہے۔ جس کی "شام وسحر" کے ذریعے نئے اور پرانے لکھنے والوں کو مواقع فراہم کر کے انھوں نے اَدب کو نئی آوازیں، نئے اُسلوب دیے ہیں۔ مصنف نے ان امور کا بالالتزام ذکر کیا ہے۔ ہر سورج کی قسمت میں ڈوبنا ہے اور ہر ڈوبتے سورج کو آخر اُبھرنا ہے۔ سیّد صاحب نے اس لیے بلا تخصیص جہاں بھی روشنی دیکھی وہیں پر قلم کے ڈیرے ڈال دیے اور پھر فن کے تکنیکی اور موضوعاتی رویوں سے لے کر ادیب کی خیر پسندی کی فہم و فراست تک ان کا نقادانہ آہنگ بلند ہوا۔ ہر شاعر نے اسے اپنی خوبی قرار دیا کہ ڈاکٹر صاحب اس کی تعریف کر رہے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب نے قرار دیا کہ یہ ادیب کا موادِ شعر و نثر تھا جس نے انھیں اس پر لکھنے پر مائل کیا اور ادیب کی زندگی کو سب سے زیادہ ضرورت اس کی شاعری اور نثر کی بلندی کی ہے۔

پھر انھوں نے تخصیص کے پرچم کی بجائے عوامی رنگ کے علم کو سربلند کیا۔ جن شعرا کو نقادانِ فن نے زیادہ اہمیت نہ دی اگر ان میں کوئی خوبی نظر آئی تو سیّد شبیہ الحسن نے ان کو موضوعِ تنقید بنایا۔ ان کو اپنے آئینے میں پرکھنے کی بجائے تنقید کا غیر جانبدارانہ روپ ظاہر کیا اور پھر اہم نقادوں کی آراء سے بھی اپنی رائے کے سراغ کا موازنہ ان کی تنقیدی عدل کی خوبی ہے۔

یوں آصف وٹو نے ایک ہمہ جہت شخصیت کے رنگِ تنقید اور اُسلوبِ تنقید کی انفرادیت، اجتماعی رویوں سے آگاہی، صحافتی خدمات، رثائی اَدب کی ارتقائی جہات سے واقفیت اور اصنافِ نظم ونثر کے معروف وغیر معروف اسماء کے حوالے سے تنقیدی ریاضت کے ساتھ ساتھ تنقیدی اوصاف کی ممیّزہ حیثیت جیسے موضوعات پر سوانح حیات کے ساتھ قلم اٹھایا۔ اگرچہ اس سے صاحبانِ محبت کو خاصا مواد ملے گا تاہم یہ مصنف کا کمال ہے کہ اس نے اتنے وسیع وعریض موضوع کو بہت کم صفحات پر مکمل کر دکھایا ہے جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

◆◆◆

پروفیسر آصف وٹو کی منفرد تخلیق
ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات

صفدر ظہیر

◆◆

محترم محمد آصف وٹو صاحب کی زیرِ نظر تصنیف پر پہلے تو ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہیں کہیں سے منتخب اقتباسات پڑھے تو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات پر وٹو صاحب کے عمیق تجزیے نے نہ صرف چونکا دیا بلکہ بے حد متاثر کیا۔ اُس کے بعد تو پوری کتاب تفصیلاً پڑھ ڈالی۔ جناب وٹو صاحب نے کمالِ فن سے اپنی تصنیف کو چار مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر زاویے سے ایک تفصیلی بحث کر کے ڈاکٹر صاحب کے فن بلکہ فنون کا جامع احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کاموں کی کوئی بھی صنف کسی بھی پہلو سے وٹو صاحب کی تنقید، تجزیے اور قلم کی گرفت سے باہر نہیں ہے اور یہی اُن کی تصنیف کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ انھوں نے تمام کتاب کو اپنے خوب صورت اُسلوب و منفرد اندازِ بیان سے مزیّن کیا ہے۔ اُن کی تصنیف نے جس طرح تمام عوامل کا تجزیہ کیا ہے وہ اُس کی جامعیت کا ثبوت ہے لیکن میں ایک بات ضرور اُن کے گوش گزار کرنا چاہوں گا کہ یہ تصنیف صرف ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اب تک کے کام کا تجزیہ ہے۔ جتنی مزید تصانیف، مقالات، مضامین، تبصرے، شاعری وغیرہ کی مستقبل میں ہمیں ڈاکٹر صاحب سے توقع ہے اُن کے لیے وٹو صاحب یا کسی اور ماہرِ قلم کی مزید کئی تصانیف درکار ہوں گی۔

ایک اور پہلو جس کا کم از کم مجھے کسی حد تک پہلے سے ادراک تھا وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا تحقیقی، تنقیدی اور شعری سفر سب سے جدا اور یکتا راستے پر رواں دواں ہے۔ وہ اپنی زندگی اور فن میں ایک طرزِ فکر کو ارادتاً لے کر چلے اور اِسی فکر کے تحت اُن باکمال تخلیق کاروں کے فن پر جرأت آمیز انداز میں قلم اُٹھایا، جنھیں شاید کچھ عرصے بعد کوئی مشکل ہی سے لائقِ تبصرہ سمجھتا۔ ان بے مثال قلم کاروں میں نسیم امروہوی، قیصر بارہوی، آلِ رضا، حبیب جون پوری، ڈاکٹر آغا سہیل، سیف زلفی، اسلم کولسری اور سید وحید الحسن ہاشمی جیسے جید نام شامل ہیں۔ یہ تمام افراد اپنے اپنے فن کے مردِ میدان ہیں۔ قاری ان سب کو پڑھتا ہے اور مدح سرائی کیے بغیر نہیں رہ

سکتا لیکن قلم برادری میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اپنا وقت ان لوگوں کے فن پر تبصرے یا تنقید کے لیے وقف کریں۔ یہی ڈاکٹر شبیہ الحسن کی بڑائی ہے کہ انھوں نے نہ صرف ان شخصیات کے فن پر سیر حاصل کام کیا اور بہت سی تصانیف قاری تک پہنچا دیں بل کہ آئندہ نسل کے لیے ان کو زندۂ جاوید کر دیا۔

اسی طرح تنقیدی مضامین میں ڈاکٹر صاحب کی وسعت نظری، سوچ، رجحان اور سمت جو بھی ہو لیکن بڑی بات یہ ہے کہ وہ ایک مضبوط و متعین Commitment کا علم بلند کیے ہوئے ہیں اور اپنے اب تک کے کاموں میں انھوں نے اس علم کو کسی بھی معاشی، معاشرتی یا کمرشل وجوہ کی بنا پر جھکنے نہیں دیا۔ اکیسویں صدی میں اس طرح کا ادیب ملنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ایک اور نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ بحیثیت اعزازی مدیر ماہ نامہ ''شام و سحر'' کی کامیاب، معیاری اور مسلسل اشاعت۔ اس دورِ بے اَدبی میں کسی بھی سطح کے اَدبی مجلّے کی ادارت اور پھر ہر ماہ باقاعدگی سے شائع کرنا اور قاری تک پہنچانا یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بہترین اَدبی معیار بھی برقرار رکھنا قارئین کے لیے تحفے کی مانند ہے۔

پروفیسر آصف وٹو نے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جو مواد فراہم کر دیا ہے وہ قابلِ تحسین بھی ہے اور لائقِ مطالعہ بھی۔ یہ کتاب جہاں ایک جانب صاحبانِ علم و اَدب کے لیے لائق مطالعہ ہے وہاں دوسری جانب طالبانِ علم کے لیے رہ نمائی کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے۔ اگر وٹو صاحب خوش بخت ہیں کہ انھیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جیسا اُستاد اور رہ نما میسّر آیا تو ڈاکٹر صاحب بھی خوش نصیب ہیں کہ اس بے برکت عہد میں انھیں آصف وٹو جیسا مخلص شاگرد نصیب ہوا۔ آصف وٹو کے بقول انھوں نے یہ کتاب عقیدت سے جدا ہو کر معروضی انداز میں لکھی ہے لیکن میرے خیال میں اس کتاب کا ایک ایک حرف ڈاکٹر شبیہ الحسن سے ان کی والہانہ عقیدت کا اعلان کر رہا ہے۔

اب چلتے چلتے دو چار باتیں اس کتاب سے ہٹ کر بھی ہو جائیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کو جاننے کا دعوا تو نہیں کر سکتا لیکن اُن کے ساتھ بے تکلف ملاقاتیں اُن کے اور اپنے زمانہ طالب علمی سے ہیں۔ اُس وقت سے ہی شبیہ الحسن کی اَدبی اور علمی سرگرمیاں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ یہ صاحب مستقبل میں ضرور کوئی بڑا کام کریں گے لیکن اُنھوں نے تو ایک کے بجائے بہت سے بڑے بڑے کام اتنی سی عمر میں کر ڈالے۔ ڈاکٹر صاحب کی تدریسی، اَدبی اور صحافتی خدمات کی تعداد اور معیار دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ دنیائے اَدب کے بھی سپہ سالار ہی ثابت ہوں گے۔

شاید بہت سے لوگ نہ جانتے ہوں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن صبح سے لے کر رات گئے تک تدریس کے علاوہ بے شمار دیگر اَدبی مشاغل میں تن دہی سے مصروف رہتے ہیں۔ اس دھن میں اپنے گھر، اپنے کنبے کو بھی مشکل سے ہی وقت دے پاتے ہیں۔ بہر حال جب اُن کے اہلِ خانہ کو اِس امر میں اُن سے کبھی شکایت نہیں رہی تو ہم کون ہوتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو ہمت اور حوصلہ دے کہ وہ تمام اَدبی کام اسی لگن، جذبے اور دل جمعی کے ساتھ نہ صرف انجام دیتے رہیں بل کہ پہلے سے بھی بہتر انداز میں اور آگے بڑھائیں۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات

غضنفر کاظمی

◆◆

جس دورِ پُر آشوب میں عزت و توقیر کا پیمانہ علم و عرفان کی بجائے دولت بن جائے، صاحبانِ علم بے توقیر اور صاحب ثروت باوقار قرار پانے لگیں، جب اَدبی تحریریں عنقا ہو جائیں، کتابیں دکانوں میں پڑے پڑے اپنا رنگ و روپ کھونے لگیں، نوجوان نسل مطالعے سے جی چرانے لگے اور حرف کی حرمت اور لفظ کا تقدس طوائف کے ٹوٹے گھنگھروؤں سے بھی زیادہ بے وقعت ہو جائیں، ایسے ماحول میں علمی و اَدبی کام کرنے والے کو دیوانہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اَدب کا بے جان جسم بے گور و کفن پڑا ہو اور خود ساختہ ادیب اَدب کو متروک قرار دیتے ہوئے قصیدہ گوئی شروع کر دیں اور اس بے اَدبی پر خلعت فاخرہ کے مستحق قرار پائیں، ان کو بغیر کسی خدمت کے خدمات کے اعتراف کے طور پر سرکاری ایوارڈ دیے جانے لگیں، ایسے میں دیوانے بھی دیوانگی تج کر فرزانگی کا ثبوت دیتے ہوئے بھیڑ چال میں شامل ہو کر گستاخیِ اَدب کے گناہ کبیرہ کا ارتکاب شروع کر دیتے ہیں۔ چمنستانِ اَدب میں خزاں رت ڈیرے جمالے، غنچے مرجھانے لگیں، کلیاں چٹکنا چھوڑ دیں، چمن کی فضاؤں میں اَدب کی بھینی بھینی خوش بو کی جگہ جھوٹے قصیدوں اور سڑے ہوئے الفاظ کی بساند دماغوں کو بوجھل کر رہی ہو، ایسے میں کوئی مجذوب اَدب کی اُجڑی کیاریوں کی گوڈی کی عبادت سرانجام دیتا نظر آئے تو اس کے قدموں کو بوسہ دینا چاہیے۔ لیکن اس عمل کا ارتکاب بھی کوئی مجذوب یا کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔ آج اَدب کی اُجڑی کیاری کی آبیاری کرنے والوں میں معدودے چند ہی نام ہیں جن میں شبیہ الحسن کا نام شائد سرِفہرست نظر آئے۔

شبیہ الحسن کی اَدبی خدمات کی فہرست تو اس قدر طویل ہے کہ اس مختصر تحریر میں ان کے عناوین کا احاطہ بھی ممکن نہیں، بہر حال ان کی کیفیت جذب کا فائدہ یہ ہوا کہ مجذوبوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور ان میں مجھ

آصف ڈوٹو ایک خوب صورت اضافہ ہیں۔ آصف ڈوٹو نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقید نگاری پر مشتمل تصانیف و تالیفات کو مجتمع کیا اور ''ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' کے عنوان سے ایک خوب صورت وسدا بہار گل دستہ ترتیب دیا جس کو انتہائی محنت، مشقت اور عرق ریزی سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کے کارہائے اَدب سے اس انداز میں مزّہ کیا جس سے ان کی شبیہ الحسن سے عقیدت، محبت اور مودّت کی خوش بو فضائے اَدب کو مہکانے لگی۔ مذکورہ کتاب میں انھوں نے شبیہ الحسن کی جتنی اَدبی خدمات کا احاطہ کیا ہے وہ شاید خود ڈاکٹر شبیہ کو بھی یاد نہ ہوں اور ایک محقق کی کامیابی کی یہی مستند دلیل ہے کہ جس ہستی کے بارے میں تحقیق کی جائے وہ خود بھی اپنے حوالے سے شائع کی جانے والی معلومات پر حیران ہو جائے۔

کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا سوانحی خاکہ اس انداز میں شائع کیا گیا کہ خاکہ ہی ان کے مکمل تعارف کے قالب میں ڈھل گیا، ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا جس میں اس مختصر خاکے میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو غرض اس سوانحی خاکے میں شبیہ الحسن کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔

''ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' ایک ایسی کتاب ہے جو جویانِ علم کے لیے رہ نما اور ناقدین کے لیے رہ نمائے کامل ہے۔ ڈاکٹر شبیہ نے کہیں بھی یہ احساس نہیں پیدا ہونے دیا کہ تنقید اعتراض بن کر اُبھر رہی ہے۔ انھوں نے تنقید کے بنیادی اصولوں پر مکمل گرفت قائم رکھی یعنی نفسِ مضمون، فکر، بیان کی ندرت اور زبان پر قدرت، ان ہی زمینوں میں ان کا قلم تنقید نگاری کی کلیاں چٹکاتا اور غنچے کھلاتا رہا۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ آصف ڈوٹو کی یہ کاوش اَدب میں مقامِ جاوداں کے حصول میں کامیاب ہوگی۔

مطبوعہ

(ماہ نامہ 'بک ڈائجسٹ' لاہور، جنوری۔فروری ۲۰۰۷ء)

(ماہ نامہ 'الحمرا' لاہور، فروری ۲۰۰۷ء)

◆◆◆

شبیہ شناسی کے لیے حرفِ آغاز

ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی

◆◆

استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو استاذ الاساتذہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے تلامذہ کی ایک فوج ظفر موج موجود ہے جن میں سے بیشتر کا تعلق قلم قبیلے سے ہے تاہم ڈاکٹر صاحب کے شاگرد رشید پروفیسر محمد آصف وٹو اس حوالے سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے تنقید و تحقیق کے میدان میں قدم رکھتے ہی اُستاد پر ہاتھ صاف کیا۔ ان کے حوصلے اور ہمت کو داد دینا پڑتی ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایسے نامور اُستاد، مستند محقق اور معتبر نقاد کو تنقید کا پہلا نشانہ بنایا۔

جب شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے نظم ”ہمالہ“ لکھی تو کہا گیا کہ جس شخص کا آغاز ہمالہ سے ہو اس کی انتہا کیا ہوگی۔ بالکل اسی طرح جس نقاد کی تنقیدی نظر کا پہلا شکار پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایسا نابغہ ہو تو آئندہ کے لیے ہم جیسے بالشتیے تو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ اب تو وٹو صاحب کی تنقیدی نظر ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر آغا سہیل ہی پر پڑے گی۔

خیر یہ تو وٹو صاحب سے محبت کی باتیں تھیں۔ ان باتوں کو طول اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ کہیں یہ معاملہ نہ ہو جائے کہ:

سنانے کے قابل جو تھی بات اُن کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

پروفیسر محمد آصف وٹو نے اپنے مرشد کامل پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی رہ نمائی میں تنقید کی خارزار میں قدم رکھا ہے اور پہلی کتاب نے انھیں ارتقا کی اس منزل پر فائز کر دیا ہے جو ہم جیسے آج تک نہیں پا سکے۔

وٹو صاحب کو اُستادِ محترم ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سے قلبی محبت بل کہ عقیدت و ارادت ہے۔ وہ استادِ محترم کی ہر بات اور ہر خواہش کو حکم کا درجہ دیتے ہیں۔ اُستاد شاگرد کی اس جوڑی کو دیکھتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد اور مرزا

فرحت اللہ بیگ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ فرحت اللہ بیگ نے اُستاد کی رحلت کے بعد ان کی کہانی مرتب کی تھی جب کہ محمد آصف وٹو ذرا عجلت میں ہیں۔ وٹو صاحب نے کتاب کے آغاز میں وہی انداز اپنایا ہے جو کہنہ مشق محقق اور نقاد اختیار کرتے ہیں چناں چہ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے سوانحی کوائف کو نہایت تفصیل اور حسنِ ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب میں ''شبیہ شناسی'' کا عنوان قائم کرتے ہوئے ان تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے جن کا تعلق ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت اور ان کے فن سے جُڑا ہوا ہے۔ وٹو صاحب نے نہایت تحمل اور صبر سے تحقیقی دیانت داری کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مشکل مرحلے کو سلامت روی سے طے کیا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو ڈاکٹر سلیم اختر اَدبی دنیا کا جن قرار دیتے ہیں ایسا جن جو بوتل سے باہر ہے اور اس لقب یا خطاب کا جواز یہ ہے کہ کوئی انسان اس قدر عدیم الفرصتی کے باوجود اتنا اَدبی سرمایہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ پھر وہ کسی ایک میدان کے کھلاڑی نہیں۔ تحقیق، تنقید، صحافت، شاعری کون سا ایسا میدان ہے جہاں ان کے اشہبِ قلم نے عظمت کے جھنڈے نہیں گاڑے۔ کم وبیش پچیس سے زائد تحقیقی و تنقیدی کتب شائع ہو کر اہلِ نقد و نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ جتنے تنقیدی و تحقیقی مضامین انھوں نے شائع کیے شاید انھیں اپنے ان فن پاروں کی تعداد بھی یاد نہ ہو۔ ہر ماہ ''شام و سحر'' کا جو فکر انگیز اداریہ وہ تحریر فرماتے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ علم واَدب کے اس ہمالیہ کی کوہ پیمائی دل گردے کا کام ہے کہ اس پہاڑ کی بلندی پر نظر ڈالنے سے پہلے دستار کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ میں محمد آصف وٹو کو اس عظیم اَدبی شخصیت کے کارہائے نمایاں پر تنقیدی محاکمے پر مبارک پیش کرتا ہوں۔

یوں تو پوری کتاب خاصے کی چیز ہے کہ یہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت اور ان کے اَدبی سفر تا حال کی ایک معتبر تحریر ہے تاہم باب سوم اور باب چہارم مصنف کے تنقیدی شعور اور فنِ تنقید سے آگہی کی مکمل گواہی ہے۔ مصنف نے ان ابواب میں اپنے ممدوح کی شبیہ کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔

آخری باب میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے نمایاں زاویوں کو پیش کیا گیا ہے اور اُردو تنقید میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہوئے انھیں عہدِ حاضر کے نامور ناقدین کی صفِ اوّل میں جگہ دی گئی ہے۔ اب میں یہ بات انتہائی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر آصف وٹو کی یہ کتاب شبیہ شناسی کے لیے حرفِ آغاز ثابت ہوگی اور آنے والے ناقدین اور محققین کے لیے رہ نمائی کا فریضہ ادا کرے گی۔

(مطبوعہ)

ماہ نامہ ''الزبیر'' بہاول پور، فروری ۲۰۰۷ء

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات۔ ایک جائزہ

شفیق الرحمٰن الہ آبادی

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات (تجزیہ وتنقید) محمد آصف ڈو کی تحقیقی وتنقیدی تصنیف ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب کی علمی و اَدبی خدمات بالخصوص ان کے تنقیدی زاویے اور تنقیدی اختصاص کا احاطہ کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے تنقیدی تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے وہ زیرِ نظر کتاب کے پیش لفظ ''گزارشِ احوالِ واقعی'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ساری زندگی علم واَدب کی آبیاری کرتے گزر رہی ہے تاہم راقم الحروف کو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سے بے پناہ عقیدت وارادت ہے تاہم مَیں نے اس کتاب کی تشکیل میں اصول تنقید کو عقیدت پر قربان نہیں ہونے دیا۔ جہاں تک ممکن ہوسکا ہے میں نے ایک غیر جانب دار نقاد کی طرح اس کتاب کو تحریر کیا ہے۔''

نام ور نقاد جناب پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر مذکورہ کتاب کے فلیپ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو تعلیمی اور اَدبی خدمات کے حساب میں متعدد اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ تازہ اعزاز جناب محمد آصف ڈو صاحب کی تالیف ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' ہے۔ آصف ڈو صاحب نے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ذاتی کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمی، علمی اور اَدبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے معاصر اہلِ قلم میں ان کے مقام ومرتبے کا تعین بھی کیا ہے، جہاں یہ کتاب ہم سے ایک مردِ شریف کا تعارف کراتی ہے وہیں پر یہ سبق بھی دیتی ہے کہ زندگی میں روشنی کا باعث محنت ہی ہے، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی تو روشنی کی مثال ہیں۔''

بلاشبہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک کل وقتی اَدیب ہیں۔ بیسویں صدی کو آخری دہائی میں ابھرنے والے ناقدین اور محققین

کی فہرست میں ان کا نام نامی نمایاں نظر آتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف اور اعترافات کے عنوان سے ہے، جس میں مولف نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن سے مکمل آگاہی اور مبسوط مطالعے کے لیے ان کے شخصی کوائف پیش کرنے کے بعد ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف، ان کی زیرِ نگرانی لکھے گئے تحقیقی مقالہ جات، تعلیمی ذمہ داریوں، اعتراف کارکردگی، صحافتی خدمات، ان کے مطبوعہ مقالات، فیچرز، انٹرویوز، تبصرے اور ان کی شخصیت و فن کے حوالے سے شائع ہونے والی تحریروں، کالم، انٹرویوز اور ان کے بارے میں ناقدین، شعرا اور اکابرین کی منظوم و منثور آرا شامل ہیں۔

دوسرا باب ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر'' کے عنوان سے اس باب کے آغاز میں فاضل مولف نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس امر کا کھوج لگانا بے حد مشکل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا تخلیقی و تنقیدی سفر کب شروع ہوا؟ تاہم مولف نے ڈاکٹر صاحب کی مطبوعہ تصانیف/ وتالیفات کے سنین اشاعت اور ان کی کتب پر شائع ہونے والے تبصروں اور مضامین کا ذکر کرنے کے بعد فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل کتب کا ذکر اور تبصرہ پیش کیا گیا ہے:

۱۔ بجھی وہ شمع (شاعرِ آلِ محمدؐ حضرت نسیم امروہوی کی یاد میں)
۲۔ آیاتِ آمنہ (حضرت محمد مصطفےٰؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کا مرثیہ)
۳۔ بیسویں صدی کا شعری ادب (نمائندہ شعراء کا کلام)
۴۔ آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق و تنقید)
۵۔ العطش (جلد اول) (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مراثی کی تدوین)
۶۔ مفاہیم (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
۷۔ منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مراثی کا مجموعہ)
۸۔ العطش (جلد دوم) (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)
۹۔ شام و سحر کی باتیں (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور کے اداریے)
۱۰۔ کلیاتِ حبیب (حبیب جون پوری کے کلام کی تدوین)
۱۱۔ ترجیحات (تحقیقی و تنقیدی مضامین)
۱۲۔ آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات)
۱۳۔ معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مراثی کی تدوین)
۱۴۔ العطش (جلد سوم) (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)
۱۵۔ باقیاتِ آلِ رضا (آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)

۱۶۔ جدید لہجے کا شاعر،سیف زلفی (سیف زلفی کی شخصیت وفن)

۱۷۔ اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

۱۸۔ تصریحات (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

۱۹۔ مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی (تحقیق وتنقید)

۲۰۔ العطش (سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کا کلیات)

۲۱۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (نعت،منقبت اور سلام کے حوالے سے مطالعہ)

۲۲۔ جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (اسلم کولسری کی شخصیت وفن)

۲۳۔ طاہرین (سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں،مناقب اور سلام کی تدوین)

۲۴۔ سیف زلفی کے مرثیے (تجزیہ وتدوین)

۲۵۔ قیصر اقلیم مرثیہ (شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری)

باب سوم ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی زاویے'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس باب میں مولف نے ڈاکٹر صاحب کے تصور نقد ونظر پر تفصیلی اور مدلل بحث کی ہے اور ڈاکٹر صاحب کی تنقید نگاری کے ذریعے فروغ اَدب کی کوششوں کو سراہا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تنقید میں تحقیق سے استفادہ کرتے ہیں اور غیر جانبدارانہ رائے پیش کرتے ہیں وہ اپنی تنقید کے ذریعے ادبا اور شعرا کی پذیرائی میں مسلسل مصروف ہیں ایسے ادیب یا شاعر جو دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے یا اَدبی گروہ بندی کا شکار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی دُور اندیشی ایسے گم نام ادیبوں کو منظرِ عام پر لاتی ہے۔ تنقید میں آپ کو یہی امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے معروف مگر معتبر ادیبوں اور شاعروں کی پذیرائی کی ہے۔ محمد آصف وٹو نے آپ کی کتب اور آراء سے یہ اخذ کیا ہے کہ آپ تہذیبی نقاد ہیں اور اپنی اس رائے کی دلیل میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''مفاہیم'' کے صفحہ نمبر۲ سے درج ذیل اقتباس پیش کیا ہے:

> ''تنقید ایک تہذیبی عمل ہے اور اس نکتے کی وضاحت ان مضامین میں نظر آئے گی، میں نے اپنی صلاحیت کے مطابق اپنی تہذیبی صورتِ حال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔''

مؤلف نے ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے مزید چند اقتباسات پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ: ڈاکٹر صاحب تہذیبی عناصر کے حوالے سے مزاح میں بھی یہ عناصر تلاش کر لیتے ہیں وہ صرف نثری تخلیقات تک تنقید کا تہذیبی سفر نہیں روکتے بل کہ شاعری میں بھی اس کے عناصر تلاش کرتے ہیں اور اشعار کے حوالوں سے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہیں، وہ اپنے معاصر تنقیدی رویوں سے آگاہی رکھتے ہیں اور تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے حق تنقید اَدا کرتے ہیں، مولف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب تخلیق کے شعوری محرکات کا کھوج لگاتے ہیں اور تخلیق کار

کے ذہنی محرکات کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ اس موقف کی تائید کے لیے فاضل مولف نے ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ رائے درج کی ہے:

"ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک باصلاحیت اور ہوش مند نقاد ہیں۔ انھوں نے اسلم کولسری کے حوالے سے ایک ایسی منفرد کتاب پیش کی ہے جو بیک وقت شاعری کی غزلوں کا انتخاب بھی ہے اس کے سوانحی کوائف اور شعری کارکردگی کا بیان بھی ہے اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی۔"

(جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ۔ فلیپ)

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جب کسی شاعر ادیب کی کتاب یا تحریر پر اپنی ناقدانہ رائے دیتے ہیں تو پہلے اس کے ارتقائی سفر پر گہری نظر ضرور ڈالتے ہیں اور پھر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شاعر موروثی شاعر ہے یا محض فنی ریاضت سے شاعر بنا ہے۔ مذکورہ موقف کی تائید کے لیے مؤلف نے ڈاکٹر صاحب کی جاوید صدیق بھٹی کے بارے میں یہ رائے پیش کی ہے:

"جاوید صدیق بھٹی کی شاعری الہامی نہیں کہ اس میں خامیاں تلاش نہ کی جا سکیں مگر سچ یہی ہے کہ انھیں شاعری ورثے میں نہیں ملی بلکہ انھوں نے ریاضت سے یہ کمال حاصل کیا ہے۔"

(تصریحات ص ۲۱۸)

کسی شاعر کے کلام میں موضوع کی تاثیر کے ساتھ محاسنِ شعری بھی ڈاکٹر صاحب کو دعوتِ تنقید دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں معروف شاعر وحید العصر سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

"سید وحید الحسن ہاشمی کے سلاموں میں علم بیان اور علمِ بدیع کے نمایاں ارکان تلاش کیے جا سکتے ہیں خاص طور پر تشبیہات اور صنعت تضاد کا برمحل استعمال ان کے کلام کے لطف کو دوبالا کرنے کا سبب بنتا ہے...... جہاں ان کے صنائع بدائع کے استعمال سے شعر کے حُسن میں اضافہ ہو وہاں وہ اسے استعمال کرتے ہیں وہ محاسنِ شعری کو شاعری کا زیور سمجھتے ہیں مقصود نہیں، اس طرح محاورات اور روزمرہ کے برمحل استعمال نے بھی ان کے سلاموں کے حسن میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔"

(طاہرین۔ ص ۱۸۸)

آرنلڈ کے نزدیک نقاد کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ جہاں کہیں سے بھی ہو سکے اعلیٰ وارفع افکار و خیالات حاصل کر کے ان کی ترویج و اشاعت کرے۔ اس عمل سے معاشرے کی فضا میں ایسے عناصر پیدا ہو جائیں گے جو تخلیقی ذہن کے لیے محرک ثابت ہوں گے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی ایسے ہی نقاد ہیں جو علم و اَدب اور اعلیٰ وارفع خیالات کی ترویج و اشاعت کو مقصدِ زندگی بنائے ہوئے ہیں۔

نقاد ایک لحاظ سے تخلیقی بھی ہوتا ہے۔ وہ فن کار کے تخلیقی تجربے اور عمل کی بازآفرینی کرتا ہے گویا اپنے

ذہن میں اسے ازسرِ نو تشکیل کر کے فن کار کے وجدان اور اس وجدان کی مخصوص صورتِ اظہار کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتا ہے تا کہ وہ فن پارے کو صحیح طور پر سمجھ سکے اور دوسروں کو سمجھا سکے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بھی ایسے نقاد ہیں جو فن پارے کے باطن سے فن کار کے تخلیقی موڈ کو اپنی گرفت میں لے آتے ہیں، محمد آصف وٹو ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ خصوصیتِ تنقید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تنقیدی عظمت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ بہت سوچتے ہیں تحریر کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

تنقید اور تحقیق دو مختلف رنگوں کی روشنی پیدا کرنے والی شمعیں ہیں ان دونوں رنگوں کی روشنی ہی میں کسی فن پارے کی صحیح تفہیم واستحسان ممکن ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے بھی حقائق کی فراہمی پر بہت زور دیا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تنقید کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ اپنی تحقیق کی بنیاد تحقیق پر استوار کرتے ہیں، انھوں نے اپنے ایک مضمون ''آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین'' کی تحریر وتشکیل میں پچاس سے زائد حواشی پیش کیے ہیں۔ مذکورہ مضمون کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالکریم خالد رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ''آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین'' کرنے کے لیے تحقیق کے مروجہ اصولوں سے رہنمائی حاصل کی ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے ردوقبول کے مراحل طے کیے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی شاعر کے سنِ ولادت کا تعین بھی اتنا اہم ہے جتنا کہ اس کی شاعری پر تنقید وتبصرہ اہمیت رکھتا ہے اس کام کو محض ''کارِ بے کاراں'' قرار دے کر ایک طرف نہیں ڈالا جا سکتا، چناں چہ انھوں نے دس بارہ صفحات کے اس مضمون میں ممکنہ حد تک ان تمام مآخذ تک رسائی حاصل کی ہے جہاں سے انھیں متعلقہ مواد حاصل ہو سکتا تھا، مضمون کے آخر میں ۲۹ ماخذات کی فہرست مضمون نگار کی محنتِ شاقہ کی گواہی دیتی ہے۔''
>
> (ترجیحات۔ ص ۲۲۰)

فاضل مولف آصف وٹو صاحب نے دلائل سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جدید دور میں رائج تنقید کے معیارات سے بخوبی آگاہ ہیں، عصرِ حاضر میں یورپ کی تنقید میں ایک اہم رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ وہ تخلیق کی اہمیت کے پیشِ نظر تخلیق کار کے جملہ کوائف کو مدنظر رکھ کر تجزیہ کرتے ہیں۔ اُردو ادب میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا یہ اختصاص ہے کہ وہ دورانِ تنقید تخلیق کار کے سوانحی کوائف کو مدِ نظر رکھتے ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے دو طریقے وضع کیے ہیں۔

I کسی بڑی شخصیت کے کوائف جمع کرتے ہوئے ایک سہ سرخی وضع کرنا اور پھر اس کی جزئیات پیش کرنا۔

II اپنے ممدوح کے سوانحی حالات سن وار بیان کرنا۔

ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ طریقِ تنقید کو بہت پذیرائی مل رہی ہے اور تنقید کے میدان میں قدم رکھنے والے

نئے ناقدین اور محققین اس طریقے کو اپنا رہے ہیں۔

اُردو تنقید میں تاثراتی دبستان کا رجحان مغرب کے زیرِ اثر پیدا ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس کے علم بردار تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور نقاد مثلاً نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، محمد حسن عسکری اور مجنوں گورکھ پوری بھی تاثراتی تنقید کے دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولف (محمد آصف وٹو) کے بقول: اگر ڈاکٹر صاحب (سیّد شبیہ الحسن) کی تنقیدی کتب کا مطالعہ کیا جائے اور تنقید کی اقسام تلاش کی جائیں تو تاثراتی تنقید پر ضرور نگاہ جائے گی۔‘‘

آخری باب چہارم ’’ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا اختصاص‘‘ کے عنوان سے ہے جو صرف سات صفحات پر مشتمل ہے مگر اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے گزشتہ ابواب کی تلخیص ہے۔ اس باب میں محمد آصف وٹو نے مختلف تنقیدی جہات میں ڈاکٹر صاحب کا اختصاص نہایت لگن اور محنت سے تلاشا ہے، اس تنقیدی اختصاص کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک صاحب فہم وذکا نقاد ہیں۔

۲۔ دورِ حاضر میں ڈاکٹر صاحب ایسے ناقد ہیں جو اپنے اُصولوں پر کوئی معاہدہ نہیں کرتے اور بے لاگ رائے پیش کرتے ہیں۔

۳۔ وہ جب کسی تخلیق کار کی تخلیق کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی سوانح کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

۴۔ وہ جب کسی فن پارے کو اپنے ذہن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو اس کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہیں۔ پہلا موضوع اور دوسرا تکنیک، لیکن ان کا زیادہ دھیان موضوع کی طرف ہوتا ہے۔

۵۔ ان کی رائے بھی تجربے اور ریاضت پر اپنی بنیاد رکھتی ہے۔

۶۔ ان کا انداز معروضی ہوتا ہے اور وہ سائنسی نقطۂ نظر سے بھی کام لیتے ہیں تا کہ رائے صاف اور شفاف رہے۔

۷۔ ان کی تنقید کا ایک بڑا رُخ فلسفۂ خیر ہے (یعنی وہ دوسروں کے لیے نیکی، پیار، محبت اور شفقت کے جذبات رکھتے ہیں)

۸۔ ان کا اُسلوب سادہ مگر پُرکار ہے وہ نہایت سادہ لفظوں میں اپنی بات کا ابلاغ کرنا چاہتے ہیں۔

۹۔ ان کی آراء میں شک کا پہلو نہیں نکلتا۔

۱۰۔ وہ اپنی رائے کو مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں۔

۱۱۔ وہ اپنی تنقید کو کبھی سطحیت کا شکار نہیں ہونے دیتے۔

۱۲۔ وہ آفاقی قدروں کا علم بلند کرتے ہیں اور اپنے نظریات کے ذریعے صاحبانِ دانش تک یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ نظریہ جتنا پختہ ہوگا اتنا ہی اثر انگیز ہوگا۔

۱۳۔ وہ تنقید کے لیے اپنے ذہن میں ایک ترتیب بناتے ہیں اور فن پارے کو دیکھ کر اس کے حُسن وقبح پر روشنی ڈالنے کی جلد بازی نہیں کرتے بل کہ اپنی رائے کو تحریر کرنے سے قبل اس کو مستحکم کرنے کے لیے ثبوت اور دلائل کا کھوج لگاتے ہیں۔

۱۴۔ وہ لفظ فہم اور لفظ شناس ناقد ہیں۔

۱۵۔ وہ فن پارے کی لسانیات پر بطورِ خاص نگاہ ڈالتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' میں جناب محمد آصف وٹو نے اپنی لیاقت کے مطابق اس کوہِ اَدب سے جوئے شیر نکالنے کی جو عمدہ کاوش کی ہے اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں، مذکورہ کتاب کے مطالعے سے شبیہ شناسی، کے بہت سے در وا ہوں گے اور یقیناً ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ساتھ ساتھ پروفیسر محمد آصف وٹو بھی اُردو اَدب کی تاریخ میں اَمر ہو جائیں گے۔

(مطبوعہ)

ہفت روزہ 'سردار' میلسی، ۲۳ جنوری ۲۰۰۷ء

◆◆◆

maablib.org

پروفیسر آصف وٹو کا یادگار کارنامہ

پروفیسر فرقان احمد قریشی

◆◆

جناب ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کثیرالجہات (Multidimensional) شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی، تدریس، تنقید، تحقیق، شاعری، صحافت اور کاروباری مصروفیات کے لیے وقف کر رکھی ہے اس کے علاوہ وہ دوستوں کے کاموں اور اَدبی تقریبات کے انعقاد میں ہمہ وقت مصروف و مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ جناب شبیہ الحسن کی اَدبی اور صحافتی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اُن کے فن کا احاطہ کئی تصانیف کا متقاضی ہے۔ جناب شبیہ الحسن اپنے دوستوں اور بالخصوص نئے لکھنے والوں کی راہ نمائی، سمت نمائی اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ وہ اَدبی تقریبات کے انعقاد کی صورت میں انھیں متعارف کروانے اور ان کی تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے صرف دوست احباب ہی نہیں بل کہ اِس جہانِ فانی سے کوچ کر جانے والے شعرا اور ادبا کے کلام کو مرتب کرتے ہوئے اور ان پر تحقیق و تنقید کا کام انجام دیتے ہوئے انھیں اَدبی اعتبار سے زندہ کر دیا ہے۔

''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' جناب محمد آصف وٹو کی اپنے اُستادِ محترم کے نام نذرانہ عقیدت کی عمدہ مثال ہے۔ جناب آصف وٹو اپنے اُستادِ مکرم کے لیے بے پناہ خلوص اور ارادت کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں۔ اس دور میں ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو قرونِ اولیٰ اور اسلاف کی روایات کے پاس دار ہونے کے ساتھ ساتھ مثبت سوچ کے علم بردار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ جناب وٹو ان ہی میں سے ہیں۔ میرے خیال میں اس تصنیف کا اختصاصی وصف وہ انصاف ہے جو مصنف نے منصف بن کر تجزیہ اور تنقید کے میزان میں انتہائی تن دہی اور جاں فشانی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ جناب وٹو عادات و اطوار کے اعتبار سے اپنے اُستادِ محترم جناب شبیہ الحسن کی شبیہ دکھائی دیتے ہیں جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ان کا خوش اخلاق، ملنسار اور منکسر المزاج ہونا ہے۔

اس کتاب میں تنقیدی رجحانات کے جملہ لوازمات کو نہایت دیدہ ریزی، دقیق و عمیق نگاہی اور باریک

بی کے ساتھ اُدا کرنے کی بھر پور سعی کی گئی ہے۔ تصنیف کے مندرجات میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تمام محاسن پر تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی انداز میں قلم کشائی کی گئی ہے۔ پہلے باب میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جن میں اعزازات، تحقیقی مقالہ جات، اعترافات اور صحافتی خدمات کی فہرست بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی زاویے کے باب میں مصنف نے تنقید کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور ڈاکٹر صاحب کی مختلف تصانیف کے حوالہ جات کی مدد سے انھیں غیر جانبدار نقاد، بے لاگ تجزیہ نگار، عصرِ حاضر کا بے باک تبصرہ نگار اور کامیاب تحقیق کار ثابت کرنے کے لیے بھر پور انداز سے خامہ فرسائی کی ہے۔

جناب وٹو نے اپنے مؤقف کی وضاحت کے لیے اپنی تحریر میں سلاست، فصاحت، بلاغت اور صراحت کی روشنائی کے تمام رنگوں کو قوسِ قزح کے مانند تحقیق کے قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ یہ رنگ ایک دوسرے میں اس طرح باہم مدغم ہو چکے ہیں کہ اُن کی جلوہ نمائیوں میں حدود کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ انھوں نے تنقید کے تقاضوں کو ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ساتھ عقیدت، محبت اور ارادت پر قربان نہیں ہونے دیا۔

جناب شبیہ الحسن کے مزاج میں جدید اور قدیم تہذیب کے رکھ رکھاؤ اور رچاؤ کے میلانات اور رجحانات بدرجہ اُتم پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام تفصیلات اور جزئیات کتاب میں علاحدہ علاحدہ ابواب میں بیان کی گئی ہیں۔ شبیہ شناسی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جناب آصف وٹو نے اُن کی دو درجن کے لگ بھگ تصانیف کو الگ الگ جائزے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

نامور اور معتبر دانش ور شعرا اور ادبا کی آرا نے مصنف کے مؤقف کو مضبوط، مبسوط اور مربوط بنانے اور آگے بڑھانے میں اہم کردار اُدا کیا ہے۔ شبیہ شناسی کے حوالے سے شعرا اور اُدبا کی فہرست خاصی طویل ہے اُن میں قابلِ ذکر ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر انور سدید، مرزا ادیب، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر عبدالستار نیازی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر نواز حسن زیدی، ڈاکٹر سلیم اختر، شہزاد احمد، ڈاکٹر ہارون قادر، ڈاکٹر سجاد مرزا، ڈاکٹر عارف ثاقب، ڈاکٹر ریاض قدیر، ڈاکٹر علی شیر طور، پروفیسر خورشید بیگ میلسوی، شفیق الرحمن الہ آبادی، اعجاز ثقلین بخاری، آفتاب کاوش، ڈاکٹر عاصی کرنالی، نعیم فاطمہ علوی، سعدیہ انور، پروفیسر آصف وٹو، پروفیسر رابعہ سرفراز، ڈاکٹر افتخار احمد بیگ، ڈاکٹر معراج نیر اور راقم الحروف شامل ہیں۔

جناب وٹو نے اکتشاف کے پاتال میں اتر کر استنباط اور ارتباط کے خطوط کو کمال خوبی اور خوش اُسلوبی سے مرتکز اور منطبق کرتے ہوئے جناب شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کو لازوال بنا دیا ہے۔

جناب وٹو کی یہ کاوش قابلِ دید بھی ہے اور قابلِ داد بھی نیز دیگر شاگردوں کے لیے قابلِ تقلید بھی۔ انھوں نے اس تصنیف میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا صرف ایک پہلو بطور نقاد اُجاگر کیا ہے۔ اُمید واثق ہے کہ دوسرے ناقدین و محققین بھی ان کی دیگر جہات پر توجہ دیں گے اور وٹو صاحب کی طرح شبیہ شناسی کا حق ادا کریں گے۔

◆◆◆

پروفیسر آصف وٹو کا تخلیقی کارنامہ

ڈاکٹر شوکت زرّیں چغتائی

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن پر یہ کتاب تخلیقی اُسلوب کے اعتبار سے جامع مقالے کی حیثیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب علم شخصیت ہیں جن کو آصف وٹو نے اس کتاب ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' میں اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ شبیہ الحسن کا پیکر سامنے آ گیا ہے۔

زیرِ مطالعہ کتاب ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات کی خصوصیت یہ ہے کہ آصف وٹو نے نہایت تگ و دو، تلاش اور تحقیق کے ساتھ شبیہ الحسن کی نثر و نظم، تنقید اور تحقیق کے نمونے فراہم کیے ہیں جو اچھے خاصے دقیق مضامین اور مقالوں کی شکل میں ہیں جنھیں اُردو اَدب و تحقیق کا حصّہ کہا جا سکتا ہے جیسا کہ آصف وٹو کی کتاب کے مطالعہ سے ترجمانی ہوتی ہے کہ شبیہ الحسن کی نثر کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ مختصر جملوں میں بڑی دانائی سے کام لیتے ہیں اور اس دانائی میں بھی بہت مفہوم جھلکتے ہیں۔ اس کے باوجود جہاں ہزاروں تنقیدی تصانیف قاری کی منتظر ہیں لیکن آصف وٹو کی یہ تصنیف اپنے مقام پر اہمیت کی حامل ہے جب کہ تنقید کا بنیادی مقصد فکری محاسن و معائب کو اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ اس سے انسان کا ذہن درست و نادرست کی شناخت کرتا ہے۔ محمد آصف وٹو نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات میں آراء کے عنوان سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کے بارے میں ناقدین اور دانش وروں کی آراء کو مختلف اقتباسات دے کر پیش کیا ہے۔ ان آراء کو بھی مصنف نے بہت محنت اور ان تھک جدوجہد کے ساتھ یک جا کر کے کتاب میں شامل کیا ہے۔ یہ کارنامہ بڑا احسن قدم ہے یہ آراء کتاب کے ۴۷ صفحات سے شروع ہو ۹۳ صفحات تک محیط ہیں۔ ان آراء میں بھی آصف وٹو نے شبیہ الحسن صاحب کے اَدبی و شعری تحقیقی سفر کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ تحقیق و تنقید کے کٹھن راستوں پر جستجو، محنت اور لگن کے ساتھ ساتھ اَدب کا فطری ذوق اور شاعرانہ عمیق نگاہ ان کے بہترین زادِ راہ کا درجہ رکھتے ہیں اور شاعری کی مختلف اصناف

میں طبع آزمائی کرتے ہوئے جب وہ گوشۂ مرثیہ میں داخل ہوتے ہیں تو اس صنف میں ان کے جذب وشوق وارفتگی عقیدت اور محبت کی ایک خاص پہچان نظر آتی ہے۔

اس کے بعد اس کتاب ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' میں آصف وٹو نے خراجِ تحسین کے موضوع سے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے شعرا کا منظوم خراجِ تحسین کا جائزہ پیش کیا ہے۔ خراجِ تحسین میں بھی شعرا کی مختلف اصناف زیرِ بحث آئی ہیں۔ ان اصناف میں شعرا نے اس موضوع کے رموز و نکات کو اُجاگر کیا ہے۔ یہ نظمیں شبیہ الحسن صاحب پر بڑی دقتِ نظر اور خلوصِ دل اور جذبے اور عقیدت کی چاشنی کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ ان کی شخصیت جس بات کی مستحق ہے یہ جائزہ لے کر ان کے کمالاتِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی مثال تحسین یزدانی کی ایک نظم کے چند اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے:

اے وقارِ سخن اعتبارِ سخن
کوہسارِ ادب، آبشارِ سخن
تو ہے جانِ سخن تو قرارِ سخن
اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

اس سلسلے میں سید عرفی ہاشمی کی نظم کے چند اشعار بھی نظر آتے ہیں:

تجھے دریافت کرتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے
تری تنقید سے روحِ دیانت پیار کرتی ہے
تری تحقیق سے چشمِ کرامت پیار کرتی ہے
جہاں تو شعر لکھتا ہے ذہانت پیار کرتی ہے
تو وہ فن کار ہے جس سے شرافت پیار کرتی ہے

اب اس مقالے میں مجھے یہ کہتے ہوئے کچھ عار محسوس نہیں ہوتا کہ میں نے آصف وٹو کی اس کتاب ''ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' کا جائزہ پوری تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں سید شبیہ الحسن صاحب کے تمام تصنیفی و تالیفی سرمائے کا تعارف آصف وٹو نے مختصر جائزوں کے ساتھ پیش کیا ہے بل کہ نہایت محتاط انداز میں متوازن زبان میں موضوع اور مقالہ کی شخصیت کی ادبی خدمات کو جامع طور پر اُجاگر کیا گیا ہے کیوں کہ مقام اور مرتبہ کا تعین فرد کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ لمحوں میں اسے طے کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال یہی ہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات۔ چند تاثرات

اقبال کاظمی

◆◆

سب سے پہلے تو میں جناب محمد آصف وٹو کا از حد شکر گزار ہوں کہ موصوف نے اپنی مندرجہ بالا قابلِ قدر تصنیف مجھ تک بھجوانے کا بندوبست فرمایا۔ اس لیے اس کرم فرمائی پر اظہارِ تشکر اور کتاب کی رسید کے طور پر چند تاثرات پیش کر رہا ہوں جو اس کتاب کے جستہ جستہ مطالعے کے نتیجے میں اُبھرتے ہیں۔ مصروفیات کی وجہ سے تفصیلی مطالعہ تو نہیں کر سکا مگر مندرجات کی تفصیل پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اگر عہدِ موجودہ کا کوئی شخص یا آئندہ زمانے کا کوئی محقق اور متجسس ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت اور اُن کے فن اور اَدبی خدمات کے حوالے سے کوئی فیصد مقالہ یا تحقیقی کتاب تحریر کرنا چاہے گا تو جناب محمد آصف وٹو کی یہ وقیع کتاب اُس کو نہ صرف تمام ضروری معلومات فراہم کر دے گی بل کہ اُس کی مطلوبہ کاوشوں کے لیے ایک رہ نما کتاب ثابت ہوگی۔ دو سو انتالیس (۲۳۹) صفحات پر مشتمل اس کتاب کا طویل ترین باب اوّل (۹۴ صفحات) بعنوان ''ڈاکٹر شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف اور اعترافات'' مندرجہ ذیل ذیلی عنوانات کے تحت ان کے سوانحی کوائف اور اعترافات کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ ''ذاتی کوائف۔ خانوادہ۔ تعلیم۔ ملازمت۔ اعزازات۔ اہم عہدے اور ذمہ داریاں۔ تحقیقی کام۔ تصانیف۔ نگراں تحقیقی مقالہ جات۔ تعلیمی ذمہ داریاں۔ اعترافاتِ کارکردگی۔ صحافتی خدمات۔ رکنیت۔ اساتذہ کرام۔ اسفار۔ مصروفیات۔ مقالات۔ فیچر۔ انٹرویو۔ تبصرے۔ فلیپ۔ شبیہ شناسی۔ برصغیر کے نام ور دانش وراور اکابرین (۵۴ حضرات) کی آرا۔ ماہ نامہ 'شام و سحر' کے حوالے سے ۶۷ دانش وروں کی آرا، ۷ اشعرا کے منظومات تحسین۔ کتاب کے اس اوّل باب کے مطابق برصغیر کے بیش تر اہلِ دانش نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی فنی اور اَدبی خدمات کو سراہا ہے۔ تمام اکابرین اور شعرا نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ سب ہی اُن کی فہم و دانش اور علمی اور اَدبی کاوشوں کے قائل اور مداح ہیں۔ راقم الحروف بھی اُن کے مداحوں میں شامل ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن جس محنت اور لگن اور تواتر کے ساتھ علمی و اَدبی کام کر رہے ہیں وہ قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ صد ستائش بھی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہمیں بھی بہت عزیز ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مرثیہ فاؤنڈیشن کے رکن ہیں۔ دوسرے وہ مرثیہ فاؤنڈیشن کے

سرپرست اور دورِ حاضر میں صنفِ رثا کے ایک بڑے حامی اور نام ور مرثیہ گو برادرم سید وحید الحسن ہاشمی کے ہونہار فرزند ارجمند ہیں۔ جناب وحید الحسن ہاشمی نے فروغِ صنفِ رثا کے لیے پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص بڑی جد و جہد اور کوششیں فرمائی ہیں۔ والدِ ماجد کی تعلیم و تربیت کا ہی اثر ہے جو ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی و اَدبی خدمات میں جلوہ فگن ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

اب جب کہ جناب وحید الحسن ہاشمی کے تعلق سے مرثیے کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ تذکرہ نگاری اور تنقید و تحقیق کے حوالے سے دنیائے اُردو نے صنفِ رثا کے ساتھ کسی بھی عہد میں انصاف نہیں کیا۔ اُردو زبان کا بیشتر شعری ذخیرہ صنفِ رثا پر مشتمل ہے اور اُردو زبان کی عظیم شاعری اسی صنفِ سخن میں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی نے مرثیے کو اُردو کی شہ رگ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں "مراثی یعنی رثائی اَدب اُردو کی شہ رگ ہے" (خط مورخہ چوبیس جون ۱۹۹۶ء بنام اقبال کاظمی)۔ آنجہانی ڈاکٹر رستوگی نے میرے نام ایک اور خط مورخہ ۵ مئی ۱۹۹۶ء میں فرماتے ہیں۔ "اُردو کا رثائی اَدب نہ ہوتا تو اُردو زبان Epic (رزمیہ) سے ناواقف رہتی اور جو بلندیاں اسے ملی ہیں وہ مرثیوں ہی سے عبارت ہیں...... اُردو کے عظیم شاعروں میں صرف دو ہی نام لیے جا سکتے ہیں، انیس اور دبیر۔ اعلیٰ اقدار کے حامل اور انسانیت کے عَلم بردار یہی دو ہیں۔" اس اعتبار سے اُردو زبان کی تذکرہ نگاری اور تحقیق و تنقید کو رثائیات کے حوالے سے لبریز ہونا چاہیے تھا مگر بدقسمتی سے انتہائی غیر اَدبی طرزِ فکر کی بنیاد پر تذکرہ نگاروں اور نقاد حضرات اور محققین بائمکین نے اس عظیم صنفِ سخن پر وہ توجہ نہیں دی کہ جس کی یہ صنفِ سخن بجا طور پر مستحق تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے جہاں دیگر موضوعات اور کتابوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے وہاں رثائی کتابیں اور رثائی موضوعات بھی اُن کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے خود بھی مرثیے کی کتابیں مرتب کی ہیں۔ میں چاہوں گا کہ وہ اپنی تنقیدی کاوشوں میں رثائی موضوعات اور رثائی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ دیں۔ اپنے دامنِ ترجیحات کو اور زیادہ کشادہ کریں اور فراخ دلی سے کام لیں۔

جناب محمد آصف وٹو نے "تنقیدی اور تحقیقی سفر"۔ "تنقیدی زاویے" اور "تنقیدی اختصاص" کے ابواب میں جو ارشادات فرمائے ہیں وہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقیدی روش، ترجیحات اور نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات کی ترجمانی اور تفہیم جناب محمد آصف وٹو کی نہایت مستحسن اور کامیاب کاوش ہے جو قابلِ صد ستائش ہے۔ مَیں اُن کو اس کتاب کی اشاعت پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میری وٹو صاحب سے بھی گزارش ہے کہ وہ اپنی تنقیدی اور تجزیاتی کوششوں میں صنفِ رثا کو اوّلیت دیں تا کہ عہدِ حاضر بھی اس عظیم صنفِ سخن کی عظمت و اہمیت سے واقف ہو سکے اور یہ تجزیاتی اور تنقیدی تحریریں صنفِ رثا کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

◆◆◆

اُردو تحقیق وتنقید کے بحرِ مواج......ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

آفتاب احمد ملک

◆◆

دل پہ سو رنگ سے کردار سحر کھلتا ہے
ذہن پہ دفترِ معیارِ بشر کھلتا ہے
یوں بجھ لو کے جہاں عقل کے پَر جل جائیں
اُس سے آگے میری تخلیق کا دَر کھلتا ہے

۲۵ مختلف موضوعات پر کُتب کے مصنف، دبستان تحقیق وتنقید کی معتبر و مستند شخصیت، اَن گنت شاگردانِ رشید کے مقبول ومحبوب اُستاد، مایہ ناز شعرا و ادبا کے ہم عصر نقاد، مختلف الجہات خوبیوں کے مالک، ادیبانہ، حکیمانہ، فلسفیانہ گفت گو کرنے والے مقرر، اہم شخصیات کے شخصی وفنی خاکوں کے مرتب، ماہ نامہ 'شام وسحر' کے معنی خیز اداریوں کے ذہین وفطین اداریہ نگار، شعری شعور کے مبلغ، دنیائے مرثیہ وسلام کے منفرد شاعر اہلِ بیتؑ، کُتب بینی کتب نگاری میں سرفہرست صاحبِ کتاب، دیباچہ، آراء نگار دانش ورانِ تمام صفات کا حامل نہ انسان نہ جن بل کہ مؤکل ہے جیتے جی اتنے اعلیٰ، ادبی، تحقیقی اور تخلیقی کارہائے نمایاں سرانجام دیتے ہوئے اہلِ فکرونظر سے مخاطب ہیں:

میں نے تاریخ تو لکھ دی ہے کھرے لفظوں میں
حاشیے بعد میں لکھیں گے پرکھنے والے

خوش بخت سیّدزادے کی شخصیت وفن پر پروفیسر محمد آصف وٹو صاحب جو صاحب موصوف کے شاگرد رشید ہیں، ۱۹۵۸ء تا ۲۰۰۶ء تک کا علمی وتنقیدی سفرنامہ کتابی صورت ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' میں منصۂ شہود پر لائے ہیں۔ یہ کتاب حقیقتاً تشنگانِ اَدب وتنقید وتحقیق کے لیے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی

ہے۔ خصوصاً جب ان پر ایم۔فل یا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ منظرِ عام پر آئے گا تو بطور مستند حوالہ یہ تصنیف ہی ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

ہاشمی خاندان کے چشم و چراغ نے خداداد صلاحیتوں کی بنا پر تنقیدی وادی میں ان مٹ تحریری نقوش اہلِ قلب و نظر کی نذر کیے ہیں۔ نئے سے نئے چراغ جلائے ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ سے دبستانِ لاہور کا سفر ہو یا قدیمی مراثی کا مشکل ترین اَدبی جائزہ کمالِ عقیدت کم وقت میں فرائض سرانجام دیئے ہیں۔ تنقیدی بصیرت کی عکاس ہر سو تحریراً تصانیف و تالیفات کے اُفق پر موجود ہے۔ بقول ڈاکٹر صاحب :

مرا وجود ہے تخلیقِ زندگی کا بھرم
میں کائنات کے پیکر میں ہوں رگوں کی طرح

ابوالعباس کا قول ہے کہ:

''ہم بادشاہوں کی صحبت اختیار کریں تو عزت نفس ہوتی ہے۔ تاجروں میں بیٹھیں تو دل کے غریب ہو جائیں گے۔

ہماری ہم نشین کتابیں اور صرف کتابیں ہیں جن سے کسی فتنے اور بدمزگی کا اندیشہ نہیں اور نہ ان کی زبان اور ہاتھ سے کوئی خطرہ ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کی فکر انگیز کتب کی خوش بو ہر سو حساس فکر و نظر کو معطر کر رہی ہے۔ جدید تنقیدی میدان میں انفرادی رجحانات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کمالِ محنت و محبت، کہنہ مشق شعرا و ادبا اور اہلِ قلم کی گم شدہ میراث کو صفحۂ قرطاس پر لا کر دم لیا ہے اور بکھری تنقیدی تاریخ کو یک جا کر دیا ہے۔ وسیع مطالعہ و عمیق تجربہ کی بنا پر بوسیدہ اوراق کو تحریراً کتب کی شکل میں اربابِ علم و کمال کو مطالعے کے لیے تحفتاً دی ہیں۔ ہر کتاب ایک چلتی پھرتی تاریخ ہے گو اس سیم زدہ بے حس معاشرہ میں کتب بینی نہ سہی اُس کے باوجود قومی و اَدبی جذبوں سے سرشار، مردِ قلندر نے بلا چوں و چرا یادگار کارنامے سرانجام دے کر تحقیق و تنقید کی نئی راہیں وا کی ہیں، بقول شاعر کے :

مجھے تنقید کی بوچھاڑ سے بجھنا نہیں آتا
مری آزادگی شُعلہ مقالی ساتھ لائی ہے

اربابِ شعروادب کے لیے ''شبیہ شناسی'' اب ایک مستقل تحقیقی موضوع بن گیا ہے ایک شخصی خاکہ نہیں بل کہ تحریک جس نے شائقینِ علم و اَدب کو لائبریری کے لیے تنقیدی اور تحقیقی کتب کے تحائف دیئے ہیں :

زندگی بہ حباب اندر
دنیا بہ کتاب اندر!

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر کالم آرائی کرنا یعنی دو صفحات میں قدر آسان نہیں ہے۔

بقول شخصے کہ:

ہر زاویے سے ایک مکمل کتاب ہوں
میرا مطالعہ نہ کوئی سرسری کرلے
مشہور ہوں تو کاتب اخبار سے کہو
میرے کلام کی بھی کتابت جلی کرے

ڈاکٹر صاحب ایک کھلی کتاب ہیں، ورق ورق نئے موضوعات کی یونیورسٹی ہے اپنے آپ کو تنقید کے لیے پیش کر رہے ہیں:

تم سمندر کو بھی اک موج سے کم لکھتے ہو
پیاس لکھتے ہو جنھیں کیسے وہ دریا لکھیں
میرے لفظوں میں تو کردار نمایاں ہو مرا
ان کی مرضی میرے ناقد مجھے جیسا لکھیں

ادبی خدمات ہوں یا اعزازات معروف اہلِ قلم کی آراء ہی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی وسیع النظری تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں کا برملا اعتراف ہی بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں کے مصداق کامیاب کامران انسان کی بین ثبوت بھی ہے:

تقلید میری کرتے ہیں، شعراء نسل نو
فن میں بھی حسن کرامت ہوں آج میں
تاریخ اپنی پلکوں سے لکھے گا ہر کوئی
اک تاج محل جیسی عمارت ہوں آج میں

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی پذیرائی کا سنگِ میل

پروفیسر وحید عزیز

◆◆

ہمارے معاشرے میں شعروادب کی قدر و قیمت بہت کم ہو گئی ہے۔ کتاب پڑھنے والے تقریباً معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ پڑھنے والوں کی عدم دل چسپی ہی کا نتیجہ ہے کہ تخلیق کاروں میں بھی مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اس مایوسی کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کتابیں کم حیثیت اور بے وقعت ہو کر رہ گئی ہیں۔ لکھنے والوں کے اہداف تبدیل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح پڑھنے والوں کی سوچ بھی بدل گئی ہے اور وہ ادبی رسائل و جرائد کے بجائے جاسوسی ڈائجسٹ یا اسی قسم کے مواد کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ ادب کے حوالے سے صورت حال روز بروز رو بہ زوال ہو رہی ہے۔ اس مایوسی اور ادب کی بے قدری کے دور میں اگر کوئی اچھی کتاب معرضِ وجود میں آ جائے تو خوشی بھی ہوتی ہے اور حیرت بھی، حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ لکھنے والے آج بھی ادب کی آبیاری اور خدمت میں مصروفِ عمل ہیں اور اس مادی دور میں جب لوگ صرف اور صرف مادی خوش حالی اور مادی بہتری کے لیے کوشاں ہیں، لکھنے والے آج بھی ادب کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہیں اور خوشی اس بات پر ہوتی ہے کہ آج کا ادیب اپنے قاری سے مایوس نہیں ہے بل کہ وہ اپنی کاوشوں اور تخلیقات سے قاری کو شعروادب کے مزید نزدیک کرنا چاہتا ہے اور معاشرے میں شعروادب کی آبیاری کر کے شعروادب کی منزلت بڑھانا چاہتا ہے۔ اس مایوسی کے دور میں پروفیسر آصف وٹو کی نئی کتاب ''ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' دیکھ کر دل کو خوشی ہوئی کہ انھوں نے ادب سے اپنے تعلقِ خاطر کو بحال رکھا ہے بل کہ میں کہوں گا کہ اس کتاب کو لکھنے کے بعد پروفیسر آصف وٹو ایک نقاد کے طور پر اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن علم و ادب کے ایک ایسے روشن ستارے ہیں جن کی چمک سے آسمانِ ادب جگمگا رہا ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے علم و ادب کے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ شاعری ہو، تنقید

ہو یا تحقیق انھوں نے ہر میدان میں اپنے تخلیقی جوہر مکمل توانائی کے ساتھ دکھائے ہیں۔ مَیں نے توانائی کی بات اس لیے کی ہے کہ علم واَدب میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے جتنا بھی کام کیا ہے یا کر رہے ہیں وہ مکمل لگن اور محبت سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اگر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی اَدبی خدمات کی بات کریں تو اُن کا ہر وصف دوسرے سے ممتاز نظر آتا ہے لیکن بطورِ خاص تنقید کے حوالے سے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے تنقید کے حوالے سے اَدب کی جو خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں مَیں سمجھتا ہوں کہ کوئی دوسرا محقق و ادیب اس توانائی اور لگن سے اَدب کی اس خدمت میں مصروفِ عمل نہیں اور غالباً یہی چیز پروفیسر آصف وٹو کی اس کتاب کا سبب بنی ہے۔ پروفیسر آصف وٹو نے نہایت مہارت سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات کو ظاہر کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی اَدبی خدمات کو خوب صورت طریقے سے سراہا ہے۔

عصرِ حاضر میں تنقید تحسین یا مدح سرائی ہو کر رہ گئی ہے۔ پروفیسر آصف وٹو نے مخصوص انداز سے ہٹ کر کام کیا ہے اس اہم اور کامیاب کوشش کے لیے یقیناً یہ نوجوان محقق مبارک باد کا مستحق ہے۔ پروفیسر آصف وٹو کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کے مروجہ دبستانوں اور معروف رویوں سے اپنی تنقید کو آراستہ کیا ہے۔ انھوں نے عصرِ حاضر کے بہترین نقاد و محقق ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے ان تنقیدی اوصاف کو بڑے سلیقے اور ہنر مندی سے پیش کیا ہے جو قارئین کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ پروفیسر آصف وٹو کی یہی کوشش و کاوش اَدب سے ان کے ذوق و شوق اور لگن کو ظاہر کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آصف وٹو صاحب نے انتہائی مہارت سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے ان اوصاف کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ پروفیسر آصف وٹو نے کہیں بھی عقیدت و احترام کو فنِ تنقید و تجزیہ پر غالب نہیں آنے دیا۔ پروفیسر آصف وٹو کی محققانہ سوچ نے ہر طرح سے ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی اوصاف کا جائزہ لیا اور پھر اسے اپنے خوب صورت اندازِ تحریر سے باذوق قارئین کو عصرِ حاضر کے عظیم محقق و نقاد، شاعر کے متعلق عمدہ اور باکمال معلومات مہیا کیں۔ پروفیسر آصف وٹو نے تحقیق کی دنیا میں شاندار کام کیا ہے۔

پروفیسر آصف وٹو نے اپنی کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کروایا ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف اور اعترافات پیش کر کے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصی زندگی کا احاطہ کیا ہے اور دانش وروں کی نگاہوں سے ڈاکٹر صاحب کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ دوسرے باب میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی، تحقیقی اور تخلیقی سفر کی روداد انتہائی دل چسپ انداز میں بیان کی ہے۔ تیسرے باب میں پروفیسر آصف وٹو نے جدید و قدیم تنقیدی دبستانوں کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی اوصاف یک جا کیے ہیں۔ آخری باب میں انھوں نے اُردو تنقید کی دنیا میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے امتیازات بیان کیے ہیں۔ اس طرح پروفیسر آصف وٹو نے انتہائی عرق ریزی اور ہنر مندی کے ساتھ

ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی رویوں کو اُجاگر کر دیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس کتاب کے فلیپ میں عصرِ حاضر کے عظیم محقق و نقاد ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو ''محنت کا جن'' قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود محض محنت کے جن نہیں بل کہ انھوں نے کئی چھوٹے چھوٹے جن پال رکھے ہیں۔ محنت کے باغیچے میں پلنے والے جنوں میں سے ایک پروفیسر آصف وٹو بھی ہیں۔ ابھی وہ ایسے جن ہیں جو بوتل سے آہستہ آہستہ باہر نکل رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ پوری طرح بوتل سے باہر آ گئے تو وہ بھی عظیم جن کے روپ میں علمی و اَدبی دنیا میں اپنا مقام و مرتبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پروفیسر آصف وٹو مبارک باد کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اَدب کی آبیاری میں مصروف محقق کے متعلق ایک تحقیقی کتاب تخلیق کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے معاشرے کی ترقی میں یہ کتاب مثبت اضافہ ہے اور اَدب کی خدمت و آبیاری کی طرف ایک مضبوط قدم ہے۔ وٹو صاحب نے جس محبت، خلوص اور محنت سے یہ کتاب تحریر کی ہے مجھے اُمید ہے کہ یہ ''شبیہ شناسی'' کے لیے سنگِ میل ثابت ہوگی اور آنے والا زمانہ ان کی اس تخلیق پر انھیں خراجِ عقیدت ضرور پیش کرے گا۔

◆◆◆

پروفیسر آصف وٹو کی شبیہ فہمی

پروفیسر انیقہ سلیم

◆◆

تنقید کا معنی ہے کھرے کو کھوٹے سے علاحدہ کرنا۔ مگر وہ نقاد کیا کرے جس کا سامنا ہی کھرے سے ہو۔ اُسے چاہیے کہ وہ، وہ کرے جو محمد آصف وٹو نے کیا۔ کچھ نہیں کیا، بس اُستاد شناسی کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ کم ہے کیا؟ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اُردو تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔ اُردو کے تمام نامور ادیب، نقاد اور شاعر حضرات ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی اور تحقیقی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اپنے اُستاد کے بارے میں وٹو صاحب لب کشائی کیا کرتے، انھوں نے اُستاد کی تعریف بزبانِ اساتذہ کر دی۔ ہر اس نظر کو پڑھا جس نے شبیہ کو دیکھا۔ ہر اس حرف کو سنا جو شبیہ کے لیے نکلا۔ ہر اس آئینے میں جھانکا جس میں شبیہ دکھائی دیا۔ یوں ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا تخلیق کیا۔ ایک مکمل شبیہ، شبیہ الحسن کی، جو آئندہ کے ناقد اور محقق پر ایک بڑا احسان ہے۔

پروفیسر آصف وٹو نے اس کتاب کا باب اوّل ڈاکٹر صاحب کے سوانحی کوائف سے سجایا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی کو واقعی ایک کھلی کتاب بنا کے رکھ دیا ہے۔ مصنف کا یہ طریقِ تحقیق دراصل اپنے اُستاد کی پیروی میں ہی ہے کیوں کہ خود ڈاکٹر صاحب کا یہ اختصاص ہے کہ وہ کسی تخلیق کا جائزہ لیتے ہوئے تخلیق کار کی زندگی کی پرتیں کھولنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی باب کا دوسرا حصہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ان کے ہم عصر نامور ناقدین، دانش وروں اور اکابرین کی آرا سے مزین ہے۔ یہ آرا جہاں ایک طرف تحقیق اور تنقید کے وسیع میدانوں میں ڈاکٹر صاحب کی نمایاں خدمات اور مرتبے کا اعتراف ہیں، وہاں آصف وٹو کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چوّن (۵۴) نامور اربابِ علم و دانش کی آراء کو ترتیب دینے کے بعد آصف وٹو پر اپنے استاد کی عظمت اور بھی واضح ہو چکی ہو گی۔ ان کا ایمان اور بھی راسخ ہو چکا ہو گا اور یقیناً اگر وہ اس کتاب کو پسِ پشت ڈال کر نئے سرے سے پھر کوشش کریں تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر تخلیق کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ان آراء کے بعد ماہ نامہ ''شام و سحر'' لاہور کے حوالے سے، جس کی اعزازی ادارت کے فرائض ڈاکٹر صاحب تقریباً دو عشروں سے انجام دے رہے

ہیں، مصنف نے باسٹھ اہلِ اُدب کی آراء کی تدوین کی ہے۔ بے شک اس پہاڑ کو سر کرنے کے لیے اُستاد شناسی کی شدید لگن ہی مدد دے سکتی تھی جو آصف وٹو میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی باب کے آخر میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن کے حوالے سے سترہ اہلِ سخن کا منظوم خراجِ تحسین سونے پر سہاگہ ہے۔

دوسرے باب میں پروفیسر آصف وٹو نے بڑی دانائی، مہارت اور سلیقے سے سنِ اشاعت و تخلیق کے مطابق ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کتب کا بھرپور تعارف پیش کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی پچیس تخلیقات پر نامور ادباء و ناقدین کی آراء اور تبصروں کو جمع کیا ہے انھوں نے انتہائی مہارت سے قاری کو ڈاکٹر صاحب کے دو عشروں پر محیط تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی سفر چند ساعتوں میں کرا دیا ہے۔ شبیہ شناسی کے متلاشی ایک طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ بالعموم اور اس باب کا مطالعہ بالخصوص کافی ہے۔ اس باب کے آخر میں مصنف نے جویانِ علم کے لیے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ مصنف کا یہ مطالعہ صرف ان کتابوں تک محدود رہا ہے جو ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات یا مرتبات کی ذیل میں مصروف ہیں۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مختلف اداروں کے ڈائریکٹرز کی حیثیت سے بے شمار کتابوں کی تسوید و ترتیب کی مگر بطور مرتب ان پر اپنا نام کندہ نہ کروایا۔ اسی طرح انھوں نے کئی شعراء اور ادبا کی معاونت سے ان کی تخلیقات کی اشاعت کی اور کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اندرونی صفحات پر بطور مرتب اپنا نام تحریر کرنا مناسب جانا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ طرزِ عمل بھی علم دوستی اور اُدب پروری کی ذیل میں آتا ہے۔ مصنف کے مطابق ڈاکٹر شبیہ کے ذہنی ارتقاء کی تفہیم کے لیے ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین بھی شامل ہو سکتے ہیں جن کا مطالعہ مصنف نے اپنی تخلیق میں شامل نہ کر کے قارئین کو شبیہ شناسی کی کھلی دعوت دی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مضمون نگاری پر کون قلم اٹھاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بارِ گراں بھی وٹو صاحب ہی اٹھائیں گے۔

پروفیسر آصف وٹو نے آخری دو ابواب میں تنقید و تحقیق کے مختلف زاویوں اور رجحانات پر بحث کرتے ہوئے ان پر ڈاکٹر صاحب کی دسترس اور پھر ڈاکٹر صاحب کے امتیازی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ دونوں ابواب جدید اُردو تنقید کے حوالے سے انتہائی اہم، قیمتی اور لائقِ صد تحسین ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں اور تخلیقات کا اعتراف ایک زمانہ کرتا ہے۔ آصف وٹو ڈاکٹر صاحب سے براہِ راست مستفید ہوئے۔ پھر ان کی تخلیقات کا گہرا مطالعہ کیا اور جب پیاس کی شدت برقرار رہی تو ڈاکٹر صاحب کے بارے میں وقت کے نامور اُدباء اور ناقدین کے مضامین، آرا اور خطوط کا بھی انتہائی شوق سے مطالعہ کیا اور یوں معروف دانش ور کانٹ کے مطابق ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہوگی کہ ''وہ جو ہے اور وہ جو تمھیں محسوس ہوتا ہے دو مختلف چیزیں ہیں، یقیناً ڈاکٹر صاحب جو ہیں اور جو ہمیں محسوس ہوتے ہیں دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ وٹو صاحب نے خدا جانے اس حقیقت کو پالیا ہے یا نہیں۔ بہر حال وہ جس سرعت سے شبیہ فہمی

کی منزلیں طے کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔

پروفیسر آصف وٹو بھی دوسرے ناقدین کی طرح ڈاکٹر صاحب کو ایک معتبر نقاد تسلیم کرتے ہیں۔ خاص طور پر انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے جس بہت بڑے نکتے پر روشنی ڈالی ہے وہ ان کا نسبتاً غیر معروف ادبا اور شعرا پر تحقیقی و تنقیدی کام ہے۔ واقعی ڈاکٹر صاحب کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور وہ اس نئے رجحان کے قائد کہلائے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک تہذیبی نقاد ہیں اور مصنف اس امر سے بخوبی شناسا ہے۔ مصنف نے انتہائی آسان پیرائے میں ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی و تحقیقی، فکری و شعوری بنیادوں، ان کی تخلیقات پر عصری تقاضوں کے اثرات، ان کی منطقی و سائنسی طرزِ فکر، تخلیقات میں عمرانی رویوں کی بھرپور عکاسی، عصری حسیت، نفسیاتی عوامل، تاریخی تنقید سے دل چسپی، ان کی وسعت نظری اور اُسلوب پر خوب صورت بحث کی ہے۔

کسی تخلیق کا بہتر جائزہ اس صورت میں ممکن ہے جب نقاد تخلیق کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کی زندگی کا بھی جائزہ لے۔ آصف وٹو کے مطابق ڈاکٹر صاحب کا یہ امتیازی وصف ہے کہ وہ تخلیق کا جائزہ لینے سے پہلے خالق کے سوانح کو بیان کرنا انتہائی ضروری گردانتے ہیں۔ اس سے خالق کی شخصیت اور شخصی رجحانات کے ساتھ ساتھ جوازِ تخلیق بھی سامنے آ جاتا ہے۔ یوں اس کثیر الجہتی مطالعہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کی اس تخلیق کے بارے میں رائے انتہائی معتبر اور ٹھوس ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تنقید کا دوسرا اہم وصف تکنیکی پہلوؤں پر گرفت کرتے ہوئے موضوعِ تخلیق کو زیادہ اہم جاننا ہے۔ آصف وٹو نے تکنیکی اور فنی پہلوؤں کو جسم اور موضوع کو روح سے تشبیہ دے کر مسئلہ سمجھایا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی روح کے لیے تڑپ کو اُجاگر کیا ہے۔

پروفیسر آصف وٹو کی تحریر کردہ کتاب ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' کے مطالعہ کے دوران جو بات مجھے سب سے نمایاں اور دل چسپ نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر صاحب کو جاننے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کی سعی بھی ہے۔ شاگرد اپنے اُستاد کا بہترین مستحن ہوتا ہے اور آصف وٹو صاحب نے اپنے اُستاد کو بغور پڑھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی مزاج اور طریق کار کو ہو بہو اختیار کر کے اُنھوں نے نا صرف ایک مؤدب شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے بل کہ اُردو اَدب میں ایک بہترین کتاب کا اضافہ کیا ہے جو شبیہ فہمی کے متلاشی دانش مندوں کے لیے روشن قندیل ثابت ہوگی۔

(مطبوعہ)

۱۔ ماہنامہ 'تخلیق' لاہور، فروری ۲۰۰۷ء

◆◆◆

پروفیسر آصف وٹو کی گراں قدر تصنیف

پروفیسر انیقہ سلیم

◆◆

تنقید ایک فطری اور معاشرتی عمل ہے اور جب یہ اَدبی تنقید ہو تو اس کا کام نظریاتی اقدار کو پرکھنا، پڑتال کرنا، محفوظ کر کے نسل در نسل آگے منتقل کرتے رہنا ہے۔ یہ اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے جب نقاد غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے فن سے انصاف کرے۔

پروفیسر محمد آصف وٹو کی پہلی کاوش ''ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' ایک تجزیاتی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ جس کا بنیادی مقصد قارئین کو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب یعنی مصنف کے اُستاد نام دار و کام گار کے ہمہ گیر سوانحی کوائف اور تنقیدی، تخلیقی و تحقیقی سفر سے متعارف کروانا ہے۔ اگر ہم ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے علمی و اَدبی اوصاف شمار کرنا چاہیں تو اس کے لیے کئی دفتر بے پایاں درکار ہوں گے کیوں کہ ڈاکٹر صاحب کے فکر و فن کے حوالے سے اُردو زبان میں گراں قدر کام ہو چکا ہے لیکن مصنف نے اچھے استاد شناس اور دانش جو کا ثبوت دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی ذات کے مختلف پہلوؤں سے شناسائی حاصل کی جو اسے دوسروں سے ممیز کرتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جو کہ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے باب اول (ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف اور اعترافات) کے پہلے نصف میں ہر فن مولا اَدب دوست ڈاکٹر صاحب کے سوانحی کوائف نہایت تفصیل و متوازن طریقے سے بیان کیے گئے ہیں جو ان کی شخصیت اور فن کے جملہ محاسن سے آگاہ ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مصنف کا شاہ کار فن دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اسی باب کے نصفِ ثانی میں عصرِ حاضر کے چون نام ور، ناقدین، محققین، دانش وروں اور اکابرین

نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اپنی متنوع اور نادر آراء دی ہیں۔ مصنف نے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کے فکر و فن سے وابستہ لوگوں کی تحریروں کو جمع کیا بل کہ ان کا تنقیدی جائزہ بھی لیا۔ ایک حوالے سے یہ کام تحقیق و تنقید کا ہے اور تخلیق کے اُفق سے ہویدا ہو کر حیرت سامانیاں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اَدبی خاندان کا شاگرد ہونے کا حق مصنف قرطاس و قلم سے انصاف کر کے اَدا کر رہے ہیں۔

مختلف آراء کے بعد ڈاکٹر صاحب کی زیرِ ادارت شایع ہونے والا علمی و اَدبی ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور کے حوالے سے مختلف دانش وروں کی باسٹھ آراء کی تدوین کی گئی ہے۔ یہ منفرد رنگ کی بلند پایہ کتاب پذیرائی اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جانے کی ایک عمدہ دلیل ہے اسی باب کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اَدب کے سترہ مختلف عقیدت مندوں کا منظوم خراجِ تحسین کتاب کی عمدہ تزئین ہے۔

باب دوم (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر) میں مصنف نے ڈاکٹر صاحب کے تخلیقی سفر کا تحقیقی، تنقیدی اور نفسیاتی جائزہ لیتے ہوئے ان کی تمام مرتبہ و تخلیقی کتب کو سن وار پیش کیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے پچیس فن پاروں پر نام ور اربابِ علم و فضل کی آراء یک جا کی ہیں جنھوں نے تحقیق و تنقید کی روایت کو معیار، اُسلوب سے آگے بڑھایا ہے اور اس بات پر ایقان اور بھی راسخ ہو جاتا ہے کہ اہلِ اَدب ڈاکٹر صاحب کی بطور محقق اور نقاد ہر دو حیثیتوں کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے معترف ہیں۔

باب سوم (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات) میں مصنف نے تنقیدی اوصاف کا احاطہ کیا ہے ان کی تنقیدی خصوصیات اور تنقیدی دبستانوں سے ڈاکٹر صاحب کی وابستگی کو نہ صرف پیش کیا بل کہ ڈاکٹر صاحب کو بطور تہذیبی نقاد سامنے لاتے ہوئے ان کی تنقید میں عمرانی زاویوں کی بھرپور عکاسی کی۔ بلاشبہ مصنف ڈاکٹر صاحب کو ایک دبستان مانتے ہیں اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو ایک گل دستے کی مانند پیش کیا ہے جس میں رنگارنگ فصلِ بہار کے پھول دکھائی دیتے ہیں۔

چوتھے اور آخری باب (اُردو تنقید میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا اختصاص) میں مصنف ڈاکٹر صاحب کا مختلف تنقیدی جہات میں اختصاصی جائزہ لیتے ہیں۔ تخلیق و تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تخلیقی عمل میں کئی حقائق پنہاں ہوتے ہیں۔ تنقید ان حقائق کا راز فاش کرتی ہے۔ کسی بھی خالق کی تخلیق اس کی اپنی ذات کی عکاس ہوتی ہے۔ مصنف کے مطابق ڈاکٹر صاحب تنقید کے لیے نہ صرف مصنف کی شخصیت بل کہ ناقدین کی آراء کی ایک ترتیب ذہن میں بنا کر فن پارہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے دلائل کا کھوج لگاتے ہیں تا کہ رائے صاف و شفاف رہے اور اس میں کسی قسم کا اشتباہ شامل نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی تنقید کا ستون دراصل فلسفہ خیر ہے اور جب یہی فلسفہ ان کے فنِ تنقید میں لفظوں کی صورت اختیار کرتا ہے تو تنقید کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔

کسی شاگرد کا اپنے اُستاد کے لیے اس انداز میں کتاب مرتب کرنا اَدبی ماحول میں خراجِ عقیدت کی ایک درخشندہ مثال ہے جو شخصیت شناسی اور اَدب شناسی کا خوب صورت شاہ کار پیش کرتی ہے۔ کتاب کی تحریر و تدوین میں بہت عرق ریزی اور جاں فشاں حد تک محنت کی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف نے اس کتاب میں آغاز سے اختتام تک معلومات کے کئی در وا کیے ہیں جس سے ڈاکٹر صاحب کی تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی شخصیت کی مختلف جہتوں کی تمام پرتیں کھلتی ہیں اور یہ ان کے فکر و فن کا محاکمہ ہے۔

ایزد تبارک و تعالیٰ پروفیسر محمد آصف وٹو کو فکر و فن کی دنیا میں وہ بلند مرتبہ و مقام عطا فرمائیں کہ جس کے خواب اور جستجو نے انھیں لکھنے پر مجبور کیا۔ آمین!

◆◆◆

'شام وسحر' کی اکیسویں سالگرہ

تاج سعید

◆◆

اُردو کے جو اَدبی رسائل ان دنوں شایع ہو رہے ہیں، ان کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے برابر ہے اور اس بارے میں ہمارے ثقہ بند ادیب اور شاعر فکر مند بھی رہتے ہیں کہ ان کی تعداد کم کیوں ہے آج تک کسی نے بھی ان کی زبوں حالی کے تدارک کی طرف توجہ نہیں دی۔ آنے والی ہر حکومت نے اَدبی رسائل کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی اور انجمن اَدبی رسائل کہ جن میں احمد ندیم قاسمی، صہبا لکھنوی اور کئی دوسرے نامی گرامی اہلِ قلم شامل تھے، نے جان لڑا کے ہر سربراہِ مملکت کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر سرکاری ذمہ دار افسر نے بڑی ذمہ داری سے اس کے حل کا وعدہ بھی فرمایا، لیکن کسی کو بھی توفیق نہ ہوئی کہ وہ کوئی ایسا ذریعہ تلاش کرتے کہ اَدبی رسائل کی خریداری میں اضافہ ہوتا یا پھر انھیں اتنی وافر مقدار میں اشتہارات دیے جاتے جن سے ان کی مالی مشکلات میں کمی واقع ہوتی اور اَدبی رسائل موت کے منھ میں جانے سے بچ جاتے۔

گزشتہ دنوں ایک بار پھر اکادمی ادبیات کے چیئرمین نذیر ناجی نے ہماری موجودہ حکومت کی توجہ اَدبی رسائل کی مشکلات کی طرف دلائی، ان کے ارشاد کے مطابق وزیرِ اعظم نے اَدبی رسائل کے لیے سرکاری اشتہارات ایشو کرنے کا وعدہ بھی فرمایا اور اس سلسلے میں انھوں نے محکمہ اطلاعات کے سربراہ کی توجہ دلانے کے لیے ان کو ان اَدبی رسائل کی ایک فہرست بھی فراہم کی، لیکن لگتا ہے کہ ابھی اس فہرست پر عمل درآمد شروع نہیں ہوا کہ ہمارے اَدبی رسائل کے صفحات ابھی تک اشتہارات سے خالی ہی ہیں۔

گرمی گزر گئی ہے اور اب سردی بھی چند دنوں کی مہمان ہے۔ بہار آئے گی اور اس کے جانے کے بعد ہمیں پھر موسمِ گرما کا استقبال کرنا پڑے گا اور موسموں کی تبدیلی کا یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن اَدبی رسائل کے حالات اور مشکلات حل نہیں ہو پائیں گے۔ ایسے اَدب کُش ماحول میں اور ایسے ملک میں جہاں خواندہ خواتین وحضرات کی تعداد بہت ہی کم ہے، وہاں اس قسم کی شکایت کہ اَدبی رسائل کم کیوں شایع ہوتے ہیں، یہ

بات عجیب سی لگتی ہے اور جو لوگ دنیا کی اشاعتی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ملک میں اَدب و شعر کی دنیا بانجھ پڑنے لگے تو اس ملک کے سربراہان اس کو سیراب کرنے کے لیے اپنے وسائل کام میں لاتے ہیں، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ جس گھر یا جس ملک میں کتب و رسائل نہ ہوں، وہ گھر اور وہ ملک بنجر اور بانجھ بن جاتے ہیں۔ علم واَدب کا فروغ اور تعلیم کی روشنی سے اذہان کو جلا ملتی ہے...... تہذیب وثقافت کے پودے کو پرورش پانے اور زندگی کے حُسن اور رنگ رُوپ کو سنگار کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پاکستان میں یوں تو چند نہایت ہی عمدہ اَدبی رسائل اپنے ایڈیٹروں کی ثابت قدمی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں دو ایک تو ایسے ہیں، جن کی مالی حالت مستحکم ہے اور جن کی عمر پچاس برس تک پہنچ گئی ہے۔ اور یہ ان کی سخت جانی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ہمارے سامنے ''شام وسحر'' کے نام سے ایک ایسا رسالہ اس وقت موجود ہے جو قطع وضع کے لحاظ سے خاصا سادہ ہے اور جس میں ہر ماہ ایک یا دو اشتہار ہوتے ہیں، جو اس کے اخراجات کی کفالت نہیں کر سکتے۔ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس رسالے کی مالی حالت زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ لیکن شیخ صفدر علی کے مالی تعاون سے اس اَدبی رسالے کو ڈاکٹر شبیہ الحسن ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے شایع کر رہے ہیں۔ رسالے کی باقاعدگی قابلِ داد ہے اور اس کے مدیر کی کوششوں ہی کی وجہ سے ملک کے سارے ہی معروف ادیب اور شاعر ''شام وسحر'' کے ساتھ قلمی تعاون کرتے ہیں اور کبھی بھی ایڈیٹر کو اس رسالے میں بھرتی کا مواد دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ سال میں ایک دو نمبر بھی شائع کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ''محرم نمبر'' تو خاصا جان دار ہوتا ہے اور بڑی باقاعدگی سے اس کی اشاعت کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

یہ تمہید ہم نے اس لیے باندھی ہے کہ یہ سادہ سا اَدبی پرچہ ''شام وسحر'' لاہور سے شایع ہو رہا ہے اور ہمارے سامنے اس کا جو تازہ شمارہ ہے وہ بائیسویں سال کا پہلا شمارہ ہے یعنی اس رسالے کو شایع ہوتے ہوئے اکیس برس گزر چکے ہیں۔ ہمیں اس کا علم نہیں کہ اس کے قارئین میں کون سے لوگ شامل ہیں، جن کی معاونت اسے جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہمیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ ہمیں اس رسالے کو اپنی کوئی تخلیق اشاعت کے لیے ارسال کرنے کا وقت کم ملتا ہے لیکن ڈاکٹر شبیہ الحسن اتنے فعال اور مستعد ایڈیٹر ہیں کہ وہ اس رسالے کو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شایع کرتے ہیں اور میری طرح کئی لوگ ابھی خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہے ہوتے ہیں کہ ڈاکیہ گھر کے دروازے پر دستک دے کر ''شام وسحر'' دے جاتا ہے۔

آندھی آئے یا طوفان، پاکستان کے موسمی حالات کیسے بھی ہوں ''شام وسحر'' کی باقاعدگی میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔ موجودہ شمارے میں ایڈیٹر نے حسبِ روایت اس بار بھی سال بھر کے بارہ شماروں کی ببلوگرافی (انتخاب ۹۷ء) مرتب کر کے شایع کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سال بھر میں ''شام وسحر'' کیسے کیسے اَدبی جواہر پارے ہر ماہ اپنے دامن میں سمیٹ کر لاتا رہا ہے اور کیسے کیسے علم وفضل کے مالکوں نے ہمارے لیے اپنے

فکر و خیال کے کتنے چراغ روشن کیے ہیں، جو آنے والی نسلوں کے لیے رہ نمائی کا ذریعہ بنیں گے۔

اسی رسالے (شام وسحر) میں سال بھر کے بارہ شماروں میں سے چند معیاری تخلیقات کا انتخاب بھی شایع کیا گیا ہے جس سے موجودہ شمارے کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس جریدے کے مدیر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ''زنہار شام وسحر'' کے عنوان سے جو اداریہ لکھا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''عصرِ حاضر میں ہر شخص پریشان حال و مضطرب ہے۔ زندگی گزارنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ادیب اور شاعر اس صورتِ حال سے بے چین ہو چکے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسے اَدب کش معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں، جہاں قاری، تخلیق کار اور اَدب کی مثلث ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بے اَدبی کی تند و تیز ہواؤں کے سامنے علم واَدب کے چراغ جلانا تو شاید ناممکن نہ ہو، تاہم اس کا تحفظ انتہائی محال ہے۔''

ایڈیٹر ''شام وسحر'' کا یہ ارشاد بجا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ انھوں نے ماہ نامے کے ذریعے ایک طویل عرصے سے علم واَدب کی شمع روشن کر رکھی ہے اور اُردو اَدب کے شیدائیوں کی سرپرستی سے یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اگر ادارہ کے ارکان کی ہمت اور حوصلہ قائم رہا تو ''شام وسحر'' آئندہ بھی اپنی اَدبی فتوحات جاری رکھے گا...... البتہ ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب سے یہ گزارش کرنی ہے کہ ایک طویل عرصے تک ایک ہی ڈگر پر چلنے سے ''شام وسحر'' کے معیار کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا انھیں چاہیے کہ نئے سال کے ساتھ اس رسالے میں نئے اذہان کے افکار سے اپنے جریدے کو سجانے کا سامان کریں تاکہ اس رسالے کے معیار کے ساتھ ساتھ اس کے ظاہری حُسن میں بھی اضافہ ہو، اور اگر اس کی ضخامت میں بھی تھوڑا سا اضافہ ہو سکے تو کیا کہنے۔

بہر حال، ہم ''شام وسحر'' کے نگران اور مدیرِ اعزازی کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ انھوں نے جس اَدبی علمی شمع کو جلائے رکھنے کا عزم کیا ہے، اس کے لیے خداوند تعالیٰ انھیں ہمت اور حوصلہ عطا کرے تاکہ وہ ''شام وسحر'' تشنگانِ اَدب کے لیے ذوق کی آبیاری کا فریضہ ادا کرتا رہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور ماہ نامہ 'شام وسحر'......فنی اور تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر شوکت زریں چغتائی

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کو ماہ نامہ 'شام وسحر' کے حوالے سے دیکھنا ایک طرف تو مشکل نظر آتا ہے چوں کہ اس جریدے میں جس قدر بھی اَدبی تخلیقات ملتی ہیں اگر ہم انھیں غور وفکر کے ساتھ پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے مثلاً اس کے جائزے سے یہ سرِ فہرست رجحان سامنے آتا ہے۔ ایک عظیم نقاد اور مدبر و مفکر قسم کی شخصیت نے بڑی چھان پھٹک کے بعد اور انتہائی محنت سے ان کی ترتیب و تدوین کو مدِ نظر رکھا ہے۔ نظم ہو یا نثر، سلام، نعت مرثیہ، کوئی بھی تخلیق عام طرزِ نگارش کی حامل اس ماہ نامے میں نظر نہیں آتی بل کہ اس میں بھی ایک خاص رجحان کی پیش رفت ملتی ہے۔

اگر شام وسحر کی باتیں، کے موضوع کا جائزہ لیا جائے تو علم واَدب کا کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر بات نہ کی جاتی ہو۔ جس طرح کہ یہ: ادیب وشاعر عصرِ حاضر کو کس قسم کے خیالات اور طرزِ عمل کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ اس کے کچھ فوائد ہیں یا محض علمی واَدبی کاوشیں نمود ونام کے پرچار کے لیے لکھی جارہی ہیں یا یہ کہ اَدب محض روزی کمانے کا ذریعہ بنا ہوا ہے یا اَدب کی سستی شہرت کمانے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے یا صرف علمی و اَدبی جدوجہد کو مذاق اُڑانے کا طرزِ عمل بنالیا ہے۔ تعلیمی درس گاہوں میں حصولِ علم کا مقصد ملازمت کے حصول کے لیے ضروری ہے یا اس سے اور بھی کسی کارآمد انسان کے بننے کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ دوسری طرف یہ کہ اساتذہ بھی طلبا کو کسی جوہرِ قابل بنانے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں یا نہیں۔

لہٰذا مجھے یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک بڑے نقاد، مصنف، شاعر اور ادیب ہیں جن کی تمام تر توجہ اور دل چسپیاں علم واَدب کی ترویج وترقی کی طرف مبذول رہتی ہیں۔ وہ ایک ایسے دیدہ ور ہیں جو کہ علم کے چمن کے لیے بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔

اور یہی نہیں معاشرتی رویوں اور حوالوں سے بھی ان کے موضوع ''باتیں'' میں جو کچھ نظر آتا ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے کی کم نظری سے معاشرے میں پیدا ہونے والی خرابیاں خامیاں پوشیدہ ہیں ان میں خاص طور پر ان خیالات کی نشان دہی ملتی ہے۔ اخلاقی پس ماندگی، بے جا طور پر دولت کمانا، راتوں رات امیر بننے کا خواب، اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کی تمنا میں بھاگ دوڑ اور دوسرے انسانوں کے حقوق پسِ پشت ڈالنا۔ اپنے آپ کو اہم اور قابل شہرت یافتہ سمجھنے کا تصور۔ اسی قسم کی کافی باتیں جن کو موضوع ''باتیں'' میں تحریر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے علمی و ادبی معیارات کو قائم و دائم رکھے۔ آمین!

نذر......ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب

نظم

یہ کرتے ہیں اقدار اہلِ نظر
یہ ''شام و سحر'' ہے، یہ ''شام و سحر''
کہیں اُس کے الفاظ کی خوش بوئیں
جو روشن بھی کرتی ہیں قلب و نظر
کہیں لفظ و معنی و افکار ہیں
کہیں بات کرتی ہے دل پہ اثر
جنھیں لفظ و معنی کا ادراک ہے
وہی جان پائیں گے تیرا ہنر
ہر ایک شعر و جذبے میں پیغام ہے
یہ اقدار کرتی ہے میری نظر
اُدب میں شبیہ الحسن کا کیا ہے مقام
مجھے بھی خبر ہے تمھیں بھی خبر
کہا مجھ سے دل نے کہ زرّیں تو لکھ
قصیدے کی صورت میں ہے پُراثر

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بحیثیت مدیر 'شام و سحر'

ڈاکٹر غلام یٰسین

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔[۱] آپ کا تعلق ایک معروف علمی و اَدبی خانوادے سے ہے۔ آپ کے والدِ گرامی (وحید الحسن ہاشمی) نے اُستاد، ادیب، نقاد، مدیر، خطیب اور شاعر شہرت پائی ہے۔ جدید اُردو مرثیے میں ان کی حیثیت مسلمہ ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے بھی اپنے والدِ محترم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُردو زبان و اَدب کی ترقی کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ آپ اُستاد، شاعر، نقاد، محقق اور مدیر ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ آمدہ صفحات میں شبیہ الحسن بحیثیت مدیر ان کی خدمات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اُردو زبان کے ارتقا میں رسائل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اَدبی مجلہ عوام کی ذہنی تربیت میں ایک فعال قوت کے طور پر کام کرتا ہے۔ اَدبی جریدے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں مستند ادیبوں کے ساتھ نئے لکھنے والوں کو اپنی قلمی صلاحیتیں اُجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس میں پرانی اصناف کے ساتھ نئے تجربات بھی سامنے آتے ہیں۔ اَدبی رسالہ بہ یک وقت ایک مکتب، ایک مخزن اور ایک انجمن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اَدبی مجلہ نئے لکھنے والوں کی تربیت اور حوصلہ افزائی کا فریضہ انجام دیتا ہے اور ایک نسل کی میراث آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیتا ہے۔

اُردو زبان میں اَدبی رسائل کا آغاز ہوا تو ''فوائد الناظرین''، ''تہذیب الاخلاق''، ''صلائے عام''، ''دل گداز'' اور ''اُردوئے معلّی'' نے اس روایت کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔[۲] بیسویں صدی میں ارتقا کی اس لکیر پر ''مخزن''، ''الہلال''، ''ہمایوں''، ''نگار''، ''عالم گیر''، ''نیرنگِ خیال''، ''اَدبی دنیا''، ''ساقی''، ''اَدبِ لطیف''، ''سویرا''، ''نقوش''، ''نیا دور''، ''الزبیر''، ''سیارہ''، ''سیپ''، ''فنون''، ''اوراق'' اور ''شام و سحر'' ظاہر ہوئے اور اُردو کی ترقی میں اپنا کردار اَدا کرنے لگے۔

شیخ صفدر علی نے جنوری ۱۹۷۶ء میں ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور سے جاری کیا اور اب تک اس کے سرپرست اعلیٰ ہیں۔ آغاز میں ان کے مدیران معاون خالد شفیق بٹ اور آتش رومانی تھے۔[۳] ''شام وسحر'' نے اَدبی ذوق کی پرورش کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ ابتدا میں اسے خالد بزمی، نظیر لدھیانوی، لطیف ساحل، رشید کامل، طفیل دارا، راجہ رشید محمود، عارف شفیق اور متعدد کلاسیکی روایت کے حامل ادیبوں کا تعاون حاصل ہوا۔ خالد شفیق نے ''شام وسحر'' کے سالناموں کو نعت کے لیے وقف کیا اور پانچ ضخیم نعت نمبر شائع کیے۔ ۱۹۸۸ء سے خالد شفیق کی جگہ سید شبیہ الحسن نے لی ہے۔[۴] ان کے عہد ادارت میں شخصیات پر مختصر نمبر چھاپنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ ''شام وسحر'' نے اب تک ان کی ادارت میں اقبال نمبر، محرم الحرام نمبر (ہر محرم الحرام میں)، فیض نمبر، طاہر جعفر نمبر، دبیر نمبر، ظہیر کاشمیری نمبر، حسن عابد نمبر، اشاریہ نمبر، ساحر لدھیانوی نمبر، آغا سہیل نمبر، اَدبی جائزہ نمبر (ہر سال کے اختتام پر)، حلقہ ارباب ذوق نمبر، سیف زلفی نمبر، فرقان قریشی نمبر، شیر افضل جعفری نمبر، عمر فیضی نمبر، جعفر بلوچ نمبر، سلیم اختر نمبر، عظیم قریشی نمبر، قیصر بارہوی نمبر، صبا اکبر آبادی نمبر، حمید کوثر نمبر، سلام نمبر، ڈاکٹر معراج نیر نمبر، ڈاکٹر طاہر تونسوی نمبر، اور آپ بیتی نمبر (ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی نشانِ جگر سوختہ نمبر) شایع کیے ہیں۔ ''شام وسحر'' نے تاحال باقاعدگی کی روایت کو قائم رکھا ہے۔

''شام وسحر'' ایک مختصر ماہانہ اَدبی مجلّہ ہے۔ اس کی ضخامت عام طور پر پینتالیس سے پچاس صفحے ہے۔ اس کی فہرست پر نظر ڈالیں تو درج ذیل مستقل سلسلے نظر آتے ہیں۔ ''باتیں'' (اداریہ)، ''حمد و نعت''، ''مضامین''، ''شاعری'' (نظم، غزل) ''افسانہ''، ''خاکہ''، ''کتابوں پر تبصرہ''، اور ''نامے میرے نام''۔ مختصر رسائل کی افادیت بیان کرتے ہوئے مدیر ''شام وسحر'' لکھتے ہیں۔

> ''اَدبی رسائل تہذیبی علامت ہونے کے ساتھ ساتھ عصری ضرورت بھی ہوتے ہیں۔ ان اَدبی رسائل نے وقتاً فوقتاً عوام الناس کی جس طرح ذہنی تربیت کی ہے وہ اَربابِ اَدب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ بعض احباب کم ضخامت کے رسائل کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی اہمیت وافادیت کے منکر ہیں۔ اس حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ برصغیر پاک وہند کے عوام میں ایسے مختصر رسائل ہی سے تہذیبی اور فکری انقلاب برپا ہوئے ہیں۔''[۵]

اس ترقی یافتہ اور مصروف زمانے میں مختصر جرائد کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے کیوں کہ انھیں ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکتا ہے جب کہ ضخیم رسائل الماری کے شیلفوں کی زینت بن جاتے ہیں۔ انھیں دیمک کے سوا اور کوئی نہیں پڑھتا۔ ایک باشعور مدیر اپنے رسالے کے قارئین کو نہ صرف اچھے مضامین نظم ونثر فراہم کرتا ہے بل کہ اپنے اداریے میں ان تحریکات پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو عہد حاضر میں اَدب پر اپنے اثرات مرتسم کررہی ہیں نیز ان

کے نتائج کا تجزیہ بھی پیش کرتا ہے۔ کسی اَدبی پرچہ کا ادارتی صفحہ مدیر کا اپنا ذاتی صفحہ ہوتا ہے۔ جس میں وہ اپنے خیالات پیش کرتا ہے اور شمارے میں موجود تخلیقات اور تخلیق کاروں سے متعلق اپنی رائے دیتا ہے۔ ''شام وسحر'' کے اداریے اپنی افادیت کے اعتبار سے بے حد وقیع ہیں۔ ہر اداریے میں کسی نہ کسی اہم اَدبی مسئلہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور قارئین کی توجہ لمحہ موجود کے اَدبی مسائل کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے۔ مرزا ادیب ''شام وسحر'' کے اداریے سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''شام وسحر'' کا پرچہ دیکھتے ہی سب سے پہلے میں ''باتیں'' کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پروفیسر شبیہ الحسن نے اپنے ہر اداریے میں کوئی نہ کوئی ایسا موضوع ضرور چھیڑا ہے جو اَدبی مسائل کے حوالے سے اہم بھی ہے اور بھرپور توجہ کا مقتضی بھی''۔[6]

شبیہ الحسن کے ''باتیں'' کے عنوان سے لکھے گئے اداریے قاری اور مدیر اور ادیب اور مدیر کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہیں۔ ان اداریوں میں قاری اور تخلیق کار کی صحیح رخ پر سمت نمائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر انور سدید نے ان اداریوں کو ''اندھیرے کے جگنو'' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اداریے بنیادی طور پر مسائل کے اداریے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''وہ مسائل جن سے اَدبی دنیا فی الوقت دوچار ہے اور جو اَدب کے صحت مند ارتقا میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ بالالفاظ دیگر مدیر ''شام وسحر'' نے ہمیں ان مصائب سے آگاہ کرنے اور اَدب کے راستے سے خاروخس ہٹانے کا مشورہ دیا ہے اور مشورہ دینے کا انداز چوں کہ جارحانہ نہیں بل کہ شائستہ ہے۔ اس لیے بات دل میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

شبیہ الحسن کی بحیثیت مدیر جو پالیسی رہی ہے۔ اس پر ڈاکٹر آغا سہیل نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''شام وسحر'' کے اداریوں میں نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ کسی نہ کسی مسئلہ پر توجہ دی گئی ہے۔ جس میں اَدب کی خدمات کے لیے نئے عزائم بھی ہیں، ادیبوں کے باہمی تنازعات سے اَدب کو جو نقصان پہنچ رہا ہے، اس پر توجہ بھی دی گئی ہے۔ اشتہارات کے حصول میں اربابِ اختیار جس طرح دخل دیتے ہیں۔ اس کا ذکر ہے۔ مہذب معاشرے کی تشکیل میں بزرگوں کی آراء کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ علمائے سُو جس طرح کا اَدب تخلیق کر رہے ہیں، اس سے اَدب کو جو نقصان پہنچ رہا ہے، اس طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ بعض شعرا اور ادبا تازہ اَدبی مسائل اور حالات سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ اس کا ذکر ہے۔ نیز ان اداریوں میں اَدب، ادیب اور قارئین کے باہمی روابط سے صحت مند مقصدی اَدب کی تخلیق کے تعین میں آسانی پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔''[8]

ہمارے ہاں کتاب کو خرید کر پڑھنے کا رواج تقریباً ختم ہو رہا ہے۔ اس کا سبب ناشر اور قلم کار الیکٹرانک میڈیا کی برق رفتار ترقی کو قرار دیتے ہیں، لیکن کتاب کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔ کسی اَدبی مجلّے کی بقا کا انحصار اس کے مستقل خریداروں کی مناسب تعداد اور اشتہارات سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں حکومت اور پرائیویٹ سیکٹر دونوں طبقے اپنے وسائل سے ان رسائل کی مالی معاونت کرتے ہیں۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسا نہیں۔ صرف ان اَدبی رسائل کی حکومت سرپرستی کرتی ہے جو ان کے لیے پروپیگنڈے کا کام کریں۔ ان کے ہر اچھے بُرے عمل کی تعریف کریں۔ ''شام وسحر'' کو نہ تو زیادہ اشتہارات ملتے ہیں اور نہ ہی حکومت کی اسے ''سرپرستی حاصل ہے۔ یہ اَدبی خدمت شیخ صفدر علی اور شبیہ الحسن اپنے محدود وسائل سے انتہائی مستقل مزاجی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ مالی مشکلات کا ذکر شبیہ الحسن کے اداریوں میں ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''اَدبی رسائل کے ساتھ حکومت کا غیر ہمدردانہ رویہ سب پر عیاں ہے۔ اشتہارات اور نیوز پرنٹ کے سلسلے میں ان رسائل کے ساتھ جو بے رخی برتی جارہی ہے، اس کے اثرات مخرب اخلاق ڈائجسٹوں کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں''۔ ۹

اُردو زبان کو اس کا صحیح حق دلانے کے لیے اَدبی رسائل کے مدیروں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان رسائل میں اُردو کے دفاع میں مضامین شائع کیے ہیں نیز اپنے اداریوں میں اس کے حقوق کا دفاع کیا ہے۔ شبیہ الحسن نے بھی اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اپنے پیش رووں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اداریوں کے ذریعے اُردو زبان و اَدب کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالی ہے، اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ کسی قوم کی تہذیبی اور لسانی تشکیل میں زبان کس قدر معاون ثابت ہوتی ہے۔ اُردو زبان کی ترویج کے لیے شبیہ الحسن نے جو کوششیں کی ہیں۔ ان کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے :

> ''ہر مہذب ملک میں قومی زبان کو وقار اور تمکنت کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ علاقائی زبانوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے تاہم قومی زبان وفاق کی علامت ہونے کے ساتھ قوم کے مجموعی کلچر اور طرزِ اَدا کا موثر ذریعہ ہوتی ہے''۔ ۱۰

اس ناکامی کا سبب شبیہ الحسن کے نزدیک صوبائی اور علاقائی سطح پر بڑھتا ہوا لسانی تعصب ہے۔ ہر صوبے کا سیاست دان اپنی سیاسی دکان چمکانے کے لیے جس حربے کو پہلے استعمال کرتا ہے۔ وہ اس کے صوبے کی مقامی زبان سے متعلق ہوتا ہے۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ بعض اراکین اسمبلی انگریزی یا اپنی مقامی زبان میں حلف لینا پسند کرتے ہیں۔ اس نازک صورتِ حال کا ذکر شبیہ الحسن نے ان الفاظ میں کیا ہے :

> ''پاکستان میں علاقائی سیاست نے مرکزیت ختم کردی ہے۔ اس رویے نے اُردو زبان پر بھی

اثرات مرتسم کیے ہیں۔ اب تو اسمبلی کے ارکان بھی اُردو میں حلف اٹھانے سے گریزاں ہیں۔ یہ طرزِ احساس اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اُردو اب قومی زبان نہیں رہی اور علاقائی زبانوں کو اس پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔ ہر محبِ وطن پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ اُردو زبان کے فروغ کے لیے اپنا کردار اَدا کرے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کرے کہ وہ اُردو اور پاکستان کو لازم وملزوم سمجھتا ہے۔"[۱۱]

شبیہ الحسن کو معاصر اُردو اَدبی تنقید میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی تنقیدی آراء کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اُردو کی مختلف اصناف نظم ونثر سے متعلق کئی تنقیدی کتب اور مضامین لکھ چکے ہیں۔ ان کے مختصر اداریوں میں بھی عمدہ تنقید کے نمونے جابجا نظر آتے ہیں۔ ترجمہ ایک اہم صنفِ اَدب ہے۔ مترجم پر تخلیق کار کی نسبت دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے مگر بعض مترجمین اس فن کی نزاکت کا ادراک نہیں رکھتے۔ ایسے مترجمین کو شبیہ الحسن اپنے ایک اداریے میں یہ مشورہ دیتے ہیں:

"ایک زمانے میں ترجمے کا فن انتہائی دشوار سمجھا جاتا تھا اور ہر کس و ناکس اس کوچے میں قدم نہیں رکھتا تھا۔ تاہم مقامِ افسوس یہ ہے کہ عصرِ حاضر کے خود ساختہ مترجمین نے اسے کارِ طفلاں بنا دیا ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ ایک زبان کے لفظ کو دوسری زبان میں منتقل کر دینا ترجمہ کہلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر لفظ کا ایک تہذیبی پس منظر ہوتا ہے۔ جسے سمجھے بغیر ترجمے کا حق ادا نہیں ہو سکتا، کامیاب مترجم وہی قرار پاتا ہے جو بین السطور خیال کو اپنی گرفت میں لے اور تخلیق کار کے ذہن کے قریب پہنچنے کی کوشش کرے۔"[۱۲]

ایک اور اقتباس دیکھیے جس میں قاری کو ان کے تنقیدی شعور کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ شبیہ الحسن لکھتے ہیں:

"کسی بھی معاشرے میں فرد کی حیثیت اساسی ہے۔ فرد کے ذہنی رجحانات ومیلانات کی تشکیل میں معاشرہ نمایاں کردار اَدا کرتا ہے۔ اگر معاشرہ مثبت رویے تخلیق کرے تو فرد کی قوتِ متخیلہ کی پرواز درست سمت اختیار کر لیتی ہے جب کہ منفی معاشرتی رویے تخلیق کار کے ذہنی ہیجان کا سبب بنتے ہیں۔ مہذب معاشرے میں تخلیق کاروں کی عزت محض اس بنا پر ہوتی ہے کہ وہ مخرب اخلاق رویوں کی بیخ کنی کر کے معاشرے کو راہِ راست پر لاتے ہیں۔"[۱۳]

عصرِ حاضر میں پاکستانی ادیب اپنے فرائض سے غافل ہو کر مالی منفعت کے حصول میں تمام اخلاقی و اَدبی روایات پامال کر رہے ہیں اور اعلیٰ اَدب کا ادراک رکھتے ہوئے بھی اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ فن کار معاشرے کا حساس فرد ہے۔ وہ جس معاشرے میں سانس لیتا ہے وہ اس سے بے گانہ کیسے رہ سکتا ہے۔ یہی سبب

ہے کہ وہ اپنے ملکی وقومی مسائل کا ادراک رکھتا ہے۔ ہم اسے سیاسی شعور کا نام دے سکتے ہیں۔ شبیہ الحسن بھی اپنے ملک کی سیاسی صورتِ حال کا بڑا ادراک رکھتے ہیں۔ ان کا ایک اداریہ ملاحظہ ہو:

''جمہوریت کی بحالی کے ساتھ ہی فکر و دانش کی سطح پر یہ مسئلہ سب سے پہلے اُبھر کر سامنے آیا ہے کہ ایک صحیح جمہوری معاشرے کی بنیاد رکھنے کے لیے کن فکری جمہوری اقدار کی ضرورت ہوگی۔ جمہوریت بنیادی طور پر افکار و نظریات کی رنگارنگی اور اختلاف رائے کو قبول کرتی ہے......ایک جمہوری معاشرہ ادیب اور فن کار کی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے مناسب حالات اور بہتر ماحول فراہم کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ادیب اور فن کار آمرانہ حکومتوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ موجودہ حالات میں تمام تخلیق کاروں کا یہ فرض ہے کہ وہ معاشرے میں نئی فکری بحثوں کا آغاز کریں تاکہ ہماری تہذیبی زندگی کو ایک نئی سمت مل سکے۔''[۱۴]

لمحہ موجود میں ایک سے زیادہ تحریکیں پنپ رہی ہوتی ہیں۔ ہر تحریک میں معقول تعداد میں اُدبا اور شعرا وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسے میں اُدبی رسائل کے مدیر بھی کسی ایک تحریک سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ان کے رسائل پر کسی خاص تحریک یا اُدبی گروہ کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ ایسے مدیروں کی تعداد کم ہے جو غیر جانب دار رہتے ہیں۔ صرف اعلیٰ فن پاروں کو اپنے رسائل میں جگہ دیتے ہیں اور اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ اس فن پارے کا خالق کس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی نظر صرف تخلیق کے معیار پر ہوتی ہے۔ شبیہ الحسن کا شمار بھی ایسے ہی مدیروں میں ہوتا ہے جو صرف اعلیٰ تخلیق کی قدر کرتے ہیں۔ ان کے شمارے ''شام و سحر'' میں ہر گروہ اور ہر تحریک سے وابستہ لوگوں کی معیاری نگارشات شامل ہوتی ہیں۔ شبیہ الحسن فن کار سے زیادہ اس کے فن کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ تمام مکتبہ ہائے فکر کے اہلِ دانش نہ صرف ان کے مداح ہیں بل کہ اپنی تحریریں بھی ان کے شائع کردہ اُدبی مجلّے کے صفحات پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ شبیہ الحسن کے اس غیر جانب دارانہ رویے پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''اُدبی جرائد کے شہر لاہور میں جن پرچوں نے سنجیدہ علمی مباحث اور غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر سے اپنے لیے اہم مقام بنالیا ہے۔ ان میں سید شبیہ الحسن کا ماہ نامہ ''شام و سحر'' بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ اس رسالے کو گروہ بندی، تعصبات اور ذاتی جھگڑوں سے دُور بل کہ محفوظ رکھا جائے۔''[۱۵]

عصر حاضر کی غیر یقینی سیاسی صورتِ حال نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اُدب کو بھی متاثر کیا ہے۔ آج کا ادیب اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ وہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہو کر اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرے۔ اس خواہش کے نتیجے میں ادیب کی فطری آزادی سلب ہوگئی ہے اور اُدب جذباتی

نعروں کی زد میں آ گیا ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن اس نازک صورت حال سے بچنے کے لیے ادیبوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں:

''ادیب دیانت داری سے وہ اپنے نظریات کو پیش کرے اور کسی قسم کی سیاسی گروہ بندی میں مبتلا ہوئے بغیر حق وصداقت کے علم کو بلند رکھے۔''[۱۶]

یہ رویہ جمہوریت پسند ادیبوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں جمہوری نقطہ نظر پسندیدہ ہوگا وہاں اختلاف رائے بھی ہوگا، اگر یہ اختلاف مثبت ہو تو بہت پسندیدہ عمل ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن بھی مثبت اختلاف رائے رکھنے والوں کا بڑی کشادہ دلی سے احترام کرتے ہیں نیز ان کی تحریروں کو بھی ''شام وسحر'' میں جگہ دیتے ہیں۔تعمیری اختلاف رائے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ایک اداریے میں رقم طراز ہیں:

''ہر تخلیق کار کا اپنا ایک نقطہ نظر ہوتا ہے۔جس کی ترسیل کے لیے وہ شعر وادب کو وسیلہ بناتا ہے، تاہم اگر کوئی ادیب اپنے نظریہ کو حرف آخر سمجھتے ہوئے اسے دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرے تو یہ ناانصافی ہی نہیں ادبی بددیانتی بھی ہے...... ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم اپنی خامیوں اور دوسروں کی خوبیوں پر توجہ دیں۔''[۱۷]

شبیہ الحسن کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے، جو سچ بات کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔وہ کھری بات کہنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔آج کل غیر ملکی میڈیا کی یلغار نے جس طرح ہماری مشرقی تہذیب وثقافت کو نقصان پہنچایا ہے، بل کہ مٹا کر رکھ دیا ہے۔شبیہ الحسن نے بڑی جرأت کے ساتھ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ''شام وسحر'' کے اداریوں میں اس قومی حمیت کے مسئلے پر آواز بلند کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''کسی قوم کی شناخت اس کی تہذیب وثقافت کی مرہون منت ہے۔حقیقت یہ ہے کہ قومیں اپنی ثقافت کے ذریعے زندہ رہتی ہیں۔یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ پچاس برس گزر جانے کے باوجود ہم اپنی ثقافت کے خدوخال متعین نہیں کر سکے۔یہی سبب ہے کہ عصر حاضر میں ہمارے ہاں جس کلچر کو اُجاگر کیا جا رہا ہے، وہ کسی بھی طرح ہماری روایت کا حصہ نہیں ہے۔''[۱۸]

کسی ملک کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشی، مجموعی اور انفرادی خامیوں کی نشان دہی کے لیے طنز ومزاح بہترین حربہ ہے۔ڈاکٹر شبیہ الحسن اس فن سے خوب آشنا ہیں۔انھوں نے اپنے اداریوں میں بعض جگہ طنز ومزاح کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ان کے اداریوں میں طنز ومزاح کے نمونے ملاحظہ ہوں:

''ہمارے تخلیق کاروں کو زندگی میں کلیات چھپوانے کا جنون پیدا ہو گیا ہے۔ایک زمانے میں رحلت کے بعد کلیات کی اشاعت قابل تحسین سمجھی جاتی تھی۔زندگی میں کلیات کی اشاعت نے قاری کو الجھن میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ شاید اس کلیات کے خالق کا

تخلیقی سفر ختم ہو گیا ہے۔ تخلیق کاروں سے التماس ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنا فاتحہ خود نہ پڑھیں۔ دوسروں کو بھی اس کا موقع فراہم کریں۔''[19]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''عصر حاضر میں سیاسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اُدبی تخلیق کار بھی اپنا چولا بدلنے کی فکر میں ہیں۔ آپ اس صورت حال ''اُدبی ہارس ٹریڈ نگ'' قرار دے سکتے ہیں۔''[20]

موجودہ عہد کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا عہد ہے۔ آئے دن کی سائنسی ایجادات نے انسانی فرد کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں صرف وہی شخص کامیاب ہوگا، جو حالات کی تیز رفتاری کا ساتھ دے سکے گا۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے جدید ذرائع سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ان سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے تخلیق کاروں نے ان دونوں ذرائع ابلاغ کو درست طریقے سے استعمال نہیں کیا۔ اس رجعت پسندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر غیر اُدبی لوگوں کا مکمل قبضہ ہو گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی تخلیقات میں معاشرے کے اہم مسائل کو جگہ دیں اور ہر قسم کے میڈیا کو اپنے نظریات کی تشکیل کے لیے استعمال کریں اگر ہم نے قدامت پرستی کو ترک نہ کیا تو آنے والے زمانے میں ادیب اور اُدب دونوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔''[21]

ہماری معاشرتی زندگی سے شعر و اُدب کو بے دخل کرنے والے خود ہمارے ادیب اور شاعر ہیں۔ جنھوں نے زندگی کے بدلتے رخوں کو نہ تو محسوس کیا اور نہ ہی اپنی تخلیقات میں محفوظ کرنے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ آگے نکل گیا اور اُدب پیچھے رہ گیا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے سماجی رویوں کو اتنی گہرائی سے پیش کیا ہے، جس کا تصور بھی محال ہے۔

''شام و سحر'' کے اداریے مختصر مگر انتہائی جامع ہوتے ہیں۔ شبیہ الحسن کے قلم کا یہ ایجاز ہے کہ وہ ایک بڑے موضوع کو چند لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں اور پیرایہ بیان ایسا دل چسپ کہ اس اجمال پر تفصیل کا گمان ہوتا ہے۔ شبیہ الحسن نے ''شام و سحر'' (آغا سہیل نمبر)[22] شایع کیا تو اپنے اداریے ''باتیں'' میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فکر و فن پر اس جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''اس دنیا میں ان لوگوں کی تعداد انتہائی قلیل ہے جو خود بھی منزل آشنا ہوں اور دوسروں کو بھی منزل مقصود تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر آغا سہیل ان کامیاب ترین انسانوں میں سے ایک ہیں۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی ایک واضح نقطہ نظر کے ساتھ بسر کی اور بے شمار لوگوں کو منزل آشنا کیا۔ آغا سہیل ایک مشہور افسانہ نگار، معروف ناول نگار، مقبول سفرنامہ نگار،

کامیاب معلم اور معتبر نگارہی نہیں بل کہ ایک علم دوست اور شریف النفس انسان ہیں۔''۲۳

الغرض شبیہ الحسن نے ''شام وسحر'' کو ایک اُدبی تحریک بنا دیا ہے۔ علم واُدب کی سرپرستی از خود ایک کٹھن راہ ہے مگر اس سنگلاخ راستے پر شبیہ الحسن اب تک بڑی خوبی اور کامیابی سے چل رہے ہیں۔ ایک جانب مستند ادبا اور شعرا کی تحریریں اس کے اُدبی معیار کو فزوں تر بناتی ہیں تو دوسری جانب نوآموز لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اس اُدبی مجلّے کی اہم شناخت ہے۔ ''شام وسحر'' کے پرچے اپنے علمی واُدبی معیار کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ ان میں کلاسیکی اور جدید رویوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ''شام وسحر'' نے مختلف ادیبوں اور شاعروں پر مضامین اور خاص نمبر شائع کیے ہیں، جو تاریخی اور مستند حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شبیہ الحسن مدیر اعزازی کی حیثیت سے ''شام و سحر'' کا اداریہ ''باتیں'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ دس پندرہ سطروں میں اہم اُدبی مسائل اور معاملات کو اس خوبی سے سمیٹتے ہیں کہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے اور ایک گہرا اثر بھی قائم رہتا ہے۔ اس طرح شبیہ الحسن کا بحیثیت مدیر اپنے معاصرین میں اختصاص یہ ہے کہ:

اول: ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اداریے مختصر اور جامع ہیں۔

دوم: یہ اداریے بڑے پُراثر اور جاذبِ نظر ہیں۔

سوم: ان اداریوں کے اُردو اُدب پر دُوررس اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

چہارم: یہ اداریے گہرے ناقدانہ شعور کے حامل ہیں۔

....

حوالہ جات

۱۔ محمد آصف وٹو، ''شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف''، شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات، ۱۳، اظہار سنز، ۱۹۔ اُردو بازار، لاہور ۲۰۰۷ء۔

۲۔ غلام یٰسین، ''اُردو افسانے کی روایت اور مجلّہ نقوش لاہور''، ۹، ۱۹۷۹ء۔
مقالہ برائے ایم۔ فل اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، ۱۹۹۵ء۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں اُدبی رسائل کی تاریخ، ۲۳۵، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جنوری ۱۹۹۲ء۔

۴۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن، شام وسحر کی باتیں، ۶۳، الحبیب پبلی کیشنز، ۲۵۳۔ ایف رحمان پورہ، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۵۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن، ''باتیں'' (اداریہ) شام وسحر، لاہور، جولائی ۱۹۸۹ء۔

۶۔ مرزا ادیب، ''شام وسحر کی حکیمانہ باتیں''، شام وسحر کی باتیں، ۹۔

۷۔ ڈاکٹر انور سدید، ''اندھیرے کے جگنو''، شام و سحر کی باتیں، ۱۴۰۔

۸۔ ڈاکٹر آغا سہیل، ''شام و سحر کے اداریے''، شام و سحر کی باتیں، ۱۱، ۱۲۔

۹۔ شبیہ الحسن، ''باتیں'' (اداریہ)، شام و سحر، لاہور، اپریل ۱۹۹۰ء۔

۱۰۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، مارچ ۱۹۹۷ء۔

۱۱۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، مارچ ۱۹۹۷ء۔

۱۲۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، اگست ۱۹۹۷ء۔

۱۳۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، مئی ۱۹۹۴ء۔

۱۴۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، اپریل ۱۹۸۹ء ۔

۱۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، نامے میرے نام، شام و سحر، لاہور، جنوری ۱۹۹۲ء۔

۱۶۔ شبیہ الحسن، باتیں ، (اداریہ)، شام و سحر، لاہور، اکتوبر ۱۹۹۰ء۔

۱۷۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، مئی ۱۹۸۹ء۔

۱۸۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، اپریل ۱۹۹۶ء۔

۱۹۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، فروری ۱۹۹۳ء۔

۲۰۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، نومبر ۱۹۹۰ء۔

۲۱۔ شبیہ الحسن، باتیں ، شام و سحر، لاہور، مارچ ۲۰۰۷ء۔

۲۲۔ شام و سحر (آغا سہیل نمبر)، مدیر شبیہ الحسن، جون ۱۹۹۳ء۔

۲۳۔ شبیہ الحسن، باتیں ، اداریہ، شام و سحر، جون ۱۹۹۳ء۔

(مطبوعہ۔ ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور۔ جون ۲۰۰۷ء)

◆◆◆

madblib.org

شبیہ الحسن کے تخلیقی کارنامے

کرامت بخاری

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے تخلیقی سفر میں رواں دواں ہیں، اُن کی تخلیقات، مضامین، تحقیقی مقالہ جات، دیباچے اور انٹرویوز منظرِ عام پر آ چکے ہیں، وہ جناب وحید الحسن ہاشمی کے فرزند ارجمند ہیں۔ جناب وحید الحسن ہاشمی ہمارے عہد کے ممتاز مرثیہ نگار، منفرد لہجے کے منقبت نگار اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُن کی دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، برصغیر پاک و ہند میں مرثیہ کے حوالے سے اُن کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ''العطش'' اُن کے ۴۰ جدید مرثیوں کا مجموعہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت منوا چکا ہے، اس مجموعے کی تزئین، تدوین، تشکیل اور ترسیل کی ذمہ داری بھی شبیہ الحسن نے نبھائی۔ ایک مفصل دیباچہ جو کہ اپنی نوعیت کا ایک تحقیقی باب بھی ہے، اُس کا اضافہ کیا جس سے اُن مرثیوں کی تفہیم اور ابلاغ میں آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔

محترم شبیہ الحسن ملکی سطح پر حضرتِ انیسؒ اور حضرتِ دبیرؒ کے حوالے سے بہت سا تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ آلِ رضا اور قیصر بارہوی کے کلام کے حوالے سے تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی کام منظرِ عام پر آ چکا ہے، جب سے ڈاکٹریٹ سے فارغ ہوئے ہیں، اُن کا تحقیقی کام زیادہ تیزی سے منظرِ عام پر آیا ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کی ''حیات وفن'' پر ایک کتاب لکھ چکے ہیں۔ مفاہیم اور ''شام وسحر'' کی باتیں بھی ایک منفرد اور اچھوتا کارنامہ ہے، ''شام وسحر'' کی ادارت بذاتِ خود ایک بہت بڑی اَدبی خدمت ہے، اُردو اَدب وثقافت کے لیے اس خانوادے کی خدمات کا زمانہ معترف ہے۔

سیف زلفیؔ (مرحوم) کے لیے بھی شبیہ الحسن کا کام ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار، اُن کی تاریخ، روایت، فن، فکر، زبان و بیان اور ارتقا سب کچھ قلم بند کر چکے ہیں۔ اتنا ڈھیر سارا کام یقیناً کوئی ادارہ ہی کر سکتا ہے، مگر شبیہ الحسن یہ حیران کن مرحلہ طے کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

میرے خیال میں ''قیصر اقلیم مرثیہ'' اور ''العطش'' دو ایسے کارہائے نمایاں ہیں، جو رہتی دنیا تک اُردو

اُدب کے قارئین، ناقدین، محققین، مورخین اور مصنفین کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے رہیں گے۔

جدید تنقید کے مختلف نظریات، اس کی توجیہات، تشریحات اور تاویلات یعنی تاثراتی تنقید ہو یا نفسیاتی تنقید، سماجی وعمرانی رویوں سے مربوط تحریریں ہوں یا شعور وفکر کی بازیافت یہ سب کچھ شبیہ الحسن کے ہاں اکٹھا ہو گیا ہے۔ اتنی ڈھیر ساری خصوصیات کا ایک جگہ اکٹھا ہو جانا عطیہ خداوندی ہے کہ خالق نطق ولب کا کرم ہے ورنہ ایک آدھ اچھی تحریر بھی زندگی بھر میسّر نہیں ہوتی۔ انسان خالی دامن روانہ ہو جاتا ہے اور خالی ہاتھ سپرد خاک کر دیا جاتا ہے۔

میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ انھیں باب العلم کی دہلیز سے عطا ہوا ہے، شبیہ الحسن مظلوم کی حمایت میں لکھی گئی تحریروں، مرثیوں، منقبتوں، سلاموں اور نوحوں کو مرتب کرتا رہتا ہے، یک جا کرتا رہتا ہے اور اپنی تحقیق میں تخلیق کی آمیزش کے ساتھ ساتھ عبادت میں بھی مشغول رہتا ہے، شبیہ الحسن بہت ہی خوش قسمت نقاد ہے کہ وہ اپنے فن کی آبیاری، چشمۂ رشدوہدایت سے کرتا ہے، وہ ولائے آلِ محمدؐ سے سرشار ہے، کیوں نہ ہو یہ محبت اور عقیدت، اُسے وراثت میں ملی ہے، جناب وحید الحسن ہاشمی اور اُن کے والد گرامی اور اُن کے آباؤاجداد وثناخوانِ محمدؐ وآلِ محمدؐ رہے ہیں۔

اس مختصر سی تحریر میں نہ تو ان کے تخلیقی جوہر کا احاطہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کے تحقیقی کام کا تجزیہ و تذکرہ ممکن ہے۔ صرف اور صرف ایک تاثراتی نوٹ لکھا جا سکتا ہے جو کہ اعتراف ہنر کے ذیل میں آتا ہے، لہٰذا اس مختصر سی تحریر کو کسی آنے والے بڑے مضمون یا مقالہ کی out-line تصور کیا جائے، انشاء اللہ اگر زندگی نے مہلت دی تو جناب شبیہ الحسن کے فکروفن پر ایک تفصیلی مضمون سپردِ قلم کروں گا اور ''شام وسحر'' کے لیے روانہ کروں گا۔ میری دُعا ہے کہ رب کریم اس شخص کی توفیقات میں اضافہ کرے، اس کے قدم اور قلم میں روانی عطا فرمائے، اس کے نام، کام، کلام اور مقام میں مزید اضافہ وبرکت عطا فرمائے، یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

◆◆◆

'شام وسحر' ایک تحریک ایک دبستان

ڈاکٹر عباس رضا

◆◆

اربابِ دانش اس امر سے بخوبی آگاہ ہوں گے کہ علم و اَدب کی سرپرستی بجائے خود ایک کٹھن راہ ہے۔ اس سنگلاخ راستے پر چلتے ہوئے قدم بہ قدم لہو رونا اور جگر خوں کرنا پڑتا ہے مگر جن احباب کے پیشِ نگاہ خالصتاً اَدب کی خدمت مقصدِ حیات بن جائے وہ ہر قسم کی گروہ بندیوں سے ماوراء ہو کر اَدب کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر لحہ کمربستہ رہتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں ماہ نامہ ''شام وسحر'' اپنی اشاعت کو جس تسلسل سے برقرار رکھے ہوئے ہے وہ بجائے خود ایک حیران کن امر بھی ہے اور اپنے اَدبی معیارات کے حوالے سے یقیناً لائق صد تحسین بھی ہے۔ اس ماہنامے کا اختصاص یہ ہے کہ ایک طرف تو صفِ اول کے ادبا اور شعرا کی تحریریں اس کے اَدبی معیار کو فزوں تر بناتی ہیں اور دوسری جانب نو آموز لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی اس ماہنامے کی اہم روایت ہے۔ ماہ نامہ شام وسحر کی ایک اہم جہت معتبر اہلِ قلم کی پذیرائی کا سلسلہ بھی ہے جسے اس برس بھی عرش فیضی' حمید کوثر اور جعفر بلوچ جیسے مستند اور معتبر شعرا کے خاص نمبر شائع کر کے برقرار رکھا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ ماہ نامہ اپنی اس منفرد جہت کو آنے والے دنوں میں بھی برقرار رکھے گا۔

ماہ نامہ 'شام وسحر'' کو جو اعتبار اور وقار حاصل ہوا ہے۔ اس کارہائے نمایاں کا سہرا جناب شیخ صفدر علی کے سر ہے۔ جناب شیخ صفدر علی اَدب پرور اور اَدب دوست شخصیت ہیں جو زر پرستی کے اس دور میں بھی اَدب نوازی کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں' قارئین اَدب اس اَدب دوست بزرگ کے ممنونِ احسان ہیں۔

ماہ نامہ ''شام وسحر'' کے مدیر اعزازی ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا نام نامی تنقید اور تحقیق کے حوالے سے حرفِ معتبر کا درجہ رکھتا ہے۔ شبیہ صاحب نے جس انداز سے اپنے ذوقِ سلیم کی بدولت اس ماہ نامے کے فنی اور اَدبی حُسن کو چار چاند لگا دیے ہیں وہ حد درجہ لائقِ ستائش ہے۔ دعا ہے کہ ان کے ارادے اسی طرح جوان رہیں تا کہ پاکستان کی اَدبی دنیا ماہ نامہ ''شام وسحر'' کے دم قدم سے آباد رہے۔

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور جنوری ۲۰۰۶ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور ماہ نامہ ’شام وسحر‘ لاہور

محمد افضل ثاقب

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک ہشت پہلو نگینہ ہیں اوران کی ذات کا ہر رُخ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ معروف شاعر، مقبول ادیب، مستند نقاد، بے مثال محقق اور دانش ور ہونے کے ساتھ ساتھ اس ہاشمی قبیلے کے جواں مرد ہیں جہاں قرطاس وقلم ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جدید علمی وفکری نظریات کے مبلغ جریدے ’شام وسحر‘ کے مدیر بھی ہیں جس نے قیامِ پاکستان کے بعد اُدب کی صورتِ حال کو بدلنے میں اپنا مثبت کردار اَدا کیا ہے اور مَیں یہ بات بلامبالغہ و بلاشک کہہ رہا ہوں کہ نوجوانوں کی جتنی حوصلہ افزائی اس ماہ نامہ نے کی ہے کسی دوسرے رسالے نے نہیں کی۔ اس کے ساتھ ساتھ مضافات میں بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی جتنی قدر ڈاکٹر شبیہ الحسن کے وسیلے سے اس رسالے میں ہوتی ہے کسی دوسرے اُدبی جریدے میں نہیں ہوئی اور شاید آج میرا قلم اسی لیے ڈاکٹر صاحب کی مدیرانہ صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے بے چین ہے۔

اُدب کی ترویج واشاعت بذاتِ خود ایک کٹھن اور جان جوکھوں کا کام ہے اور خاص طور پر خالصتاً اُدبی وتنقیدی شعور بیدار کرنے کے لیے کسی علمی واَدبی مجلّہ کی اشاعت کی مثال ’’گھر پھونک تماشا دیکھ‘‘ کی سی ہے۔ ۲۹ سال سے ’شام وسحر‘ کی مسلسل اشاعت ڈاکٹر شبیہ الحسن کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا مظہر ہے۔ ماہ نامہ ’شام وسحر‘ کی ایک اہم خوبی اس کی ہر ماہ باقاعدہ اشاعت ہے۔ عصرِ حاضر میں شائع ہونے والے اکثر اَدبی رسائل بے قاعدگی کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار نیازی نے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے متعلق بالکل بجا فرمایا ہے کہ:

’’ڈاکٹر صاحب نے محنت شاقہ سے چھوٹی عمر میں جو علمی واَدبی مقام بنایا ہے۔ اس میں ان کا خونِ جگر شامل ہے‘‘ اور بقول شاعر:

ہم چراغوں کی جگہ دل کو جلا رکھتے تھے
پھر ہواؤں کے مقابل اُسے لا رکھتے تھے

اب تک تو ہم ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے شفیق الرحمٰن الٰہ آبادی اور ماہ نامہ 'شام وسحر' کے ذریعے سے متاثر تھے۔ آج ان سے ملاقات ہوئی ہے تو قیاس یقین میں بدل گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں نہ صرف تخلیق کاروں سے پیار اور محبت ہے بل کہ وہ ان کے لیے بہت سے عملی کام بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق اس قلم قبیلے سے ہے جو نہ صرف بڑے شہروں میں رہتے ہیں بل کہ دُور دراز مضافات میں اپنی جھوکیں آباد کر کے اور بجنل اور خالص اُدب تخلیق کر رہے ہیں اور ایسے لوگ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہیں۔

ماہ نامہ 'شام وسحر' سن ۲۰۰۳ء نومبر کے شمارے میں ڈاکٹر صاحب اپنے اداریے 'باتیں' کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

''عصرِ حاضر میں ہمارے ملک میں ادیبوں اور شاعروں کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ شہروں میں مقیم تخلیق کار تو کسی نہ کسی طرح اپنی تخلیقات کی اشاعت کا اہتمام وانصرام کر لیتے ہیں لیکن مضافات میں بسنے والے تخلیق کاروں کی تخلیقات کی اشاعت جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ شہروں سے دُور رہنے والے تخلیق کار اپنی اعلیٰ تر تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار نثری وشعری صورتوں میں کر دیتے ہیں لیکن انھیں خبر نہیں ہوتی کہ ان تخلیقات کا مستقبل کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مضافات میں شہروں کی نسبت اچھا اُدب تخلیق ہو رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ نثری وشعری تخلیقات شائع ہوں تاکہ ان کے حقیقی معیار کا احاطہ کیا جا سکے۔''

ماہ نامہ 'شام وسحر' ۲۹ برس سے مسلسل شائع ہونے والا واحد اور منفرد اُدبی جریدہ ہے جو بلا تفریق مختلف طبقوں کے اہلِ قلم کی نگارشات کو شائع کرتا ہے اور ہر قسم کی ادبی گروہ بندیوں سے بالاتر ہے۔ اس کے مطالعہ سے ملکی اور بین الاقوامی اُدبی صورتِ حال سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ سلسلہ ''تبصرہ کتب'' میں نئی اور اہم کتابوں کے مطالعے کا موقع ملتا ہے۔

سلسلہ 'نامے مرے نام' میں مختلف اہلِ قلم کی آرا سامنے آتی ہیں۔ ماہ نامہ 'شام وسحر' کے خاص نمبر خصوصاً فیض احمد فیض نمبر، ظہیر کاشمیری نمبر، ساحر لدھیانوی نمبر، حلقہ اربابِ ذوق نمبر، ڈاکٹر آغا سہیل نمبر، محرم الحرام نمبر، اقبال نمبر اور نعت نمبر قابلِ ذکر ہیں جو نہ صرف یادگار دستاویز ہیں بل کہ اُدب کے قاری اور ہر لائبریری کی ضرورت ہیں۔

ماہ نامہ 'شام وسحر' کی ترتیب، مضامین، مقالہ جات، ملکی و بین الاقوامی اُدبی تقریبات کی رپورٹیں غزلیں اور نعتیں، موقع کی مناسبت سے تنقیدی مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ ماہ نامہ 'شام وسحر' دسمبر ۲۰۰۵ء کے صفحہ نمبر ۳ پر بعنوان دو نعتیں سیّد وحید الحسن ہاشمی کا کلام ہے۔ نمونے کے طور پر ایک نعت کا مطلع پیش کر رہا ہوں:

لوگ اُن کو نہ سراہیں تو قلق ہوتا ہے
جن کا ہر لفظ محبت کا سبق ہوتا ہے

ماہ نامہ 'شام وسحر' میں حُسن انتخاب اور توازن اس قدر اعلیٰ ہوتا ہے کہ قاری داد و تحسین دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نومبر ۲۰۰۳ء کے شمارے میں صفحہ ۲۲ پر ڈاکٹر خیال امروہوی کی دو غزلیں دی گئی ہیں۔ ایک غزل سے صرف دو شعر پیش کر رہا ہوں۔ حسن انتخاب دیکھیے :

کسی تکمیل کا ساماں نہ ہاتھ آیا جوانی سے
نیا عنواں تراشو عمرِ رفتہ ...کی کہانی سے
تخیل میں اگر شامل نہ ہو احساس کی گرمی
اَدب بے کیف رہ جاتا ہے لفظوں کی گرانی سے

عصرِ حاضر کے علمائے اَدب، جید، ناقدین، محققین، جناب ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سہیل احمد خان، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب شہزاد احمد، ڈاکٹر آغا سہیل اور دوسرے اہلِ قلم نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اندازِ نقد و نظر کو سراہتے ہوئے خوب صورت تبصرے کیے ہیں۔ میں یہاں صرف ڈاکٹر خواجہ زکریا کے تبصرے کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں :

''گزشتہ ربع صدی میں نمایاں ہونے والے محققین اور ناقدینِ اَدب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں وہ وسیع المطالعہ اور کثیر الجہات شخص ہیں۔''

میں آخر میں ڈاکٹر صاحب کے اداریے سے ایک اقتباس پیش کر کے اجازت چاہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے نوخیز تخلیق کاروں کو اپنے قیمتی مشورے سے یوں نوازا ہے:

''عصرِ حاضر کے نوخیز تخلیق کاروں سے ہماری التجا ہے کہ وہ شعر و اَدب سے ربط ضرور رکھیں لیکن اپنے کلاسیکی اَدب کا بغور مطالعہ کریں اور اس میں اپنا خونِ جگر شامل کر کے اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بنائیں۔ اگر انھوں نے ہماری التجا کو اہمیت نہ دی تو ان کی تخلیقات سے آفاقی مہک مفقود ہو جائے گی۔''

◆◆◆

ایک نظریہ ساز نقاد۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر آغا سہیل

◆◆

پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے حتی الوسع تاریخ اُدب اُردو کا بالاستعیاب مطالعہ کر کے جن نتائج کے استنباط سے ترقی پسند شعور اپنی تخلیقی تنقید میں جذب کیا ہے وہ ان کی تجزیہ نگاری کو معتبر بناتا ہے نیز یہی وہ شعور ہے جو ہماری بیمار صحافت سے ان کے اَدبی مطالعے کی گہرائی اور گیرائی کو ممیز اور ممتاز کرتا ہے۔ ہمارے متعدد نام نہاد اساتذہ جو تنقید کا مجہول مذاق رکھتے ہیں دراصل نکتہ چینی سے اَدب کو داغ دار اور طلبہ کے اذہان کو منتشر اور مکدر کر رہے ہیں اور معاشرے کے مذاق کو جذبے، خیال اور وجدان کی طرف لا رہے ہیں جس نے سطحی صحافت (زرد) کو جنم دیا ہے۔ اَدب کا صحیح اور سلیم المذاق تقاضا اَدب کا گہرا مطالعہ چاہتا ہے جو روز بروز ماند پڑتا جا رہا ہے اور سہل انگاری سے صحافت جنم لے رہی ہے مابعد الطبیعاتی کے مطالعہ کی یک رُخی اور سستی نکتہ چینی جنم لیتی ہے جو اکثر مکروہ ہوتی ہے، نقاد کو معروضی طور پر کسی اَدب پارے کی عملی تنقید کر کے نظریاتی زاویے کا استخراج کرنا چاہیے۔ نظریے کی صحت پر اس کا ایمان ہونا چاہیے جو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرنا چاہیے، بخوبی جانچ اور پرکھ کر لینے کے بعد اسے منطبق کرنا چاہیے اور کسی تخلیق کار سے مطلقاً مرعوب نہیں ہونا چاہیے (متاثر ہونے کے بھی حدود و قیود ہوتے ہیں) خبر کی کسی ایک صنف کو کُل نہیں جز سمجھ کر اَدب کا محاکمہ کرنا چاہیے، حتیٰ کہ نقاد کو اپنی ذاتیات کو بھی منہا کر کے معروضی محاکمہ کرنا چاہیے جو ایک اَمر محال ہے۔ تحقیق میں غیر جانب داری ہی نقاد اور اس کے محاکمے کو معتبر بناتی ہے خود اس کی ذات (خواہ کتنی ہی گراں قدر کیوں نہ ہو) قاری شعوری اور لاشعوری طور پر محو کر دیتا ہے، غالباً یہ نکتہ شبیہ الحسن کو ملحوظ رہتا ہے، بیسویں صدی میں جس قدر سوشل سائنسز معرض وجود میں آئیں، تخلیق کار کی متخیلہ ان سے کسی نہ کسی حد تک متاثر رہی ہے اس لیے نقاد کا فرض ہے کہ تخلیق کار کی متخیلہ کا ادراک رکھ کر اس کے اُسلوب بیان کا تعین کرے، مادی جدلیاتی (کارل مارکس) نظریے نے انیسویں، بیسویں سے آج اکیسویں صدی تک تخلیق کاروں کو متاثر کیا ہے جو نقاد اس نظریے سے بوجوہ اغماض کرتے ہیں

وہ سچائی کو جھٹلانے کا ارتکاب کرتے ہیں، اَدب معاشرے کے رگ وریشے میں جذب ہوتا ہے اور مادی جدلیاتی ارتقا کا شعور اس میں جذب ہوتا رہتا ہے اس لیے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانے والے تخلیق کے جسد بے روح کو قبول کرتے ہیں اور روح کو بھول جاتے ہیں۔ شبیہ الحسن نے خواجہ الطاف حسین حالی سے لے کر پریم چند، اختر حسین رائے پوری اور سید سجاد ظہیر کے مادی جدلیاتی نظریے کے ارتقا کا معروضی تجزیہ کر کے اپنے اَدبی نقطۂ نظر کو وضع کیا ہے اگر موصوف کسی مصلحت کی بنا پر اپنے مطمحِ نظر کو خود قبول کرنے سے منکر ہوں تو آنے والا زمانہ ان کے معروضی نقطۂ نظر کو دریافت کر لے گا۔

نہ تو اَدب جامد ہے نہ معاشرہ، دونوں فعال ہیں۔ وقت کے حرکات وسکنات سے کوئی لمحہ نہ خالی ہے نہ تہی ہے ہر تخلیق معاشرتی محرکات وعوامل کے نقوش اپنے اُوپر ثبت کر کے محفوظ رکھتی ہے اس کتبے سے کوئی نقش خالی نہیں ہے جنوبی ہند سے شمالی ہند کا برصغیر ہو کہ شمالی ایشیا ہو کہ کائنات کا کوئی بھی خطہ ارضی ہو اپنا ریکارڈ اپنے جدول سے پُر ہے۔ یقین ہے کہ شبیہ الحسن اس کائنات کے اسی حصار میں جو علمی اور اَدبی نقش تنقید اور تخلیق کے نام پر بنائیں گے وہ دوام سے مکالمہ کرے گا کہ خونِ جگر سے اور صحت مند ذہن سے جو نقش بنتا ہے وہ نقش کالحجر ہوتا ہے۔

(مطبوعہ)

ہفت روزہ ''کرنیں'' لاہور، ۲۸ جنوری تا ۳ فروری ۲۰۰۷ء

پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، فروری ۲۰۰۷ء

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ محقق اور نقاد

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

◆◆

اُردو زبان واَدب کی ترویج وترقی کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر جتنا کام ہوا، اس کا احاطہ کرنا آسان نہیں مگر یہ طے ہے کہ سرکاری سطح پر جتنا کام ہوا، اسے مصلحت کے پیشِ نظر محدود رکھا گیا۔ تخلیق اور تحقیق کے علاوہ اصطلاحات کے تراجم ہوئے ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی خصوصاً اُردو کو دفتری زبان بنانے میں جہاں پس وپیش کی گئی وہاں اصطلاحات میں مغائرت غالب رہی اور وہ انگریزی زبان کا نعم البدل ثابت نہ ہوئیں اور آج بھی اُردو زبان کو وہ درجہ نہ ملا کہ وہ دفتری معاملات میں کارآمد خیال کی جاتیں، خصوصاً وفاقی حکومت نے انگریزی زبان کو وسیلۂ اظہار قرار دے کر اندر باہر ہر جگہ اسی زبان سے کام لینا اور اُردو کو محض نچلی سطح پر برتنا پسند کیا مثلاً پولیس، محکمہ مال یا دوسرے تعمیری محکموں میں ضلعی سطح پر اُردو سے کام لیا، جہاں تک شعرو اَدب کا تعلق ہے اس کے لیے حکومت نے اکادمی ادبیات، مجلس اقبال یا مجلس ترقی اَدب جیسے ادارے بنائے جو ہر حکومت کی طرف سے اپنے منظورِ نظر افراد کی ''خدمات'' کے پیشِ نظر ان کے حوالے کر دیے جاتے ہیں، اگر حکومتِ وقت ناراض ہو جائے تو بیک بینی ودو گوش نکال باہر کر دیا جاتا ہے جس کی تازہ مثال احمد فراز کا نیشنل بک فاؤنڈیشن سے سبک دوش کیا جانا ہے، ورنہ ان سے بڑی عمر کے دانش ور ابھی تک برسرکار ہیں بل کہ برسرپیکار ہیں۔

غیر سرکاری سطح پر تنقید وتحقیق کی مثال آبِ رواں کی سی ہے کہ یہ چشمہ کبھی خشک نہیں ہوا۔ اُردو اَدب کی عظیم روایات کو آگے بڑھانے میں ہمارے نقادوں اور محققوں کا کردار مثالی ہے۔ شعرواَدب کی تفہیم کا خوش گوار فریضہ اور ہمہ جہت تخلیقات پر نظر رکھتے ہوئے اپنے اپنے ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمارے نقادوں نے نثری کارناموں اور اصنافِ شاعری میں نام پیدا کرنے والے اہلِ قلم کی عرق ریزیوں کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس کا مطالعہ بجائے خود نہایت اہم ہے بل کہ اَدب کے طالب علم کی رہ نمائی اور تخلیق کار کی پذیرائی کا سبب بھی ہے، ہمارے ہاں تنقید اور تحقیق کے بنیادی اصول مشرق اور مغرب کے امتزاج کا آئینہ دار

ہیں۔ ابتدا میں تبصرہ نگاروں نے فنی محاسن کے پیش نظر جتنا جائزہ لیا اس سے کہیں زیادہ معنوی خوبیوں کو تنقید نگاروں نے سراہا لیکن عہدِ موجود میں کسی شاعر یا ادیب کی ذاتی زندگی، معاشرتی احوال اور سیاسی نظریات کو بھی زیرِ بحث لانا ضروری قرار پایا ہے چناں چہ ہمارے نقادوں اور تحقیق کام کرنے والے دانش وروں کا کام وقت گزرنے پر مشکل لیکن دل چسپ ہو چکا ہے، خصوصاً مغربی اُدب کے حوالے سے جن نظریات کو اہمیت دی گئی ان کی روشنی میں تخلیقی کاموں کی پرکھ کا رجحان عام ہوا لیکن عابد علی عابد اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے مشرقی اصول تنقید کے آئینے میں عملی اعتبار سے جو کارنامے انجام دیے انھیں ہر سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی اور یہی روایت عہدِ موجد کے نوجوان نقادوں اور محققوں کو بھی آگے بڑھانے کا خیال آیا ان میں فی الوقت ڈاکٹر شبیہ الحسن کا انداز نقد و نظر ہمارے پیش نظر ہے، اُردو زبان واَدب میں ان کا نام جانا پہچانا ہے اور وہ گزشتہ پچیس برس سے اپنا کام محنت اور لگن سے جاری رکھے ہوئے ہیں انھیں اپنے ہم عصر ناقدوں پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے ۱۹۸۱ء میں ایم۔اے کرتے وقت بھی تحقیق اور تنقید کا اعلیٰ معیار پیش کیا اور ''آلِ رضا کی غزل گوئی'' پر اپنا مقالہ ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی کی نگرانی میں لکھا جسے اَدبی حلقوں میں اس اعتبار سے سراہا گیا کہ آلِ رضا بحیثیت مرثیہ نگار اور سلام گزار تو جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن غزل میں بھی ان کے ہاں تغزل اور شعری نزاکت کے علاوہ تہذیبی رکھ رکھاؤ اپنے نقطۂ کمال پر ہے جسے صراحت اور وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے انھیں اپنی تحقیق سے غزل گوئی میں بھی انفرادیت کا پرچم تھما دیا ہے اور یوں آلِ رضا کو عہدِ موجود میں کلاسیکی روایت کی پاسداری کا حامل قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے پی ایچ ڈی کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ ''لکھنؤ کی اُردو شاعری'' ہے۔ لکھنؤ کی تہذیبی اور اَدبی میراث پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور دبستان لکھنؤ جیسی معتبر کتاب کی موجودگی میں کچھ اور لکھنا یا اس موضوع میں تنوع یا تخصیص پیدا کرنا آسان کام نہ تھا مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ڈاکٹر سہیل احمد جیسے نابغۂ روزگار نقاد اور محقق کی نگرانی میں اس موضوع کے ساتھ نہ صرف انصاف کیا بل کہ ہر اعتبار سے لکھنوی مزاج کے حسن و جمال کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اُردو اَدب میں اپنی تحقیق سے گفت گو کے نئے دَر وا کیے، اس میں شک نہیں کہ دریائے گومتی کے کنارے آباد یہ مرکزِ اَدب سمٹ کر صورتِ نقطہ رہ گیا ہے۔ اسی شہر سے ادیبوں، شاعروں، فن کاروں، خطاطوں اور مصوروں کے علاوہ مسعود حسن ادیب اور سیّد احتشام حسین جیسے نقادوں کا آبائی رشتہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ یہ مردم خیز سرزمین اپنی آغوش میں باکمال ہستیوں کو پروان چڑھاتی رہی۔ مگر انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں کچھ ایسے حادثے بھی گزرے کہ بہت سے اہلِ قلم ۱۹۴۷ء کے بعد وقتاً فوقتاً لکھنؤ چھوڑ کر پاکستان آ گئے، ڈاکٹر شبیہ الحسن نے لکھنؤ کی اُردو شاعری (۱۹۴۷ء۔۱۹۰۰ء) کا احاطہ کیا، اس کے بعد لکھنؤ پر کیا گزری یہ ایک الگ داستان ہے جسے ابھی لکھنا ہو گا، اب دریائے گومتی کے سرسبز کناروں پر ہر طرف ویرانی خیمہ زن ہے، لکھنؤ شائستگی اور نزاکت آفرینی یا اَدبی محاذ آرائی قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے مقالات کی فہرست طویل ہے جو ماہ نامہ ''شام وسحر'' کے علاوہ دوسرے اَدبی جرائد مثلاً ماہِ نو، افکار، صحیفہ، سہ ماہی دبستان، اَدبی مجلّہ مخزن، ارتقا کراچی یا روزنامہ جنگ کے اَدبی صفحے پر شائع ہوئے لیکن ان کا تحقیقی اور تنقیدی کام مختلف کتابوں اور موضوعات کے حوالے سے منظرِ عام پر آیا، وہ اَدب کے سنجیدہ قارئین سے داد پا چکا ہے، خصوصاً جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، کلیاتِ حبیب، ڈاکٹر آغا سہیل (شخصیت اور فن) مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی، منتخب اور معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین) اور بیسویں صدی کا شعری اَدب لائقِ تحسین ہے، ان کے مقالات اور مضامین کے مجموعے مفاہیم، ترجیحات، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار اور تصریحات پر ملک کے نام ور ناقدین نے ان کی محنت اور ریاضت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ذوقِ جستجو اور تحقیق کے اعلیٰ معیار کی تعریف کی ہے مثلاً ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کلیاتِ حبیب جون پوری سے متعلق لکھا کہ ''کلیاتِ حبیب'' مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھے شاعر سے ہمیں متعارف کرایا ہے اور ایک جوہرِ قابل کو مٹی میں ملنے سے بچالیا ہے'' اسی طرح پروفیسر ممتاز حسین نے ان کے تنقیدی شعور کو واضح، جچا تلا اور تیکھا بتلایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ نہ تو اس رجحان کو پسند کرتے ہیں کہ کلام تمام تر لفظی شعبدہ گری کا حامل ہو یا تمام تر روایتی ہو اور اس میں روایت سے سرِ مو انحراف نہ پایا جائے اور نہ وہ اس جدت پسندی کے قائل ہیں کہ جدید غزل کو اپنی فضا، معنویت اور ساخت میں ماضی کے تجربات سے بالکل ہی بے نیاز ہو جانا چاہیے۔ اس کے برعکس جہاں وہ غزل میں نئی معنویت یا انفرادی تجربات کے اظہار کو پسند کرتے ہیں وہاں وہ غزل میں ایک ایسا رچا ہوا اندازِ بیان بھی دیکھنا چاہتے ہیں جو ماضی میں اچھی غزلوں کا طرۂ امتیاز تھا اور جسے اس دور میں فراق، فیض اور دوسرے شعرا نے برتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شہزاد احمد، ڈاکٹر آغا سہیل اور دوسرے اہلِ قلم نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اندازِ نقد و نظر پر خوب صورت تبصرے کیے ان میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا یہ تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے کہ ''گزشتہ ربع صدی میں نمایاں ہونے والے محققین اور ناقدین اَدب میں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ اور کثیر الجہات شخص ہیں، ایک علمی و اَدبی خانوادے کے لائق فرزند ہیں اور مختلف النوع موضوعات پر قابلِ قدر تصنیفی و تنقیدی سرمایہ فراہم کر چکے ہیں ان کی تازہ ترین تنقیدی تصنیف ''تصریحات'' ہم عصر اہلِ قلم کے اَدبی کارناموں کو متعارف کرانے کے لیے ایک بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، معاصرین کے بارے میں اظہارِ خیال آسان کام نہیں مگر ڈاکٹر صاحب اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں، میرے خیال میں ''تصریحات'' کے مضامین دورِ حاضر کے نوجوان اہلِ قلم پر مزید تحقیق و تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو بھی اَدبی حلقوں میں اسی طرح پذیرائی حاصل ہو گی جو ان کی دیگر تصانیف کو اس سے قبل حاصل ہو چکی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر سلیم اختر کا تبصرہ دل چسپ نہیں تکلف آ رہے۔ میں جب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

کو دیکھتا ہوں تو مجھے "پتا پر پوت" والی ضرب المثل یاد آتی ہے۔ نیک باپ کا نیک اطوار فرزند۔ باپ نے مرثیہ نگاری میں نام پیدا کیا اور وحید العصر کا خطاب پایا جب کہ بیٹے نے مرثیے کی تحقیق و تنقید سے امتیاز پایا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تازہ تالیف "مختصر مرثیہ کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی" اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں سید وحید الحسن ہاشمی کی شخصیت کے مطالعہ کے ساتھ بطور مرثیہ نگار ان کے فن کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے مگر اس انداز اور اُسلوب میں کہ مرثیہ کے فن سے وابستہ تخلیقی امور اور فنی جزئیات کا بھی احاطہ ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ہم عصر اور نوجوان نقاد ڈاکٹر عبدالکریم خالد نے ان کے بارے میں جو بات کہی اسے بیان کرنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنے کسی ایک اَدبی کارنامے پر خوش ہو کر داد و تحسین کے انتظار میں نہیں رہتے بل کہ ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کام میں سرگرمِ عمل ہو کر خود کو ایک تسلسل کے ساتھ متحرک رکھتے ہیں اور یوں ہر آن ایک نئے انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں، انھوں نے اَدبی سطح پر جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ ان کی بے پایاں محنت اور ریاضت کا پھل ہے۔ تلاش و جستجو کی اُمنگ سینے میں بیدار رکھنے والے ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنی بات کہنے اور اسے منطقی نتیجے پر پہنچانے کے ڈھنگ سے پوری طرح واقف ہیں۔ انھوں نے اُردو اَدب کی تنقیدی اور تحقیقی روایت میں اکیسویں صدی کے ذہن کو شامل کر کے نہ صرف اسے تر و تازہ رکھا ہے بل کہ اپنے خوش گوار اُسلوب سے اسے عام قاری سے قریب تر کر دیا ہے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ بحیثیت مدیرِ اعزازی انھوں نے 'شام و سحر' کو ایسا معیار دیا ہے جو دوسرے اَدبی ماہ ناموں میں کم کم نظر آتا ہے، انھوں نے ملک کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا بھرپور تعاون حاصل کیا۔ نثر اور نظم کی جملہ اصناف کی نمائندہ تخلیقات اور ان پر سالانہ اَدبی جائزہ تسلسل کے ساتھ شائع کرنا آسان کام نہیں۔ انھوں نے خصوصی نمبروں کی اشاعت میں بھی اعلیٰ معیار کی تحریروں کو شامل کیا اور خود بھی معیاری مگر مختصر اداریے کی طرح ڈالی، شیخ صفدر علی نے 'شام و سحر' اور شبیہ الحسن کو لازم و ملزوم بنا کر اَدب پروری کی روایت کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ سالانہ اَدبی جائزہ پیش کرنا اور ہر مہینے کی نگارشات کو میزانِ نقد و نظر میں رکھنا گویا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے مگر شبیہ الحسن کو ڈاکٹر سلیم اختر کی معاونت حاصل رہی اور یہ کام بطریق احسن آگے بڑھتا رہا اور اب یہی کام پروفیسر ظفر الحق چشتی انجام دے رہے ہیں، ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ہمہ جہت شخصیت کیلئے ملک معراج خالد ایوارڈ ان کی بیس برس کی مختلف الجہات سرگرمیوں میں کامیابی کے ساتھ قدم بڑھانے کا وہ انعام ہے جس کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "حق بہ حقدار رسید"...... ہماری دعا ہے کہ وہ علم و اَدب کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں اور اساتذہ کی عزت و تکریم میں اسی طرح اضافہ کرتے رہیں۔ ان سے ہماری بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں یقیناً وہ کام کام اور کام سے شہرت دوام پانے والے ہیں۔

(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، دسمبر ۲۰۰۵ء)

◆◆◆

۱۹

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ایک سلجھا ہوا نقاد

خالد اقبال یاسرؔ

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اُردو زبان واَدب کے جید قسم کے پروفیسر ہیں لیکن ان کے اطوار پروفیسروں والے قطعاً نہیں ہیں۔مَیں نے اپنی زندگی میں اس قدر منضبط اور مرتب زندگی بسر کرنے والا پروفیسر نہیں دیکھا جو اپنے روزانہ انضباطِ اوقات پر اتنا مذہبی طور پر عمل کرتا ہو۔ان کی مصروفیات کی فہرست طویل تو ہے مگر وہ ایک ڈرل کی طرح اس پر عمل کرتے ہیں اور اس Rut رہٹ سے بے زار بھی نہیں ہوتے کیوں کہ ایک تو ان کی کوئی مصروفیت بے مصرف نہیں ہوتی اور دوسرے اپنے Tight Schedule کے باوجود ان کے پاس احباب کے لیے اتنا وقت ہوتا ہے کہ جو ہمارے فارغ البال اور وقت کی اہمیت سے ناآشنا شاعروں، ادیبوں اور اُستادوں کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اپنے آشناؤں سے اپنا رابطہ نہیں توڑتے۔ وہ دوست کی دہلیز کی طرف جانے والے راستے کو گھاس میں گم نہیں ہونے دیتے۔ایک حیرت اور کہ اپنی تمام خشک علمی، تعلیمی اور تنقیدی سرگرمیوں کے باوجود ان کا چہرہ ہمیشہ کھِلا کھِلا رہتا ہے جو ان کی طبعی اور باطنی خوش نیتی اور خلوص کا آئینہ دار ہے۔لااُبالی پن اور سیمابی کیفیت تو انھیں چھو کر بھی نہیں گزرتی۔ان کی شخصیت کا یہی حسنِ ترتیب ان کی تنقیدی کتب میں ترتیبِ حسن بن جاتا ہے۔اگر کسی نقاد کو اپنے زیرِ نظر موضوع اَدب سے، صنفِ اَدب سے اور اہلِ اَدب سے ہمدردی نہیں تو وہ حدِ اَدب سے آگے گزر جاتا ہے۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک سلجھے ہوئے نقاد ہیں وہ کسی ایسے موضوع یا ایسے شاعر پر قلم ہی نہیں اٹھاتے جنھیں وہ تشریح و توضیح کے قابل نہ سمجھتے ہوں اسی لیے جب وہ قلم اٹھاتے ہیں تو بڑی گہرائی سے موضوع یا ادیب کے فن پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کے بارے میں کم نویسی سے کام نہیں لیتے۔ان کی تدوین اور ترتیب بھی ان کے کردار کی طرح منضبط ہے۔وہ مستند اعداد و شماریوں مجتمع کرتے ہیں کہ متعلقہ شاعر کے بارے میں جستجو کرنے والے دوسرے ناقدوں کو بھی ترغیب حاصل ہوتی ہے۔ان کے مقالوں اور مقدموں کا قرینہ ہی ایسا ہے کہ شخصیت اور فن ایک ہی نگاہ میں پڑھنے

والے کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ صنفِ شعر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو خاص طور پر مرغوب اور شاعر خاص طور پر محبوب ہیں۔ ان کی تحریروں سے شاعروں کی شاعری کی خوش بو اور بڑھ جاتی ہے۔

بہت سے شاعر گم نام لوگوں کی طرح گم نام ہی مرنا چاہتے ہوں گے مگر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو ایسے شاعروں کی یہ خواہش اچھی نہیں لگتی اور وہ اپنی کتابوں کے ذریعے انھیں زمانے بھر سے روشناس کروا کے ان کی شہرت یا رسوائی کا سامان بہم کر دیتے ہیں۔ کسی پر لکھتے ہوئے وہ تضاد خیالی کا شکار بھی نہیں ہوتے جیسا کہ ہمارے بہت سے کچے پکے نقادوں کا وطیرہ ہے اور نہ ہی ایک بار کسی شاعر کے بارے میں تعریفی کلمات تحریر میں لا کر ان سے بعد میں فیشنی نقادوں کی طرح مکر جاتے ہیں۔ جب وہ کسی شاعر کی نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ان کا رویہ صحت مند اور مثبت رہتا ہے اور وہ اس کے مزاج کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کر کے انھیں اس شاعر کے شعروں کی تفہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ شاعروں کو اپنی نظر سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ وہ الفاظ کے مخفی معنوں تک رسائی کی تگ و دو میں دُور تک جانے کا حوصلہ اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنا موقف بغیر رَدّ و قدح کے بیان کرتے ہیں اور شواہد و دلائل کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کی باتیں منطق سے خالی نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ان نام نہاد اُردو پروفیسروں یا نقادوں کی طرح نہیں ہیں جو اُردو کو بس ایک آدھ بار سونگھ کر اس کے ذریعے صرف دولت کماتے ہیں اور دوسروں کو کہنیاں مار کر اپنے لیے راستہ بناتے ہیں بل کہ ان صاحب دل اساتذہ میں سے ہیں جو ایک زمانے کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں اس لیے نہ وہ خود تنہا رہتے ہیں نہ کسی اور کو تنہا چھوڑتے ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تنقیدی، تدوینی اور ترجمتی صلاحیتوں کے ارباب فکر و نظر معترف ہیں۔ ان کے اُسلوب میں روانی اور شگفتگی ہے۔ سادہ بیانی، ندرتِ خیال اور وسعتِ فکر ان کی تحریروں کے نمایاں وصف ہیں۔ ان کی کتابیں اسی لیے معلومات اور افادیت سے بھرپور ہیں۔

مرثیے سے لگاؤ انھیں ورثے میں ملا ہے۔ وہ خود تو مرثیہ نہیں لکھتے مگر پڑھتے بہت ہیں۔ انھوں نے بہت سے مرثیہ نگار نہ صرف خود دریافت کیے ہیں بل کہ دوسروں کو بھی رثائی اَدب پر تحقیق کی ترغیب دی ہے۔ وہ تکرار سے بھی بچتے ہیں اور غزل اور مرثیے کی کلاسیکی شعری روایت سے آگے بڑھ کر جدید مرثیے اور غزل کے ان شاعروں کو موضوع بناتے ہیں جن کے رشحاتِ قلم پر وقت کی گرد پڑ چکی ہے اور ان کے مجموعے پرانے کتب خانوں کی الماریوں میں دفن ہیں یا اگر زندہ ہیں تو اپنی شاعری کی قدر ناافزائی سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ یوں تو ہر دَور ہی مقابلے کا دَور ہوتا ہے۔ مگر اس عہد میں وقت کی رفتار تیز ہے اور مقابلہ زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔ Media explosion نے ہر میدان میں شہرت کی دوڑ بل کہ Ret race کو اور بھی مہمیز کیا ہے۔ لکھنے والوں کے کمیک گروہ نے پہلے تحریری اور پھر برقی ابلاغ کے ایوانوں کی دہلیز ایسے پکڑی بل کہ جکڑ

رکھی ہے کہ وہ کسی اور ایسے نئے لکھنے والے کو اس مالی لحاظ سے پُرکشش میدان میں داخل ہونے نہیں دیتے جو پہلے ان کے پاؤں نہیں پکڑتا۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ان کی اَدبی دہشت گردیوں سے سہمے ہوئے ادیبوں کا ہاتھ پکڑا ہے اور اپنی گوناگوں صلاحیتوں سے مفاداتی اَدبی گروہوں کی قلعہ بندیوں میں شگاف ڈالا ہے۔ انھوں نے ایسے شعرا پر خاص طور پر قلم اٹھایا ہے جن کے ساتھ زمانے نے انصاف نہیں کیا اور اس بارے میں مالی منفعت کا خیال تک نہیں کیا۔ وہ ایسے شاعروں کے بارے میں دوسروں کے جذباتی اور غیر منصفانہ بیانات اور ان کا مضحکہ اُڑانے کے لیے مفاداتی گروہ کے مسخروں کے گھڑے ہوئے لطیفوں سے متاثر نہیں ہوتے بل کہ ان کی تحریروں کا خود مطالعہ کر کے اپنے نتائج کھلے دل اور کھلے ذہن سے اَخذ کرتے ہیں بل کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تو ان شاعروں کو بھی لائق اعتنا جانا ہے جنھوں نے شعری روایت کے سانچے اور سماجی معمولات کے ڈھانچے منہدم کیے ہیں۔ ان کے ہاں عام تنقیدی روّیوں سے انحراف بھی پایا جاتا ہے اور اعتراف بھی۔ انھیں حسنِ انتخاب کی صلاحیت بھی ودیعت ہوئی ہے۔ شخص اور شاعری کے انتخاب میں وہ کم ہی غلطی کرتے ہیں۔

اُردو زبان سے ان کا لگاؤ بھی فطری ہے اور لسانی اعتبار سے شین قاف بھی درست ہے کہ اُردو ان کی مادری زبان ہے اور پھر زبان و اَدب نے ان میں زبان اور محاورہ کی پاسداری کی عادت بھی پیدا کر دی ہے اس لیے وہ جس شاعر کے آثارِ سخن پر روشنی ڈالتے ہیں ان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔

ان میں کتب کی اشاعت کا سلیقہ بھی پایا جاتا ہے۔ وہ کتاب کے سائز، کاغذ، کمپوزنگ، جلد بندی، تصاویر، متنی اجزاء، جیسے تمہید، پیش لفظ، انتساب، مقدمے، اشاریے، کتابیات سب پر بڑی تنظیمی نظر رکھتے ہیں اور اپنے ہر کام کو ایک مقدس فرض سمجھ کر پورا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک جذبوں سمیت سلامت رکھے۔ آمین!

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر

پروفیسر حسین سحر

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تعلق ایک علمی و اَدبی خانوادے سے ہے۔ ان کے والد گرامی شاعرِ اہلِ بیت سیّد وحید الحسن ہاشمی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ عصرِ حاضر کے رثائی اَدب میں موصوف ایک ممتاز و منفرد مقام پر فائز ہیں اور متعدد تصانیف کے خالق ہیں۔ خود ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بھی کثیر التصانیف ہیں۔ گزشتہ دس برس کے قلیل عرصے میں ان کی تقریباً پچیس کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ جس سے ان کی قلم کی جولانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسلسل محنت و ریاضت کے طفیل تحقیق اور تنقید کے میدان میں انھوں نے عہد موجود کے اکثر ناقدین فن سے اپنی اصابتِ رائے اور صلابتِ فکر کا لوہا منوایا ہے۔ چناں چہ مختلف اَدبی حلقوں نے ان کی کھلے دل سے پذیرائی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عصری تنقید اب ان کے حوالے کے بغیر نامکمل نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک تازہ فکر محقق و نقاد ہیں اور خیال و فن کی پختگی کے اعتبار سے ایک وقیع مقام کے حامل ہیں۔ یوں تو تنقید کے مختلف دبستانوں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے مگر تہذیبی تنقید ان کا وصفِ خاص ہے کہ اپنی اکثر تحریروں میں انھوں نے تہذیب کے مختلف روّیوں کو اُجاگر کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔ وہ ایک باشعور نقاد ہیں اور ان کی تنقید میں ہمیں فکر و شعور کی بازیافت ملتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عصری تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان کے تفکر و تدبر میں ایک منطقی انداز ہے اور سماجی روّیوں کی بھرپور ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں ہمیں عصری حسیت کے مظاہر عام ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیق و تنقید میں نفسیاتی عوامل کا کھوج لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان کے یہاں تاثراتی تنقید کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان خصائص کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کی تنقید میں جہاں وسعتِ نظر دکھائی دیتی ہے۔ وہاں ایک گہرائی اور گیرائی کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ مختصراً ان کے تنقیدی اُسلوب کو ہم جدید روّیوں کا آئینہ دار سمجھتے ہوئے انھیں ایک ایسا جدید نقاد کہہ سکتے ہیں جس کے فن میں روایت کا مکمل احترام بھی ہے اور لمحۂ حاضر کا ادراک و شعور بھی۔

ان کے تحقیقی و تنقیدی سفر کے ارتقاء کو اگر نہایت اختصار سے بھی بیان کیا جائے تو اس کا خاکہ کچھ یوں ہوگا۔

۱۹۸۷ء میں ''بجھی وہ شمع'' کے نام سے شاعرِ آلِ محمدؐ حضرت نسیم امروہوی کی یاد میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ جسے ڈاکٹر صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں ممتاز منفرد مرثیہ نگار نسیم امروہوی (مرحوم) کی حیات اور ان کے فن کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۸۸ء میں ''آیاتِ آمنہؑ'' کے عنوان سے پیغمبر اسلام جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؑ کا مرثیہ شائع ہوا جس کے مصنف شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی (مرحوم) ہیں اور جسے ڈاکٹر صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس تصنیف کے پہلے حصے میں اُردو مرثیہ کی اہمیت اور جدید اُردو مرثیے میں قیصر بارہوی کی مرثیہ گوئی کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں حضرت آمنہؑ کی شخصیت پر قیصر (مرحوم) کے مرثیے کا متن ہے اور آخر میں اس مرثیے کے بارے میں متعدد ناقدین کی بیش قیمت آراء مضامین کی صورت میں ہیں۔

۱۹۸۸ء ہی میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ایک اور کتاب ''بیسویں صدی کا شعری اُدب'' منظرِ عام پر آئی جس میں آٹھ نمائندہ شعراء حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، ناصر کاظمی، ن۔ م۔ راشد، مجید امجد، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی شامل ہیں۔ اس کتاب میں جہاں ان شعرا کی پانچ پانچ منتخب منظومات شریک ہیں۔ وہاں ان کے فن پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت وقیع اور جامع انداز میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں ''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں معروف و ممتاز شاعر سید آلِ رضا کی غزل گوئی پر ڈاکٹر صاحب نے اُردو شعری روایت میں آلِ رضا کا مقام متعین کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔ اس لحاظ سے غالباً یہ پہلا کام ہے جو آلِ رضا کی غزل پر کیا گیا ہے۔

۱۹۸۹ء میں ''العطش'' جلد اوّل شائع ہوئی جس میں سید وحید الحسن ہاشمی کے گیارہ مرثیوں کی تدوین کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے سید وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری کے فنی اور فکری محاسن کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۱۹۸۹ء ہی میں ''مفاہیم'' کے نام سے ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ شائع ہوا جس میں سات مضامین شامل ہیں۔ مضامین کے عنوانات سے کام کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ترتیب کچھ یوں ہے۔ طنز و مزاح۔ مقاصد و محرکات، ایک معتبر مزاح نگار فرحت اللہ بیگ، اُردو مرثیہ...... ایک تمہید، مرثیے اور قصیدے کی جہتوں کا جائزہ، مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں، ظفر علی خاں کی نعت نگاری اور حفیظ جالندھری۔ ایک منفرد گیت نگار۔

۱۹۹۱ء میں قیصر بارہوی (مرحوم) کے دس مرثیوں کا مجموعہ ''منتخب مرثیے'' کے نام سے شایع ہوا۔ جن کی ترتیب وتدوین ڈاکٹر صاحب نے کی ہے۔ اس کتاب میں قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات اور ان کی فنی پختگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں ''العطش'' کی جلد دوم شایع ہوئی جو سیّد وحید الحسن ہاشمی کے گیارہ جدید مرثیوں پر مشتمل ہے اور ڈاکٹر صاحب نے ان کی تدوین کی ہے۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں ''حرف مدعا'' کے عنوان سے وحید الحسن ہاشمی صاحب کے معروضات ہیں اور دوسرے حصے میں ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر مظفر عباس کے مضامین ہیں۔

۱۹۹۸ء میں ''شام وسحر کی باتیں'' شایع ہوئیں جو ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء تک ماہ نامہ ''شام وسحر'' کے اداریوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب ''شام وسحر'' کے مدیر ہیں اور ان کے لکھے ہوئے ان اداریوں پر مختلف تجزیہ نگاروں کی آراء اس کتاب میں شامل ہیں۔ آخر میں ایک توضیحی اشاریہ بھی دیا گیا ہے جس سے کتاب کی وقعت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

۱۹۹۸ء میں ''کلیات حبیبؔ'' کے نام سے حبیبؔ جون پوری کی کلیات شایع ہوئی جس کی تدوین بھی ڈاکٹر صاحب نے کی ہے اور کلامِ حبیب پر ایک بھرپور مقدمہ بھی لکھا ہے اس کے علاوہ حبیبؔ کی شخصیت پر مختلف نقادوں کے پانچ مقالے ہیں۔ آخر میں حبیبؔ کا کلام شامل ہے۔

۱۹۹۸ء میں ''ترجیحات'' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر آیا جس میں سات شعراء اُدبا پر مضامین کچھ اس طرح ہیں۔ محمود نظامی کے سفرنامے کے بارے میں، آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل۔ ایک مطالعہ، نسیم امروہوی ایک موضوعاتی مطالعہ، شیر افضل کی شعری تخلیقات، قیصرِ اقلیمِ مرثیہ۔ قیصر بارہوی اور ایک معتبر مرثیہ نگار۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے تحقیق وتنقید کا حق اَدا کیا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب نے ''آغا صاحب'' کے نام سے معروف نقاد ڈاکٹر آغا سہیل کی حیات وفن پر ایک قابلِ قدر کتاب مرتب کر کے شایع کی جس میں آغا صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کے بارے میں ان کے علاوہ مختلف اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔

۱۹۹۸ء میں ''معتبر مرثیے'' شایع ہوئی۔ اس کتاب میں قیصر بارہوی (مرحوم) کے گیارہ مرثیوں کی تدوین کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک بسیط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ ۱۹۹۸ء میں ''العطش'' جلد سوم شایع ہوئی۔ جس میں سید وحید الحسن ہاشمی کے آٹھ مرثیے شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں ان مرثیوں کی تدوین کی وہاں ان پر ایک طویل اور جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔

۲۰۰۰ء میں ''باقیاتِ آلِ رضا'' کے نام سے آلِ رضا (مرحوم) کا غیر مطبوعہ کلام شایع

کتاب میں تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے جہاں آلِ رضا کے غیر مدون کلام کی تدوین صنف وار کی ہے وہاں اس موضوع پر ایک بسیط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔۲۰۰۰ء میں ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' منظرِ عام پر آئی جس میں سیف زلفی (مرحوم) کی شخصیت وفن پر مختلف ادباء کی تحریریں اور سیف (مرحوم) کا منتخب کلام شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مفصل مقدمے نے کتاب کی وقعت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔۲۰۰۴ء میں ''اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' شایع ہوئی جس میں نظری اور عملی تنقید پر مشتمل ڈاکٹر صاحب کے آٹھ مضامین شریک ہیں۔ ان مضامین سے ان کے تنقیدی شعور وادراک کا اندازہ ہوتا ہے۔۲۰۰۵ء میں ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' منظرِ عام پر آئی جس میں وحید الحسن ہاشمی صاحب کے چالیس مرثیوں کے حوالے سے ان کا مفصل تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔۲۰۰۵ء میں ''تصریحات'' شایع ہوئی جو ڈاکٹر صاحب کے پندرہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے۔ مضامین کے عنوان کچھ یوں ہیں: (۱) آغا سہیل کی ادبی جہتیں (۲) ادب کا مسیحا۔ طاہر تونسوی (۳) ایک مانوس اجنبی اشفاق حسین (۴) نسیم سید کی مکمل گواہی (۵) ڈاکٹر طارق عزیز اور خواب آگہی (۶) کچھ ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کے بارے میں (۷) اختر ہاشمی کا شعری منظر نامہ (۸) سید وصی الحسن نقاش کی شاعری (۹) ڈاکٹر محمد صالح طاہر کے مضامین (۱۰) شکیل جاذب کی شعری کھنک (۱۱) بے حس معاشرے میں آفتاب کاوش کا تحفۂ احساس (۱۲) جاوید صدیق بھٹی کا شعری سفرنامہ (۱۳) ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر ضیاء الرحمٰن فاروقی (۱۴) تلوار اور قلم کی حرمت کا امین۔ خالد محمود امر اور (۱۵) فطرت شناس شاعر اختر حسین سندھو۔ اس کتاب میں انھوں نے معروف ادبا کے ساتھ ساتھ نئے شعرا و ادبا کو بھی اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے جو نئی نسل کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کی دلیل ہے۔ نئے شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ یہ تعمیری اور مثبت رویہ ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔

۲۰۰۵ء ہی میں ''العطش'' کے نام سے سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی کلیات شایع ہوئی جس میں وحید صاحب کے چالیس جدید مختصر مرثیے شامل ہیں۔ ان مرثیوں کی تدوین کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک جامع مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں ایک سو سے زیادہ حواشی بھی ہیں۔۲۰۰۶ء میں ''سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' منظرِ عام پر آئی جس میں نعت۔ منقبت اور سلام کے حوالے سے وحید الحسن ہاشمی صاحب کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے جس میں صنف وار وحید الحسن ہاشمی صاحب کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں وحید الحسن ہاشمی صاحب کے منتخب کلام کی شمولیت نے کتاب کی قدر وقیمت اور بڑھا دی ہے۔۲۰۰۶ء میں ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' شایع ہوئی جس میں ڈاکٹر صاحب نے عصرِ حاضر کے ایک ممتاز نوجوان شاعر اسلم کولسری کی شخصیت وفن کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔۲۰۰۶ء میں ''طاہرین'' شایع ہوئی جس میں وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں مناقب اور سلاموں کی تدوین کے ساتھ ساتھ ان کا فنی وفکری

مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ ڈاکٹر صاحب کے ایک طویل مقدمے کی صورت میں ہے۔

۲۰۰۶ء میں ''سیف زلفی کے مرثیے'' کے نام سے منظرِ عام پر آنے والی کتاب میں سیف (مرحوم) کے چار مرثیے شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بسیط مقدمے میں ان مرثیوں کا تجزیہ کیا ہے۔

۲۰۰۶ء میں ''قیصرِ اقلیم مرثیہ'' شایع ہوئی جو شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی (مرحوم) کی مرثیہ نگاری سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں قیصر کی حیات کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ممتاز ناقدین کی آرا قیصر کے فن کے بارے میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قیصر (مرحوم) کے ۲۵ مرثیوں کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے اور جدید مرثیے میں قیصر کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی مندرجہ بالا مرتبات و مؤلفات اور تصانیف کے موضوعات سے یہ امر واضح ہے کہ نظری اور عملی لحاظ سے جہاں ان کی تنقید میں ایک خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے وہاں اصنافِ ادب کے حوالے سے بھی ان کے یہاں تنوع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ معروف و ممتاز اہلِ قلم کے ساتھ ساتھ وہ نسبتاً کم معروف بل کہ نئے اور نوجوان لکھنے والوں کو بھی اپنی تنقید کا موضوع بناتے ہیں جو ان کا امتیاز ہے۔ اُن کا تحقیقی و تنقیدی سفر جس مرحلۂ شوق سے شروع ہوا تھا وہ اُسی جوش اور روانی کے ساتھ مسلسل اب بھی جاری ہے۔ ان کے قلم میں روزِ اول کی سی تازگی اور توانائی موجود ہے بل کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ دعا ہے کہ منزل بہ منزل ارتقا کا یہ سفر اسی طرح جاری و ساری رہے اور :

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا جہانِ فن

ڈاکٹر طاہر تونسوی

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن لحۂ موجود میں ایسے دانشور ہیں جنھوں نے اُردو تحقیق وتنقید میں ایک تحرک پیدا کیا ہے اور اس طرح کثیر الجہاتی ادیب ہونے کے ناطے ہر صنف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اس کا عملی ثبوت ان کی وہ کتابیں ہیں جو ایک طرف تو موضوعات کا تنوع پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف ایک ہی موضوع کا تسلسل بھی قائم رکھتی ہیں جن کی بدولت ان کے عمیق مطالعے اور وسعتِ فکر ونظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تحقیقی وتنقیدی کارناموں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کی اَدبی فتوحات کا گوشوارہ ترتیب دے لیا جائے تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے ان کی ایک مکمل تصویر آجائے اور اس بات کا بھی پتہ چل جائے کہ اُنھوں نے بہت کم عرصے میں مطالعۂ نظم ونثر میں کتنے ہفت خواں طے کیے ہیں اس حوالے سے ان کی اَدبی کارگزاری اور تخلیقی کارکردگی کا منظر نامہ یہ ہے: (۱) مفاہیم (مقالات)، (۲) اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (مقالات)، (۳) ترجیحات (مقالات)، (۴) تعریحات (مضامین)، (۵) آل رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق وتنقید)، (۶) جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت وفن)، (۷) آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن)، (۸) ''شام وسحر کی باتیں'' (شام وسحر کے اداریے)، (۹) کلیاتِ حبیب (حبیب جون پوری کے کلام کی تدوین)، (۱۰) مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی (تحقیق وتنقید)، (۱۱) باقیاتِ آلِ رضا (آلِ رضا لکھنوی کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)، (۱۲) بجھی وہ شمع (نسیم امروہوی کی یاد میں)، (۱۳) بیسویں صدی کا شعری اُدب (انتخاب کلام)، (۱۴) آیاتِ آمنہ (قیصر بارہوی کے مرثیے کی تدوین)، (۱۵) العطش (سید وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین)، (۱۶) منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)، (۱۷) معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)، (۱۸) طاہرین (سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، منقبتیں اور سلام کی تدوین)، (۱۹) جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق وتنقید)،

(۲۰) سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (نعت، منقبت اور سلام کے حوالے سے)، (۲۱) سیف زلفی کے مرثیے (سیف زلفی کے مرثیوں کی تدوین)، (۲۲) قیصرِ اقلیم مرثیہ (تحقیق و تنقید)، (۲۳) قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کی تدوین)

ظاہر ہے کہ یہ کام کسی بھی حوالے سے کم نہیں اور پھر ۲۳ کا ہندسہ ایک اعتبار سے بابرکت ہے کہ تین اور دو کو جمع کیا جائے تو پانچ بنتا ہے جو اہم بھی ہے اور معتبر بھی اور ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مسلک سے بھی لگا کھاتا ہے اور اس بات کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ محولہ بالا بات کے تناظر میں اُنھوں نے مرثیہ کے صیغے میں بے پناہ کام کیا ہے اور اس صنف کی طرف بھرپور توجہ دے کر اور جدید مرثیے کی جہات کو سامنے لاکر منفرد حیثیت دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے العطش پر اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے:

''ہمیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا ممنون ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے ''العطش'' کو مرتب کر کے صرف حقِ فرزندی ہی ادا نہیں کیا بل کہ اُردو مرثیے کو وہ گراں قدر تحفہ عطا کر دیا ہے۔ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔'' (ماہ نامہ 'شام و سحر' فروری ۲۰۰۷ء، محرم نمبر ص ۲۴)

میرے نزدیک ڈاکٹر شبیہ الحسن کثیر الجہاتی نقاد اور محقق ضرور ہیں تاہم ان کی اس خصوصیت کا زاویہ خصوصی طور پر صنفِ مرثیہ کے گرد گھومتا ہے اور اس کا بنیادی محور ان کا وہ عقیدہ اور مسلک بھی ہے جس کے تابع ذاتی و ادبی شخصیت بھی ہے تاہم اس بات سے ان کی تحقیق و تنقید کو محدود کرنا نہیں بل کہ ان کی ثابت قدمی کا تذکرہ مقصود ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ان کی اَدبی شخصیت پر رثائی اَدب کا قبضہ ہے۔ یوں بھی اس کے بغیر اَدب کا تذکرہ ادھورا بھی ہے اور بے سمت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ کی تحقیق و تنقید کے پس منظر میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے نہ صرف اس کی سمت کو درست کیا ہے بل کہ اسے ایک انفرادی نہج بھی عطا کی ہے اس کا عملی ثبوت محولہ بالا وہ منظر نامہ ہے جس پر ان کے ناقدین نے تجزیے اور تجزیاتی مطالعے کی اساس رکھی ہے چناں چہ شاعر اور دانش ور خالد اقبال یاسر نے ان کے اس وصف کو تسلیم کرتے ہوئے اُنھیں ایک سلجھا ہوا نقاد قرار دیا ہے ان کے بقول:

''مرثیے سے لگاؤ اُنھیں ورثے میں ملا ہے وہ خود تو مرثیہ نہیں لکھتے مگر پڑھتے بہت ہیں انھوں نے بہت سے مرثیہ نگار نہ صرف خود دریافت کیے ہیں بل کہ دوسروں کو بھی رثائی اَدب پر تحقیق کی ترغیب دی ہے وہ تکرار سے بھی بچتے ہیں اور غزل اور مرثیے کی کلاسیکی شعری روایت سے آگے بڑھ کر جدید مرثیے اور غزل کے ان شاعروں کو موضوع بناتے ہیں جن کے رشحاتِ قلم پر وقت کی گرد پڑ چکی ہے۔''[۱]

دراصل بات ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تحقیقی اور تنقیدی شعور کی ہے جس کی نشان دہی اس کے بہت سے ناقدین نے کی ہے جن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر فرمان فتح

پوری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر جمیل جالبی، انتظار حسین، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سلیم اختر، مرزا ادیب، ڈاکٹر آغا سہیل، پروفیسر عتیق احمد، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر سید معراج نیرؔ، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر عبدالستار نیازی، ڈاکٹر صدیق شبلی اور ڈاکٹر اجمل نیازی شامل ہیں اور یہ فہرست بہت طویل ہے کہ وہ ''شام وسحر'' کے مدیر بھی ہیں اور مدیر کی تعریف تو سب نے کرنا ہی ہوتی ہے مگر میرے نزدیک وہ اس سے مبرّا ہیں اس لیے کہ ان کا کام بولتا ہے اس حوالے سے وہ خوش قسمت ہیں کہ ہر اَدبی گروہ کے سرغنے اور ان کے چیلے ان کے نہ صرف معترف ہیں بل کہ ان کے گن گاتے ہیں اور میں اسے ان کی ذات اور شخصیت کا سحر سمجھتا ہوں کہ وہ جس طرح ایک متوازن آدمی ہیں اسی طرح تعلقات میں بھی ایک توازن برقرار رکھتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے بل کہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اَدبی گروہ بندی سے الگ تھلگ رکھتے ہیں اور یوں وہ کسی بھی حوالے سے خسارے میں نہیں رہتے۔ اس اعتبار سے ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ابھی لکھا جا رہا ہے اس کا معتبر ثبوت آصف وٹو کی کتاب ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات'' ہے جس میں ان کے بارے میں مکمل معلومات مل جاتی ہیں اور اس بات کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ اَدب کا شاید ہی کوئی ناقد یا قاری ایسا نہیں جو ان کے لیے لطف اللسان نہ ہو۔ نئے لکھنے والوں میں سے ڈاکٹر ندیم گیلانی کی یہ رائے خاص وقیع ہے کہ:

> ''ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کا تنقیدی شعور بہت واضح، جچا تلا اور تیکھا ہے۔ باتیں حکیمانہ سوچ کی آئینہ دار ہیں۔''[۲]

نام ور شاعر، مرثیہ نگار، تنقید نگار اور محقق سیّد حسن عسکری کاظمی کہ جن کی بے پناہ صلاحیتوں کا ئیں زمانہ طالب علمی سے معترف ہوں اور اُنھوں نے نوجوانوں کی جس طرح تربیت کی ہے وہ ناقابلِ تردید ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے بارے میں ان کی جچی تلی اور اُستادانہ رائے دیکھیے:

> ''ان کی تنقید میں کسی تخلیق کار سے گہرے لگاؤ اور قربت کا لحاظ رکھنے کے باوجود تنقیدی معیار کو بحال رکھنا اور قاری کے سامنے حقائق کا تسلسل اور اپنے زاویہ نظر کے علاوہ نتیجہ خیز گفت گو کو آگے بڑھانا شامل رہتا ہے۔''[۳]

اس رائے میں میری رائے بھی شامل ہے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اپنے مزاج کے اعتبار سے تنقید کا توازن برقرار رکھا ہے۔ اس پسِ منظر میں وہ فن کار کی شخصیت کے ساتھ ساتھ فن پارے کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید معراج نیر کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر معراج نیر ایک زیرک محقق، ہوش مند ناقد اور عمیق خاکہ نگار ہیں۔ وہ شخصیات کو ایک خاص تہذیبی ماحول میں دیکھتے ہیں اور ان کا خاکہ تشکیل دیتے ہوئے ان کے سیاق وسباق کو بھی

پیشِ نگاہ رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں خاکہ نگاروں کی دو عمومی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ خاکہ نگار ہیں جو شخصیت کے ظاہری خدوخال پر نگاہ رکھتے ہیں اور ان کی شبیہیں قارئین کے سامنے لے آتے ہیں دوسرے خاکہ نگار وہ ہیں جو شخصیت کے باطن میں جھانکتے ہیں اور ان کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر معراج نیر ثانی الذکر خاکہ نگاروں کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے تمام خاکے دراصل مختلف اور متنوع شخصیتوں کے باطنی سفرنامے ہیں.......... ڈاکٹر معراج نیر تحقیقی مزاج کے حامل ہیں یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ممدوحین کے خاکے لکھتے ہوئے ان کے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔''[۴]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر سلیم اختر کی خودنوشت ''نشانِ جگرِ سوختہ'' کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''.....'نشانِ جگرِ سوختہ' محض ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی ہی نہیں بل کہ جگ بیتی بھی ہے اس کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر نے محض ''میں'' اور ''میرے'' کا سفرنامہ ہی بیان نہیں کیا بل کہ پورے معاشرے میں موجود ''ہمارے'' اور ''ہم'' کی آپ بیتی بیان کی ہے۔ اس طرح یہ آپ بیتی ''میرے'' کے دائرے سے نکل کر ''ہمارے'' کے دوائر میں داخل ہوگئی ہے یہی سبب ہے کہ اس میں ہمارے عہد کی سیاست، معاشرت، معیشت اور مذہبی رویوں پر بھی بہت سا مواد مل جاتا ہے۔''[۵]

''نشانِ جگرِ سوختہ'' کے اُسلوب کے بارے میں ایک اور جگہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس طرح قلم اُٹھایا ہے:

''ڈاکٹر سلیم اختر ایک اُسلوب ساز تخلیق کار ہیں۔ نشانِ جگرِ سوختہ میں اُنھوں نے سادہ اور سلیس اُسلوب کو اہمیت دی ہے تاہم جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے اُنھوں نے کاٹ دار اُسلوب بھی استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے جگہ جگہ تمثیلی پیرائے میں بھی باتیں کی ہیں بعض جگہ اُنھوں نے اُدھوری بات سے دوہرا اثر لیا ہے اس طرح ایجاز و اختصار نے بھی ان کے اُسلوب میں ایک خاص طرح کی لذت پیدا کردی ہے۔''[۶]

ان دو تین مثالوں سے جو الگ الگ مقالوں کی حیثیت میں سامنے آئی ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی بے پناہ ناقدانہ صلاحیتوں کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ وہ بلا جھجک اپنا نقطۂ نظر بیان کردیتے ہیں اور لگی لپٹی رکھے بغیر بات کہنے کا فن جانتے ہیں اور پھر فن پارے کے موضوع اور اس کے پس منظر میں اُٹھنے والے سوالات کو بھی پیشِ نظر رکھ کر فن کار زیرِ بحث کے تنقیدی نظریات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں اس طرح خود ان کی تنقیدی اُپج میں

بھی کئی جہتیں سامنے آ جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے مَیں نے اپنے اس مضمون کا عنوان ہی ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا جہانِ فن'' رکھا ہے اور اسی حوالے سے ان کی تنقیدی جہت کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی سرمایے کی اساس ان کے غیر جانب دارانہ رویہ کی وجہ سے اُستوار ہے اور پھر ان کا مزاج چوں کہ مشفقانہ اور ہمدردانہ ہے اور ان کی سوچ کے زاویے مثبت نکات کو سامنے لانے کی ہے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی تنقید کو اعتبار بھی بخشا ہے اور وقار بھی...... لمحۂ موجود بعض اَدبی گروہوں کی بنا پر اُردو تنقید پر سے اعتماد اُٹھنے لگا ہے کہ تحسینی دبستانِ تنقید نے جنم لیا ہے اور اگر ایسا بھی ہو تب بھی غنیمت سمجھنا چاہیے کہ اس طرح حوصلہ افزائی کا رجحان تو سامنے آیا ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اپنے اَدبی جگادروں کے علاوہ باقی اہم لکھنے والوں کے لیے تو تنقیصی تنقید کا نام نہاد ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح تنقید بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس پس منظر میں مجھے اپنی بات دوبارہ کہنے دیجیے کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا وجود اس گئے گزرے زمانے میں غنیمت ہے کہ وہ اُردو تنقید میں توازن کی اعلیٰ مثال بنے ہوئے ہیں اور اَدب کے ایک دیانت دار قاری اور پھر صحت مند تنقید کا رول ادا کر رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک الگ مکتبۂ فکر اور مسلک رکھنے کے باوجود خیبر سے کیاڑی تک کے ہر مکتبۂ فکر کے دانش وروں کے لیے شرفِ قبولیت رکھتے ہیں اور عہدِ بے ہنر میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا یہی کمالِ فن ہے جس کی وجہ سے وہ معروف بھی ہیں اور مقبول بھی۔ آخر میں مجھے ان سے ایک سوال یہ کرنا ہے کہ جہاں اُنھوں نے ڈھیر سارے جھنجھٹ پال رکھے ہیں لکھنے کے لیے اور پھر اچھا لکھنے کے لیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں۔ اب تک جو کچھ اُنھوں نے سیکھا ہے اور لکھنے کا جو عمل جاری ہے اور جو سفر جاری رہے گا میں ان کے جہانِ فن اور ان کی جہاتِ فن کا قائل بھی ہوں اور معترف بھی!!

(مطبوعہ۔ پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور۔ پاکستان، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

....

حواشی

(۱) روزنامہ ''دن'' لاہور، ۲۸ فروری ۲۰۰۷ء۔

(۲) روزنامہ ''اوصاف'' لاہور، ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء۔

(۳)

(۴) ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور: ص ۲۷۔۲۶، ۳۱۔

(۵) ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، ڈاکٹر معراج نیر نمبر، نومبر ۲۰۰۶ء۔

(۶) روزنامہ ''دن'' لاہور، اَدبی بیٹھک از ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن، ۲۸ مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۔

◆◆◆

رثائی اَدب کا ابنِ خلدون ۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

محمد شفیع بلوچ

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جون پور، جسے بجا طور پر ہندستان کا شیراز کہا جاتا تھا، کے اس عظیم علمی و اَدبی خاندان کے فردِ فرید ہیں جو اَدب کے درخشندہ ستاروں کا ایک جھرمٹ ہے۔ پڑدادا مولوی میر انتظام علی جون پور میں فارسی قصیدے کے مستند اُستاد، دادا سیّد شبیر حسن صفاؔ الہ آبادی (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۷۵ء) فارسی، اُردو اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر، چچا سیّد مجیب الحسن زود گو شاعر اور آرزوؔ لکھنوی کے شاگرد اور ان تمام حوالوں سے بڑھ کر والد سیّد وحید الحسن ہاشمی (پ: ۱۹۳۰ء، بمقام جون پور) بیسیوں تصانیف کے خالق اور عصر موجود کے رثائی قافلے کے سالار کارواں۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم و اَدب اور بالخصوص رثائی اَدب لہو بن کر ڈاکٹر شبیہ کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ باپ اگر مرثیے کے میر کارواں تو بیٹا رثائی اَدب کا ابنِ خلدون ہے۔ مرثیے اور رثائی اَدب کی تدوین و تحقیق کی تاریخ ڈاکٹر شبیہ کی خدمات کے ذکر کے بغیر ادھوری متصور ہوگی۔ اب تو پاکستان بھر میں لے دے کے وہی اس سلسلے میں اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیق و تنقید کا نقطہ مرکزی اور مرغوب موضوع مرثیہ اور مرثیہ گو شعرا رہا ہے، خاص طور پر جدید مرثیہ گو شعرا۔ مرثیے کی تحقیق و تنقید ڈاکٹر شبیہ کا امتیاز یوں ٹھہرتی ہے کہ رثائی اَدب کے سلسلے میں ان کی اب تک شایع ہونے والی کتب میں نصف کے قریب مرثیے کی تدوین، تحقیق، تفہیم اور تفسیر سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد امکانی موضوعات پر مباحث کے دَر وا کیے ہیں۔ انھوں نے لکیر کو نہیں پیٹا بل کہ ایسا فکری موقف اختیار کیا ہے جو مرثیے کے کئی نئے زاویے سامنے لاتا ہے یوں مرثیے کی تفہیم اور اس کے فنی پہلوؤں کو مزید نکھارا ہے۔

تدوین اور بالخصوص مرثیے کی تدوین کے سلسلے میں انھوں نے قابلِ قدر کام سرانجام دیا ہے۔ تدوین متن کا کام کچھ اتنا آسان بھی نہیں اس کے لیے بنیادی طور پر علمِ عروض کا جاننا ضروری ہے اور شاعری اور عروض

تو ان کے گہوارہ تربیت کا حصہ ہے۔ انھوں نے تدوین کے جدید اصولوں کو مدنظر رکھا ہے اس لحاظ سے ان کا مدون کیا ہوا کام کئی معاصرین سے بہتر ہے۔ رثائی تنقید میں اگر چہ ان کا اُسلوب استدلالی ہے تاہم حیات و کائنات سے وابستہ مختلف و متنوع موضوعات کو مرثیے کے تناظر میں سمیٹ کر وہ اپنی تنقید کو تخلیقی سطح پر لے آئے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ کے تنقیدی مینفسٹو کو اگر ہم مختصر طور پر بیان کرنا چاہیں تو وہ کچھ یوں ہوگا کہ ان کے نزدیک تنقید اصل میں تہذیبی صورتِ حال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کا نام ہے۔ وہ تنقید کو ایک تہذیبی عمل گردانتے ہوئے مرثیے کا تہذیب کے ساتھ تعلق اپنی کتاب ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' میں یوں جوڑتے ہیں:

''تہذیبی وابستگی کی وجہ سے اس صنف کا قوت و توانائی سے اظہار اس وقت ممکن ہو سکا جب اسلامی تہذیب اپنے عروج پر دکھائی دینے لگی اور یہی تہذیبی عروج مختلف تہذیبی عوامل کے ذریعے مرثیے میں بھی ظاہر ہوا۔''

مرثیے کے سلسلے میں ان کی درج ذیل کتب سامنے آ چکی ہیں:

ا۔ اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار ۲۔ مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی ۳۔ آیاتِ آمنہ (قیصر بارہوی کے مرثیے کی تدوین) ۴۔ العطش (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین)۔ ۵۔ منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین) ۷۔ سیف زلفی کے مرثیے (سیف زلفی کے مرثیوں کی تدوین)۔ ۸۔ قیصر اقلیم مرثیہ۔ قیصر بارہوی ۹۔ قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کی تدوین)۔ ۱۰۔ اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف (زیرِ طبع)

''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' کے مندرجات میں مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں، مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ بعض نقادانِ فن نے مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ صاحب نے اس سلسلے میں جزوی اختلاف کیا ہے اور ہر دو اصناف کے بنیادی فرق کو دو تہذیبوں کا فرق قرار دیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مرثیے اور ڈرامے میں وہی فرق ہے جو یونان اور لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت میں ہے۔ اسی طرح ''مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ'' میں ان کا تحقیقی اور فکری مآل یہ ہے کہ مرثیہ اور قصیدے کی بعض مماثلتیں حیرت انگیز ہیں تاہم یہ دونوں اصناف اپنی نوعیت اور مذاق کے اعتبار سے جداگانہ ہیں۔ اگر آپ بنظرِ غائر دیکھیں تو محض مرثیہ کے انکار ہی قصیدے سے جدا نہیں ہیں بل کہ ان کا اُسلوب بھی ایک دوسرے سے منفرد ہے...... ہزاروں مماثلتوں کے باوجود قصیدہ قصیدہ ہے اور مرثیہ مرثیہ۔ قصیدہ کا طربیہ لہجہ اور مرثیہ کا المیہ لہجہ، انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کا بنیادی سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔''

علاوہ ازیں اس کتاب میں خود ڈاکٹر شبیہ کے بقول مرزا دبیر، آلِ رضا، نسیم امروہوی، سیّد وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی جیسے مرثیہ نگاروں کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کے فن کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے اور

دکھانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے اور یہ دعوا ہے بھی درست۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی ایک ایسے قادر الکلام شاعر ہیں جنھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے جوہر مرثیہ میں زیادہ نکھر کر سامنے آئے۔ وہ ایسے مرثیہ نگار ہیں جن کے یہاں مرثیہ بقول احمد ندیم قاسمی عروج کی ایک نئی سطح کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی جدید اُردو مرثیے کے نہ صرف بانی ہیں بل کہ رثائی اَدب کا ایک معتبر، مؤقر اور مسلم شاعر ہیں۔ ''وحیدیات'' یہ ڈاکٹر شبیہ نے ایک بیٹے کی بجائے ایک متوازن اور غیر جانب دار نقاد کی حیثیت سے حوالے کا کام کیا ہے۔ ''مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی'' نامی کتاب کی تخلیق کا جواز ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن یوں پیش کرتے ہیں:

> ''تقسیم برصغیر کے بعد اُردو مرثیہ کو جدید تناظر میں دیکھنے اور اسے حیات تازہ عطا کرنے والوں میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد ''مختصر مرثیہ'' کی ضرورت کا احساس دلایا اور ''جدید مختصر مرثیے'' کی ایک تحریک چلائی۔ اس تحریک کو نہ صرف مرثیہ نگار شعرا کی جانب سے پذیرائی حاصل ہوئی بل کہ اس تحریک سے متاثر ہو کر شعرا نے مختصر مرثیے لکھنا شروع کیے اور یہ سلسلہ آج بھی اسی آب و تاب سے جاری ہے۔ جدید مختصر مرثیے کی اس روایت کو روشناس کرانا اور اس سلسلے میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کی خدمات کا احاطہ کرنا اس کتاب کی تخلیق کا جواز ہے۔''

اس کتاب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیّد وحید الحسن ہاشمی کے بطور مرثیہ نگار تمام تخلیقی اور فنی محاسن کو اُجاگر کر کے انھیں جدید مختصر مرثیے کا بانی اور میر کارواں ثابت کیا ہے۔

سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس جدید مرثیوں کی ترتیب و تدوین ''العطش'' کے نام سے ڈاکٹر شبیہ نے کی ہے۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی اور مرثیہ لازم و ملزوم ٹھہرتے ہیں۔ زبان و بیان، مضمون کے ساتھ کلاسیک اور جدت کا حسین امتزاج سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مراثی کے خاص اوصاف ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ نے تمام چالیس مرثیوں کے فنی محاسن اور موضوع، مضمون اور زبان و بیان کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے۔

''العطش'' کا سب سے بڑا وصف اور اختصاص یہ ہے کہ اس میں ہر مرثیہ پر الگ معتبر نقاد کا تجزیہ شامل ہے یوں چالیس سے زائد انتقادی آراء کے ساتھ خود ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا ۸۴ صفحات پر مشتمل طویل مقدمہ جسے ۱۹۴ استناد کی مدد سے وقیع بنایا گیا ہے۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی کے فکر و فن کی تفہیم کے ساتھ ساتھ جدید مرثیے کی روایت میں ان کے مقام و مرتبے کو متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

''العطش'' میں سیّد وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری نادر الاسلوب حیثیت سامنے آئی ہے۔ ڈاکٹر شبیہ

الحسن نے انھیں آل رضا اور جوش کے شاعرانہ محاسن کا پُر تحمل امتزاج لکھا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ''العطش'' میں سید وحید الحسن ہاشمی کی شاعری کے سلسلے میں لکھا ہے:

''سید وحید الحسن ہاشمی نے ان مرثیوں میں ہمارے عہد کے انسانی اوصاف اور اقدار کو بڑی مہارت سے اُجاگر کیا ہے۔ قدیم شاعروں نے مرثیہ کو آسمانی شئے بنا دیا تھا، ہاشمی صاحب نے اس صنف کا رشتہ زمین سے اُستوار کیا جس میں فرقہ پرستی کی تنگ نظری موجود نہیں ہے۔ ہاشمی صاحب نے ان مرثیوں میں اپنے تخلیقی رجحانات کو بھرپور انداز میں پیش کر کے اُردو اَدب میں ایک نئی اور جان دار مثال قائم کی ہے۔ العطش کے یہ مرثیے جدید مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

پروفیسر آصف وٹو ''العطش'' کے اختصاصی اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُردو مرثیے کی تاریخ میں سید وحید الحسن ہاشمی وہ پہلے مرثیہ نگار ہیں جن کی شخصیت اور فن پر تینتالیس ہم عصر ناقدین اور دانش وروں کی آرا ایک جا ہوئی ہیں، نیز یہ کہ اُردو مرثیے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چالیس موضوعاتی مرثیے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ موضوعاتی تنوع بھی اُردو مرثیے میں ایک نادر اضافہ ہے۔'' (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات۔ تجزیہ و تنقید، ص ۱٦۸)

سید قیصر عباس زیدی المتخلص بہ قیصر بارہوی، مرثیے کی لکھنوی اور عصر موجود کی توانا و بلند آہنگ روایت کا حسین امتزاج تھے۔ قیصر بارہوی جیسے عظیم مرثیہ نگار کا نام فنا کی گھاٹیوں میں گم ہو چکا ہوتا اگر اسے ڈاکٹر شبیہ الحسن جیسا دردمند اور مخلص نقاد اور محقق میسر نہ آتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر شبیہ نے اپنے تنقیدی اور تحقیقی کارناموں سے قیصر بارہوی کا نام رثائی اَدب کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے لکھوا دیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ نے قیصر بارہوی کے سلسلے میں بھی بھرپور کام سرانجام دیا ہے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کے منتخب مرثیے شایع کیے۔ ''منتخب مرثیے'' میں قیصر بارہوی کے دس مراثی کا تحقیقی، تجزیاتی اور موازناتی مطالعہ کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ عصرِ حاضر کے رثائی اَدب میں ان کا مقام و مرتبہ متعین ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہ کتاب فن مرثیہ کے حوالے سے ایک انتہائی اہم اور قیمتی دستاویز قرار دی جا سکتی ہے۔ مرثیہ گوئی میں قیصر بارہوی کا مقام متعین کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فنی معنویت کو ڈاکٹر شبیہ الحسن کتاب کے مقدمے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری جدت و کلاسیکیت کا حسین امتزاج تھی۔ انھوں نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی تھی لیکن صنفِ مرثیہ میں ان کے طبعی جوہر کھل کر ہمارے سامنے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیصر بارہوی کے مرثیوں میں دیگر اصنافِ سخن کی خوش بو بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر غزل کا رچاؤ اور قصیدہ کا طنطنہ انتہائی حسین امتزاج کے ساتھ ان کے مرثیوں

میں جلوہ افروز ہوا۔"

"قیصر اقلیم مرثیہ" قیصر بارہوی کے سوانحی کوائف اور ان کے فن کے بارے میں اعترافات کے علاوہ ان کے تمام مرثیوں کا تعارف اور تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ جدید اُردو مرثیہ میں قیصر بارہوی کا اختصاص اور مقام متعین کیا ہے۔ قیصر بارہوی نے عقیدت و احساس کو مربوط کرتے ہوئے ایسے عظیم مرثیے تخلیق کیے کہ بقول ڈاکٹر سید شبیہ الحسن سلطنت مرثیہ کے قیصر بن کر نصف صدی تک دنیائے مرثیہ پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت کے سلسلے میں اس کے مولف اور مدون ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب لکھتے ہیں:

> "قیصر بارہوی ایک ہمہ جہت شاعر تھے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی مگر اپنی فکر اور اُسلوب بیان سے انھوں نے مرثیے کی صنف کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کیا اور اسے ہم عصر اصناف میں ممتاز مقام دلانے کی کامیاب کوشش بھی کی۔ راقم الحروف کی دیرینہ تمنا تھی کہ قیصر بارہوی کی زندگی ہی میں ان کا تمام کلام زیور طبع سے آراستہ ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا، خاص طور پر ان کے مرثیوں کی تعداد کے حوالے سے جو مغالطے پیدا ہو گئے تھے امید ہے کہ اب ان کے ترپن مرثیوں کی اشاعت کے بعد یہ مغالطے رفع ہوں گے۔ زیر مطالعہ تصنیف میں راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری پر کما حقہ، روشنی ڈالی جائے۔ اسی لیے ان کے تمام مرثیوں کا علاحدہ علاحدہ مطالعہ بھی پیش کیا جا رہا ہے اور بیسویں صدی کے شعری منظرنامے میں ان کے اختصاص کو بھی اُجاگر کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔"

حال (۲۰۰۷ء) ہی میں قیصر بارہوی کے ۵۳ مرثیوں پر مشتمل ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مرتب کردہ سب سے ضخیم کتاب "قیصر بارہوی کے مرثیے۔ تجزیہ وتدوین" جو کہ ۱۰۴۰ صفحات پر محیط ہے، شایع ہوئی ہے۔ اور اغلباً اُردو مرثیے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی شاعر کے ترپن مرثیے ایک جلد میں شائع ہوئے ہیں۔ جدید اُردو مرثیے میں قیصر بارہوی کو خاص مقام دلانے میں سب سے بڑا ہاتھ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ہے جو اس کتاب کی صورت میں سامنے ہے۔

قیصر بارہوی کا اُسلوب اظہار ہم عصر مرثیہ نگاروں میں سب سے منفرد تھا انھوں نے مرثیہ کو تازہ اسالیب کے ذریعے متعدد فکری موضوعات سے آشنا کیا۔ بقول پروفیسر حسن عسکری انھیں لفظ برتنے اور معنویت میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ رثائی اُدب کے ایسے معتبر خلاق کو جس بھرپور انداز سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے متعارف کرایا ہے وہ صرف ان ہی کا حصہ ہے۔ جس طرح قیصر بارہوی نے رثائی اُدب میں انیس کی روایت کو زندہ رکھا ہے اسی طرح ڈاکٹر شبیہ الحسن نے قیصر بارہوی کے تمام مراثی مرتب کر کے اور ان کے فن پر ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ایک طویل اور مبسوط مقدمہ لکھ کر نہ صرف قیصر بارہوی کو امر کر دیا بل کہ اپنا نام بھی مرثیے

کے مدوین کی تاریخ میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ خود ڈاکٹر شبیہ صاحب کے بقول قیصر بارہوی کے مرثیوں کی یہ کتاب جہاں ایک طرف قیصر بارہوی کے متنوع اور ہمہ رنگ موضوعات اور ذائقوں کا احاطہ کرتی ہے وہاں دوسری طرف اس کتاب کے ذریعے قیصر شناسی کے نئے نئے دَر ہمارے سامنے وا ہو رہے ہیں۔

سید ذوالفقار حسین رضوی المعروف بہ سیف زلفی جدید لہجے کے ایک معتبر اور بلند آہنگ شاعر تھے۔ وہ تمام مروج شعری اصناف پہ مکمل دسترس رکھتے تھے۔ غزل اور مرثیے میں انھوں نے خاص نام پیدا کیا۔ ''سیف زلفی کے مرثیے۔ تجزیہ وتدوین'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی جس میں سیف زلفی کے چار مرثیے پیش کیے گئے ہیں۔ ایک سو کے لگ بھگ صفحات کا ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا مقدمہ شامل ہے جس میں انھوں نے سیف زلفی کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کی شعری تخلیقات اور اصناف کے حوالے سے بھرپور مدلل اور مفصل بحث کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر آغا سہیل رقم طراز ہیں:

> ''پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جو متعدد کتابوں کے مصنف ومرتب بھی ہیں اور علم وادب کی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، انھوں نے سیف زلفی کے بعض عسیر الحصول مرثیوں کا کھوج لگا کر ایک پُر مغز اور مدلل مقدمہ لکھا ہے جو تحقیق وتدوین کے علاوہ تنقید اور تخلیق کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ اہلِ ذوق یقیناً سیف زلفی کے ان مرثیوں سے بھی استفادہ کریں گے اور ان کی تفہیم کے لیے اس مقدمہ کو اپنے راستے کا خضر بنائیں گے۔''

معروضات بالا کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق اور تیقن سے کہی جا سکتی کہ ڈاکٹر شبیہ عصر موجود میں مرثیے کے معروف مگر معتبر نقاد ہیں اور یہ بات تو طے ہے کہ کلاسیکی اور جدید مرثیے پر ان کی گہری نظر ہے۔ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کی تدوین وتحقیق اور تجزیاتی مطالعہ کے ضمن میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی حیثیت اس سلسلے میں دائرہ معارف کی سی ہے اور انھیں تاریخ مرثیہ کا ابنِ خلدون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ اُردو کا ایک کثیر الجہات محقق و نقاد

محمد شفیع بلوچ

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہمہ پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں گوناں گوں خوبیوں اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ نسبی لحاظ سے وہ نجیب الطرفین سیّد ہیں اور ان کا تعلق ایک اعلیٰ وارفع علمی، اَدبی اور مذہبی گھرانے سے ہے۔ دادا سیّد شبیر حسن صؔفا ایک بلند پایہ شاعر اور علم واَدب کی ایک قدآور شخصیت تھے۔ تایا حبیبؔ جون پوری بھی ان ہی خوبیوں کے مالک تھے اور سب سے بڑھ کر سیّد وحید الحسن ہاشؔمی جیسے نابغہ عصر، نادر اُسلوب کے حامل مرثیہ گو جن کے والد ہوں تو یہ بات تو یقینی ہے کہ ریاضت، صداقت، دیانت، لیاقت، قوت متخیلہ، لسانیات پر عبور، منطقی اور مدلل اندازِ فکر، وسعت اور بالغ نظری، نظم ونثر پر دسترس اور اَدب وعرفان سے آگہی جیسے خواص، گویا تمام تہذیبی اور اَدبی اقدار ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے لہو میں شامل ہیں اور ان کو ورثے میں ملیں ہیں، بقولِ شاعر:

خیال و فکر کی سچائیاں بھی شامل ہیں
میرے لہو میں میرے شجرۂ نسب کی طرح

علمی مدارج کے لحاظ سے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ریاست کی سب سے اعلیٰ ڈگری کے حامل، پیشے کے لحاظ سے معلم (ایسوی ایٹ پروفیسر)، دانش کے اعتبار سے ایک کثیر الجہات نقاد، محقق، مفسر، شاعر ادیب اور مدیر شہیر جب کہ مزاج کے اعتبار سے انتہائی نفیس، لطیف، مخلص اور شریف النفس انسان ہیں۔ ان کی دو درجن کے لگ بھگ تحقیقی، تنقیدی، علمی اور اُدبی کتب شائع ہو کر علمائے اُدب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر پروفیسر سیّد شبیہ الحسن کی اب تک شائع ہونے والی کُتب ان کے تحقیقی اور تنقیدی بصائر اور سادہ، سچے اور شائستہ اُسلوب کے باعث اُردو اُدب کا ایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ان کی تالیفات وتصانیف ان کے واضح تنقیدی شعور، دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے یہاں موضوعات کا خاصا تنوع ہے اور ہر موضوع کے داخلی خارجی اور زمانی پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ وہ ایک ایسے منفرد، وسیع المطالعہ اور کثیر الجہات نقاد ہیں جو ہر موضوع کو ادب کے وسیع کینوس پر رکھ کر بہ نظرِ غائر دیکھنے کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں روایت سے انحراف بھی نہیں اور جدت سے بھی منھ نہیں موڑا۔ وہ ایسے باصلاحیت اور ہوش مند نقاد ہیں جنھوں نے ادب کے گنجلک مسئلوں کو بڑی سادگی اور شستگی سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی و تحقیقی اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''شبیہ الحسن ان نقادوں اور محققین میں سے ہے جو ادب کو ایک وسیع تر تہذیبی پسِ منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ تہذیبی اقدار سے ان کی علمی وابستگی ان کی تحقیق و تنقید کو ایک نہج عطا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پامال موضوعات پر قلم اٹھانے کے بجائے زیادہ تر ان شخصیات کو تنقید و تحقیق کا موضوع بناتے ہیں جن پر پہلے بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کوشش میں بسا اوقات وہ نئی معلومات فراہم کرتے ہیں یا کسی ایسے زاویے کو سامنے لاتے ہیں جس میں تنقیدی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔''

''مفاہیم'' ڈاکٹر شبیہ کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے طنز و مزاح کے محرکات، فرحت اللہ بیگ کی مزاح نگاری، اُردو مرثیہ اور مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں اور مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتوں کے علاوہ مولانا ظفر علی خان کی نعت اور حفیظؔ جالندھری کی گیت نگاری پر فکر انگیز مضامین رقم کیے ہیں۔ طنز و مزاح کے مقاصد و محرکات میں شبیہ صاحب نے طنز و مزاح کی تمام اقسام پر بحث کر کے فکری نتائج برآمد کیے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ والے مضمون میں فرحت کی مزاح نگاری کے علاوہ ان کی شخصیت اور فن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے، اس لحاظ سے اسے جامع مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُردو مرثیے والا مضمون نہ صرف پُر مغز اور پُر از معلومات ہے بل کہ اُردو مرثیے کا اجمالی خاکہ بھی ہے۔ اس مجموعے میں مرثیے کے سلسلے میں ان کے دیگر دو مضامین یعنی ''مرثیے اور قصیدے کی مشترکہ جہتوں کا جائزہ'' اور ''مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں'' اپنے اندر جدت، تازگی اور فکر کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں شبیہ صاحب نے مرثیے اور قصیدے کے مزاج میں جو بنیادی فرق ہے اس پر بحث کی ہے اور نہایت اہم نتائج اَخذ کیے ہیں اسی طرح انھوں نے مرثیے میں ڈرامائی عناصر کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کے ڈانڈے یونانی ڈرامے تک سے جاملائے ہیں۔ اس مرحلے پر ہندستانی ڈرامہ یاد آتا ہے، بہر حال اس مضمون میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے نئے مباحث کے کئی سامان پیدا کیے ہیں۔

''مولانا ظفر علی خان کی نعت نگاری'' میں شبیہ صاحب نے مولانا (مرحوم) کی نعت نگاری کی جملہ جہتوں کا نہ صرف مکمل احاطہ کیا ہے بل کہ مولانا کی شخصیت اور فن کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ''حفیظ جالندھری کی گیت نگاری'' میں شبیہ الحسن صاحب نے اُردو گیت نگاری کی روایت کو پیشِ نظر رکھ کر حفیظؔ صاحب کے فن گیت

نگاری کو اُجاگر کیا ہے اس لحاظ سے یہ مضمون بھی خاصے کی چیز ہے۔

''آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی'' بنیادی طور پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب کا ایم۔اے اُردو کا مقالہ ہے جسے بعد میں گراں قدر اضافوں کے بعد شائع کیا گیا۔ سید آلِ رضا لکھنوی تہذیب کے نمائندہ شاعر اور مرثیہ اور غزل ہر دو اصنافِ سخن کے قادر الکلام اور نرم و لطیف لہجے کے شاعر تھے۔ وہ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے یہی وجہ ہے کہ انھیں ''لفظ'' برتنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ اُردو کے بہت کم شعرا ایسے ہیں جو بہ یک وقت غزل اور مرثیے میں کامران اور سُرخرو ہوئے ہوں۔ سید آلِ رضا (مرحوم) کی سب سے بڑی شاعرانہ خوبی یہ تھی کہ انھوں نے مرثیے اور غزل کے مزاج کو ہم آہنگ کیا جو بجائے خود مشکل تجربہ تھا۔ ان کے اُسلوب میں بلا کی سادگی اور شائستگی تھی۔ ان کا یہ شعر غزل اور مرثیے کے مزاج کا حسین امتزاج ہے:

قفس کے منتظم نے کس محبت سے پوچھا ہے
اسیرو بھول جاؤ گے فضائے آشیاں کب تک

ایسا شاعر ایک عرصے تک ناقدین کی عدم توجہی کا شکار رہا اور دیگر کئی اہم اَدبی شعرا و ادبا کی طرح وہ خود بھی ان کے بقول:

وہ رضاؔ جس کو غزل گوئی سے تھا کچھ واسطہ
واقعہ تھا اک زمانے میں اب افسانہ ہوا

پردۂ گمنامی میں چلا جاتا مگر صد شکر کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے کتاب مذکور کے ذریعے انھیں افسانہ بننے سے بچالیا اور ان کے فکر و فن کو حیاتِ نو بخشی۔ اُردو اَدب پر شبیہ صاحب کا یہی احسان کیا کم ہے کہ انھوں نے سیّد آلِ رضا جیسے عظیم شاعر کے فکر و فن اور شخصیت کا انتہائی وقیع جائزہ پیش کر کے اس بھولے بسرے شاعر کو نئے سرے سے دریافت کیا۔ اس کتاب میں شبیہ صاحب نے سید آلِ رضا کے حالاتِ زندگی، سیرت و کردار اور مطبوعہ تخلیقات کے جائزے کے ساتھ ساتھ غزل کی لکھنوی روایت کے سفر کو آلِ رضا تک طے کیا ہے اور پھر اسی تناظر میں مرحوم کی غزل گوئی کا تنقیدی مطالعہ، شعری نظریات اور فکری و فنی تجزیوں کے علاوہ اُردو شعری روایت میں آلِ رضا کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ کتاب کے آخر میں شبیہ صاحب نے آلِ رضا کے سوانحی حالات کا حتمی تعین کر کے کتاب کو ایک حوالہ جاتی دستاویز بنا دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب سیّد آلِ رضا کی غزل گوئی کے بنیادی محاسن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ سیّد آلِ رضا عام طور پر ایک مرثیہ گو شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کا پہلو ناقدین کی نظر سے اوجھل رہا۔ دو سو برس کی شعری روایت کے محاکمے کے بعد آلِ رضا کے شعری نظریات کا سراغ لگایا ہے۔ آلِ رضا کے فکر و فن کے بارے میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا یہ کام فی الواقع قابلِ صد تحسین ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل لکھتے ہیں کہ ''انتخاب کا کام عطر کشید کرنے کے مترادف ہے جس میں ذوقِ سلیم کی رہبری، مذاقِ سخن کی استواری، شئے لطیف اور وجدان کی سلامت روی کے ساتھ ساتھ شعری تربیت سے ہم آہنگی ضروری ہے سید شبیہ الحسن میں مذکورہ اوصاف حمیدہ بدرجہ احسن موجود ہیں۔'' اس تناظر میں جب ہم ''بیسویں صدی کا شعری اُدب'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ تمام اوصاف اس تالیف میں مل جاتے ہیں جن کا تذکرہ ڈاکٹر آغا سہیل نے کیا ہے۔ ''بیسویں صدی کا شعری اُدب'' حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، ناصر کاظمی، ن م راشد، مجید امجد، مولانا ظفر علی خان، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی جیسے نمائندہ شعرا کے کلام کا انتخاب ہے۔
اس انتخاب کے سلسلے میں ڈاکٹر شبیہ صاحب نے مذکورہ شعرا کے کلام کے متن کے مختلف نسخوں کو مدِ نظر رکھ کر یہ انتخاب مدون کیا ہے یوں اس کتاب کی افادیت اور جامعیت سے انکار ممکن نہیں۔ کتاب بقول فاضل مرتب بظاہر تو ایم۔ اے اُردو کے طلبہ کی سہولت کے لیے ترتیب دی گئی ہے تاہم اس بات کی بھی کاوش کی گئی ہے کہ جن شعرا کا متن نصاب میں شامل نہیں ہے ان کی نمائندہ تخلیقات شامل کی جائیں۔ یہ کتاب ایک طرف تو نصاب کے جملہ متقضیات پورے کرتی ہے اور دوسری جانب اس کے ذریعے سے علم واُدب کے شائقین بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں یوں شبیہ صاحب شعروں کے انتخاب میں بھی کہیں رسوا نہیں ہوئے اور ان کے دل کا حال بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: یہ انتخاب نصابی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ طلبہ اور سنجیدہ قارئین کے شعری ذوق کی تربیت کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

''ترجیحات'' سات مضامین پر مشتمل ہے جو اُردو اُدب کی چند وقیع شخصیات پر تحقیقی اور تنقیدی مرقع ہے۔ ''محمود نظامی کا باطنی سفر نامہ'' ماضی سے ایک تہذیبی رابطہ اور ایک گم شدہ تہذیب کی کڑیاں تلاش کر کے انھیں حال سے ملا دیا۔ ''آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین'' ایک خاص تحقیقی مضمون ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے خیال میں کسی بھی شاعر کے سنِ ولادت کے تعین سے قبل تحقیق وتدوین کے اصولوں سے کما حقہ آگاہی، شاعر سے متعلق تمام معلومات سے واقفیت، شاعر سے متعلق دیگر پیش کردہ مواد پر مکمل دسترس اور ذہنی تجزیے کی صلاحیت نہایت ضروری ہے۔''

اس مضمون میں انھوں نے تمام ممکنہ حد تک ان تمام ماخذ تک رسائی حاصل کی ہے۔

''نسیم امروہوی۔ ایک موضوعاتی مطالعہ'' اور ''مولانا مرتضیٰ حسین فاضل۔ ایک مطالعہ'' بنیادی طور پر تنقیدی مضامین ہیں۔ ان کی تحقیقی مہارت حقائق کی تلاش میں سرگرم نظر آتی ہے اور تنقیدی بصیرت فن کی جانچ پرکھ اور اقدار کے تعین میں صَرف ہوتی ہے۔

''شیر افضل جعفری کی شعری تخلیقات۔ ایک مطالعہ'' بیک وقت تنقیدی، تجزیاتی اور تبصراتی انداز لیے ہوئے ہے۔ ان میں ان کی شاعری پر ایک مضبوط فکری اور تنقیدی محاکمے کا انداز جس میں ان کے فن کی مختلف

جہتوں سے شاعر کی قلندرانہ اور وسیع المشرب شخصیت پر بحث ہے۔ ترجیحات کا ایک اہم مضمون آرزو لکھنوی کے تلمیذِ رشید سید وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری پر ہے۔ یہ ان کے والدِ گرامی ہیں لیکن بیٹے کے بجائے نقاد نظر آتے ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی کے تیس مرثیوں کا جائزہ پیش کیا ہے اور فکری اور فنی حوالے سے ان کے شاعرانہ محاسن کو اُجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے مقالات کا ایک اور خوب صورت مجموعہ ''تصریحات'' کے نام سے موجود ہے جو روحِ عصر کے ساتھ جدت و کلاسیکیت کا مزاج لیے ہوئے ہے۔ اس مجموعے میں جہاں ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر طاہر تونسوی، اشفاق حسین، نسیم سید، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر فخر الحق نوری اور اختر ہاشمی جیسی عصر موجود کی معتبر اُدبی شخصیات کے فنی محاسن کو اُجاگر کیا گیا ہے وہاں سید وصی الحسن نقاش، ڈاکٹر محمد صالح طاہر، شکیل جاذب، آفتاب کاوش، جاوید صدیق بھٹی، ضیا الرحمٰن فاروقی، خالد محمود امر اور اختر حسین سندھو جیسے عصرِ حاضر کے جواں جہاں شعرا کے تخلیقی رویوں کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ ہر چند ان اُدبی شخصیات سے تعلق خاطر ہونے کے باوصف کسی مضمون میں بھی دوستی یا ستائش باہمی کا شائبہ تک نہیں اور یہی ایک دیانت دار نقاد کا سب سے بڑا وصف ہوتا ہے۔

اپنے آباو اَجداد اور بالخصوص اپنے والدِ گرامی سید وحید الحسن ہاشمی جو بجائے خود اُردو کے ایک عظیم مرثیہ نگار ہیں سے ورثے میں ملنے والی مرثیے کی روایت کے نہ صرف امین بل کہ وارث ہیں، اس حوالے سے رثائی اُدب کے انتقاد میں ان کا اختصاص یوں بنتا ہے کہ ان کی اب تک شائع ہونے والی کتب میں نصف کے قریب مرثیے کی تفہیم اور تفسیر سے متعلق ہیں۔ اُردو مرثیے کے حوالے سے ان کا اولین اعزاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے معروف مرثیہ نگار جناب قیصر بارھوی کے مراثی کی تدوین اور تفہیم کے سلسلے میں سب سے ضخیم کتاب مرتب کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ یہ بات پورے تیقن کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا محبوب و مرغوب موضوع اور ان کی تحقیق و تنقید کا نقطہ مرکزی مرثیہ اور مرثیہ گو شعرا رہا ہے، خاص طور پر جدید مرثیہ گو شعرا۔ مرثیے کی تحقیق و تنقید ڈاکٹر شبیہ کا امتیاز ٹھہرتی ہے۔ مرثیے کے سلسلے کے بہت سے موضوعات پر انھوں نے کچھ اس تواتر سے لکھا ہے اور اس انداز سے فنی اور معنوی محاسن سے بحث کی ہے کہ ان کے فکری موقف سے خود مرثیے کی تفہیم اور اس کے مختلف فنی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

تدوین اور بالخصوص مرثیے کی تدوین کے سلسلے میں انھوں نے قابلِ قدر کام سرانجام دیا ہے۔ تدوینِ متن کا کام کچھ اتنا آسان بھی نہیں اس کے لیے بنیادی طور پر علمِ عروض کا جاننا ضروری ہے اور شاعری اور عروض تو ان کے گہوارہ تربیت کا حصہ ہے۔ انھوں نے تدوین کے جدید اصولوں کو مدِ نظر رکھا ہے اس لحاظ سے ان کا مدون کیا ہوا کئی معاصرین سے بہتر ہے۔

بطور مدیر 'شام و سحر' جہاں تک ان کے اداریوں کا تعلق ہے تو یہاں بھی ا کی تخلیقی صلاحیتیں اُبھر کر

سامنے آئی ہیں۔ انھوں نے اداریے کو عام صحافیانہ سطح سے اُٹھا کر تخلیقی سطح پر پہنچایا ہے۔ وہ اپنے اداریوں میں اہم اُدبی مسائل، معاصر تحریکات اور رفتارِ اُدب پر روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔ ان کے اداریے بقول ڈاکٹر انور سدید مسائل کے اداریے ہوتے ہیں۔ 'شام وسحر' میں جہاں ان کے زیرِ ادارت سال بھر کی تخلیقات کا جائزہ شایع کرنا ایک اچھی اور مفید روایت بنا ہے وہاں وہ اس جریدے کے ذریعے نوواردانِ اُدب کی تربیت کا فریضہ بھی سرانجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر پروفیسر سیّد شبیہ الحسن کی مذکورہ بالا تمام علمی اور اُدبی فتوحات بالخصوص ان کے مضامین اور مقالات ان کی ندرتِ فکر اور گہری ناقدانہ بصیرت کا بین ثبوت ہیں۔ ان کا تحقیقی اور تنقیدی سرمایہ ان کی علمی ریاضت اور وسعتِ مطالعہ پہ دال ہے۔ ان کے مضامین سچے، کھرے اور تخلیقی اُسلوب لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے یہاں کہیں ابہام یا ژولیدگی نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مضامین رقم کرتے وقت ان کے سامنے ایک واضح نصب العین ہے یہی وجہ ہے ان کی تنقید میں استدلال بھی ہے وزن بھی۔ مختصر یہ کہ ان کی تحقیق و تنقید اس کے طبعی رجحانات اور باطنی میلانات کی آئینہ دار ہے:

قاصر قلم ہے کیا لکھوں میں ان صفات پر
قطرہ رہے خموش سمندر کی بات پر

(ریحانؔ اعظمی)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ ایک عظیم نقاد

پروفیسر خورشید بیگ میلسوی

◆◆

معروف شاعر اور محقق ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اپنے اسلاف کی وراثت، اَدبی روایت اور ناقدانہ انفرادیت کی بنا پر اُردو اَدب کا اہم سرمایہ ہیں۔ جو کردار کو فن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ایک نقاد اگر انجمن ستائش باہمی کا رُکن بن جائے یا وہ ذہنی برہمی کے اظہار کے لیے کسی اہلِ فن کے فن پر ناخن تیز کرے تو یقیناً وہ پاک باز اور باکردار نقاد نہیں کہلا سکتا۔ یہ سیّد شبیہ الحسن کی خوش بختی ہے کہ وہ سیّد وحید الحسن ہاشمی جیسے نابغۂ عصر، نادر اُسلوب کے حامل مرثیہ گو شاعر کے گھر پیدا ہوئے۔ انھیں اپنے تایا حبیبؔ جون پوری اور دادا سیّد شبیر حسن صفاؔ کا اَدبی ورثہ نصیب ہوا۔ یہ گھرانہ شروع ہی سے لفظ کو زندگی کا گراں قدر اثاثہ سمجھتا تھا اور سچ کے بیان کے لیے کبھی غزل، کبھی نثر تو کبھی مرثیے کی صنف کو اظہار کا ذریعہ بناتا رہا اور پھر اس گھرانے کا اہلِ بیتؑ عظام سے تعلق بھی نشانِ ظفر مندی بنا۔ جس نے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے فن اور شخصیت دونوں کو عرفان و آگہی اور غیبی مدد عطا کی کہ آج وہ بیسیوں کتابوں کے مصنف اور صاحبِ اُسلوب شاعر کے طور پر اپنی مثال ڈھونڈتے ہوئے اَدب کے مطالعے اور پھر تجزیے کے اور بجنل بیان پر قادر نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی شخصیت علم و مطالعے سے مزید تابناک ہوئی اور یہی اصل روشنی اُن کے وہ اب و جد ہیں جن کی زبان و بیان کی وراثت اُن کے حصے میں آئی اور رشکِ جناں بنی۔ ایک تخلیق کار کے طور پر انھوں نے غزل میں روایت و جدت کو آمیز کر کے پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اوریجنل اَدب تخلیق کیا اور تنقید کے باب میں میزانِ عدل کے مترادف کسوٹی تشکیل دی اور پھر بیان کی نفاست، روانی اور سادگی کو اپنایا تا کہ نہ صرف تخلیق کار اپنی شاعری کے تجزیے سے آگاہ ہو کر ارتقائے اَدب کی راہ پر محوِ سفر رہے بل کہ عام قاری کو بھی اَدب کی تفہیم حاصل کرنے کی آسانی اور شعور سے آگاہی بخشی۔ ایک ایسا دَور جب ایک طرف محنت جانکاہ کے ذریعے نقدِ اَدب کا کام ہو رہا ہے اور دوسری جانب سہل پسندی کے عادی افراد نقل نویسی یا خریدے ہوئے مسودے پر اپنی قابلیت کی دھاک بٹھانے میں مصروف

بلا شبہ ہمارے اُدب کو تحقیقی خوش بو کے ادراک اور ترسیل کے لیے ایک ایسے نقاد کی ضرورت ہے جو رائج منفی اور اَدب دشمن پالیسیوں پر چلنے والے لوگوں کا اپنی فنی عظمت اور تحقیقی محنت سے ڈٹ کر مقابلہ کرے اور اور یکجہتی کے وقار کے قیام کا بندوبست کرے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے قلم سے پیار اور لفظ سے محبت ایک نعمتِ غیر مترقبہ کے مترادف ہے اور وہ اس کے ذریعے خدمتِ علم و اَدب کے ساتھ ساتھ خدمتِ انسانیت میں مسلسل مصروفِ عمل ہیں۔ اُن کے ذہن و دل کے تخلیقی و تنقیدی تناسبات کو سائنسی قوانین سے ماپنے کی بجائے اَدب کے معروف نظریاتِ تنقید سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے تنقیدی و تخلیقی رویے اور ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید کی صداقت ان کی آگہی کا وہ خام مال ہے جسے ان کی وراثت، انفرادی خصوصیت اور روایت نے ندرت عطا کی ہے۔ اس رفیع الشان مقام کا خود ڈاکٹر شبیہ الحسن کو ادراک ہے اس لیے وہ کہتے ہیں ......

مرا وجود ہے تخلیقِ زندگی کا بھرم
میں کائنات کے پیکر میں ہوں رگوں کی طرح

انسان نے جس طرح بے آب و گیاہ دنیا کو حسنِ تخیات کو ترتیب دیا اسی طرح شاعر اور ادیبوں نے تخلیق کے پیکر تراشے جس کے لیے نقد و نظر کی رگیں درکار تھیں۔ بلا شبہ پاکستان میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس حوالے سے بے حد کام کیا ہے اور کام بھی ایسا جس پر نظریۂ تنقید اور رویے فدا ہیں۔ چناں چہ مفاہیم (مقالات) ہوں یا ترجیحات (مقالات)، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (مقالات) ہوں یا تصریحات (مقالات)، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق)، باقیاتِ آلِ رضا (تدوین)، کلیاتِ حبیب جون پوری (تدوین)، بیسویں صدی کا شعری اَدب، آیاتِ آمنہ، بجھی وہ شمع، العطش، وضاحتیں، وزیر الحسن عابدی، حروف بدن، اقبال شناسی، شام و سحر کی باتیں، سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (نعت، منقبت اور سلام کے حوالے سے) ان کے علاوہ میرے زیرِ مطالعہ کتاب ''مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن'' (تحقیق و تنقید) محتاجِ ذکر اور محتاجِ تعارف نہیں۔ مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی کی چالیس فیصد تنقیدی و تحقیقی کاوشیں ان کتابوں سے محسوس کی جاسکتی ہیں کہ انھوں نے کتنی عرق ریزی اور جاں فشانی سے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ غالباً ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن وہ واحد نقاد ہیں جن کے حصے میں تنقید کی عظمت اور ایمان دارانہ وصف کی اعلیٰ روایت آئی۔ تب ہی تو انھوں نے اپنے والدِ ذی وقار اور برصغیر کے عظیم مرثیہ گو شاعر اور مختصر مرثیے کے بانی سیّد وحید الحسن ہاشمی کے فنِ مرثیہ گوئی، نعت گوئی پر نہ صرف دیگر اصحابِ نقد و نظر کی رائے شامل کی بل کہ اپنے لفظوں سے بھی رثائی اَدب کے درخشندہ ستارے کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ کشمکش مرثیہ مصائبِ زینبؑ جو ۱۹۹۵ء میں لکھا گیا اور جو اٹھانوے بند پر مشتمل مرثیہ ہے، کا آخری بند ملاحظہ کیجیے:

دیدۂ وقت نے یہ منظرِ غم بھی دیکھا   شام کی راہ تھی اور قافلۂ آلِ عبا
لبِ تاریخ بتاتے ہیں بعنوانِ وفا   سرِ عباسؑ کئی مرتبہ نیزے سے گرا

صرف اس واسطے نیزے پہ نہ ٹھہرے عباسؑ
سر کھلے ثانیِ زہراؑ کو نہ دیکھے عباسؑ

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شکریہ جنھوں نے عظیم باپ کے فن شناس فرزند ہوتے ہوئے عام قاری کے لیے زیرِ نظر کتاب ''مختصر مرثیے کی روایت'' اور وحید الحسن ہاشمی'' کے پہلے باب میں سید صاحب کے سوانحی حالات اور تصانیف کا تذکرہ کیا جب کہ دوسرے باب میں انھوں نے اُن تخلیق کاروں کے تجزیوں کی تفصیل بیان کی جنھوں نے سید صاحب کے فکروفن پر خامہ فرسائی کی یا منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ آپ نے والدِ محترم کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اعداد وشمار کے تحقیقی نکات سامنے رکھے۔ یہ باب اپنی طوالت کے باوجود ادب کے قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے کیوں کہ اس باب میں مختصر مرثیے کے حوالے سے سیّد وحید الحسن کے لکھے ہوئے مرثیوں کے ممیّزہ اوصاف بیان کیے گئے اور قاری کو بتایا گیا کہ آغاز میں جہاں اقدارِ انسانی کا روشن مطلع موجود ہے وہاں مرثیے کے بیانیہ انداز کا تاثر بھی بدرجہ اتم موجود ہے اور سید شبیہ الحسن نے یوں اس باب میں ایک دقیق مرحلے کو سہل انداز میں صفحۂ قرطاس کی زینت بنادیا ہے۔ اگلے ابواب میں مختصر مرثیے کے حوالے سے بے حد اہم مباحث شامل ہیں جس کے بعد سیّد وحید الحسن کے منتخب مرثیے ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب مرثیہ کی صنف اور ارتقا کے حوالے سے جہاں اہلِ نقد ونظر کے ہاں مقبولیت پاچکی ہے وہاں اس نے سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رویے کے حُسن اور تجزیاتی ریاضت کو آشکار کرکے مرثیے کے فن کے وجودِ مستحکم کی طرف اَدبی اصناف کے ارتقا سے دل چسپی رکھنے والے اصحاب کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ ہم اسے فکری اعتبار سے حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی کے اس شعر سے تطبیق کریں تو بے جا نہ ہوگا......

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

آخر میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو ان کے علمی واَدبی اور ناقدانہ کارناموں پر سلام پیش کرتا ہوں :

کس کے جلووں سے در و بام نظر ہیں روشن
کوئی خورشید، سرِ بزم درخشاں تو نہیں
کر رہا ہوں میں گُلِ حرف نچھاور تجھ پر
گو مرے شعر، تری شان کے شایاں تو نہیں

(مطبوعہ)

پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، ۱۶ تا ۳۰ نومبر ۲۰۰۶ء۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مضمون نگاری

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ان اہل قلم میں سے ہیں جنھیں مبدائے فیض سے غیر معمولی اَدبی صلاحیتوں سے نوازا جاتا ہے۔ ایسی شخصیات اپنے علمی واَدبی کارناموں سے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کرتی ہیں بل کہ آیندہ زمانوں کے لیے بھی روشنی کا مینار بن جاتی ہیں۔

موصوف کی ذہنی تشکیل میں تین عوامل اہم کردار اَدا کر رہے ہیں۔ (۱) خاندانی علم دوست واَدب پرور ماحول (۲) ذہنی اُپج (۳) درس وتدریس اُردو۔

ان تین عوامل کے مطلع تاباں پر تحقیقی لگن، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی رعنائی کی قوسِ قزح اپنے بوقلموں رنگوں کی بہار دکھا رہی ہے۔ بقول جوشؔ ملیح آبادی:

کچھ میرے ظرف نے بھی دیا ہے سُبو کو رنگ
کچھ عنصرِ نوازشِ روحانیاں بھی ہیں

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیق وتنقید سے متعلق کتب۔ مفاہیم، ترجیحات، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار اور تصریحات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مضامین اصنافِ اَدب اور اَدبی شخصیات کے بارے میں لکھے ہیں۔ اصناف شعر میں، خصوصاً مرثیہ ان کا محبوب ومرغوب موضوع ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی مرثیہ نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اگر آپ کے ذہن میں اس کتاب کے بارے میں یہ تصور موجود ہے کہ اس میں اُردو مرثیے کے محاسن، تاریخ، ارتقائی سفر کی روداد اور تمام معروف وغیر معروف مرثیہ نگاروں کے کوائف یک جا کیے گئے ہوں گے تو مَیں آغاز ہی میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ اس کتاب میں صنفِ مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی شعوری کوشش کی گئی

ہے۔۔۔۔۔ میں ایک ایسے علمی قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں مرثیہ سننا محض ثواب اخروی ہی نہیں بل کہ اس کے حسن وقبح پر روشنی ڈالنا بھی مرثیے کے فروغ کا ایک ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔''[۱]

مندرجہ بالا تحریر سے سید شبیہ الحسن کی روایت گریز سوچ اور مجتہدانہ طرزِ استدلال کا اندازہ ہوتا ہے۔ تحقیق وتنقید کا حقیقی تقاضا بھی یہی ہے کہ مسائل کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھا جائے تاکہ مصائب ومحاسن کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا جا سکے۔ سید شبیہ الحسن تحقیق وتدوین کے اصولوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اسی لیے وہ حقائق کے استنباط میں ٹھوکر نہیں کھاتے۔

معروف غزل گو اور جدید مرثیے کے نمائندہ شاعر سید آلِ رضا لکھنوی کی تاریخ ولادت کی تحقیق کے سلسلے میں ان کا مضمون ان کی محققانہ بصیرت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس مضمون میں شبیہ الحسن نے بڑے سلیقے سے قیاسات ومعروضات کے انبار سے اصل مآخذات کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

''اولاً ہم نے آلِ رضا کے اہلِ خانہ کو اہمیت دی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے آلِ رضا کے والد جسٹس سید محمد رضا (مرحوم) کی خودنوشت بیاض کا اقتباس پیش کیا ہے۔ اس کے بعد مرحوم کے حقیقی بھائی سید ہاشم رضا صاحب کی تحریروں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

ثانیاً ہم نے ان اصحاب کی تحریروں کو اہمیت دی ہے، جن کا تعلق آلِ رضا سے براہ راست رہا ہے۔ اس سلسلے میں فی الوقت ہم نے تین اصحاب وحید الحسن ہاشمی، ضمیر اختر نقوی، اور ضیاء الحسن موسوی کی آراء کو اہمیت دی ہے، کیوں کہ یہ تینوں حضرات زمانی اور فکری اعتبار سے سید آلِ رضا کے قریب رہے ہیں۔ ثالثاً ہم نے آلِ رضا کی زندگی میں شائع شدہ کتابوں کو اہمیت دی ہے۔ اس سلسلے میں بالخصوص ہمارے پیشِ نظر جدید فن مرثیہ نگاری (وحید الحسن ہاشمی) اور غزل معلٰے (سید آلِ رضا) رہی ہیں اور ہم نے ان کے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کتب میں ان کا سن ولادت غلط شائع ہوتا تو وہ تصحیح فرما دیتے۔ سید آلِ رضا کی خاموشی سے بھی ہمارے متعین کردہ سن ولادت کو تقویت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے ردّ وقبول کے لیے تحقیق وتدوین کے جدید اصولوں کا بھی سہارا لیا ہے۔''[۲]

معروف اَدبی شخصیات کے بارے میں ناقدینِ اَدب ہمیشہ خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن اکثر اہلِ قلم ایسے بھی ہیں جنھوں نے اَدب کے حوالے سے نمایاں کارنامے تو سرانجام دیے ہیں لیکن نہ ان کی کوئی لابی ہے اور نہ انھیں میڈیا منظرِ عام پر لاتا ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ایسے اہلِ قلم کی خدمات کو موضوعِ تحقیق بنائیں تاکہ انھیں ان کا جائز حق مل سکے۔ ان کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے اَدبی رسالے ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور کا ہر شمارہ جہاں ان کی پُرخلوص مساعی کا منھ بولتا ثبوت ہے وہاں ان

کی تنقید و تحقیق سے متعلق کتب بھی اس حقیقت کی مکمل شہادت دیتی ہیں۔ معروف نقاد ڈاکٹر سہیل احمد خاں لکھتے ہیں:

''وہ (ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن) پامال موضوعات پر قلم اٹھانے کی بجائے زیادہ تر ان شخصیات کو موضوع بناتے ہیں جن پر پہلے بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس کوشش میں بسا اوقات وہ نئی معلومات فراہم کرتے ہیں یا کسی ایسے زاویے کو سامنے لاتے ہیں جس میں تنقیدی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔''۳۰

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی مضامین اہل نقد و نظر کی آراء کے حوالوں سے مرصّع اور اپنے بے لاگ تجزیے سے آراستہ ہوتے ہیں۔ وہ تجزیہ کاری کے عمل میں کسی بھی بڑے نام سے مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ تحسین و توصیف میں بھی بعض دیگر نقادوں کی طرح جانب دارانہ پالیسی اختیار نہیں کرتے۔ تحقیق و تنقید میں اعتدال و توازن کو قائم رکھنا ان کا خاص وصف ہے۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی، سیّد شبیہ الحسن کے اندازِ تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر شبیہ الحسن جس شخصیت کا ذکر آغاز کر دیتے ہیں، جس میں ولادت، بچپن اور عمر کے مختلف مدارج کے احوال، تعلیم و تربیت، اساتذہ اور اہل کمال سے اخذ و مطالعہ کا تعارف، خاندان کا اَدبی، تہذیبی اور معاشرتی منظر اور اس شخصیت کے ذاتی جوہر استعداد کا ذکر ہوتا ہے۔ اس سوانحی مرحلے سے گزرنے کے بعد یا اسی کے ضمن میں شبیہ الحسن اس شخصیت کے مولد و مسکن کے اس عہد کے علمی، اَدبی اور تہذیبی اثرات و مظاہر کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اس علاقے کے ماحول و فضا کا کیا کیا تاثر اس شخصیت نے قبول کیا...... اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد شبیہ الحسن اس شخصیت کے علمی و اَدبی کارناموں کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں......''۴۰

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی مضامین کا مجموعی جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شعور افزائی و فکر انگیزی کے عناصر بھی ہیں، نئی معلومات کا ذخیرہ بھی ہے، ہماری تاریخ و تہذیب کی عکاسی بھی ہے اور نقد و نظر کے نئے امکانات کی نشان دہی بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مختلف کتابوں میں شامل چند اہم تنقیدی مضامین کے کچھ اقتباسات نذرِ قارئین ہیں تاکہ موصوف کے اندازِ نقد و نظر کا کچھ اندازہ ہو:

''نظر نامہ'' ایک مسافر کی سفر در سفر کی روداد ہے۔ محمود نظامی نے اس ایک سفر میں جس طرح دو سفر کیے ہیں، وہ بذاتِ خود ایک خاصے کی چیز ہے۔ بیش تر ناقدین نے اسے تخیل کی کار فرمائی قرار دیا ہے، جب کہ ہمارے خیال میں یہ ماضی سے ایک تہذیبی رابطہ تھا، جو کسی طرح بھی منقطع نہیں ہو سکا تھا۔ بار بار ماضی کی طرف لوٹنا اور اس کے نتیجے میں مسرور ہونا بذاتِ خود ایک انوکھا عمل ہے۔''۵۰

''ڈاکٹر آغا سہیل کے ان افسانوں میں معاشرتی کرب اور سماجی آشوب کے ساتھ ساتھ فکری زوال کا بھی احساس ابھرتا ہے۔ دوسرے افسانوں کے برعکس آغا سہیل کے ان افسانوں میں محو غم دوش ہونے کی بجائے فکر فردا کا احساس بھی ملتا ہے۔ آغا سہیل کے لب ولہجہ میں ایک تُرشی بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ''بدلتا ہے رنگ آسماں'' میں جو ایک ارتعاش اور بے چینی کی کیفیت ابھرتی ہے وہ اگن کنڈلی میں پُرسکون سطح کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان افسانوں میں آغا سہیل کا لب ولہجہ کہیں کہیں اصلاحی بل کہ تبلیغی ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے کے مسائل پر زور شور سے تنقید کرتے ہیں۔''[6]

....

''المیہ اور طربیہ دونوں معصیت اور انتشاری کیفیات کی پیداوار ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف مقاصد اور ان کے طریقِ کار کا ہے۔ المیہ بربادی کا احساس دلا کر انساں کو غیر اطمینان بخش صورت حال سے دوچار کر دیتا ہے۔ جب کہ طربیہ تخریب میں مضمر تعمیر کی سمت توجہ دلا کر بہتری کے امکانات روشن کرتا ہے۔ مقصد بہر حال دونوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہر اعتبار سے طربیہ رجحان کا مطالعہ کرنے والے کو اس رجحان کے پس پردہ عوامل کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ ماحصل یہ ہے کہ طربیہ کے پیچھے المیاتی عناصر کا عمل دخل یقینی ہے۔ اور المیہ کے بغیر طربیہ کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔''[7]

....

مقالہ نگاری اور عام مضمون نگاری میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مقالات میں ایسی زبان استعمال کی جاتی ہے جو عام علمی سطح سے بلند ہوتی ہے۔ اس امر کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ تحریر کا اُسلوب عالمانہ و فاضلانہ ہو۔ اس صورت میں اکثر اوقات زبان گنجلک اور ناقابلِ تفہیم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تنقیدی نگارشات میں یہ خامی نظر نہیں آتی۔ موصوف جب محسوس کرتے ہیں کہ اب ثقیل اور گہراں بار الفاظ سے معانی کی کمر جھکنے لگی ہے تو تحریر کو فوراً شگفتگی و رعنائی کا عصا پیش کر کے سہارا دے دیتے ہیں۔ اس طرح تنقید و تحقیق، تخلیق کی چاشنی سے خوش مزہ ہو جاتی ہے اور عبارت کا ہر جملہ دل کش و جاذبِ نظر بن جاتا ہے۔ سیّد شبیہ الحسن کی تنقیدی نگارشات کے درج ذیل چند اقتباسات میں تخلیق کا جمالیاتی رنگ ملاحظہ ہو۔

....

''ہم ایک ایسے بنجر معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں سنجیدہ شعر و اَدب سے ربط رکھنا جگ ہنسائی کا موجب بن گیا ہے۔ دانش مند قلم کاروں نے تو اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر لوح و قلم سے اپنا ناتا توڑ لیا ہے۔ یاد رہے کہ جب تلوار سے ہمارا تعلق ٹوٹا تھا تو ہم اپنی پُر جلال سلطنت کھو بیٹھے تھے اور اب لوح و قلم کو چھوڑ کر ہمارا رشتہ اپنی پُر جمال تہذیب سے ٹوٹ گیا ہے۔''[8]

''شاعر کی شاعری کو فکر بلند آہنگی اور علوئے مرتبت بخشتی ہے۔ تجربہ الفاظ و تراکیب کا پہاڑ نظروں کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے مگر فکر اس پہاڑ کے حسین نظاروں سے روح و دل میں اُتر جانے والی کیفیات کو اور پُر فریب اور پُر اثر بنا دیتی ہے۔ فکر ہی آسمان شاعری کا ایک چمکتا ہوا ستارہ اور آنکھ کی سیپی میں تابندہ گُہر ہے۔ کہیں یہ ذہن کی جھیل میں ابھرا ہوا یادوں کا کنول اور کہیں روشنی کا جزیرہ ہے۔ فکر ہی شعر میں معنویت اور شاعری کو خلعتِ دربارِ دوام عطا کرتی ہے۔'' ۹

....

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے چوں کہ اُردو کلاسیکی اَدب کا بھی بھرپور مطالعہ کیا ہے اور جدید اَدبی رویوں کا بھی وہ کامل ادراک رکھتے ہیں، اس لیے ان کا تنقیدی و تحقیقی شعور پختگی کی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس پختگی اور بالغ نظری نے انھیں صفِ اول کے نقادوں میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ مقام انھیں محنت و ریاضت سے حاصل ہوا ہے۔ وہ ملک و قوم کا ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔

....

حوالہ جات

۱۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر سیّد، ''چند باتیں'' (دیباچہ) مشمولہ ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' (کتاب) لاہور: اظہار سنز ۱۹۔ اُردو بازار، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۔

۲۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر سیّد، ''آلِ رضا کے سنِ ولادت کا حتمی تعین'' (مضمون)۔

۳۔ سہیل احمد خاں، ڈاکٹر محولہ بالا ۲ ...... (پس ورق فلیپ)۔

۴۔ عاصی کرنالی، ڈاکٹر، ''دیباچہ'' محولہ بالا ۲، ص ۱۲۱۔

۵۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر سیّد، ''محمود نظامی کا باطنی سفرنامہ'' محولہ بالا ۲، ص ۲۱۔

۶۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر سیّد، ''ڈاکٹر آغا سہیل کی اَدبی جہتیں'' (مضمون)۔
مشمولہ ''تصریحات'' (کتاب) لاہور: الحسن پبلی کیشنز ۲۵۳۔ ایف، رحمان پورہ، ۲۰۰۵ء، ص ۳۶، ۳۷۔

۷۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر، ''طنز و مزاح۔ مقاصد و محرکات'' (مضمون) مشمولہ۔
''تصریحات'' (کتاب) لاہور: اظہار سنز ۱۹۔ اُردو بازار، ۱۹۸۹ء، ص ۲۔

۸۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر سیّد، ''اختر ہاشمی کا شعری منظرنامہ'' (مضمون) محولہ بالا ۶، ص ۱۴۱۔

۹۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر سیّد، ''سیّد وصی الحسن نقاش کی شاعری'' (مضمون) محولہ بالا ۶، ص ۱۵۶۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن......اُردو مرثیہ کے ایک اہم نقاد

ڈاکٹر ضیاء الحسن

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تربیت ایک شعر فہم گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد وحید عصر حضرت سید وحید الحسن ہاشمی کا شمار اپنے عہد کے نام ور مرثیہ نگار شعرا میں ہوتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذوقِ مرثیہ ان کو وراثت میں ملا ہے اور ان کی جینز میں شامل ہے۔ اگرچہ ان کی تحقیقی و تنقیدی کاوشیں متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں لیکن مرثیہ کے حوالے سے ان کے کام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مرثیہ نگاری پر ان کے کام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول مرثیہ نگاری کے فن کے حوالے سے ان کا تنقیدی کام، دوم مرثیہ نگاروں پر ان کی تنقیدی آرا اور سوم ہمارے عہد کے بعض اہم مرثیہ نگاروں کے تخلیقی کام کی تدوین۔ ان کی تیئس (۲۳) میں سے پندرہ شائع شدہ کتابوں کا موضوع مرثیہ نگاری یا مرثیہ گو شعرا ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہمارے عہد کے اُبھرتے ہوئے محقق اور نقاد ہیں۔ 'شام و سحر' کے مدیر کی حیثیت سے انھوں نے گزشتہ کم و بیش بیس (۲۰) برس میں اَدب اور ادیب دونوں کی خدمت کی ہے۔ متعدد اَدبی شخصیتوں اور اداروں کے حوالے سے خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ تنقیدی و تحقیقی کاموں میں بھی ان کا ایک منفرد اندازِ کار ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، قاری سے اس کا مکمل تعارف کراتے ہیں۔ یہ ترتیب و تہذیب ان کی شخصیت کا لازمی اور نمایاں جزو ہے۔ انھوں نے جس طرح صنف مرثیہ پر مسلسل کام کیا ہے، وہ ان کی علمی لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اب مرثیہ نگاری کی تنقید و تحقیق میں ان کا نام معتبر سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے مرثیہ نگاری پر کام میں ان کی کتاب ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے لیکن اسے آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں پہلے دو ابواب کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں'' ہے۔ اس باب میں انھوں نے لکھنؤ اور لکھنوی مزاج کے تناظر میں ڈراما، ریختی اور مرثیہ کو موضوع بحث بنایا ہے۔ لکھنؤ کی فضا میں

مرثیہ نگاری کا فروغ بھی مرثیہ میں ڈرامائی عناصر کی شمولیت کا باعث بنا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرثیہ کو ایک مرکب صفت قرار دیا ہے۔ جس میں دیگر کئی اصنافِ اَدب اور فنون کے عناصر اس طرح شامل ہوئے ہیں کہ اس صنف کے مزاج میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس باب میں انھوں نے پلاٹ، قصہ، کردار، مکالمہ، ڈرامائی کشمکش، رزمیہ کیفیات اور المیہ عناصر کو دونوں اصناف میں مشترک عناصر کے طور پر شناخت کیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ'' ہے۔ اس باب کو بھی وہ لکھنؤ کی معاشرتی و تہذیبی فضا کے پس منظر میں زیرِ بحث لائے ہیں۔ انھوں نے جذبۂ غم اور احساسِ طرب کو بنیاد بنا کر ان اصناف کے افتراقات و اشتراکات پر بات کی ہے۔ مبالغہ اور مدح کو انھوں نے اشتراکات کے طور پر کیا ہے لیکن دونوں اصناف کے مزاجی فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ اس کتاب کے بقیہ ابواب چند اہم مرثیہ نگاروں کے فن کے جائزے پر مشتمل ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے مرزا دبیرؔ کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ انھوں نے انیسؔ کے بجائے دبیرؔ کو منتخب کیا ہے لیکن انھوں نے دبیرؔ کو انیسؔ پر فوقیت دینے کے لیے منتخب نہیں کیا بل کہ ان تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر دبیرؔ کا مقام متعین کرتے وقت پیشِ نظر رہتی ہیں۔ ان کے خیال میں دونوں عظیم مرثیہ نگاروں کا موازنہ بلاجواز ہے اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا ناانصافی اور اَدب ناشناسی ہے۔ انھوں نے انیسؔ و دبیرؔ کو دل و دماغ کے تناظر میں سمجھنے کی سعی کی ہے۔ دیگر مرثیہ نگاروں آلِ رضا، نسیمؔ امروہوی، قیصرؔ بارہوی، سید وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی کے نام شامل ہیں۔

''قیصر اقلیم مرثیہ'' قیصرؔ بارہوی کے فکر و فن پر ایک مبسوط کتاب ہے۔ جس میں ان کے چند مرثیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ان کے سوانحی کوائف اور اہل الرائے کے قیصرؔ بارہوی کے فن کے حوالے سے اعتراف عظمت کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ان کے ترپن مرثیوں پر تعارفی نوٹ درج کیے گئے ہیں۔ اس باب کو پڑھ کر قاری قیصرؔ بارہوی کے فکر و فن سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم باب ''جدید اُردو مرثیہ اور قیصرؔ بارہوی کا اختصاص'' ہے۔ اس باب میں انھوں نے جدید مرثیہ کے خدوخال واضح کرنے کے ساتھ ساتھ قیصرؔ بارہوی کے فن پر گہری نگاہ ڈالی ہے اور ان کے مراثی کو جدید زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔

''سیف زلفی کے مرثیے'' بنیادی طور پر تدوین کا کام ہے۔ ابتدا میں ایک طویل مقدمہ شامل کیا ہے۔ جس میں انھوں نے سیف زلفی کی شخصیت اور شاعری کے متنوع جہتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ مقدمہ فی الاصل ان کا وہ طویل مضمون ہے جو ان کی کتاب ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' کے آخری باب کی شکل میں لکھا گیا۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا عکاس ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعر کے جملہ کوائف

کا تعارف کرایا ہے بل کہ شعری میدان میں ان کے پائے کا تعین بھی کیا ہے۔

''مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی'' بھی اسی ترتیب و تہذیب کی آئینہ دار ہے جو ان کی دیگر کتابوں سے جھلکتی ہے۔ یہاں اس امر کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو والد کی محبت میں مرتب نہیں کیا بل کہ ان کی معروضی رائے یہ ہے کہ سیّد وحید الحسن ہاشمی جوشؔ اور سیّد آلِ رضا کے بعد اُردو کے رثائی اَدب کا سب سے اہم نام ہیں۔ اس کتاب کا جو format ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن صاحب نے بنایا ہے، وہ کم و بیش ان کی تمام کتابوں کا format ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔ پہلے دو ابواب میں انھوں نے شاعر کے سوانحی کوائف، حالاتِ زندگی اور شخصیت اور تصانیف کے تعارف کے لیے وقف کیے ہیں۔ تیسرے باب میں وحیدِ عصر کے چالیس مرثیوں کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب میں انھوں نے بیسویں صدی کی تیز رفتار زندگی کے تناظر میں مختصر مرثیے کا جائزہ لیا ہے اور سیّد وحید الحسن ہاشمی کو اس کا پیش رو قرار دیا ہے۔ کتاب کا یہ باب بے حد اہم ہے کیوں کہ اس میں مختصر مرثیہ نگاری اور جدید زندگی میں ہم آہنگی تلاش کر کے اسے موجودہ عہد کا ترجمان قرار دیا گیا ہے۔ سیّد وحید الحسن ہاشمی نے مختصر مرثیہ کے جو خد و خال متعین کیے ان کے ہم عصر دیگر شعرا نے ان ہی کو گہرا کیا ہے جن میں ڈاکٹر خیالؔ امروہوی، ڈاکٹر عاصی کرنالی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی اور نیساںؔ اکبر آبادی کے نام اہم ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ حسبِ روایت انتخاب مراثی پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی نے بعض اہم مرثیہ نگار شعرا کے تخلیقی کام کو نہایت عرق ریزی سے مدون بھی کیا ہے جن میں سیّد آلِ رضا، قیصر بارہوی، سیّد وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی کے نام شامل ہیں۔ عام طور پر تدوین کا کام ماضی بعید کے تخلیقی کام کے حوالے سے کیا جاتا ہے لیکن انھوں نے اپنے عہد کے اہم شاعروں کو اس کام کے لیے منتخب کر کے ایک نئی روایت کو مستحکم کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے بعض شاعروں کو ان کی زندگی میں ہی خراجِ تحسین پیش کیا ہے جو زیادہ قابلِ قدر کام ہے، یہ کام انھوں نے رواروی میں نہیں کیا بل کہ پوری دیانت داری اور علمی لگن کے ساتھ انجام دیا ہے مثلاً 'العطش' میں انھوں نے سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کو جمع کیا ہے اور صرف جمع ہی نہیں کیا بل کہ چالیس اہم نقادانِ اَدب سے ہر مرثیے پر الگ الگ رائے لکھوائی ہے۔ آپ انھیں مختصر مضامین کہہ سکتے ہیں۔ یہی کام انھوں نے ہر شاعر کے ساتھ کیا ہے کہ ان کے ہر مرثیے پر الگ تجزیاتی رائے یا خود قلم بند کی ہے یا دوسرے نقادوں سے لکھوائی ہے۔ یوں نہ صرف کلام محفوظ کیا ہے بل کہ ہم عصر ادیبوں کی آرا کو بھی جمع کیا ہے۔

سیّد شبیہ الحسن ہاشمی ہمارے عہد کے ایک اہم نقاد، مدون اور محقق ہیں۔ وہ ابھی اپنے عہدِ شباب میں ہیں اور مستقبل میں مزید کام بھی کریں گے۔ اتنی کم عمری میں انھوں نے ستائیس کے لگ بھگ کتابیں شائع کروائی ہیں۔ اگر ان کے کام کی رفتار یہی رہی تو یقیناً ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ اپنے تصنیفی و تالیفی کام کے حجم میں وہ

اپنے عہد کے تمام ادیبوں سے آگے نکل جائیں گے۔ انھوں نے اس مصروف اور تیز رفتار زندگی میں جس طرح اپنی توجہ علمی کاموں پر مرکوز کر رکھی ہے، اس سے ان کی علمی لگن اور علم دوستی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔
میرے لیے یہ امر اس لیے بھی باعثِ مسرت ہے کہ وہ میرے اُستاد بھائی ہیں اور یہ بات میں کسی ایک اُستاد کے حوالے سے نہیں لکھ رہا بل کہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر آغا سہیل، پروفیسر سجاد حارث، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر عبید اللہ خان کتنے اساتذہ ہیں جن سے مختلف زمانوں میں ہم دونوں نے تربیت حاصل کی ہے یقیناً ڈاکٹر صاحب اپنے کام سے اپنے ان اُستادوں کا نام روشن کریں گے۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بطور محقق

پروفیسر کلثوم طارق برنی

◆◆

تحقیق کیا ھے؟ تحقیق مخصوص حالات میں، مخصوص شواہد اور روایات کی روشنی میں اُس سچائی کی تلاش ہے۔ جو محقق کی دسترس میں ہو یا اُس کی دسترس میں ہو سکتی ہو۔ تحقیق میں دعوے سند کے بغیر قبول نہیں کیے جا سکتے اور سند کے لیے ضروری ہے کہ وہ قابلِ اعتماد ہو۔ عام طور پر تنقید اور تحقیق دو الگ الگ دائرہ ہائے عمل میں ہونے کے سبب ایک دوسرے کے متضاد نظر آتے ہیں۔ تنقید کا کام کھرے اور کھوٹے کو پرکھنا ہے جب کہ تحقیق کسی شے کی حقیقت کے اثبات کا نام ہے۔ جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ تاہم بعض دائرے ایسے ہیں جن میں یہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے تنقیدی مضامین میں جو شخصیات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں تحقیق کو تنقید کے ہم رکاب لے کر چلتے ہیں۔ تنقید میں تحقیقی عوامل کا بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''کوئی اَدب پارہ اتنا مطلق اور قائم بالذات نہیں ہو سکتا کہ اس کو اس کے مصنف کی ذات و شخصیت سے کاملاً منقطع کر کے دیکھا جا سکتا ہو اور ظاہر ہے کہ مصنف کی ذات وشخصیت کے مسائل ان گوناگوں واقعات سے وابستہ ہیں جن سے کسی مصنف یا شاعر کی زندگی عبارت ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مصنف یا شاعر کی حیات بھی کوئی ایسی شے نہیں جو خلا میں معلق ہو۔ شاعر بھی تو دوسرے انسانوں کی طرح اس دنیائے آب و گل کا مکیں ہوتا ہے۔''[۱]

اسی میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''......اس کے انسان ہونے سے ہی یہ لازم آتا ہے کہ وہ چند متعلقات جن سے وہ وابستہ ہے اور جن سے اس کا فن متاثر ہوتا ہے۔ پس ایسے حالات میں شاعر اور مصنف اپنے ماحول اور گرد و پیش کے مادی عوامل اور متعلقات سے کیوں کر بے نیاز رہ سکتا ہے۔''[۲]

اس اقتباس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جب تک کوئی نقاد فن پارے کے مصنف کی ذات و شخصیت اور اُس سے وابستہ مسائل اور واقعات کی کھوج نہیں لگاتا۔ اس وقت تک وہ فن پارے کی اصل تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن بھی تنقید میں اس تحقیقی نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''شعر و اَدب کی نام ور ہستیاں اپنے فکری جلال و جمال کی وجہ سے حیات و جاوداں کی حق دار ہو جاتی ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان کی معلومات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کے طرزِ اظہار سے مصنف کے علاوہ اس دور کے پورے حالات کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے..... شاعر ہو یا ادیب وہ عوامی شعور سے اپنا ذاتی شعور منسلک رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقات میں معاشرتی حالات و واقعات، سماجی عیوب و محاسن اور تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ عظیم شاعر یا اعلیٰ پائے کا مصنف اپنے شعور و ادراک کو اخلاقی قدروں سے جوڑ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم تخلیق کار کسی عہد یا خطے تک محدود نہیں ہوتا بل کہ اس کی تخلیق میں پوری کائنات کے مسائل موجود ہوتے ہیں۔''[۳]

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یہ سطور ڈاکٹر آغا سہیل کے حوالے سے ہیں۔ وہ آغا صاحب کی شخصیت کی تمام جہتیں کھول رہے ہیں۔ ان کے آباء کے بیان سے اُن کی زندگی کے تمام گوشوں تک پھر ان کی تصانیف میں ناول، افسانہ، تنقید و تحقیق ہو یا سفرنامہ اور پھر آپ بیتی ہر جگہ جھانکتے ہوئے وہ ان کی تخلیقات کو پرکھتے ہیں۔ جب وہ ڈاکٹر آغا سہیل کے تنقیدی مضامین ''اَدب اور عصری حسیت'' کی بات کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر آغا سہیل تنقیدی بصیرت و بصارت کے مالک ہیں۔ ان کی تخلیقی اُپج انھیں نئے نئے موضوعات کی طرف مائل کرتی ہے اور ان کا منطقی رویہ ان کی تنقید کو اعتبار بخشتا ہے۔ آغا سہیل کا تنقیدی شعور اپنے اندر تخلیقی نمو رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تنقیدی افکار میں تخلیق کی خوش بو محسوس ہوتی ہے۔''[۴]

اسی میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر آغا سہیل کی پوری زندگی حرکت و عمل سے تعبیر رہی ہے۔ لکھنؤ سے لے کر لاہور تک ان کی زندگی کا ایک ایک پل سبق آموز اور قابلِ ستائش رہا ہے۔''[۵]

اسی طرح جب ڈاکٹر شبیہ الحسن وصی الحسن نقاش کی بات کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

''وصی الحسن نقاش کو بچپن ہی سے شعر و شاعری سے شغف تھا۔ گھر میں علمی و اَدبی ماحول تھا۔ جب چہار جانب شعر و شاعری کا غلغلہ بلند ہو۔ گھر کی الماریاں شعری مجموعوں سے پُر ہوں۔ اَدبی

رسائل اور مذہبی جرائد کی بھر مار ہو۔ گھر کے اندر اور باہر مشاعرے اور مسالمے منعقد ہوتے ہوں۔ ملاقاتیوں میں ادیبوں اور شاعروں کی کثرت ہو تو ایسے ماحول میں شعری رجحان رکھنے والا خود شعر نہ کہنے لگے تو کیا کرے۔ قیصر بارہوی (مرحوم) کی ہدایات اور والد کی اصلاح نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ نقاش نے مشقِ سخن جاری رکھی۔''[۶]

اب اس اقتباس میں وصی نقاش کی شخصیت جو بچپن سے بطور شاعر سامنے آ رہی ہے۔ اُس کی پختگی بیان کی دلیل ہے۔ یہاں صاف معلوم ہو رہا ہے کہ شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی معلومات ان کی تنقید کو استوار کرنے میں بنیاد فراہم کر رہی ہیں۔ یہی صورتِ حال ہمیں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے دیگر مضامین میں بھی نظر آتی ہے۔ ''باقیاتِ آلِ رضا'' میں آلِ رضا کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''آلِ رضا کے آبا و اجداد علم و اَدب کے پرستار اور شیدائی تھے۔ شاعری سے دل چسپی اور شعر فہمی کا ذوق و شوق تو اس خانوادے کے جملہ افراد میں بدرجۂ اتم موجود تھا لیکن حُسنِ اتفاق سے میدانِ شاعری کا باقاعدہ شہہ سوار کوئی نہ تھا۔ آپ کے والد جسٹس محمد رضا اگرچہ شاعر نہ تھے۔ لیکن قدیم اور جدید شعرا کے ہزارہا اشعار انھیں ازبر تھے اور وہ انھیں اپنی تحریر و تقریر میں بل کہ عدالتی فیصلوں میں بھی برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ یہ اُن کی شعر فہمی اور ذوق تربیت کا نتیجہ تھا کہ اُن کے تمام بیٹوں نے شعر و اَدب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔''[۷]

ڈاکٹر شبیہ الحسن کم سے کم الفاظ میں نثر پارے کے مصنف کے بارے میں آرائشِ گفت گو کے بغیر کھل کر بات کرتے ہیں۔ تنقید میں بھی اُن کا مطمعِ نظر تحقیق ہے۔ اُن کے اُسلوبِ بیان سے کسی بھی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ معاملہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ اس کی تفاصیل کے بیان میں جزوی انحراف بھی روا نہیں رکھتے۔ ''تصریحات'' کے ایک تنقیدی مضمون میں ڈاکٹر شبیہ الحسن ''ایک مانوس اجنبی ...... اشفاق حسین میں شعر و شاعری سے اُن کے رابطے کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''اشفاق حسین ایک علمی و اَدبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعر و شاعری سے اُن کا ربط بہت پرانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''اعتبار'' کی شاعری نے انھیں اَدبی حلقوں میں محض متعارف ہی نہیں کرایا بل کہ بااعتبار بھی بنایا۔ انگریزی نظموں کی تخلیق اور تراجم سے والہانہ رغبت نے اُن کے ذہنی اُفق کو وسیع کیا۔''[۸]

اسی طرح ڈاکٹر شبیہ الحسن ''جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ'' میں اسلم کولسری کے بارے میں بات کرتے ہیں تو اُن کے سوانحی کوائف کے ضمن میں ڈاکٹر شبیہ الحسن محققانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ وہ اُسلوبِ بیان میں کہیں بھی انھیں عظیم شاعر، عظیم لکھنے والا نہیں کہتے، لکھتے ہیں:

''اسلم کولسری ایک صاحب طرز شاعر اور ہوش مند ناقد ہیں۔ اُن کی ساری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔''[9]

اسی طرح آگے چل کر ڈاکٹر شبیہ الحسن لکھتے ہیں:

''اسلم کولسری کی شاعری کسی بڑے فلسفیانہ نظام کو پیش نہیں کرتی۔ اگر میرا موقف درست ہے تو اسلم کولسری نے شعوری طور پر کسی فلسفیانہ نظام کی تشکیل کی شعوری کوشش ہی نہیں کی...... وہ تو محض ایک سوچنے والے تخلیق کار ہیں۔''[10]

ڈاکٹر شبیہ الحسن حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے بھی قلم کے نشتر کو شہد میں ڈبونے کا فن جانتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے یہاں محض تنقید ہی میں تحقیقی اثرات کا سراغ نہیں ملتا بل کہ انھوں نے الگ سے بھی خالص تحقیقی دائرہ عمل میں رہ کر تلاش وجستجو کا کام سرانجام دیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے پیش نظر ان کا تحقیقی مقالہ ''آل رضا کی فن غزل گوئی'' ہے۔ یہ مقالہ ایم۔اے کی سطح کا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اس مقالے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آل رضا لکھنوی کے مرثیے کے حوالے سے تو ان کے فکری رجحانات پر جستہ جستہ تحقیقی و تنقیدی کام کی کوشش کی گئی۔ تاہم آل رضا کی غزل گوئی پر ناقدین کی عدم توجہی کے باعث انھوں نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کے تین ذیلی ہیں۔ جن کے عنوانات حالات زندگی، سیرت و کردار اور شعری ماحول ہیں۔ دوسرے باب میں آل رضا کی مطبوعہ تخلیقات کا ناقدانہ انداز سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ''غزل کی لکھنوی روایت آل رضا تک'' کا خصوصی تحقیقانہ اور ناقدانہ مطالعہ ملتا ہے۔ باب چہارم میں آل رضا کی غزل گوئی کا تنقیدی مطالعہ ہے جس کے دو ذیلی عنوانات میں (ا) شعری نظریات (ب) فکری وفنی تجزیہ۔ باب پنجم میں اُردو شعری روایت میں آل رضا کا مقام ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن آل رضا کے سنِ ولادت کا تعین کرتے ہوئے داخلی وخارجی شواہد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ یہاں ان کی تحقیق سائنس اندازِ فکر کی حامل نظر آتی ہے۔ وہ آل رضا کے سنِ ولادت کا سب سے قدیم سراغ ضما اخلاق حسین کے تذکرے سے لگاتے ہیں۔ ضما اخلاق حسین کے خیال میں آل رضا ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ مصنف یعنی ڈاکٹر صاحب ضما اخلاق حسین کے اس سن کو تحقیق کی وساطت سے رَد کرتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مولفہ نے غالباً کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تمام مرتبین کے پیش کردہ سن ۱۸۹۵ء کا ماخذ آل رضا کا خودنوشت اقتباس قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس اقتباس کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ حالاں کہ خودنوشت اقتباس کا شمار بنیادی ماخذات میں ہوتا ہے۔ شبیہ الحسن نے آل رضا کے والد جسٹس سید محمد رضا کی ڈائری سے ایک اقتباس پیش کیا ہے۔ جس کے مطابق آل رضا کا سنِ پیدائش ۱۸۹۶ء ہے۔ تحقیق کے قدم بہ قدم تنقید پر نظر رکھتے ہوئے شبیہ الحسن نے آل رضا کے خود مرتب کردہ شعری مجموعے ''غزل معلےٰ'' کا ثبوت دیا

ہے۔ جس کے مطابق آلِ رضا کا سن پیدائش ۱۸۹۶ء ہے۔ شبیہ الحسن آلِ رضا کے چھوٹے بھائی سید ہاشم رضا کی تحریر کا ایک اقتباس بھی پیش کرتے ہیں۔ جس کے مطابق آلِ رضا کا سنِ پیدائش ۱۸۹۶ء ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تحقیقی سلسلے میں سائنسی نقطۂ نظر اپناتے ہوئے اور تحقیق میں تجزیے کو اہمیت دیتے ہوئے مزید داخلی وخارجی شواہد پیش کیے ہیں:

(۱) آلِ رضا کے شاگرد سید وحید الحسن ہاشمی نے سب سے پہلے آلِ رضا کے سنِ ولادت کا تعین ۱۸۹۶ء کیا ہے۔

(۲) پروفیسر سید وصی رضا نے آلِ رضا پر لکھے گئے ایک سوانحی خاکے میں ان کا سن ولادت ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔

(۳) سید ضمیر اختر نقوی نے اپنے جدید مرثیاتی تذکرے میں آلِ رضا کا سن ولادت ۱۸۹۶ء تحریر کیا ہے۔

(۴) محترمہ سلطانہ مہر نے آلِ رضا کے سنِ ولادت کا تعین ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔

(۵) یاور عباس نے ''یادرفتگاں'' کے حوالے سے ان داخلی وخارجی شواہد کی روشنی میں پورے وثوق کے ساتھ آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۰۔ جون ۱۸۹۶ء مقرر کیا ہے۔

شبیہ الحسن اپنے موضوع پر بات کرتے ہوئے تلاش وجستجو کا دامن کسی بھی موقع پر ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے۔ وہ صاف ذہن کے ساتھ موضوع کا براہِ راست مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی تحریر اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ موضوع پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن مواد کے حصول کے لیے بنیادی مآخذات اور ثانوی مآخذات کے ساتھ ساتھ انٹرویو سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ مواد کے حصول میں حقائق اور حقائق میں کم سے کم نظریاتی طور پر فرق روا نہیں رکھتے۔ گو عملاً وہ کسی ایک حقیقت کی تمام ترکڑیوں کو بیان نہیں کرتے بل کہ بعض کا ذکر کرتے ہیں اور بعض کو نظر انداز کرتے ہوئے ادبی تنقید اور فنی تاثر کے ساتھ مکمل صداقت، متانت اور علمی معروضات کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے مواد کے سلسلے میں آلِ رضا کی ذاتی ڈائریوں اور اُن کی اصل کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اپنے اس تحقیقی کام میں نہ تو آلِ رضا کے وکیل نظر آتے ہیں اور نہ ہی اُن کے محتسب بل کہ بنیادی مآخذات کے ساتھ ساتھ ثانوی مآخذات لوگوں کے تاثرات، خیالات اور انٹرویو کو بھی شامل کرتے ہیں۔ آلِ رضا کی شعر گوئی کی طرف رغبت کی وجہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے محمد واصل عثمانی کا بیان درج کیا ہے:

> ''سید صاحب کو اوائلِ عمری سے شعر وسخن کا شوق تھا۔ اچھے شعر سنتے اور سر دُھنتے اور انھیں حرزِ جاں بنا لیتے۔ نجم احسن اور آلِ رضا میں یہی قدر مشترک تھی۔ نجم صاحب بھی ایک خوش گو اور

پُرگو شاعر ہونے کے علاوہ اچھے ادیب تھے...... یہی حوصلہ افزائی سیّد صاحب کی شعر گوئی کے لیے محرک ثابت ہوئی...... آلِ رضا نے غزل گوئی میں رفتہ رفتہ وہ مقام حاصل کرلیا جو اساتذہ کا مقسوم ہے۔''[۱۱]

ڈاکٹر شبیہ الحسن حقیقت کو کسی بھی قسم کی رنگ آمیزی کے بغیر اور بلا کسی ضروری حصے کو چھپائے یا توڑے مروڑے پوری معروضیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں شبیہ الحسن کی اندازِ بیان پر قدرت اُن کے معروضی اندازِ فکر کا پتہ دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''تنقید کی بنیاد تحقیق پر رکھنی چاہیے اور تحقیق کے دوران اپنی ذات اور تعصبات کو الگ کر کے معروضی انداز سے اصل حقیقت کو تلاش کرنا چاہیے۔''[۱۲]

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تحقیق کرتے ہوئے تنقید اور تنقید کرتے ہوئے تحقیق کے معروضی انداز پر ہی انحصار کیا ہے مثلاً: آلِ رضا جب اپنے حقیقی بھائیوں ہاشم رضا، مسعود رضا اور کاظم رضا کے پُرزور اصرار پر لکھنؤ سے کراچی تشریف لائے۔ مگر کراچی میں آلِ رضا کو وہ ماحول نہ مل سکا جس کے وہ عادی تھے۔ شبیہ الحسن صاحب اس سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

''کراچی میں انھوں نے وکالت کا پیشہ جاری رکھا اور اسی کو روزی کا ذریعہ بنایا۔ پاکستان آ کر آلِ رضا کی طبیعت کچھ اُلجھی سی گئی اور وہ بجھے بجھے سے دکھائی دیتے تھے۔ وہ وضع داری اور تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ بھی تھے اور اُس خاندان کے سربراہ بھی جس نے قیامِ پاکستان میں بہت حصہ لیا تھا۔''[۱۳]

یہاں پر آگے چل کر انھوں نے ماہر القادری کی ''یادِ رفتگاں'' کا حوالہ بھی دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''سیّد آلِ رضا مشرقی تہذیب و ثقافت کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ ان میں یہ وضع داری اور رکھ رکھاؤ والدین کی دین تھا۔ جو خود مشرقی تہذیب و تمدن پر جان نچھاور کرتے تھے۔ آلِ رضا چوں کہ ایک مرتب و مسلسل تہذیب کی کڑی تھے۔ اس لیے وہ انگرکھا بھی پہنتے تھے اور شیروانی اور ٹوپی بھی۔ ان کے نقش و نگار اور قد و قامت میں دل کشی پائی جاتی تھی۔''[۱۴]

شبیہ الحسن جب سراپا نگاری کرتے ہیں تو جزئیات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ آلِ رضا کی مرادیا نگاری میں جوش ملیح آبادی کی رائے بھی دی ہے۔

شبیہ الحسن آلِ رضا کی شخصیت اور سراپا کو صدفی صد سچ پیش کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ تحقیق تو سچ کا سودا ہے۔ سوانح کا بیان ہو یا سراپا نگاری ڈاکٹر شبیہ الحسن جانتے ہیں کہ شخصیت کا ہر پہلو، ہر واقعہ جیسا ہے۔ بے کم و کاست، بے رنگ آمیزی ویسے کا ویسا ہی پیش کرنا ہے۔ عدالتی شہادت کی طرح

تحقیقی بیان میں بھی وہ کامل سچائی پیش کرتے ہیں۔ شبیہ الحسن جب آلِ رضا کی غزل کا فکری وفنی تجزیہ کرتے ہیں تو اس سے ان کے وسیع مطالعہ، غور وفکر اور زاویہ نظر پر بھی روشنی پڑتی ہے:

''آلِ رضا کا ''تصورِ محبت'' ارضی ہے۔ انھوں نے ماورائی محبت کے بیان سے احتراز کیا ہے۔ ان کے خیال میں حقیقی محبت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجاز کو وسیلہ بنانا نہایت ضروری ہے۔''[۱۵]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تحریری لہجہ غیر شخصی ہونے کے باوجود آلِ رضا سے اور اُن کے شعری حوالوں سے قاری کا رشتہ جوڑتا ہے۔ شبیہ الحسن نے تنقیدی شعور میں بھی تحقیقی لہروں کی ہلچل ہونے کے باوجود شخصیت کی بابت قاری کے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ آلِ رضا کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آلِ رضا کی غزلوں کے مطالعے سے کئی مخفی باتوں کا علم ہوتا ہے اور اُن کی شاعری کے چند پوشیدہ پہلوؤں کا انکشاف بھی ہوتا ہے۔ ہر شاعر کی طرح آلِ رضا نے بھی شعوری کوشش کی ہو گی کہ ان کے کلام میں انفرادیت کے عناصر زیادہ سے زیادہ منعکس ہوں تاکہ وہ اپنے عہد کے شعرا میں بلند قد دکھائی دیں۔ منفرد ہونے یا دکھائی دینے کے لیے انھوں نے اپنی شاعری میں خودداری کے عنصر کو نمایاں جگہ دی ہے۔''[۱۶]

آلِ رضا کی غزل گوئی پر بات کرتے ہوئے شبیہ الحسن کے قلم کی نوک میں تیزی ضرور آ گئی مگر تلخی نہیں بڑھی۔ اس کا الزام آلِ رضا کو دینے کی بجائے کہ وہ خودداری کے عنصر کو نمایاں کرنے میں مصروف رہے۔ محقق الزام اُس شعری جبلت کو دے رہا ہے جو ہر انسان سے میں تقاضا کرتی ہے کہ وہ نمایاں نظر آئے جو ہر شاعر، مصنف، ادیب کے دل میں بطور انسان پرورش پاتی ہے۔ یہی جبلت اُسے کچھ کہنے اور بڑا دکھائی دینے پر مجبور کرتی ہے۔ شبیہ الحسن کا اندازِ بیان روکھا پھیکا نہیں ہے۔ بات کو لفظوں کا جامہ پہناتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ ''غزل کی لکھنوی روایت آلِ رضا تک'' میں شبیہ الحسن نے پوری ''لکھنوی غزلیت کی مختصر ترین تاریخ'' لکھ دی ہے۔ اس تاریخ میں بقول جمیل جالبی صاحب:

''صحیح تحقیق کے عمل سے ہمارے نقاد بے بنیاد نتائج (Sweeping Remarks) اور بے شعوری سے پیدا ہونے والے اعتقاد کے ساتھ غلط بات کہنے سے بچ سکتے ہیں۔''[۱۷]

شبیہ الحسن لکھتے ہیں:

''آخری تاجدارِ اودھ سلطان واجد علی شاہ اختر کے وقت تک لکھنوی دبستان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں انقلابِ سلطنت نے لکھنؤ کی دنیا میں بدل دی۔ وہ بے فکری اور بے خودی، جس نے طربیہ ماحول کی آبیاری کی تھی۔ رفتہ رفتہ غائب ہو گئی۔ اقتصادی مشکلات اور پریشانیاں قدم بہ قدم دامن گیر ہونے لگیں اور تمدن و معاشرت نے المیاتی عناصر کو

فروغ دینا شروع کر دیا۔''[۱۸]

شبیہ الحسن اپنے موضوع کو سامنے رکھ کر بات کو واضح انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ قاری کو تاریخ سے باخبر رکھتے ہوئے تحقیقی عمل میں طوالت سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کی خوبی پڑھنے والے کو کسی بھی صورت میں بور نہیں ہونے دیتی۔ وہ اپنے موضوع کے ممدوح نہیں، محقق ہیں:

''آلِ رضا نے غزل میں محبت کا جو ارضی تصور دیا ہے۔ وہ اس قدر جاندار ہے کہ اسے تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ انھوں نے تنگ نظر صالحین کی طرح جنس سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کیا ہے بل کہ جنس کے حوالے سے تشکیل ہونے والی محبت کو انھوں نے نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔''[۱۹]

اسی طرح وہ آلِ رضا کی شاعری میں نرگسیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''آلِ رضا کے عشق و محبت کے اس نرگسی تصور کا جائزہ اگر ہم ان کی غزلوں کے حوالے سے لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں وہ ایک باغی شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنے دل کی بات محبوب کی زبان سے کہلوانے کے خواہش مند ہی نہیں بل کہ بہ ضد بھی ہیں۔''[۲۰]

شبیہ الحسن مقالے میں ہمہ وقت اپنے موضوع مقالہ کے گرد رہتے ہیں اور ایسی باتوں میں نہیں اُلجھتے جو موضوع کو تو پھیلا دیں لیکن انھیں موضوع شخصیت سے دُور لے جائیں۔ وہ اپنے اخذ کردہ نتائج اور تاثرات کو منصوبہ بندی کے تحت دلائل کی روشنی میں پرکھتے ہوئے اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع سے متعلق بنیادی فکر کو اُجاگر کرتے ہیں۔ وہ آلِ رضا کے فن پارے کے تناظر میں ایسا فکری دائرہ بھی تشکیل دیتے ہیں۔ جن میں اُن کے اپنے نظریات کا عمل دخل نہیں بل کہ موضوع شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ شعری روایت میں آلِ رضا کا مقام متعین کرتے وقت شبیہ الحسن نے اپنے تحقیقی و تنقیدی شعور کا عمدہ ثبوت دیا ہے:

''آلِ رضا کی غزل گوئی روایت کے شعور سے آگاہ ہے۔ غزل کے کلاسیکی لہجے کی وہ نفیس روایت اور زبان و بیان کا وہ بلیغ احساس جو آرزو لکھنوی کی ''سریلی بانسری'' بن گیا تھا۔ آلِ رضا کی ''غزل معلیٰ'' کے اسی شعری سانچے میں ڈھل کر ایک غنائی اشارہ بن گیا۔''[۲۱]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحقیقی و تنقیدی کام ایسا نہیں ہے کہ انھیں نظر انداز کیا جا سکے۔ بنیادی طور پر تنقیدی ذہن رکھنے کے باوجود تحقیق کے تقاضوں کا ادراک رکھتے ہوئے وہ تحقیقی سفر کو تنقیدی راستوں سے ملاتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا انداز تحریر معروضی ہے۔ اسی معروضیت نے انھیں اپنی ذات کے تمام تعصبات سے بالاتر کر کے دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کی واضح شکل عطا کی ہے۔ اُن کے تحقیقی امکانات میں بھی تخلیقی رنگ کی کمی نہیں ہے۔ وہ اس عہد کے محققوں میں انفرادی سطح پر مجموعی طرزِ احساس بن کر سامنے آئے ہیں۔

حواشی

۱۔ سیّد عبداللہ، اُردو میں اُصول تحقیق، مقتدرہ قومی زبان، لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۳۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۳۔ سیّد شبیہ الحسن، ڈاکٹر تصریحات، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، 2005ء، ص ۱۱۔

۴،۵،۶۔ ایضاً، ص ۷۰،۳۰،۱۱۔

۷۔ ایضاً، باقیات آل رضا، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۰ء، ص ۳۶۔

۸۔ ایضاً، تصریحات، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۹۱۔

۹۔ ایضاً، جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ، لاہور: القمر انٹرپرائزز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۱۱۔ ایضاً، آل رضا کا فنِ غزل گوئی، لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۳۹۔

۱۲۔ جمیل جالبی، اُردو میں اُصول تحقیق، لاہور: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۶۸۔

۱۳۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر آل رضا کا فنِ غزل گوئی، لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۔

۱۴،۱۵،۱۶۔ ایضاً ص ۱۲۸،۱۲۵،۴۳۔

۱۷۔ جمیل جالبی، ص ۶۶۔

۱۸۔ شبیہ الحسن، ڈاکٹر، آل رضا کا فنِ غزل گوئی، ص ۹۲۔

۱۹،۲۰،۲۱۔ ایضاً، ص ۱۶۰،۱۳۰،۱۱۵۔

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے نعتیہ افکار

شبیر احمد قادری

◆◆

نعت دل کی گہرائیوں سے بلند ہونے والی وہ آواز ہے جو دور تک سنائی دیتی اور دیر تک اپنا تاثر اور تاثیر قائم رکھتی ہے۔ اس آواز کی گونج مستقبل میں بھی سنائی دیتی رہی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح صدیوں پہلے لکھی گئی نعتوں کی خوش بو آج بھی فضاؤں کو معطر رکھے ہوئے ہے۔ نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مزرعۂ خیال سے حاصل ہنر کی صورت میں سامنے آتی ہے تو شعروں کے رنگارنگ پھول بھی کھلتے اور گرد و پیش کو مہکاتے ہیں۔ نعت جس درجہ خلوص، محبت اور عقیدت کے ساتھ کہی جائے گی وہ اتنا ہی دل کے تاروں کو متحرک کرے گی۔ نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تنوع، تاثر اور ہمہ گیریت اسی وقت پیدا ہو گی جب نعت گو کی نسبت لازوال اس ذاتِ والا صفات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہو گی۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا ایک مضمون ماہ نامہ ’شہرِ نعت‘ فیصل آباد میں ’’اردو نعت ماضی، حال، مستقبل‘‘ کے نام سے شائع ہوا۔ جولائی ۲۰۰۷ء کے شمارے میں شامل اس مضمون میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ جو شے لافانی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسلک ہو جاتی ہے اسے بھی دوام حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا وہ اپنے اشعار کو لافانی بنانے کے لیے ان ہی کے افکار و اذکار سے سجا لیتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے صرف اشعار ہی لافانی نہیں ہو جاتے بل کہ ان کے خالق کو بھی دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ گراں قدر تصور ہے جو شاعر میں نعت گوئی کا سبب بنتا ہے۔(۱) ڈاکٹر شبیہ الحسن اس گراں قدر تصور کو نعت گوئی کا جذبہ محرکہ خیال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستحکم نسبت، پختہ تعلق خاطر اور راسخ عقیدت کے بغیر مبنی بر جذبہ نعت کہنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اس حقیقت کو دہراتے ہیں کہ عظیم المرتبت اور جلیل القدر ہستیوں میں حضور اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ آپ موجب تخلیق کائنات ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی نبض آج بھی ان ہی کے فیوض و برکات سے رواں دواں ہے۔(۲) ڈاکٹر

صاحب موصوف نعت گو شعرا کے لیے حضور سرورِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بے پناہ عقیدت، عشق رسول کے سیلِ رواں، حُبِ رسول کی مے سے سرشاری کے ساتھ ساتھ ایمان کی پختگی کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ جو درِ حضور سے منھ موڑتا ہے دنیا اور آخرت میں رسوائی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے ایک اور مقام پر نعت گو شعرا کی حضور سے عقیدت کے اسباب کی نشان دہی کی ہے:

پہلا سبب: وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موجبِ تخلیقِ کائنات سمجھتے ہیں۔

دوسرا سبب: وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آخرت کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔

تیسرا سبب: وہ اس کائنات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیاوی مسائل سے چھٹکارا دلانے کا سبب سمجھتے ہیں۔

چوتھا سبب: وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ اور بندے کے درمیان وسیلہ سمجھتے ہیں۔

پانچواں سبب: وہ اس میں خدائی اوصاف کی جلوہ گری دیکھتے ہیں۔[۳]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی مقررہ اس درجہ بندی میں ردوبدل ہو سکتا ہے مگر یہ وہ عقائد ہیں، نعت گو کا جس پر ایمان لازمۂ نعت نگاری ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت اور محبت کے یوں تو بے شمار اسباب و محرکات بیان کیے جا سکتے ہیں مگر مذکورہ نہال بارور سے فیض اٹھانا، نعت گو شاعر کے لیے از بس ضروری ہے۔ اس چشمۂ الطاف سے سیراب ہوئے بغیر نعت کا حقیقی تصور نہیں ابھر سکتا۔ اس لیے بیشتر نعتوں میں یہی موضوعات مقبول و معروف ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں سرشار و مست ہو جانے کے بعد عاشقِ رسول علیہ السلام کے لیے دنیا کی سختیاں اور تکالیف بے معنی ہو جاتی ہیں۔

وحید العصر سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنے نعتیہ مجموعہ کے آغاز میں 'فنِ نعت گوئی' کے عنوان سے اپنے طویل مقدمے کا آغاز اس واقعہ سے کیا ہے:

> "میرے ایک غزل گو دوست جن کا لاہور میں ہلکا پھلکا شہرہ بھی ہے ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے کہ نعت کس طرح کہتے ہیں، میں نے کہا غزل کا محبوب خواہ مجازی پیکر رکھتا ہو خواہ ملکی یا عالمی معاشرے کی شکل میں ہو بدل کر اس شخصیت کو محبوب بنایا جائے جسے خدا بھی اپنا محبوب کہتا ہے۔ جن اشعار سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی قول یا کسی عمل کی خوش بو آئے انھیں نعتیہ اشعار کہا جاتا ہے۔"[۴]

سبحان اللہ کس عمدہ طریقے سے بات سمجھائی ہے۔ نعت فی الاصل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال (احادیث) اور اعمال (یعنی سنتوں) کو منظوم کرنے کا نام ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اس کتاب حقیقت کا ایک اور ورق الٹا ہے۔ رقم طراز ہیں کہ رضائے اُدب کے حصول کا آسان طریقہ یہ ہے۔ انسان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے، بلاشبہ اگر کوئی شخص خدا کا امر اپنی جانب منعطف کرانے کا متمنی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے کردار کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار اور اپنے اقوال کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال سے ملانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص رسول کی محبت واُلفت کے بغیر اللہ کی رضا حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بے مصرف عمل میں مصروف ہے۔ کیوں کہ:

کسی کے دل میں جو حُبِ نبی نہیں ہوتی
چراغ لاکھ جلے روشنی نہیں ہوتی[5]

اُن کی نگاہ میں اگر کوئی شاعر محض فاعلاتن فاعلات کے زور پر نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس درجہ مقبول شاعر نہ ہو گا جس قدر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سنن پر عمل پیرا نعت گو ہو گا اس لیے کہ اس میں وہی فرق ہے جو قول اور عمل میں ہوتا ہے۔ باعمل نعت گو بحضورِ حق تعالیٰ زیادہ پسندیدہ قرار پاتا ہے۔ نعت میں ''جذبہ صادق'' کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔[6] ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے صدفی صد درست ہے کہ سچے جذبے کے بغیر نعت کو ایک جانب کسی صنف میں بھی حسن تاثیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی نعت شناسی کا ایک اور پُرکشش زاویہ دیکھیے:

اول : مذہبی معاملات اور زمانے کی ضرورتوں نے بھی شعرا کو اس صنف میں طبع آزمائی پر مجبور کر دیا ہے۔
دوم : بیش تر غزل گو شعرا اپنی غزلوں کو'باوضو' کر کے نعت کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔
سوم : نعتیہ اشعار کی پیش کش میں اسالیب کے متنوع ذائقے بھی محسوس کیے جا رہے ہیں۔
چہارم : ہیئت کے بھی بے شمار تجربے کیے جا رہے ہیں۔[7]

یہ تناظرات اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ماضی اور حال کی طرح صنفِ نعت کا مستقبل بھی روشن اور تابناک ہے۔ نعت لکھنے والوں کو احترام ملتا ہے وہ بھی قابلِ رشک ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنے اس مضمون کو اشعار سے بھی سجایا ہے جو ان کے نعتیہ خیالات وافکار کو برنگِ دگر سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے یہ افکار اس اعتبار سے بھی قابلِ فہم ہیں کہ یہ سلیس انداز میں لکھے گئے ہیں۔ افکار ایسے ہیں کہ ان کے حوالے سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دل سے نکلنے والی باتیں دل پر اثر کرتی ہیں۔ ان کے علوس ونقوش جب کسی تحریر میں دکھائی دیتے ہیں تو یہیں سے فکری ہم آہنگی کا تصور جنم لیتا ہے۔ ''اُردو نعت، ماضی حال، مستقبل'' ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ایسا ثروت مند اور منور

مضمون ہے کہ اس سے نہ صرف ان کے اپنے افکارِ نعت کی تفہیم میں آسانی پیدا ہوتی ہے بل کہ جدید نعتیہ منظر نامے کی تعبیر کے بند دریچے بھی وا ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

....

حواشی

(۱) ماہ نامہ 'شہرِ نعت' فیصل آباد، مجلس معین ادب، فیصل آباد، شمارہ جولائی ۲۰۰۷ء، صفحہ ۸۔

(۲) ایضاً، صفحہ ۸۔

(۳) ایضاً، صفحہ ۱۲۔

(۴) وحید الحسن ہاشمی، یاسین (نعتیہ مجموعہ)، حبیب پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۱۔

(۵) شہرِ نعت، صفحہ ۱۱۔

(۶) ایضاً، صفحہ ۱۰۔

(۷) ایضاً، صفحہ ۱۲۔

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی مزاج

سیّد تحسین گیلانی

◆◆

میتھیو آرنلڈ (Mathew Arnold) کے قول کے مطابق "اَدب تنقیدِ حیات ہے" آرنلڈ اَدب اور شاعری کو انسانی کلچر کی عظیم قدر و قیمت کی حامل سرگرمی قرار دیتا ہے۔ وہ مذہب کو فرضی حقائق کا شکار اور فلسفے کو علت و معلول، مطلق و غیر مطلق کے استدلال کی آرائش میں مگن خیال کرتا اور سائنس کو شاعری کے بغیر نامکمل کہتا ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ "تنقیدی قوم کام یہ ہے کہ وہ علوم کی تمام شاخوں میں، ہر چیز کے وجود کو اُس کے حقیقی روپ میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ خیالات کا نظام قائم کرتی ہے۔"[۱] آرنلڈ کے یہ افکار نہ صرف انگلش لٹریچر یعنی (English Criticism) پر ہی نہیں بل کہ امریکن (Criticism) پر بھی اثر انداز ہوئے اور بقول ناصر عباس نیّر "آرنلڈ کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اُس نے تازہ اور ہر قسم کے علوم سے تنقید کی ہم رشتگی اور یوں زندگی کے متنوع گوشوں کی بصیرت کو اَدب کی قوت بنانے پر زور دیا۔"[۲] ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اَدب کی مختلف جہات میں ڈھیروں کام کیا ہے مگر بنیادی طور پر اُن کا مزاج تحقیقی اور تنقیدی رویے کا حامل ہے اور اُن کی پسندیدگی کا اظہار اس حوالے سے زیادہ تر مرثیہ کے کام کے طور پر سامنے آیا ہے۔ مرثیے کے حوالے سے اُن کا تنقیدی مزاج کبھی کبھی تو (New Criticism) کے مزاج سے نہ صرف مصافحہ کرتا ہے بل کہ بعض اوقات تو وہ اس تنقیدی گرداب کے قریب گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس کا آغاز ۱۹۴۱ء میں امریکا سے ہوا (جان کرو رین سم) (Jahn Crowe Ransom---1888-1974) نے اپنی کتاب (The New Criticism) شائع کر کے کیا۔"[۳] جب کہ اس مکتب کو پروان چڑھانے والوں میں کلینتھ بروکس (Cleanth Brooks) ایلن ٹیٹ (Allen Tate) رابرٹ پین وارن (Robert Pennwaren)، ڈبلیو کے ومساٹ (W.K. Wimsatt) کے نام نمایاں ہیں اس طرح نشاۃ ثانیہ کے بعد سے بیسویں صدی کے ربع اوّل تک برطانوی نقادوں کی فکر ہی حاوی نظر آتی ہے۔ اسی تناظر میں ناصر عباس نیّر اپنی معرکتہ الآراء کتاب "جدید تنقید اور مابعد جدید تنقید" میں لکھتے ہیں کہ "خود نئی تنقید کے مکتب کا چراغ

آئی اے رچرڈز (I.A. Richards) ، ٹی۔ ایس ایلیٹ (T.S. Eliot)، ولیم ایمپسن (William Empson) اور ایف آر لیوس (F.R Leavis) ایسے انگریزی ناقدین کی فکر سے روشن ہوا ہے۔"[۴]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا نام اُردو ادب میں معتبر حیثیت کا حامل ہے اور اس قدر مستند شکل اختیار کر گیا ہے کہ وہ یقیناً کثیر الجہات (Multidimensional) شخصیت کے رُوپ میں لکھنے والوں کی سمت نمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کا تحقیقی وتنقیدی کام اپنی جگہ اس کے علاوہ بھی وہ صحافت، شعری اور تدریس میں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکے ہیں ان کے سیکڑوں شاگردان اپنی جھولیاں علم کے خزانوں سے بھرنے کے بعد اُن کے لیے دعا گو ہیں۔ اُن کے تحقیقی اور تنقیدی مزاج کے حوالے سے جاری رہے گی مگر پہلے اُن کی چند اہم کتب کے نام دیکھیے: مفاہیم (تحقیقی وتنقیدی مقالات)، ترجیحات (تحقیقی وتنقیدی مقالات)، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق وتنقید)، جدید لہجے کا شاعر...... سیف زلفی (شخصیت وفن)، ''شام وسحر'' کی ''باتیں'' (ماہ نامہ شام وسحر کے اداریے) آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن)، کلیاتِ حبیب (حبیب جون پوری کے کلام کی تدوین)، العطش (جلد اول، دوم، سوئم...... سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)، باقیاتِ آلِ رضا (سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)، منتخب مراثی (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)، آیاتِ آمنہ (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)، بیسویں صدی کا شعری اَدب (انتخابِ کلام)، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (مقالات)، تصریحات (مضامین)، معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)، قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کی تدوین) علاوہ ازیں متعدد زیرِ طبع کتب۔

آرنلڈ کہتا ہے کہ ''تحقیق اُن خیالات کو اپنا مواد بناتی ہے جنھیں نقاد دریافت کرتا اور ثقافتی زندگی کا حصہ بناتا ہے۔''[۵] ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ہاں کا تنقیدی مزاج روایتی نہیں بل کہ شبیہ الحسن نے جدید تنقیدی رویے کو اپناتے ہوئے تخلیق سے پھوٹتی نئی معنویت کو آشکار کرنے کی سعی مسلسل کی ہے۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب وکامران بھی ہوئے ہیں ان کے اندر چھپے ہوئے کھوج کار اور تنقید نگار نے مل کر ان کے تنقیدی شعور کی نہ صرف اُبج دی بل کہ انھیں آگے ہی آگے دیکھنے اور ایک قابل جوہری کی طرح پرکھ کرنے کی طاقت سے بھی نوازا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نظم، افسانہ، انشائیہ اور دیگر اصناف اَدب کی طرح جدید اُردو تنقید بھی مغرب سے مستعاری گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسی ضمن میں بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''مگر سوال یہ ہے کہ مغرب سے کیا کچھ درآمد نہیں ہوا۔ فلسفیانہ مباحث، معاشی اور سیاسی نظریات، سائنسی علوم، تہذیبی نوادرات، زبانیں، لبادے، کھیل اور فیشن ایک سیل رواں ہے کہ جس نے مغرب سے مشرق کی طرف اُمڈنے کا منظر دکھایا ہے......''[۶]

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک روشن فکر نقاد ہیں اور اپنے کام کے ساتھ مکمل انصاف برتتے ہوئے انھوں

نے اپنے تنقیدی مزاج میں دن بہ دن نکھار پیدا کیا ہے اور دیکھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ ایک عام آدمی اتنا ڈھیر سارا کام کیسے کر سکتا ہے تو یقیناً اس کے پیچھے اُن کی اپنے کام کے ساتھ خالصتاً کمٹمنٹ صاف ظاہر ہے۔

میر انیس کا انتقال ۱۲۹۱ھ مطابق تمبر ۱۸۷۴ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ جنوری ۱۹۷۱ء میں مرکزی انیس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور انیس صدی تقریبات کا آغاز ایک کل ہند سیمنار سے ۲۲ اپریل ۱۹۷۵ء کو ایوانِ غالب نئی دہلی میں ہوا۔ میر انیس اُردو کے چوٹی کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا ہے کہ:

''انیس کے مرثیے اور غالب کی غزلیں عالمی اَدب کو اُردو کی دین ہے میر انیس نے اپنے مرثیوں کے ذریعے اُردو شاعری کو سوز و گداز و اخلاقی بلندی کی دولت عطا کی۔ انھوں نے مرثیے کو اتنی وسعت دی کہ وہ جذبات نگاری، منظر کشی، رزمیہ، ڈراما بھی کا گلدستہ اور فکر و فن کا ایک جلوہ، صد رنگ بن گیا۔''

انیس صدی تقریبات کے سلسلے میں ۱۹۷۵ء میں منعقد ایوانِ غالب نئی دہلی کی تقریب میں عالمی اَدبی شخصیتوں کے مقالات شامل ہوئے شخصیات میں شبیہ الحسن بھی شامل ہوئے اُن کا قابل قدر مقالہ خاصے کی چیز ہے جسے بعدازاں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی مرتبہ کتاب انیس شناسی میں بھی شامل کیا۔ جو اس تقریب میں شامل مقالات پر مبنی دستاویز ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا مضمون ''میر انیس کی خوشہ چینی اور اُن کے خوشہ چیں'' سے ایک ٹکڑا حاضرِ خدمت ہے۔ ''......وہ ایک ایسے دَور کے شاعر ہیں کہ جب فکر، تہذیب اور زبان پر عہد بالیدگی کا شباب آیا وہ اس شائستہ تہذیب کے وارث تھے کہ جس کی زبان گویا اُردو تھی اسی لیے وہ اپنے دور کی نئی فنی بصیرت اور جمالیاتی شعور کی علامت بن گئے وہ کسی بھی صنفِ سخن کو اپناتے ایک عظیم شاعر کا منصب حاصل کر لیتے۔ مگر انھوں نے اپنی ساری خوشہ چینیوں سے مرثیہ کی بستہ، مضمحل صنفِ سخن کو توانا بنایا اور اپنے آفاق گیر فکر و شعور کی مدد سے اس محدود سمجھی جانے والی صنفِ سخن میں نہ صرف اپنے لیے اطمینان بخش گنجائش پیدا کر لی بل کہ اُردو شاعری کی سرحدوں میں دفعتاً ایسی توسیع پیدا کر دی کہ جس کی وجہ سے اس نوزائیدہ زبان کا قد و قامت اور اس کی کارفرمائی عالمی معیاروں کے رُوبرو رجز خوانی کرنے لگی۔''[۲] ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے ہاں ایک بات جو میں نے بالخصوص محسوس کی ہے کہ وہ غیر محسوس طریقے سے تخلیقیت کے اندر بکھیری ہوئی جذبے کی فراوانی کو لفظوں میں اس طور سے متشکل کرتے ہیں کہ کسی بھی تخلیق کا واضح رنگ روپ نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور اُن کی تنقید میں تخلیق کا رجحان بھی کافی حد تک نمایاں نظر آتا ہے اُن کی یہی جہت تمام تنقید نگاروں سے اُن کو جدا کرتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے تمام اصنافِ اَدب پر گفت گو کرتے نظر آتے ہیں مگر خاص طور پر اُن کی نگاہ مرثیہ نگاری اور فنِ مرثیہ کے حوالے سے جانچ پرکھ کی دائی ہے۔ مرثیہ کے حوالے سے اُن کا کام اور نام انتہائی معتبر حیثیت کا حامل ہے۔ یقیناً ابھی اُن کے نام اور کام کے حوالے سے بہت گفت گو کی جا سکتی ہے لیکن یہاں یہ بھی بتاتا چلوں

کہ ان کا ایک اہم تعارف مدیر ''شام وسحر'' کے حوالے سے بھی ہے انھوں نے مسلسل انتیس سال سے ''شام وسحر'' کو نہ صرف کامیابی سے جاری رکھا ہوا ہے بل کہ ''شام وسحر'' اس وقت اُدب کا معتبر ترین سفیر بھی ہے اور اُن کے اکثر تحقیقی وتنقیدی مقالات ہمیں بطور نیاز ''شام وسحر'' سے ہی ملتے ہیں۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے بارے میں چند ناقدین،اکابرین اور دانش وروں کی آراء بطور تبرک پیشِ خدمت ہیں:

پروفیسر ممتاز حسین

شبیہ الحسن صاحب کا تنقیدی شعور بہت واضح، جچا تلا اور تیکھا ہے وہ نہ تو اس رجحان کو پسند کرتے ہیں کہ کلام تمام تر لفظی شعبدہ گری کا حامل ہو یا تمام تر روایتی ہو اور اس میں روایت سے سرمو انحراف نہ پایا جائے اور نہ وہ اس جدت پسندی کے قائل ہیں کہ جدید غزل کو اپنی فضا، معنویت اور ساخت میں ماضی کے تجربات سے بالکل ہی بے نیاز ہو جانا چاہیے۔اس کے برعکس جہاں وہ غزل میں نئی معنویت یا انفرادی تجربات کے اظہار کو پسند کرتے ہیں وہاں وہ غزل میں ایک ایسا رچا ہوا انداز بیان بھی دیکھنا چاہتے ہیں جو ماضی میں اچھی غزلوں کا طرۂ امتیاز تھا اور جسے اس دَور میں فراق، فیض اور دوسرے شعرا نے برتا ہے۔

ظہیر کاشمیری

شبیہ الحسن نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''مفاہیم'' میں بعض اہم اور نازک مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔وہ ہر موضوع کو گہری ناقدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور نتائج اخذ کرنے سے پہلے ہر موضوع کے داخلی، خارجی اور زمانی پہلوؤں کو عموماً پیش نظر رکھتے ہیں۔وہ بعض جگہ اُدب کے گنجلک مسئلوں کو بڑی سادگی اور شستگی سے بیان کر جاتے ہیں اور یہ سادگی اور شستگی اُن کے اظہار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور علم وفن کے بارے میں متعدد صائب الرائے اہلِ قلم کے افکار کو کتابی صورت میں یک جا کر کے پاکستان کی اُدبی تاریخ کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔اس کامیابی کے لیے ڈاکٹر شبیہ الحسن بھرپور تحسین کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک باصلاحیت اور ہوش مند نقاد ہیں انھوں نے اسلم کولسری کے حوالے سے ایک ایسی منفرد کتاب پیش کی ہے جو بہ یک وقت شاعر کی غزلوں کا خوب صورت انتخاب بھی ہے اُس کی سوانحی کوائف اور شعری کارکردگی کا بیان بھی اور اس کے کلام کا تنقیدی جائزہ بھی...... ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنی اس قابلِ قدر کتاب میں اسلم کولسری کو متعدد سطحوں پر دریافت کر کے ایک اہم اُدبی خدمت انجام دی ہے۔جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

گزشتہ ربع صدی میں نمایاں ہونے والے محققین و ناقدینِ اُدب میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ اور کثیر الجہات شخص ہیں۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ ایسے ہی محقق اور تنقید نگار ہیں۔

....

حواشی

(۱) ناصر عباس نیرّ، جدید اور مابعد جدید تنقید، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۸۔
(۲) ناصر عباس نیرّ، جدید اور مابعد جدید تنقید، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۸۔
(۳) ناصر عباس نیرّ، جدید اور مابعد جدید تنقید، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۷۔
(۴) ناصر عباس نیرّ، جدید اور مابعد جدید تنقید، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۸۔
(۵) ناصر عباس نیرّ، جدید اور مابعد جدید تنقید، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۳۹۔
(۶) وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اُردو تنقید، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۷۔
(۷) گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، انیس شناسی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۹۔
(۸) محمد آصف وٹو، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات، ۲۰۰۷ء، ص ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۵۳۔

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بطور محقق و نقاد

پروفیسر ڈاکٹر سیّد زوار حسین شاہ

◆◆

بڑے شہروں کی مشینی زندگی نے بڑی حد تک لوگوں کو علم و اَدب سے بے گانہ کر دیا ہے۔ ہر کوئی حصول معاش اور مرتبے کی دوڑ میں یوں شریک ہو گیا ہے کہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں کی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کا دم بہت غنیمت ہے جو اَدب و شعر سے تعلق نباہ رہے ہیں۔ زمانہ انھیں کچھ کہے وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اَدب پروری کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی کا تعلق عشاق علم و اَدب کے اسی قبیلے سے ہے جو پسندیدگی کے معیارات بدل جانے کے باوجود قارئین کو جدید اَدب سے وابستہ رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نہایت معزز علمی و اَدبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے والد وحید الحسن ہاشمی معروف مرثیہ نگار ہیں، چچا حبیب جون پوری شاعر، بھائی وصی الحسن نقاش شاعر، چچازاد بھائی اختر ہاشمی شاعر، خود محقق و نقاد اور اَدبی رسالے کے مدیر ہیں، کہنا چاہیے کہ شبیہ الحسن ہاشمی شعر و اَدب کے ماحول میں سانس لیتے ہیں کہ ان کے چاروں اَور یہی ماحول ہے۔ ہاشمی صاحب کے مضامین و مقالات کی طویل فہرست ان کے ذوق سلیم اور ہمہ جہت ادیب و نقاد ہونے پر دال ہے۔ یوں تو شبیہ الحسن ہاشمی اَدب و شعر کے ہر موضوع پر قلم اُٹھا سکتے ہیں کوئی صنف شعر و اَدب ایسی نہیں جس کے بارے میں ان کے تنقیدی خیالات پڑھنے کو نہ ملے ہوں البتہ گھر کے حسینیت نواز ماحول نے انھیں فطری طور پر نعت، منقبت اور مرثیے سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ چناں چہ انھوں نے بطور محقق و نقاد مدحیہ شاعری اور مرثیہ کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔

کلاسیکی اَدب سے شغف و شیفتگی قابلِ ستائش ہے مگر اسی لمحے حال سے بے رخی بھی کوئی دانش مندی نہیں۔ زمانہ حال سے قطع تعلقی فرد و معاشرہ دونوں کے لیے نیک شگون نہیں ہوا کرتی۔ کیوں کہ جو کوئی اپنے عہد کی نبض کو نہ پہچان سکے گا وہ یقیناً پیچھے رہ جائے گا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی نے تحقیق و تنقید کے لیے جن موضوعات کو

منتخب کیا اس سے راقم کو خوش گوار حیرت بھی ہوئی اور نصیحت بھی کہ سامنے اور قریب کے لوگ اور موضوعات ہماری توجہ اور توسل کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں چناں چہ ان زندہ موضوعات کو چھوڑنا اور ان موضوعات کو چھیڑنا جن پر ہمارے پیش رو ناقدین بڑی بڑی عمارتیں اور امارتیں بنا چکے، ان پر قلم اٹھانا خطرے اور خرابی سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی ایک صدی سے ناقدین اور ان جیسے دیگر دانش ور غزل اور غزل میں بھی میر کے موضوعات والی غزل، جس میں اخلاق و آداب اور معاشرے کی سانسیں یوں اکھڑی ہوئی ہیں جیسے کوئی دمے کا مریض سانس کی تکلیف زدہ آمد و رفت سے چھٹکارا پانا چاہتا ہو، صلاحیت کہ ناقدین نے اسی غزل کو معاشرے کا آئینہ قرار دیا بل کہ یہاں تک کہ غزل کے ان خود ساختہ معیارات کو بنیاد بنا کر پوری تہذیب کو گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔ صد شکر کہ، ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی نے تنقید کے ان خود ساختہ معیارات سے مرعوب یا مغلوب ہوئے بغیر تخلیقات کو ہی تنقید و تحقیق کا معیار مانا ہے اس کا بین ثبوت ڈاکٹر صاحب کا رنگ تحقیق و تنقید ہے۔

دوسروں کی تعریف و توصیف اعلیٰ ظرف اور بلند حوصلے کا کام ہے ورنہ نکتہ چینی کرنا کسے نہیں آتا۔ تعمیر مشکل تخریب نہایت آسان۔ بنی ہوئی عمارت کو ایک گنوار زیادہ آسانی سے تباہ کر سکتا ہے البتہ تعمیر کے لیے جس نفاست، اعلیٰ ذوق اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ تنقید اَدب از حد مشکل اور تعمیری طرز فکر کا نام ہے ورنہ عالی شان عمارتوں میں سوراخ کرنا ہو تو مولانا حالیؔ کو دیکھ لیجیے کہ انھوں نے اپنے استاد مرزا غالب تک کی شاعری کو نیچرل کہہ دیا۔ پروفیسر کرار حسین نے کیا خوب بات کہی ہے:

> ''شاعری نیچرل اور اَن نیچرل نہیں ہوا کرتی۔ شعر یا تو شعر ہے ورنہ بکواس ہے، شاعری کو اَن نیچرل کہنا تو شاعری کو گالی دینا ہے۔''

اس تمہید کا مدعا اور منشا یہ ہے کہ تنقید اَدب کا کام تخریب ہرگز نہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی کی تنقید کا رنگ عموماً تعمیری ہوتا ہے۔ ہاشمی صاحب کی تنقید ہو یا تحقیق اس میں تین رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ تفہیم، تحسین اور تنظیم۔ بظاہر یہ کام آسان لگتا ہے کہ تنقید میں کوئی مخصوص رنگ پیدا کر لیا جائے لیکن درحقیقت یہ انتہائی مشکل منصب ہے۔ شبیہ الحسن ہاشمی اپنے مضامین و مقالات میں علمی و اَدبی شخصیات کو موضوع بناتے ہیں یوں اصناف، شخصیات کے ضمن میں زیر بحث آتی ہیں۔ کیوں کہ اصناف کو برتنے والے اور زندہ رکھنے والے شاعر و ادیب ہی ہوتے ہیں اور وہی روحِ عصر کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتے ہیں لہٰذا اَدب سے تعلق جوڑنے کے لیے ادیب تک رسائی ہماری پہلی کوشش ہونی چاہیے۔ ہاشمی صاحب کے مزاج کا یہ خاصا ہے کہ جب وہ کسی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں چاہے وہ شاعر ہو یا نثر نگار، افسانہ نگار ہو یا قصیدہ نگار، نعت گو ہو یا مرثیہ نگار ضروری سمجھتے ہیں کہ تخلیق کار کے بارے میں ابتدائی معلومات اس قدر منظم انداز میں قاری تک پہنچائیں کہ تخلیق کار کی شخصیت کا کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل نہیں رہتا۔ ان معلومات میں تعلیم و تربیت ملازمت و مشاغل، اعزازت، تصانیف و

تالیفات سمیت سب کچھ آ جاتا ہے۔ کسی فرد کے ذہنی و فکری ارتقا کی داستان کو یوں منظم انداز میں پیش کرنے سے قاری کے لیے ہمہ گونہ آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔

شخصیت کے ذہنی و فکری ارتقا کی تفہیم کے لیے دوسری اہم چیز اس کا ماحول ہے جس میں فرد کی شخصیت کی ساخت و پرداخت ہوتی ہے۔ ہاشمی صاحب کا خاص رنگ ہی یہ ہے کہ وہ کسی تخلیق کار کے فن پر رائے دینے سے پہلے قاری اور تخلیق کار کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتے ہیں اس طرح قاری بھی ہاشمی صاحب کی طرح شاعر و ادیب سے نہ صرف اپنائیت محسوس کرتا ہے بل کہ وہ فن کی تحسین و تفہیم میں نقاد کا ہم نوا بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن یوں تو تحقیق و تنقید دونوں میں یکساں دل چسپی رکھتے ہیں مگر ان کا طبعی جھکاؤ تحقیق و تدوین کی طرف زیادہ ہے۔ یہ بات باعث تحسین ہے کہ ان کے تحقیقی و تدوینی کارنامے مستقبل کے محقق و نقاد کے لیے تحقیق و تنقید کے کئی دَر وا کرتے ہیں راقم اس کے لیے ایک مثال پر اکتفا کرے گا کہ ڈاکٹر صاحب نے قیصر بارہوی کے مراثی کی تدوین کے ضمن میں جو خالص تحقیقی انداز اپنایا ہے وہ نوآموز محققینِ اَدب کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ اُنھوں نے قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تعداد، ہر مرثیے کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ انھوں نے قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تعداد، ہر مرثیے کے موضوع، سنِ تخلیق، سالِ اشاعت، بندوں کی تعداد سمیت تمام تفصیلات پوری صحت اور ذمہ داری سے بیان کی ہیں۔ یہ خدمت کچھ کم درجے کی نہیں۔ وہ خود قیصر بارہوی کے مراثی کی تدوین کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''راقم الحروف کو قیصر بارہوی کے مطبوعہ مرثیوں میں اختلاف متن کے مسائل بھی درپیش رہے ہیں۔ مختلف ایڈیشنوں میں شامل اختلاف متن کو راقم الحروف نے قیاسی تصحیح کے بجائے قیصر بارہوی کے ہاتھ سے لکھی تحریر کو اہمیت دی ہے اور جہاں ان کی تحریر دستیاب نہ ہو سکی وہاں ان کی وڈیو/آڈیو سے مدد لی ہے۔ قیصر بارہوی کے ہاں املا کے بھی بعض مسائل راقم الحروف کو درپیش رہے ہیں۔ راقم الحروف نے حواشی و تعلیقات کے بجائے رائج املا کو ترجیح دی ہے تاکہ قارئین کے لیے مرثیوں کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو سکے۔''[۳]

تدوین کے مشکل اور صبر آزما کام سے ڈاکٹر صاحب کی دل چسپی نے بہت سے درویش منش شعرا کی تخلیقات کو قاری تک پوری صحت کے ساتھ پہنچایا ہے۔ باقیاتِ آلِ رضا، قیصر بارہوی کے مرثیے، کلیاتِ حبیب (حبیب جون پوری کے کلام کی تدوین)، العطش (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ و تدوین) اور ''طاہرین'' ان کے تدوینی کام کی چند مثالیں ہیں۔ اس ضمن میں مواد کی فراہمی اور پھر اشاعت کے مرحلے تک پہنچانے کے لیے جن حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان تمام سے عہدہ برآ ہونا اور کہے جانا کہ ہاں اور کام بھی کریں گے ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مزاج کی خاصیت

شبیہ الحسن ہاشمی کے تحقیقی اور تدوینی کام کے ضمن میں سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کو، جس طرح مختلف بیاضوں، اخبارات و رسائل سے لے کر صنف وار یک جا کیا ہے قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔ اس سے تحقیق و تدوین کے کام سے تعلق رکھنے والوں کو رہ نمائی اور حوصلہ ملتا ہے۔ اس کام کے لیے ان کی زندگی کے دس سال صرف ہوئے ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنے منتخب کردہ موضوعات کتنے عزیز ہیں کہ کسی جلبِ منفعت کے بغیر صرف اَدب کی خدمت کے لیے وہ یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سید آلِ رضا خوش نصیب ہیں کہ انھیں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی جیسا نقاد ملا ہے جس طرح خواجہ محمد زکریا نے مجید امجد اور ڈاکٹر رشید امجد نے میراجی کو اُردو اَدب کی زندہ جاوید شخصیات بنا دیا۔ میری رائے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا کام اسی نوعیت اور سطح کا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں:

> ''آلِ رضا خوش نصیب شعرا میں ہیں جنھیں ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی جیسا مخلص نقاد ملا ہے..... ڈاکٹر صاحب نے دس برس کی مسلسل محنت سے اخبارات، رسائل اور بیاضوں سے ریزہ ریزہ کلام جمع کیا اور اس طرح آلِ رضا کے کلام کی باقیات یک جا ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام میں تدوین کے جدید اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے اور جا بجا حوالوں اور حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ آج کل تدوینِ متن کا کام اُردو محققین کے بس کا نہیں رہا کہ اکثر نقاد علمِ عروض میں پیدل ہیں اور تدوینِ متن میں عجیب و غریب غلطیاں کرتے ہیں۔ شاعری شبیہ الحسن کے گہوارۂ تربیت کا حصہ ہے اس لیے یہ متنِ صحت کے اعتبار سے کئی معاصرین کے کام سے بازی لے گیا ہے۔''[۳]

نقاد و محقق کے لیے ضروری ہے کہ وسیع مطالعہ ہو کلاسیکی اور عصری اَدب کا شناور ہو تبھی جب وہ نتائج کا استنباط کرے گا تو اس میں عقیدت کی بجائے علمیت کا وفور ہو گا۔ پھر یہ بھی کوئی اچھی روایت نہیں کہ تاریخ کی طرح تحقیق و تنقیدِ اَدب کی بنیاد دلیل کہ عمارت محض عقیدت پر کھڑی کر دی جائے۔ عقیدہ پرستی اور اندھی تقلید نے ہماری اَدبی تنقید کو ایسا گورکھ دھندہ بنا دیا ہے کہ تخلیق کار کچھ کہتا ہے مگر نقاد کی منشا کچھ اور ہوتی ہے۔ اسی تنقید کی ابتدا اُردو تنقید کے ''باوا آدم'' مسٹر حالی سے ہوتی ہے۔ اجمال کچھ یوں ہے مغلیہ سلطنت کا زوال تو اورنگ زیب عالم گیر کی مساعی نامسعود اور شاہ جہاں کی قید سے شروع ہو چکا تھا۔ قید میں شاہ جہاں کو وضو کے پانی کے لیے بھی استدعا کرنا پڑتی تھی۔ بہر حال دکنی ریاستوں کی تباہی سے سلطنت دہلی اپنے منطقی انجام کو پہنچی کہ مرہٹوں کی یلغار کو روکنے والے قلعے (دکنی ریاستیں) اورنگ زیب مسمار کر چکا تھا۔ مغلیہ سلطنت کا رعب و دبدبہ مخالف کمانڈروں کو رشوتیں دینے سے ختم ہو چکا تھا اور اورنگ زیب کی وفات سے اجڑے دیار کی تباہ حال بستیوں کا بٹوارہ شروع ہوا اور جو جس کے ہاتھ لگا لے اُڑا۔ لیکن معاشرے کی تہذیبی موت اس وقت واقع ہوئی جب مسٹر حالی نے انگریزوں کی شہ پر اپنے فکری مُرشد سر سید کی رہ نمائی اور تنقیدِ اَدب کی آڑ میں اُردو شاعری پر شب خون مارا تو ہماری سیاست،

ریاست اور معیشت کی طرح ہماری تہذیب و تخلیق پر بھی فکرِ غیر کا تسلط ہو گیا۔ حالؔی نے غزل کے ساتھ قصیدے کو بھی ہدف تنقید بنایا تا کہ ہماری شاعری سے محبوبیت اور رانیست کا عنصر یکسر غائب کر دیا جائے۔ قصیدے کو مبالغہ ہی مبالغہ اور جھوٹ کا پلندہ کہہ دیا تا کہ عوام و خواص کو اپنے حکمرانوں سے جو محبت، عقیدت اور انس ہے اس کو کسی طور کم یا ختم کیا جا سکے۔ قصیدہ گو جب ممدوح کی صفات گنواتا تھا تو ان صفات کے چرچے ہی سے معاشرے میں قابل قدر اقدار کو زندگی ملتی تھی مگر جدید تنقید نے اس سے محروم کر دیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کہتے ہیں:

''ہندستان پر سیاسی گرفت کے بعد انگریزوں نے اپنے استعماری ہتھکنڈوں سے ہندستانیوں کی جسمانی قوت پر تو فیصلہ کر لیا لیکن وہ اس کی تخیلی سطح کو فتح نہ کر سکے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ لکھنؤ کے فوجیوں کے ہاتھوں سے چھنی جانے والی تلواریں انیسؔ کے مرثیوں میں زیادہ آب تاب کے ساتھ چمکنے لگیں۔ اُردو شاعری کی تخیلاتی پرواز سے انگریزی حکومت کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ جب تک شاعری میں تخیلاتی تلواریں چمکتی رہیں گی اُس وقت تک یہ امکان باقی رہے گا کہ واقعاتی دنیا میں ان ہی تلواروں کا استعمال کیا جائے۔ نظم جدید کی فطرت نگاری نے تخیل کو چھوڑا اور واقعیت اور گرد و پیش کے مناظر سے اپنا رشتہ استوار کیا...... حالؔی خود کو واقعیت سے وابستہ کر کے امرِ واقعہ کو شاعری کہنے لگے...... لہٰذا حالؔی نے تخیل کے اساسی رکن مبالغہ کو جھوٹ کے ہم معنی قرار دے کر شعرا کو مبالغے سے پرہیز کا مشورہ دیا۔''[۴]

ان خیالات کا اظہار وہی کر سکتا ہے جسے اُردو ادب کے وافر سرمائے تک رسائی ہو۔ جسے اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات اور سماجی حالات کا علم ہو، جسے انقلابی قوتوں اور ردِ انقلاب کے لیے کام کرنے والے عوامل کی خبر ہو، تبھی وہ شعر و ادب کا صحیح اور حقیقت پر مبنی تحریر کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی اس شاعری کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس میں روحِ عصر کارفرما ہو اور جس کے انقلابی تصورات معاشرے میں زندگی کی نوید بن رہے ہوں۔ اس لیے وہ جوشؔ کی انقلابی شاعری کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ اپنے والد سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کا فکری تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''وحید الحسن ہاشمی، جوشؔ کی طرح استعماری قوتوں کے سخت خلاف ہیں انھوں نے اپنے مرثیوں میں استعمار کی پھیلی ہوئی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی جو کوشش کی ہے اس نے ان کے شعری مقام و مرتبہ کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ استعماری قوتوں کے خلاف شعری محاذ آرائی پر جوشؔ ملیح آبادی کا ہاشمی صاحب کے فن پر واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔''[۵]

جوشؔ اور وحید الحسن ہاشمی کے انقلابی خیالات ہی کو نہیں بل کہ شبیہ الحسن ہر اس تخلیق کو نگاہِ استحسان سے دیکھتے ہیں جس میں عصری شعور کی کارفرمائی ہو اور فن کی پاسداری بھی شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی جدید مرثیہ

نگاروں میں بلند مقام کے حامل ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کہتے ہیں:

''قیصر بارہوی، عصرِ جدید کے ایک معتبر مرثیہ نگار ہیں۔ انھوں نے صنفِ مرثیہ کو اپنے عہد کے مسائل سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ عطا کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں میں آپ کو عہد جدید کے سیاسی و سماجی تقاضے بھی موجزن دکھائی دیں گے اور ان کے حل کے لیے تجاویز بھی ملیں گی۔ لیکن سب سے اہم اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں ''مرثیت'' کا فقدان نہیں ملے گا۔''[۶]

اس مرحلے میں تنقید ادب کی خشک باتوں سے ہٹ کر خالصتاً ایک ذوقی چیز کی طرف اشارہ کرنے لگا ہوں وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جس قوم سے خوش ہوتا ہے اسے عظیم انسان عطا کرتا ہے یقیناً ایسا ہی معاملہ افراد اور خاندانوں کے ساتھ ہے۔ جس فرد یا خاندان کو اللہ تعالیٰ جاوداں زندگی دینا چاہتا ہے اسے برگزیدہ انسانوں سے نوازتا ہے۔ تاریخِ اسلام میں نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشن مثال سب کے سامنے ہے۔ اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ سید وحید الحسن ہاشمی خوش نصیب انسان ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں شبیہ الحسن جیسا لائق اور باسعادت فرزند عطا کیا جو نہ صرف ان کے علمی و ادبی سلسلے کو آگے بڑھا رہا ہے بل کہ وحید الحسن ہاشمی کی شعری تخلیقات کو جس محنت، لگن اور اہتمام سے شائع کرا رہا ہے یہ عمل لائقِ تحسین و تقلید ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وحید الحسن ہاشمی ایک معتبر نعت گو، ایک عہد ساز مرثیہ نگار، منقبت نگار، سلام نگار اور نوحہ کہنے والے ہیں۔ مگر ان کا پورا کلام قارئین کے سامنے نہ تھا۔ شبیہ الحسن کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انھوں نے والد کے کلام کو بیاضوں میں مقید نہیں رہنے دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں:

''ضرورت تھی کہ ان کے تمام کلام کو یک جا کر کے شایع کر دیا جائے۔ ان کے لائق فرزند ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ان کی جملہ نعتیں، منقبتیں اور سلاموں کو یک جا کر کے ''طاہرین'' کے نام سے شایع کر دیا ہے اب وحید الحسن ہاشمی کے صحیح شاعرانہ مرتبے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔''[۷]

جدید مرثیہ نگاری کا فن کلاسیکی مرثیے سے زیادہ وقت طلب ہے کلاسیکی مرثیہ نگار جس ماحول اور فضا میں مرثیہ گوئی کرتا تھا وہ مرثیے کے فن کا قدر دان اور کربلا کی حقیقت و حقانیت سے مانوس ماحول تھا۔ عہد حاضر میں معاشی تگ و تاز، مغربی فکر کی بالا دست حیثیت، فکری تضادات، سرمایہ دارانہ نظام نے فن کی ناقدری کے ساتھ اعلیٰ اخلاق و کردار کی اہمیت کو بڑی حد تک پس پشت ڈال دیا ہے۔ آج کا خودسر نوجوان جس کے ہاتھ ہمہ وقت کمپیوٹر پر اور آنکھیں تباہ کن میزائلوں پر لگی ہوئی ہیں اس کے پاس وقت کہاں کہ وہ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربانی اور اس کے روحانی، اخلاقی اور انسانیت نواز پہلوؤں پر غور و فکر کر سکے اور نہ آج کے نوجوان کو تربیت کے اخلاقی معیارات سے کوئی سروکار ہے۔ چناں چہ جدید مرثیہ نگار کی مشکلات دو چند ہو گئی ہیں۔ کلاسیکی

مرثیہ تاریخ تھی اور جدید مرثیہ اس سانحہ عظیم کا تجزیہ ہے۔ جدید مرثیہ نگار ایک قدم پیچھے ہٹ کر پہلے فلسفہ شہادت پھر منقبت اور آخر میں واقعہ کربلا کی طرف آتا ہے اس شعری سفر کے لیے جس تنظیم اور مشق و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے فن کی ان نزاکتوں سے مرثیہ گو کی طرح نقاد کا باخبر ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ شبیہ الحسن جدید مرثیے کے فن اور مرثیہ نگاروں سے گہری فکری ہم آہنگی رکھتے ہیں ان کے خیال میں مرثیے میں تمام تر جدیدیت کے باوجود حزنیہ پہلو نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب عصرِ حاضر کے جدید مرثیہ نگار قیصر بارہوی کے بارے میں کہتے ہیں:

''قیصر بارہوی کے بعض مرثیوں میں آغاز تا انجام ایک حزنیہ کیفیت طاری رہتی ہے عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ مرثیہ نگار سامعین پر رقت طاری کرنے کے لیے آخری پندرہ بیس بند کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں۔ قیصر بارہوی کا طریقہ کار اس سے مختلف اور منفرد ہے۔ وہ بعض اوقات ابتدا ہی میں ایک ایسا سحر انگیز حزنیہ دائرہ کھینچ دیتے ہیں کہ قاری و سامع اس سے باہر نہیں نکلتا..... قیصر بارہوی کے یہاں حزنیہ ماحول کی رو پورے مرثیے میں سرایت کر جاتی ہے۔''۸

وہی شاعری تا دیر زندہ رہتی ہے جو اپنے عہد کی آواز ہو۔ کتنی اصناف ادب و شعر زمانے کی دست بُرد کی تاب نہ لا کر دم توڑ چکیں مگر مرثیہ آج بھی اسی آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے جیسا کہ انیس و دبیر کے عہد میں تھا البتہ مرثیہ گو شعرا کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔ مرثیہ کی طویل زندگی کا پہلا اور بنیادی سبب تو اس کا آفاقی موضوع ہے اور دوسرا یہ کہ صنف مرثیہ کو ہر دور میں کچھ ایسے کاملینِ فن میسر آئے جن کی زبان و بیان کی صلاحیتوں نے ہر کہ و مہ سے مرثیے کی عظمت تسلیم کرائی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا نقاد بھی مرثیہ نگاروں کی اس ریاضت کو نگاہِ استحسان دیکھ رہا ہے یا نہیں؟ تو اس ضمن میں عرض ہے کہ شبیہ الحسن ہاشمی کی اقدارِ حیات کے تبدیل ہوتے ہوئے نظام، عصری مسائل اور اخلاق و افلاس کی پیچیدگیوں پر پوری نگاہ ہے۔ وہ مرثیہ نگاروں کی تخلیقات کو عہدِ حاضر سے ہم آہنگ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ چناں چہ جب کسی مرثیہ گو کی فنی و فکری توانائیوں کو دیکھتے ہیں تو ان کا قلم داد و تحسین میں بُخل سے کام نہیں لیتا۔ وہ وحید الحسن ہاشمی کے بارے میں کہتے ہیں:

''ہاشمی صاحب کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے مرثیوں کو زمانے کی آواز میں شامل کیا اور فنی و فکری حوالے سے اس صنف کو با اعتبار بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے مرثیوں میں زندگی بسر کرنے کے اعلیٰ اخلاقی اصول فراہم کر کے اس بے راہ رو معاشرے کو راہ راست پر ڈالنے کی کوشش کی۔ سید وحید الحسن کی رثائی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید مختصر مرثیے کے موجد ہیں اور جب تک صنف مرثیہ زندہ ہے وحید الحسن ہاشمی کا نام بھی زندہ رہے گا۔''۹

ڈاکٹر شبیہ الحسن عہد حاضر کے مسائل اور اُدب کش رجحانات پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہیں تو اس لیے کہ اگر یہ رجحان جاری رہا تو اعلیٰ قدروں کی بیخ کنی ہوتی جائے گی۔ معاشرہ فکری سطح پر بنجر اور بے حس ہوتا جائے گا۔ تہذیبی قدروں کی پامالی کا سلسلہ تیز تر ہوگا تو نتیجتاً صالح فکر کے حامل افراد اور اعلیٰ دماغ منظر سے ہٹتے چلے جائیں گے اور یہ صورت حال کسی معاشرے کے لیے نیک شگون نہیں۔ اس تہذیبی شکست و ریخت کو اگر کوئی روک سکتا ہے تو وہ اس معاشرے کا ادیب ہے مگر اُدب و ادیب کی حالت زار کیا ہے اس بارے میں شبیہ الحسن کہتے ہیں:

''ہم ایک ایسے بنجر معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں سنجیدہ شعر و اُدب سے ربط رکھنا جگ ہنسائی کا موجب بن گیا ہے۔ دانش مند قلم کاروں نے تو اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر لوح و قلم سے اپنا ناتا توڑ لیا ہے۔ یاد رہے کہ جب تلوار سے ہمارا تعلق ٹوٹا تھا تو ہم اپنی پُر جلال سلطنت کھو بیٹھے تھے اور اب لوح و قلم کو چھوڑ کر ہمارا رشتہ اپنی پُر جمال تہذیب سے ٹوٹ گیا ہے۔ اس طرزِ عمل کا ایک منفی نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ قلم غیر دانش مندوں کے ہاتھ میں آ کر کم حیثیت بل کہ بے وقار ہو گیا ہے۔''[۱۰۰۱]

ڈاکٹر شبیہ الحسن کو شعرا و ادبا کی ناقدری کا رنج ہے مگر ان حوصلہ شکن حالات میں وہ نہ خود قرطاس و قلم سے ربط توڑتے ہیں نہ اس کا مشورہ کسی شاعر اور ادیب کو دیتے ہیں۔ اُدب و شعر کی تمام اصناف پر لکھنے کا گُر جانتے ہیں البتہ ان کی تنقید عمومی طور پر محبت آمیز انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ ان کی تنقید دل و دماغ کو بوجھل کر دینے والی نہیں ہوتی نہ ہی دھماکہ خیز مواد کی طرح قاری پر برستی ہے نہ ٹھہرے پانی کی طرح ہوتی ہے جس میں تیراک جس قدر ہاتھ پاؤں مارے آگے بڑھنے یا اُوپر اٹھنے کی بجائے ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ایسی تنقید قاری کے ذہن کو یبوست زدہ کر دیتی ہے۔ شبیہ الحسن ایسی تخریبی تنقید سے خود کو دُور رکھتے ہیں بل کہ ان کی تنقید کا مقصد تو تخلیق کار اور قاری کے تعلق کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تحقیق و تنقید کے ذریعے اگرچہ شعرا کو گوشہ گم نامی سے تو نہیں نکالا البتہ بہت سوں کو گوشہ گم نامی میں گرنے سے بچا لیتا ہے۔

....

حواشی

۱۔ سہ ماہی ''رثائی اُدب'' ۱۸واں شمارہ، پروفیسر کرار حسین نمبر، ایڈیٹر انچیف ہادی عسکری، ایڈیٹر ہلال نقوی، اپریل تا جون ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۰۔

۲۔ شبیہ الحسن، سیّد، ڈاکٹر (تجزیہ و تدوین)، قیصر بارہوی کے مرثیے، لاہور: اظہار سنز، اُردو بازار، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۸۔

۳۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر، (تدوین)، باقیات آلِ رضا، فلیپ از ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، رحمان پورہ، جون ۲۰۰۰ء۔

۴۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار، لاہور: اظہار سنز، اُردو بازار، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴۔۴۵۔

۵۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر، مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، رحمان پورہ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۱۔

۶۔ شبیہ الحسن (ترتیب)، آیاتِ آمنہ (مرثیہ) قیصر بارہوی، لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، رحمان پورہ، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۔

۷۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر (ترتیب وتدوین)، طاہرین (مجموعہ مراثی سید وحید الحسن ہاشمی)، فلیپ از ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، رحمان پورہ، ۲۰۰۶ء۔

۸۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر (تحقیق وتنقید)، قیصر اقلیم مرثیہ، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، رحمان پورہ، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۵۔

۹۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر (ترتیب وتدوین)، العطش (مجموعہ مراثی سید وحید الحسن ہاشمی)، لاہور: الحسن پبلی کیشنز رحمان پورہ، ۲۰۰۵ء، ص ۸۳۔

۱۰۔ شبیہ الحسن، سید، ڈاکٹر، تصریحات، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، رحمان پورہ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۳۱۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ۔ آسمانِ اَدب کا ایک درخشاں ستارہ

یعقوب تصور

◆◆

یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ متحدہ عرب امارات کے حسین و دلکش شہر شارجہ میں آج محترم شہزاد احمد کی صدارت میں محبانِ اَدب و سخن نے (جن میں محترم ابو طالب نقوی اور جناب مصدق لاکھانی نمایاں ہیں) یہ بزم اعتراف کارہائے ترویج و اَدب و سخن جناب ڈاکٹر شبیہ الحسن منعقد کی ہے۔ اس بزم کی اہمیت میں اس لیے بھی اضافہ ہوگیا ہے کہ اس کی صدارت برصغیر ہند و پاک کے ایک عظیم ادیب و شاعر جناب شہزاد احمد فرما رہے ہیں۔

محترم شبیہ الحسن کی شخصیت اور ان کی علمی و فنی بصیرت و قابلیت کے بارے میں اظہار مجھ جیسے طالب علم اَدب کی علمی اہلیت اور استعداد کے حصار سے بعید ہے اور میری اس وقت کی تمام گفت گو کا تجزیہ کیا جائے تو ایسا ہی محسوس ہوگا جیسے مَیں نے سورج کے روبرو ایک چراغ روشن کیا ہے لیکن اگر مَیں اس میں بھی کامیاب ہو جاؤں اور اس ستارۂ فن و اَدب کے کسی ایک علمی پہلو پر بھی مختصر گفت گو کر سکوں تو یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ ہوگا۔ مَیں نے اس بزم کو بزمِ اعتراف اس لیے کہا کہ کسی کے انتہائی پُر خلوص اور ذوق و مہارت فن کے کارہائے گراں قدر کا اعتراف ہی اصل میں اس کی محنت و عرق ریزی کی سچی توصیف ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن آسمانِ اَدب پر ایک درخشاں ستارے کی حیثیت سے نمودار ہو کر بتدریج نظام شمسی ہی کی طرح نظامِ اَدب کے سیارگانِ ضوفشاں میں نمایاں سے نمایاں تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس کا سبب یقیناً صرف اور صرف اُن کی اَدبی ریاضت، مسلسل مطالعہ، علمی بصیرت، جذبۂ تحقیق اور پُر خلوص و حقیقی انہماک ہے اس مختصر وقت میں ان کے اَدبی ذخائر کا خاطر خواہ جائزہ پیش نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کی توضیح و اظہار بہ طریق احسن اور بہ حد کمال ممکن ہے سو اس محفل میں جس میں امارات کے شائقین اُردو اَدب تشریف فرما ہیں مختصراً کچھ حقائق پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اب تک کتنی کتابیں لکھی ہیں لیکن جن کا علم ہے ان میں قابلِ ذکر کئی ہیں ''مفاہیم، ترجیحات، آلِ رضا کا

فنِ غزل گوئی'' وہ کتابیں ہیں جو تنقیدی و تحقیقی مقالات اور مطالعہ پر مشتمل ہیں۔

شام وسحر کی باتیں ایک ایسی کتاب ہے جس میں ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء تک کے ماہ نامہ ''شام وسحر'' کے دل کش، بامقصد اور متاثر کن اداریے جمع کردیے گئے ہیں جو اَدبی کاوشوں کا مرقع ہے۔

''بجھی وہ شمع'' حضرت نسیم امروہوی کے فن اور ان کی شخصیت کا وسیع مطالعاتی احاطہ ہے۔

''آیاتِ آمنہ'' قیصر بارہوی کے مرثیے کا عمیق مطالعہ اور دقیق تجزیاتی شاہ کار۔

''کلیاتِ حبیب'' حبیب جون پوری کے کلام واَدب وفن کی خوب صورت تدوین۔

''العطش'' جلد اول، دوم اور سوم محترم وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین۔

''لکھنؤ کی اُردو شاعری'' ایک خوب صورت اَدبی تجزیہ لکھنؤ کی تہذیب کے دل کش تناظر میں۔

''آغا صاحب'' ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت اور ان کے علمی وفنی تناظر میں۔

''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' سیف زلفی کی شخصیت اور ان کے فنی کارنامے نمایاں کا مطالعہ و تجزیہ۔

''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' تحقیق وتنقید۔

''باقیاتِ آلِ رضا'' محترم آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تلاش، تحقیق اور دھنک رنگ تدوین شامل ہیں۔

محترم شبیہ الحسن کے موضوعات میں تنوع ہے انھوں نے اَدب کے ان گنت دوائر و محاذات پر انتہائی کامیابی سے اس انداز میں ضوافشانی کی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے وہ مطالعہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی غیر اہم نہیں سمجھتے اور ان سے بھی مضامین کشید کر لیتے ہیں اور مشاہدہ میں ہمہ تن چشم و گوش ہیں کہ منظر کے کسی بھی پہلو کو محوِ نظر نہیں ہونے دیتے اور ان ہی اوصاف کی وجہ سے انھوں نے تنقید و تحقیق میں بہت سے ایسے پہلو بھی اُجاگر کیے اور ایسے تاریک گوشے بھی تنویر کے احاطے میں لائے جو اب تک نگاہِ تنقید سے اوجھل تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے ذخائرِ فن واَدب کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کمالِ فن کے رموز کا نہ صرف ادراک رکھتے ہیں بل کہ انھیں برتنے کے سلیقے میں مہارت بھی جو یقیناً ان کی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنے کی مثبت جدوجہد کی غماز ہے اور اس ضمن میں جو اہم عوامل کارفرما نظر آتے ہیں وہ گہرا اور مفصل مطالعہ اور عمیق مشاہدہ، استدلال اور حوالوں کی قوسِ قزح سے مزین اظہار کی دل کشی، زبان ولغت پر مضبوط دسترس اور لفظوں کو نفسِ مضمون کے مطابق سبک روی اور شدتِ احساس کے خاطر خواہ استعمال کرنے کی صلاحیت اور وہ بھی اس طرح کہ قاری کے اذہان پر انمٹ تاثر ثبت کر جائے اور پھر سب سے اہم یہ کہ مضمون کی اٹھان مسلسل اور بتدریج اُفقی نہج پر گامزن رہے اور اختتام بالکل اسی طرح جیسے ایک فائر ورک آسمان کی وسعت میں بلندی پر پہنچ کر صد رنگی روشنی کے پھول بکھیر دیتا اور آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

تصنیف وتالیف کا شغف ڈاکٹر شبیہ الحسن کے اُدبی میلانات اور تنقیدی رجحانات کا عکاس ہے۔ تحقیق وتنقید میں جواں ہمتی کا بڑا دخل ہے اور ساتھ ہی مختلف شعبہ ہائے اُدب اور ماحول ونفسیات کے امتزاج سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا علم بھی ضروری ہے۔ تحقیق جس قدر مشکل کام ہے تنقید اُس سے بھی کہیں زیادہ دقت طلب لیکن محترم شبیہ الحسن کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان میں تحقیقی تگ ودو کا جذبہ اور تنقیدی بصیرت وقوت کا ایک سیل ہے جو کلک اظہار کو بہ انداز بیک مسلسل رواں رکھتا ہے ان کے ہاں اصل اہمیت مجموعی صورتِ حال اور وسیع تناظر کی ہے۔ وہ انفرادی یا ذاتی خدوخال سے کہیں بھی متاثر نظر نہیں آتے بل کہ بحرِ فن کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کے گوہرِ مقصود نکال لاتے ہیں۔

تنقیدی اور تحقیقی مضامین مخصوص طبقۂ اُدب کی جبلی اور میلانی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں جن میں تصنع کا فقدان اور حقائق کی سنگینی اور کاٹ ہوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ اُدبا اور شعرا کی بہت بڑی تعداد ان مضامین کی طرف متوجہ نہیں ہوتی۔ محض ایسے حضرات ان مضامین میں دل چسپی لیتے ہیں جنھیں خوب سے خوب تر کی تلاش اور حقائق کی کھوج ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں سطر سطر دل کش رنگینی اور دل چسپ حقیقت آفرینی اپنے قاری کو پیہم متوجہ رکھتی ہے اور شاید یہی ایک محقق اور ناقد کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

محترم شبیہ الحسن نے ازراہ محبت مجھے اپنی کئی کتابیں آج عطا فرمائی ہیں اور یہ چند الفاظ میں نے محض ان کی ان تحریروں سے متاثر ہو کر تحریر کیے ہیں جو میری نظر سے گزر چکی ہیں ان پر مزید لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی عطا کردہ کتب کا باقاعدہ مطالعہ کیا جائے۔

سو آج میں ان چند سطور پر ہی اکتفا کرتے ہوئے محترم شبیہ الحسن کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اتنے مختصر مدت میں اُدب کے ذخائر میں اتنا بڑا اضافہ کیا ہے اور ان کی فکری، علمی اور مطالعاتی توانائی دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں منظر در منظر ابھی اَن گنت میدان ہیں جنھیں انھیں سر کرنا ہے اور اعتماد و تیقن کی وہ برقیاتی لہریں بھی جو مسلسل آگے بڑھ کر کامیابیوں کی راہیں کشادہ کر رہی ہیں۔

اللہ انھیں ترویج اُدب کے نیک مقاصد میں کامیابی اور کامرانی عطا فرمائے۔ آمین! تحقیق سچ کی تلاش اور تنقید اظہارِ صدق کا نام ہے سو آخر میں اپنا ایک شعر ان کی نذر کرنا چاہوں گا کہ :

سچی بات اگر کہہ دینے کے دل میں ارمان بھی ہیں
پھر اِس بات سے کیا ڈرنا کہ دیواروں کے کان بھی ہیں

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی کارِ مسیحائی

نجم الحسن رضوی

◆◆

دبئی کی ایک نواحی بستی کو سوناپور کہتے ہیں مگر شاید اَب یہ نام پورے دبئی پر صادق آتا ہے کیوں کہ اسے طلائی شہر یا ''سٹی آف گولڈ'' کہا جاتا ہے جہاں صرافہ بازار کی رونقیں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ علم و ہنر کی دنیا میں بھی ایک سوناپور واقع ہے جہاں شاعر و ادیب اپنی تحریروں سے سونے اور چاندی کے ورق تیار کرتے ہیں۔ یہ اَدب کی ٹکسال ہے۔ جس میں لفظوں اور فقروں کے سکے ڈھلتے ہیں۔ سونے اور چاندی کے سکے!

ڈاکٹر شبیہ الحسن اس ٹکسال میں کوالٹی کنٹرول کے شعبے سے وابستہ ہیں اور سکوں کو پرکھ کے ان کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا حکم جاری کرتے ہیں، گویا نقد و نظر ان کا اصل مشغلہ ہے لیکن چوں کہ وہ شاعر ہیں لہٰذا ان کی تنقید میں تخلیقی چمک ملتی ہے۔ ان کے شعر کی اثر انگیزی بھی کچھ کم قابلِ ذکر نہیں اور وہ اپنی شاعری میں سچے جذبات کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے بعض اوقات ایسا اسمِ اعظم تخلیق کرتے ہیں جس کی تاثیر سے دلی آرزوئیں پوری ہو سکتی ہیں، یہ ان کا دعوا ہے اور اس سے اپنے فن پر ان کے اعتماد کا پتہ چلتا ہے۔ اَدب کے کوچے کی سیر کرتے ہوئے وہ ایک ہاتھ میں تحقیق کی چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں تخلیق کی چھتری تھام کے قدم آگے بڑھاتے ہیں اس لیے ہمیں ان کی تحریر میں ایک متوازن اور منظم طرزِ فکر کا احساس ہوتا ہے۔

نقد و نظر کا ذکر آیا ہے تو میں یہ اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے ایسی تنقید و تحقیق سے، کوئی خاص دل چسپی نہیں جو امتحان پاس کرنے کے لیے طلبا کی ضرورت پوری کرتی ہے۔ ان تحریروں کا دار و مدار عام طور پر ری سائیکلنگ کے فن پر ہوتا ہے یعنی بارہا کہی ہوئی باتوں کو اتنی خوبی سے دہرایا جائے کہ وہ نئی لگنے لگیں۔ اس قسم کی تنقید کو جس میں لوگ ناموں کی گردان اور دوسروں کی دی ہوئی آراء پر انحصار کرتے ہیں، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے ''طوطے کی فال'' کا نام دیا تھا اور شاید اسی بنا پر روایتی تحقیق کے بارے میں جسے لوگ آثارِ قدیمہ کی تلاش کا کوئی سلسلہ سمجھتے ہیں ایک اور مردِ ظریف نے کہا تھا کہ کسی ایک مصنف کی تحریر سے کچھ اخذ کرنے سے بہتر ہے کہ

بہت سارے لکھنے والوں کی تحریروں سے استفادہ کیا جائے کیوں کہ پہلی صورت میں آدمی پر سرقے کا الزام لگ سکتا ہے جب کہ دوسری صورت میں وہ محقق کہلائے گا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کو ایسے اعزاز کی طلب نہیں، ایک تو وہ ہر معاملے میں اپنی واضح رائے رکھتے ہیں اور دوسری خاص بات جو ان کی اَدبی ترجیحات میں شامل ہے، یہ ہے کہ وبائے عام سے انھوں نے اپنا دامن بڑی حد تک بچائے رکھا ہے۔ مختلف اَدبی موضوعات کے جن مفاہیم تک وہ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں وہ عام نہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہی نہیں جن پر پہلے ہی بہت سے لوگ خامہ فرسائی کر چکے ہوں اگرچہ انھوں نے مرثیے کی صنف کے بارے میں تواتر سے لکھا ہے مگر ان کے فکری موقف سے خود مرثیے کی تفہیم اور اس کے مختلف فنی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اسی طرح قاری کو شعر واَدب کے باب میں ان کے مضامین کے ذریعے مختلف تہذیبی آفاق تک رسائی کا موقع ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا سب سے نمایاں تحقیقی کام یہ ہے کہ انھوں نے بعض ایسی اہم اَدبی شخصیتوں کے بڑے کامیاب شخصی اور فنی خاکے تیار کیے ہیں جن کے بارے میں لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ ان شخصیات میں مولانا ظفر علی خان، حفیظؔ جالندھری، سیّد آل رضاؔ، نسیمؔ امروہوی، سیف زلفی، شیر افضل جعفری، وحیدالحسن ہاشمی، قیصرؔ بارہوی، حبیبؔ جون پوری اور آغا سہیل شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے نسیمؔ امروہوی کے بارے میں اپنے مضمون میں لغت نویسی اور لسانیات کے شعبے میں ان کی مہارت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل احمد خان کا ایک اقتباس نقل کیا ہے کہ ''الفاظ کو زندہ انسانوں کی طرح محسوس کرنا، یہ ہنر کم لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔'' شبیہ صاحب اس بات کے لیے ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے لفظوں کے آئینے میں ایسے لوگوں کی تصویریں ہمیں دکھائی ہیں جو آج بھی اپنے لفظوں میں زندہ ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ تنقید کے لیے بڑی رسمی اور گھمبیر زبان ہونی چاہیے، مگر اس میں خطرہ یہ ہے کہ بعض اوقات اس کی وجہ سے بڑی 'قاری دشمن' نثر وجود میں آتی ہے۔ ماضی میں ہمارے ایک محترم اور بزرگ نقاد کی خشک اور روکھی پھیکی تحریر کو ان کی علمیت کی نشانی کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اور موصوف کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر غلطی سے کبھی کوئی شگفتہ فقرہ ان کی تحریر میں در آتا ہے تو وہ اسے کاٹ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ بات چاہے کیسی بھی ہو اسے پُر اثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے خوب صورت انداز میں کہا جائے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن یہ گُر جانتے ہیں۔ ان کی تحریر سنجیدہ اور سادہ تو ہے مگر خوب صورت تخلیقی فقروں سے خالی نہیں مثلاً حفیظؔ جالندھری کے بارے میں یہ بات کہ ''حفیظؔ کی شاعری میں نالۂ دل بھی نغمۂ رباب بن کے ظاہر ہوتا ہے'' یا اُردو کو جھنگ رنگ میں نہلانے والے شاعر شیر افضل جعفری کے حوالے سے یہ فقرہ کہ ''ان کی

غزلوں میں شیر افضل جعفری کا بجیلا اور منفرد انداز ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے“ ان کی نثر کے خوب صورت اندازِ تکلم کی گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں یہ اقتباس بھی بہت دل نشیں ہے کہ ”ظفر علی خاں نے قرآن پاک کا مطالعہ فقط بصارت سے نہیں بصیرت سے کیا تھا اور خاص طور پر وہ آیات ان کے پیشِ نظر رہی تھیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وستائش کے پہلو نکلتے ہیں یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنی نعتوں میں ان آیات کو نہایت فن کارانہ انداز سے نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔“

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تحقیق کے شعبے میں اَن تھک محنت اور جگر کاوی کا ثبوت دیتے ہوئے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اسے کسی بھی پہلو سے تشنہ نہیں چھوڑا اور بڑے معتبر نتائج برآمد کیے ہیں جس سے قاری کو پتہ چلتا ہے کہ سید آل رضا اصل میں کب پیدا ہوئے تھے، مرثیے اور ڈرامے میں کون سی باتیں ملتی جلتی ہیں، محمود نظامی نے ایک سفر کے دوران دو سفر کیے۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی ...... اور سیف زلفی نے اپنے شعری مجموعے کا نام ”ٹکڑے ٹکڑے آدمی“ یوں رکھا کہ انھیں معاشرے میں یہی منظر نظر آتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے بعض نام ور زندہ اہلِ قلم کے خصوصی مطالعے پیش کرنے کے علاوہ بہت سے مرحوم شاعروں کی شخصیت اور فن پر جامع مقدمے بھی تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے جہاں ایک طرف سید آل رضا کے غیر مطبوعہ کلام کو جمع کیا وہاں حبیب جون پوری کی کلیات اور سیف زلفی کے بارے میں معتبر اَدبی مواد بھی ترتیب دیا ہے جس سے ان مرحومین کا بکھرا ہوا کام سامنے آیا ہے اور اس سے فنِ تحقیق کے اس رُخ کو سمجھنے میں مدد ملی ہے کہ کسی محقق کا کام فقط قبروں کے کتبے لکھنا نہیں ہوتا بل کہ اہلِ نظر کو یہ احساس دلانا ہے کہ موت کے بے رحم ہاتھ ہمیں کیسے کیسے ہنرمندوں سے محروم کر دیتے ہیں یہی احساسِ زیاں شاید اس تحقیق کا ثمر ہے۔

جس طرح دہلی کا ”سوناپور“ اپنے قبرستان کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے اسی طرح اَدب کے سوناپور میں بھی ایک قبرستان موجود ہے، وقت کا قبرستان جوان نادرِ روزگار ہستیوں سے بھرا پڑا ہے جنھیں لوگ بھلا چکے ہیں لیکن ایک صاحبِ نظر محقق لوگوں کو بتاتا ہے کہ رزقِ خاک ہونے والوں میں سب کے سب مردہ نہیں، وہ کتابِ اجل میں بند جگمگاتے لفظوں کے ان ’لالہ وگل‘ کو ڈھونڈ نکالتا ہے جو اپنی تابندگی اور خوش بو سے مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دیتے ہیں۔ اس کارِ مسیحائی کے لیے تحقیق وتلاش کے یہ متوالے ہماری بھرپور پذیرائی کے مستحق ہیں اور ان میں ڈاکٹر شبیہ الحسن بھی شامل ہیں۔

(ماہنامہ ’شام وسحر‘ لاہور نومبر ۲۰۰۳ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ایک باشعور نقاد

مظہر حسین مظہرؔ

◆◆

سرزمین لاہور علم واَدب کا گہوارہ ہے اس دبستان میں ہاشمی خاندان کی حیثیت مسلّم ہے۔ عرصہ دراز سے علم واَدب کی ترویج اور ترقی کے لیے سادات کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے یقیناً یہ ودیعت خداوندی اور عطیۂ ربِ ذوالجلال ہے جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے اور پھر سادات کے لیے اُس کا کرم بے پایاں ہے جو ہمہ وقت جاری وساری ہے۔ مجھے بچپن ہی سے شعروشاعری سے تعلق رہا ہے اور خصوصاً نعت، سلام اور منقبت میری محبوب اصنافِ نظم رہی ہیں۔ جناب سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کے لکھے ہوئے سلام اور منقبت میرے قلب وروح کے لیے طمانیت اور نورانیت کا باعث ہوتے ہیں۔ جب کبھی کسی اخبار، رسالہ یا مجلّہ میں اُن کا کلام دیکھتا ہوں پہلی فرصت میں پڑھتا ہوں لیکن ایم اے اُردو کرنے کے بعد جب اَدبی مذاق کا رُخ ذرا تبدیل ہوا اور تحقیق وتنقید کے میدان میں مثلِ طفلِ مکتب قدم رکھا تو تحقیقی مذاق ومزاج کے آئینہ دار مجلّات اور رسائل کی فہرست مرتب کی جس میں میرے محترم دوست شفیق الرحمٰن الہ آبادی نے میری بھرپور معاونت کی تو ماہنامہ 'شام وسحر' کی متوازن اور نوآموز تخلیق کاروں کی حوصلہ افزا پالیسی نے مجھے بے حد متاثر کیا، کہتے ہیں کہ کسی بڑے کارنامے، کتاب یا ادارے کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی شخصیت موجود ہوتی ہے۔'شام وسحر' کی صورت میں جناب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن جیسی نابغۂ روزگار ہستی سے آگہی اور ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو مسلسل ۳۰ سال سے تحقیق وتنقید کے میدان میں اپنا سکہ جما چکے ہیں اُن کا اَدبی وتنقیدی شعور عصرِ حاضر کے نوجوان ادبا میں بڑی تیزی سے منتقل ہو رہا ہے بل کہ اُن کا فنِ انتقاد نسلِ نو کے لہو میں تحلیل ہو رہا ہے اور وہ پڑھے لکھے طبقہ میں قبولیت عوام کی سندِ فضیلت حاصل کر چکے ہیں۔ تحسین صاحب کے بقول:

سخن کا میں صلہ پانے لگا ہوں
کہ لوگوں میں پڑھا جانے لگا ہوں

اُن کی ذات یقیناً نسلِ نو کی توجہ کا مرکز ہے۔ اُن کی تخلیقات، تحقیق اور تخصص کی غماز ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اَدب کے لیے بالعموم اور مرثیہ نگاری کے لیے بالخصوص وقیع کام کیا ہے اُن کے تبصرے، تجزیے اور اداریے دانش وروں کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور انھیں نئے زاویوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ ایک نقاد شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی شعور رکھتا ہے جب دانش و آگہی، شعور و ادراک اور علم و عقل جذبہ ہائے شوق میں مجتمع ہوتے ہیں تو ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت وجود میں آتی ہے۔ آپ کے والد گرامی نے بجا طور کہا تھا:

جو جذبہ ہائے شوق چھپائے ہوا تھا میں
وہ میرے بعد سب مرے بیٹے میں آ گئے

آپ کے تحقیقی اور تنقیدی سرمائے کی فہرست کافی طویل ہے۔ مفاہیم، ترجیحات، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار، تصریحات، باقیاتِ آلِ رضا، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی، کلیاتِ حبیب جون پوری، شام و سحر کی باتیں، بیسویں صدی کا شعری اَدب، جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی، منتخب اور معتبر مرثیے، بجھی وہ شمع، آغا صاحب اور آیاتِ آمنہ ایسی خوب صورت کتابیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن کے خلوص اور اَدب دوستی کی مظہر ہیں۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی دو کتب 'تصریحات' اور 'باقیاتِ آلِ رضا' پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اِن دونوں مدوّن کتب کی خواندگی سے مجھے طرفہ راحت و لذت حاصل ہوئی۔ ایک طرف تو جدید تنقیدی افکار سے روشناسی ہوئی تو دوسری طرف معاصر تحقیقی روّیوں سے متعلق آگہی ہوئی۔ انھوں نے روایت اور جدت کے اشتراک سے ایک ایسا تنقیدی نقطۂ نظر اپنایا ہے جو سب سے منفرد اور جدا ہونے کے ساتھ توازن اور اعتدال جیسے اوصاف سے متصف ہے۔ سب سے بڑھ کر اُن کا اُسلوبِ بیان ہے وہ کسی قیمت پر بھی فنِ تنقید اور اصولِ نقد و نظر کو قربان نہیں ہونے دیتے بل کہ نفیس اور لطیف پیرائے میں ایسی اچھوتی بات کر جاتے ہیں جو نہ تو آئین کے منافی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی تخلیق کار کی دل آزاری کا باعث، اس طرح کلمۂ خیر کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حق تنقید بھی ادا ہو جاتا ہے۔ اُن کے ذہنِ رسا، عصری حسیّت، قوتِ متخیلہ، تنقیدی بصیرت، لسانیات پر عبور، منطقی اور مدلّل اندازِ فکر، وسعت اور بالغ نظری، نظم و نثر پر دسترس اور بعض دیگر موروثی خواص نے نہ صرف اُنھیں باشعور نقاد بنا دیا ہے بل کہ اِن تمام محاسن کے سبب اُن کی حیثیت ایک صاحبِ طرز اور قادر الکلام ادیب سے کسی طور کم نہیں۔ انھوں نے ایک نئے تنقیدی دبستان کا سنگِ بنیاد رکھ کر سطحی اور ستائشی تنقید کے بند توڑ دیے ہیں۔ ایسے میں اُن کے مقالے اور مضامین نثر کا شاہ کار بن گئے ہیں جس سے منزلِ انتقاد کو ڈھونڈنے میں کافی حد تک آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ اس رہ نمائی میں اُن کا کردار Bacon اور Montaigne کے خیالات کا ترجمان بن گیا ہے۔ اُس نے کہا تھا:

"An essay voice the past, reflect the present and mould the future."

اُنھوں نے تنقید کوفن کے طور پر اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے جس کا اظہار اُن کے جملہ مقالات میں جا بجا ملتا ہے۔ Emerson کی طرح فنِ تنقید کو زندگی کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے:

"All art is the expression of life in forms of truth and beauty."

صداقت اور خوب صورتی، کلاسیکیت اور رومانیت میں تاریخی امتزاج، نئے Talent کی دریافت اور تنقید میں روایت کا پرچار یعنی "Reference of tradition in Criticism" چند ایسی لازوال خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا نام دنیائے اُدب میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی فکر کے محرکات

مرید عباس خاور

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو اپنے ہاشمی النسل ہونے کا ناز کیوں نہ ہو کہ یہ فخر انیس کو بھی حاصل تھا جنھوں نے کہا تھا :

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

ہاشمی تھے تو اہل بیتؑ کے غم سے آشنا اور پھر خطیب نہج البلاغہ سے نسبت چلتی ہوئی اس ہاشمی گھرانے کے چشم و چراغ تک پہنچی۔ فلک جس طرح ان خطبات پر حیراں تھا اسی طرح ایک عالم سیّد شبیہ الحسن کی لفظ شناسی اور فنِ تنقید میں کامل دست گاہ پر ورطۂ حیرت میں ہے گویا سلسلۂ نسب سے علم و حکمت کے موتی وراثت میں سیّد وحیدالحسن ہاشمی کی صورت پہنچے اور انفرادی 'صوت' جوان کے ذہن میں تخلیق ہوئی۔ کبھی شاعری میں اس کی نمود ہوئی تو کبھی تنقید میں اور یہ دونوں اصناف تخلیقی نوعیت کی ہیں۔ صنفِ شاعری سے واقف ہونا اور اس پر عبور ہونے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کسی ستارے سے روشن گرے اور خود ستارے میں فرق ہوتا ہے اور تنقید کی مثال ایسے سورج کی ہے کہ مہتاب غزل ہو یا سیارۂ نظم، اسی سورج کی روشنی سے منور ہوتے ہیں اور خود یہ سورج جس تخلیق کار کا مداح ہے ان میں اُردو اُدب میں رثائی اُدب کو ہیئت کے تجربے سے آشنا کرنے والے مختصر مرثیے کی روایت کے بانی سیّد وحیدالحسن ہیں جو نعت، منقبت کی اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے اور خوب صورت شاعری تخلیق کرتے رہے۔

اب آیئے اس عہد کی جانب جہاں اُسلوب کا قحط ہے اور اچھی تنقید کا بھی عالم یہ ہے کہ قدآور شعرا اچانک انیس کے شعر کو دبیر کا قرار دے دیتے ہیں اور یہی سلوک سلامت علی سے ببر علی جیسی عظیم ہستی کے بارے ہوتا ہے کسی شاعر نے عہدِ حاضر کے ان نظر انداز کرنے والے روّیوں کے بارے میں کیا خوب کہا ہے :

بھائی کچھ نہیں دیتا شکستہ 'یادوں' نے
کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

وجہ صاف ظاہر ہے کہ سیکھنے کا عمل غائب ہو رہا ہے۔ شعر ابلاغ کی تاثیر سے خالی کیوں ہے؟ اگر قاری کو ہی شعر میں مضمون آفرینی کرنی ہے تو پھر شعری فن کیا لفظوں کو بے ترتیبی سے جوڑنے کا نام ہے؟ وجہ واضح ہے کہ تنقید اُدب سے دُور کھڑی ہے یا کر دی جاتی ہے۔ 'حُسن کی خواہش' صبح پر برافروختگی ہمارے شعرائے کرام کا نقاد کے بارے میں یہی رویہ رہا تو اُدب کا خدا ہی حافظ ہے۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنی اعلیٰ نسبی کا نہ صرف اپنے بہت زیادہ حصولِ علم کی خواہش کے ذریعے اظہار کیا بل کہ تخلیق کی سب سے بالائی منزل تنقید پر براجمان ہو کر اس کا اظہار کیا ان کے تنقیدی روّیے میں اُدب کے ارتقا کی جانب داری ہے۔ ان کا وسیع مطالعہ اس سمت میں ان کا معاون خاص ہے اور یہ بہت بڑا کام انھوں نے ایک عظیم شخصیت کے حوالے سے بھی کیا۔ جن کا نام نامی اسم گرامی سید وحید الحسن ہاشمی ہے۔ جن کی شاعری کا مرکز محور و نفوس قدسی ہیں جو وجہ تکوین کائنات سے جڑے ہوئے ہیں یا وہ خود وجہ تکوینِ کائنات ذاتؐ ہے۔ دراصل مذاہب دانش کی تحفظ گاہ ہیں۔ انسان کا الہامی کتابوں اور معصوم ہستیوں کے ذریعے خدا سے ربط ہے۔ اس ربط میں تخلیق کار ثواب بنتی ہے اس لیے فن اور مہارت کو شامل نہ بھی کیا جائے تو سہل بیانیہ انداز میں "بات" کر دی جاتی ہے۔ بہت سے مجموعے لکھے جا رہے ہیں میری مراد مجالس کے بعض ذاکر شاعران جو مدح اہلِ بیتؑ میں معروف موسیقی کی طرزوں پر سامعین کو جھومنے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ شاعر بھی جو باعثِ تکوینِ کائنات کی سیرت کو بیان کرتے ہوئے تلوار کی اس دھار کا خیال نہیں رکھتے جس میں ایمان کا اثاثہ محفوظ رہ سکے۔ محبتِ رسولؐ اور محبت خدا میں فرق حمد و نعت کے مابین حقیقی لکیر کو مدھم بنا دیتا ہے تاہم سرورِ انبیاء کی ذات اعلیٰ صفات کے اوصاف حمیدہ کا بیان نہ ہو تو ایمان کی سیڑھی کی شکست و ریخت ہوتی ہے جہاں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے مباحث میں نعت، منقبت اور سلام کے ان حوالوں کی جانب ہم جیسے طالبِ علموں کی توجہ مبذول کرائی ہے وہاں اپنی تنقید کے ذریعے معتبر حوالے فراہم کیے ہیں جن پر ہر شاعر اپنے فن کو خود بھی پرکھ سکے وہ سمجھ میں آنے والی اور دل میں اُترنے والی سہل زبان سے کام لے کر اک عقدۂ مشکل کو سب پر واضح کر دیتے ہیں۔ ہمارے روّیوں کی سنگ دلی میں اضافہ ہو رہا ہے اُدب کو ایسے ماحول میں زندہ رہنا ہے۔ ایسا ماحول جس میں زمین سے نمی غائب ہو رہی ہے۔ بڑا شاعر کہاں ہے؟ اس تلاش میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن دوسرے نقادوں کی نسبت زیادہ متحرک ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اور بجنل نقاد لفظوں کے اندر سخن کے موتی بھی دیکھ لیتا ہے اور وہ اضافی الفاظ بھی جو موتی تو ہوتے ہیں مگر سچے موتی نہیں ہوتے جس طرح ماہر فلکیات کو اب پلوٹو کے بونے سیاہ ہونے کا پتہ چل رہا ہے جس طرح کلوننگ سوسائٹی ایمان سے خالی نظام کا نتیجہ بن چکی ہے وجہ ہر عمل میں تعجیل بھی ہے اور ان ہی پیشواؤں کی تعلیمات سے دوری بھی۔ انسان نجانے کب سے خدا کو

لیبارٹری میں ٹیسٹ کرنے کے جنون میں مبتلا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ تصویر اپنے مصور کے بارے میں گمان کرے ...... ایسے بے سخن عہد میں جب لفظ کی حرمت سے زیادہ لفظ کا بار اسے حسن سے دور لے جا رہا ہے۔ رثائی، نعتیہ اَدب نہ صرف ہر جہان میں ہمارا نجات دہندہ بن سکتا ہے بل کہ ہمارے افکار کو آلودگی سے بچا سکتا ہے جس پر سیّد وحید الحسن ہاشمی کا مقامِ عرفان قابلِ ستائش ہے جب کہ ان کی شاعری میں تاثر کی شدت اور بیان کا فن کارانہ انداز اضافی خوشی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے ہمارے سامنے ان کی تخلیقات کی ناقدانہ آراء بیان کر کے اپنے والد گرامی کی اَدبی خدمات کا احاطہ بھی نہیں کیا بل کہ اَدب کے عہد میں ایمان کی ضوفشانی کو دل و دماغ پر مرتکز کیا ہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت وفن کا منظوم اعتراف

شفیق الرحمٰن الہ آبادی

◆◆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا شمار ان چند خوش نصیب ادیبوں میں ہوتا ہے، جن کی شخصیت اور فن کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کیا گیا، بل کہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ جدید نقادوں میں جس شخصیت کو سب سے زیادہ منظوم خراجِ تحسین پیش کیا گیا وہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہیں۔ آپ کی پوری زندگی علم واَدب اور اس کی ترویج سے عبارت ہے۔ آپ ایک اچھے معلم، اَدیب، محقق، نقاد، مدیر، منتظم اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ بحیثیت انسان بھی بہت خلیق ہیں۔

عصرِ حاضر میں ادیبوں اور دانش وروں کی کمی نہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ ادبا کے جم غفیر میں ڈاکٹر شبیہ الحسن عوام وخواص میں زیادہ مقبول ہیں۔ میرے خیال میں اس تکریم کا اہم سبب آپ کی غیر معمولی اَدبی وتخلیقی استعداد اور اعلیٰ اخلاق ہیں۔ پروفیسر فرقان احمد قریشی کے بقول:

> ''ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب اپنے مزاج، شخصیت اور فن میں منفرد، یکتا، بے مثال اور باکمال ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو ہر لحہ کام، کام اور صرف کام کے لیے وقف کر رکھا ہے۔''

آپ نے اُردو تنقید وتحقیق میں نہ صرف گراں قدر اضافہ کیا ہے بل کہ تنقید وتحقیق کو فکری اور سائنسی سمت دینے میں آپ کا نمایاں حصہ ہے آپ کی دو درجن سے زائد تصانیف آپ کی ادبی، تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت ہیں۔

اُردو شاعری میں کسی شخصیت کے محاسن اُجاگر کرنے کے کئی طریقے وضع کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر صنفِ قصیدہ میں تو شاعر اپنے ممدوح کے محاسن بیان کرنے میں اپنی جملہ شاعرانہ ہنر مندیوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ آپ محض غالبؔ، ذوقؔ اور سوداؔ کے ممدوحین کا مطالعہ فرما لیجیے۔ آپ خود دیکھیں گے کہ جو صفات قصیدوں میں بیان کی گئی ہیں، تمام ممدوحین ان صفات سے بے بہرہ ہیں۔ دراصل ان شعرا نے ''حسنِ طلب'' کی خاطر یہ صفات اپنے ممدوحین کی ذوات میں شامل کر کے خود داخلِ حسنات ہوگئے۔ شعرا کا یہ طرزِ عمل منفی ہے یا مثبت، اس

کا فیصلہ تو صائب الرائے ناقدین فرمائیں گے تاہم یہ بات بہر حال طے ہے کہ جس شاعری میں قلبی جذبات و احساسات شامل نہ ہوں اسے دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔

شخصیت سازی کے لیے شاعری میں صنفِ نظم کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ حالیؔ، اقبالؔ، جوشؔ، ساحرؔ، اخترؔ اور اسی قبیل کے دوسرے شعرا نے مختلف شخصیات پر مختلف ہیئتوں میں نظمیں لکھ کر اپنے ممدوحین کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ یہاں بھی وہی کیفیت ہے کہ دل سے نکلی ہوئی بات یادگار ہے ورنہ تمام شاعری دست بردِ زمانہ کا شکار ہوگئی ہے۔

میرے خیال میں جب کوئی شاعر کسی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے آئینۂ دل میں سجا لیتا ہے۔ اس کی پرستش کرتا ہے اور اُن کے محاسن کے جلوے دیکھتا رہتا ہے۔ جب خیالات اخلاص کی بھٹی میں پگھل جاتے ہیں تو وہ جلبِ منفعت یا حسنِ طلب سے لاتعلق ہو کر اپنے ممدوح کی اس طرح مدح سرائی کرتا ہے کہ اس کے حرف حرف سے حق و صداقت کی مہک آنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بھی ان چنیدہ شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے افکار و نظریات سے محض ناقدین ہی کو متاثر نہیں کیا بل کہ شعرا بھی ان سے متاثر ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ معروف شعرائے کرام نے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن پر بے لوثی کے ساتھ نظمیں لکھی ہیں اور ان میں موجود خلوص اس بات کا مظہر ہے کہ انھیں ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے محبت ہی نہیں بل کہ عقیدت ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کو شعری خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں قیصر بارہوی، ریحانؔ اعظمی، پروفیسر جعفر بلوچ، ڈاکٹر منظور حسین اسدؔ، سیّد ناصرؔ زیدی، مظفر نقوی، صادق جمیل، طاہر ناصر علی، تحسین یزدانی، رضا عباس رضا، اخترؔ ہاشمی، پروفیسر ظفر چشتی، واحد امیر، مراتب علی شاد، حشمت علی قیصر، نذیر ازفر، سلطان محمود اور سیّد عرفیؔ ہاشمی شامل ہیں۔ آپ ان منظومات کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ شعرا نے کتنے خلوص اور محبت کے ساتھ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے لیے گہر ہائے آب دار جمع کیے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ شعرا نے مختلف اصناف و ہیئتوں کے ذریعہ اپنی شاعرانہ ہنرمندیوں کی پیش کش بھی کی ہے۔ اس طرح یہ تمام منظومات فکر اور فن دونوں کا حسین امتزاج بھی ہیں اور نادر نمونہ بھی۔

اس مختصر مضمون میں، مَیں ان صاحب الرائے شعرا کرام کی نظموں کا ذکر کروں گا جس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت و فن کا منظوم اعتراف کرتے ہوئے آپ کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ریحانؔ اعظمی نے بارہ اشعار پر مشتمل نظم میں ڈاکٹر صاحب کی فکر اور علم و ادب سے محبت کو خوب اُجاگر کیا ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

تحقیق کے حوالے سے معروف تیرا نام
زندہ رہے گا ملکِ سخن میں یہ تیرا کام
منشور تیرا علم و اَدب کا فروغ ہے
اس عہد میں تو قاطعِ فکرِ دروغ ہے

پروفیسر جعفر بلوچ نے ''شام وسحر'' میں اپنا خاص نمبر شائع ہونے کی خوشی میں ڈاکٹر صاحب کو جو منظوم خط نما تبصرہ کیا ہے وہ نہ صرف ان کی عاجزی بل کہ ان کی معجز بیانی بھی ایک شعر دیکھیے:

جناب مکرم شبیہ الحسن
طلسم آفرینِ بساطِ سخن

ڈاکٹر منظور اسد نے اپنی نظم میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ آپ کے والد محترم وحید عصر سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

پتھروں کو تراشیں تو ہیرے بنیں
اور عبارت کو دیں لفظ کا پیراہن
ان کے والد گرامی ہیں مرثیہ گو
سجدہ گاہ جبیں ہے درِ پنجتن

سید ناصر زیدی نے ''شکریہ'' ردیف باندھ کر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ کچھ یوں ادا کیا ہے:

جناب شبیہ الحسن، شکریہ
طرف دارِ شعر وسخن، شکریہ
تعارف برا آپ نے چھاپ کر
نبھائی ہے مجھ سے لگن، شکریہ

مظفر نقوی نے اپنی نظم میں آپ کے ساتھ ساتھ ماہ نامہ 'شام وسحر' کا تذکرہ بھی کیا ہے:

ممنون ہوں احسان کی اس نے بھی نظر کی
کچھ روشنی مجھ پر بھی پڑی ''شام و سحر'' کی
ہے قلب مظفر میں شبیہ اس کی وفا کی
ہیں مجھ پہ عنایات بڑی ایسے بشر کی

آپ کی ساری زندگی علم وادب کی آبیاری میں بسر ہو رہی ہے صادق جمیل نے آپ کے اوصاف جمیلہ پر جو نظم لکھی ہے وہ بہت جمیل ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

جس بزم میں بھی ہو گی کہیں اہلِ فن کی بات
ہو گی وہاں ضرور، شبیہ الحسن کی بات
وہ نظم ہو کر نثر، ہے دونوں پہ دسترس
اور معتبر انھی سے ہے نقدِ سخن کی بات

ہرنا صر علی نے اپنی نظم میں آپ کی ہمہ جہت شخصیت کی چند پرتیں وا کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے اور آپ کے گردوں کو "باہنر" ٹھہرایا ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

دیارِ علم و ادب سے ترا تعلق ہے
جنھوں نے سیکھا ہے تجھ سے وہ باہنر ٹھہرے
ہمارے دل پہ کھلے تیری شخصیت کے رموز
رہِ سخن میں جو ہم تیرے ہم سفر ٹھہرے

تحسین یزدانی نے اپنی نظم میں آپ کے لیے وقارِ سخن، اعتبارِ سخن، آبشارِ سخن، جانِ سخن، قرارِ سخن، گوہرِ ب دارِ سخن، انحصارِ سخن، تاجدارِ سخن، بہارِ سخن، رازدارِ سخن اور یارِ سخن جیسی نادر تراکیب استعمال کر کے آپ کی شخصیت کو نہ صرف خوب صورت خراجِ تحسین پیش کیا ہے بل کہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔
خورشید بیگ میلسوی نے آپ پر باقاعدہ نظم تو نہیں لکھی لیکن اپنے ایک مطبوعہ مضمون بعنوان: ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک عظیم نقاد" میں آپ کی نذر یہ دو خوب صورت شعر کہے ہیں:

کس کے جلووں سے در و بام نظر ہیں روشن
کوئی خورشید، سرِ بزم درخشاں تو نہیں
کر رہا ہوں میں گُلِ حرف نچھاور تجھ پر
گو مرے شعر، تری شان کے شایاں تو نہیں

رضا عباس رضا نے منفرد انداز سے آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے جو شاعر کی قادرالکلامی کا ثبوت بھی ہے۔ رضا عباس رضا نے آپ کے اسمِ گرامی "شبیہ الحسن ہاشمی" کو نام کے حروف کی ترتیب سے شروع ہونے والے پہلے حرف سے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے مثلاً:

ش — شہرِ ہنر میں اک نیا لہجہ ہے، فن کے ساتھ
ب — برجِ شرف پہ لکھو، شبیہ الحسن کے ساتھ
ی — یہ بات اس کی نسلی شرافت بتائے گی
ہ — ہے عشق کس قدر اسے اپنے وطن کے ساتھ

اختر ہاشمی نے اپنی نظم میں یہ بیان کیا ہے کہ آپ میں کام کرنے کی لگن اور جذبہ بہت زیادہ ہے اور تبلیغِ سخن کے ساتھ ساتھ آپ ہماری قومی زبان اُردو کے تحفظ اور مفادات کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ بقول اختر ہاشمی:

ہے نام شبیہ اس کا، ہے اس باپ کا بیٹا
پیری ہے مگر کام کا جذبہ بھی بہت ہے

تبلیغِ سخن اس کے ارادوں کی ہے معراج
اُردو کے مفادات کا پیاسا بھی بہت ہے

پروفیسر ظفر چشتی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں انھوں نے پانچ اشعار پر مشتمل مختصر مگر جامع نظم لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی دانش وری اور علم سے دیوانگی کا ذکر کیا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

شبیہ خوش اَدا جیسے سیانے کم ہی دیکھے ہیں
جہانِ علم میں ایسے دوانے کم ہی دیکھے ہیں

واجد امیر آپ کو انیسؔ و دبیرؔ کا جانشین اور پرتو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ جانشینِ انیس و دبیر کا پرتو
کتابیں جس کا سدا اوڑھنا بچھونا ہیں

مراتب علی شاد نے نظم لکھ کر نہ صرف ڈاکٹر صاحب کو بلکہ ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں اور مداحوں کو بھی ''شادؔ'' کر دیا ہے۔ نظم کا پہلا بند دیکھیے:

ہو مرثیہ جدید کہ ہو نظم کی زمیں لکھتا ہے منقبت میں کبھی لفظ یہ حسیں
اشعار اس کے ہوتے ہیں نایاب و بہتریں شاعر ہے بے مثال، تو جدت کا ہے امیں
راہِ ادب میں فکر کا معمار ہے شبیہ

حشمت علی قنبر نے اپنی نظم میں جہاں ڈاکٹر صاحب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے وہاں پر یہ ذکر بھی کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب محبِ اہلِ بیت بھی ہیں:

یوں ڈاکٹر شبیہ ہیں اہلِ سخن کے ساتھ
جیسے ہو خوشبوؤں کا جزیرہ چمن کے ساتھ
مرکز ہے ان کی سوچ کا مولائے کائنات
گہرا شغف وہ رکھتے ہیں خیبر شکن کے ساتھ

نذیر اذفر آپ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے دعا گو بھی ہیں کہ:

وفادار و مخلص شبیہ الحسن
سدا ان پہ ہو سایۂ پنج تن
کروں ان کی تعریف کیا دوستو
نہیں ان میں بغض و ریا دوستو

سلطان محمود نے اپنی نظم میں اعتراف کیا ہے کہ ہمارے لفظ بے صوت اور بے زبان تھے، بے بختی سخن کی بھیک

مانگ رہی تھی ایسے میں ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ہمارے ہاتھ تھام کر ہمیں نہ صرف حوصلہ دیا بل کہ معتبر بھی کر دیا، سلطان محمود کی نظم محض تحسین یا مبالغہ آرائی نہیں بل کہ حقیقت پر مبنی ہے جو لوگ ڈاکٹر صاحب سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل کر چکے ہیں یا جن لوگوں کے آپ کے ساتھ قلمی روابط ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ایک علم دوست اور علم پرور شخصیت ہیں۔ آپ عاجزی اور انکسار کا پیکر ہیں اور قارئین اُدب کے دلوں میں اپنی تحریر کو منقش کرتے ہیں، آپ اپنے ہنر اور حُسنِ اخلاق سے دلوں کو تسخیر کر لیتے ہیں، آپ کی گفت گو، مضامین اور اداریے نہ صرف فکر انگیز ہوتے ہیں بل کہ سننے اور پڑھنے والوں کے سامنے فکروفن اور حروف و معانی کا ایک نیا جہاں وا کرتے ہیں۔

سید عرفی ہاشمی ممتاز دانش ور اور کہنہ مشق شاعر ہیں انھوں نے ڈاکٹر صاحب پر جو نظم تحریر فرمائی ہے بلاشبہ وہ لازوال نظم ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت وفن کے جملہ محاسن کو خوب دریافت کیا ہے اور دریافت کرنے کے بعد نتیجہ بھی نکالا ہے۔ نظم کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیں:

تجھے دریافت کرتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے

....

تجھے معلوم ہے کیا درد کی تجسیم ہوتی ہے
کہاں خونِ جگر سے ذات کی تفہیم ہوتی ہے
کہاں پر کائناتِ فکروفن تقسیم ہوتی ہے
کہاں سے علم ملتا ہے، کہاں تعلیم ہوتی ہے

اب ذرا مذکورہ نظم کا آخری معنی خیز بند ملاحظہ فرمائیں:

سو اب یہ سوچ رکھتے ہیں
کہ ہم بھی ایک قطرے سے زیادہ
کچھ نہ ہو کر
مستقل بے سمت بہتے ہیں
شعورِ نیستی کا درد سہتے ہیں
تجھے دریافت کرنے میں
سدا مشغول رہتے ہیں

مذکورہ بند میں سیدعرفی ہاشمی

ع   کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے

کے مصداق ڈاکٹر صاحب کی شخصیت وفن کو اُجاگر کرنے کے بعد اپنی عاجزی کا اظہار کررہے ہیں کہ وہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کو مکمل طور پر دریافت کرنے سے قاصر ہیں لیکن اس کے باوجود انھیں دریافت کرنے میں سدا مشغول بھی رہتے ہیں۔ دراصل اس نظم میں عرفی ہاشمی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے چند محاسن سے پردہ اٹھایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی عظمت ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی ہمہ جہت اَدبی شخصیت کی تفہیم کے باوجود عاجزی کا اظہار کیا ہے اور اس کے علاوہ اُردو اَدب اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ساتھ محبت کرنے والوں کو ''شبیہ شناسی'' کی دعوت بھی دی ہے اور ان شاء اللہ ''شبیہ شناسی'' کا عمل سدا جاری رہے گا اور ''دبستانِ شبیہ الحسن'' سے استفادے کی صورت نکلتی رہے گی۔

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی فکری جولانیاں

مصدق لاکھانی

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن سے میری ملاقات تین یا چار روز سے زیادہ پرانی نہیں لیکن اُدبی حلقوں میں ان کے چرچے کے حوالے سے جو تعارف ہے وہ مرے لیے نیا نہیں۔ اسی لیے بھائی ابو طالب نے جب مجھ سے ان کے بارے میں کچھ لکھنے کے لیے کہا تو بغیر پس و پیش کے مَیں نے ہامی بھر لی حالاں کہ ٹوٹی پھوٹی شاعری کے علاوہ مَیں نے قلم سے کوئی کام نہیں لیا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں یہ بات کم و بیش سبھی لکھنے والوں نے تسلیم کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ذہن اس بات میں سرگرمِ عمل رہتا ہے کہ کسی طرح تاریخِ اَدب کے صدف سے نئے نئے آب دار موتی تلاش کر کے منظرِ عام پر لائے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے تخلیقی اور تحقیقی جوہران کتابوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں جو اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں مفاہیم، ترجیحات، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، شام وسحر کی باتیں، آیاتِ آمنہ، بیسویں صدی کا شعری ادب، العطش، آغا صاحب، جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی، باقیاتِ آلِ رضا وغیرہ شامل ہیں۔

آج کی تحقیق و تنقید کی دنیا کے بارے میں بہت سوں کی طرح مرا اپنا بھی یہ خیال ہے کہ چند محققین کو چھوڑ کر اُردو اَدب کے اکثر محققین تن آسانی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہاں تحقیق کے مروجہ اصولوں سے سراسر بغاوت نظر آتی ہے لیکن تنقیدی بصیرت رکھنے والے اب بھی کچھ لوگ ہیں، جنھوں نے اَدب کے پرچم کو سربلند رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس لیے ان چند لوگوں میں سے ہیں کہ وہ اَدب پارے یا تخلیق کار کو اس کے انفرادی یا ذاتی خدوخال میں دیکھنے کی بجائے اسے اَدب کے وسیع کینوس پر رکھ کر بہ نظرِ غائر دیکھنے کے قائل ہیں۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بسا اوقات مطالعہ کرنے والے بغیر کسی طے شدہ لائحہ عمل کے مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں غیر منظم اور غیر مرتب تحریر معرضِ وجود میں آتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب راہ معین کر لیتے ہیں

اور ایک واضح نصب العین کے ساتھ اپنا تحقیقی اور تنقیدی سفر شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ جو گوشہ اُجاگر کر کے ہم تک پہنچاتے ہیں ان میں توانائی ہوتی ہے اور فکر انگیزی بھی۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن ان نقادوں اور محققین میں سے ہیں جو ادب کو ایک وسیع تر تہذیبی پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ تہذیبی اقدار سے اُن کی علمی وابستگی ان کی تحقیق و تنقید کو ایک نہج عطا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ پامال موضوعات پر قلم اُٹھانے کی بجائے زیادہ تر ان شخصیات کو تحقیق و تنقید کا موضوع بناتے ہیں جس پر پہلے بہت کم لکھا گیا ہو۔ اس کوشش میں بسا اوقات وہ نئی معلومات فراہم کرتے ہیں یا کسی ایسے زاویے کو سامنے لاتے ہیں جس میں تنقیدی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ بات نہایت اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاں موضوعات کا خاصا تنوع ہے اور کئی سطحوں پر تحقیق، تنقید اور تخلیق کے کام میں منہمک ہیں، تنوع کا عمل وہیں مل سکتا ہے جہاں لکھنے والے کی اپنی اُدبی بنیاد ہو۔ وہ ہمہ جہت مطالعہ کا عادی ہو۔ بہت سے علم سے وہ آشنائی رکھتا ہو۔ اس کا ایک اَدبی خاندانی پسِ منظر ہو۔ وہ مکتب کی کرامت سے زیادہ فیضانِ نظر کو ایک سرچشمہ قرار دے کر اپنے ذہن کو سیراب اور اپنی فکر کو شاداب رکھتا ہو۔ فنی ریاضت اور دلی خلوص اس کی ذات کا جوہر ہو۔ سچائی اور بے خوفی اس کے خمیر و ضمیر میں رچی بسی ہو اور وہ اعتماد کے ساتھ اپنی بات کہنے اور اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کے اعلیٰ وصف کا حامل ہو۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ نعمتیں بہت وسعت اور کثرت کے ساتھ ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اَدب کے اس مسافر نے دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا راستہ طے کر لیا ہے کہ بہت سے رہ روانِ سست رفتار کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے یہاں کسی بھی شخصیت پر قلم اُٹھاتے ہوئے یہ اہتمام ہوتا ہے کہ پورا مضمون ایک منطقی ترتیب اور استدلالی تنظیم میں منسلک نظر آتا ہے۔ اسی تنظیمی وحدت کا یہ اثر ہے کہ کہنے کے لائق کوئی بات اور ظاہر کرنے کے لائق کوئی گوشہ نظر سے مخفی نہیں رہتا۔ ڈاکٹر شبیہ جس شخصیت کو موضوع بناتے ہیں اس کا مکمل شخصی خاکہ پیش کر دیتے ہیں۔ بچپن، عمر کے مختلف مدارج اور تعلیم و تربیت سے لے کر اس شخصیت کے تہذیبی اور معاشرتی پس منظر تک سب کا ذکر ہوتا ہے۔ اس مرحلے سے گزر کر ڈاکٹر شبیہ اس عہد کے علمی، اَدبی اور تہذیبی اثرات و مظاہر کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں اور ان اثرات کا ذکر کرتے ہیں جو اس شخصیت نے اس ساحل سے قبول کیے ہوں۔ ساتھ ساتھ وہ اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ اس شخصیت نے اس کمال تک پہنچ کر اُس مخصوص عہد کو کیا دیا اور ان ہی مناظر سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مقالہ نگاری میں توازن پیدا ہوتا ہے وہ جہاں جہاں مناسب سمجھتے ہیں مختلف تصانیف پر اپنی رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ نثر و نظم کے نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔ غیر مطبوعہ قلمی مسوّدوں کا بھی سراغ لگاتے ہیں اور یہ سارے دُکھ جھیل کر نذرِ قارئین کر دیتے ہیں۔

مقالہ نگاری میں جس بات کی بڑی اہمیت ہے وہ اَسناد اور حوالہ جات ہیں اور یہی دراصل محقق کی اصل دریافت ہوتی ہے کہ وہ کس منزل پر کھڑا ہے۔ اس کے ذہن و حافظہ میں کتنی قوت ہے۔ ڈاکٹر شبیہ کے ہاں حوالہ جات کے انبار نظر آتے ہیں اور اس طرح اپنی بات کو کسی وکیل کی طرح ثابت کرتے چلے جاتے ہیں۔ مقالہ نگاری ایک تحقیقی اور علمی سطح کا بلند پایہ عمل ہے۔ اسی لیے عموماً زبان مشکل اور بیان پیچیدہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے ہاں آسان زبان اور سادہ بیان پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ اپنی مقالہ نگاری میں نرم روی اور حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہیں۔ وہ زوردار الفاظ یا دبنگ الفاظ سے کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے بل کہ اپنی روایتی وضع داری کو قائم رکھتے ہیں اور اکثر مصالحانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں۔

غرضیکہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیق و تنقید ان کے طبعی رجحانات اور باطنی میلانات کی آئینہ دار ہے۔ ان کی کتابیں اور مقالات سے ان کے من پسند موضوعات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اَدب کے وسیع میدان میں خانہ پری کرنے کی بجائے ایک کونے میں بیٹھ کر چن چن کر اَدب پارے جمع کرنے کو ترجیح دی ہے۔ ان کی کامیابی کی بڑی وجہ بھی یہی ہے۔

(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور نومبر ۲۰۰۳ء)

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی رثائی خدمات

محمد اصغر انیس

◆◆

تاریخ اُدب کے سرسری مطالعہ سے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُردو مرثیہ جیسی متنوع الجہات اور وسیع المعانی صنفِ سخن اپنے عظیم تخلیقی سرمائے کے باوصف تحقیقی اور تنقیدی ہر دو اعتبار سے عدم توجہی کا شکار رہی ہے۔ حالاں کہ یہ علمی واَدبی اثاثہ ایک ایسا بیش بہا خزانہ تھا جس سے ناقدین اور محققین جواہر پارے چن چن کر اُردو اَدب کو مالا مال کر سکتے تھے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا بل کہ رثائی اُدب کے حوالے سے دونوں افراط وتفریط کا شکار ہوئے۔ گروہی نکتہ نظر نے مرثیے کے مقام و مرتبے کے تعین میں ابہام پیدا کیا۔ ایک گروہ نے صرف عقیدت کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کے اَدبی پہلو سے صرف نظر کیا تو دوسرے گروہ نے اس کو فقط رونے رُلانے کی شاعری قرار دے کر محدود کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام فکری مغالطوں کے باوجود رثائی اُدب کا قافلہ پوری شان وشوکت کے ساتھ رواں دواں رہا جس کی وجہ اس کا وہ مضبوط فکری پس منظر ہے جو اس کائنات میں رونما ہونے والے عظیم واقعہ سے مربوط ہے جو بجائے خود آفاقی وسعتوں کا حامل ہے۔ اسی آفاقیت اور ارفع انسانی اقدار سے مضبوط انسلاک نے ہر دَور میں معانی و مفاہیم کی نئی سطحوں کو متعارف کروایا ہے۔ عرب اور ایران سے ہوتی ہوئی یہ صنفِ سخن جب ہندستان میں رواج پذیر ہوئی تو شاہی سرپرستی اور عقیدت کے گہرے رجحان نے اس میں تجزیاتی اُسلوب کو پنپنے نہ دیا۔ کم وبیش یہی صورتِ حال دہلی اور لکھنؤ میں برقرار رہی جس کے نتیجے میں اُردو مرثیے کا ضخیم تخلیقی سرمایہ وجود میں آیا۔ ان مراثی میں واقعات بیانیہ انداز لیے ہوئے ہیں۔ روایات کی بھرمار ہے، محققانہ اور ناقدانہ اندازِ نظر مفقود ہے۔ اس دَور میں کچھ اساتذۂ فن نے سرسری انداز میں ان نقائص کی نشان دہی کی ہے جو اُس دَور کے رثائی اُدب میں رواج پا چکے تھے لیکن یہ آرا ناکافی تصور کی جائیں گی کیوں کہ مرثیہ نگاروں کی اکثریت نے ان اصولوں کا التزام ضروری نہ سمجھا۔ میر تقی میر اور محمد رفیع سودا کے نام اس ضمن میں لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اپنے دیباچوں میں صنفِ مرثیہ کیلئے چند اصول متعین کرنے کی کوشش

کی، یہ ابتدائی نوعیت کی کاوشیں گہری عقیدت کے رنگوں کو دھندلا نہ سکیں۔ خلیق و ضمیر کے دَور سے لے کر انیس و دبیر تک بھی مرثیہ نگار واقعات کے بیان کو ہی مرثیہ نگاری کا حقیقی منشا تصور کرتے رہے ان کے بعد آنے والے مرثیہ نگار مضامین میں تنوع اور جدّت تو پیدا نہ کر سکے لیکن ''ساقی نامہ'' اور ''بہاریہ'' کا اضافہ کر کے اپنی الگ شناخت بنانے کی سعی کرتے رہے البتہ اس دَور کی شاعری میں ایک خاص بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ بعض مرثیہ نگاروں نے روایات کی چھان پھٹک شروع کی چناں چہ واجد علی شاہ نے شہزادۂ قاسم کے مرثیے میں ان کی شادی کی روایت کو خلاف حقیقت ہونے کا برملا اظہار کیا ہے۔ اس دَور میں مغربی علوم کی ترویج نے جہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی پر گہرے اثرات مرتسم کیے وہاں اَدبی حوالے سے بھی بہت سی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ سرسیّد احمد خاں کی عقلی اور منطقی تحریک نے استدلال کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ مروجہ اصنافِ اَدب پر استدلالی انداز میں رائے زنی کے رواج کو فروغ حاصل ہوا۔ سرسیّد کے مکتبۂ فکر کے اثرات ان کے معاصرین اور متاخرین میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ آزاد، حالیؔ اور شبلیؔ کی کاوشیں اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے پہلی مرتبہ ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر دلائل و براہین سے دو عظیم مرثیہ نگاروں کے معائب و محاسن کو اُجاگر کیا۔ اگر چہ ان کی یہ کاوش عملی تنقید تک محدود رہی اور بہت سے ناقدین نے اس میں واضح فروگذاشتوں کی نشان دہی کی ہے لیکن اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی انھوں نے ''شعرالعجم'' لکھ کر مشرقی تنقیدی اصولوں کے برتنے کا طریقۂ کار متعارف کروایا۔ حالیؔ نے اپنے ہم عصروں سے زیادہ فہم و فراست کا ثبوت دیا انھوں نے مشرقی اور مغربی تنقیدی اصولوں کو یک جا کر کے مختلف اصنافِ اَدب کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ مقدمہ شعر و شاعری میں دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ مرثیے پر اُن کی آراء خالصتاً تجزیاتی اور نظری ہیں بل کہ حقیقی معنوں میں اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے جدید مرثیہ نگاری کے اصولوں کی نشان دہی کی تو بے جا نہ ہوگا۔ انھوں نے واضح طور پر مرثیہ نگاری کی پرانی روش ترک کر کے نئے سرے سے اس صنفِ سخن کو موزوں کرنے پر زور دیا۔ عبارت آرائی، مضمون آفرینی، ضعیف روایات رقم کرنے اور بے جا مصائب کے بیان سے احتراز کرنے کی تلقین کی۔ حالیؔ کے تنقیدی نظریات نے مستقبل کے اَدب پر خاطر خواہ اثرات مرتب کیے۔ بیسویں صدی کا سورج اپنے دامن میں بہت سی ہنگامہ خیزیاں لیے طلوع ہوا۔ نظریات اور خیالات میں تبدیلی کے آثار دکھائی دیے۔ مغربی تنقیدی مذاق کے زیر اثر علوم و فنون میں تحقیق و تجزیے کو فروغ حاصل ہوا۔ زبان و اَدب کے نئے ذائقے اور نئے سانچے متعارف کروائے گئے۔ تمام اصنافِ اَدب کو جدید تنقیدی اصولوں کے تحت پرکھا گیا۔ صنفِ مرثیہ میں بھی واضح تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ رثائی اَدب کے تخلیقی سرمایہ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ محققین اور ناقدین کی نئی کھیپ منظرِ عام پر آئی جنھوں نے مختلف مشرقی و مغربی اصنافِ اَدب سے صنفِ مرثیہ کا تقابلی جائزہ پیش کیا جس کے نتیجے میں اس صنف کی مختلف جہتیں کھل کر سامنے آئیں۔ ان ناقدین اور محققین میں کلیم الدین احمد، امداد امام

اثر، ڈاکٹر مسیح الزماں، نصیر الدین ہاشمی، حامد حسن قادری، فرمان فتح پوری، رشید موسوی، شارب ردولوی، مسعود حسن رضوی ادیب، جیلانی کامران، سیّد عابد علی عابد وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ جدید ناقدین اور محققین میں ڈاکٹر صفدر حسین، ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر ہلال نقوی، پروفیسر سردار نقوی، ڈاکٹر سیّد تقی عابدی، ڈاکٹر آغا سہیل، سیّد وحید الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے نام نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن عہدِ حاضر کے ایک اہم اور سنجیدہ فکر نقاد ہیں۔ متنوع الجہات تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی سرمایہ کے ساتھ ساتھ زود نویسی اور پُر گوئی نے متقدمین اور معاصرین پر ان کی فوقیت پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر شبیہ نے مرثیے کی تحقیق، تنقید اور تدوین کے حوالے سے جو اہم سنگِ میل عبور کیے ہیں موجودہ دور میں کسی بھی دوسرے نقاد یا محقق سے اُن کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک ایسے مستند حوالے کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جن کو نظر انداز کر کے حال اور مستقبل کا کوئی محقق اور نقاد صنف مرثیہ پر گفت گو کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان کے تنقیدی اور تحقیقی شعور کی پختگی اور استناد کا کھوج لگائیں تو کہنہ مشقی، لگن اور جہدِ مسلسل کا ایک خوش کن اور حیرت ناک سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ علم و اَدب سے گہری دل چسپی اور لگاؤ ان کی وراثت ہے جسے اُن کی لگاتار اور شبانہ روز ریاضت نے بے پناہ نکھار بخشا ہے۔ جدید و قدیم اہلِ سخن کی علمی جہتوں کا احاطہ اور نئے رُخوں کا تعارف گویا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ اگر اس حوالے سے ان کے کام کا جائزہ لیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تحریر کی جاسکتی ہے اسی لیے راقم الحروف نے دانستہ اُن کے صرف ایک اَدبی رُخ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس مضمون کا مقصد بھی ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی رثائی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کرنا مقصود ہے۔ اس سلسلے میں شہزاد احمد کی یہ رائے نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یوں تو ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے اَدب کی کئی جہات میں کام کیا ہے مگر ان کا محبوب موضوع مرثیہ ہے اور پھر اس حوالے سے مرثیہ نگار بھی مرثیے میں ان کا یہ لگاؤ صرف اَدب کی حد تک نہیں ہے بل کہ اس میں دنیا بھر کے موضوع شامل ہوتے چلے گئے ہیں۔'' (فلیپ: اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار)

درج بالا بیان کی تصدیق ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی رثائی موضوع پر تحریر کی گئی تقریباً ڈیڑھ درجن کتب کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ان کتب کا مختصر جائزہ قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتا ہوں تاکہ رثائی اَدب کے حوالے سے عہدِ حاضر کی اس اہم شخصیت کی کاوشوں کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

نام ور مرثیہ نگار سیّد نسیم امروہوی کی یاد میں تحریر کردہ ''بجھی وہ شمع'' نامی کتاب ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مرثیہ نگار سے دلی عقیدت کی آئینہ دار ہے۔ ۸۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اظہار سنز نے جون ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ انتساب معروف شاعر قیصر بارہوی کے نام کیا گیا۔ یہ کتاب اجمال میں تفصیل کی آئینہ دار ہے۔ پس و پیش کے عنوان سے ڈاکٹر شبیہ کا رقم کردہ دیباچہ بھی لائق مطالعہ ہے۔ کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن

میں سید نسیم امروہوی کے حیات وفن کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اکابرین اُدب کی وقیع آراء درج کی گئی ہیں۔ آخر میں مرثیہ نگار کا منتخب کلام، اوراقِ گل کے عنوان سے مرتب کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب سید نسیم امروہوی کے فکر وفن کے حوالے سے ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ کتاب بہ یک وقت خراجِ تحسین بھی ہے اور مرثیہ نگار سے دلی عقیدتوں کا اظہار بھی جسے ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن نے بڑی دیدہ ریزی اور خلوص کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

قیصر بارہوی (مرحوم) کے معروف مرثیہ ''آیاتِ آمنہؑ'' کے تعارف میں مرتبہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کتاب ۱۹۸۸ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ ۲۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو سفینہ پبلی کیشنز لاہور نے شایع کیا۔ انتساب سید وحید الحسن ہاشمی کے نام کیا گیا۔ ''آیاتِ آمنہؑ'' تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اُردو مرثیہ کی اہمیت اور جدید اُردو مرثیے میں قیصر بارہوی کے مراثی کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا ہے۔ دوسرے حصے میں مرثیے کا متن جناب آمنہؑ کے شخصی کارناموں کے ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں ناقدین کی وقیع آراء کو درج کیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر میمونہ انصاری، پروفیسر سجاد رضوی شامل ہیں۔

تنقیدی وتجزیاتی مضامین پر مشتمل ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ''مفاہیم'' ۱۹۸۹ء میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اختصار اور جامعیت کا یہ مرقع اظہار سنز، لاہور نے اٹھانویں صفحات کی ضخامت کے ساتھ شایع کیا۔ کتاب کا انتساب معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر وحید قریشی کے نام سے کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ''باتیں'' کے عنوان سے مصنف نے اس کتاب کی وجہِ تصنیف بیان کی ہے۔ کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر آغا سہیل کا رقم کردہ ہے جب کہ مختلف موضوعات پر سات مضامین تحریر کیے گئے ہیں جن میں سے تین کا تعلق صنفِ مرثیہ سے ہے۔ ''اُردو مرثیہ (ایک تمہید)'' میں مرثیے کے تہذیبی پس منظر کے حوالے سے اس صنف کا تعارف پیش کیا گیا ہے جب کہ دوسرا مضمون ''مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ'' میں تحقیقی اور تجزیاتی انداز اپنایا گیا ہے جب کہ تیسرے مضمون ''مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں'' میں بھی کم وبیش یہی انداز برقرار ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب ایک اچھی کاوش ہے اور مرثیے سے دل چسپی رکھنے والوں کو نئی معلومات فراہم کرتی ہے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی مرتبہ 'منتخب مرثیے' قیصر بارہوی کے دس مرثیوں کی ترتیب و تدوین پر مشتمل ہے۔ ۱۹۹۱ء میں قیصر بارہوی گولڈن جوبلی آرگنائزیشن لاہور کے زیرِ اہتمام شایع شدہ یہ کتاب ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا ''حرفِ سپاس'' کے نام سے ایک مضمون کتاب کے آغاز میں شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کا وقیع دیباچہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے تنقیدی شعور کا آئینہ دار ہے جس میں قیصر بارہوی کے مراثی کا تحقیقی مطالعہ، مرثیہ گوئی کا فن اور دوسرے شعرا سے ان کا تقابل کر کے عہدِ حاضر میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین

کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں قیصر بارہوی کی سوانح کا سرسری تذکرہ شامل ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے والدِ گرامی سید وحید الحسن ہاشمی جو بلاشبہ عہدِ حاضر کے بلند پایہ مرثیہ نگار ہیں ان کے جدید مراثی کی تدوین بلاشبہ فنِ مرثیہ نگاری میں ایک اہم کارنامہ ہے۔ ''العطش'' نامی یہ کتاب جلد اول، دوم اور سوم تین مراحل میں پایۂ تکمیل کو پہنچی جلد اول ۱۹۸۹ء میں شایع ہوئی جس میں گیارہ مرثیے ہیں۔ جلد دوم میں کل گیارہ مراثی ہیں، یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں الحبیب پبلی کیشنز لاہور نے شایع کی۔ ۲۶۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ''حرفِ مدعا'' کے عنوان سے سید وحید الحسن ہاشمی کے معروضات پیش کیے گئے ہیں۔ اس حصے میں ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر مظفر عباس کے اُردو مرثیہ کے حوالے سے دقیق مضامین بھی شامل ہیں اس کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگار کے فن پر بڑی صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ العطش جلد سوم میں سید وحید الحسن ہاشمی کے آٹھ مراثی ہیں۔ اس کتاب کو الحبیب پبلی کیشنز، لاہور نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر شبیہ کا طویل مقدمہ ہے۔ جس میں وحید الحسن ہاشمی کے مراثی کی فہرست، سنِ تخلیق اور بندوں کی تعداد درج کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ وحید الحسن ہاشمی کے فنِ مرثیہ نگاری پر تنقیدی حوالے سے بحث کر کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ کتاب کا تیسرا حصہ فکر و فن کے نام سے ہے۔ جس میں انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر حسن رضوی نے سید وحید الحسن ہاشمی کی رثائی جہتوں کا بڑے منفرد انداز میں احاطہ کیا ہے۔ یہ مضامین وحید الحسن ہاشمی کے فن کی تفہیم میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ العطش کی تینوں مذکورہ جلدوں کو ضم کر کے ''العطش'' کلیاتِ مراثی کے نام سے ایک انتہائی دیدہ زیب اور ضخیم کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی مرتبہ یہ کتاب اپنے معیار کے اعتبار سے بلند پایہ کاوش ہے۔ چالیس مرثیوں پر مشتمل اس کتاب کو الحسن پبلی کیشنز نے ۲۰۰۵ء میں پورے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ نفیس اور اعلیٰ معیار کے کاغذ اور طباعت نے کتاب میں تقدس کی شان پیدا کر دی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''یہ الہامی کتابوں کی طرز پر شایع کی گئی ہے جسے رحل میں رکھ کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔''

۲۴۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو شیخ مبارک علی، ثریا بیگم، سید ابوالحسن نقوی اور سیدہ اخلاص فاطمہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔ ''العطش'' کا مبسوط مقدمہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی و تنقیدی مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ بڑے سائز کے کاغذ پر سو صفحات مع حواشی و تعلیقات پر مشتمل یہ مقدمہ اپنے اندر ایک جہانِ معانی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں سید وحید الحسن کے سوانحی حالات اور فن کو اس انداز میں رقم کیا گیا ہے کہ یہ مقدمہ وحید شناسی کے سلسلے میں بنیادی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چالیس مراثی کا فکری و فنی جائزہ بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جدید مختصر مرثیے کے حوالے سے وحید الحسن ہاشمی کے نہ صرف مقام و مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے بل کہ اُن کے مراثی کے حوالے سے بہت سی تند و تیز تنقیدی آراء کا شافی جواب بھی فراہم کیا گیا ہے۔ مزید برآں ہر مرثیے

کے ساتھ کسی معتبر اور بلند پایہ نقاد کی رائے بھی درج کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے ایک بھرپور کاوش کہلائے جانے کے لائق ہے۔ اگر اس کو تحقیق و تدوین کا نادر نمونہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی اور احمد ندیم قاسمی ''حقیقت یہ ہے کہ اگر ''العطش'' شایع نہ ہوتی تو اُردو مرثیہ ایک بیش قیمت دستاویز سے محروم رہ جاتا۔''

''کلیاتِ حبیب'' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شایع ہونے والی کتاب میں حبیب جون پوری کی شعری جہتوں کے ساتھ ساتھ مذہبی شاعری کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ حبیب پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام شایع ہونے والی اس کتاب کی ترتیب و تدوین بھی ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیقی کاوشوں کا ثمر ہے۔ اس کتاب کو آرزو لکھنوی، سیّد وحید الحسن ہاشمی، پروفیسر ذوالفقار حسنین ہاشمی، ڈاکٹر باقر زیدی اور سیّد منقاد حیدر کے نام معنون کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے جن میں دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ آٹھ قصیدے اور اٹھائیس قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ متنوع موضوعات پر پانچ مبسوط مقالے بھی اس کتاب کی وقعت میں بیش بہا اضافہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے ان الفاظ میں درج ہے:

> ''کلیاتِ حبیب'' مرتب کر کے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اچھے شاعر سے ہمیں متعارف کرایا ہے اور ایک جوہر قابل کو مٹی میں ملنے سے بچالیا ہے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ''ترجیحات'' ۱۹۹۸ء میں اظہار سنز، لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ ۲۲۴ صفحات کی اس کتاب کو انھوں نے اپنے والدین کے نام معنون کیا ہے۔ اس میں سات نامور شعرا اور ادبا پر مضامین قلم بند کیے گئے ہیں۔ رثائی اُدب کے حوالے سے نسیم امروہوی کی شخصیت اور فن پر ''نسیم امروہوی...... ایک موضوعاتی مطالعہ'' کے عنوان سے اور قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری پر ''قیصر اقلیمِ مرثیہ۔ قیصر بارہوی'' دونوں مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ سیّد وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ متنوع اُدبی موضوعات میں مرثیہ نگاری کو شعوری طور پر اپنی تحریروں میں شامل رکھنا چاہتے ہیں جس سے اُن کے رثائی اُدب سے دلی لگن کا اظہار ہوتا ہے۔ نیز وہ دیگر اصنافِ سخن کا تذکرہ کرتے وقت صنفِ مرثیہ کو قطعاً نظر انداز نہیں کرتے۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں نے اس کتاب کے فلیپ پر ان الفاظ میں اُن کی اس کاوش کو تسلیم کیا ہے۔ ''شبیہ الحسن ان نقادوں اور محققین میں سے ہیں جو اُدب کو ایک وسیع تہذیبی پسِ منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ تہذیبی اقدار سے ان کی علمی وابستگی ان کی تحقیق و تنقید کو ایک نہج عطا کرتی ہے۔''

عہدِ حاضر کے معتبر اور اہم مرثیہ نگار قیصر بارہوی کے گیارہ مراثی پر مشتمل 'معتبر مرثیے' نامی کتاب کی ترتیب و تدوین بھی ڈاکٹر شبیہ الحسن کی رثائی خدمات کے سلسلے میں اہم حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۹۹۸ء میں قیصر بارہوی پبلی کیشنز نے اسے ۲۵۶ صفحات کے ساتھ شایع کیا جس کا انتساب جدید مرثیہ نگاروں کے نام سے یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مقدمہ اور دوسرے میں قیصر بارہوی کے گیارہ مراثی ہیں۔ ڈاکٹر

شبیہ الحسن اس کتاب کے مقدمے میں رقم طراز ہیں :

''قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری جدت وکلاسیکیت کا حسین امتزاج تھی ...... خاص طور پر غزل کا رچاؤ اور قصیدہ کا طنطنہ انتہائی حسین امتزاج کے ساتھ ان کے مرثیوں میں جلوہ افروز ہوا۔''

ڈاکٹر مظفر عباس نے اس کاوش پر ڈاکٹر شبیہ الحسن کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔''معتبر مرثیے'' کی ترتیب وتدوین میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا کام انتہائی وقیع ہے۔انھوں نے بڑی عرق ریزی سے قیصر بارہوی کے فن کے بارے میں ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جو خاصہ کی چیز ہے۔''

''باقیاتِ آلِ رضا'' جون ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کی وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے مرثیہ نگار کا غیر مطبوعہ کلام پوری صحت کے ساتھ شایع کیا ہے۔ ۲۸۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو الحسن پبلی کیشنز نے شایع کیا۔کتاب کا انتساب سید ہاشم رضا اور محترمہ رعنا زیدی کے نام ہے۔یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں ڈاکٹر شبیہ الحسن کا طویل مقدمہ ہے جب کہ دوسرے حصے میں سید آلِ رضا کے کلام کی صنف وار تدوین کی گئی ہے جن میں علاوہ دیگر اصناف کے دو حمدیں، پانچ نعتیں، چونتیس منقبتیں، انچاس سلام، ایک نوحہ، چوہتر رباعیات، اور تین شخصی مرثیے شامل ہے۔رثائی اَدب میں یہ کتاب منفرد اہمیت کی حامل ہے۔

رثائی خدمات کے حوالے سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ایک اہم سنگِ میل اس وقت عبور کیا جب ۲۰۰۲ء میں اظہار سنز، لاہور کے زیرِ اہتمام ان کی ۳۳۶ صفحات پر مشتمل کتاب ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' شایع ہوئی۔ یہ ایک ایسی کاوش ہے جس کو نظر انداز کر کے عہدِ موجود کی مرثیہ نگاری پر قلم نہیں اٹھایا جاسکتا۔آٹھ تحقیقی اور تنقیدی مقالات پر مشتمل یہ کتاب رثائی اَدب میں اہم اور مستند حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔اپنے مقالات میں صنفِ مرثیہ کا تقابل مختلف اصنافِ اَدب سے کروا کر ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اس کتاب کو بلند پایہ تصانیف کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔اس کے علاوہ پامال اور روایتی موضوعات سے انحراف کرتے ہوئے مرزا دبیر، آلِ رضا، نسیم امروہوی، قیصر بارہوی، سید وحید الحسن ہاشمی اور سیف زلفی کے مراثی میں نئے رُخوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔جس سے اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ندرت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔شہزاد احمد اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی یہ کتاب جدید اور کلاسیکی مرثیے پر ایک جامع کتاب ہے..... چناں چہ یہ کتاب مرثیے کا ایک تعارف بھی ہے، مرثیے پر تنقید بھی اور ان امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو مستقبل قریب میں رونما ہونے والے ہیں۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ''مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی'' ۲۰۰۵ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی ۲۲۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو الحسن پبلی کیشنز نے شایع کیا۔اس کتاب کے پہلے حصہ میں انھوں نے وجہ تصنیف بیان کی ہے اور دوسرے حصے میں سید وحید الحسن ہاشمی کے تین مراثی مع تبصرہ

پیش کیے گئے ہیں۔ ان مرثیوں میں زندگی، بچپن اور کشمکش شامل ہیں جن پر بالترتیب ڈاکٹر خیال امروہوی، ڈاکٹر نیر صمدانی اور ڈاکٹر سلیم اختر کی گراں قدر آرا بھی شامل اشاعت ہیں۔

''سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'' ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ایک اور قابلِ قدر تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے جس میں انھوں نے وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، مناقب اور سلام نگاری کو موضوع بنایا ہے۔ یہ کتاب ۲۴۴ صفحات کے ساتھ ۲۰۰۶ء میں الحسن پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام شایع ہوئی۔ اس کتاب میں سلام نگاری کی تاریخ کے حوالے سے سید وحید الحسن کے سلاموں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ''العطش'' جیسی ضخیم اور گراں بہا کلیاتِ مراثی کی تدوین کے بعد ''طاہرین'' کی ترتیب و تدوین بھی ڈاکٹر شبیہ الحسن جیسے حوصلہ مند مدوّن ہی کا کام ہے۔ یہ کتاب بھی اعلیٰ اور نفیس کاغذ پر انتہائی اہتمام سے شایع کی گئی ہے۔ ۶۲۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سید وحید الحسن ہاشمی کی نعتوں، مناقب اور سلاموں کی ترتیب و تدوین کی گئی ہے۔ اس کتاب کو الحسن پبلی کیشنز نے ۲۰۰۶ء میں شایع کیا۔ ''طاہرین'' کا طویل مقدمہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی وسعت اور رثائی اَدب سے دلی لگاؤ کا آئینہ دار ہے جس میں انھوں نے نعت نگاری اور سلام نگاری کے فن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ''طاہرین'' کے فلیپ پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی اس کاوش پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ان کی جملہ نعتیں، منقبتیں اور سلاموں کو یک جا کر کے ''طاہرین'' کے نام سے شایع کر دیا ہے...... باپ اگر پچاس کتابوں کا مصنف تھا تو بیٹے نے بھی تین درجن کی گنتی پوری کر لی ہے۔ انھوں نے اپنے والد صاحب کے کلام کی تدوین تو، کر کے محض حقِ فرزندی ہی اَدا نہیں کیا بل کہ اپنے والد کے علمی مرتبے کو متعین کرنے کے لیے نقادوں کا کام بھی آسان کر دیا ہے۔''

''العطش'' اور ''طاہرین'' کے مطالعے کے بعد رثائی اَدب سے دل چسپی رکھنے والے قارئین اس بات کا فیصلہ اچھی طرح کر سکتے ہیں کہ مذکورہ دو کتب جیسی تصانیف خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہیں کیوں کہ ان کتب کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ رثائی اَدب سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کو فقط دل چسپی ہی نہیں بل کہ جنون کی حد تک عقیدت ہے جو ان سے ایسی کتاب کی ترتیب و تدوین از خود کرواتی ہے۔ اِن کتب کو پہلی نظر میں دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کام کس لگن اور مشقت کا متقاضی تھا۔ مرتب نے اپنی مشکلات اور مسائل کا تذکرہ کیے بغیر نہایت جاں فشانی اور چابک دستی سے اپنی پیش کش کو ہر اعتبار سے قابلِ توجہ بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔

۲۰۰۶ء میں ہی ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ۲۰۷ صفحات پر مشتمل کتاب ''سیف زلفی کے مرثیے'' منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب سیف زلفی کے مراثی کی تدوین اور تجزیہ کے حوالے سے قابلِ ستائش کاوش ہے۔ الحسن پبلی کیشنز لاہور کے زیرِ اہتمام شایع ہونے والی اس کتاب کا انتساب سیف زلفی کی اہلیہ محترمہ توفیق فاطمہ کے نام ہے۔ یہ کتاب اس حوالے سے نہایت قابلِ قدر کارنامہ ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے مرثیہ نگاری کی کاوشوں کو طاقِ نسیاں کی

زینت بننے سے بچا کر محفوظ کر دیا ہے۔ سیف زلفی کے مراثی تک رسائی اور پھر ان کی اشاعت ایک بے لوث اُدبی خدمت ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے ایک سو سے زائد صفحات پر محیط طویل مقدمے پر مشتمل ہے۔ اس مقدمے میں سیف زلفی کے سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ اُن کی شعری تخلیقات اور اصناف سخن کی خصوصیات بھر پور انداز میں اُجاگر کی گئی ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں سیف زلفی کے چار مرثیے پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل نے اس کتاب کے فلیپ پر ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

''پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن...... نے سیف زلفی کے بعض عسیر الحصول مرثیوں کا کھوج لگا کر ایک پُر مغز اور مدلل مقدمہ لکھا جو تحقیق و تدقیق کے علاوہ تنقید اور تخلیق کا بخوبی احاطہ کرتا ہے...... اُمید ہے کہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی اس کتاب سے اہلِ ذوق اور خصوصاً مرثیہ کے شائقین بیش از بیش فائدہ اٹھائیں گے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے رثائی اُدب کے حوالے سے جو طویل قلمی سفر طے کیا ہے اس میں منزل کا تعین کرنا فی الوقت ممکن نہیں ہاں البتہ سنگِ میل کی تعداد میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب تک جو تازہ سنگِ میل عبور کیا ہے وہ شاعرِ حسینیتؑ قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے اُن کی بیش قیمت مرتبہ کتاب ''قیصر اقلیم مرثیہ'' کے نام سے منظرِ عام پر آئی ہے یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں ۳۲۰ صفحات کے ساتھ الحسن پبلی کیشنز، لاہور نے شایع کی۔ کتاب کا انتساب معروف مرثیہ نگار اور نقاد ڈاکٹر ہلال نقوی کے نام کیا گیا ہے۔ قیصر بارہوی کے مراثی کو یک جا کر کے تقریباً تمام دستیاب کلام کو اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ قیصر بارہوی کے مراثی پر اس نوعیت کے کام کی مثال اب تک موجود نہیں اس اعتبار سے اولیت کا سہرا ڈاکٹر شبیہ الحسن کے سر ہے انھوں نے قیصر بارہوی کے بہت سے کلام کو زمانہ کی دستبرد سے بچانے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اُن کے اس جذبے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کتاب کو چار ابوب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابواب کی تقسیم سے پہلے ''معروضات'' کے عنوان سے ڈاکٹر شبیہ الحسن نے کتاب کی تخلیق کے اسباب بیان کیے ہیں۔ کتاب کا پہلا باب قیصر بارہوی کے حالاتِ زندگی اور ناقدین کی آراء پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں اُن کے ترپن مرثیوں کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اُردو مرثیے میں قیصر بارہوی کے اختصاص کو اُجاگر کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگار پر ناقدین کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کے بھرپور انداز میں جوابات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ چوتھے اور آخری باب میں قیصر بارہوی کے چار مختلف مرثیوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔ یہ کتاب قیصر بارہوی کے حوالے سے بالخصوص اور رثائی موضوع کے اعتبار سے بالعموم ایک اہم حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ انتظار حسین اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''قیصر بارہوی...... کے انتقال کے بعد لازم تھا کہ ان کے سارے کلام کو سمیٹا جاتا اور اس کا

سنجیدگی سے مطالعہ کر کے ان کے مرثیے کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم کی جاتی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے بارھوی (مرحوم) کے سارے مرثیوں کو سمیٹ کر اولاً سرسری تعارف کروایا ہے اور پھر دقتِ نظر کے ساتھ ان کا ایک تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی رثائی اُدب کے حوالے سے تمام تصانیف کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیں تو ایک خاص بات اُن کا اُسلوبِ نگارش ہے۔ وہ حتی المقدور سادہ اور رواں الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جس سے اُن کے مافی الضمیر کی تفہیم نہایت آسان ہو جاتی ہے۔ اس طرح دراصل وہ عام قاری کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ ناقدین کو اس اُسلوب میں عالمانہ شان کی کمی محسوس ہوتی ہو گی لیکن ایسی تحریریں جو اپنے اندر معانی کی گہرائی رکھنے کے بجائے صرف شکوہِ الفاظ کی پیش کش تک محدود ہوتی ہیں اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تحریریں بات کو سادہ لیکن استدلال اور حوالے سے پیش کرنے کی عمدہ مثال ہیں۔ اُن کا اپنا منفرد انداز ہے۔ وہ مقلد بننے کے بجائے مخترع بننا پسند کرتے ہیں۔ کسی تخلیق کار کے فن پارے کا تجزیہ کرتے وقت وہ ٹی ایس ایلیٹ کے اس قول کی پاسداری کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کے تحت تنقید کا مقصد اُدب پارے کی تنقیص کے بجائے تحسین کرنا ہے۔ تنقید کرتے وقت وہ تند و تیز لب و لہجہ اختیار نہیں کرتے بل کہ دھیمے انداز میں اپنی بات قاری کے دل و دماغ میں اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں ہم طوالت کے خوف سے اُن کے اسلوب کی صرف ایک مثال اُن کی معروف تحقیقی تصنیف ''اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار'' سے کریں گے:

> ''اُردو کے بعض ناقدین نے ڈرامے اور مرثیے میں بعض جزوی مماثلتیں تلاش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''مرثیہ'' دراصل ''المیاتی ڈرامہ'' ہے۔ اس طرزِ فکر میں لاکھ برائیاں سہی، مگر ایک خوبی بہر حال موجود ہے کہ ان ناقدین نے مرثیہ کا ایک خاص اندازِ فکر سے مطالعہ کیا ہے اور مرثیے کو ایک نئی جہت دینے کی سعی کی ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباس اگرچہ ایک مختصر مثال ہے لیکن اُن کی تمام تحریروں میں اسی ہی روانی اور استدلالیہ انداز باہم دگر ہو کر اپنے موضوع کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ مختصر مضمون ڈاکٹر شبیہ الحسن کی رثائی کاوشوں کا سرسری تعارف ہے۔ جس میں اس حوالے سے چند جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کیا گیا ہے لیکن ان کی مدونہ کتب اور تصانیف کو پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس سُرعت اور جاں فشانی سے اور مختصر عرصے میں انھوں نے یہ تمام اہداف حاصل کیے ہیں اُدبی حلقوں میں اس کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عہدِ موجود میں رثائی اُدب پر کام کرنے والے ان گراں قدر حوالوں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے اور اگر اسی رفتار سے اُن کا یہ سفر جاری رہا تو مستقبل کے طالب علموں کے لیے ان کی تحریریں ایک اثاثہ ثابت ہوں گی۔

◆◆◆

خراجِ تحسین

(ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے شعراء کا منظوم خراج تحسین)

قسیمؔ ابنِ نسیمؔ امروہوی

(نظم)

اس نظم میں فرازِ ہنر کا ہے تذکرہ — تابندگی فکر و نظر کا ہے تذکرہ
قرطاس پر قلم کے سفر کا ہے تذکرہ — نخلِ اَدب کے تازہ ثمر کا ہے تذکرہ

پی ایچ۔ ڈی جس کا حُسن، یہ ہے اُس چمن کا ذکر
لکھا ہے قلم شعار **شبیہ الحسن** کا ذکر

ہو کر دعا وحیدِ موّدت[1] کی مستجاب — بچپن میں کر گئی تھی عطا فکر کو شباب
تدوین اَن گنت تو ہیں تالیف بے حساب — تحقیق بے مثال ہیں تصنیف لاجواب

خدمات کے یہ زاویے جب منکشف ہوئے
دانش ورانِ قوم سبھی معترف ہوئے

تعلیم بیس سال کی کہتی ہے برملا — روشن رہے گا خیمۂ اُردو کا یہ دیا
تحقیق کی گواہ غزل گوئی رضاؔ[2] — تدوین کا بھی حُسن کلامِ رضاؔ بنا

اُردو جو بس گئی ہے ولا کے ایاغ میں
ظلمت شکن ضیا ہے شبیہی چراغ میں

(۱) جناب سیّد وحید الحسن ہاشمی (۲) سیّد آلِ رضاؔ

سادات کے صدف کا درخشندہ اِک گہر یعنی حَسب نَسب سے بھی ہے ذات معتبر
ماں باپ کی ہے تربیتِ خاص کا اثر ہے مسندِ معلم اُردو پہ جلوہ گر
تدریس میں ہے محو جو چوبیں سال سے
تابندہ کتنے رُخ ہیں شبیہی جمال سے

بحثِ اَدب کی بات ہو یا ہوں مذاکرے تقریرِ فی البدیہہ سے حرفوں کے گُل کھلے
سی ڈیز کی کتب میں جو محفوظ ہو گئے وہ عکسِ حرف مٹ نہیں سکتے شبیہ کے
حرفوں کو اس لیے بھی بقائے دوام ہے
فیچر کی بات قائدِ اعظمؒ کے نام ہے

تنقید و تبصرے ہوں مقالے کہ تجزیے جوہر نہاں تھے جو بھی وہ آئینہ کر دیے
جامِ بقا صحافتی خدمات کے پیے طاقِ ورق پہ جل گئے تحریر کے دیے
بخشی ہیں عزتیں یہ خدائے رؤف نے
چوما قلم شبیہ کا لاکھوں حروف نے

رُکنیتیں بھی آٹھ ہیں حاصل بصد وقار یہ عزم و ولولہ بھی ہے مضبوط و پائیدار
اُردو کی بَن سکے نہ کبھی مسجدِ ضرار فائز ہیں سولہ عہدوں پہ ایسے ہیں ذمہ دار
اعزاز آٹھ پائے کہ جو یادگار ہیں
ردِّ خزاں، یہ تمغۂ فصلِ بہار ہیں

یہ دیکھ کر قلم ہوئے کتنے رقم طراز اُردو کی خدمتوں کو ملی منزلِ فراز
بولے ُسنِ شعور کے لمحے بہ فخر و ناز ایّام دس ہزار ہیں اپنے اَدب نواز
تحریریں گونجتی ہیں، حسب کے دیار میں
لفظیں ہیں پانچ لاکھ قلم کے حصار میں

یہ پانچ لاکھ لفظ جو فرمائے مرحمت جتلا گئے شبیہ کی خدمات اَن گنت
ہے لائقِ ستائش و تحسین ہر صفت دو نام ہم صفت ہیں، شبیہ الحسن، لُغت
لفظیں سجا کے دامنِ فکرِ کمال میں
صدیاں، سمیٹ لی ہیں انچاس سال میں

نشوونمائے ذہن پہ مائل ہے زندگی زندہ رہے وطن کی زباں، ہے دعا یہی
پائی ہے ڈاکٹر کی سند سے یہ روشنی دیتی ہے داد لکھنؤ کی اُردو شاعری

اُردو ہے آسمان، ستارہ شبیہ ہے
الہام کی عطا کا سپارہ شبیہ ہے

پیراک جتنے بحرِ مقالات کے ہیں اب اُن میں سے پانچ ان کے ہیں شاگردِ خوش ادب
تدریس سے شبیہ کی یوں مطمئن ہیں سب پانچوں کو ہے تجلّیِ تحقیق کی طلب

میرے ذہن میں بات یہ اُن کے ذہن کی ہے
بیدار رہنمائی شبیہ الحسن کی ہے

مستقبلِ ادب کی طرف بھی دھیان ہے افکار کے پرند ہیں، اونچی اُڑان ہے
جب تو نظر میں اُردو کا ہر نوجوان ہے "فن کی جناں" شبیہ کا اپنا جہان ہے

موسم ہو پُر بہار نہ کیوں ان کے ذکر کا
سُوکھا شجر نہیں ہے کوئی باغِ فکر کا

نظم اور نثر دونوں ہی محبوب ہیں انھیں دونوں غذائیں ذہن کی مرغوب ہیں انھیں
دونوں پسند علم کے مشروب ہیں انھیں دونوں حرم طواف کو مطلوب ہیں انھیں

معیار ہے مطالعہ عالی جناب کا
نظریں طواف کرتی نہیں ہر کتاب کا

لکھیے نسیمؔ بات وہی، جس سے بے گماں ہو خوبیوں کا عکسِ **شبیہ الحسن** عیاں
ذاتِ شبیہ خدمتِ فن کی ہے کہکشاں ذوقِ ادب "شبیہ شناسی" سے ہے عیاں

آفاق میں "شبیہ شناسی" کی دھوم ہے
یہ دھوم دھام صدقۂ بابِ علوم ہے

◆◆

سیّد ناصر زیدی

(نظم)

تصنیفِ مرثیہ میں گزارے ہیں ماہ و سال
قیصؔر تھے شاعری کے حوالے سے باکمال

تھے مُبتلائے عشقِ شہیدانِ کربلا!
رہتا تھا اُن کے ذہن میں بس ایک ہی خیال

مظلومِ کربلا کی شہادت کی شان میں
وہ شعر ہوں رقم کہ جو کہلائیں بے مثال

عہدِ رواں میں مرثیہ کہتے تھے منفرد
یہ مرثیے ہیں یا کہ ہیں زخموں کا اِندمال

پڑھنے میں اُن کا ثانی و ہم سر کوئی نہ تھا
کیا شان تھی، شکوہ تھا اور کس قدر جلال

عُقدہ کھلا بہ حَقِّ مُحِبّانِ بارھوی
رشحاتِ فکر کو نہیں اُن کے کبھی زوال

ہے بے عدیل "قیصرِ اقلیمِ مرثیہ"
حاصل قبولِ عام ہو یا ربِّ ذوالجلال

ترتیب دے دیے ہیں جو قیصؔر کے مرثیے
ہے ڈاکٹر شبیہ کا یہ کام لازوال

ناصؔر میں گرچہ کوئی مقالہ نہ لکھ سکا
منظوم شکل میں تو نُمایاں ہے عرضِ حال

(مطبوعہ) ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور فروری۔ مارچ ۲۰۰۷ء

◆◆

سیّد ناصر زیدی

(نظم)

جناب **شبیہ الحسن**، شکریہ
طرف دارِ شعر و سخن، شکریہ

تعارف مرا آپ نے چھاپ کر
نبھائی ہے مجھ سے لگن، شکریہ

اس اعزاز کے گرچہ قابل نہ تھا
کری پھر بھی تائیدِ فن، شکریہ

محبت کی تحریر پڑھ کر لگا
ہوئے دُور رنج و محن، شکریہ

مرے مہرباں شیخ صفدر علی
جریدے کا ہیں بانکپن، شکریہ

اسیرِ روایات ہیں، لاجرم
نہ چھوڑیں گے رسمِ کہن، شکریہ

بڑے باپ کے وارثِ باادب
شبیہِ وحیدالحسن، شکریہ

عیادت محبِ گرامی سے ہو
تو کہنا وحیدِ سخن، شکریہ

ہے ناصرؔ بھی مدح سرا آپ کا
امامِ امامانِ فن، شکریہ

◆◆

جعفر بلوچ

(نظم)

ادیب، مئیں، شاعرِ خوش نوا
اَدب تجھ سے پاتا ہے نشوونما
پروفیسرانہ تری ہر ادا
بہ ہر بزم ہے آج چرچا ترا
شبیہ الحسن حبّذا، مرحبا

تو خیر آیت و خیر پرواز ہے
خوش انجام تیرا ہر آغاز ہے
بزرگوں کو تو باعثِ ناز ہے
تری ذات خُردوں کی ہے رہ نُما
شبیہ الحسن حبّذا، مرحبا

ترا رنگِ نعت و مناقب حسیں
طریقِ ادائے مطالب حسیں
مرصع، مزیّن، مناسب، حسیں
دل آویز ہے تیرا حُسنِ ثنا
شبیہ الحسن حبّذا، مرحبا

ترا ماہ نامہ ہے شام و سحر
یہ علم و اَدب کا ہے پیغام بر
چلا اس سے پاتے ہیں فکر و نظر

صحیفہ ہے یہ جامِ جم سے ورا
شبیہ الحسن حبّذا، مرحبا
یہ کیفِ بہار اور بھی ہو فزوں
یہ عزّ و وقار اور بھی ہو فزوں
ترا اعتبار اور بھی ہو فزوں
فروغ اور بھی ہو زیادہ ترا
شبیہ الحسن حبّذا، مرحبا

◆◆

پروفیسر جعفر بلوچ

(نظم)

جنابِ مکرم شبیہ الحسن — طلسم آفرینِ بساطِ سخن
دیا آپ نے چھاپ نمبر مرا — مرا ذکر "شام و سحر" میں کیا
مرا فکر و فن کیا ہے اور کیا ہوں مَیں — ثنا خواں بس اہلِ اَدب کا ہوں میں
جو توقیر اس کمتریں کی بڑھی — بڑائی ہے یہ اصل میں آپ کی
جناب وحیدالحسن ہاشمی — مرے پیش رو بھی ہیں مخدوم بھی
مرے شیخ میں شیخ صفدر علی — اَدب میں بھی ان کو سمجھیے ولی
غرض ہیں مرے دیدہ قلب و جاں — جو میرے محسن ہیں عیاں اور نہاں
مناسب نہیں اور طولِ کلام — میں کہتا ہوں پھر شکریہ، والسلام
دعا گوئے دیرینہ جعفر بلوچ
سدا خیر خواہانہ ہے جس کی سوچ

◆◆

اختر ہاشمی

(نظم)

اسلاف کے جذبوں کا شناسا بھی بہت ہے
اُردو کی وہ تہذیب پہ مرتا بھی بہت ہے

جملوں کی فصاحت پہ وہ رکھتا ہے نگاہیں
موزونیِ تحریر پہ شیدا بھی بہت ہے

وہ چاہتا ہے علم کا مرکز ہو ہر اک گھر
اُس کو روشِ جہل کا صدمہ بھی بہت ہے

اُس کی یہی خواہش ہے کہ یک جا ہوں مسلماں
تفریق کی باتوں سے وہ جلتا بھی بہت ہے

ہے نام شبیہ اُس کا، ہے اُس باپ کا بیٹا
پیری ہے مگر کام کا جذبہ بھی بہت ہے

اصحابِ مودّت کی بھی امداد ہے حاصل
تائیدِ الٰہی کا سہارا بھی بہت ہے

تبلیغِ سخن اُس کے ارادوں کی ہے معراج
اُردو کے مفادات کا پیاسا بھی بہت ہے

اختر جو لکھیں اُس نے کتابیں وہ بہت ہیں
اور اُس کا چمکتا ہوا چہرہ بھی بہت ہے

◆◆

ریحان اعظمی

(نظم)

اے ہاشمی گھرانے کے فرزندِ ارجمند
اہلِ اَدب کو فکر تری کیوں نہ ہو پسند

بے مثل دسترس ہے تری لفظیات پر
حاصل نہ کیوں عبور ہو تجھ کو لغات پر

تحقیق کے حوالے سے معروف تیرا نام
زندہ رہے گا ملکِ سخن میں یہ تیرا کام

منشور تیرا علم و اُدب کا فروغ ہے
اس عہد میں تو قاطعِ فکرِ دروغ ہے

حق بین و حق شناس ہے بے شک ترا قلم
ترسیلِ علم کا ترے ہاتھوں میں ہے علَم

امن و اماں میں فکرِ شبیہِ حسن ہے تو
جس پر خزاں نہ آئے کبھی وہ چمن ہے تو

فردِ عمل میں جتنی تصانیف ہیں تری
سایہ فگن ہے تجھ پہ یہ محنت وحید کی

آلِ رضا کے مخفی جو تھے رمزِ شاعری
تیرے قلم نے آج انھیں بخشی زندگی

سجاد و سیف قیصر و شاہد سے نام ور
ممنوں تیری فکر کے یہ صاحبِ ہنر

وہ بیسویں صدی کے سخن دانِ لکھنؤ   تحقیق تو نے کی تو ہوئے آج سرخرو
ہاں اس عمل میں تیرے قلم کا کمال ہے   پیوستہ تیری فکر سے ماضی و حال ہے

قاصر قلم ہے کیا لکھوں میں ان صفات پر
قطرہ رہے خموش سمندر کی بات پر

◆◆

ڈاکٹر مولانا سیّد محمد باقر زیدی

(نظم)

ہیں جو ابنِ نجی شبیہِ حسن
حفظ میں رکھ تو خالقِ ذوالمنن
ہیں شرافت میں بے عدیل و نظیر
اور سخاوت بھی اِن کی ہے روشن
جدِّ اعلیٰ علیؑ کے ہیں آثار
ان میں موجود بے گمان و سخن
ہیں فضائے اَدب میں بالا قد
گلشنِ ہاشمی کے سروِ چمن
وسعتِ قلب کی خدا نے عطا
عشقِ مولاؑ سے بھر گیا دامن
شاعرِ کربلا کے قدموں سے
راہِ تنقید ہو گئی روشن
دل سے باقرؔ کے یہ دعا نکلی
دے خدا اور اِن کو اوجِ سخن

◆◆

سیّد عرفی ہاشمی

(نظم)

(۱)

تجھے دریافت کرتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے
تجھے معلوم ہے کیا درد کی تجسیم ہوتی ہے
کہاں خونِ جگر سے ذات کی تفہیم ہوتی ہے
کہاں پر کائناتِ فکر و فن تقسیم ہوتی ہے
کہاں سے علم ملتا ہے، کہاں تعلیم ہوتی ہے

(۲)

تجھے دریافت کرتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے
ترے افکار کا اقدار سے رشتہ نہیں ٹوٹا
حقیقت کا لبِ اظہار سے رشتہ نہیں ٹوٹا
قلم کا حرمتِ افکار سے رشتہ نہیں ٹوٹا
ترے فن کا کبھی معیار سے رشتہ نہیں ٹوٹا

(۳)

تجھے دریافت کرتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے
تری تنقید سے روحِ دیانت پیار کرتی ہے
تری تحقیق سے چشمِ کرامت پیدا کرتی ہے
جہاں تو شعر لکھتا ہے ذہانت پیار کرتی ہے
تو وہ فن کار ہے جس سے شرافت پیار کرتی ہے

(۴)

تجھے دریافت کرتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے
قلم تیرا توازن کی زمیں ہموار کرتا ہے
اَدب تیرا تعصب کی نظر پر وار کرتا ہے
سخن تیرا ضمیرِ وقت کو بیدار کرتا ہے
تو سورج ہے اُجالوں کی رَوِش سے پیار کرتا ہے

(۵)

تجھے دریافت کرتے ہیں
تو یہ معلوم ہوتا ہے
تو نامعلوم سے مَعلوم تک رستہ بناتا ہے
تو دستِ فکر سے احساس کا چہرہ بناتا ہے
تجھے جو غیر لکھتے ہیں، انھیں اپنا بناتا ہے
تو قطرے میں اُترتا ہے اسے دریا بناتا ہے

(۶)

سواب یہ سوچ رکھتے ہیں
کہ ہم بھی ایک قطرے سے زیادہ
کچھ نہ ہوکر
مستقل بے سمت بہتے ہیں
شعورِ نیستی کا درد سہتے ہیں
تجھے دریافت کرنے میں
سدا مشغول رہتے ہیں

◆◆

پروفیسر ظفر چشتی

(نظم)

شبیہ خوش ادا جیسے سیانے کم ہی دیکھے ہیں
جہانِ علم میں ایسے دوانے کم ہی دیکھے ہیں
جہاں ہر آدمی ہے آسمانِ علم کا تارا
ہماری آنکھ نے ایسے گھرانے کم ہی دیکھے ہیں
ہمیں رہتا ہے اکثر گردشِ حالات کا شکوہ
پر اس کے ہونٹ پر ایسے بہانے کم ہی دیکھے ہیں
مگر حاصل تجربہ ہے اسے اتنے زمانوں کا
اگرچہ کہنے کو اُس نے زمانے کم ہی دیکھے ہیں
یہ آرائش اسی کی کاوشوں کا ہے ثمر ورنہ
ظفر شام و سحر اتنے سہانے کم ہی دیکھے ہیں

◆◆

رضا عباس رضا

(نظم)

ش شہرِ ہنر میں اک نیا لہجہ ہے، فن کے ساتھ
ب برجِ شرف پہ لکھو، شبیہ الحسن کے ساتھ
ی یہ بات اس کی نسلی شرافت بتائے گی
ہ ہے عشق کس قدر اسے اپنے وطن کے ساتھ
ا اُردو ادب سے اس کا نہیں ہے فقط لگاؤ
ل لپٹا ہے اس کا رزق بھی شعروسخن کے ساتھ
ح حاصل ہے دسترس اسے دینی علوم پر
س سیکھا ہے اس نے دنیوی فن بھی لگن کے ساتھ
ن نخلِ وفا کی شاخِ ثمرور ہے اس کی ذات
ہ ہے اس کے ساتھ سارا چمن، یہ چمن کے ساتھ
ا اخلاص و صدق اس کی زباں پر ہیں موجزن

ش شیریں سخن ہے خوش بوئے سروِ سمن کے ساتھ
م میری یہی دُعا ہے کہ صدقہ رسولؐ کا
ی یارب، رہے عروج شبیہ الحسن کے ساتھ

◆◆

طاہر ناصر علی

(نظم)

یہ سب کے دل کی دُعا کیسے بے اثر ٹھہرے
تُو جو بھی حرف لکھے بس وہ معتبر ٹھہرے

دیارِ علم و اَدب سے ترا تعلق ہے
جنھوں نے سیکھا ہے تجھ سے وہ باہنر ٹھہرے

تُو سب کے واسطے رکھتا ہے پیار کی دولت
جو تجھ کو سمجھے نہیں خود سے بے خبر ٹھہرے

وحیدؔ عصر کا سایہ رہے ترے سر پر
بہارِ علم ترے گھر میں عمر بھر ٹھہرے

ہے تیرا نام **شبیہ الحسن** اِسی باعث
ترے جمال پہ ممکن نہیں نظر ٹھہرے

یہ سارا فیض ہے تیری اَدب سرائے کا
کہ سنگ ریزے یہاں آتے ہی گہر ٹھہرے

ہمارے دل پہ کھلے تیری شخصیت کے رموز
رہِ سخن میں جو ہم تیرے ہم سفر ٹھہرے

رواں دواں ہے ترا کاروانِ علم و ادب
نہیں خبر کہ کہاں جا کے رہ گزر ٹھہرے

ملی ہے اُن کو ضیا آفتابِ تاباں سے
اِسی لیے کوئی اختر کوئی قمر ٹھہرے

ہر ایک دور نے دیکھا یہ معجزہ طاہرؔ
علی کے ماننے والے ہی دیدہ ور ٹھہرے

◆◆

نشاط واسطی

(نظم)

تُو کہ ہے خاورِ آسمانِ سُخن
نازشِ مِلّت و افتخارِ وطن
اے شبیہ الحسن اے شبیہ الحسن اے شبیہ الحسن

تیرا ہر شعر شاعری کی معراج ہے
تیرے سر پر سخن کا حسیں تاج ہے
تیری ہر نظم میں قنبری بانکپن اے شبیہ الحسن

شاملِ حال ہے پنجتنؑ کا کرم
تیرے اشعار میں شاعری کا بھرم
صدقہ آلِ عبا کا ہے تیرا سخن اے شبیہ الحسن

ہے دعا یہ مری تو سلامت رہے
تیرا فن شاعروں کی قیادت کرے
تو بنے دھر میں مرکزِ فکروفن اے شبیہ الحسن

◆◆

صادق جمیل

(نظم)

جس بزم میں بھی ہو گی کہیں اہلِ فن کی بات
ہو گی وہاں ضرور، شبیہ الحسن کی بات

وہ نظم ہو کہ نثر، ہے دونوں پہ دسترس
اور معتبر انہی سے ہے نقدِ سخن کی بات

پیشِ نظر ہے آپ کے مِلّت کا اتحاد
گُل کی نہیں، یہ کرتے ہیں سارے چمن کی بات

کہنے کو ایک فرد، مگر قافلہ صفت
تنہا انہی کی بات ہے اک انجمن کی بات

مصروف ہیں اَدب کی یہ خدمت میں رات دن
ہم نے سُنی ہی ان سے نہیں ہے تھکن کی بات

حُبِ وطن چھلکتی ہے، ایک ایک بات سے
کرتے ہیں اتنے پیار سے پیارے وطن کی بات

کرتے نہیں یہ ذکر کسی اور کا جمیلؔ
جب بھی سُنی ہے ان سے سُنی پنجتنؑ کی بات

◆◆

مظفر نقوی

(نظم)

ممنون ہوں احسان کی اس نے بھی نظر کی
کچھ روشنی مجھ پر بھی پڑی شام و سحر کی
ہے اس کی سخن دانی کے انداز نرالے
ہر موڑ پہ ہے دھوم بڑی اس کے ہنر کی
'قُم' کہہ کے اُٹھا دیتا ہے مُردوں کو جہاں میں
شاہد ہیں کتابیں یہاں کچھ اس کے ہنر کی
شاعر بھی ہے نقاد و محقق بھی بڑا ہے
شہرت ہے یہاں چاروں طرف اس کی نظر کی
سیتا ہے فقط چاکِ گریبانِ اَدب کو
رہتی ہے تلاش اس کو شریفانِ نظر کی
صحرا کی طرح رکھتا ہے دل اپنا کشادہ
امداد کرے آپ خدا، ایسے بشر کی
امید تو ہے میرے لیے بھی وہ لکھے گا
احسان کی جب میری طرف اس نے نظر کی

ہے قلبِ مظفر میں شبیہ اُس کی وفا کی
ہیں مجھ پہ عنایات بڑی ایسے بشر کی

◆◆

مظفر نقوی

(نظم)

قوی ہے دسترس تری علومِ نفسیات پر
ہے لطف جا بہ جا ترا اُدب کی کائنات پر
ادیب لطف لے رہے ہیں تیرے معجزات پر
اُدب کا تو سفیر ہے۔ شعور تیری ڈھال ہے
تو صاحبِ کمال ہے، تو روشنی مثال ہے

☆

تری نیاز مند یہ اُدب کی سرزمین ہے
ادیب بے نوا کی کاوشوں کا تو اَمین ہے

محققینِ فن میں تو عظیم و بہترین ہے
ہر ایک باکمال کا فقط یہی خیال ہے
تو صاحبِ کمال ہے، تو روشنی مثال ہے

☆

اُدب کی سرزمیں پہ ہیں اگرچہ چہرہ [illegible]یاں
مگر تجھے پسند ہیں، اُدب کی آب یاریاں
سکوں نثار تجھ پہ ہیں، شبوں کی بے قراریاں
اَدب کی تیرے ہاتھ میں زمین اور کدال ہے
تو صاحبِ کمال ہے، تو روشنی مثال ہے

☆

تجھے نہیں غرض کوئی جہاں کے شور و شین سے
تجھے یہ علم مل چکا ہے شاہِ مشرقین سے
تجھے یہ روشنی ملی ہے سب غمِ حسینؑ سے
ترے کمالِ ذات کی مثال ہی محال ہے
تو صاحبِ کمال ہے، تو روشنی مثال ہے

☆

بہار کا پیام تو ہے اے شبیہِ محترم
اُدب کا تو سنگار ہے تو ماورائے بیش و کم
اُدب کے شہر کی ضیا، اُدب کے حُسن کا بھرم
ہمیشہ تیری فکر میں بھی ماضی اور حال ہے
تو صاحبِ کمال ہے، تو روشنی مثال ہے

☆

تیرے قلم کے فیض سے اُٹھے ہوئے ہیں کچھ بشر
وہ خوش نصیب جو زمیں میں سو چکے تھے بے خبر
ترے کرم سے سج گئی ہے اہلِ فن کی رہ گذر
ترے قلم کی نوک میں وہ حُسن وہ جمال ہے
تو صاحبِ کمال ہے، تو روشنی مثال ہے

◆◆

ڈاکٹر منظور حسین اسد

(نظم)

آج ہیں زینتِ بزمِ اہلِ سُخن
نکتہ داں، نکتہ بیں، صاحبِ فکروفن

جن کی تنقید و تحقیق پر ہے نظر
وہ ہمیشہ اسی کام میں ہیں مگن

پتھروں کو تراشیں تو ہیرے بنیں
اور عبارت کو دیں لفظ کا پیرہن

اُن کے والد گرامی ہیں مرثیہ گو
سجدہ گاہِ جبیں ہے درِ پنجتن

بارگاہِ حسینؑ کے ذاکر ہیں وہ
سر پہ غازیؑ کا پرچم ہے سایہ فگن

معرفت کی بلندی پہ فائز ہیں وہ
اُن کی معراج ہے ذکرِ خیبر شکن

نعت گوئی میں بھی اُن کا ثانی نہیں
بزمِ تخئیل پھولوں کی ہے انجمن

جن کے بازو ترازو اَدب کے لیے
اِک شبیہ الحسن، اِک وحیدالحسن

◆◆

مراتب علی شاد

(نظم)

ہو مرثیہ جدید کہ ہو نظم کی زمیں
لکھتا ہے منقبت میں سبھی لفظ یہ حسیں
اشعار اس کے ہوتے ہیں نایاب و بہتریں
شاعر ہے بے مثال، تو جدّت کا ہے امیں
راہِ اَدب میں فکر کا معمار ہے شبیہ
ذہنِ رسا سے، علم کے موتی اُچھال کر
سوچوں کو اپنی فکر کے سانچے میں ڈھال کر
کہتا ہے شعر تازہ زمینیں نکال کر
لفظوں سے کھیلتا ہے، بہت دیکھ بھال کر
اِک نخلِ سایہ دار کی مہکار ہے شبیہ
بخشی غمِ حسینؑ نے، یہ اس کو روشنی
اس کو ملی ہے باپ سے ورثے میں شاعری
تقسیم یوں ہی کرتا رہے، علم و آگہی
دنیا میں اِک مثال بنے، اُس کی زندگی
ہر دردمند شخص کا غم خوار ہے شبیہ

◆◆

واجدامیر

(نظم)

وحیدِ عصر کی کامل شبیہ جس کی ہے
متاعِ نقد و نظر، دولتِ زبان و بیاں
کہاں ہمیشہ کسی کو نصیب ہوتی ہے
زمامِ شعر و سخن پر گرفت ہے جس کی
وہ جانشینِ انیسؔ و دبیرؔ کا پرتو
کتابیں جس کا سدا اوڑھنا بچھونا ہیں
قلم سے ربط، تعلق ہے روشنائی سے
چراغِ علم ،جلاتا ہے جو اندھیروں میں
محبت اس کی ہے طاقت، وفا ہے اس کا اصول
غلامِ فاتحِ خیبر، فدائے آلِ رسولؐ
کمال رنگِ مشیّت نے اس کو بخشا ہے
برنگِ کوثر و تسنیم ہے لب و لہجہ
جو گفت گو کا قرینہ ہے، بس اُسی کا ہے

◆◆

تحسین یزدانی

(نظم)

(۱)

اے وقارِ سخن، اعتبارِ سخن کوہسارِ ادب، آبشارِ سخن
تو ہے جانِ سخن، تو قرارِ سخن اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(۲)

تو محقق ہے، شاعر ہے، نقاد ہے تجھ سے شہرِ سخن، دائم آباد ہے
تو کہ ہے گوہرِ آبدارِ سخن اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(۳)

نور ہے، روشنی ہے، اُجالا ہے تو معتبر اک ادب کا حوالہ ہے تو
ہے تری ذات پر انحصارِ سخن اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(۴)

انتقاد و تحقیق ہے مسلک تیرا تیرا انداز و اسلوب سب سے جدا
تو زمانے میں ہے نخلِ سایہ فگن اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(۵)

علم کی کان ہے، مخزنِ حرف تو عالی ہمت بھی ہے، بے بہا ظرف تو
تو شہنشاہِ فن، تاجدارِ سخن اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(۶)

سرزمینِ سخن، تجھ سے رنگین ہے گلستانِ ادب کی تو تزئین ہے
تو ہے بادِ سحر، تو بہارِ سخن اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(۷)

فکر کے قافلے کا تو سالار ہے فن سے مخلص بھی ہے تو وفادار ہے
تو محبِ ادب، رازدارِ سخن اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(۸)

تو ہے عالی نسب، تو ہے عالی گہر　　تو وحیدالحسن کا ہے لختِ جگر
باپ کی طرح تو بھی ہے یارِ سخن　　اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن

(مطبوعہ) ا۔ ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، ۲۔ ماہنامہ 'سپوتنک' لاہور، فروری ۲۰۰۷ء

◆◆

نذیر اذفر

(نظم)

وفادار و مخلص شبیہ الحسن　　سدا اُن پہ ہو سایۂ پنجتن
وہ خوش بخت و شاداں ہیں خوش کام ہیں　　بہت ان پہ اللہ کے انعام ہیں
انھیں مل کے ملتی ہے دل کو جِلا　　رہیں شاد ہر دم ہے میری دعا
زمانے میں پھیلائیں علم و ہنر　　کٹیں شادمانی میں شام و سحر
دعائیں یہ کرتا ہے دل سے شفیق　　رہیں علم والے ہی ان کے رفیق
کروں ان کی تعریف کیا دوستو　　نہیں ان میں بغض و ریا دوستو
دعا ہے رہیں وہ سدا کامران
مددگار ہو خالقِ دوجہان

(مطبوعہ) ہفت روزہ 'سردار' میلسی، یکم فروری ۲۰۰۷ء۔

◆◆

حشمت علی قنبر

(نظم)

یوں ڈاکٹر شبیہ ہیں اہلِ سخن کے ساتھ　　، جیسے ہو خوشبوؤں کا جزیرہ چمن کے ساتھ
مرکز ہے ان کی سوچ کا مولائے کائنات؏　　گہرا شغف وہ رکھتے ہیں خیبر شکن کے ساتھ
دل میں بسا کے نہج بلاغہ کا ہر سبق　　رکھتے ہیں علمیت کا ہُنر جان وتن کے ساتھ
حامی یزیدِ عصر کے حامی نہ بن سکے　　ہر حال میں رہے ہیں حسینؑ و حسنؑ کے ساتھ

اُن کی ہر اک کتاب سے روشن ہوئی یہ بات
فن کی تو زندگی ہے فقط اہلِ فن کے ساتھ
ردِّ تعصبات ہے اُن کے قلم کی ضو
فن کار زندہ رہتا ہے اپنے وطن کے ساتھ
نقاشؔ ہوں، شریفؔ ہوں، عرشیؔ ہوں یا شبیہؔ
ان سب کی آبرو ہے وحیدؔالحسن کے ساتھ
کتنے رُخوں سے میرے بھی نکھرے ہیں خدوخال
محوِ سفر ہوں میں بھی شبیہ الحسن کے ساتھ
شرمندہ ہو گا تیشۂ فرہاد ایک دن
قیصرؔ رہیں گے آپ جو اس کوہ کن کے ساتھ

◆◆

مشتاق شبنم

(جنابِ شبیہ الحسن ہیں شاعر، ادیب، ناقد)

ج — جادۂ شعر و ادب پر ہے تری گہر نظر
ن — ناز پرور ہے رہِ تحقیق میں تیرا سفر

ا — اہلِ فکر و فن کے دل میں تیرا قائم ہے وقار
ب — باعثِ صد فخر تیرا خامۂ جادو نگار

ش — شمعِ روشن کی ہے تو نے شب گزیدہ شہر میں
ب — بحرِ رحمت کو صدا دی تو نے دشتِ قہر میں

ی — یوں اندھیری رات میں تو نے کیا روشن چراغ
ہ — ہم نے تجھ سے گمشدہ تحریر کا پایا سراغ

ا — اپنی خوشیوں سے بدل لیتا ہے تو اوروں کے غم
ل — للّٰہِ الحمد اس طرح رہتا ہے تو سب سے بہم

ح — حرف تیرے سینۂ قرطاس کی تسکین ہیں
س — سب مضامینِ مودّت کی حسیں تدوین ہیں

ن — ناز ہم کرتے ہیں تجھ پر اے ادیبِ محترم
ہ — ہیں بہت مقبولِ عالم تیرے رشحاتِ قلم

ی — یہ حقیقت ہے تری فکر و نظر ہے خوب تر
ں — نازشِ اہلِ اَدب ہے تیرا تحریری سفر

ش — شارحِ سوز و سلام و مرثیہ صد مرحبا
ا — اے محقق اے مفکر مرحبا صد مرحبا

ع — عہدِ حاضر، عہدِ ماضی، عہدِ آئندہ ترا
ر — روشنی ہی روشنی ہے مرحلہ در مرحلہ

ا — اس طرح تو نے کیا ہے مرثیہ خوانوں کا ذکر
د — داد دیتے ہیں بصدق تجھے سب اہلِ فکر

ی — یوں چراغِ حرف روشن کر دیا قرطاس پر
ب — برملا ترشیحِ رحمت ہے ہر اک احساس پر

ن — نامساعد وقت کو تفسیر تو نے کر دیا
ا — اس طرح تاریخ کو تصویر تو نے کر دیا

ق — قول سچّا، فکر مثبت نکتہ لہجہ ترا
د — دل یہ کہتا ہے کہ ہو گا دورِ آئندہ ترا

سلطان محمود

(نظم)

حرفِ بے صوت
لفظ بے زبان تھے
ماحول میں بے یقینی کی دیوی سر جھکائے بیٹھی تھی
بے بختی ہاتھوں میں کشکول لیے
سخن کی بھیک مانگ رہی تھی
کہ ایسے میں
مسیحائی کا لبادہ اوڑھے
اُفقِ شام سے کرن نمودار ہوئی
مکالمہ کی فضا، دل کی دھڑکن کی تال پر
رقص کناں تھی
کہ آج پیرائے حدود میں ہمیں دولتِ نطق مل گئی
آج ہم معتبر ہوگئیں
کہ **شبیہ الحسن** نے ہمارے ہاتھ تھام لیے ہیں

◆◆

ڈاکٹر شوکت زرّیں چغتائی

(رباعیات)

(۱)

ہر صنفِ سخن میں قادر ہے شبیہ
نقاد بڑا ہے دوستو ظاہر ہے شبیہ
تسلیم میں کرتی ہوں اے شوکت زرّیں
ثانی نہیں جس کا وہی شاعر ہے شبیہ

(۲)

دریائے لطافت کا شناور ہے شبیہ
حساس طبیعت کا سخن ور ہے شبیہ
اسلوب نیا، فکر نئی ہے اس کی
سچ یہ ہے کہ اخلاص کا پیکر ہے شبیہ

(۳)

الفاظ و معانی سے سجائی تصویر
کیا رنگِ محبت سے بنائی تصویر
کیا کہنا ترا حُسنِ خیالات شبیہ
اس طرح ہر اک دل میں سمائی تصویر

◆◆

حصیر نوری

(نظم)

(۱)

تیرے علم و فضل سے واقف ہیں سب
دیدۂ بینا پہ تو ہے آشکار
تجھ سے ہے لفظ و بیاں کی آبرو
تجھ سے قرطاس و قلم کا ہے وقار

(۲)

شہسوارِ فکر و فن صد آفریں
نام تیرا ہے اَدب کے ذکر میں
اے محقق یہ بھی تیرا ہے خراج
تذکرہ تیرا ہے اہلِ فکر میں

(۳)

شخصیت ہی پُرکشش تیری نہیں
تو ہے دل کش اور بلند افکار بھی
ذکر کس کس رُخ سے میں تیرا کروں
تو کہ ناقد بھی ہے اور نثار بھی

(۴)

ذکرِ اہلِ بیتؑ سے سرشار ہے
کیوں نہ ہو یہ کلکِ خاماں بر بہ خم
تیری تحریریں مقدس ہیں بہت
تیری تحقیقی نظر ہے محترم

(۵)

ہیں تیرے پیشِ نظر آلِ نبیؐ
تیرے موضوعِ سُخن کو ہے دوام
فکر تیری قابلِ تعظیم ہے
ذات تیری قابلِ صد احترام

(۲)

تیرا اندازِ نظر ہے محترم تیری تحقیقی بصیرت مرحبا
تو، بہ مائل ارتقا ہر دم رہے صدقِ دل سے میں یہ کرتا ہوں دُعا

◆◆

علی ضیغم ہمدانی

(نظم)

جو تنقید و تحقیق کا کوہ کن
اَدب کا حوالہ شبیہ الحسن ہے
خبر میں نظر میں سفر میں حضر میں
وہ فکرِ آفریں ہے وہ شیریں سخن ہے
وہ ''شام و سحر'' کا مدیرِ مکرم
گلستانِ معنی چمن در چمن ہے
اس نے اَدب کو سہارے دیے ہیں
وہی واقفِ عظمتِ فکر و فن ہے
ہر اِک فرد ہے خادم آلِ احمدؐ
بس اِس گھر پہ یہ رحمتِ ذوالمنن ہے
وہی نثر کی خوبیوں کا ہے مرکز
اسی گھر میں ہی شعر کا بانکپن ہے
فضائے اَدب جس سے مہکی ہوئی ہے
جدھر دیکھیے بوئے سروِ سمن ہے
سلامت، اَدب پروروں کا قبیلہ
بہت کم ہیں جن کا شرافت چلن ہے
جو شمعیں بجھی تھیں وہ لَو دے اُٹھی ہیں
شبیہ الحسن کا یہ اعجازِ فن ہے
دبستانِ لاہور لَو دے اُٹھا ہے
یہ ہے شہرِ ضیغم کہ باغِ عدن ہے

◆◆

سید اعجاز ثقلین بخاری

(نظم)

شاعرِ بے بدل اور اُستادِ فن
عِلم و دانش کا پیکر شبیہ الحسن
نعتیں ہیں یہ اُردو زباں کے لیے
تیری فکر و نظر، تیری جاں، تیرا تن
تیری محنت سے آخر یہ دن آئے ہیں
کامرانی ترے در پہ ہے خیمہ زن

کاروانِ اَدب کی قیادت لیے تیرا اخلاص رکھے تجھے گام زن
تیری خدمت سے اُردو زباں کو ملے سادگی کا چلن، حُسن کا بانکپن
تیرا اقبال تیری ریاضت سے ہے یاد رکھیں گے خدمات اہلِ وطن
دوستی کا بھرم، بُوئے اہلِ وفا ہاشمی خون کا منفرد ہے چلن
باپ سے تو نے سیکھا یہی ہے سبق نیک کاموں میں آنے نہ پائے تھکن
سامنے تیرے قائم رہیں دیر تک
صحت و آبرو سے وحید الحسن

◆◆

عثمان قیصر

(نظم)

خیال و فکر کو دیتا ہے پیکرِ تاباں عروسِ علم و اَدب پر ہے اس کا یہ احساں
زمانہ اس کی اَدب دوستی سے ہے شاداں ہیں اس کی ذات سے وابستہ بے شمار امکاں
قلم قبیلہ نہ کیوں ہو نصیب پر نازاں
تلاشِ دُر میں شبیہ الحسن ہے سرگرداں

کتاب اس کی ہے عذرا وہ اس کا وامق ہے وہ بے شمار کتابوں کا خود بھی خالق ہے
ہے زر نگار مصنف شگفتہ ناطق ہے ادیب و شاعر و نقاد ہے محقق ہے
نکلنے ہاتھ سے دیتا نہیں کوئی میداں
تلاشِ دُر میں شبیہ الحسن ہے سرگرداں

قلم کی نوک سے، حرف و صدا کے خنجر سے تراشتا ہے وہ پیکر جہاں کے منظر سے
ہمیں ملا یہ شناور بہت مقدّر سے نکالتا ہے گہر ڈوب کے سمندر سے
اسے ہی کہتے ہیں اے دوست ہمتِ مرداں
تلاشِ دُر میں شبیہ الحسن ہے سرگرداں

عظیم باپ کا قیصر وہ ہے عظیم پسر — سمیٹنے میں جو مصروف ہے اُدب کا گہر
ہے شہرِ فن کو شبیہ الحسن کی خوب خبر — مدیرِ "شام و سحر" ہے مدیرِ "شام و سحر"

فروغ علم کی خاطر ہے رات دن کوشاں
تلاشِ دُر میں شبیہ الحسن ہے سرگرداں

◆◆

سیّد افتخار امام

(قطعات)

ایسی تخلیق ایسی کاوشِ فن
اے شبیہ الحسن مبارک ہو
جس پہ صدیوں کو ناز کرنا ہے
وہ عبارت، وہ فن مبارک ہو

☆

کسی سے کسبِ ہنر کا اگر ارادہ کریں
تو اپنے دامنِ علمی کو ہم کشادہ کریں
اے افتخار قلم کی بقا ضروری ہے
چلو شبیہ شناسی سے استفادہ کریں

◆◆

زرتاج جمیل

(نظم)

جی چاہتا ہے اپنا دلی مدعا کہوں — کچھ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے لیے لکھوں
تحریر کے رموز سے ناآشنا ہوں میں — شعروسخن کی ادنیٰ سی اک طالبہ ہوں میں
سورج کو اب چراغ دکھانا ضرور ہے — مدھم سہی پہ شمع جلانا ضرور ہے
گلزارِ ہاشمی کے چمن کے یہ پھول ہیں — تہذیب و علم ان کے نمایاں اصول ہیں
علم و اَدب میں ان کے گھرانے کا نام ہے — اس گھر کی سچ کہو تو سحر اور شام ہے

آبا سے شاعری کی جو معراج پائی ہے — دن رات ایک کر کے اُسے آزمائی ہے
سچ پوچھیے تو شعر و سخن کے امیر ہیں — اُسلوبِ نثر اُن کے کرم کے سفیر ہیں
ہیں سرفراز دولتِ علم و ہنر سے یہ — گزرے ہیں تربیت میں اسی رہ گزر سے یہ
تہذیب فن و فکر کی اک شمع پاس ہے — جس راہِ صنف پر وہ چلے اُن کو راس ہے
شعر و اَدب کے زاویے اتنے وجیہہ ہیں — تخلیق میں پدر کی مکمل شبیہ ہیں
علم و اَدب میں اُن کا جو اعلیٰ مقام ہے — مشہور اُن کا مرثیہ گویوں میں نام ہے
نقاش ہے قلم ترا عصرِ جدید کا — پیغام دے رہا ہے یہ صبحِ نوید کا
سیماب ہے مزاج میں یوں اُن کے موجزن — تدریس ہو کہ شعر ہو تنقید ہو کہ فن
ایما سے ان کی سوچ کے غنچے چٹکتے ہیں — انشاء فکر و فہم کے دریا اُبلتے ہیں
اپنے قلم سے علم کے موتی لٹاتے ہیں — لائق ادیب ہو تو محقق بناتے ہیں

اعجاز یہ مودّت آلِ نبیؐ کا ہے
تحریر کے ہنر میں سفر روشنی کا ہے

◆◆

سید قمر حسنین

(نظم)

تو نے کتنی کتابوں پہ تنقید کی، اے شبیہ الحسن، اے شبیہ الحسن
تیرے لفظوں میں ہے علم کی روشنی، اے **شبیہ الحسن**، اے **شبیہ الحسن**

تیری آنکھوں میں دل کے اُجالے بھی ہیں، تیرے لفظوں میں زندہ حوالے بھی ہیں
تو ہے تہذیبِ الفاظ کی زندگی، اے **شبیہ الحسن**، اے **شبیہ الحسن**

تیرے خوں میں ہے حُبِّ علیؑ کا اثر، تو ہے شاعر وحید الحسن کا پسر
تیرے گھر میں پلی اور بڑھی شاعری، اے **شبیہ الحسن**، اے **شبیہ الحسن**

روزِ اوّل سے یہ ریت تیری رہی، کربلا ہی پڑھی کربلا ہی لکھی
تیرا کردار، نام و نسب، ہاشمی، اے **شبیہ الحسن**، اے **شبیہ الحسن**

تو محبت کے مکتب کا عنوان ہے، تو اَدب کے زمانے کی پہچان ہے
عشق کا دَرد ہے دَرد کی آگہی، اے **شبیہ الحسن**، اے **شبیہ الحسن**

تو ہے اُستاد تیرا کرم محترم، تجھ کو اللہ دے اور زورِ قلم
میرے لب پر قمرؔ بس دعا ہے یہی، اے **شبیہ الحسن**، اے **شبیہ الحسن**

◆◆

ظفر عابدی

(قطعہ)

اَدب نواز گھرانوں کا استعارہ ہے
سخن وروں میں چمکتا ہوا ستارہ ہے
فروغِ علم و اَدب کی جو بات آ جائے
شبیہ فرد نہیں مستند ادارہ ہے

◆◆

جاوید صدیق بھٹی

(نظم)

یہ ایک شاعر
یہ اک محقق
کہ جس کے افکار میں ہمیشہ
محبتوں کے عقیدتوں کے
ہزار چشمے رواں دواں ہیں
یہ ایک شاعر
یہ اک محقق
کہ جس کا اُسلوب منفرد ہے

کہ جس کے لہجے سے پھول جھڑتے ہیں سو طرح کے
کہ جس کے لفظوں میں روشنی ہے
کہ جس کی باتوں میں زندگی ہے

یہ ایک شاعر
یہ اک محقق
جو اپنے ماضی کا ترجماں ہے
جو اپنے اجداد کا امیں ہے
کوئی بھی رُت ہو
کوئی بھی موسم
قلم کہیں بھی جھکا نہیں ہے رُکا نہیں ہے
یہ ایک شاعر
یہ اک محقق
دیارِ ظلمت میں اپنے خوں سے
چراغ ایسے جلا رہا ہے
کہ جس پہ اکثر گماں گزرے
کہ جیسے مشرق سے کوئی سورج اُگا رہا ہے
یہ ایک شاعر
یہ اک محقق

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شہادت پر

زاھد بخاری

(نظم)

کیسا مزاجِ موسمِ گلشن بگڑ گیا ۔۔۔ بادِ خزاں سے باغِ تمنا اُجڑ گیا
سفاک وہ فضا ہے کہ کھٹکا ہے ہر گھڑی ۔۔۔ میرا یہ سر گیا کہ ابھی میرا دھڑ گیا
خطرہ ہے آندھیوں کا، کبھی بجلیوں کا خوف ۔۔۔ کس کس کے ساتھ تنہا مجھے لڑنا پڑ گیا

لے کر دوا تب آؤ گے اے میرے چارہ گر
جب وقتِ نزع سانس ہی میرا اُکھڑ گیا؟

تھیں رونقیں دوچند شبیہ الحسن کے ساتھ
اب وہ حسین چہرہ ہی مٹی میں گڑ گیا

اوصاف کتنے جمع تھے اِک اُس کی ذات میں
وہ دلربا سا شخص جو ہم سے بچھڑ گیا

قائم رہے گی تابہ ابد اُن کی آب و تاب
انگشتری میں ایسے نگینے وہ جڑ گیا

کیا خاک لطف رہ گیا سیرِ چمن میں اَب
جب خوش نما گلاب ہی ٹہنی سے جھڑ گیا

اب تو قدم قدم پہ ہے بے پردگی کا خوف
زاہد لباسِ قوم کا بخیہ اُدھڑ گیا

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شہادت

خورشید بیگ میلسوی

(نظم)

وہ وحیدِ عصر کا نورِ نظر، لختِ جگر
خوں فشاں چشمِ فلک ہے آج جس کی موت پر

اس کی یادوں کو بھلانا اس قدر آساں نہیں
خون کے آنسو مداوائے غمِ جاناں نہیں

خدمتِ حرف و قلم جس کا رہا ہر دم شعار
سرزمینِ پاک کو جس پر رہے گا افتخار

اس کی ہر تصنیف ہے علم و اَدب کا شاہ کار
وہ سخن کی آبرو تھا وہ سخن کا اعتبار

اس کی خدماتِ گراں مایہ بُھلا سکتا ہے کون
لوحِ دل سے اس کی یادوں کو مٹا سکتا ہے کون

زندگی بھر مہر و الفت کو دیا اس نے فروغ
علم و حکمت کو، دیانت کو، شرافت کو فروغ

وہ کلیمِ فکر و فن، روحِ روانِ انجمن
وہ شبیہِ محترم، وہ شاعرِ شیریں سخن

وہ حریمِ شامِ علم و آگہی کا ماہ تاب
فکروفن کی صبحِ فردا کا درخشاں آفتاب

وہ شرافت کا امیں مہر و محبت کا نشاں
وہ وحیدِ عصر کی شانِ عزیمت کا نشاں

علم و حکمت کا امیں، وہ صاحبِ سیفِ قلم
جس سے قائم ہے مودّت کا عقیدت کا بھرم

اس کو قدرت نے عطا کی تھی نگاہِ دوربیں
اس کا ثانی نقد و فن میں کوئی ہو سکتا نہیں

داد ہم دیتے ہیں اس کے شوق کی تکمیل کو
اس نے کر دی ہے فروزاں علم کی قندیل کو

انکساری میں روایت کا وہ اعلیٰ تر نشاں
زندگی جس کی شرافت کی تھی جوئے بے کراں

کارفرما جو سدا اپنے اُصولوں پر رہا
جو کسی میدان میں ہرگز نہ باطل سے جھکا

تشنگانِ علم و عرفاں اس سے ہو کر فیض یاب
ہو گئے ہیں خود بھی شہرِ علم میں عزّت مآب

از طفیلِ ہادیِ مُرسل ملے اس کو اماں
حامی و ناصر ہو جنت میں خدائے مہرباں

اس کے لفظوں کو ملی خورشید کی تابندگی
چار سُو پھیلی ہے اس کے فکروفن کی روشنی

◆◆

شہید شبیہ الحسن کے بعد!

سیّد تقی عابدی

◆◆

تاریخ کے صفحات اور ذہن کے اوراق اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ کسی بھی نام ور، دانش ور اور ادیب کی شناسائی اور شہرت اُس کے موت کی چوکھٹ سے گزرنے کے بعد بڑھ جاتی ہے کیوں کہ اس کی معنوی اولاد یعنی اس کی نگارشات کی خوش بو صدیوں تک چمنستانِ اَدب میں پھیلتی رہتی ہیں۔ شاید اسی لیے ذوق نے کہا تھا:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

ہماری یہ تعزیتی تحریر میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم مرحوم ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن پر گفت گو کر سکیں جس کا اعتراف علمائے اَدب نے ان کی زندگی ہی میں کیا اور ان کی سخن دانی، سخن پروری، سخن شناسی اور سخن نوازی کی دستاویز مرحوم کی زندگی کے آخری ایام میں تکمیل کے آخری مراحل تک اظہار سنز، لاہور کی محبتوں اور کوششوں سے پہنچ چکی تھی۔ بہرحال ہم شبیہ الحسن کی اَدبی فتوحات کا اجمالی تذکرہ اَدبی نگارشات میں وقتاً فوقتاً پیش کر کے نفسِ مضمون کو تحقیق اور تنقید کے جواہر سے با اَرزش بناتے رہیں گے تاکہ اَدب کے پرستاروں تک یہ اَدب کے شہ پارے جو مرحوم کے قلم سے ان کی دو درجن سے زیادہ تصنیفات اور تالیفات میں بکھرے پڑے ہیں نہ صرف پہنچ سکیں بل کہ مکمل ایک صحیفہ کی شکل میں محفوظ بھی ہو جائیں تاکہ ان کے جہانِ فن کے اور کئی زاویوں پر آئندہ نسلیں کام کر سکیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اُردو شعر و اَدب کا یہ شہید اپنی مختصر مگر پُر کار زندگی میں بڑے کام کر گیا۔ شبیہ الحسن نے جو اُردو کی خدمت کی وہ تو اُنھیں کرنا ہی تھی کیوں کہ وہ جس خاندان کے ورثہ دار ہیں اس کی شناخت ہی شعر گوئی، سخن فہمی اور اَدب پروری ہے جو صفا الہ آبادی، حبیب جون پوری، وحید الحسن ہاشمی سے ہوتے ہوئے نقاش ہاشمی

اور عرفی ہاشمی تک آج بھی رواں دواں ہے۔ خاندانی اقدار، گھر کا ماحول، لاہور کی اُدبی فضا نے شبیہ الحسن کے تخلیقی مزاج کو تحقیق اور تنقید کے رجحان سے بھی جوڑ دیا اور یہی نہیں بل کہ اُدبی جریدہ 'شام وسحر' کی مدیریت اور کالم نگاری نے شہروں اور مضافاتوں میں بھی ان کی تحریروں کو اُدبی بیٹھک اور اُدبی چوپال میں موردِ فکر ونظر بنا دیا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اُردو شعری بضاعت مخصوصاً صنفِ مرثیہ، مرثیہ نگاروں کے خاندانوں کی بے توجہی کے باعث بڑی حد تک برباد ہوگئی۔ ہزاروں شاہ کار سلام، نظمیں اور مرثیے تلف ہوگئے۔ یعنی! ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مگر اس پُر آشوب اور تاریک دور میں شبیہ الحسن نے شمؔع جلالی اور حبیؔب جون پوری، آل رضؔا، قیصؔر بارہوی، وحیؔد الحسن ہاشمی اور سیف زلفی وغیرہ کے کلام کو مرتب کر کے ان کو عمدہ تنقیدی اور تحقیقی حوالوں سے مزیّن کر کے اظہار سنز، لاہور کے ذریعہ بازارِ سخن میں اس وقت پیش کرنے کی مردانہ ہمت کی جب اُردو شعر واُدب کا ماحول فیضؔ کے شعر کی تفسیر بن چکا تھا:

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گُہر جائیں گے

لیکن ہمیں یقین ہے کہ شبیہ الحسن نے جو حُسنِ یوسف بازارِ مصر میں پیش کیا ہے وہ تا اَبد خریداروں اور پرستاروں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے بہت صحیح کہا ہے ''جو لوگ مرثیے کی تخلیق وتنقید میں اپنی محبتوں سے اب ایک نئی دنیا تعمیر کر رہے ہیں۔ ان میں آپ کے نام پر لکیر نہیں پھیری جا سکتی۔ آپ کے نام کو کاٹا نہیں جا سکتا۔ آپ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ مسلسل کتابیں سامنے آ رہی ہیں''

ہم یہاں ڈاکٹر نقوی کی گفت گو کو آگے بڑھاتے ہوئے یہی کہیں گے کہ شبیہ الحسن نے جو شعر اور نقد کو شایع کیا ہے وہ ایک اَمرِ کام ہے۔ اگر چہ شبیہ الحسن ہماری نظروں سے چُھپ چکے ہیں لیکن صحیفوں کے سرِ ورق پر اس لیے نمایاں ہیں کہ ''چُھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد'' یا ''چُھپ نہیں سکتا ہے ناقد، نقد کے چھپنے کے بعد''

ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک کثیر الجہت تخلیقی شخصیت تھے۔ وہ شاعر، محقق، نقاد، مدیر، کالم نگار کے علاوہ شعری محافل کے ناظم اور اُدبی مناظروں کے عمدہ منتظم بھی تھے۔ ہُنر مند کا ہنر ایک تخلیقی اور فطری اپج ہوتا ہے۔ معروف تنقید نگار احتشام حسین نے بہت صحیح کہا ہے کہ شاعر اور نقاد یا شعر گوئی اور شعر فہمی اکتسابی نہیں فطری اور الہامی ہوتی ہے اور یہ زورِ بازو سے حاصل نہیں ہوتی جب تک:

ع تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چناں چہ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان کی شاعری کے زیرِ اشاعت مجموعہ ''حروف بدن'' کو زیورِ طباعت سے مجہز کر کے عوام تک پہنچایا جائے تا کہ ان کی منفرد آواز میں لہجوں کا اُتار چڑھاؤ، متن کا جلال و ملال، زبان کی سلاست و شگفتگی، خاندانی زبان دانی اور لطفِ محاورے سے آشنائی اور استفادہ ہو سکے۔

مرحوم کا جو کوئی رثائی اَدب اور اُردو شعر و نثر پر ان کی ناگہانی شہادت سے مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے ورق ورق کو مطبوعہ شکل میں محفوظ کیا جائے۔ تجربہ یہ ہے کہ اس کام میں ایک دن کی دیر ایک صدی کا اثر رکھتی ہے۔

یہ زمانہ جدید ٹیکنالوژی کی دولت سے مالا مال ہے۔ کتاب کی رسائی میں دشواریاں بڑھتی جارہی ہیں اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مرحوم کی تمام کتابوں کو ویب سائٹ پر منتقل کر دیا جائے تا کہ اس سے عوام اور خواص شرق و غرب میں مستفید ہو سکیں۔

راقم نے مرحوم شبیہ الحسن کے فن پر لکھے ہوئے اکثر مضامین میں عمدہ نکات کی نشان دہی اور جوہر نگاری کے ذکر میں فقدان دیکھا ہے۔ صرف توصیفی اور تشریفاتی گفت گو سے کسی بھی فن کار کے فن کا معیار بتایا نہیں جا سکتا اس لیے اس طرف توجہ اور کام میں گیرائی اور دقت نگاری کی ضرورت ہے اسی لیے ہم نے اس تحریر کے آغاز میں یہ تاکید بھی کر دی کہ یہ مضمون مرحوم کی شخصیت اور فن پر نہیں بل کہ ان کی اَدبی فتوحات سے استفادہ کی تحریر ہے۔

مرحوم شہزاد احمد نے بہت ٹھیک کہا کہ ''یوں تو شبیہ الحسن نے اَدب کی کئی جہات میں کام کیا ہے مگر ان کا محبوب موضوع مرثیہ ہے اور پھر اسی حوالے سے مرثیہ نگار بھی۔ مرثیہ سے ان کا یہ لگاؤ صرف اَدب کی حد تک نہیں بل کہ اس میں دنیا بھر کے موضوع شامل ہوتے چلے جارہے ہیں۔ مرثیے کی یہ توجیہہ انسان کی پوری زندگی کا احاطہ بھی کر سکتی ہے۔

ہم اخیر میں یہی کہیں گے کہ مرحوم شبیہ الحسن کی اَدبی خدمات میں رثائی اَدب کی خدمت انھیں زندۂ جاوید کر چکی ہے اور ان کا یہ کام قیصر بارہوی کے اس شعر کے مصرعہ ثانی کا تمغۂ امتیاز بن چکا ہے ؎

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے
مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے

سیّد تقی عابدی (کینیڈا)

سید تقی عابدی - کینیڈا

◆◆◆

صاحبِ خیر: سیّد شبیہ الحسن

ڈاکٹر سلیم اختر

◆◆

خیر اور شر کا اظہار شخصیت کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ انسان خلا میں زندگی بسر نہیں کرتا اسی سماج میں رہتا ہے اور دوسروں سے رابطہ ناگزیر ہے۔ آپ دوسروں کو پسند کریں یا نہ کریں لیکن کسی نہ کسی نوعیت کا باہمی رابطہ لازم ہے۔ آپ کے اعمال دراصل خیر وشر کی عملی صورت ہوتے ہیں۔ شخصیات کا رابطہ موجب خیر بھی ہے اور باعثِ شر بھی۔ اس لیے کسی بھی فرد کا اندازہ تب تک نہیں ہوتا جب تک کہ اس سے براہِ راست عمل اور ردِ عمل نہ ہو۔ یہ تمہید اس لیے ہے کہ جو شخص سیّد شبیہ الحسن سے کبھی نہیں ملا وہ یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ شبیہ صاحب خیر تھا۔ صاحب خیر کہہ کر شاید میں شبیہ کی شخصیت کو پوری طور پر واضح نہ کر پاؤں کیوں کہ وہ خیر ہی خیر تھا۔ وہ سراپا خیر تھا اگر خیر کو مجسم دیکھنا ہو تو شبیہ کو دیکھ لو۔

جہاں تک میری دوستی کا تعلق ہے تو دراصل بنیادی طور پر مَیں ان کے والد محترم سیّد وحید الحسن ہاشمی کا دوست تھا۔ اس لیے جب ہمارے باہمی تعلقات کا آغاز ہوا تو شبیہ نے ہمیشہ یہ امر ملحوظ رکھا کہ مَیں ان کے والد کا دوست ہوں۔ وہ مجھے بزرگ تو نہیں سمجھتا تھا لیکن بزرگ دوست کا درجہ دیتا تھا۔ اسی لیے بے تکلفی کے باوجود شبیہ کے طرزِ عمل میں رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ ویسے بھی شبیہ کوئی شوخ طبع نہیں تھا۔ میرے بعض دوستوں کی طرح نہ وہ جنسی لطیفے سنا سکتا تھا اور نہ ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگا سکتا تھا۔ وہ طبعاً متین تھا اور یہ متانت اس کے طرزِ عمل کا حصہ بن چکی تھی۔ عجب بات ہے کہ شبیہ اَدیب تھا لیکن ادیبوں کے محبوب مشغلے غیبت، بدخوئی، سیکنڈلنگ سے اسے کوئی رغبت نہ تھی۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے کہ ادیب کے پاس قلم ہو اور اسے وہ کسی کے خلاف استعمال نہ کرے، زبان ہو اور وہ اس کی اُتی اُتارنے کے لیے، اپنے مبینہ دوستوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے سان پر نہ چڑھائے۔ اس لحاظ سے شبیہ الحسن واقعی سیّد اور سیّد زادہ تھا۔ شبیہ کے والد مرحوم بھی مشرقی وضع داری اور شرافت کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ مجھے یاد ہے میرے ایک دوست نے ایک محفل میں میرے ساتھ، وحید الحسن صاحب اور شبیہ الحسن، ہم تینوں کی مذمت کی تو سامعین حیران و پریشان ہو گئے کہ اس شخص کو اس مذمتی

اُسلوب میں گفت گو کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی۔ وحیدالحسن صاحب نے کمال صبر و ضبط کا ثبوت دیا جواب آں غزل کے طور پہ انھوں نے اپنی زبان آلودہ نہ کی۔ شبیہ کا ہاتھ پکڑا اور محفل سے اٹھ کر آ گئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ دونوں باپ بیٹا نے اس کے خلاف کبھی نامعلوم الفاظ استعمال نہ کیے۔ شبیہ کے پاس اپنا رسالہ ''شام و سحر'' تھا، ہاتھ میں قلم تھا وہ چاہتا لکھ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا بل کہ بعد کی ملاقاتوں میں اس شخص کو بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ تو نے کتنی زیادتی کی تھی۔

اس طرح کے متعدد واقعات یاد آ رہے ہیں صرف ایک واقعہ سن لیجیے وہ شخص اگر چہ سید تھا لیکن غالباً ۷ ۱۹۴ کے بعد ساختہ سید ہوگا کیوں کہ اس میں سیدوں جیسی اعلیٰ کرداری صفات کا فقدان تھا۔ بنیادی طور پر وہ دو نمبر آدمی تھا اور فراڈ اس کا ذریعہ معاش تھا وہ کسی حوالے سے مجھے ملا اور مجھے ٹھیک ٹھاک بیوقوف بنایا لیکن میں بیوقوف پھر بھی اسے سمجھ نہ پایا۔ میرے حوالے سے وہ شبیہ سے ملا اور ڈاکٹر عبدالکریم خالد سے، اسی طرح کراچی گیا۔ میرا نام لے کر مشفق خواجہ سے ملا۔ مشفق خواجہ کسی ایسے شخص کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیتے لیکن اس نے خود کو میرا قریبی دوست ظاہر کیا۔ اس لیے خواجہ صاحب نے آؤ بھگت کی اور کچھ سلوک بھی کیا۔ اس طرح کراچی کے متعدد لوگوں سے ملا اور میرا نام غلط طریقے سے استعمال کرتا رہا۔ بہر حال جب اس کی شخصیت کا بھرم کھل گیا تو ہم سب تو اس سے دور ہو گئے مگر شبیہ نے اپنی وضع داری کی ریت نبھائی اور جان بوجھ کر اس کے ناجائز مطالبات پورے کرتا رہا۔ یہی نہیں بل کہ شبیہ نے اس پر ایک بڑا اچھا مضمون بھی لکھا۔ مَیں نے شبیہ کو فون کیا اور کہا کہ یہ آدمی تو نمبر دو ہے آپ نے کیسے اس پر مضمون لکھ دیا۔ شبیہ کا جواب تھا یہ آدمی نمبر دو نہیں بل کہ دو سو نمبر کا تھا لیکن اس کی کتاب اچھی تھی اس لیے میں نے مضمون لکھا۔ یہ ہے ایک سچے سید کا طرز عمل اور شبیہ اس معاملے میں واقعی پانسے کا سونا تھا۔ اس کی شخصیت میں کسی طرح کا بھی کھوٹ نہ تھا۔

جہاں تک تقریبات کے انعقاد کا تعلق تھا تو شبیہ کی انتظامی صلاحیتیں پوری طرح سے اُجاگر ہوتیں۔ ایک ٹائم ٹیبل کی طرح تقریب وقت پر شروع ہوتی اور وقت پر ختم ہوتی۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ شبیہ نے اپنے لیے کوئی تقریب نہیں کروائی۔ ہاں والدِ محترم کے لیے اس نے بہت کچھ کیا۔ مجھے اس کی یہ بات ہنوز یاد ہے کہنے لگا کہ میرے والد زندگی کے آخری دور میں ہیں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے میں ان کے لیے اور تو کچھ نہیں کر سکتا، تقریبات کا اہتمام کرتا رہتا ہوں کہ انھیں اس عمر میں کچھ خوشی حاصل ہو جائے۔ یہ آدابِ فرزندی کی بات ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ کسی دوسرے شہر سے کوئی ادیب آئے اور شبیہ اس کے لیے تقریب کا اہتمام نہ کرے اور مہمانوں کو تحائف دے کر رخصت نہ کرے۔ انتقال سے ہفتہ پہلے مجھے کہنے لگا ہمارے ایک بزرگ ہیں انھیں بہت گلہ ہے کہ زمانے نے ہماری قدر نہیں کی۔ میں سوچتا ہوں کہ ان کے اعزاز میں تقریب منعقد کر دیں بزرگ آدمی ہیں وہ خوش ہو جائیں گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، وہ بزرگ تقریب سے بے حد خوش ہوئے۔

شبیہ زیادہ تر تقریبات پیک سلوشن میں کرتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اسی بہانے طلبہ اہم ادیبوں اور شاعروں کو دیکھ لیں، ان کی باتیں سن لیں۔ ان کے منھ سے اشعار سن لیں اور یہ بھی کہ اس بہانے انھیں ادب کے بارے میں کچھ واقفیت ہو جائے۔

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اسی مفہوم کی ایک حدیث ہے، تحفے دیا کرو، اس سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ شبیہ سے بڑھ کر میں نے اس حدیث پر کسی اور کو عمل پیرا ہوتے نہیں دیکھا۔ ادبی تقریبات ہوتی ہیں تو تقریب سے پہلے صاحب تقریب آگے پیچھے پھرتا ہے جیسے ہی آپ نے اس کی شان میں قصیدہ پڑھ دیا، تقریب ختم ہوگئی تو وہ لاتعلق ہو جاتا ہے اور پلٹ کر یہ بھی نہیں پوچھتا کہ تمھارے پاس گھر جانے کے لیے سواری کا بندوبست ہے کہ نہیں۔ اس کے برعکس شبیہ کا یہ طرز عمل تھا کہ تمام مہمانوں کو گاڑیوں پر لے کر آتا اور تقریب کے اختتام پر تمام مقررین کو خوب صورت تحائف پیش کرتا یہ کام وہ تب سے کر رہا تھا جب سے اس نے تقریبات کا سلسلہ شروع کیا۔ کتنے ہی ادیب اس کے دیے ہوئے کپڑوں سے جامہ زیب ہوتے اور کتنے ہی ادیبوں کے گھروں میں اس کی پیش کردہ کراکری سے مہمانوں کی تواضع ہوتی تھی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اسے تحفے دینے کا خبط تھا۔ موقع ہو یا نہ ہو وہ دوستوں کو تحفے دیتا رہتا تھا۔ ایک دن گھر آیا تو بنیان اور جرابیں اٹھائے چلا آیا۔ میں نے پوچھا یہ کیوں بھئی؟ کہنے لگا میں بازار اپنے لیے بنیان اور جرابیں خریدنے گیا اس وقت آپ یاد آ گئے لہٰذا آپ کے لیے بھی خرید لیں۔ بات بنیان یا جراب کی نہیں، محبت اور خلوص کی ہے۔ بلاشبہ شبیہ محبت اور خلوص سے بھرا تھا۔ طویل قربت میں لاتعداد ایسے واقعات کا گواہ ہوں جس سے شبیہ کی اعلیٰ ظرفی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ کئی غریب کنبوں کی کفالت کر رہا تھا۔ کئی بچے بچیوں کے تعلیمی اخراجات وہ برداشت کر رہا تھا۔ اس کے جاننے والوں میں کسی دوست کو کسی طرح کی تکلیف ہوتی تو شبیہ ازخود جا کر اس کی جس طرح سے بھی مدد کر سکتا وہ اس سے گریز نہ کرتا۔ پیک سلوشن اس کے تعلیمی ادارے تھے۔ میں ان میں کئی مرتبہ گیا، ہر سیشن کے آغاز میں شبیہ یہ اعلان کرتا کہ کسی بچے کو اس وجہ سے داخلہ نہیں ملے گا کہ اس میں فیس دینے کی استطاعت نہیں ہے آپ اچھے نمبر لے کر آئیں میں آپ کو زیادہ سے زیادہ فیس میں رعایت دوں گا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ نجی تعلیمی ادارے اب ایک انڈسٹری میں تبدیل ہو چکے ہیں لیکن شبیہ کے ادارے ایسے نہ تھے وہ مستحق طلبہ کو وظائف دیتا۔ کتابوں اور یونیفارم کے لیے پیسے دیتا اور زیادہ سے زیادہ فیس میں رعایت دیتا تھا۔ اس نیک نیتی کا اللہ نے صلہ دیا کہ ایک سے چار ادارے بن گئے۔

شبیہ نے ساری عمر محنت بل کہ میں مشقت کہوں گا، سے زندگی بسر کی۔ اس نے جو مقام حاصل کیا وہ گروپ بندی یا سیاسی سرپرستی سے نہ حاصل کیا بل کہ اپنی محنت اور جدوجہد سے۔ وہ صبح سات بجے گھر سے نکلتا اور رات کے گیارہ بارہ بجے سے پہلے گھر نہ آتا اور پھر کھانا کھا کے سو نہ جاتا بل کہ رسالہ مرتب کرتا، اپنا تنقیدی

اور تحقیقی کام کرتا۔

دوستی کے آغاز میں مجھے ان معمولات کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ ایک مرتبہ رات کو اس کے گھر فون کیا، ان کی چھوٹی بیٹی نے فون اٹھایا اور بتایا کہ انکل ابھی تو ابو گھر نہیں آئے۔ میں نے پوچھا وہ کب گھر آتے ہیں۔ بیٹی نے جواب دیا اور یہ جواب میں نے کئی لوگوں کو سنایا تھا کہ انکل وہ اگر رات کے گیارہ بجے گھر آ جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ جلدی آ گئے ہیں۔ مَیں نے یہ نوٹ کیا کہ جن لوگوں نے کسی بھی شعبے میں نام پیدا کیا، قد اونچا کیا اور نمایاں مقام حاصل کیا تو وہ یک رخ ذہن (Single track of mind) کے حامل تھے اور یہی عالم شبیہ کا بھی تھا۔ ساری دنیا کی دل چسپیاں اور مسائل ایک طرف لیکن اس کا لکھنا پڑھنا ایک طرف۔ قلم کے معاملے میں شبیہ نے کبھی بھی کسی طرح کا سمجھوتہ نہ کیا۔ تنقید، تحقیق اور تدوین پر اس کی تقریباً دو درجن کتابیں اس کی محنت اور ریت جگے کی گواہ ہیں۔

بنیادی طور پر شبیہ درویشانہ مزاج رکھتا تھا۔ جب اُسے بیسواں گریڈ ملنے لگا تو سیکرٹری ایجوکیشن نے بلا بھیجا اور کہا کہ اس وقت فلاں ادارے میں ڈائریکٹر جنرل کی اسامی خالی ہے، فلاں ادارے میں چیرمین ابھی متعین نہیں ہوا۔ اس نے فہرست گنوادی، اب آپ بتائیں آپ کہاں جانا پسند کریں گے، شبیہ نے جواب دیا کہ نہ مَیں چیرمین بننا چاہتا ہوں اور نہ ہی ڈائریکٹر جنرل، مَیں اُستاد ہوں اور اُستاد ہی رہنا چاہتا ہوں، آپ مجھے میرے ہی کالج میں تعینات کر دیں۔

پاکستان کے کرسی پسند اور منصب آشنا معاشرے میں شبیہ الحسن جیسے قلندر خال خال ملتے ہیں۔ قحط الرجال اس بات کا نہیں کہ بڑے لوگ نہیں ہیں۔ قحط الرجال تو اس بات کا ہے کہ صاحبِ خیر، عنقا ہیں اور بلاشبہ شبیہ الحسن صاحبِ خیر تھا کہ زیستِ عمل خیر میں بسر کی۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(۲۱۔۱۰۔۱۲)

◆◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی اَدبی جہتیں

ڈاکٹر مظفر عباس

••

ڈاکٹر شبیہ الحسن ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ اُستاد، شاعر، محقق، نقاد، کالم نگار، مدیر، مرثیہ گو، دانش ور اور سب سے بڑھ کر ایک سچے اور کھرے انسان۔

شبیہ الحسن نے اپنی مختصر حیات مستعار میں وہ اَدبی کارنامے انجام دیے ہیں جو بہت سے لوگ طویل العمری کے باوجود انجام نہ دے پائے۔ اُن کی اُٹھان میں بانکپن تھا۔ کیوں نہ ہوتا وحید الحسن ہاشمی جیسا نابغہ اُن کا باپ اور آغا سہیل جیسا ادیب اُن کا اُستاد۔ شبیہ الحسن کے قلم میں ٹھہراؤ، فکر میں گہرائی اور رائے میں وزن تھا۔ اُن کی ادبی جہتوں کا جائزہ لینے سے پہلے ایک نظر اُن کی تصانیف پر ڈالنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر شبیہ نے کم و بیش ۳۰ کتب اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

۱۔ مفاہیم	۲۔ ترجیحات	۳۔ اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار
۴۔ تصریحات	۵۔ آل رضا کا فنِ غزل گوئی	۶۔ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی
۷۔ آغا صاحب	۸۔ کلیاتِ حبیب	۹۔ باقیاتِ آل رضا
۱۰۔ بجھی وہ شمع۔ نسیم امروہوی	۱۱۔ بیسویں صدی کا شعری اَدب	۱۲۔ آیات آمنہ
۱۳۔ العطش	۱۴۔ معتبر مرثیے	۱۵۔ جدید غزل اور اسلم کولسری
۱۶۔ ادبی بیٹھک	۱۷۔ حسن عسکری کاظمی کی جہتیں	۱۸۔ ترغیبات
۱۹۔ مضافاتی شعر و اَدب	۲۰۔ اُردو شعر و اَدب کے سفیر	۲۱۔ اَدبی چوپال

ساٹھ ستر کے قریب اَدبی مقالات اِن کے علاوہ ہیں۔ جن میں اہم یہ ہیں۔

۱۔ ایک منفرد گیت کار۔ حفیظ جالندھری	۲۔ ظفر علی خان کی نعت نگاری
۳۔ اُردو مرثیہ نگاری	۴۔ مرزا دبیر۔ چند حقائق
۵۔ ایک مانوس اجنبی۔ اشفاق حسین	۶۔ اقبال شناسی اور فرہنگ اقبال

۷۔ شیر افضل جعفری اور اُن کی تخلیقات ۸۔ کچھ جعفر بلوچ کے بارے میں

۹۔ واقعہ کربلا اور اُدب ۱۰۔ اُردو نعت ۔ ماضی، حال، مستقبل

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ۱۹۸۸ء میں ماہ نامہ شام و سحر کی ادارت سنبھالی اور اس اَدبی پرچے کو اپنے مخصوص جدت طبع کے مطابق صوری و معنوی تنوع کا آئینہ دار بنا دیا۔ اُنھوں نے شام و سحر کے پچیس سے زائد خاص نمبر شایع کیے۔ اِن خاص شماروں کے عنوانات ہی سے شبیہ کی ذہنی اُپج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

۱۔ علامہ اقبال نمبر ۲۔ محرم نمبر ۳۔ فیض احمد فیض نمبر

۴۔ آغا سہیل نمبر ۵۔ ساحر لدھیانوی نمبر ۶۔ حلقہ ارباب ذوق نمبر

۷۔ عمر فیضی نمبر ۸۔ ڈاکٹر سلیم اختر نمبر ۹۔ کتاب کلچر نمبر

۱۰۔ حسن عسکری کاظمی نمبر

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی زندگی نے وفا نہ کی اور ناگہانی موت کے سفاک ہاتھوں نے اَدب سے ایک درخشندہ ستارہ چھین لیا۔ ابھی اُس نے نہ معلوم کب تک آسمانِ اَدب کو تاب ناک کرنا تھا۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن ہمہ جہت اَدبی شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعر و ادب کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں شبیہ کے اشہب قلم نے جولانیاں نہ دکھائی ہوں وہ بنیادی طور پر ایک سچے تخلیق کار تھے۔ جن کی فکر میں گہرائی و گیرائی، رائے میں توازن، اُسلوب میں تنوع اور استخراج نتائج میں بے باکی تھی۔ شبیہ الحسن کی اگر کوئی مماثلت تلاش کی جائے تو وہ صرف اُن کے اُستاد ڈاکٹر آغا سہیل ہی ہوں گے۔ شبیہ اُن کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے تھے اور اپنے اُستاد کی شخصیت اور فن پر آغا صاحب کے عنوان سے ایک کتاب بھی مرتب کی تھی۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تمام زندگی اپنے اُستاد کی طرح جہد مسلسل کی ایک طویل اور کٹھن زندگی کا استعارہ ہے اُنھوں نے خود اپنی ایک رباعی میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

فلک سے چاند ستاروں کو توڑنے والو
زمیں سے رشتہ انساں کو استوار کرو
کھرچ دو ہاتھ سے تقدیر کی لکیروں کو
تم آدمی ہو جہاد عمل سے پیار کرو

◆◆◆

کیا خبر کون کسے مار دے۔ کافر کہہ کر!

ڈاکٹر اسد اریب

تم نے جو کتاب لکھی، میرے نام بھیجی۔ ہر کتاب کے ساتھ ایک رُقعہ یہ منسلک ہوتا ''براہ کرم اپنی رائے سے آگاہ کیجیے، اور کچھ لکھ کر بھی دیجیے۔'' میں انشاء اور اُدب کے معاملات میں کچھ تحفظات رکھتا ہوں، اپنی رائے کو محفوظ رکھنے کے لیے، مَیں نے تمھیں خاطر خواہ، کبھی جواب نہ دیا۔ مجھے یقین تھا، مَیں اپنے ایک ایسے عزیز کی شکستِ خاطر کا مجرم ہوں، جس کا باپ پاکستان آنے کے بعد میرا، پہلا دوست بنا۔ جس کے باپ نے لاہور کی اُدبی سرگرمیوں کے میدان میں ہر ہر قدم پر مجھے چالیس برس اپنے ساتھ رکھا۔ اُس وقت تم اپنی ماں کے گود میں ہمکتے ہوئے ایک شیر خوار بچے تھے، پھر تم پالنے سے نیچے اُترے، ایک دن تم نے اپنے ننھے ننھے پاؤں، زمین پر رکھے، لڑکپن، نوجوانی اور جوانی کے بھرپور دنوں میں، تمھارا باپ تمھاری ہر ہر کامیابی کی خبر مجھے دیتا، میں خوش ہوتا۔ تم ''شام و سحر'' میں آئے، تو پھر تم نے ایک خط لکھا، ساتھ میں، تمھاری تحریر کے، میرے محترم ذی شان دوست، تمھارے نام ور والد حضرت وحید الحسن ہاشمی کا ایک مختصر سا مکتوب بھی تھا۔ مَیں پھر بھی کچھ نہ لکھ پایا، شاید یہ سب کچھ اِس اقرارِ جرم کے اسباب میں سے تھا، جو آج اس تحریر کے ذریعے ظہور میں آ رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے، بہت اصرار سے مجبور ہو کر، مَیں نے تمھارے نام، اُدب کی شناخت اور قدرِ تحقیق کے بارے میں، اپنا نقطۂ نظر سمجھاتے ہوئے ایک مختصر سا مکتوب یقیناً لکھا، جو شاید کبھی تمھارے نام آئے ہوئے، خطوط، چھپوانے والوں کو تمھاری فائل سے کبھی مل پائے۔ مَیں نے کہا تھا ''تم نے اپنی کتاب زندگی کے اوراق سے بھی کہیں زیادہ، صفحات تحریر کر ڈالے۔ یہ ایک محیر العقول سا کام لگتا ہے، ایسی سرعت تحریر، ہمارے اُدب نگاروں میں اَب کہیں شاذ ہی مل سکے گی، یہ تحیر خیال عموماً اہلِ علم نے، مؤلف بحار الانوار کے بارے میں کیا تھا، جو میں آج تمھارے بارے میں کر رہا ہوں۔''

''سُنا تم نے! سمجھا تُم نے'' ! سپردِ زمین کرتے ہوئے، تمھارے سرہانے کھڑے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا حدیث ماثورہ میں آتا ہے، تلقین کے اس جواب میں تم جیسے نیک انجام کہتے ہیں'' ہاں میں نے

سُنا'''' ہاں، مَیں نے سمجھا'' مَیں تلقین کے وقت، دفنِ میت پر حاضر تو نہ تھا، سیکڑوں لوگوں سے سُنا ضرور کہ تمھارا چہرہ ایسا تازہ دم تھا جیسے ابھی بول پڑو گے۔ جیسے کہو گے، ''مَیں سب کچھ سُن رہا ہوں''۔ اسی جرأت و یقین پر، یہ مخاطبہ اس تحریر کے ذریعے تُم سے کر رہا ہوں۔

تمھارا وجود زمانے پہ ایسا کیا بھاری تھا؟ کہ سہائے نہ سہا جاسکا، تمھارا جرم کیا تھا؟ کہ تمھارے بچوں کو یتیم کر دیا گیا۔ کیا کوئی جان سکتا ہے؟ جب تمھاری میت گھر پر لائی گئی، درودیوار سے لگے وحشت زدہ، چہروں نے کیا کیا ہوگا، آہوں سسکیوں اور آنسوؤں کے اس ہجوم میں کون تھا؟ جو سوگوار نہ ہو، مگر ہر اشک بار آنکھ دوسری اشک بار آنکھ سے پوچھتی تھی۔ انسانی جان کی ارزانی کہاں تک جائے گی؟ مذہب اور مسلک کے نام پر ہمارے وطنؔ میں، قتل و غارت گری کا یہ بازار کب تک کھلا رہے گا؟

شبیہ الحسن: سُن رہے ہو! تم نے احتیاط نہیں کی۔ تُم نہیں ڈرے۔ مگر وہ جو احتیاط بھی کر رہے ہیں، ڈر بھی رہے ہیں: کیا خبر کون اُنھیں ماردے، کافر کہہ کر۔

◆◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن تخلیقی ناقد اور ہمہ جہت صلاحیتوں سے مالا مال دانش ور

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

◆◆

ڈاکٹر شبیہ الحسن ہمہ جہت شخصیت ہونے کے سبب بیک وقت مختلف اَدبی وعلمی محاذوں پر سرگرم عمل نظر آئے، ان کا طرزِ احساس اور اندازِ گفت گو سب سے الگ اور ان کی تحریر میں شائستگی، متانت اور رکھ رکھاؤ ان کی پہچان تھی، وہ ایسے گھر کے چشم و چراغ تھے جہاں تہذیبی طور طریقے، مجلسی آداب اور نشست و برخاست پر خاص توجہ دی جاتی ہے، سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنے تمام بیٹوں کی تعلیم و تربیت اس نہج پر کی کہ وہ سب کے سب ان کی طرح شعوری طور پر محبت، نرم خوئی اور احترامِ آدمیت کے دلدادہ اور بزرگوں کی شفقت کو عزیز جانتے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی زندگی اپنے ہم عصر لوگوں کے درمیان ایک مثال بن گئی، وہ سب کی بھلائی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے، اپنا بیشتر وقت دوسروں کی خدمت کے لیے وقف کرتے، شبیہ الحسن کی مثال پارس کی سی تھی کہ جو ان کے قریب آیا اسے سونا بنا دیا، کتنے لوگ ان کی رہنمائی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اعلا ترین ڈگری حاصل کر کے نام ور ہوئے، وہ خلوصِ دل سے ہر اس شخص کی مدد کرتے جو ان سے راہ و رسم رکھتا، ان کے شاگردوں نے مختصر وقت میں اَدبی کارنامے سرانجام دیے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی نمایاں خوبی یہی تھی کہ وہ کبھی تنگ دل نہ ہوئے بل کہ خوش دلی کے ساتھ معاونت پر آمادہ نظر آئے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے ایک جگہ لکھا کہ شبیہ الحسن کا متجس ذہن ہر وقت اَدب و نقد کے بارے میں نئے پہلو اُجاگر کرنے میں مصروف رہتا ہے، ان کے تحقیقی مقالات ہوں، تنقیدی مضامین ہوں یا ہلکے پھلکے اُسلوب میں تحریر کردہ کالم، ان سب میں مشترکہ عنصر یہ ہے کہ شبیہ الحسن نکتہ طرازی کرتے ہوئے نئے نئے نکات کی کھوج میں رہتے ہیں' اسی طرح شہزاد احمد (مرحوم) نے لکھا ''یوں تو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اَدب کی کئی جہات میں کام کیا ہے مگر ان کا محبوب موضوع مرثیہ ہے اور پھر اسی حوالے سے مرثیہ نگار بھی۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے تحقیقی و تنقیدی مقالات کے حوالے سے مفاہیم، ترجیحات، اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار، تصریحات، مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، جدید لہجے کا شاعر۔

سیف زلفی، حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں۔ اسی طرح شخصیت اور فن پر بہت سی کتابیں لکھیں ان میں آغا صاحب، قیصرِ اقلیمِ مرثیہ اور تعینات میں شامل مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے اپنے والدِ گرامی کے مرثیوں کی تدوین ''العطش'' کے دو مختلف ایڈیشنوں میں کی اور ہر مرثیہ زندہ اور متحرک اہلِ قلم دانش وروں کی آرا کے ساتھ شایع کیا، انھوں نے ''اُردو شعر و اَدب کے سفیر'' ایسی تحریر پیش کی جس میں دبئی، کینیڈا، قطر، امریکا، جرمنی، فرانس، آسٹریلیا اور انگلستان میں آباد اُردو اَدب کی آبیاری کرنے والے اہلِ قلم کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا۔

ان کا اشہبِ قلم برق رفتاری کے ساتھ منزلیں سر کرتا رہا، ان سے ملک و قوم کو بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، نئی نسل کے لوگ ان کی صحبت سے اور ان کے تنقیدی اور تحقیقی و تخلیقی تجربوں کی روشنی میں کیا کچھ حاصل کر رہے تھے مگر ڈاکٹر شبیہ الحسن کا چراغِ زندگی بجھانے اور ان کا خون بہانے کے لیے درون پردہ سازش تیار کی گئی، پردۂ شب میں دشمن جان گھات لگائے ہوئے تھا، وہ اپنے ادارے پیک سلوشن سے باہر آئے۔ ابھی کار کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے کہ سنسناتی ہوئی دو گولیاں ان کے بدن کو چیرتی ہوئی نکل گئیں، ان کو سروس ہسپتال پہنچایا گیا لیکن کوشش کے باوجود ان کو بچایا نہ جاسکا، وہ صبح ہونے سے پہلے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی شہادت کی خبر ملتے ہی دوست، احباب، عزیز و اقارب، اہلِ قلم، ان کے شاگرد، ادارے میں کام کرنے والے، اہلِ محلّہ، غرض سبھی ان کے گھر رحمٰن پورہ میں جمع تھے، ہر شخص پریشان حال تھا کہ انھیں کس نے قتل کیا، ان سے کسے اختلاف تھا، وہ تو علم و اَدب کی روشنی پھیلا رہے تھے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے سیاست یا مذہب پر کبھی کوئی گفت گو نہیں کی وہ بڑے وسیع المشرب انسان تھے۔ وہ ہر مکتبِ فکر کا احترام کرتے، سب کی عزت کرتے، ان کے حلقۂ احباب میں مسلم اور غیر مسلم مسیحی ادیب اور دانش ور شامل تھے، ڈاکٹر کنول فیروز ایڈیٹر 'شاداب' لاہور مسیحی قلم کار نے کہا کہ شبیہ الحسن مجھ سے بھائیوں کی طرح ملتے، مجھے ایوارڈ ملنے پر مبارک باد پیش کی۔ اپنے والدِ محترم کے مرثیے پر مجھ سے لکھوایا۔ وہ تو بے ضرر آدمی تھا، اسے ٹارگٹ کیا گیا، ڈاکٹر کنول فیروز جذباتی ہو رہے تھے اور ان کے جنازے میں شامل دوسرے احباب کے ساتھ وہ بھی رو رہے تھے۔ لاہور میں اتنا بڑا جنازہ پہلی بار دیکھا گیا، سخت گرمی کے باوجود لوگوں کا اژدہام تھا۔ ان کے گھر سے سڑک کے دوسرے سرے تک انبوہِ کثیر تھا، ہر شخص ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شرافت، وضع داری اور اَدب پروری کا ذکر کرتا دکھائی دیا۔ لاہور کے بیشتر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے جنازے میں شرکت کی اور اس کے بعد الحمرا کے سب سے بڑے ہال میں تعزیتی ریفرنس ہوا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تین گھنٹے یہ اجلاس جاری رہا جس میں اٹھارہ مقررین، دس شعرا اور ان کے بھائیوں نے اظہارِ خیال کیا۔ ایسا تعزیتی ریفرنس بھی آج تک لاہور میں کم دیکھنے کو ملا، ہر شخص تصویرِ غم بنا ہوا تھا، اس اجلاس میں خواتین کی بڑی تعداد نے شمولیت کی، کئی مرتبہ گریہ وزاری کی آوازیں بلند ہوئیں، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، شہزاد احمد،

ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر ضیاء الحسن اور بہت سے دوسرے احباب شبیہ الحسن کی اَدبی خدمات اور ان کے قتلِ ناحق پر گفت گو کرتے رہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے عزیز خاص ڈاکٹر عباس رضا کی نظامت میں یہ تعزیتی اجلاس شام تک جاری رہا۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا کہ شبیہ الحسن ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھوں نے مختصر عرصے میں کیا کچھ کر دکھایا۔ انھوں نے اپنے اساتذہ سے بڑھ کر تنقید و تحقیق میں کشادہ نظری کا ثبوت فراہم کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے ''تعینات'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر سچّی بات کہی کہ ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اپنے دل کش اُسلوب سے تنقید و تحقیق کو تخلیق کا درجہ دیا ہے اور مصنف کے باطن سے اس کا تخلیقی جوہر تلاش کرنے کی کاوش کی ہے'' تعینات میں انھوں نے سترہ مضامین جمع کیے جو سب کے سب چونکانے والے اور معلومات میں اضافہ کرنے والے ہیں مثلاً پیغمبر شعر و سخن۔ مصطفےٰ زیدی، لکھنوی تہذیب کا آخری چراغ۔ سید آلِ رضا، ڈاکٹر آغا سہیل کی افسانہ نگاری، ایک گمشدہ تہذیب کا باشندہ۔ ڈاکٹر سہیل احمد خان، حفیظ تائب اور حُبِّ محمدؐ و آلِ محمدؐ، ڈاکٹر سلیم اختر ایک تہذیبی خاکہ نگار، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے ''آشوب'' میں عصری آشوب، طالب جوہری کے شعری جواہر اور اس قبیل کے دوسرے مضامین سے ڈاکٹر شبیہ الحسن کے مطالعے کی وسعت اور حقائق منکشف کرنے میں ان کی دیدہ ریزی کا اعتراف کرنا ضروری ہو جاتا ہے، ان کی خوب صورت تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے جس میں ان کا تجزیہ و تنقید لائق صد تحسین ہے۔

''ماضی پرست ناقدین کا المیہ یہ ہے کہ حال سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، ماضی کے تمام تخلیق کار تو ان کی چشمِ بصیرت میں معتبر مقام کے حامل ہوتے ہیں جب کہ موجودہ عہد کے لکھنے والے انھیں کم معیار معلوم ہوتے ہیں، اس طرزِ احساس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ماضی کی روایات کو تو زندہ و تابندہ رکھنے کی خواہش کرتے ہیں لیکن ان میں عصرِ حاضر کا لہو شامل کرنے کے لیے کدو کاوش نہیں کرتے۔ اس صورتِ حال میں اَدب و شعر کی ترقی مزید سست رفتار ہو جاتی ہے اور تازہ افکار و نظریات اس عظیم روایات کا حصہ نہیں بن پاتے، میرے خیال میں وہ تخلیقی شہ پارہ صاحبانِ فکر و نظر کی نگاہ میں کبھی اعتبار حاصل نہیں کر پاتا جس میں ماضی کی روشن روایات، حال کی دیدہ وری اور مستقبل کی خیال آرائی موجود نہ ہو، عظیم تخلیق کار وہی کہلانے کا اہل ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو اپنی تخلیق میں یک جا کر دے، تعینات میں موجود تمام تخلیق کاروں میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود ہے۔''

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ہلکے پھلکے کالم لکھے اور ''اَدبی بیٹھک'' میں ان کا انتخاب شائع کیا، اسی طرح اُردو شعر و اَدب کے سفیروں کے بارے میں جن پاکستانی دانش وروں نے اپنی اپنی آرا پیش کیں ان کی تعداد ۱۱۰ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عہدِ موجود کے بیشتر قلم کاروں نے ان کے کام کو سراہا مگر افسوس یہ ہے کہ ایسے منفرد مزاج، اَدب نواز، نقاد اور محقق کو اس وقت موت کی نیند سلا دیا گیا جب اسے عہدِ موجود کی اَدبی زندگی میں خونِ جگر کا اعجاز

دکھانے کی فکر لاحق تھی، ڈاکٹر شبیہ الحسن غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے اور ان کے والدِ گرامی سید وحید الحسن ہاشمی کے بقول ''وہ خود کو ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے پر آمادہ رہے'' وہ اپنے پاس کچھ بھی بچا کر نہیں رکھنا چاہتے تھے، وہ جہالت کے اندھیرے کاٹنے کی خاطر اپنے لہو سے چراغ روشن کرنا سیکھ چکے تھے۔ ڈاکٹر اپنی ذات میں روشنی کا استعارہ بن چکے تھے، وہ شاعری سے زیادہ نثری خدمات انجام دینا چاہتے تھے اس کے باوجود شاعری میں بھی اپنا مخصوص رنگ و آہنگ دکھاتے رہے، انھوں نے رخصت سے قبل پیش گوئی کرتے ہوئے یہ کہا:

اپنے گھر میں بھی اجنبی ہوں میں
جرم یہ ہے کہ روشنی ہوں میں

◆◆◆

شبیہ الحسن ہاشمی میرا دوست، میرا اُستادزادہ

ڈاکٹر آغا سلمان باقر

••

شور مچاتی کلاس میں، ہیڈ ماسٹر صاحب کا چپڑاسی، وحشیانہ نظروں سے گھورتا ہوا، داخل ہوا۔ ایک لمحے کو خاموشی چھائی اور سب طالب علموں نے تیزی سے پلٹ کر اُسے دیکھا اور پھر درگزر کرتے ہوئے اُسی شوروغل میں مصروف ہو گئے کہ سب ٹھیک ہی ہے۔ اُس نے اندر داخل ہوتے ہی للکار کر کہا۔

''......اِس جماعت میں کون ہے سلمان باقر......؟''

ہیڈ ماسٹر کے چپڑاسی کے منہ سے اپنا نام سن کر میں ٹھٹھک گیا۔ بے اختیار کھڑے ہو کر میں نے کہا۔

''......جی......مَیں ہوں......''

''......چل بیٹا......لگتا ہے آج تیری شامت آئی ہے......!''

مَیں بے اختیار اپنے بنچ سے اُٹھا اور اُس کے حکم کی تعمیل میں چپڑاسی صاحب کی طرف، اُس کے ہم راہ چلنے کو لپکا۔ چپڑاسی نے مجھے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور باقی کلاس کو دھمکی دے کر برامدے میں ہولیا یہ راستہ سیدھا ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے تک جاتا تھا۔

چق اُٹھا کر ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ابھی میں کچھ سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ چپڑاسی نے اپنی روایتی پھرتی دکھائی اور بولا۔

''......لو جی......سر جی......آٹھویں جماعت سے سلمان باقر حاضر ہے......''

ہیڈ ماسٹر صاحب نے، جو اپنے ہاتھوں میں مسلسل، پونے دوفٹ کا بانس نما بید بڑی پھرتی اور چابک دستی سے گھما رہے تھے، میری طرف گھور کر دیکھا۔ اُس لمحے میں نے دل میں سوچا، لو جی...... آج تو خیر نہیں...... کمرے کا دیگر منظر کچھ ایسے تھا کہ ایک معروف شاعر اُن کے سامنے تشریف رکھتے تھے۔ جن کو عرفِ عام میں ماسٹر راحت ٹونڈا کہا جاتا تھا۔ اُس وقت وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو کوئی شعر سنا رہے تھے۔ کمرے کے دائیں کونے میں ایک پتلا دُبلا، منحنی سا لڑکا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھوں میں کوئی کتاب تھامے، جلدی جلدی سبق یاد کر رہا تھا۔

اُس کی ایک نظر کتاب کے ورق پر پڑتی تھی اور دوسری ہم تینوں پر اُچکتی تھی۔ وہ پتلا سا لڑکا، اِس سب کے باوجود کتاب کا سبق یاد کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کا دل کہیں اور ہے، آنکھیں کسی اور سمت ہیں اور زبان کتاب سے منسلک ہے۔ عین اُسی وقت جب ہیڈ ماسٹر صاحب، ماسٹر راحت حسین راحت کے کسی شعر پر دل کھول کر داد دے رہے تھے، اُن کی نظر اُس خوف زدہ، کتاب والے لڑکے سے دوچار ہوئی، اُنھوں نے داد و تحسین کو درمیان میں چھوڑا اور گرج کر بولے۔

''......شبیہ کیا دیکھتا ہے، اِدھر اُدھر...... یہ ایس اے اگر ابھی یاد نہ کیا تو تیری وہ چمڑی اُدھیڑوں گا کہ تیرے والد بھی یاد رکھیں گے اور......!''

ماسٹر راحت نے زبردست قہقہہ لگایا...... بولے۔

''......ہاشمی صاحب...... اپنے بیٹے کے والد کو تو بخش دیں۔ کر لے گا یاد...... آپ میرے اشعار کے رموز عارفانہ پر توجہ فرمایئے۔''

ہاشمی صاحب نے غالباً ماسٹر راحت صاحب کی بات پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور بات کاٹ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''......سلمان باقر تمھارے والد بہت دنوں سے نہیں آئے، اُن کو میرا سلام کہو اور اُن سے کہنا کہ جب صحت اجازت دے تو تشریف لا کر ہمارا جدید مرثیہ ہی سن لیں۔ اَب تم جا سکتے ہو......''

میں نے جی بہتر کہا اور باہر آ گیا۔

یہ تھے ہمارے قزلباش حسینیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر وحید الحسن ہاشمی اور وہ جو کمرے کے کونے میں سبق یاد کرنے والا صاحب زادہ تھا...... وہ تھا، شبیہ الحسن ہاشمی! شبیہ کو اُس روز مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

....

مدتیں بیت گئیں۔ گویا چند سال اور گذر گئے...... اورینٹل کالج لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ میں بھی اُس مشاعرے میں شریک تھا۔ حسن رضوی کو اُس مشاعرے کی نظامت کے لیے خصوصاً مدعو کیا گیا تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ مشاعرے میں شبیہ الحسن کا نام پکارا گیا۔ شبیہ الحسن نے خوب صورت غزل پڑھی۔ خوب داد و تحسین ملی۔ کسی نے مجھ سے کہا...... وحید الحسن ہاشمی کا کلام لگتا ہے۔ میں نے بے ساختہ کہا...... نہ شبیہ ایسا ہے اور نہ ہی ہاشمی صاحب۔ وہ اپنی اولاد کی یوں پذیرائی نہیں کرتے۔ یہ کلام شبیہ کا ہی ہے۔ منجھا ہوا [redacted] لیے ہے کہ شبیہ الحسن شاعر ابنِ شاعر ہے اور میں جانتا ہوں کہ وحید الحسن ہاشمی ایسے والد ہیں کہ جو اپنی اولاد پر ایسی شفقت قطعی نہیں فرماتے۔ ورنہ اُن کی ساری اولاد ہی شاعر ہوتی اور بعد کے زمانے نے اِس بات کو ثابت بھی کیا۔ اس لیے کہ ہاشمی صاحب کی وفات کے بعد شبیہ الحسن اور بڑا شاعر بن کر اُبھرا۔

غالباً، شبیہ الحسن سے میری دوستی کا آغاز اُسی دن ہو گیا تھا کہ جب وہ ہاشمی صاحب کے کمرے میں سبق یاد کر رہا تھا۔ بعد میں ایک دن میں نے شبیہ الحسن کو یہ واقعہ اور دن یاد کرایا تو شبیہ الحسن نے ایک بھرپور قہقہہ، خلاف معمول لگایا اور کہنے لگا۔ یار، سچ بتاؤں کہ اُس دن ابا نے مجھے اتنا دھمکا رکھا تھا کہ میں سبق یاد کرتے ہوئے، خشک آنکھوں اور خاموش ہچکیوں کے ساتھ وہ انگریزی کا ایس اے یاد کر رہا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ میرے میٹرک کے امتحان تھے۔ میں چپکے سے ایک انٹر کالجیٹ مشاعرہ سننے چلا گیا۔ گھر واپس آیا تو ابا، آگ بگولا بنے بیٹھے تھے اور اماں پان چبا رہی تھیں۔ کسی من چلے نے ابا کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ آج فلاں کالج کے مشاعرے میں آپ کے صاحب زادے نے جو غزل پڑھی ہے، وہ کمال تھی۔ ماشاء اللہ، آپ کا نوجوان آگے چل کر بڑا شاعر بننے کی پوری صلاحیت سے مالا مال ہے۔ پُوت کے پاؤں، پالنے میں نظر آتے ہیں...... ہاشمی صاحب ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں خوش ہوئے ہوں مگر اُن کو پتہ تھا کہ اگلے دو روز بعد میٹرک کا انگریزی کا پیپر ہے اور صاحب زادے مشاعرے پڑھتے پھر رہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا۔ گھر پہنچا تو دُرگت کا پورا سامان موجود تھا۔ خوب ڈانٹ پھٹکار پڑی اور سزا یہ ملی کہ آج میں اُن کے ساتھ اسکول جاؤں گا۔ اور وہاں کونے میں کھڑے ہو کر انگریزی کے تمام مضامین، فر فر یاد کر کے سناؤں گا۔ مگر وہاں بھی عجب ہوا۔ ماسٹر راحت صاحب آ گئے اور اُنھوں نے اپنی شاعری سنانا شروع کر دی۔ میرے لیے یہ عجب سامانِ عبرت تھا۔ ایک طرف شاعری اور دوسری طرف انگریزی کو یاد کرنا...... بس یہی وجہ تھی کہ میں یاد تو انگریزی کر رہا تھا مگر دل شاعری میں اٹکا تھا، خشک آنکھیں رُو رہی تھیں؛ اور خاموش ہچکیاں، حلق میں پھنسی ہوئی تھیں کہ جب تم کانپتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تھے......"

یار شبیہ...... معاف کرنا...... تمھارے والد محترم وحید الحسن ہاشمی صاحب کی اسکول میں دہشت ہی اتنی زیادہ تھی...... حالت یہ تھی کہ اگر کلاس شور کر رہی ہوتی اور کوئی لڑکا اُونچی آواز سے، جھوٹ ہی کہہ دیتا" ...... ہاشمی صاحب......" تو ایسی خاموشی چھاتی کہ مکھی کے بھنبھنانے کی آواز بھی، جناتی آواز کا رُوپ دھار لیتی۔ وہ بچوں کو پڑھانا چاہتے تھے۔ مجھے تو وہ انگریزی پڑھاتے تھے۔ جو انگریزی، ہاشمی صاحب نے آٹھویں جماعت میں پڑھا دی...... وہ یقین مانو، آج تک کام آ رہی ہے۔ پٹائی وہ، صرف اُن ہی لڑکوں کی کرتے تھے جو اُن کو زچ کر دیتے تھے۔ ورنہ وہ کمال کے شفیق اور نفیس انسان تھے۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر وہ شاعر تھے، شاعر کا دل، دماغ اور رُوح رکھتے تھے...... اور مَیں جانتا ہوں کہ شاعری کرنے والا ہمیشہ نازک احساسات اور پیار بھری طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ وحید الحسن ہاشمی بھی ایسے ہی حساس اور نازک طبع تھے۔

پھر شبیہ الحسن کالج میں لیکچرار ہو گیا۔ جس کالج میں بھی رہا۔ وہاں کی اُدبی سوسائٹی کا وہی روحِ رواں ہوتا تھا۔ گویا شبیہ کی وجہ سے اُس کالج میں مشاعروں کی رُومان پرور فضا، گئی بہار کی طرح لوٹ آتی۔ کالج میگزین رنگ وشعر سے سج جاتا تھا۔ اس لیے کہ اُس میگزین میں شبیہ الحسن اپنے نازک احساسات اور فطری نفاست

پسندی سے میگزین کو رُوپ چڑھا دیتا۔ شبیہ الحسن کی شاعری، فطرت کے ہم آہنگ تھی۔ اُس کی سوچ وفکر میں رسیلا ٹھہراؤ تھا۔ وہ اُدب عالیہ میں دن رات کھویا رہتا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی موجودگی میں شعریت کا ماحول، پوری آب وتاب کے ساتھ پروان چڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایک لڑکیوں کے کالج میں بطور مہمانِ خصوصی بلایا گیا۔ شبیہ الحسن کی صدارت میں مشاعرہ تھا، وہ بھی صنفِ نازک کی بھری پُوری دنیا میں...... شبیہ نے مجھے فون کیا...... کہنے لگے سلمان، بھائی یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے...... بتاؤ کیسی غزل پڑھوں۔ میں نے کہا...... بھائی پریشان نہ ہو...... جیسی غزلیں لڑکیاں، لونڈیاں، بالیاں پڑھیں، بس اُسی نوعیت کی پھڑکتی ہوئی اپنی غزل پڑھ دینا۔ وہ تم سے انتہائی رومانوی غزل کی توقع لگائے ہوں گی پھر مجھے کل بتانا کہ کیا ہوا...... اگلے روز صبح ہی شبیہ الحسن کا فون میرے دفتر آ گیا۔ اَب جو کچھ اُنھوں نے فرمایا، وہ کچھ یوں تھا۔

''...... لو بھئی...... لڑکیوں کے کالج پہنچ گیا۔ گیٹ پر پرنسپل صاحبہ اور دیگر خواتین پروفیسرز نے استقبال کیا...... جیسے مَیں کوئی آسمان سے انوکھا اُترا ہوں اور سید حا اسی ''وطنِ حُسن'' میں حضرت آدم کی طرح جا اٹکا ہوں۔ کالج کی بزمِ اُردو کی دوشیزاؤں نے پھولوں سے میرا استقبال کیا۔ حسین چہرے، رنگین لباس میں ملبوس دوشیزائیں جب تمھارے بھائی شبیہ الحسن کو پھول پیش کرتی تھیں، تو مَیں دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ اِن کو بھلا پھول پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو خود حسین کلیاں ہیں۔ پھول تو اُن سے کم تر ہیں...... یہ سوچتا جاتا اور پھول وصول کر کے ایک اور ساتھ کھڑی لڑکی کو تھما دیتا...... بس منہ سے کچھ نہ بولتا تھا۔ دل ہی دل میں، اپنے آپ سے باتیں کرتا، خاموشی سے اسٹیج تک آیا۔ لڑکیوں نے اسٹیج کو رنگ برنگی، گل نار دوپٹوں سے سجا رکھا تھا اور چاروں طرف پھول ہی پھول اپنی بہار دے رہے تھے۔ پھول دونوں طرح کے تھے...... خیر مشاعرہ شروع ہوا۔ ایسے ایسے طرح دار اشعار پڑھے گئے کہ الاَمان الحفیظ۔ تم نے سچ کہا تھا کہ حالات کے مطابق اپنی غزل پڑھ دینا۔ مَیں نے تین غزلیں پیش کیں۔ مزا آ گیا...... لطیفہ تو سب سے آخر میں ہوا۔

ہوا یہ کہ ایک دوشیزہ آٹوگراف لینے آئیں...... فرمانے لگیں...... آپ سیّد ہیں۔ میں نے کہا الحمدللہ۔ جی ہاں! فرمانے لگیں میں بھی سیّد ہوں۔ پھر تو سب ٹھیک ہو جانے کی اُمید پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کیا مطلب۔ کہنے لگیں آپ کی اماں کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا اَب...... مَیں حیرت سے بھونچکا رہ گیا۔ مگر بھولا بن کر بولا...... کیا کہہ رہی ہو تم...... کہنے لگی...... مجھے اپنی بہو بنانے پر اماں کو تو کوئی عذر نہ ہو گا...... میں نے کہا بی بی...... ہوش کے ناخن لو...... مَیں تو پہلے سے شادی شدہ ہوں...... کہنے لگی...... میں نے پتہ کر لیا ہے اور مجھے پتہ ہے۔ مَیں تو دوسری زوجہ کی اُمیدوار ہوں...... میں یہ سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ ایسا سٹ پٹ بھاگا کہ پلٹ کر نہ دیکھا......''

....

زندگی اور شبیہ الحسن سے محبتوں کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اُس نے کالج بنالیا تو وہ اور مصروف ہو گیا۔ مَیں اپنے معمولات میں مصروف ہوتا گیا۔ مگر ملاقاتیں بدستور ہوتیں رہتی تھیں۔ پوری محبتوں اور دل نشینی کے ساتھ۔ اکثر مشاعروں کی نظامت، اِس شہر لاہور میں شبیہ الحسن کرتا۔ مَیں بھی اُس میں بطور شاعر شریک ہوتا تو شبیہ الحسن ہمیشہ مجھے بڑے اَدب اور احترام سے مائک پر بلاتا اور مولانا محمد حسین آزاد کے تعارف کو کرانا کبھی نہ بھولتا۔ میں شبیہ سے کہتا کہ بس میرا نام لیا کرو اور بلا لیا کرو۔ تو وہ کہتا کہ جناب حضرت قبلہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے پوتے کو پڑھنے کے لیے بلاؤں اور اُن کا ذکر نہ کروں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد کے اُردو اَدب پر وہ احسانات ہیں کہ اُن کے کارناموں کا ذکر، اُن کے نام میں پوشیدہ ہے اور اُن صاحبِ علم لوگوں کا نام ہی اَدب میں خیر و برکت کا التزام ہے۔ مَیں حضرتِ مولانا آزاد کے نام کے بنا آپ کو کیسے اسٹیج پر طلب کر سکتا ہوں۔ مجھے اِس سے نہ روکیے۔ میں جواباً کہتا...... شبیہ بھائی، آپ کی محبت بے پناہ ہے۔ میں اُس کا احترام کرتا ہوں۔ چلیے جیسے آپ خوش ہوں۔

....

شبیہ الحسن ہاشمی ایک اَن تھک، ادیب اور شاعر تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اَدب اور تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ جب بات کرو، جب اُن سے ملو...... وہ بتاتے کہ یہ کام ہو رہا ہے، فلاں کام اختتام کو ہو گیا ہے اور اَب یہ نیا اَدبی کام شروع کرنے والا ہوں۔ دن رات تالیف، ترجمہ، تدوین، ترتیب چلتی رہتی...... شاعری ہمہ وقت جاری رہتی...... مَیں نے پوچھا کہ بھائی سوتے کب ہو تو کہتے یار وقت کم ساگتہ ہے۔ جتنا کام کرسکتا ہوں کر لیتا ہوں۔

شبیہ الحسن نے اپنے والد کی وفات کے بعد، اُن کے لیے بھی بہت کام کیا۔ حضرت وحید الحسن ہاشمی کی زیرِ ترتیب تصانیف کو احترام اور خوب صورتی سے شایع کرایا۔ اُن کے نام کو مزید عالی شان بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس سلسلے میں جو سب سے خوب صورت کتاب مرتب کی وہ ''وحیدِ عصر'' تھی...... ''وحید عصر'' ہاشمی صاحب کی زندگی میں طبع ہوئی۔ ہاشمی صاحب نے مجھے بتایا کہ اِس کتاب کے پس منظر میں صرف اور صرف شبیہ الحسن کا ہاتھ ہے۔ گو وہ ہاتھ ٹھیک طرح سے نظر نہیں آتا۔ مگر ایک صاحبِ علم بیٹے نے، اپنے باپ کو زندگی میں ''وحیدِ عصر'' کی صورت میں ایسا تحفہ دیا ہے، جس کی تمنا ایک باپ کو ہو سکتی ہے۔ میری اِس تمنا کو بار آور شبیہ الحسن نے کیا ہے، جس کے لیے میں شبیہ کو قیامت تک دعا دیتا رہوں گا۔ یہ اُسی کی دن رات کاوش و محنت کا ثمر ہے۔

....

ایسا منحوس لمحہ تھا کہ بار بار فون بجتا تھا۔ اور ہر کوئی ایک ہی جملہ کہتا تھا۔

''...... کسی ظالم، نابکار نے شبیہ الحسن کو مار دیا...... وہ اَب دنیا میں نہیں رہا......''

ظلم وستم کی داستان میں شبیہ الحسن کا نام بھی مظلوم بن کر شامل ہو گیا۔ افسوس کہ کچھ ایسے عناصر بھی اس پاک وطن میں آ کر بس گئے ہیں کہ جو ہر صاحب علم اور صاحب وجدان کو نہ صرف زندگی سے محروم کر دیتے ہیں بل کہ ہمارے ملک کو علم سے جہالت کی طرف تیزی کے ساتھ دھکیل رہے ہیں۔ غالباً وہ چاہتے ہیں کہ یہاں اُن کا اور صرف جہالت کا راج اور دَور دورہ ہو جائے۔ نہ کوئی صاحب علم رہے اور نہ ہی ذکرِ علم و دانش ہو...... صرف اور صرف وہ ہوں اور جہالت کی گھمبیر تاریکی ہو...... شبیہ الحسن تو مر گیا مگر علم کی صورت میں اُس کی جلائی ہوئی شمعیں، پھر بھی جہالت گر بجھا نہ سکے۔

میں خاص طور پر اُس جگہ گیا جہاں جہالت گروں نے رُوشن گر کو زندگی سے محروم کیا تھا۔ مَیں وہاں کافی دیر تک رُکا رہا...... کھڑا رہا...... اور سوچتا رہا کہ شبیہ الحسن ابھی سامنے سے آ جائے گا...... وہ نہ آیا...... پر مجھے لگا کہ اُس کی رُوح اُسی طرح مسکراتی ہوئی آ رہی ہے۔ میں نے اُس کی روح کو مسکراتے دیکھا تو خود بھی بے اختیار مسکرانے لگا...... ایک راہ گیر نے مجھ سے رُک کر کہا...... روتے بھی ہو اور مسکراتے بھی ہو......!

◆◆◆

عاشقِ علم وادب۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی یاد میں

اعتبار ساجد

••

پچھلے دنوں خیال آیا کہ ایسے ارباب علم وفن تلاش کیے جائیں جنھوں نے تن تنہا ایک ادارے کی حیثیت سے ان تھک لگن اور محنت سے کام کیا ہو۔ کچھ نام ذہن میں تھے۔ کچھ ڈھونڈ رہا تھا اسی دوران اظہار سنز کے برادرم محمد علی انجم نے میرے موضوع سے متعلق چند کتب مجھے عنایت کیں ان میں سے ایک کتاب تھی ''ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات (تجزیہ وتنقید) سچی بات یہ ہے کہ تدریسی اور نصابی حوالوں سے ایسی کتب بے حد اہمیت کی حامل ہوتی ہیں لیکن میں ارباب علم وفن کے کوائف کی تلاش میں تھا جس کے ذریعے علم ہو سکے کہ فلاں ادیب یا محقق کیا محض چند کتابوں کا خالق ہے یا اس کا مجموعی کام ایک بڑے ادارے کے کام کے مماثل ہے؟ یوں ہی رسماً میں نے کتاب کے مندرجات دیکھے۔ کوائف کا حصہ آیا تو اسے تمام وکمال پڑھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا کام؟ اتنا کام ایک فردِ واحد نے کیسے کرلیا۔ یہ تو ایک بڑے ادارے کا کام تھا جس کا اسٹاف درجنوں افراد پر مشتمل ہو اور جسے طباعت واشاعت کی ہر ممکنہ سہولت حاصل ہو۔ مگر یہاں تو فردِ واحد تھا۔ نہ اس کا کوئی اسٹاف تھا نہ پرنٹنگ پریس تھا نہ پیپر مل تھی۔ تنِ تنہا، ایک معلم، محقق، مفکر، ادیب، شاعر۔ گھر اور تدریس کی تمام ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی نبھانے والا ایک تنہا آدمی، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے والد گرامی اور نامور مرثیہ گو سیّد وحید الحسن ہاشمی سے میرے والد محترم سیّد علمدار حسین (مرحوم) کی بچپنے سے دوستی تھی ایک ہی شہر میں دونوں نے شعور کی آنکھ کھولی تھی پھر جب لاہور میں اقامت گزیں ہوئے تو کبھی کبھار کا ملنا جلنا بھی جاری رہا۔ میں بسلسلہ ملازمت (تدریس) زیادہ تر بلوچستان اور اسلام آباد میں رہا۔ اس لیے وحید الحسن ہاشمی صاحب کے صاحب زادے کی حیثیت سے تو ڈاکٹر شبیہ الحسن سے یاد اللہ تھی مگر تعلقات ایسے قریبی نہیں تھے جنھیں دوستی کہا جا سکے۔ یہ دوستی برسوں بعد ان سے الحمرا آڈیٹوریم کی ایک تقریب میں ہوئی جس میں انھوں نے اپنے ادبی رسالے ''شام وسحر'' کی چند کاپیاں اور کچھ کتابیں مجھے عنایت کیں۔ ان کا اپنائیت بھرا لہجہ اور اندازِ تکلم مجھے بہت پسند آیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ عالم فاضل آدمی ہیں۔ یہ نہیں

جانتا تھا کہ وہ بڑے رکھ رکھاؤ، تہذیب اور وضع دارانہ رویوں کے کشادہ دل انسان ہیں۔ چند ملاقاتوں کے بعد اندازہ ہوا کہ میں ایک منجھے ہوئے ادیب، محقق اور شاعر ہی سے نہیں ایک بے حد محبت کرنے والے انسان سے مل رہا ہوں۔ ان اَدبی ملاقاتوں کے دوران یادداشتوں پر مشتمل میری کتاب ''یادیں باقی رہ جاتی ہیں'' شایع ہوئی تو ایک نسخہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو بھی دیا۔ انھوں نے کتاب غور سے دیکھی۔ ورق گردانی کی پھر پوچھنے لگے ''اسے اچھی طرح پڑھ لوں تو اس پر لکھوں گا بھی اور کہیں اس کی تقریب رونمائی ہوئی تو پڑھوں گا بھی۔''

مَیں نے صاف گوئی سے کہا ''تقریب رونمائی کی بابت تو میں نے سوچا نہیں۔ یہ بڑے بکھیڑے کا کام ہے۔ کتابیں تو اتر سے چھپتی رہتی ہیں۔ کچھ کی تقریب ہو جاتی ہے، کچھ کی نہیں ہوتی۔ اس کام میں پڑ جاؤں تو لکھوں گا خاک؟''

انھوں نے بڑی اپنائیت سے کہا ''ہم کریں گے اس کی تقریب۔ کتاب اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کچھ نہ کچھ اس کا ڈسپلے بھی ہونا چاہیے۔ بس آپ جائیں۔''

مَیں وہاں سے اُٹھ کر سیدھا شہزاد احمد صاحب کے پاس پہنچا۔ کتاب انھیں دے چکا تھا۔ اب درخواست گذار تھا کہ تقریب ہو تو اس کی صدارت شہزاد احمد کریں۔ شہزاد صاحب انتہائی خلیق، انتہائی شفیق اور انتہائی خوب صورت انسان تھے۔ تھوڑی سے لیت و لعل کے بعد مان گئے۔ اس تقریب یا کتب کا بیان مقصود نہیں صرف یہ بتانا اور ریکارڈ پر لانا ضروری ہے کہ اس تقریب کا سارا اہتمام ڈاکٹر صاحب نے کیا۔ میرا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہونے دیا۔ مَیں نے شکریہ اَدا کرنا چاہا تو کہنے لگے ''بعض اچھے کاموں کا شکریہ وصول کر کے اچھے کام کا ثواب زائل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ اپنا شکریہ دعا کی شکل میں میری طرف منتقل کر دیں۔ یہی بڑی نعمت ہے۔''

ان کی علم دوستی اور کشادہ دلی کے بہت سے واقعات میری نظر سے گذرے ہیں لیکن ان سب خصوصیات اور خوبیوں سے قطع نظر جو بات میرے لیے دل چسپی اور حیرت کا سبب بنی ہے وہ علم و اَدب سے ان کی محبت، ان تھک محنت اور مسلسل ریاضت علم ہے۔ لہٰذا ان کا مجموعی کام ایک ادارے کے برابر معلوم ہوتا ہے اور یہی میرا موضوع ہے۔

۲۷ رجنوری ۱۹۵۸ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے سیّد شبیہ الحسن کا قلمی نام حسن ہاشمی تھا۔ میٹرک ۱۹۷۴ء میں، ایف اے ۱۹۷۶ء میں، بی اے ۱۹۷۸ء میں، ایم اے (اُردو) ۱۹۸۱ء میں، ایم فل ۱۹۹۱ء میں اور پی ایچ ڈی ۱۹۹۶ء میں۔ ملازمتیں اعزازی لیکچرر شپ سے لے کر پروفیسر شپ تک مختلف کالجوں میں کیں۔ تعلیمی اعزازات کی تعداد ۷ اور اعتراف کارکردگی کے قومی نوعیت کے اعزازات کی تعداد ۴ ہے۔ ''شام و سحر'' کے اقبال، فیض، ساحر، ظہیر کاشمیری، سلیم اختر، صبا اکبر آبادی، آغا سہیل نمبر کے علاوہ متعدد نمبر اپنی ادارت میں بڑے اہتمام اور تحقیقی تدبر سے شایع کیے۔ مقالاتِ قلمی کی تعداد انگنت ہے۔ بے شمار کتب جن کی نوعیت تخلیقی بھی

ہے اور تحقیق بھی، تصنیف کیں۔ صرف یہی نہیں کہ تحقیق کی اور کسی خاص موضوع کو چن کر اس پر زورِ قلم صَرف کیا بل کہ موضوعات میں تنوع کا بطور خاص خیال رکھا۔ بالخصوص ان کا بڑا کام یہ ہے کہ انھوں نے فراموش کردہ ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں پر تحقیق کی۔ اور دن رات صرف کر کے خون پسینہ بہا کر ایک ایک پہلو میں تحقیق کی غیر جانبداری اور معیار کو سامنے رکھا اور اتنے صفحات لکھے کہ اگر انھیں تعداد میں شمار کیا جائے تو وہ سیکڑوں نہیں ہزاروں سے تجاوز کر جائیں گے۔ بلاشبہ، بلاتردد یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیقی اور تنقیدی اُدب میں یہ کام ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ معدودے چند لوگ ہیں جنھوں نے یہ قلمی مشقتیں اور ریاضتیں کی ہیں جن میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا ہے۔

میں کبھی تنقید کا آدمی نہیں رہا۔ یہ بڑا صبر طلب کام ہے لیکن تحقیق اور تنقید میری دل چسپی کے موضوعات اس لیے رہے کہ جو اہلِ قلم یہ قلمی جہاد کرتے ہیں وہ محض قلم کاریوں کے جوہر نہیں دکھاتے، انھیں ہزاروں لاکھوں کتابیں کھنگالنی پڑتی ہیں۔ ان میں سے متعلقہ اور مطلوبہ حصوں کو نشان زد کر کے انھیں ایک خاص تسلسل کی لڑی میں موضوع کے مطابق پرونا پڑتا ہے اور اس کی تکمیل کے بعد بھی بار بار اس پر نظرِ ثانی اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ متعلقہ موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ بلاشک وشبہ یہ محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ اور اگر مسلسل کیا جائے تو فرہاد کی کوہ کنی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فرہاد کا عشق دودھ کی نہر بہانے کے لیے نہیں تھا اس کا مقصد شیریں کی خوشنودی تھی۔ سقراط نے زہر کا پیالہ سچائی کی مہر لگانے کے لیے پیا تھا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی برسوں پر پھیلی ہوئی علمی، اَدبی اور تحقیقی محنتوں کو دیکھتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شخص ادب کا فرہاد تھا یا سقراط؟ اسی مخمصے میں ہوں کہ انھیں کیا نام دُوں۔ ان دو ناموں کے علاوہ تیسرا نام میرے ذہن میں نہیں آتا۔

میں فرہاد نہیں ہوں، مانا، نہریں کیوں کھدواتے ہو
گر سقراط نہیں تو زہر کا پیالہ کیوں پکڑاتے ہو
میں برگد کا پیڑ ہوں اور تم لوگ مسافر لمحوں کے
میرے سائے میں آتے ہو تم، میرے سائے سے جاتے ہو
آبلہ پا تھا لیکن تپتی ریت پہ چلتا رہا مدام
تم ٹھنڈے کمروں میں بیٹھے، دانش ور کہلاتے ہو

◆◆◆

پروفیسر صاحب میری نظر میں

سید فدا حسین امتیاز گیلانی

◆◆

اس دنیا میں انسان کو پروردگارِ عالم نے جو زندگی دی ہے وہ نہایت مختصر ہے اور اس مختصر سی زندگی میں وہی انسان عظمت اور کامیابی حاصل کرتے ہیں جو شدید محنت اور کوشش کرتے ہیں اور پھر ان ہی لوگوں کے اوصاف ہمارے لیے رہ نمائی کا باعث بنتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ کمال کی بلندیوں کو چھوتے ہیں اس وجہ سے یہ لوگ اس دنیا سے رخصت ہونے کے باوجود زندہ و پائندہ رہتے ہیں۔ اگر ہم اس حوالے سے دیکھیں تو پروفیسر سید شبیہ الحسن ہاشمی کی شخصیت بھی اُن افراد میں شامل ہے۔ اگر چہ وہ ہم سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن اُن کا کام ہمارے پاس موجود ہے جو انھیں صدیوں تک زندہ رکھے گا۔ سید شبیہ الحسن صاحب کا خاندان اگر چہ اُردو اَدب میں خاصا بلند مقام رکھتا ہے لیکن جو منفرد شہرت اور پہچان پروفیسر صاحب کے حصے میں آئی وہ کسی کو نہ مل سکی۔ انھوں نے اُردو اَدب میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اُس کی وجہ سے اُن کا شمار اُن قدرآور شخصیات میں ہونے لگا کہ اُن کے ذکر کے بغیر اُردو اَدب ہمیشہ نامکمل رہے گا۔ اَدب کی وہ کون سی صنف ہے جسے پروفیسر صاحب نے اپنے انداز سے بیان نہ کی ہو۔ بطور نقاد، شاعر، تخلیق کار وغیرہ کے اُن کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

بہت سے لوگ پروفیسر شبیہ الحسن صاحب کو بطور ایک اَدبی شخصیت کے جانتے ہوں لیکن اُن کے قریبی لوگ یہ بتاتے ہیں کہ اُن کی شخصیت کے بہت سے رُخ تھے۔ وہ تخلیقی کام کے علاوہ بھی بہت سے فرائض انجام دیتے تھے۔ کوئی بھی تقریب ہو بلانے والے یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ضرور تشریف لائیں گے نہ صرف تشریف لائیں گے بل کہ علم کے موتی بھی بکھیریں گے۔ دوست، رشتہ دار کبھی کوئی بھی اُن سے ناخوش نہ تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بھی اپنی مذہبی تقاریب میں انھیں اپنے پاس موجود پاتے۔ خاص طور پر پروفیسر صاحب چھوٹے پیشے سے وابستہ افراد کو تحفے بھی دیتے تھے۔ کوئی بھی شخص اُن سے ناراضگی کا تصور بھی نہ کرتا تھا بل کہ جس سے بھی وہ ملاقات کرتے وہ انھیں اپنا ہی سمجھتا تھا۔

پروفیسر صاحب ہمیشہ مصروف دکھائی دیتے تھے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اُن کے جسم میں کام کرنے والا ایک جن موجود تھا جو کبھی تھکتا نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب اپنے متعلق اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ انھوں نے کیوں کہ کبھی وقت ضائع نہیں کیا اس وجہ سے وقت اُن کے پاس ہمیشہ محفوظ رہا ہے۔ اور انھوں نے بڑے سلیقے اور قرینے سے وقت کا استعمال کیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے مخلص اور ہر دل عزیز شخصیت کو نہ جانے کس کی نظر کھا گئی اور وہ اچانک ہی سب کو افسردہ کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہم انھیں اپنے درمیان ہمیشہ موجود پائیں گے۔ اُن کی باتیں، اُن کی تخلیقات، ہمیشہ ہمارے لیے رہ نمار ہیں گی۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی

خورشید بیگ میلسوی

••

سید محسن نقوی کے بعد سیّد شبیہ الحسن پر "بارود کی بارش اور خون کے چھینٹے" کربلائی تسلسل کی یاد دلا رہے ہیں۔ ایک نے شہرِ غزل کے جمود کو توڑا تو دوسرے نے "رثائی ادب" کو تنقیدی جدت سے سرفراز کیا۔ اہلِ اَدب حیرت زدہ ہیں اور ایسی غم کی گہری کھائی میں ہیں جہاں خون ہی خون ہے، دھواں ہی دھواں ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹ مئی ۲۰۱۲ء کی شب اپنی تعلیمی مصروفیات مکمل کر کے جوں ہی اپنی گاڑی کی طرف بڑھے اچانک ان پر گولی چلا دی گئی اور وہ کسی شقی القلب کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ حیف صد حیف آخر وہ کون لوگ تھے جنھوں نے ایک شخص کو نہیں پوری اَدبی دنیا کو خون میں نہلا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ گھناؤنی سازش اور قابلِ مذمت واردات اَدب پسندوں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اگر اسی طرح دانش وروں اور ادیبوں کو ہدف بنایا جائے گا تو "سہاگ" تو اردو اَدب کا اجڑے گا۔ انسان فانی ہے، اسے تو موت آنی ہی ہے مگر ایسے اعلیٰ دماغوں کی موت در حقیقت بہت بڑا سانحہ ہے جس کا ازالہ کسی طور ممکن نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن تو انتہائی بے ضرر انسان تھے۔ انھوں نے تو سوائے خدمتِ علم واَدب کے کسی فرد کو دکھ نہیں پہنچایا پھر یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟ ان کی شہادت ایک سوالیہ نشان بن گئی ہے؟؟؟

پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن متعدد بار میلسی تشریف لائے اور جب ان کی موت کی خبر آئی تو...... میلسی کے اَدب دوستوں کا کیا حال ہوا؟ اس کا بیان سہل نہیں۔ ہر آنکھ اشک بار تھی، ہر دل سوگوار تھا۔ "میلسی رائٹرز فورم" کے زیرِ اہتمام پروفیسر شفیق الرحمن الہٰ آبادی نے ایک تعزیتی اجلاس بلایا جس میں اہلِ قلم نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات گراں مایہ اور ان کی بے لوث شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے علاوہ ان کے لیے فاتحہ خوانی بھی کی۔ اسی طرح ملک کے دیگر شہروں میں اَدبی ریفرنسز برپا ہوئے اور تادیر ہوتے رہے انھوں نے ہر سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ قرار دیا۔ وہ ایک عظیم مرثیہ نگار تھے۔ انھوں نے اپنے والد گرامی جناب سید وحید الحسن ہاشمی (مرحوم) سے یہ عظیم ورثہ پایا اور اپنے والدِ گرامی کی مرثیہ نگاری کے علا

اور ناقدانہ مضامین لکھ کر مرثیہ کی بہارِ بے خزاں کو خوشبو عطا کی۔ الغرض ڈاکٹر صاحب نے نقد و تحقیق کے انبار لگا دیے۔ ان کی حب الوطنی اور اسلام سے محبت غیر معمولی تھی۔ ہر ملنے والا شخص ان کو اپنا سمجھتا تھا۔ یہی نہیں بل کہ ہر فرد کو یہ احساس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ جناب پروفیسر آصف وٹو اور پروفیسر وحید عزیز نے (خدا انھیں سلامت رکھے) ان کی عظیم شخصیت کو کتاب کی شکل میں لانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب نے راقم سے بھی خصوصی محبت کا اظہار کیا۔ انھوں نے جہاں میرے مضامین کو اپنی کتب میں شامل کیا وہیں میری کتابوں پر بھی خامہ فرسائی کی۔ جناب پروفیسر شفیق الرحمن الہٰ آبادی اور مجھ سے انھیں بہت زیادہ محبت تھی۔ وہ مجھے اکثر پیار سے ''علامہ'' کہہ کر پکارتے تھے۔ اہلِ میلسی کے لیے ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن صاحب جہاں ایک عظیم نقاد، محقق، فلسفی، شاعر، ادیب اور خوب صورت انسان تھے وہیں ایک عظیم خطیب بھی تھے۔ ان کا لب ولہجہ محفل میں ایک سماں باندھ دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ جانِ محفل بھی تھے اور جانِ اَدب بھی۔ کہیں وہ کالج میں لیکچر دے رہے ہیں، کہیں کسی محفل میں اُردو اَدب کے موضوعات پر گفت گو ہو رہی ہے، کہیں ''ریسرچ سنٹر'' میں بیٹھ کر اَدب کی اصلی ضروریات، تاریخی مناظر، عالمی تقاضوں جیسے اہم موضوعات پر لکھا جا رہا ہے اور کہیں احباب کے خطوط کے جوابات دیے جا رہے ہیں۔ غرض کہ وہ لکھتے چلے گئے چوں کہ لکھنا اور پڑھنا ہی ان کے حصے میں آیا۔ سو انھوں نے جس قدر لکھا اس کی تعریف کرنا ضروری تو ہے مگر مجھ جیسے بے مایہ شخص کو یہ توفیق بھی ڈاکٹر صاحب کی حوصلہ افزائی اور کردار و عمل کی زیبائی نے عطا کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انھوں نے جو دامنِ اَدب پر گل بوٹے سجائے ہیں وہ ہمیشہ شاداب رہیں۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن جنت الفردوس میں جا پہنچے ہیں اور ہم بھی اسی راستے پر رواں دواں ہیں۔ یقیناً جلد یا بدیر ان سے ملاقات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی آخرت بہتر بنائے۔

◆◆◆

اُستادِ مکرّم

سیّد فخر حسین بخاری

••

اگست /ستمبر ۱۹۸۸ء کی بات ہے، دن اور تاریخ مجھے یاد نہیں۔ ایف سی کالج لاہور میں ایم اے اُردو کے داخلے کے لیے انٹرویو تھا۔ تمام امیدواروں سے ان کی اسناد لے لی گئی تھیں۔ کمرے میں ایک صاحب موجود تھے جو ایک ایک امیدوار کا نام پکارتے اور اسے صدر شعبہ اُردو کے کمرے میں بھیجتے۔ کبھی کبھی کسی امیدوار سے کوئی بات بھی کر لیتے۔ جب میری باری آئی تو میری اسناد پر نظر ڈالتے ہوئے میرا اور میرے والد صاحب کا نام دیکھا اور کہا: ''تم خورشید صاحب کے بیٹے ہو؟'' میں نے جواب دیا: ''جی ہاں۔'' مزید تبصرہ ہوا: ''خورشید صاحب کا بیٹا اور نمبر اتنے کم! ہم تو انھیں اپنا اُستاد تصور کرتے ہیں۔ ان کی کتابیں پڑھ کر ہم نے ایم اے کیا اور تمھارے نمبر اتنے کم!'' مَیں شرمندہ اور خاموش۔ میں یہ سمجھا تھا کہ یہ کوئی طالب علم ہیں جنھیں اُستادوں نے اپنی مدد کے لیے ساتھ رکھ لیا ہے۔ لیکن جب کلاسز کا آغاز ہوا تو معلوم ہوا کہ موصوف پروفیسر شبیہ الحسن ہیں اور ہمیں پڑھائیں گے۔ پروفیسر شبیہ الحسن صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

شبیہ صاحب خاصی پُرکشش شخصیت کے حامل تھے اور خاصے متحرک بھی۔ انھیں اپنے مضمون پر دسترس حاصل تھی۔ طلبہ کے ساتھ ان کا رویہ خاصا ہمدردانہ ہوا کرتا تھا۔ جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا اور شبیہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کبھی ایسا نہ ہوا کہ مایوس لوٹے ہوں۔

طلبہ ہمیشہ سے آسانی اور سہولت کے متلاشی رہے ہیں۔ شبیہ صاحب کا طریقہ تدریس یوں تو بہت سادہ اور دل کش ہوتا تھا لیکن طلبہ کی سہولت اور آسانی کے پیشِ نظر بہت کچھ لکھوا بھی دیا کرتے تھے جس سے طلبہ کو خاصی سہولت رہتی تھی۔ ایف سی کالج کے دور میں تو خیر شبیہ صاحب سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی اور ان کے علم سے استفادہ بھی۔ لیکن جو ملاقاتیں ایم۔ اے کرنے کے بعد ہوئیں ان میں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ میرا لاہور تو جانا رہتا ہی تھا۔ جب بھی لاہور جاتا تو انجم رضوی صاحب سے ملنے اُردو بازار بھی جاتا۔ رضوی صاحب شبیہ صاحب کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ کبھی کبھی وہاں شبیہ صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی شبیہ صا

کبھی اپنی کسی تصنیف کی طباعت کے سلسلے میں کبھی کسی دوست کے ساتھ وہاں تشریف لاتے۔

نو آموز محقق اور ناقد عام طور پر اُدب کے بڑے بڑے ناموں خصوصاً کلاسیک سے آغاز کرتے ہیں۔ شبیہ صاحب کا نظریہ تھا کہ میرؔ و غالبؔ، اقبالؔ و اکبرؔ پر تو بہت سا کام ہو چکا اب اس امر کی ضرورت ہے کہ علاقائی اُدب کو کھنگالا جائے۔ اپنے علاقے کے شاعروں، ادیبوں پر لکھنا چاہیے۔ اس سے ایک تو مضافات کے شاعر اور ادیب گمنامی سے نکلیں گے دوسرے علاقائی اُدب کی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے گا۔ اس رجحان کی ترغیب کے لیے انھوں نے اپنے مجلّہ ''شام و سحر'' کو بھی استعمال کیا۔ اس مجلّے کے ذریعے بہت سے نئے لکھنے والے متعارف ہوئے۔ شبیہ صاحب نے مجھے بھی تحریک دی کہ میں بھی کچھ لکھا کروں اور جو کچھ لکھوں اسے چھپوا دیا کروں اور مجھے پیش کش کی کہ اگر مَیں اپنی کوئی تحریر انھیں بھجواؤں گا تو وہ ضرور حوصلہ افزائی کریں گے۔ لیکن مَیں اپنی فطری سستی اور سہل نگاری کی بنا پر اس پیش کش سے استفادہ نہ کر سکا۔

شبیہ صاحب نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت سا کام کیا۔ قدرت نے انھیں متحرک جسم اور ذہن عطا کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ انھیں بہت تھوڑی مدت میں بہت سے کام کر کے اس دنیا سے رخصت ہونا تھا۔

◆◆◆

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

شفیق الرحمن الہ آبادی

◆◆

''کُل نفسٍ ذائقة الموت'' سے انکار ممکن نہیں مگر بعض نابغۂ روزگار شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی جدائی سوہانِ روح بن جاتی ہے۔ بلاشبہ پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شہادت بھی ایک ناقابلِ فراموش سانحہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا اولین تعارف آج سے تقریباً پندرہ برس قبل ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور کے توسط سے اس وقت ہوا جب وہ اس کے اعزازی مدیر تھے۔ میں جب بھی کوئی مضمون یا تبصرہ برائے اشاعت ارسال کرتا تو وہ اسے نہ صرف شایع فرماتے بل کہ تحسین بھی فرماتے ان کی حوصلہ افزائی سے مزید لکھنے کی تحریک ملتی، بعدازاں ان کی بے لوث محبت اور علم دوستی کی بدولت یہ قلمی تعلق قلبی تعلق میں تبدیل ہوگیا اور ڈاکٹر صاحب میری فرمائش پر اپنے مصروف اور قیمتی وقت سے کچھ وقت نکال کر چار پانچ مرتبہ میلسی تشریف لائے اور ہر دفعہ مجھے میزبانی کا شرف بخشا۔

ان کی رہنمائی اور مشاورت سے میری تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ''آئینۂ خیال'' ۲۰۰۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔ انھوں نے کمال محبت سے پیک سلوشن کالج لاہور میں اس کی تقریب پذیرائی کا اہتمام فرمایا جس کی صدارت نام ور محقق اور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے فرمائی جب کہ ڈاکٹر عبدالکریم خالد، پروفیسر فرقان احمد قریشی، پروفیسر آصف وٹو، پروفیسر وحید عزیز ودیگر علمی اور اَدبی شخصیات نے اظہار خیال فرمایا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف مجھے بل کہ تمام مہمانوں کو خوب صورت تحائف سے بھی نوازا۔ ڈاکٹر صاحب کھلے دل اور کھلے ہاتھ کے مالک تھے وہ جب بھی میلسی تشریف لاتے میرے لیے اور دوسرے دوستوں کے لیے قیمتی سوٹ، ڈائریاں، کتب ودیگر تحائف لے کر آتے۔ ان کی جب بھی کوئی تازہ کتاب شایع ہوتی تو مجھے فون پر اس کی اشاعت کی خوش خبری سناتے اور کتاب ارسال فرماتے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ انھوں نے اپنی تین نایاب کتب ترغیبات، اَدبی بیٹھک اور اَدبی چوپال میں میری شخصیت وفن پر بہت خوب صورت مضامین

تحریر فرمائے۔اس کے علاوہ مختلف اَدبی رسائل واخبارات میں میرے حوالے سے کالم بھی تحریر فرمائے۔ماہ نامہ "تعمیرِ ادب" کیہ نے جب مجھ پر خاص نمبر شایع کیا تو اس میں سب سے مفصل مضمون ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تھا جسے میں فخر سے اپنی (سی وی) بھی کہتا ہوں۔ان کی شہادت سے ایک روز قبل میری ان سے موبائل پر بات ہوئی۔ مَیں نے کہا سر جی آپ کیسے ہیں؟ میلسی کب تشریف لا رہے ہیں؟ تو فرمانے لگے! شفیق بھائی زیادہ لکھنے کی وجہ سے انگلیوں میں درد ہے۔ڈرائیونگ بھی صحیح طریقے سے نہیں کر پاتا دعا کریں۔ میں نے دعا کے ساتھ ساتھ انھیں خورشید بیگ میلسوی کا یہ شعر سنایا!

تمھارے واسطے پوروں کو زخمی کر لیا میں نے
توقع اور کیا رکھتے ہو تم اپنے لکھاری سے

تو بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے مَیں ٹھیک ہو جاؤں تو میلسی ضرور آؤں گا مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اچانک ہم سب کو چھوڑ کر ہماری پہنچ سے بھی دور پہنچ جائیں گے۔ ۲۰ مئی کو ہم نے میلسی رائٹرز فورم کے زیر اہتمام انجم آرٹ گیلری میں ان کے لیے تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا جس میں راقم الحروف کے والد محترم حاجی غلام مصطفیٰ نجمی اور خورشید بیگ میلسوی، سعید احمد انجم، تحسین یزدانی، مظہر حسین مظہر و دیگر احباب نے اظہار خیال کیا اور ڈاکٹر صاحب کی علمی واَدبی خدمات کو منظوم ومنثور خراج تحسین پیش کیا۔

دوسرے دن لاہور سے پروفیسر آصف وٹو کا فون پر پیغام ملا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ۲۶ مئی بروز ہفتہ ۱۱ بجے دن الحمرا ہال نمبر ۲ میں تعزیتی ریفرنس ہے تو مَیں اپنے دوستوں مرید عباس الماس، سعید احمد سعید اور سعید نوشاہی کے ہمراہ الحمرا ہال میں پہنچا تو عجیب دُکھ بھری کیفیت تھی۔ڈاکٹر صاحب نے پوری زندگی دوسروں کے لیے محفلیں سجائی تھیں اپنے سے زیادہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو اہمیت اور عزت واحترام دینے والی ہر دلعزیز شخصیت اک پروگرام میں موجود نہ تھی البتہ ان سے محبت کرنے والوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ جب ہال بھر گیا تو بعد میں آنے والے افراد واپس نہیں گئے بل کہ ڈاکٹر صاحب کی محبت میں سیڑھیوں پر بیٹھتے گئے۔صدارت ڈاکٹر سلیم اختر نے کی جب کہ دیگر مہمانوں میں پروفیسر ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، شہزاد احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی، صوفیہ بیدار، ڈاکٹر فخر الحق نوری، عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر طارق عزیز شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عباس رضا نے انجام دیے۔ مقررین نے جب ڈاکٹر شبیہ الحسن کی شخصیت وفن پر روشنی ڈالی تو ہال میں موجود تمام سامعین اشک بار ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کی یادوں اور باتوں کو یاد کر کے اپنے جذبات واحساسات پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ان کی شہادت کے بارے میں ان کے بھائی عرفی ہاشمی نے ایک انکشاف یہ بھی کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک شاگردہ کے بقول چند دن پہلے وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں کے درمیان بیٹھے تھے کہ ان کے شاگردوں نے انھیں ایک حدیث سنائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ اس ماہ آپ جو دعا مانگیں گے وہ ضرور

پوری ہوگی۔ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ کیا یہ روایت مستند ہے؟ جب انھوں نے تصدیق کی تو ڈاکٹر صاحب نے دعا مانگی یا اللہ! مجھے شہادت عطا فرمانا، دُعا کے بعد جب دوستوں کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ انھوں نے آمین نہیں کہا تو خود تین بار آمین کہا اور یوں ان کی دعا قبول ہوگئی۔

۱۸ رمئی بروز جمعہ کو ڈاکٹر صاحب پیک سلوشن کالج کینٹ کیمپس میں تعلیمی و انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے تشریف فرما تھے کہ رات کے دس بج گئے، بجلی چلی گئی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا میں اب چلتا ہوں تم کلوزنگ کر کے آجانا۔ ان کی گاڑی کیمپس کے عقب میں کھڑی تھی اندھیرا تھا وہ جیسے ہی گاڑی کے قریب گئے اور دروازہ کھولنے لگے تو دو نامعلوم افراد نے آپ پر فائرنگ کر دی اور موٹر سائیکل پر فرار ہوگئے۔ آواز سن کر جب لوگ کالج سے باہر آئے تو ڈاکٹر صاحب شدید زخمی تھے ان کو فوراً ہسپتال لے جایا گیا مگر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شب ۲ بجے انھوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی اور شہادت کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ ان کے بھائی کے بقول ان کی جیب سے ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی آخری تحریر ایک آزاد نظم ''چلو اک بار پھر فطرت کی بانہوں میں چلے جائیں'' ملی ہے۔ جس میں ان کے رخصت ہونے کے واضح اشارے موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پوری زندگی علم کی شمع روشن کیے رکھی اور یہی ان کا جرم بن گیا۔ رام ریاض نے کہا تھا :

ہاتھ خالی ہوں تو دانائی کا اظہار نہ کر
ایسی باتوں کا بڑے لوگ برا مانتے ہیں

ڈاکٹر صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں ہر چیز کا شارٹ کٹ موجود ہے مگر علم اور محنت کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شہادت کے تناظر میں ان کے اپنے یہ دو شعر قابلِ ذکر اور قابلِ غور ہیں:

اپنے گھر میں بھی اجنبی ہوں میں
جرم یہ ہے کہ روشنی ہوں میں
شہر کا شہر ہے فرشتہ صفت
ان فرشتوں میں آدمی ہوں میں

معروف شاعر اور کالم نگار امجد اسلام امجد ۲۴ رمئی کے روزنامہ ''ایکسپریس'' میں اپنے مستقل کالم ''چشم تماشا'' میں رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر شبیہ الحسن کی یاد میں حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے منعقدہ خصوصی تعزیتی اجلاس میں بیٹھا میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ آخر اس ''روشنی کے مجرم'' اور فرشتوں کے جھرمٹ میں گھرے آدمی نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو یک لخت اس قدر بہیمانہ انداز میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا گیا۔''

مشہور افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس یونس جاوید نے اپنے تعزیتی کلمات میں اس بات پر زور دیا کہ ہم لوگ، ہمارا پریس اور میڈیا دہشت گردی کی اس سازش کے اصل مجرم یعنی امریکا کا نام کیوں نہیں لیتے جس کے ایما پر یہ سلسلہ جاری ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن مذہبی نہیں ادبی آدمی تھے وہ انسانیت سے بے لوث پیار کرتے تھے وہ اپنے خطاب میں اور کالموں میں اکثر اس شعر کا حوالہ ضرور دیتے تھے:

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے

◆◆◆

منفرد نقاد اور مخلص انسان

گلشن آراء طارق

◆◆

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اُدب کا درخشاں ستارہ تھا۔ ان کا دم اس کائنات میں غنیمت تھا۔ وہ باکمال اور منفرد ادیب اور نقاد تھے بل کہ اس سے بھی بڑھ کر وہ سچے اور مخلص انسان تھے۔ ان کی انسان دوستی اور وفاداری کے چرچے ہر زبان پر ہیں اور وہ دوستوں کے ساتھ تو مخلص تھے ہی بل کہ ان سے مخالفت رکھنے والے بھی ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ وہ علم واَدب کے سچے پرموٹر تھے۔ ہر لحہ وہ علم واَدب کے فروغ کے لیے سرگرم عمل رہتے۔ انھوں نے جتنے مضامین، جتنی کتابیں لکھیں، جتنے مکالے انھوں نے لکھوائے اور راہنمائی کی یہ سب ان کی اَدبی خدمات ہیں، جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ میری ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن سے ملاقات جاوید صدیق بھٹی کی اَدبی بیٹھک میں منائی جانے والی سالگرہ کی تقریب میں ہوئی جس کی وہ صدارت کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان سے ملاقاتیں رہیں۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ سینئرز کا احترام کرتے اور جونیئرز کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انھوں نے بے شمار نئے لکھنے والوں پر کالم اور مضامین لکھے۔ ان کا لکھا ہوا کالم یا مضمون جب چھپ جاتا تو وہ اس شخص کو جس پر کالم لکھا ہوتا خود فون کر کے بتاتے۔ تحفے تحائف دینا بھی ان کی خاص خوبی تھی۔ غرضیکہ ان کی وفات سے اَدبی میدان میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین!)

◆◆◆

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

جاوید صدیق بھٹی

◆◆

ہم اُس عہد بے سروسامان میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ہم عزت سمیٹنے کے تو قائل نہیں مگر کسی کو عزت و وقار دینے کے روادار نہیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایک مخلص انسان پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن تھے جو زندوں کی قدر کرتے تھے۔ ان پر مضمون لکھتے تھے، ان پر کتابیں لکھتے تھے اور ان کی پذیرائی کے لیے تقاریب منعقد کراتے تھے اور اس سارے کام میں انھیں ذاتی نمود و نمائش کی ہرگز طلب نہیں ہوتی تھی۔ اُن کا یہ طرزِ عمل ولیوں جیسا تھا۔ وہ زندوں سے بھی محبت کرتے تھے اور مُردوں سے بھی۔ اُنھوں نے کئی مردہ ادیبوں کی تخلیقات کو شایع کر کے انھیں حیاتِ نو عطا کی۔ وہ ایسے شخص تھے کہ مُردوں اور زندوں سب کے دوست اور رفیق تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس ہماہمی کے زمانے میں بھی ڈاکٹر شبیہ الحسن کی عزت کرتے تھے اور ان کے لیے حرفوں کے پھول نچھاور کرتے تھے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن اکیسویں صدی کے وہ منفرد محقق اور نقاد تھے جن کا تخلیقی سفر کبھی رُکا نہیں۔ وہ ایک سمندر کی مانند تھے جو مسلسل رواں دواں ہو اور تشنگانِ علم و اَدب اس سے متواتر سیراب ہو رہے ہوں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ خوش مزاجی اور شگفتہ پن اُن کی شخصیت کی ایک خوبی تھی۔ عاجزی اور انکساری بھی ان کا ایک خاص وصف تھا وہ جتنے بڑے آدمی تھے اتنے ہی حلیم اور عاجز تھے ان سے ایک بار ملنے والا دوبارہ ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ بڑی خوب صورت باتیں کرتے تھے جب وہ باتیں کرتے تو سننے والے کی خواہش طول پکڑتی جاتی تھی کہ وہ باتیں کرتے جائیں اور وہ سنتا جائے۔ کسی محفل یا تقریب میں جب تقریر کرتے تو سننے والے سب کام چھوڑ کر محو ہو جاتے۔ وہ شعر بھی اس قدر اچھے طریقے سے پڑھتے کہ سننے والے مزے لے کر سنتے اور بار بار سننے کی فرمائش کرتے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی و تخلیقی افکار سے شعر و اَدب اور تحقیق و تنقید کو نئی راہیں سجھائیں۔ ان کی پندرہ سے زائد کتب جو تحقیق اور تنقید پر مشتمل ہیں

اربابِ دانش و بینش سے داد و تحسین حاصل کرچکی ہیں انھوں نے صنف مرثیہ کے حوالے سے مختلف نوعیت کے باا عتبار کام کیے۔ ان کو جتنی عزت اور شہرت ملی کم کم ادیبوں اور نقادوں کو نصیب ہوئی۔

وہ خلوصِ دل اور خلوصِ نیت سے ہر آدمی کا کام کرنے پر بڑی فراخ دلی سے آمادگی کا اظہار کرتے تھے اور جب تک وہ کام تکمیل کے سارے مراحل طے نہ کر لے وہ اس کام کی پیروی کرتے تھے۔ مجھے ان کی شخصیت اور ذات میں ایک بات جو بہت پسند تھی وہ یہ کہ وہ کسی بھی شخص کی برائی نہیں کرتے تھے۔ مَیں نے ان کی ذات میں کبھی منفی سوچ نہیں دیکھی وہ مثبت سوچ کے مالک تھے۔ ہر شخص کا کام کرتے تھے کبھی کسی کو ٹالتے نہ تھے۔ وہ کبھی کسی کے خلاف بات نہ کرتے تھے۔ مَیں نے ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ آپ نے کبھی کسی کے خلاف بات نہیں کی۔ انھوں نے اپنے خاص سٹائل میں مسکرا کر جواب دیا کہ مَیں اتنا پاگل نہیں کہ اپنا وقت ضایع کروں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ زندگی کے خوب صورت لمحات فضول اور بے کار باتوں میں ضایع نہ کرے۔ دوستوں سے مسلسل رابطہ رکھنا، ان کو تحفے تحائف دینا ان کا خاصا تھا۔ میرے ساتھ بھی ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر دن میں ایک مرتبہ بھی رابطہ نہ ہوتا تو ناراض ہو کر کہتے ''یار! زیادہ مصروف ہو گئے ہو۔ سارا دن کوئی رابطہ ہی نہیں ہوا'' آج مَیں جب ان کی قربت اور محبت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنی ذات میں کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ان کا نام رہتی دُنیا تک زندہ رہے گا۔

◆◆◆

اک روشن چراغ تھا نہ رہا

پروفیسر راشد طفیل

◆◆

زندگی کا سفر جس برق رفتاری سے گزر رہا ہے اس کے گزرنے کا احساس ہمیں نہ جانے کیوں نہیں۔ یہ بات سوچتے سوچتے سمجھ نہیں آتی کہ زندگی اتنی ارزاں کیوں ہوگئی ہے۔ انسان کی قدر و منزلت کا احساس ہمیں بروقت کیوں نہیں ہوتا۔ جب وہ لوگ ہم میں موجود ہوتے ہیں تو ہمیں اُن کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اِس دورِ ترقی میں سماجی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی روایات شاید اپنا اثر کھو رہی ہیں اور معاشرہ جمود کا شکار نظر آتا ہے یا اکیسویں صدی میں زندگی کے تمام رویے سائنسی اور مادی ہو چکے ہیں۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر وحید قریشی، احمد فراز، حمید اختر، منشا یاد، شہزاد احمد، ہاجرہ مسرور ہم سے جُدا ہوئے۔ جانے والے اُردو زبان و اَدب کی شان تھے۔ نئی صدی میں اُردو اَدب کا تعارف تھے۔ ان سب نے اپنی تمام زندگی اُردو زبان و اَدب کی خدمت اور اس کے فروغ کے لیے صرف کردی۔ پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی (مرحوم) بھی اِسی کاروانِ علم و اَدب کا حصہ تھے اور تادمِ رحلت مذہب، شعر و اَدب اور تدریس کے شعبہ سے منسلک رہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تخلیقی، تنقیدی اور بطور اُستاد سفر چار دہائیوں پر مشتمل ہے۔ شہر لاہور جو تہذیب و تمدن، زبان و اَدب کا اہم مرکز گردانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تمام زندگی کے شب و روز اِسی مرکز میں بسر کیے وہ حلقۂ اربابِ ذوق اور انجمنِ ترقی مصنفین کے ہفتہ وار اجلاسوں میں اکثر شرکت کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود بھی ''عالمی مجلس اَدب'' کے نام سے ایک اَدبی تنظیم بنائی تھی۔ اس پلیٹ فارم سے نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی (مرحوم) کا تعلق مذہبی، علمی گھرانے سے تھا۔ اُن کے والد سید وحید الحسن ہاشمی (مرحوم) مرثیے کے اعلا پائے کے شاعر اور اُردو زبان و اَدب کے ماہر بھی تھے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ابتدائی تربیت اسی مذہبی، علمی، اَدبی ماحول میں ہوئی۔ اسی علمی و اَدبی ماحول کی وجہ سے انھوں نے شعر و اَدب کے حوالے سے جو کام کیا ہے آج زمانہ اس کا معترف ہے۔ اُن کے بھائی عرفی ہاشمی بھی اچھے

شاعر ہیں ڈاکٹر صاحب کو یونی ورسٹی میں سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سہیل احمد خاں اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سے پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ہاشمی (مرحوم) اعلا پائے کے اُردو غزل اور مرثیے کے شاعر تھے۔ ان کا کلام، تنقیدی مضامین اور تحریریں ملک کے معروف جرائد اور رسائل میں تسلسل سے چھپتی رہتی تھیں۔ مختلف اخبارات میں اَدبی کالم بھی لکھتے رہے ہیں۔ لیکن ان کا زیادہ رجحان تنقید کی طرف رہا۔ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید کی آرا بنی بر حقیقت معلوم ہوتی ہیں کہ آج اُردو میں تنقید لکھنے والوں کا فقدان شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اردو تنقید کو سید شبیہ الحسن کی صورت ایک اچھا نقاد میسر آ گیا ہے۔ ان کا تنقیدی کام اپنی الگ پہچان کا حامل ہے۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی کتب کی تعداد ۲۶ کے قریب ہے۔ وہ ہمہ جہت خوبیوں کے مالک تھے۔ چالیس سال تک بطور پروفیسر تعلیم کے شعبہ سے منسلک رہے اور بطور ماہر تعلیم بھی اپنی خدمات مختلف کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ناصر علی رضا نے رات گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب پر جان لیوا قاتلانہ حملہ کی خبر فون پر دی تو مجھے اس خبر پر یقین نہ آیا کہ وہ تو ساری زندگی محبت اور امن کے داعی رہے ہیں، وہ مذہبی ہم آہنگی کے قائل تھے اور فرقہ واریت کے بھی خلاف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو حملہ کے فوراً بعد ہسپتال منتقل کیا گیا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گئے۔ اُن کے جنازے میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔ اُن کے تعزیتی ریفرنس منعقدہ الحمرا ہال میں مذہبی، سیاسی، علمی، اَدبی شخصیات نے ڈاکٹر صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محبت کے ساتھ یاد کیا گیا۔ ناصر علی رضا سے ڈاکٹر صاحب سے متعلق بات کرتے ہوئے ایف سی کالج کا ایم۔ اے کا زمانہ یاد آ گیا۔

ایم اے (اُردو) کے دو سالوں میں اشفاق تابش، میاں خالد، حماد ضیاء، زاہد حسین بھٹی، ناصر علی رضا اور راقم کلاس فیلو تھے ہم نے کالج میں ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر طارق عزیز، احمد عقیل روبی، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر عباس رضا، پروفیسر عباس تابش کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام سے پڑھا ہے۔ طلبہ و طالبات کے لیے تعلیمی اعتبار سے، ڈاکٹر حسن نواز زیدی، ڈاکٹر مظفر عباس اور خصوصی طور پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تعاون مثالی تھا۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کلاس روم کے علاوہ طلبہ و طالبات کے لیے کالج، اپنے گھر میں ہمیشہ خندہ پیشانی سے، محبت اور مروت کے انداز میں طلبہ و طالبات کی تعلیمی مشکلات کے حل کرنے میں ہر ممکن تعاون کرتے۔ طالب علموں کی مشکلات کو اپنی مشکلات تصور کرتے، ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی سکالرز کی ہر ممکنہ تعلیمی مدد کرتے۔ اپنی ذاتی لائبریری اور دیگر نایاب کتب کی رسائی طلبہ و طالبات کے لیے ہمیشہ ممکن بناتے۔ اتوار کے روز ان کی لائبریری میں طلبہ و طالبات اپنے مسائل کے حل کے لیے خصوصی طور پر آتے۔ راقم اور ناصر علی رضا اکثر اتوار کو صبح آٹھ بجے ان کے در دولت پر حاضری کے لیے حاضر ہوتے وہ ہمیشہ ہماری دل جوئی

فرماتے۔ تدریس کے حوالے سے ہمیشہ اچھے مشورے دیتے۔ ہم سب دوست جب بھی لاہور میں اکٹھے ہوتے تو ڈاکٹر عبدالکریم خالد اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی کے پاس ضرور حاضری دیتے، ان ملاقاتوں میں ادب، سیاست، تدریس پر ان کی پُر مغز اور فکری گفت گو سننے کو ملتی۔ ڈاکٹر صاحب مہمان نواز تھے۔ ان کے پاس ہر ہر آنے والے کو چائے پیش کی جاتی۔ اگر کھانے کا وقت ہے تو لنگر حسین کھانے کو مل جاتا تھا۔ ہم نے اُن کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ ہر معاملہ کو کمال ہنر مندی سے حل کرتے تھے کہ کسی کو بات کرنے کا موقعہ نہیں دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب مذہبی، علمی و اَدبی خدمت کو عبادت تصور کرتے تھے۔ وہ ان تھک تھے نہ جانے کیسے زندگی کے تمام شعبوں میں پورا اُترتے تھے۔ ان کے معمولات زندگی کو اگر دیکھا جائے تو یقین نہیں آتا کہ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کس طرح کالج، گھر، ٹیوشن، اخبارات، میڈیا، اَدبی مجالس، مذہبی مجالس، دوستوں کے ساتھ ملاقاتیں، طلبہ و طالبات کے مسائل کو حل کرنا، غرباء، مساکین کی مدد کرنا...... ان سب محاذوں پر وہ کامیاب تھے۔

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی (مرحوم) عشقِ رسولؐ، اہل بیتؑ، شہدائے کربلا کی محبت میں ہمیشہ مگن رہتے تھے۔ ان سب متبرک ہستیوں سے اُن کی عقیدت و محبت ڈاکٹر صاحب کی ذات کا خاصہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب امن، محبت کے فروغ کے داعی تھے۔ وہ علم پرور اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ آج ہم جس معاشرتی، سیاسی، تہذیبی استحصالی رویوں کا شکار ہیں، دہشت گردی نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ زندگی کا سکون مفقود نظر آتا ہے۔ علم و اَدب کے چراغ آہستہ آہستہ گل ہوتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں، حمید اختر، منشاء یاد، ہاجرہ مسرور کا اس جہانِ فانی سے کوچ کر جانا علم و اَدب کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی (مرحوم) بھی اسی کاروانِ علم و اَدب کے مسافر تھے۔ خدائے بزرگ برتر ان کی مغفرت فرمائے۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی (مرحوم) کے علمی، اَدبی، تدریسی کام کو تحسین سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اک روشن چراغ تھا نہ رہا
شہر میں اک دماغ تھا نہ رہا

◆◆◆

بارور

پروفیسر ناصر علی رضا

••

میٹھے تھے جن کے پھل، وہ شجر کٹ کٹا گئے
ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

نخلِ ثمرور کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ کئی جہتوں سے خدمت خلق کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ درماندہ مسافر اس کی گھنی چھاؤں میں دم لیتے ہیں تو تھکے ہارے راہی اس کے پھولوں کی مہک سے بار زیست کو آسودہ محسوس کرتے ہیں۔ ایک طرف پھل لذت کام و دہن کا سامان مہیا کرتے ہیں تو دوسری طرف غربا کے آنگن میں، اس کی لکڑی جل کر کاروانِ حیات کو رواں دواں رکھتی ہے۔ الغرض پھل دار درخت تا دم آخر جادۂ زندگی کی کٹھن گھڑیوں کو آسان بناتا رہتا ہے۔ عام طور پر بارور پیڑ انسان کو جسمانی آسودگی عطا کرتے ہیں لیکن خالق کائنات کا شاہ کار حضرت انسان، مزکورہ صفات سے متصف ہو تو وہ جادہ زیست کے باطنی اور جسمانی ہر دو پہلو سے اطمینان بہم پہنچاتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایسے ہی ایک گھنے بارور کا نام ہے۔ حیف صد حیف! طوفانِ جہالت نے اسے کاٹ دیا، بے حس سماج نے ٹھنڈی چھاؤں والی دیوار گرا دی۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ سید، شاعر، اُستاد، محقق، نقاد، صحافی، اور نہ جانے کتنے پہلو جو دنیا کی نگاہ میں غیر اہم لیکن حقیقتاً ہر پہلو ایک دبستان ہے۔ آپ کی ان حیثیات کا مقام متعین کرنا صاحبانِ علم وفن کا کام ہے، مَیں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ جس شعبے کی نمائندگی کرتے تھے وہاں ان کا مرتبہ وہی تھا جو نظامِ شمسی میں سورج کا۔ اکثر نام نہاد سید زادوں کو دیکھا کہ ان میں اور ہندو برہمنوں میں تمیز کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ سید شبیہ الحسن ذریت احمد مرسل کا حقیقی وارث، جو لینا نہیں صرف دینا جانتے ہیں۔ استاد ایسا کہ طلبہ تو درکنار دوسرے شعبے کے اساتذہ بھی اپنی کلاسز چھوڑ کر اس معدنِ علم کے گہوارے سے لعل و جواہر کی طلب میں اپنی جھولیاں پھیلا دیتے۔ تحقیق کے میدان میں قدم رکھا تو ان جواہر نایاب کو کھنگالا، جن پہ زمانے کی گرد جم چکی تھی۔ ناقد بنے تو ایسے ایسے گوہر تراشے کہ شاید ان کو موجودہ مقام تک پہنچنے میں لمبی مسافت طے کرنا پڑتی۔ یہ

چند پہلو ہیں؛ کہ زمانے کے سامنے عیاں ہیں؛ بر سبیلِ تذکرہ ان کا حوالہ آ گیا۔ حقیقت یہ ہے، وہ شبیہ الحسن ان جہات سے بہت بڑا ہے دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

یارانِ خدا کے متعلق یہی باتیں تواتر سے سنی گئیں، کہ وہ منکسر المزاج ہوتے ہیں، کم مایہ لوگوں کو راحت پہنچا کے انھیں لذت سرمدی حاصل ہوتی ہے۔ جذبہ ایثار، ان کے اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے اور زمانے کی تشنگی علم کو ہمیشہ سیراب کرتے رہتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی مفاد پرستی، خودغرضی اور بے حسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر کوئی ایسا فرد دکھائی دے تو یقیناً دوستانِ خدا میں سے ہوتا ہے۔ سیّد شبیہ الحسن، بلا مبالغہ، مالک کائنات سے محبت کرنے والی ہستی کا نام ہے۔ مقرب الٰہی کا قول و فعل منشائے رضائے الٰہی سے متصل ہوتا ہے۔ شبیہ الحسن نے کبھی اپنی ذات یا ذاتی مفاد کو محور بنا کے کوئی کام نہیں کیا، ایک ہی تمنا ان کے من میں بے قرار رہتی کہ میری کسی کاوش سے کسی کا کچھ بھلا ہو جائے۔ زمانہ گواہ ہے درِ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس چوکھٹ پہ جو بھی آیا وہ کبھی خالی دامن لے کر نہیں لوٹا:

مزا تو جب ہے بے طلب دے
سخی کے در سے سوال کیسا

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہر پہلو سے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نظریہ ''روایت اور انفرادی تشخص'' پر پورا اترتے تھے۔ ہمیشہ منفرد انسانی روش کے پہلو بہ پہلو میراث اجداد سے پیوست رہنے کا درس دیتے تھے۔ اس لیے کہ درخت کتنا ہی تناور کیوں نہ ہو جیسے ہی بنیاد سے کٹ جائے گا، اب زیادہ دیر طوفانوں کے تھپیڑے کھانے کی سکت اس میں نہ ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کے تمام پہلو نقطہ کمال پر تھے، لیکن ایک ''بیٹے کی باپ سے محبت''، ایسا دیکھا نہ سنا۔ اگر چہ ڈاکٹر صاحب کے والد گرامی سیّد وحید الحسن ہاشمی صاحب کا انتقال شبیہ الحسن سے ڈیڑھ دو برس پہلے ہو گیا تھا لیکن، بقول ڈاکٹر سیّد نواز حسن زیدی صاحب ''شبیہ صاحب کے جانے سے ہاشمی صاحب مر گئے'' کیوں کہ شبیہ الحسن ہاشمی صاحب کی یاد میں ہر ماہ کوئی نہ کوئی تقریب منعقد کرواتے ہی رہتے تھے۔ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے باپ کی محبت کو کتب میں محفوظ کیا، اپنی ذات کے لیے وہ ایسا کچھ نہ کر سکے۔ نہ جانے کیا سوچ کر ان کے والد محترم نے نام ''شبیہ الحسن'' رکھا؟ اتنی مشابہت کم ملتی ہے! زندگی راستے پر تو ممکن ہے کوئی کسی عظیم ہستی کے چلن کی نقالی کرے لیکن عظیم المرتبت انسانوں کی طرح دنیا کو وداع کرنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ سیّد شبیہ الحسن حقیقی معنوں میں ''شبیہ حسنؑ'' تھے۔ زندگی بھر وہی سخاوت اور فیاضی برتی جو مولا حسنؑ کے دسترخوان پر سجتی تھی اور جہان کو وداع کیا وہی انداز جیسے امام حسنؑ کے لاشے میں تیر پیوست ہو گئے اور بدن تیروں سے چھلنی چھلنی، سیّد شبیہ الحسن بھی ویسے ہی دمِ شہادت زخموں سے چور چور دارِ فانی سے کوچ کر گئے! ان کی جدائی ہمارے لیے ملے جلے جذبات کی عکاس ہے۔ اطمینان و آسودگی اس سبب سے کہ وہ حیات سرمدی کی خوشیاں سمیٹ کر لے

گئے اور درد اپنی ذات کا، اب گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چراغ شبیہ الحسن کوئی نہیں۔

دستور دنیا ہے کہ جانے والوں کا خلا، وقت کے ساتھ پُر ہو جاتا ہے اگرچہ دنیا کے آئینِ مسلم کو مانے بغیر کوئی چارا بھی نہیں لیکن کچھ نابغہ روزگار اتنا بڑا خلا چھوڑ جاتے ہیں کہ لاکھوں مل کر بھی اس کا مداوا نہیں کر سکتے، جیسے علم کی شمع فروزاں وہ روشن کر جاتے ہیں، اسی انداز کی تابنا کی کوئی نہیں کر پاتا۔ سید شبیہ الحسن تیرگی اذہان و روح کو جس انداز سے منور کر گئے، اس کو اب جلا نہیں ہوتی، گھپ تاریکیوں میں کوئی بھی قندیلِ شبیہ نہیں!

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ بڑا اندھیرا ہے

◆◆◆

جُرم یہ ہے کہ روشنی ہوں مَیں

طاہر ناصر علی

••

میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مَیں اپنی بات کہاں سے شروع کروں۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی کی یادیں میرے سامنے لق و دق صحرا کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ کافی دیر سے لکھنے کی کوششیں بے سود کر رہا ہوں مگر کچھ بھی لکھا نہیں جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے میرے سب الفاظ گونگے ہو گئے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ میرے دیدہ و دل کی طرح میرا قلم بھی رو رہا ہے اور میرے الفاظ بھی گریہ کناں ہیں۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی سے میرا تقریباً ۳۱ سال پرانا تعلق تھا۔ ابھی انھوں نے ایم۔ اے اُردو نہیں کیا تھا اور وہ طالب علم تھے مگر اُس زمانے میں بھی وہ بڑے فعال تھے۔

مجھے یاد ہے ہم پانچ چھ نوجوان شعرا کا اک گروپ تھا کہ جو حیدالعصر سیّد وحید الحسن ہاشمی (مرحوم) اور دیگر اُستاد شعرا کے زیرِ سایہ مقاصدوں، مسالموں اور غزل کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتا تھا۔ راقم الحروف کے علاوہ اِس گروپ میں سیّد شبیہ الحسن ہاشمی، عرفی ہاشمی، نقاش ہاشمی اور بہت سے بزرگ شعرا بھی تھے کہ جن کا اُس وقت میدانِ سخن میں طوطی بول رہا تھا۔ کہیں سید سیف زلفی کے لب و لہجے کی گھن گرج سنائی دیتی تھی کہیں راحت نقوی حرف و الفاظ کی گتھیاں سلجھا رہے تھے۔ کہیں ڈاکٹر سیّد مسعود رضا خاکی اپنے اشعار سے نواز رہے تھے کہیں شیخ سرور علی سرور (بی کام) کا ترنم کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ کہیں مولانا افسر عباس زیدی، شاہد نقوی، میر رضی میر جلوہ گر تھے اور کہیں حضرت قیصر بارہوی، ظفر شارب، گہر جلالوی اور سلامت علی خیال کا ترنم ماحول کو گرمائے ہوئے تھا۔

کہیں اُستاد زیبا ناروی اور حضرت نسیم امروہوی کی مرصع شاعری کا جادو ہر شخص کے ذہن و دل پہ اثر کر رہا تھا۔ عاصم گیلانی، اثر ترابی، مشکور حسین یاد، سعید عالم زیدی، ہوش عابدی، شائق زیدی اور ضیا حیدر رضیا کا

بھی جواب نہیں تھا اور ہم چار، پانچ نوجوان شعرا تھے کہ جنھیں اِس ماحول میں پھولنے پھلنے کا موقع ملا۔ ہمارے بعد آنے والے ہم عصروں کو اِن محافل میں شرکت کرنے کا موقع نہیں مل سکا مگر افسوس کہ اب ان میں سے بہت سے انجیل رفتگاں میں شامل ہو چکے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لاہور میں اُن دنوں بہت زیادہ مسالمے اور مقاصدے ہوا کرتے تھے۔ لاہور میں مسالمہ کے بانی مظہر علی جاوید (مرحوم) تھے۔ ایک مسالمہ پروفیسر سیّد حسن عسکری کاظمی کے گھر میں ہوا کرتا تھا۔ کاظمی صاحب اُن دنوں وحدت کالونی میں رہا کرتے تھے۔ اس کی نظامت ڈاکٹر شبیہ الحسن ہاشمی کیا کرتے تھے۔ یہ اُن کی طالب علمی کا دور تھا۔ یہ مجلس مسالمہ بڑی زبردست بپا ہوتی تھی۔ کاظمی برادران کی سوز خوانی مجھے آج بھی بہت یاد آتی ہے مجھے یاد ہے ڈاکٹر شبیہ الحسن اُن سے یہ سلام فرمائش کر کے سُنا کرتے تھے:

قلب انساں پہ غم شہ کا اثر ہے کہ نہیں
آنکھ پیاسوں کے لیے آج بھی تر ہے کہ نہیں

ڈاکٹر شبیہ الحسن کی نظامت بھی بہت زبردست ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے لکھنوی انداز کا ململ کا کرتا زیب تن کیا ہوا ہوتا تھا جو انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ عاقل کاظمی ان محافل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے اور وہ بہت ہی اہتمام سے شعر سناتے تھے:

حسینؑ چھاؤں میں بیٹھا ہوں میں ترے غم کی
تُو وہ شجر ہے کہ کٹ کے بھی سایہ دار رہا

وحید الحسن ہاشمی صاحب کا گھر ایک اُدب سرائے تھا بڑی بڑی قد آور شخصیات اُن سے استفادہ کرنے اور شرف نیاز مندی حاصل کرنے اُن کے پاس آیا کرتی تھیں۔ جب ہم لوگ اُن کے پاس جاتے تھے تو بہت فلک قدر لوگوں سے ہاشمی صاحب کے توسل سے ملاقات ہو جاتی تھی اور وہ لوگ جن کے قریب جانے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا وہ لوگ سامنے تھے اور ہمیں خود پہ فخر ہوتا تھا اور ہم خود کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن سے ملاقات ہوتی تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ہمیشہ مسکرا کر ملتے تھے۔ کون سا عالم دین نہیں تھا جو اُن کے دولت کدے پر اُن سے ملنے نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن سے مل کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ ڈھیر سارے کام کیسے کر لیتے تھے وہ بہ یک وقت شاعر بھی تھے، نقاد بھی تھے، معلم بھی تھے، اچھے منتظم اور اچھے کالم نگار بھی تھے سب سے بڑی بات اور خوبی اُن کی یہ تھی کہ وہ بہت اچھے انسان تھے اور باکردار آدمی تھے۔

انھوں نے اپنا نام بنایا وہ کثیر المطالعہ آدمی تھے بل کہ یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ تنہا نہیں بل کہ اپنی ذات میں ایک لشکر تھے۔ سب کو اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے۔ اپنے اساتذہ کی بہت عزت کرتے تھے اور عموماً کہا

کرتے تھے کہ جو اپنے اساتذہ کی عزت نہیں کرتا وہ زندگی میں کبھی گوہرِ مقصود نہیں پا سکتا۔ اس لیے آج اُن کے بچھڑ جانے پر سب لوگ اشک بار ہیں وہ بہت ہی قیمتی انسان تھے۔

ڈاکٹر شبیہ جس سے ملتے تھے اُس پر اپنی خوش اخلاقی، خوش گوئی، دوستی، محبت اور خلوص کی ایسی چھاپ لگا دیتے تھے کہ پھر لوگ اُن سے دوبارہ ملنے کی جستجو کرتے جو شخص اُن سے ملتا تھا پھر اُس کے بعد اُن کا ہی ہو جاتا تھا۔ مجھے اُن کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ نقاش ہاشمی اور عرفی ہاشمی کے ملک سے باہر چلے جانے کے بعد اَدبی محفلوں میں اور مسالموں اور مقاصدوں میں ہم اکٹھے جایا کرتے تھے جب ڈاکٹر صاحب اور میں اپنے اشعار سنا لیتا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ یار میرے ساتھ چلنا میں تمھیں تمھارے گھر ڈراپ کر دوں گا مگر وہ مجھے میرے گھر چھوڑنے کی بجائے مجھے ''مسجد الحسین'' میں منعقد محفل مقاصدہ میں لے جاتے مَیں انھیں کہا کرتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب انھوں نے تو مجھے بلایا ہی نہیں تو ڈاکٹر صاحب کہتے کہ مولا کی محفل میں جانے کے لیے کارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیں ان محافل میں ضرور جانا چاہیے۔ وہ بڑے ہی مخلص آدمی تھے۔ اُن کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ کثیر المطالعہ ہونے کی وجہ سے جب کبھی وہ تقریر کرتے تو سب پہ چھا جاتے تھے وہ بلا کے نکتہ شناس تھے۔ بعض مرتبہ تو وہ ہر آدمی کو اُسی کی سطح پر آ کر ملتے تھے۔ تعلیم وتدریس کے شعبے میں ایک معتبر نام اور کام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔

مجھے ایک منظر کبھی نہیں بھولے گا جس میں مَیں نے اُن کی مقناطیسی شخصیت کا مظاہرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ایک بار اُن کے ساتھ ایک جگہ جانے کا اتفاق ہوا جن صاحب کے پاس وہ گئے تھے وہ بہت بڑے افسر تھے اور وہ عمر میں بھی ڈاکٹر صاحب سے بڑے تھے مگر میں یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن کو دیکھتے ہی وہ صاحب کہ جن کا مجھے نام یاد نہیں ہے۔ اپنی کرسی سے مسکراتے ہوئے اُٹھے اور انھیں اپنے گلے سے لگا لیا اور اُن کے کسی مضمون کی تعریف کرنے لگے۔ مَیں اِس بات سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور دل ہی دل میں ڈاکٹر صاحب کی نذر اُتارنے لگا مجھے اُس وقت زمیندارہ کالج گجرات کے اپنے فارسی کے اُستاد پروفیسر سیف الرحمٰن سیفی جو کہ خود بھی فارسی، اُردو اور پنجابی کے بہت اچھے شاعر ہیں ان کا یہ شعر بہت یاد آیا۔

زندگی درکار ہے تو تمکنت کی موت مر
دوسروں کی زندگی پہ نقش گہرا چھوڑ دے

میں عموماً اتوار کو صبح ۸ یا ۹ بجے وحید الحسن ہاشمی صاحب کے گھر جاتا تھا تو اُس وقت ڈاکٹر شبیہ اپنے طالب علموں اور طالبات کو پڑھا رہے ہوتے تھے مجھے وہ سب سے متعارف کراتے اور پھر بعض مرتبہ وہ میرے بارے میں بھی انھیں پیراگراف لکھوانا شروع کر دیتے تھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں بھی اُن کے شاگردوں میں سے ایک اُن کا شاگرد ہوں۔ سچ پوچھیے تو رواداری اور عاجزی کوٹ کوٹ کر اُن میں بھری ہوئی تھی۔ وہ اس دورِ پُر آشوب

میں اک فردِ نایاب کی طرح تھے۔

ان کا قہقہہ بھی بڑا ابھرپور ہوا کرتا تھا مگر آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو اُن کا وہی قہقہہ غم آلود قہقہہ بن کر میری یادوں کے در پر دستک دے کر مجھ کو ہسکی طرح اشکبار کر رہا ہے میں جب بھی اُن کے گھر جاتا تھا تو میرے سامنے افراد نہیں بل کہ مجھے علم و اَدب کی ایک کہکشاں دکھائی دیتی تھی۔

کبھی ڈاکٹر عبدالکریم خالد، کبھی نواز زیدی، کبھی ڈاکٹر طارق عزیز، کبھی فرقان قریشی، کبھی رضا عباس ترابی، کبھی فخر الحق نوری، کبھی ظفر چشتی اور کبھی اختر ہاشمی صاحب سے ملاقات ہوجاتی تھی۔ یہ تمام لوگ ڈاکٹر شبیہ الحسن کے براہ راست احباب میں سے ہیں مگر اُن کے حوالے سے یہ سب لوگ میرے بھی احباب میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں میں سے بیشتر (Ph.D) ہیں اور بامِ نام وری پر جگمگا رہے ہیں۔

بہت سی باتیں ہیں کہ میں جو خود کو کرید کرید کر تحریر کر رہا ہوں جب بھی ڈاکٹر صاحب کی کوئی کتاب شایع ہوتی تو وہ مجھے میرا نام لکھ کر مجھے عطا کرتے اور کہتے کہ یار مجھے پتہ ہے کہ تم کتاب کے بہت رسیا ہو وہ سب کتابیں اب میری ذاتی لائبریری میں محفوظ ہیں اور وہ مجھے ہمیشہ اُن کی یاد دلاتی رہیں گی جو طالب علم اور طالبات اُن سے پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اُن میں سے اکثر خود بھی بڑے صاحب ذوق تھے وہ اُن کو بھی اپنی کتابیں عطا کرتے۔ انھوں نے کئی لوگوں کو (Ph.D) کا مقالہ لکھنے میں معلومات فراہم کیں اور اُستاد کے فرض کو بہت خوب صورتی اور خلوص سے نبھایا۔

وہ اچھے باپ تھے اچھے شوہر تھے اور اچھے بیٹے تھے انھوں نے اپنے والد گرامی سیّد وحید الحسن ہاشمی کا حق ادا کیا اور اُن پر تحقیق کر کے اُن کو زندہ و جاوید کر دیا۔ اُن کا ایک زمانہ شیدا تھا مگر وہ اُردو حرف کی آبرو جناب شہزاد احمد (مرحوم) ڈاکٹر اجمل نیازی اور ڈاکٹر خورشید رضوی کے بہت مداح تھے۔

مَیں تو اُن کو کفن میں نہیں دیکھ سکا واپس چلا گیا تھا اس لیے کہ مجھ میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ میں انھیں اِس حالت میں دیکھ سکوں مگر سیّد اختر ہاشمی نے بتایا کہ اُن کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جو کہ سب کو بتا رہی تھی کہ دیکھو میں شہید ہو کر کامیاب ہو گیا ہوں اِسی لیے تو ڈاکٹر اقبالؒ نے کہا تھا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
جو مرگ آید تبسم برلبِ اُوست

خداوند عالم اُن کے درجات بلند فرمائے اُن کی بیٹیوں ایما اور انا حسن کو شاد و آباد رکھے اور اُن کی زوجہ، بیٹے، والدہ اور بھائیوں کو اور اہلِ خاندان کو یہ بہت بڑا صدمہ برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے اور خداوندِ عالم ہم سب کے مہربان دوست اور ہم سفر کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ بقول فدائے سخن

زندہ ہے جو وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مرسلؐ نہ رہے کون رہے گا

میں اپنے اِس بے ربط سے مضمون کو اپنے اِن گریہ کناں اشعار پر ختم کرتا ہوں:

جن جن میں تُو نے بانٹی تھیں دل کی محبتیں
اُن سب کو تیرے ہجر کا صدمہ دیا گیا
تُو پیرو شبیہ محمدؐ تھا اِس لیے
تجھ کو ستم کی گولی سے چھلنی کیا گیا

ڈاکٹر شبیہ الحسن کو مرزا دبیرؔ کا یہ شعر بہت پسند تھا:

شمر کہتا تھا یہی ماں ہے علی اکبرؑ کی
جس کا اک ہاتھ کلیجے پہ دھرا رہتا ہے

◆◆◆

maablib.org

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے سوانحی کوائف

ذاتی کوائف

- نام — سید شبیہ الحسن
- قلمی نام — حسن ہاشمی
- تاریخ پیدائش — ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء
- مقام ولادت — لاہور
- تاریخ شہادت — ہفتہ ۱۹ رمئی ۲۰۱۲ء (۲۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ)
- مقام شہادت — لاہور
- آخری آرام گاہ — قبرستان فردوسیہ، فیروز پور روڈ، لاہور

❖ خانوادہ

- دادا — سید شبیر حسن صفا الٰہ آبادی
- دادی — سیدہ صدیقہ بانو
- نانا — سید محمد رضا تقوی
- نانی — سیدہ لطیف النساء
- والد — سید وحید الحسن ہاشمی
- والدہ — سیدہ سرفراز فاطمہ
- برادران — سید وصی الحسن (نقاش ہاشمی)، سید شریف الحسن (ایس۔ ایچ ہاشمی) سید محمد فضل حسن (عرفی ہاشمی)
- بہن — سیدہ شمع فاطمہ زوجہ سید ناصر علی
- زوجہ — سیماب رضوی بنت سید احمد حسن رضوی
- اولاد — ایما حسن۔ اشنا حسن۔ سید وجیہ الحسن

❖ تعلیم

• میٹرک	۱۹۷۴ء	گورنمنٹ قزلباش ہائی سکول' لاہور
• ایف۔اے	۱۹۷۶ء	گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
• بی۔اے	۱۹۷۸ء	گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
• ایم۔اے (اُردو)	۱۹۸۱ء	اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی' لاہور
• ایم۔فل (اُردو)	۱۹۹۱ء	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد
• پی ایچ۔ڈی (اُردو)	۱۹۹۶ء	پنجاب یونیورسٹی' لاہور۔ پاکستان

❖ ملازمت

• اعزازی لیکچرار
(گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور ۔ فروری ۱۹۸۲ء تا نومبر ۱۹۸۲ء)

• لیکچرار
(گورنمنٹ مولانا ظفر علی خان ڈگری کالج' وزیر آباد ۔ ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۴ء)

• لیکچرار
(گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج' قصور ۔ ۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۵ء)

• لیکچرار
(گورنمنٹ ایف۔سی کالج' لاہور ۔ ۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۹ء)

• اسسٹنٹ پروفیسر
(گورنمنٹ کالج' لاہور ۔ ۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۰ء)

• اسسٹنٹ پروفیسر
(گورنمنٹ ایف۔سی کالج' لاہور ۔ ۱۹۹۱ء)

• ایسوسی ایٹ پروفیسر' صدر شعبہ
(گورنمنٹ ایجوکیشن کالج' فیصل آباد)

• ایسوسی ایٹ پروفیسر
(گورنمنٹ ایجوکیشن کالج لوئر مال' لاہور)

• ایسوسی ایٹ پروفیسر' صدر شعبہ
(گورنمنٹ کالج، گوجرانوالہ)

- ایسوسی ایٹ پروفیسر
  (گورنمنٹ ایف ۔ سی کالج' لاہور)
- ایسوسی ایٹ پروفیسر
  (گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ' لاہور)
- پروفیسر اُردو
  (گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ' لاہور)

❖ اعزازات

- سند امتیاز ایم ۔ اے اُردو' پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
- بہترین مقرر' گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- بہترین سوشل ورکر' گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- ہاکی کا بہترین کھلاڑی' انٹر کالج ہاکی ٹورنامنٹ' لاہور ڈویژن
- نائب کپتان ہاکی' گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- سو میٹر دوڑ میں اوّل' گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- ہاکی کپتان' گورنمنٹ قزلباش حسینیہ ہائی سکول' لاہور
- بہترین کھلاڑی' گورنمنٹ قزلباش حسینیہ ہائی سکول' لاہور

❖ اہم عہدے و ذمہ داریاں

- صدر مجلس اُدب' گورنمنٹ قزلباش حسینیہ ہائی سکول' لاہور
- صدر انجمن اُردو' پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج' لاہور
- سٹاف سیکرٹری گورنمنٹ مولانا ظفر علی خان ڈگری کالج' وزیر آباد
- چیئر مین ڈرامیٹک کلب مولانا ظفر علی خان ڈگری کالج' وزیر آباد
- نگران بزم اُدب مولانا ظفر علی خان ڈگری کالج' وزیر آباد
- سٹاف سیکرٹری' گورنمنٹ اسلامیہ کالج، قصور
- سیکرٹری سوسائیٹز بورڈ گورنمنٹ اسلامیہ کالج، قصور
- پراکٹر' گورنمنٹ اسلامیہ کالج، قصور
- انچارج سیمینار کمیٹی گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- انچارج ٹیوٹوریل گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور

- سیکرٹری تقریبات گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- صدر انجمن طلبائے قدیم ایم۔اے اُردو' گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- سٹاف سیکرٹری شعبہ اُردو' گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- نگران سیمینار لائبریری ایم۔اے اُردو گورنمنٹ ایف سی کالج' لاہور
- نگران تقریبات' گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ' لاہور
- چیئرمین سوسائٹیز' گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ' لاہور

❖ تحقیقی کام

تحقیقی مقالات

(الف) ایم۔اے (اُردو)

موضوع: "آلِ رضا کی غزل گوئی" نگران: ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی

(ب) ایم۔فل (اُردو)

موضوع: "آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین" نگران: ڈاکٹر سید سجاد باقر رضوی

(ج) پی ایچ۔ڈی (اُردو)

موضوع: لکھنؤ کی اُردو شاعری (۱۹۰۰ء۔۱۹۴۷ء) نگران: ڈاکٹر سہیل احمد خان

❖ تصانیف

(ا) مطبوعہ

- مفاہیم (مقالات)
- ترجیحات (مقالات) (انعام یافتہ)
- اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (مقالات)
- تصریحات (مضامین)
- ترغیبات (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
- تعینات (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
- اُردو شعر و اَدب کی معمار خواتین (تحقیقی و تنقیدی مقالات)
- مضافاتی شعر و اَدب (تحقیق و تنقید)
- اُردو شعر و اَدب کے سفیر (تحقیقی و تنقیدی مقالات)

- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق تنقید)
- جدید لہجے کا شاعر۔سیف زلفی (شخصیت وفن)
- آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن)
- شام وسحر کی باتیں (ماہ نامہ شام وسحر کے اداریے)
- کلیاتِ حبیب (حبیب جون پوری کے کلام کی تدوین)
- مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی (تحقیق تنقید)
- باقیاتِ آلِ رضا (آلِ رضا لکھنوی کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)
- بجھی وہ شمع ...... (نسیم امروہوی کی یاد میں)
- بیسویں صدی کا شعری اَدب (انتخاب کلام)
- آیاتِ آمنہؑ (قیصر بارہوی کے مرثیے کی تدوین)
- العطش (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین)
- منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)
- معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)
- طاہرین (سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں منقبتیں اور سلام کی تدوین)
- جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق وتنقید)
- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (نعت منقبت اور سلام کے حوالے سے)
- سیف زلفی کے مرثیے (سیف زلفی کے مرثیوں کی تدوین)
- قیصر اقلیم مرثیہ۔قیصر بارہوی (تحقیق وتنقید)
- قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کی تدوین)
- اَدبی بیٹھک (اَدبی کالم)
- حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں (تحقیق وتنقید) (انعام یافتہ)
- ترغیبات (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
- اَدبی چوپال (اَدبی کالم)
- مضافاتی شعروادب (تحقیق وتنقید)
- اُردو شعروادب کے سفیر (تحقیق وتنقید)
- اُردو کی معمار خواتین

(ب) زیرِ طبع

- لکھنو کی اُردو شاعری۔ بیسویں صدی میں (تحقیق)
- اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف (تحقیق و تنقید)
- حروفِ بدن (شاعری)

❖ نگرانِ تحقیقی مقالہ جات

(ایم۔اے اُردو)

- ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق، مماثلتیں و اختلافات...... سعدیہ شفقت (۱۹۸۹ء۔۱۹۹۱ء)
- عصمت چغتائی اور منٹو، مماثلتیں اور اختلافات...... رضا احمد (۱۹۹۱ء۔۱۹۹۳ء)
- قیصر بارہوی کی غزل گوئی...... مریم یٰسین (۲۰۱۰ء۔۲۰۱۱ء)

(ایم۔فل اُردو)

- ڈاکٹر ظہیر فتح پوری۔ شخصیت و فن...... پروفیسر ندیم (۲۰۰۳ء)
- عبید اللہ علیم۔ احوال و آثار...... طلعت خورشید (۲۰۰۴ء)
- نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری...... پروفیسر جواد عمر (۲۰۰۵ء)
- پروفیسر حسن عسکری کاظمی کی علمی و اَدبی خدمات...... راشدہ ریاض (۲۰۰۸ء)
- میلسی میں اُردو نعت کی روایت...... مظہر حسین مظہر (۲۰۱۰ء)

❖ تعلیمی ذمہ داریاں

- ایڈوائزر (اُردو) پنجاب پبلک سروس کمیشن، لاہور

  ماہر مضمون برائے لیکچرار اُردو، اسسٹنٹ پروفیسر اُردو

- ممتحن تحقیقی مقالہ جات

  اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور، لاہور کالج یونیورسٹی برائے خواتین

  علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

- مرتب پرچہ جات

  پنجاب یونیورسٹی لاہور، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

  بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، لاہور کالج یونیورسٹی برائے خواتین

❖ اعترافاتِ کارکردگی

- ملک معراج خالد ایوارڈ

  بہترین تدریسی خدمات (بدست چیئرمین لاہور بورڈ ڈاکٹر محمد زکریا بٹ، ۲۰۰۵ء)

- نسیمِ لیہ ایوارڈ

علمی وادبی خدمات کا اعتراف (بہترین نقاد برائے سال ۲۰۰۴ء)

- قائداعظم ایوارڈ

بہترین تدریسی خدمات (بدست ڈاکٹر شوکت علی ڈی پی آئی کالجز پنجاب ۲۰۰۶ء)

- اعترافِ خدمت ایوارڈ

بہترین علمی وادبی خدمات (بدست جناب ظہور منگلہ، چیئرمین انجمن خواجگان تاروالی ۲۰۰۶ء)

- لائف اچیومنٹ ایوارڈ

بہترین تدریسی، تحقیقی، تنقیدی، شعری اور انتظامی خدمات

(بدست جناب جاوید اقبال، ڈائریکٹر چلڈرن ایجوکیشن، نیٹ ورک پاکستان)

- عظمتِ امام حسینؑ ایوارڈ

بہترین علمی ودینی خدمات (بدست آقائے اسکندریان، ڈائریکٹر جنرل، خانۂ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران)

- جشنِ مرتضوی ایوارڈ

بہترین شعری خدمات (بدست جناب افتخار عارف، چیئرمین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد)

- حُسنِ کارکردگی ایوارڈ

بہترین تحقیقی وتنقیدی خدمات (بدست جناب ڈاکٹر سلیم اختر۔ معروف ادیب ونقاد)

- جشنِ مولودِ کعبہؑ ایوارڈ

بہترین کمپیئر (بدست جناب ڈاکٹر عباس فاموری، ڈائریکٹر جنرل خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران)

- انٹرنیشنل کلچرل اور آرٹسٹک ایوارڈ

بہترین صحافیانہ خدمات (بدست جناب آقائے محمود اعظمی۔ ایران)

- اعترافِ عظمت ایوارڈ

بہترین علمی، اَدبی وتدریسی خدمات (بدست جناب ڈاکٹر شاہد محمود، کنڈز یونیورسٹی، لاہور)

- اعزازِ فضیلت

بہترین دینی وملی خدمات (بدست جناب حفیظ صدیقی، ناظم رحمان پورہ، لاہور)

- اعزازِ سپاس

بہترین علمی وادبی خدمات (بدست جناب محمد طاہر ارشاد، چیئرمین)

❖ صحافتی خدمات

- معاون مدیر و انچارج اَدبی صفحات ہفت روزہ ''احسان'' لاہور
- معاون مدیر، پندرہ روزہ ''الایمان'' لاہور
- معاون مدیر ماہ نامہ ''راہِ عمل'' لاہور
- نگرانِ اعلیٰ ماہ نامہ 'سفینہ' لاہور
- اعزازی مدیر ماہ نامہ ''شام و سحر'' لاہور (اکتوبر ۱۹۸۸ء تا نومبر ۲۰۰۹ء)

اعزازی مدیر کی حیثیت سے درج ذیل اہم نمبر شائع کیے

- اقبال نمبر
- محرم نمبر
- فیض احمد فیض نمبر
- جعفر طاہر نمبر
- دبیر نمبر
- ظہیر کاشمیری نمبر
- حسن عابد نمبر
- اشاریہ نمبر
- ساحر لدھیانوی نمبر
- آغا سہیل نمبر
- اَدبی جائزہ نمبر
- حلقہ ارباب ذوق نمبر
- سیف زلفی نمبر
- فرقان قریشی نمبر
- شیر افضل جعفری نمبر
- عمر فیضی نمبر
- جعفر بلوچ نمبر
- ڈاکٹر سلیم اختر نمبر
- عظیم قریشی نمبر
- قیصر بارہوی نمبر
- صبا اکبرآبادی نمبر
- حمید کوثر نمبر
- سلام نمبر
- ڈاکٹر معراج نیر نمبر
- حسن عسکری کاظمی نمبر
- کتاب کلچر نمبر
- ڈاکٹر عبدالکریم خالد نمبر

❖ رکنیت

- چیئرمین عالمی مجلس اَدب، پاکستان
- وائس چیئرمین انٹرنیشنل سیرت کونسل، پاکستان
- رکن حلقہ اَرباب ذوق' لاہور
- سیکرٹری حلقہ شعرائے اہل بیت' پاکستان
- رکن مرثیہ فاؤنڈیشن، کراچی
- رکن حلقہ حمد و نعت و سلام' پاکستان
- رکن انجمن اصلاح زبان
- رکن کنزیومر ایسوی ایشن آف پاکستان

❖ اساتذہ کرام

- ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب
- ڈاکٹر وحید قریشی صاحب
- ڈاکٹر سجاد باقر رضوی صاحب
- ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب
- ڈاکٹر سہیل احمد خان صاحب
- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب
- ڈاکٹر عبید اللہ خان صاحب
- ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب

- ڈاکٹر تبسم کاشمیری صاحب
- ڈاکٹر آغا سہیل صاحب
- ڈاکٹر اقبال احمد خان صاحب
- ڈاکٹر آرزو چودھری صاحب
- پروفیسر سجاد حارث صاحب
- پروفیسر مسز نرگس رے صاحبہ
- پروفیسر شلو ر ہولڈز صاحب
- حضرت قیصر بارہوی صاحب
- سید وحید الحسن ہاشمی صاحب
- عمانوئیل سراج صاحب
- پروفیسر اشفاق سرور صاحب
- سرور حسین شاہ صاحب

❖ اسفار

- متحدہ عرب امارات
- ایران
- آسٹریلیا

❖ مصروفیات

- تدریس
- تنقید
- تحقیق
- شاعری

❖ مقالات (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تحریر کردہ)

- آلِ رضا کے شعری نظریات

(کراچی، ماہ نامہ 'افکار' جون ۱۹۸۶ء)

- روایات اور نوجوان

(لاہور، ماہ نامہ نیا پیام فروری ۱۹۸۷ء)

- اِک چراغ اور بجھا (بیادِ نسیم امروہوی)

(لاہور، ماہ نامہ پیام عمل اپریل ۱۹۸۷ء)

- نسیم امروہوی۔ ایک موضوعاتی مطالعہ

(لاہور، ماہ نامہ شام و سحر مئی ۱۹۸۷ء)

(مشمولہ 'ارمغان نسیم' مرتب، ڈاکٹر ہلال نقوی، کراچی، ۱۹۹۲ء)، (روز نامہ 'دن' لاہور، ۷ار مئی ۲۰۰۷ء)

(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۱۱ر نومبر ۲۰۰۷ء)، (روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۲۶ر مئی ۲۰۰۸ء)

(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۲۵ دسمبر ۲۰۰۷ء)، (روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۱۰ر دسمبر ۲۰۰۷ء)

- مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتوں کا جائزہ

(لاہور، سہ ماہی صحیفہ اپریل ۱۹۸۷ء) (لاہور، ماہ نامہ شام و سحر ستمبر ۱۹۸۷ء)

(روز نامہ 'جنگ' کراچی)، (روز نامہ 'دن' لاہور، ۱۷ تا ۲۰ جنوری ۲۰۰۸ء)

- ایک منفرد گیت کار...... حفیظ جالندھری

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، مئی ۱۹۸۷ء) (ملتان 'روزنامہ امروز' یکم اگست ۱۹۸۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۲ تا ۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، یکم مارچ ۲۰۰۸ء)

- نسیم امروہوی (ایک مختصر جائزہ)

(لاہور 'روزنامہ جنگ' ۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء)

- ظفر علی خان کی نعت نگاری

(لاہور 'روزنامہ 'دن' (کرنیں) یکم جون ۲۰۰۸ء) (لاہور 'روزنامہ 'جناح' ۲۴ جون ۲۰۰۸ء)

(لاہور، روزنامہ 'دن' (کرنیں) ۲۵ مئی ۲۰۰۸ء) (لاہور، روزنامہ 'مساوات' ۲ تا ۴ فروری ۲۰۰۸ء)

(لاہور، روزنامہ 'دن' ۱۰ر نومبر ۲۰۰۷ء)

- فطرت شناس شاعر اختر حسین سندھو

(روزنامہ 'دن' لاہور، یکم جون ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۱۲ر اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۶ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

- مضامینِ شام وسحر (۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۸ء تک کے مضامین کی فہرست)

(لاہور 'ماہنامہ شام وسحر' مارچ ۱۹۹۰ء)

- مرثیے اور قصیدے کی بعض مماثلتوں کا جائزہ

(لاہور 'ماہنامہ شام وسحر' جنوری ۱۹۹۲ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۳ تا ۱۶ جنوری ۲۰۰۸ء)

- آلِ رضا کی مطبوعہ تخلیقات کا جائزہ

(لاہور 'ماہنامہ شام وسحر' جولائی ۱۹۸۷ء)

- اُردو مرثیہ نگاری

(لاہور 'روزنامہ جنگ' یکم ستمبر ۱۹۸۷ء)

- طنز و مزاح نگاری' محرکات و مقاصد

(لاہور 'ماہ نو' دسمبر ۱۹۸۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۱۔۲۲ نومبر ۲۰۰۷ء)

- ایک روشن دماغ تھا نہ رہا (بیادِ مرتضیٰ حسین فاضل)

(لاہور 'ماہنامہ شام وسحر' جنوری / فروری ۱۹۸۸ء) (ماہنامہ 'پیام عمل' لاہور، اگست ۱۹۹۸ء)

(ماہنامہ 'المنتظر' لاہور، جون ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۱ تا ۲۳ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۶ر مئی ۲۰۰۷ء)

- سید وصی الحسن نقاش کی شاعری

(لاہور 'ماہنامہ شام وسحر' جون ۲۰۰۲ء) (مشمولہ۔ کوئی صحرا میں بنائے مقتل، نقاش ہاشمی)

- گل فشاں۔ لاہور سے نکلنے والا معتبر رسالہ

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' اپریل ۲۰۰۳ء)

- جاوید صدیق بھٹی کے شعری سفر کی روداد

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' جون ۲۰۰۳ء)

(ماہنامہ 'ادبیات کاشر' لاہور، نومبر ۲۰۰۳ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۹۔ اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'جناح' لاہور، ۳ مارچ ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۵ مارچ ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۲۳ر اپریل ۲۰۰۸ء)

(سہ ماہی 'دریچہ' ستمبر ۲۰۰۸ء)

(ماہنامہ 'زبان' لاہور، جنوری ۲۰۰۷ء)

(شعری مجموعہ 'یاس' جاوید صدیق بھٹی، ۲۰۰۲ء)

(ماہنامہ 'رشحات' لاہور، ستمبر ۲۰۰۵ء)

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور، ۱۵ دسمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۵ر اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'سردار' میلسی، ۲۵ نومبر ۲۰۰۷ء)

(ماہنامہ 'قلم دوست' لاہور، فروری ۲۰۰۶ء)

(ماہنامہ 'ساون' لاہور، ۱۰ر اکتوبر ۲۰۰۳ء)

(ماہنامہ 'اہل قلم' کمالیہ، مئی ۲۰۰۸ء)

(ماہنامہ 'زبان' لاہور، اگست ۲۰۰۸ء)

- حلقہ اہل قلم۔ ایک تحقیقی مطالعہ

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' جولائی ۲۰۰۳ء)

- شکیل جاذب کی شعری کھنک

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' اگست ۲۰۰۳ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۷ مارچ ۲۰۰۷ء)

(بورے والا 'حریم ادب' کتاب نمبر ۱)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۲ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

- مرزا دبیر چند حقائق۔ چند معروضات

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' جنوری ۲۰۰۴ء)

- بے حس معاشرے میں آفتاب کاوش کا تحفۂ احساس

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' اپریل ۲۰۰۴ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۸ جون ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' ۵ جولائی ۲۰۰۸ء)

- تلوار اور قلم کی حرمت کا امین۔ خالد محمود امر

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' مئی ۲۰۰۴ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۷ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۲۵ر اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۸ر مئی ۲۰۰۷ء)

- ایک دردمند دل رکھنے والا شاعر۔ ضیاالرحمٰن فاروقی

(لاہور ماہنامہ 'شام وسحر' ستمبر ۲۰۰۴ء)

(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۳ر مئی ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۶ر دسمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲ جون ۲۰۰۷ء)

- ایک مانوس اجنبی۔ اشفاق حسین

(لاہور ماہنامہ 'شام و سحر' جون ۲۰۰۱ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۵ جون ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور ۲۸ ستمبر ۲۰۰۷ء)

- نسیم سید کی مکمل گواہی

(کراچی 'ارتقا' جولائی ۲۰۰۰ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۰ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

(لاہور ماہنامہ 'شام و سحر' اگست ۲۰۰۱ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۲ر جون ۲۰۰۷ء)

- کچھ ڈاکٹر فخر الحق نوری کے بارے میں

(لاہور ماہنامہ شام و سحر جولائی ۲۰۰۱ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۷ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۳ر مارچ ۲۰۰۷ء)

(لاہور سہ ماہی دبستان ۲۰۰۵ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

- اَدبی رسائل۔ ضرورت یا محض روایت

(اَدبی مجلّہ 'مخزن' شمارہ نمبر ۷ ۲۰۰۴ء)

- ہائے میرا سائیں (بیاد مختار ترابی)

(یادیں مہک اٹھیں' مرتبہ عباس رضا)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۰ ستمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۰ مارچ ۲۰۰۷ء)

- عرشؔی ہاشمی کے جدید مختصر مرثیے

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور نومبر ۲۰۰۵ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۶ نومبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۲ر جولائی ۲۰۰۷ء)

(ماہنامہ 'نیرنگِ خیال' راولپنڈی نومبر ۲۰۰۵ء)

(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۲۸ر اپریل ۲۰۰۸ء)

- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی سلام نگاری

(ماہنامہ 'سپوتنک' لاہور فروری ۲۰۰۶ء)

- کچھ ناصر زیدی کے بارے میں

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مئی ۲۰۰۵ء)

- سیّدہ رفعت خانم کی شاعرانہ ہنرمندیاں

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جولائی ۲۰۰۵ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۶ جون ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۸ر دسمبر ۲۰۰۷ء)

- ع۔س۔ مسلم کے تنقیدی سفر کے ثمرات

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، اگست ۲۰۰۵ء) (مشمولہ۔ میرا تنقیدی سفر، ع۔س۔ مسلم، ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳۰ نومبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۳ جولائی ۲۰۰۷ء)

- کچھ محمد افسر ساجد کے بارے میں

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، دسمبر ۲۰۰۵ء)

- سید روح الامین اور اُردو زبان

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، دسمبر ۲۰۰۵ء)

- کچھ پروفیسر حمید کوثر کے بارے میں

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، حمید کوثر نمبر، اکتوبر ۲۰۰۵ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۷ر جون ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۲۳ر جون ۲۰۰۶ء) (روزنامہ 'جناح' لاہور، ۳۰ر اگست ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور، ۹ر فروری ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'کارنامہ' ملتان، ۸ر جولائی ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۹ر مارچ ۲۰۰۷ء)

- کچھ اُردو سلام کے بارے میں

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۵ء)

- تسنیم عابدی کی شاعری میں حزنیہ عناصر

(ماہنامہ 'نیرنگ خیال' راول پنڈی، جون ۲۰۰۶ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، یکم دسمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۳۰ جولائی ۲۰۰۷ء)

- کچھ پروفیسر ظفر چشتی کے بارے میں

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۶ء)

- سید وحید الحسن ہاشمی کی منقبت کی مختلف جہتیں

(ماہنامہ سپوتنک، لاہور ستمبر ۲۰۰۶ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۱۔۲۲ اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۰۔۱۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

- حرفِ قدس کی دھیمی دھیمی دستک

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۶ء) (رسالہ 'تادیب' انٹرنیشنل، اکتوبر۔ مارچ ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۳ مئی ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۷۔۱۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

- فرقان قریشی کے جلتے بجھتے دیپ

(روزنامہ 'جرأت' لاہور ۲۷ر اپریل ۲۰۰۶ء) (روزنامہ 'سعادت' لاہور ۲۶ر اپریل ۲۰۰۶ء)

(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور یکم ستمبر ۲۰۰۶ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور ۷ مئی ۲۰۰۶ء)

- واقعۂ کربلا اور اَدب کی سمت نمائی

(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور یکم مارچ ۲۰۰۶ء)

- سیف زلفی کے بارے میں

(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶ رمئی ۲۰۰۶ء)

- سیف زلفی کی یادیں، باتیں

(ماہنامہ 'اَدب دوست' لاہور، جون ۲۰۰۶ء) (روزنامہ 'سعادت' لاہور ۱۴ رمئی ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۵ نومبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۶ مئی ۲۰۰۷ء)

- وصی الحسن نقاش کے نعتیہ مظاہر

(روزنامہ 'جرأت' لاہور، ۲۲ راپریل ۲۰۰۶ء) (پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور ۱۶ راپریل ۲۰۰۶ء)

- وجاہت حسین کے بارے میں چند معروضات

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، جولائی ۲۰۰۶ء) (مشمولہ۔ فرد، معاشرہ اور شعور، وجاہت حسین

وجاہت ہاؤس آف پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۳۰ راپریل ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳۱ راگست ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۸ راپریل ۲۰۰۸ء)

- اقبال شناسی اور فرہنگِ اقبال

(ماہنامہ 'جدید اَدب' لاہور، دسمبر ۱۹۸۹ء)

- قیصر اقلیمِ مرثیہ

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (قیصر بارہوی نمبر) جون ۱۹۹۰ء)

- ڈاکٹر آغا سہیل۔ ایک تعارف، عہد بہ عہد

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور (آغا سہیل نمبر) جون ۱۹۹۳ء)

- ایک حساس تخلیق کار۔ فرقان قریشی

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، فرقان قریشی نمبر، جون ۲۰۰۶ء)

(مشمولہ۔ خراجِ دلنواز۔ مرتبہ۔ اُسامہ فرقان سیو پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۹ ستمبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۱۳ راپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۳ ستمبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۵ مئی ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۳ نومبر ۲۰۰۹ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳۰ جولائی ۲۰۱۰ء)

(روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۵ را کتوبر ۲۰۱۱ء) (روزنامہ 'سسٹم' لاہور، ۱۲ راپریل ۲۰۱۱ء)

- ایک سنجیدہ فکر نقاد۔ ڈاکٹر عبدالکریم خالد

(ماہنامہ 'نیرنگِ خیال' راول پنڈی، جولائی ۲۰۰۶ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، اتوار ۱۸ رفروری ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۹/اپریل ۲۰۰۷ء) (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، جون ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۶/ستمبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۰/اپریل ۲۰۰۸ء)

- نقاش ہاشمی کی شعری کائنات

(مشمولہ۔ حصارِ دعا میں رہتا ہوں۔ نقاش ہاشمی الحسن پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۱۶/اپریل ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳/اکتوبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'مساوات'، لاہور، ۲۴/دسمبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۷/اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۴/دسمبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، یکم اپریل ۲۰۰۷ء)

- ادب کا مسیحا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، ۲۰۰۶ء) (مشمولہ۔ طاہر تونسوی۔ ایک مطالعہ)

(ماہنامہ 'زم زم' بہاول پور، جون ۲۰۰۷ء) (سہ ماہی 'دریچہ' پاکستان، شمارہ نمبر ۱۳۔۱۴، ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۴/اکتوبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۴ مئی ۲۰۰۷ء)

- شیر افضل جعفری اور اُن کی شعری تخلیقات

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، شیر افضل جعفری نمبر، جنوری ۱۹۹۰ء) (سہ ماہی 'شیبہ' اپریل، ۲۰۰۰ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۹/اپریل ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۵/دسمبر ۲۰۰۷ء)

- اختر ہاشمی کا شعری منظر نامہ

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۱ء) (روزنامہ 'جنگ' کراچی، مڈ ویک، ۷ فروری ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور، ۸ دسمبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳/اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۲/دسمبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳۰/اگست ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۹/مارچ ۲۰۰۷ء)

- لفظوں کا شناور۔ فرقان قریشی

(مشمولہ، حرف ریزے۔ فرقان قریشی سیو پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)

- ایک باطنی خاکہ نگار۔ ڈاکٹر معراج نیّر

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (ڈاکٹر معراج نیّر نمبر) نومبر ۲۰۰۶ء)

(مشمولہ۔ پلک بسیرے۔ ڈاکٹر معراج نیّر لاہور، ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۲/مئی ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۴/اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۲/اکتوبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۵/دسمبر ۲۰۰۷ء)

- کچھ جعفر بلوچ کے بارے میں

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، جعفر بلوچ نمبر، اپریل ۲۰۰۵ء)

- کچھ عمر فیضی کے بارے میں

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، عمر فیضی نمبر، جون۲۰۰۵ء)

- عمر فیضی کے چند نایاب مکاتیب

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، عمر فیضی نمبر، جون۲۰۰۵ء)

- سید وحید الحسن ہاشمی اور اُن کی اَدبی خدمات

(روزنامہ 'اساس' لاہور، ۲۹ نومبر۲۰۰۲ء)

- واقعۂ کربلا اور اَدب

(روزنامہ 'جنگ' لاہور، ۳ فروری۲۰۰۶ء)

- حمید کوثر کے چند نادر مکاتیب

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر۲۰۰۶ء)

- کچھ اُردو نعت کے بارے میں

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۸؍اکتوبر۲۰۰۶ء)

- اُردو نعت۔ ماضی، حال، مستقبل

(روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۲۶ ستمبر۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'انصاف' لاہور، ۱۹؍اکتوبر۲۰۰۶ء)

(کتابی سلسلہ 'عبیر نعت' فیصل آباد، جولائی۲۰۰۷ء)

(پندرہ روزہ 'سائبان' لاہور، ۱۵؍اکتوبر۲۰۰۶ء)

(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، یکم اکتوبر۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'جنگ' کراچی، مڈویک میگزین، ۱۸؍اکتوبر۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'اوصاف' لاہور، ۹؍اکتوبر۲۰۰۶ء)

- طاہر القادری کی غذائے فکری

(روزنامہ 'آواز' لاہور، ۱۹؍فروری۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'جناح' لاہور، ۱۸؍فروری۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'پاکستان' لاہور، ۱۸؍فروری۲۰۰۷ء)

(ہفت روزہ 'تحریک' لاہور، ۲۸؍فروری۲۰۰۷ء)

- اسلم کولسری کا شعری مجموعہ۔ 'ویرانہ'

(ماہنامہ 'ادبِ لطیف' لاہور، اکتوبر۲۰۰۶ء)

- رفتارِ شام وسحر (ماہنامہ 'شام وسحر' کے اشاریے)

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور جنوری ۱۹۸۹ء تا جنوری ۲۰۰۷ء)

- اَدب اور معاشرہ

(سالانہ انتخاب۔ لاہور آرٹس فورم، ۲۰۰۶ء)

- اُردو مرثیہ۔ چند حقائق چند معروضات

(ماہنامہ 'سفید چھڑی' سرگودھا، جولائی ۲۰۰۷ء)
(چندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶/مارچ ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'جرأت' لاہور، ۳۰/جنوری ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'اوصاف' لاہور، ۲۸/جنوری ۲۰۰۷ء)

- اُردو مرثیہ۔ ماضی، حال، مستقبل

(روزنامہ 'ایکسپریس' لاہور، ۲۸/جنوری ۲۰۰۷ء)

- اکیسویں صدی اور مرثیہ

(روزنامہ 'دن' (کرنیں) لاہور، ۳/فروری ۲۰۰۷ء)

- اُردو مرثیہ کی نئی جہتیں

(روزنامہ 'اساس' لاہور، ۳۱/جنوری ۲۰۰۷ء)

- اُردو زبان و ادب کے فروغ میں میڈیا کا کردار

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اگست ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'دن' (کرنیں) لاہور، ۲ ستمبر ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'شیشہ' لاہور، یکم دسمبر ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، ۱۳/جولائی ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۸/جولائی ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی میں جگ بیتی

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳/اکتوبر ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۰ مئی ۲۰۰۸ء)
(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۸/مارچ ۲۰۰۷ء)

- حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی شخصیت

(ماہنامہ 'ادب دوست' لاہور)

- ڈاکٹر عبیداللہ خان۔ ایک تہذیبی شخصیت

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مئی ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'جرات' لاہور، ۱۴/جنوری ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۵ جنوری ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'مساوات' ۶/ستمبر ۲۰۰۷ء)

- میلسی کا روشن آفتاب۔ شفیق الرحمن الہ آبادی

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۷ء)
(چندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، ۳۱/دسمبر ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۸/مئی ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'مساوات' لاہور، یکم نومبر ۲۰۰۷ء)
(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۸/جون ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر جعفر بلوچ ایک صاحب طرز تخلیق کار

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۲/اگست ۲۰۰۷ء)

- پاکستانی اُدب کے قافلہ سالار۔ خالد اقبال یاسر

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۱۹/فروری ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۵ ستمبر ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۱۴۔۱۵/نومبر ۲۰۰۷ء)

- جمیل احمد عدیل کی افسانہ نگاری کی منفرد جہتیں

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، فروری ۲۰۰۸ء)
(مشمولہ 'حاویہ' جمیل احمد عدیل، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۲۷۔۲۸ نومبر ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۸ ستمبر ۲۰۰۷ء)

- گلستانِ اُدب کا جمال۔ ڈاکٹر قاسم جلال

(روز نامہ 'دن' لاہور، ۱۳/مارچ ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۱۶/ستمبر ۲۰۰۷ء)

- بالا خانے کا مسافر۔ رحمٰن مذنب

(روز نامہ 'دن' لاہور، ۲۶/فروری ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۱۸/ستمبر ۲۰۰۷ء)

- مثبت قدروں کی تخلیق کار۔ نجمہ سہیل

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء)
(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۷/مارچ ۲۰۰۸ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۸/مارچ ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ ایک ہمہ جہت تخلیق کار

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، مئی ۲۰۰۸ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۲۵ جون ۲۰۰۷ء)
(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۷ دسمبر ۲۰۰۷ء)

- ایک معتبر جائزہ نگار۔ پروفیسر ظفر چشتی

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، جولائی ۲۰۰۸ء)

- صحرائے قطر کا آہو۔ محمد ممتاز راشد

(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۶/اگست ۲۰۰۸ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۲۱/اپریل ۲۰۰۸ء)

- عرفانہ عزیز کی شعری کائنات

(روز نامہ 'دن' لاہور، ۲۰ ستمبر ۲۰۰۷ء)

- ایک نظریاتی نقاد۔ محمد علی صدیقی

(ماہ نامہ 'سپوتنک' لاہور، جولائی ۲۰۰۸ء)
(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۲۸ فروری ۲۰۰۸ء)
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۹/اکتوبر ۲۰۰۷ء)

- تنویر حسین کی تخلیقات میں طربیہ عناصر

(روز نامہ 'دن' لاہور، ۹/جولائی ۲۰۰۸ء)
(روز نامہ 'مساوات' لاہور، ۱۹/مئی ۲۰۰۸ء)

- جمہوریت کی نوید اور ادبی رسائل کا کردار

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اگست ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۳ر جون ۲۰۰۸ء)

- شفیق الرحمن کا پیش کردہ آئینۂ خیال

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۸ر مئی ۲۰۰۸ء)

- ایک منفرد تخلیق کار۔ پروفیسر وحید عزیز

(روزنامہ 'جناح' لاہور، ۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۸۔۲۹ مارچ ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۷ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

- ایک ہوش مند تخلیق کار۔ پریا تابیتا

(روزنامہ 'آفتاب' کوئٹہ، ۲۳ر جنوری ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۵ر مارچ ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۱ر دسمبر ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر نفیس اقبال کی تخلیقی کاوشیں

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۹ر نومبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۲ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

(تحقیقی مجلہ 'زبان و ادب' شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء)

- حسن عسکری کاظمی۔ ایک معتبر نظم نگار

(روزنامہ 'جناح' لاہور، ۲۷ر مئی ۲۰۰۸ء)

- اجداد کی وراثت کا امین۔ ڈاکٹر عباس رضا

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور، ۱۲ر جنوری ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۶ر جون ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور ۱۹ر اپریل ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۱ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۴ر جون ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۶ مئی ۲۰۰۸ء)

- حسن عسکری کاظمی کے مناقب اور سلام

(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، یکم مئی ۲۰۰۸ء) (سہ ماہی 'وصال' سرگودھا، اگست ۲۰۰۸ء)

- ایک معتبر نقاد۔ حسن عسکری کاظمی

(ماہنامہ 'سپوتنک' لاہور، جون ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر وحید عزیز کی تخلیقی جہتیں

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۶ر اگست ۲۰۰۸ء)

- ایک صاحب طرز نعت نگار۔ حسن عسکری کاظمی

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۷ر اپریل ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۵ر اگست ۲۰۰۸ء)

- آبروئے صحافت۔ حمید کوثری

(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶ ام مئی ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۸ر مئی ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر طاہر القادری۔ سفیر امن عالم

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۹ر مارچ ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۳ر فروری ۲۰۰۸ء)

- ایک معتبر تخلیق کار۔ پروفیسر ظفر چشتی

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۶ر فروری ۲۰۰۸ء)

- ایک معتبر مزاح نگار۔ فرحت اللہ بیگ

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۶۔ ۲۷ر نومبر ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر کنول فیروز۔ محبت اور سچائی کا علم بردار

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۱۔ ۲۳ مارچ ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۵ر نومبر ۲۰۰۷ء)

- اُردو ادب کا فرہاد۔ ڈاکٹر انور سدید

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، یکم فروری ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۴ر نومبر ۲۰۰۷ء)

- عزم و ہمت کا شاعر۔ اختر سعیدی

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۸ر جنوری ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۶ر نومبر ۲۰۰۷ء)

- نسیم الحسن حسن زیدی کی مدحیہ شاعری

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۱ر اکتوبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۱۸ر اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور)

- ایک ادب دوست تخلیق کار۔ ڈاکٹر حسن رضوی

(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۸ جون ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، یکم جولائی ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۴ر اکتوبر ۲۰۰۷ء)

- اُردو مرثیے کا ایک معتبر نام۔ قیصر بارہوی

(روزنامہ 'مساوات' لاہور ۱۱ تا ۱۷ر نومبر ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۴ جولائی ۲۰۰۷ء)

- قیام پاکستان کے بعد اُردو شاعری کے متنوع رنگ

(روزنامہ 'جنگ' لاہور، ۱۵ر اگست ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۰ر ستمبر ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'جنگ' کراچی، (مڈویک میگزین)، ۲۹ر اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- جدید اُردو غزل اور اسلم کولسری

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۴ جون ۲۰۰۷ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور ۱۱ر اپریل ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور ۱۳ر نومبر ۲۰۰۷ء)

- ایک مستند نقاد۔ڈاکٹر نواز حسن زیدی

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۵ مئی ۲۰۰۷ء)　(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۹ راکتوبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ الجریدہ، لاہور، ۱۲ رمئی ۲۰۰۸ء)

- آسمانِ شاعری کا روشن ستارہ۔طاہر ناصر علی

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۳ مئی ۲۰۰۷ء)　(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۷ راکتوبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۲۱ راپریل ۲۰۰۸ء)

- محمود نظامی کا باطنی سفرنامہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۵ راکتوبر ۲۰۰۷ء)　(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۳ رمئی ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۳ راپریل ۲۰۰۷ء)

- جلاوطنی کا دکھ اور طارق عزیز کے خواب

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۲ مارچ ۲۰۰۷ء)　(روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۲ مئی ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۵ رستمبر ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر محمد صالح طاہر کے طاہر مضامین

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۹ رستمبر ۲۰۰۷ء)　(روزنامہ 'دن' لاہور، ۵ رمارچ ۲۰۰۷ء)

- لکھنوی اور لاہوری ثقافت کا حسین امتزاج۔آغا سہیل

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۹ رستمبر ۲۰۰۷ء)　(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۳ رستمبر ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، یکم مارچ ۲۰۰۷ء)

- محبت اور انقلاب کا شاعر۔احمد فراز

(روزنامہ 'جناح' لاہور، ۲۷ راگست ۲۰۰۸ء)　(روزنامہ 'دن' لاہور، ۸ رستمبر ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۱ راکتوبر ۲۰۰۸ء)

- ریاضیاتی کلید

(مشمولہ 'کائنات کا الوہی کوڈ'۔مصنف: زاہد اسلم افغان آئی جے ایف پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء)

- روشنی سے راستہ کشید کرنے والا شاعر۔زاہد شمسی

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲ راگست ۲۰۰۸ء)　(روزنامہ 'دن' لاہور)

- اعظم کمال کی رجوعی غزلیں

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۲ راگست ۲۰۰۸ء)　(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۸ رستمبر ۲۰۰۸ء)

- سچائی کا عذاب اور شاہد چودھری

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۳۰ راگست ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۶ ستمبر ۲۰۰۸ء)

- بین الاقوامی تناظر میں اُدب کی تخلیق

(سہ ماہی 'تجدیدِ نو' لاہور، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۲ رجولائی ۲۰۰۸ء)

- پاکستانی اُدب اور ہمارے ادیب

(روزنامہ 'جنگ' کراچی، مڈویک میگزین، ۸ راکتوبر ۲۰۰۸ء)

- چل بسا جعفر بلوچ......

(پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاولپور، یکم اکتوبر ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۴ راکتوبر ۲۰۰۸ء)

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء)

- نہ اس طرح سے ملو

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۲ راکتوبر ۲۰۰۸ء)

- نذرِ ایوب قیصر کے ماہیے

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۵ راکتوبر ۲۰۰۸ء)

- 'سکوت' کا شور

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۷ راکتوبر ۲۰۰۸ء)

- اُجلے من کی شاعرہ۔ فرخ زہرا گیلانی

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۰ رجون ۲۰۰۹ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۱ رجون ۲۰۱۰ء)

- جدید تہذیبی اقدار کا امین۔ ڈاکٹر سعادت سعید

(روزنامہ 'دن' لاہور، یکم جون ۲۰۰۹ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۵ رجون ۲۰۰۹ء)

- شاہدہ لطیف کے منظوم سفرنامے

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲ رجون ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۷ راگست ۲۰۰۹ء)

- سلمان سعید اور 'درد سے بوجھل ہوا'

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۸ رمئی ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۴ رستمبر ۲۰۰۹ء)

- لکھنوی تہذیب و ثقافت کا آخری چراغ۔ سیّد آلِ رضا

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۷ رمئی ۲۰۱۰ء)

- غضنفر عباس کی شعری کائنات

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۵ رمئی ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۵ رمئی ۲۰۱۰ء)

- ڈاکٹر سلیم اختر۔ ایک تہذیبی خاکہ نگار

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۲ر مئی ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، یکم اپریل ۲۰۱۰ء)

- ایک کھلنڈرا شاعر۔ جون ایلیا

(روزنامہ 'آج کل' لاہور، ۱۳ر دسمبر ۲۰۰۸ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۵ر مئی ۲۰۱۰ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۵ر اکتوبر ۲۰۰۹ء)

- پیغمبر شعر و سخن۔ مصطفےٰ زیدی

(روزنامہ 'آج کل' لاہور، ۱۵ر اکتوبر ۲۰۰۹ء) (روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳ر مئی ۲۰۱۰ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۹ر اکتوبر ۲۰۰۹ء) (روزنامہ 'خبریں' ملتان، ۲۰ر جولائی ۲۰۱۰ء)

- ڈاکٹر سلیم اختر کے افسانوں میں شعری وجدان

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۷ر اپریل ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۸ر مارچ ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'نساخ' لاہور، ۱۰ر اپریل ۲۰۰۹ء)

- ممکن کے امکانات (پروین کل)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۸ر جولائی ۲۰۰۹ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۳ جولائی، ۲۰۰۹ء)

- ''آشوب'' میں عصری آشوب (ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا شعری مجموعہ)

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۳ر مئی ۲۰۱۰ء)

- شاعر علی شاعر کی تروینیاں

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۸ر جولائی ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۱ر مارچ ۲۰۱۰ء)

- ''گمان سے پہلے'' نعیم ساگر کا منفرد شعری مجموعہ

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۶ر جولائی ۲۰۱۰ء)

- معاشرتی کرب اور ساجد پال ساجد

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۵ر جولائی ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲ر مئی ۲۰۱۰ء)

- شبہ طراز کی شعری کاوشیں

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۲ر جولائی ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۶ر مارچ ۲۰۰۹ء)

- ایک مہذب شاعرہ۔ الویرا یاسمین علی

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۹ر جون ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۳۰ر جون ۲۰۰۹ء)

- اقبال حیدر کی مرثیہ نگاری

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۵ر جون ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، یکم ستمبر ۲۰۰۹ء)

- انسانی جذبات کا عکاس شاعر۔ ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۱۸؍مارچ ۲۰۱۰ء)

- صادق جذبوں کی شاعرہ ۔ سائرہ بتول

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۰۱۰ء)

- شامِ ہجر و وصال کا شاعر ۔ احمد شہزاد

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۰۱۰ء)

- اعجازِ مودّت کی معجز نمائیاں

(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲۰۱۰ء) (روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۰۱۰ء)

- ایک نئے شعری ذائقے کا امین ۔ رب نواز مائل

(ادبی جریدہ 'خزن' ۲۰۱۰ء)

- ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا زریں انتخاب

(ماہنامہ 'ادب دوست' لاہور، جون ۲۰۱۰ء)

- ڈاکٹر طاہر تونسوی کی شخصیت بینی

(ماہ نامہ 'وجدان' لاہور، نومبر ۲۰۰۹ء)

- ایک عہد آفریں شاعر ۔ شہزاد احمد

(سہ ماہی 'پیش رفت' جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۴) (ماہ نامہ 'وجدان' لاہور، اپریل ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'پاکستان' ملتان، ۲؍اپریل ۲۰۰۹ء)

- مجاز لکھنوی ۔ ترقی پسند تحریک کے معتبر شاعر

(روزنامہ 'آج کل' لاہور، ۳؍دسمبر ۲۰۰۸ء)

- اُجلے من کا نقاد ۔ قدرت اللہ شہزاد

(روزنامہ 'خبریں' ملتان، ۳؍اپریل ۲۰۰۹ء)

❖ فیچر

- اے قائداعظم ترا احسان ہے :

(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ...... ۲۰۰۳ء) (روزنامہ 'دن' (کرنیں) لاہور، ۱۲؍اگست ۲۰۰۷ء)

❖ انٹرویو

- قیصر بارہوی کی غزل

قیصر بارہوی سے اُن کی غزل کے بارے میں مکالمہ

(مشمولہ 'احتزاج' (قیصر بارہوی) لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)

- حلقۂ اربابِ ذوق کا ماضی، حال، مستقبل
شہرت بخاری، سجاد باقر رضوی، انجم رومانی اور سہیل احمد خان سے گفت گو
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور دسمبر ۱۹۸۹ء)

❖ تبصرے (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تحریر کردہ)

- پاکستان، سائنس، تعلیم اور معیشت (ڈاکٹر عبدالسلام) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء)
- صفر ایک (حسنین بخاری) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء)
- داستان کی داستان (ڈاکٹر آرزو چودھری) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، اپریل ۱۹۸۹ء)
- نگاہیں اُداس ہیں (افضل صفی) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء)
- ابابیلیں اُتر آئیں (ڈاکٹر حنیف ترین) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء)
- اندھیروں کی کہانی (سید اسد علی) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء)
- احساس (آفتاب کاوش) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء)
- اِک چراغ اور بھی (شہزاد احمد) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء)
- احساس (ضیاء الرحمٰن فاروقی) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۴ء)
- کلیات یگانہ (مرتب مشفق خواجہ) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۴ء)
- دریچے جاگتے ہیں (علی حسنین سید) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۴ء)
- چاندنی میں رقص (شبہ طراز) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۴ء)
- فنون (احمد ندیم قاسمی۔ مدیر) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۴ء)
- اقبال (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ مدیر) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۴ء)
- آموزش (ڈاکٹر عبدالکریم خالد۔ مدیر) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۴ء)
- نوادر (ڈاکٹر گوہر نوشاہی۔ مدیر) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۴ء)
- خاک کے پردے (ڈاکٹر آغا سہیل) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، دسمبر ۲۰۰۴ء)
- اُردو ہے جس کا نام (روح الامین) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، دسمبر ۲۰۰۴ء)
- جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھ پوری (ڈاکٹر فرمان فتح پوری) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۶ء)
- رزقِ مودّت (طاہر ناصر علی) (ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۶ء)
- علم اور علماء (ساحر لکھنوی) (ماہ نامہ 'پیامِ عمل' لاہور، مئی ۱۹۹۲ء)

- پاکستان کی سیر گاہیں (حامد علی نقوی) (ماہنامہ 'قانونِ ادب' لاہور، مارچ ۲۰۰۳ء)
- اُردو نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر (ڈاکٹر عاصی کرنالی) (ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء)
- ہدایت (مرثیہ) (علامہ طالب جوہری) (ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء)
- اردو شاعری میں تصوف (ڈاکٹر نفیس اقبال) (ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۷ء)
- جانے پہچانے (خاکے) (نجمہ سہیل) (ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جون ۲۰۰۷ء)
- مسافتوں کی تھکن عذرا اصغر (ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)
- درد کا لمس شبہ طراز (ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)
- سرکارِ دو جہاںؐ کا غلام محمد ایوب ساگر (ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور)

(ماہنامہ 'اعتبار' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

(ہفت روزہ 'ایشیا' لاہور، ۲۸ر فروری ۲۰۰۸ء)

❖ فلیپ / دیباچے (مختلف کتب پر ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے تحریر کردہ)

- رزم نامہ انیسؔ و دبیرؔ (مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی)
- روگی روگی عشق مسافر (علم دار نوشیل)
- بجھے چراغوں کی روشنی (عرشی ہاشمی)
- آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں (سید وحید الحسن ہاشمی)
- حصارِ دعا میں رہتا ہوں (سید نقاش ہاشمی)
- قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری (ڈاکٹر ہارون قادر)
- اُردو ناول کے منفی کردار (پریا تابیتا)
- رزقِ مودت (طاہر ناصر علی)
- مجتہدِ نظم مرزا دبیرؔ (ڈاکٹر تقی عابدی)
- سلکِ سلامِ دبیرؔ (ڈاکٹر تقی عابدی)
- طالع مہر (دبیرؔ کا غیر منقوطہ کلام) (ڈاکٹر تقی عابدی)
- سحابِ مدحت (مظفر نقوی)
- جنابِ زہراؑ و ثانی زہراؑ (ڈاکٹر سید ابوالحسن نقوی)
- عقیدتیں (ڈاکٹر حسن رضوی)
- فرد، معاشرہ اور شعور (وجاہت حسین وجاہت)
- ضامنِ نجات (سید اقبال رضوی)
- کربلا سفر میں ہے (طاہر ناصر علی)
- ثانیہ (پروفیسر وحید عزیز)
- کھوج پرکھ (ڈاکٹر سید قاسم جلال)
- ہمیشہ روٹھ جاتے ہو (پریا تابیتا)
- اُسے بھولنے چلے تھے (تسنیم عثمان سحر)
- حروفِ مدحت (اختر ہاشمی)
- متاعِ نور (سید مظفر نقوی)
- نہ اس طرح سے ملو (اسد اعوان)
- چاند اکیلا ہے (نذیر اے۔ قمر)
- حرفِ برہنہ (شور صہبائی)
- سٹ وچھوڑے دی (یونس وریام)
- آرزو (عبدالغفار قائم)

- گماں کی زنجیریں (ایم۔ زیڈ کنول)
- مکتبِ سلونی (طاہر ناصر علی)
- اَدبی جہتیں (پروفیسر وحید عزیز)
- اعجازِ مودّت (اعجاز ثقلین بخاری)
- شامِ شہرِ وصال (احمد شہزاد)
- شام سے ذرا پہلے (کرنل تصدق حسین میاں)
- شب رائیگاں (غضنفر عباس رانا)
- کوئی فاصلہ نہ ہو (پروفیسر وحید عزیز)
- کبھی میں یاد آؤں تو (شور صہبائی)
- چند اور مضامین (ڈاکٹر عبدالکریم خالد)
- شاعری کا دبستانِ دہلی و لکھنو۔ غیر حقیقی تقسیم (پروفیسر باقر علی شاہ)
- اُردو محاورے (فخر الدین صدیقی اثر، محمد علی انجم، تبسم زہرا)
- ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق (پروفیسر سعدیہ شفقت)

❖ اعترافِ عظمت

(ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کے بارے میں شائع ہونے والی کتب اور تحقیقی مقالات)

- محمد آصف ڈو — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے تنقیدی رجحانات
  (مطبوعہ اظہار سنز، لاہور، ۲۰۰۷ء)
- پروفیسر وحید عزیز — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا جہانِ فن
  (مطبوعہ اظہار سنز، لاہور، ۲۰۱۰ء)
- سعدیہ ہاشمی — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ احوال و آثار
  (تحقیقی مقالہ ایم۔ فل، اُردو، بہاول پور یونیورسٹی)
- حرا نسیم — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بطور تدوین کار
  (تحقیقی مقالہ ایم۔ اے، اُردو، لاہور کالج یونیورسٹی، لاہور)
- شائلہ اختر — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بطور کالم نگار
  (تحقیقی مقالہ ایم۔ اے، اُردو ایجوکیشن یونیورسٹی، فاروویمن، لاہور)
- آنسہ — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تنقیدی کتاب 'تصریحات' کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ
  (تحقیقی مقالہ ایم۔ اے اُردو، ایجوکیشن یونیورسٹی، لاہور)

❖ شبیہ شناسی

(ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کے بارے میں شائع ہونے والی تحریریں)

- مصدق لاکھانی — ڈاکٹر شبیہ الحسن کی فکری جولانیاں
  (ماہنامہ"

- یعقوب تصور — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور میرے چند جملے
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، نومبر ۲۰۰۳ء)
- علامہ سید انوار ظہوری — آلِ رضا کی غزل گوئی کے بارے میں چند معروضات
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، جنوری ۱۹۹۱ء)
- ڈاکٹر آغا سہیل — شام وسحر کے اداریے
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء)
- ڈاکٹر نواز حسن زیدی — اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، مارچ ۲۰۰۴ء)
- پروفیسر حسن عسکری کاظمی — اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، مئی ۲۰۰۴ء)
- ڈاکٹر انور سدید — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی دو گراں قدر تصانیف
(مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی)
(اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار) (ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، مئی ۲۰۰۵ء)
- ڈاکٹر عبدالستار نیازی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تصریحات، فن کے آئینے میں
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، نومبر ۲۰۰۵ء)
- پروفیسر حسن عسکری کاظمی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن۔ محقق اور نقاد
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، دسمبر ۲۰۰۵ء)
(ہفت روزہ "ذوالفقار" پشاور، یکم جنوری ۲۰۰۶ء)
- ڈاکٹر انور سدید — شام وسحر کے اداریے
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، فروری ۱۹۹۴ء)
- پروفیسر امجد علی شاکر — آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، اگست ۱۹۹۷ء)
- پروفیسر باقر علی شاہ شبیہ الحسن کا تنقیدی مجموعہ "مفاہیم"
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، ۱۹۹۱ء)
- پروفیسر سجاد مرزا — شام وسحر کے اداریے
(ماہنامہ "شام وسحر" لاہور، مئی ۱۹۹۶ء، فروری ۱۹۹۷ء)
- ڈاکٹر عارف ثاقب — روشنی کا سفر (آلِ رضا پر شبیہ الحسن کی کتاب کا تجزیہ)

(ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، نومبر ۱۹۹۰ء)

- مرزا ادیب

شام وسحر کے اداریے

(ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، نومبر ۱۹۹۷ء)

- ڈاکٹر ہارون قادر

شبیہ الحسن کا مجموعۂ مضامین 'مفاہیم'

(ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، نومبر ۱۹۹۱ء)

- شہزاد احمد

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا ایک اور تحقیقی کارنامہ

(ماہ نامہ ''شام وسحر'' لاہور، فروری ۲۰۰۴ء)

- فرقان احمد قریشی

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے اعزاز میں

(جلتے بجھتے دیپ۔ فرقان قریشی، مارچ ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر عبدالکریم خالد

کچھ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کے بارے میں

(ماہ نامہ ''سخن ور'' کراچی، مارچ۔اپریل ۲۰۰۵ء)

(ماہ نامہ 'سپوتنک'' لاہور، اگست ۲۰۰۵ء)

(ماہ نامہ 'پیامِ عمل' لاہور، اگست ۲۰۰۵ء)

(چندرہ روزہ 'سہیل' واہ کینٹ، یکم اگست ۲۰۰۵ء)

(روز نامہ 'سعادت' لاہور، ۱۴/مارچ ۲۰۰۶ء)

(ماہ نامہ 'صدرنگ' لاہور، ستمبر ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر نواز حسن زیدی

جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ

(ماہ نامہ ''الحمرا'' لاہور، مارچ ۲۰۰۶ء)

- پروفیسر صفدر نعیم

جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ

(ماہ نامہ 'ادب دوست' لاہور، جون ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا نیا کارنامہ۔ سیف زلفی کے مرثیے

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اگست ۲۰۰۶ء)

(چندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶ جولائی ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر عبدالکریم خالد

سیف زلفی کے مرثیے اور شبیہ الحسن کا نسخۂ خیر

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اگست ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر ریاض قدیر

سیف زلفی کے جدید مرثیے

(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اگست ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر نواز حسن زیدی
سیف زلفی کے مرثیے ۔ڈاکٹر شبیہ الحسن کا اُدبی کارنامہ
(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اگست ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر عبدالکریم خالد
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی اُدبی خدمات
(ہفت روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶ جون ۲۰۰۶ء)
(روز نامہ 'جرأت' لاہور، ۳۰ مئی ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر سلیم اختر
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی نئی تخلیق "اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار"
(پندرہ روزہ "ذوالفقار" پشاور، یکم تا ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء)
(ہفت روزہ "رضا کار" لاہور، ۱۸ تا ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء)
(روز نامہ 'سعادت' لاہور، ۳ دسمبر ۲۰۰۴ء)

- ڈاکٹر علی شیر طور
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے لیے تحسینی کلمات
(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

- پروفیسر خورشید بیگ میلسوی
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ایک عظیم نقاد
(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)
(پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، نومبر ۲۰۰۶ء)
(سہ ماہی 'تجدید نو' لاہور، اپریل تا جون ۲۰۰۷ء)

- مظہر حسین مظہر
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ۔ایک باشعور نقاد
(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

محمد افضل ثاقب
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور
(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

- حسن عسکری کاظمی
رثائی اُدب میں سیف زلفی کا مقام اور شبیہ الحسن
(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶ر جون ۲۰۰۶ء)

- پروفیسر حسن عسکری کاظمی
شاعرِ حسینیت قیصر بارہوی کے مرثیے
(روز نامہ 'دن' لاہور، ۲۰ر فروری ۲۰۰۷ء)

- مشتاق احمد
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ہمہ جہت شخصیت
(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

- مرید عباس خاور
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی فکر کے محرکات
(ماہ نامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

- سعید احمد سعید — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن تصریحات کے آئینے میں
  (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)
- شفیق الرحمن الہ آبادی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن۔ ایک ادبی شخصیت
  (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)
  (پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاولپور، نومبر ۲۰۰۶ء)
- نجم الحسن رضوی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی کار مسیحائی
  (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۳ء)
- ڈاکٹر محمد ہارون قادر — آل رضا کا فن غزل گوئی
  (ماہنامہ 'جدید ادب' لاہور، دسمبر ۱۹۸۹ء)
- پروفیسر امتیاز حسین — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیقی بالغ نظری
  (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۲ء)
- ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا کارنامۂ خاص۔ باقیاتِ آل رضا
  (ماہنامہ 'پیام عمل' لاہور، دسمبر ۲۰۰۱ء)
  (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۲ء)
  (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، جنوری ۲۰۰۳ء)
- ڈاکٹر آغا سہیل — آل رضا کی شعری متاع پر ڈاکٹر شبیہ الحسن کا محاکمہ
  (ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، اپریل ۲۰۰۲ء)
- اعجاز ثقلین بخاری — ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کتاب۔ جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی
  (ماہنامہ 'پیام عمل' لاہور، جولائی ۲۰۰۲ء)
- محمد عمر — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تصریحات
  (سہ ماہی 'فنون' لاہور، جنوری ۲۰۰۵ء)
- مصطفٰے کمال — موجودہ بے ادب دور میں ادب سے رابطہ
  (ماہنامہ 'مکالمہ' راول پنڈی، ۲۰۰۶ء)
- شیام — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا کارنامہ۔ سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں
  (ہفت روزہ 'آئند' حضرو۔ اٹک، جنوری ۲۰۰۶ء)
- توفیق الرحمن سیفی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی مرتبہ "طاہرین"
  (روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۳/جون ۲۰۰۶ء)

- تاج سعید — باقیات آل رضا۔ ایک یادگار کتاب
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، فروری ۲۰۰۱ء)
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، جنوری ۲۰۰۳ء)
- پروفیسر ذوالفقار علی آغا صاحب۔ ایک یادگار دستاویز
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۱ء)
- ڈاکٹر ریاض قدیر — باقیات آل رضا۔ تحقیقی وتنقیدی جائزہ
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، دسمبر ۲۰۰۱ء)
- آفتاب کاوش — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی مرتبہ 'العطش'
(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۵ء)
- ڈاکٹر شبیر احمد قادری — وحید شناسی کی ایک مثال۔ مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن ہاشمی
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، ستمبر ۲۰۰۵ء)
- ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ترجیحات
(مشمولہ۔ ترجیحات۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۹۸ء)
- ڈاکٹر عاصی کرنالی — ترجیحات کی حیرت سامانیاں
(مشمولہ۔ ترجیحات۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۹۸ء)
- ڈاکٹر آغا سہیل — ڈاکٹر شبیہ الحسن کا فکر انگیز مجموعہ۔ مفاہیم
(مشمولہ۔ مفاہیم۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۹ء)
- ڈاکٹر سجاد باقر رضوی — آلِ رضا کا روحانی فیض اور ڈاکٹر شبیہ الحسن
(مشمولہ۔ آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)
- پروفیسر سجاد حارث — ڈاکٹر شبیہ الحسن کا حُسنِ انتخاب اور شعری ادب
(مشمولہ۔ بیسویں صدی کا شعری ادب۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۸ء)
- فرقان احمد قریشی — ایک نابغۂ روزگار شخصیت۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن
(روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۲ر اکتوبر ۲۰۰۶ء)
(ہفت روزہ 'عزم' لاہور، ۲۲ تا ۲۸ر اکتوبر ۲۰۰۶ء)
(پندرہ روزہ 'سائبان' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)
(ہفت روزہ 'ذوالفقار' پشاور، نومبر ۲۰۰۶ء)
(روزنامہ 'انصاف' لاہور، ۲۱ر دسمبر ۲۰۰۶ء)

(ہفت روزہ 'کھلی عدالت' وہاڑی، ۲۲؍ نومبر ۲۰۰۶ء)

(روزنامہ 'دن' (کرنیں) لاہور، ۹؍ دسمبر ۲۰۰۶ء)

• آفتاب کاوش — شبیہ الحسن کی 'مختصر مرثیے کی روایت اور سید وحید الحسن'

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۷ نومبر ۲۰۰۵ء)

(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶؍ فروری ۲۰۰۶ء)

• نعیم فاطمہ علوی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے بارے میں

(ماہنامہ 'نیرنگِ خیال' راولپنڈی)

• آفتاب کاوش — شبیہ الحسن کی تخلیق 'سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں'

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۵؍ جنوری ۲۰۰۶ء)

• سعدیہ انور — آغا صاحب۔ ایک مطالعہ

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور)

• ڈاکٹر انور سدید — شبیہ الحسن کا مجموعۂ مقالات 'تصریحات'

(روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، ۲۶ جون ۲۰۰۵ء)

• پروفیسر آصف وٹو — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر

(ماہنامہ 'سپوتنک' لاہور، نومبر ۲۰۰۶ء)

• پروفیسر رابعہ سرفراز — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تصریحات

(مشمولہ 'توضیحی مطالعات' قرطاس فیصل آباد ۲۰۰۶ء)

• ڈاکٹر قاسم جلال — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی مضمون نگاری

(روزنامہ 'مساوات' لاہور)

(روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۳؍ دسمبر ۲۰۰۶ء)

• ڈاکٹر غلام یٰسین — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن بطور مدیر 'شام و سحر'

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جون ۲۰۰۷ء)

• ڈاکٹر انور سدید — جدید مرثیہ، قیصر بارہوی اور ڈاکٹر شبیہ الحسن

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء)

• ڈاکٹر نواز حسن زیدی — شبیہ شناسی کے لیے حرفِ آغاز

(روزنامہ 'کلیم' سکھر، ۳ جون ۲۰۰۷ء)

• ڈاکٹر آغا سہیل — ایک نظریہ ساز نقاد۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۳؍فروری ۲۰۰۷ء)

(روزنامہ 'کلیم' سکھر، ۲۹ جولائی ۲۰۰۷ء)

(پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، فروری ۲۰۰۷ء)

- خالد اقبال یاسر — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن: ایک سلجھا ہوا نقاد

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۸ فروری ۲۰۰۷ء)

- سید تحسین گیلانی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی مزاج

(ماہنامہ 'پارسا' بورے والا، جون ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر طارق عزیز — سنو میرے بندھورے

(پندرہ روزہ 'سائبان' لاہور، ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء)

- پروفیسر حسن عسکری کاظمی — آلِ رضا سے آلِ وفا تک......
ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تحقیق اور تنقید

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۶ جنوری ۲۰۰۷ء)

- ناصر زیدی — موازنۂ انیس و دبیر اور ڈاکٹر سلیم اختر

(روزنامہ 'پاکستان' لاہور، ۱۲ فروری ۲۰۰۷ء)

- پروفیسر وحید عزیز — قیصر شناسی کی کلیدِ اوّل

(روزنامہ 'اوصاف' لاہور، ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر انور سدید — قیصر بارہوی کے مرثیے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن کا کارنامہ

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر سلیم اختر — ادبی بیٹھک میں

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور، ۹؍فروری ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر اجمل نیازی — سمندر کی طرح کشادہ۔ شبیہ الحسن

(روزنامہ 'شیشہ' لاہور، ۸؍دسمبر ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر انور سدید — ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ادبی بیٹھک

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر حسن عسکری کاظمی — ادبی بیٹھک کی رنگا رنگیاں

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

(سہ ماہی 'تجدیدِ نو' لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر عبدالکریم خالد — خونِ جگر کی روشنی

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر نفیس اقبال — اَدبی بیٹھک کا نقاد

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۳ / مئی ۲۰۰۸ء)

- خورشید بیگ میلسوی — اَدبی بیٹھک کمالِ حسنِ نظر

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر جمیل احمد عدیل — ڈاکٹر شبیہ الحسن ۔ ایک متوازن نقاد

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر ثمر حسین نقوی — 'اَدبی بیٹھک' کے اَدبی مسائل

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

(سہ ماہی 'صحیفہ' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

- پروفیسر وحید عزیز — 'اَدبی بیٹھک' کے میرِ مجلس

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر شفیق الرحمٰن الہ آبادی — 'اَدبی بیٹھک' چند معروضات

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

- شفیع عقیل — 'اَدبی بیٹھک' (تبصرہ)

(روزنامہ 'جنگ' کراچی، سنڈے میگزین، ۵ / اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر سجاد جعفری — تہذیب، روایت اور اَدبی بیٹھک

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء)

- خورشید بیگ میلسوی — ترغیبات ۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا ایک اور اَدبی کارنامہ

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر حسن عسکری کاظمی — 'ترغیبات' میں 'ترغیبِ مطالعہ'

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- امتیاز حسین — تخلیق کاروں کے لیے 'ترغیبات'

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر سجاد جعفری شخصیت بنی اور ----- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی ’’ترغیبات‘‘

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- خورشید بیگ میلسوی حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور)

- ڈاکٹر سلیم اختر ’ترغیبات‘۔ سچ تو یہ ہے کہ......

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر سید معراج نیر ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ چشمِ معنی آشنا

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر نفیس اقبال ترغیبات۔ تہذیب کی بازیافت

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- خالد اقبال یاسر ’ترغیبات‘۔ ایک منفرد کاوش

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر وحید عزیز چاہت کے لہو سے تخلیق کردہ۔ ’ترغیبات‘

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر فرقان قریشی قوسِ قزح کے رنگوں سے مزین۔ ’ترغیبات‘

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر عذرا شوذب ادبی شعور کی آئینہ دار۔ ترغیبات

(ماہ نامہ ’شام و سحر‘ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- پروفیسر حسن عسکری کاظمی ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور تصریحات
- پروفیسر سیّد ثمر حسین نقوی رثائی ادب اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ادبی خدمات
- پروفیسر حسن عسکری کاظمی ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ محقق اور نقاد

(روز نامہ ’جناح‘ لاہور، ۸/اپریل ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر عبدالکریم خالد قیصر بارہوی کے مرثیے (تبصرہ)

(ماہ نامہ ’صحیفو‘ انٹرنیشنل، لاہور، اپریل ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر عباس رضا قیصر بارہوی کے ترمین مرثیوں کی تدوین

(ماہ نامہ ’ماہِ نو‘ لاہور، دسمبر ۲۰۰۷ء)

- شفیق الرحمٰن الہ آبادی شبیہ الحسن کی شخصیت و فن کا منظوم اعتراف

- ڈاکٹر ضیا الحسن — اُردو مرثیہ کے ایک اہم نقاد
- پروفیسر کلثوم طارق برنی — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن بطور محقق
- پروفیسر حسین سحر — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا تحقیقی و تنقیدی سفر
- محمد اصغر انیس — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی رثائی خدمات
- محمد شفیع بلوچ — رثائی اَدب کا ابنِ خلدون۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن
- ڈاکٹر سیّد زوار حسین شاہ — ڈاکٹر شبیہ الحسن بطور محقق و نقاد
- ڈاکٹر طاہر تونسوی — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کا جہانِ فن

(پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر عباس رضا — شام و سحر ایک تحریک۔ایک دبستان
- تاج سعید — ماہ نامہ 'شام و سحر' کی اکیسویں سالگرہ
- ڈاکٹر عارف ثاقب — 'شام و سحر' کارکردگی کے آئینے میں
- کرامت بخاری — شبیہ الحسن کے تخلیقی کارنامے
- شوکت زریں چغتائی — ڈاکٹر شبیہ الحسن اور ماہ نامہ 'شام و سحر'......فنی اور تنقیدی جائزہ
- مشتاق احمد — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی ہمہ جہت شخصیت
- حماد الرحمٰن میر — اَدب کا تابندہ چراغ۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن
- ڈاکٹر سلیم اختر — صراطِ مستقیم پر چلنے والا
- ڈاکٹر اجمل نیازی — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تخلیق کاری
- ڈاکٹر عبدالکریم خالد — شبیہ الحسن کی شبیہ
- جاوید صدیق بھٹی — مردہ پرستوں میں روشنی کی لکیر
- ڈاکٹر جواز جعفری — نظر انداز کیے گئے ادیبوں کا نقاد
- پروفیسر آصف وٹو — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی تحقیقی اور تنقیدی کاوش......

  جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ
- پروفیسر وحید عزیز — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی جوہر شناسی
- ڈاکٹر انور سدید — جدید غزل اور اسلم کولسری
- محمد شفیع بلوچ — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔اُردو کا ایک کثیر الجہات محقق و نقاد
- مظہر نیازی — آیاتِ آمنہ......ایک مطالعہ

• پروفیسر صفدر نعیم	ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور ڈاکٹر آغا سہیل
• ڈاکٹر سلیم اختر	سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کا مجموعہ
• ڈاکٹر معراج نیّر	سوچ کی چتاؤں کا شاعر، سیف زلفی اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن
• پروفیسر ظفر الحق چشتی	جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی
• پروفیسر سیّد ندیم جعفر	جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی
• محمد ہارون عثمانی	جدید لہجے کا شاعر: سیف زلفی (شخصیت و فن)
• سرفراز سیّد	''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی''......
• اظہر غوری	بڑے شاعر کے بارے میں بڑی کتاب
	جدید لہجے کا شاعر: سیف زلفی
• رابعہ عرفان	سیّد شبیہ الحسن کی گراں قدر تخلیق۔ قیصرِ اقلیمِ مرثیہ
• پروفیسر انیقہ سلیم	ایک مرثیہ گو کا نثری مرثیہ
• ڈاکٹر عبدالکریم خالد	قیصر بارہوی کے مرثیے۔ تدوینی تحقیق کی نادر مثال
• ڈاکٹر نواز حسن زیدی	ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی اَدبی شبیہ
• سیّد اختر ہاشمی	مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی
• علی حسین جاوید	رثائی اَدب میں اَرفع تحقیق
• عابد منہاس	مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی
• ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی	جدید مختصر مرثیہ اور وحیدِ مودّت
• فرح ناز	باقیاتِ آلِ رضا
• شہزاد احمد	ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن اور سیف زلفی کے مراثی
• سیّد وحید الحسن ہاشمی	سیف زلفی کے مرثیے اور شبیہ الحسن کا اختصاص
• حسن عسکری کاظمی	سیف زلفی۔ روشنیِ فکر کا استعارہ
• ڈاکٹر اجمل نیازی	سیف زلفی کے مرثیوں کی دستک
• پروفیسر محمد رضا زیدی	سیف زلفی کے مرثیے۔ شبیہ الحسن کی محنتوں کا ثمر
• حسن عسکری کاظمی	''طاہرین'' پر ایک طائرانہ نظر
• پروفیسر سیف اللہ خالد	صد جلوہ رو برو ہے
• رفعت مالک	''طاہرین'' کا تنقیدی مطالعہ

- ڈاکٹر سید قاسم جلال — ''طاہرین'' تعارف و تجزیہ
- شفیق الرحمٰن الہ آبادی — ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کار مسیحائی۔ کلیاتِ حبیب کی تدوین

(پندرہ روزہ 'حقیقت' بہاول پور، فروری ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تدوین کا مظہر 'کلیاتِ حبیب''
- پروفیسر آفاق صدیقی — کلیاتِ حبیب پر ایک نظر
- پروفیسر ذوالفقار حسنین — کلیاتِ حبیب (ایک تحقیقی اور تنقیدی دستاویز)
- کلیاتِ حبیب۔ ایک جائزہ — ڈاکٹر سید نواز حسن زیدی
- پروفیسر حسن عسکری کاظمی — سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں
- روبینہ شاہین — سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں پر ایک تنقیدی نظر
- ڈاکٹر محمد ہارون قادر — ڈاکٹر شبیہ الحسن اور سید وحید الحسن کی شعری جہتیں
- محمد فیروز شاہ — سید وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں
- مختار علی نیّر — وحید الحسن ہاشمی۔ نعت منقبت اور سلام
- پروفیسر وحید عزیز — کارنامہ خاص ''تصریحات''...... ڈاکٹر سید شبیہ الحسن
- پروفیسر صدیق اظہر — عہد جدید کا منفرد کالم نگار۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن
- شفیق الرحمٰن الہ آبادی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن۔ ایک معتبر کالم نگار

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، نومبر ۲۰۰۷ء)

(سہ ماہی 'الزبیر' بہاول پور، شمارہ نمبر ۴، ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر افتخار احمد بیگ — شام و سحر کی باتیں اور ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (غیر مطبوعہ)
- پروفیسر حماد میر — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی کتاب 'تصریحات'

(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

- پروفیسر آصف وٹو — ناخدائے ادب۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (غیر مطبوعہ)
- ڈاکٹر معراج نیّر — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی مضمون نویسی کی متنوع جہتیں (غیر مطبوعہ)
- نعیم فاطمہ علوی — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی ''تصریحات'' (غیر مطبوعہ)
- پروفیسر حماد الرحمٰن میر — تحسین و اعتراف۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (غیر مطبوعہ)
- ڈاکٹر انور سدید — حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں (تبصرہ)

(روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، ۲۹ رجون ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر شبیر احمد قادری — ڈاکٹر شبیہ الحسن۔ عرصۂ نقد و نظر کا شہسوار
(روزنامہ 'دن' (کرنیں) لاہور)
- ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن۔ ایک شخصیت ایک تحریر
(پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶؍ مارچ ۲۰۰۸ء)
- نعیم فاطمہ علوی — اُدبی بیٹھک۔ ایک مطالعہ
(سہ ماہی 'الاقربا' اسلام آباد، جنوری۔ مارچ ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر انور سدید — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی علمی واَدبی خدمات
(روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، یکم فروری ۲۰۰۸ء)
(ماہنامہ 'فنون' اورنگ آباد، انڈیا، ستمبر ۲۰۰۷ء)
- ڈاکٹر انور سدید — شیفتگی پیدا کرنے والا نقاد۔ ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر سلیم اختر — 'ترغیبات' سچ تو یہ ہے
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر معراج نیر — ڈاکٹر شبیہ الحسن چشمِ معنی آشنا
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- پروفیسر حسن عسکری کاظمی — 'ترغیبات' میں ترغیبِ مطالعہ
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- خالد اقبال یاسر — 'ترغیبات' ایک منفرد کاوش
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر عبدالکریم خالد — ڈاکٹر شبیہ الحسن کی تنقید اور نفسیاتی حربے
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر نفیس اقبال — 'ترغیبات' تہذیب کی بازیافت
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر خورشید بیگ میلسوی — 'ترغیبات' ڈاکٹر شبیہ الحسن کا ایک اور اَدبی کارنامہ
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر نواز حسن زیدی — ڈاکٹر شبیہ الحسن کی 'ترغیبات' پر ایک نظر
(ماہنامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)

- محمد شفیع بلوچ　　آئینہ ترغیبات
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر عذرا شوذب　ادبی شعور کی آئینہ دار ترغیبات
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- پروفیسر امتیاز حسین　تخلیق کاروں کے لیے 'ترغیبات'
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- علی حسین جاوید　　ادبی مجلس کا امام
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- پروفیسر وحید عزیز　　چاہت کے لہو سے تخلیق کردہ 'ترغیبات'
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- شفیق الرحمٰن الہ آبادی　　'ترغیبات' کا عمرانی مطالعہ
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- پروفیسر فرقان قریشی　　قوس قزح کے رنگوں سے مزین 'ترغیبات'
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- پروفیسر پریا تابیتا　　ایک اعلیٰ ظرف نقاد۔ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- پروفیسر سجاد جعفری　شخصیت بینی اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی 'ترغیبات'
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- آفتاب احمد ملک　　دبستانِ پاکستان کی حیرت انگیز شخصیت
(ہفت روزہ 'آن لائن' چکوال، ۱۶/ اکتوبر ۲۰۰۸ء)
- ڈاکٹر سلیم اختر　　ایک بھلا مانس کالم نگار
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)
- ڈاکٹر نفیس اقبال　　ادبی چوپال۔تہذیبی رویوں کی عکاس
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)
- خورشید بیگ میلسوی　　ارمغانِ عہد۔ادبی چوپال
(ماہ نامہ 'شام و سحر' لاہور (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)
- محمد اعجاز خاور　　ادبیانہ نگارش پر ڈاکٹر شبیہ کا ملکہ

(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۹ء)

- شاکر کنڈان — نام میں کچھ رکھا ہے
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)

- ڈاکٹر مزمل حسین — اَدبی چوپال میں سماجی رویوں کا اظہار
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)

- شفیق الرحمٰن الہ آبادی — اَدبی چوپال کی تمہیدات
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)

- پروفیسر وحید عزیز — سخت گرمی میں فرحت کا احساس۔اَدبی چوپال
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)

- آفتاب خان — اَدبی چوپال۔ایک دلچسپ تصنیف
(ماہنامہ 'شام وسحر' لاہور، (کتاب کلچر نمبر) اکتوبر ۲۰۰۹ء)

- ڈاکٹر سید قاسم جلال — اَدبی چوپال
(ماہنامہ 'مساوات' لاہور، یکم ستمبر ۲۰۰۹ء)

- محمد اعجاز خاور — اُردو اَدب کے سفیر
(روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۰ر فروری ۲۰۱۰ء)

- جمشید اقبال — شہری اور مضافاتی اَدب
(روزنامہ 'پاکستان' ملتان، ۲۴ر فروری ۲۰۱۰ء)

- ڈاکٹر وقار رضوی — اَدبی چوپال۔ایک جائزہ
(ہفت روزہ 'ذوالفقار' پشاور، یکم اپریل ۲۰۱۰ء)

- پروفیسر جمیل احمد عدیل — ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا ایک علمی کارنامہ
(روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۵ر مئی ۲۰۱۰ء)

- ڈاکٹر گل عباس اعوان — مضافاتی اَدب۔چند تجزیاتی زاویے
(روزنامہ 'خبریں' ملتان، ۱۷ر جولائی ۲۰۱۰ء)

- ڈاکٹر انور سدید — مضافاتی شعر و اَدب
(ماہنامہ 'تخلیق' لاہور، فروری ۲۰۱۰ء)

❖ قدر افزائی (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی تصنیفات و تالیفات پر لکھے گئے فلیپ)

- آیاتِ آمنہ — ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی...... ڈاکٹر میمونہ انصاری، پروفیسر سجاد حارث
- بیسویں صدی کا شعری اَدب — ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا...... ڈاکٹر آغا سہیل
- آلِ رضا کا فن غزل گوئی — ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر جمیل جالبی...... پروفیسر ممتاز حسین
- العطش (جلد اول) — ڈاکٹر وحید قریشی، احمد ندیم قاسمی
- مفاہیم — ڈاکٹر سہیل احمد خان، ظہیر کاشمیری...... پروفیسر عتیق احمد
- شام وسحر کی باتیں — پروفیسر رضی عابدی
- کلیاتِ حبیب — ڈاکٹر عبادت بریلوی
- ترجیحات — ڈاکٹر سہیل احمد خان
- آغا صاحب — احمد ندیم قاسمی
- معتبر مرثیے — ڈاکٹر مظفر عباس
- العطش (جلد سوم) — احمد عقیل روبی
- باقیاتِ آلِ رضا — ڈاکٹر وحید قریشی
- اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار — شہزاد احمد
- مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی — ڈاکٹر سلیم اختر
- تصریحات — ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں — ڈاکٹر سہیل احمد خان
- العطش (کلیات) — ڈاکٹر وحید قریشی، احمد ندیم قاسمی
- جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ — ڈاکٹر وزیر آغا
- طاہرین — ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی
- سیف زلفی کے مرثیے — ڈاکٹر آغا سہیل
- قیصرِ اقلیمِ مرثیہ — انتظار حسین
- قیصر بارہوی کے مرثیے — ڈاکٹر وحید قریشی
- اُدبی بیٹھک — ڈاکٹر انور سدید
- حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں — ڈاکٹر وحید قریشی
- ترغیبات

❖ کالم (ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کی شخصیت اور فن کے حوالے سے)

- شارجہ میں ایک اَدبی شام

(نجم الحسن رضوی (شارجہ) روزنامہ 'اساس' ۳ نومبر ۲۰۰۳ء)

- عالمی مجلسِ اَدب اور مرزا دبیر

(مختار علی نیر، روزنامہ 'صبح' پشاور، ۷ مئی ۲۰۰۵ء)

- ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا کارنامۂ خاص۔ تصریحات

(وحید عزیز، روزنامہ 'مساوات' لاہور ۴؍فروری ۲۰۰۶ء)

- عصرِ حاضر کا شہزادۂ اَدب

(وحید عزیز، روزنامہ سعادت' لاہور ۱۶ فروری ۲۰۰۶ء)

(وحید عزیز، ہفت روزہ 'ذوالفقار' پشاور، یکم ستمبر ۲۰۰۶ء)

- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں

(پروفیسر حسن عسکری کاظمی، روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۸ جنوری ۲۰۰۶ء)

- حق بہ حق دار رسید

(جاوید صدیق بھٹی، روزنامہ 'صحافت' لاہور، ۲۳ نومبر ۲۰۰۴ء)

- اسلم کولسری کی شاعری اور......ڈاکٹر شبیہ الحسن کی جوہر شناسی

(وحید عزیز، روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۲۳؍اپریل ۲۰۰۶ء)

(ہفت روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۲۰۰۶ء)

- جن کا سخن ہے فکر و عمل کے لیے مہمیز

(عاطف خالد بٹ، روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۵؍اپریل ۲۰۰۵ء)

- میں کائنات کے پیکر میں ہوں رگوں کی طرح

(پروفیسر وحید عزیز، روزنامہ 'جرات' لاہور، ۱۱؍دسمبر ۲۰۰۶ء)

(پروفیسر وحید عزیز، روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۳؍دسمبر ۲۰۰۶ء)

- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی و اَدبی فتوحات

(جمیل احمد عدیل، روزنامہ 'دن' لاہور، ۹ ستمبر ۲۰۰۵ء)

- اَدب کی شمع جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

(وحید عزیز، ہفت روزہ 'ارباب جہاں' لاہور، ۲۸ جولائی ۲۰۰۶ء)

- اَدب کا رہبر و رہنما۔ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

(وحید عزیز، روزنامہ 'سعادت' لاہور، ۴ جولائی ۲۰۰۶ء)

- سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں

(محمد فیروز شاہ، روزنامہ 'پاکستان' لاہور، ۱۹ر جنوری ۲۰۰۶ء)

- اُردو اَدب کا عظیم تنقید نگار

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'صحافت' لاہور، ۶۔ فروری ۲۰۰۷ء)

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'مساوات' لاہور، ۳۔ فروری ۲۰۰۷ء)

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'اوصاف' لاہور، ۱۶ فروری ۲۰۰۷ء)

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، ماہنامہ 'احوال' لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر شبیہ الحسن دی علمی تے اَدبی سیوا (پنجابی)

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'بھلیکھا' لاہور، ۳ فروری ۲۰۰۷ء)

- آسمانِ اَدب کا درخشندہ ستارہ

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'جناح' لاہور، ۲۹ جنوری ۲۰۰۷ء)

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'خبریں' لاہور، ۱۲ جنوری ۲۰۰۷ء)

- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی علمی و اَدبی خدمات

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۹ جنوری ۲۰۰۷ء)

- قیصر شناسی کی کلیدِ اوّل

(پروفیسر وحید عزیز، روزنامہ 'اوصاف' لاہور، ۱۹ر فروری ۲۰۰۷)

- کچھ باتیں ڈاکٹر شبیہ الحسن کے بارے میں

(ندیم صدیق بھٹی، روزنامہ 'اوصاف' لاہور، ۷ر مارچ ۲۰۰۷ء)

- اَدبی کالم نگاری اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

(پروفیسر وحید عزیز، ہفت روزہ 'سردار میلسی'، ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء)

(پروفیسر وحید عزیز، پندرہ روزہ 'ذوالفقار' پشاور، ۱۶ر مئی ۲۰۰۸ء)

(پروفیسر وحید عزیز، روزنامہ 'سنگ باری' بہاول پور، ۱۲ر ستمبر ۲۰۰۸)

- ڈاکٹر شبیہ الحسن اور تصریحات

(پروفیسر حسن عسکری کاظمی، روزنامہ 'دن' لاہور، ۳۰ر نومبر ۲۰۰۷ء)

- عصرِ حاضر کا عظیم تنقید نگار

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'پاکستان' لاہور، ۱۵ جنوری ۲۰۰۷ء)

- اُردو اَدب کا معمار

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'انصاف' لاہور، ۱۴ جنوری ۲۰۰۷ء)

- عصرِ حاضر کا عظیم معمار

(ڈاکٹر ندیم گیلانی، روزنامہ 'جرأت' لاہور، ۲۹ جنوری ۲۰۰۷ء)

- معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

(پروفیسر حسن عسکری، روزنامہ 'آجکل' لاہور، ۲۷ جون ۲۰۰۸ء)

- ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا ایک علمی کارنامہ

(پروفیسر جمیل احمد عدیل، روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۵ر مئی ۲۰۱۰ء)

- ادیبانہ نگارش پر ڈاکٹر شبیہ کا ملکہ

(محمد اعجاز خاور، روزنامہ 'دن' لاہور، ۱۸ر ستمبر ۲۰۰۹ء)

- اُردو اَدب کے سفیر

(محمد اعجاز خاور، روزنامہ 'دن' لاہور، ۲۰ر فروری ۲۰۱۰ء)

❖ انٹرویو

- عمران نقوی
  (روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، ۲۰ مئی ۲۰۰۵ء)
  (ماہنامہ 'پیام عمل' لاہور، جولائی ۲۰۰۵ء)
  (مشمولہ۔ شرف ملاقات۔ عمران نقوی
  لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء)
  (روزنامہ 'پاکستان' لاہور، ۲۲ر جنوری ۲۰۱۰ء)
- اختر سعیدی
  (روزنامہ 'جنگ' لندن، ۱۹ر جنوری ۲۰۰۶ء)
  (روزنامہ 'جنگ' کراچی، ۱۱ر جنوری ۲۰۰۶ء)
  (روزنامہ 'جنگ' مڈ ویک میگزین، کراچی، ۱۰ تا ۱۶ ستمبر ۲۰۰۸ء)
- رشید چودھری
  (روزنامہ 'اساس' لاہور، ۲۱ر اگست ۲۰۰۵ء)
- صلاح الدین اولکھ
  (روزنامہ 'اساس' لاہور، ۹۔ دسمبر ۲۰۰۵ء)
- اختر سعیدی
  (روزنامہ 'جنگ' کراچی، ۱۱ر جنوری ۲۰۰۶ء)
- شیخ سلیم احسن
  (پندرہ روزہ 'نئی آوازیں' لاہور، یکم اکتوبر ۲۰۰۵ء)
- سیف الرحمٰن خان
  (روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۲۳ جولائی ۲۰۰۷ء)
- رؤف ظفر
  (روزنامہ 'جنگ' لاہور، یکم فروری ۲۰۰۸ء)

- طارق اسماعیل ساگر (روزنامہ 'نوائے وقت' لاہور، ۲۴ر مئی ۲۰۰۷ء)
- آفتاب کاوش (روزنامہ 'الجریدہ' لاہور، ۱۵ر اپریل ۲۰۰۸ء)
- نعیم سلہری (روزنامہ 'جناح' لاہور، ۲۶ر اگست ۲۰۰۸ء)
- شفیق الرحمن الہ آبادی (سہ ماہی 'میانوالی' مئی تا جولائی ۲۰۱۰ء)
- شاہدہ لطیف (ماہنامہ ......، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء)

◆◆◆

محیط اسماعیل

''شبیہ شناسی''

[محیطیہ املا]

[حُسنِ فرہنگ بھی حُسنِ آہنگ بھی :: حسنِ ترکیب وہ، قافیہ تنگ بھی]

شبیہ کا معنا/معانی آپ سب جانتے ھیں! ناچیز اس کے مرادفات مں 'جھلک' پر اصرار کرتا ھے کہ شبیہ صاحب کی ایک عدد جھلک ھی تو نصیب ھوی تھی! ھمیں بھی اور دُنیا کو بھی!

جس طرح قدرت: بارش آثار موسم مں چمک دکھاتی اور اپنا آپ جتاتی ھے بہ عینہٖ ایک جھلک مں ھم جان گیے تھے کہ ایک مخلصِ ادب سے ملاقات ھوی! جنابِ انجم رضوی کے ھم ممنون ھیں: اپنی دُکانِ کُتب اِظہار سنز پر اپنے جگری دوست/بچپن کے ساتھی/یارِ غار: شبیہ الحسن صاحب سے ایک پَل مں ھمارا تعارفی پُل عبور کرایا تھا — مذکورہ جھلک دُبارا ھمارے حصے مں نہ آی — اب جس قدر اظہارِ تاسُّف کریں کم ھے — تاھم اِظہار سنز کی طرف سے شبیہ صاحب کی ''کتاب پر کتاب'' جلوا دِکھاتی رھی، پھر اِدھر اُدھر سے ذکرِ خیر بھی سُن لیتے اور بس — تو پھر کیا تُک ھے کہ ھم شبیہ صاحب پر کچھ خامہ فرسای کا سوچیں بھی؟ بعد از شہادت اتنا کچھ لکھا گیا کہ دو چار چیزیں سامنے رکھ لیں تو اپنے ''نام کا'' مضمون طیار! خیر ھمیں انگلی کٹوا کے شھیدوں مں نام نھی کرنا — باعثِ تحریر محض یِہ ھوا کہ ھم انجم صاحب سے عنواں پسندی کا اظہار کر بیٹھے کہ جناب ''شبیہ شناسی'' نہایت عمدہ و موزوں تریں نام ھے سبحان اللہ/ ماشاءاللہ!

ایک سے زیادہ ملاقات مں ''عنواں پسندی'' کا اِعادہ جو کیا تو انجم صاحب تایید و اتفاق کرتے ھوے بولے: چلیے عنوان ھی پر سھی کچھ لکھ دیجیے! بل کہ کل ھی لے آیے کہ مرحلۂ اِشاعت قریب ھے —

جس طرح نام کا اثر شخصیت پر مرتب ھوتا/ بتایا جاتا ھے، کتاب کا عنواں بھی کچھ کم اہمیت نھی رکھتا — مختلف اِداروں سے سال بھر مں اُردو کی سیکڑوں کُتب شایع ھوتی ھیں لیکن کسی کتاب کا عنوان پچاس وں مں سے خال خال معقول و موزوں یا مناسبت رکھتا ھوا سامنے آتا ھے — زیرِ نظر کتاب کی اِشاعت سے بُہت پہلے ''شبیہ شناسی'' مسوّدے پر لکھا ھوا دیکھا تو از حد پیارا اور موزوں تریں معلوم ھوا' معاً ہ دِل سے سبحان اللہ! کہا — جس نے بھی یِہ نام تجویز کیا قابلِ تعریف بل کہ چودھری رحمت علی کا بھای ھے جنھوں نے اِسلامی نیی ریاست کا نامِ نامی پاکستاں رکھا اور کروروں مں ایک شخص نہ ملا جس نے نام پسند نہ کیا ھو! بہ عینہٖ ''شبیہ شناسی'' بہ طورِ عنوان ہمیشہ ھی پسندِ خاطر رھے گا اور بھی کا حُسنِ سماعت قبول کرتا جاے گا: صوتی لحاظ سے بھی/ معنوی اعتبار سے بھی/ صاحبِ موضوع کی مناسبت سے بھی/ خاکی و رُوحانی تعلّق سے بھی! عربی فارسی تراکیب مں ایک خوب صورت اِضافہ/ ''شبیہ شناسی'' یعنی صورت کو پہچاننے کا عمل'' [اور صورت بھی کون سی! من موھنی]

اِس درجہ شیریں آہنگ، پیارا دُلارا روشن ستارا نام ہر کتاب کو کھاں نصیب!!!

[یِہ خوب صورت ترکیب اگر چہ کسی لُغت مں نھی، لیکن ھم اپنی زیرِ تالیف جامع ''محیط اللغات'' مں اسے شامل کریں گے: ان شاءاللہ!]

فقط ''شبیہ شناسی'' کا مدّح ایک جہاں	شھید ھی کے ھے شایاں' کتاب کا عنواں

اشاریہ

مرتبین : شہربانو، رضوانہ ذوالفقار، عالیہ اسمٰعیل، علیم دانش، احمد وقاص انجم، حافظ شاہد رضوان

﴿آ﴾

آتش ۶۹، ۱۵۹
آتش رومانی ۶۳۰
آثم فردوسی ۱۱۰
آدم ۱۰۹
آرزو لکھنوی ۲۱، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۳۱، ۳۵، ۴۱، ۴۲، ۴۹، ۵۹،
۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۷۱، ۱۰۱، ۱۰۶، ۱۶۵، ۱۹۱، ۱۹۲،
۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۱۸، ۲۲۶،
۲۷۴، ۳۵۰، ۳۹۶، ۴۰۰
آرسطو ۶۱۲
آزاد، محمد حسین ۷۳۸، ۸۴۳، ۸۶۰
آسیہ ۷۴، ۳۱۲، ۳۱۳
آصف وٹو ۱۳۹، ۴۳۵، ۴۵۱، ۵۴۲، ۵۶۷، ۵۶۹، ۵۷۰،
۵۷۱، ۵۷۲، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۲، ۶۰۳،
۶۰۴، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۱، ۶۱۳، ۶۱۴،
۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲،
۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱،
۶۳۳، ۶۳۷، ۶۷۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۶۲، ۸۶۸،
۸۷۲، ۸۷۴
آغا سلمان ۱۷۲، ۸۰۳، ۸۰۴
آغا سہیل ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲،
۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵،
۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۱۶،
۱۱۹، ۱۳۰، ۱۷۲، ۱۸۳، ۱۸۸، ۲۱۶، ۲۳۶، ۲۴۳،
۲۵۴، ۲۹۵، ۳۱۵، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۷،
۳۹۸، ۳۹۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۹، ۴۲۱،
۴۲۴، ۴۲۸، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۴۳،
۴۴۴، ۴۴۶، ۴۷۱، ۴۷۳، ۴۸۰، ۴۸۹، ۴۹۰،
۵۰۵، ۵۱۸، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۳۶، ۵۴۷، ۵۴۳،
۵۵۶، ۵۵۸، ۵۸۰، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۹۴، ۵۹۵،
۶۰۳، ۶۰۷، ۶۱۰، ۶۱۷، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۶،
۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۹، ۶۶۶،
۶۶۷، ۶۶۹، ۶۷۱، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۹۲، ۶۹۷،
۶۹۹، ۷۱۲، ۷۲۹، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۹۵، ۷۹۶،
۸۰۱، ۸۱۰، ۸۳۰، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۹، ۸۵۶،
۸۶۰، ۸۶۶، ۸۶۳، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۷۳، ۸۷۸
آفاق صدیقی ۸۷۳، ۱۹۸
آفتاب احمد ملک ۳۹۸، ۶۲۲، ۸۷۶، ۸۷۷
آفتاب کاوش ۴۲۰، ۴۲۵، ۴۳۱، ۴۳۶، ۵۳۸، ۵۳۹،
۵۵۷، ۶۱۷، ۶۶۷، ۶۸۳، ۸۴۷، ۸۶۰، ۸۶۲،
۸۶۸، ۸۸۲
آل رضا ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱،
۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۵،
۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵،
۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵،
۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۹۰، ۱۰۲، ۱۰۶،
۱۰۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸،
۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶،
۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴،
۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۸۸، ۲۰۹، ۲۱۴، ۲۲۳، ۲۲۵،

۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۵، ۲۶۲،
۲۷۱، ۲۷۷، ۲۹۸، ۳۰۳، ۳۰۵، ۳۱۷، ۳۲۱،
۳۴۴، ۳۴۷، ۳۵۰، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۴۰۰،
۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۵، ۴۲۸، ۴۳۰، ۴۳۳، ۴۴۴،
۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۷، ۴۷۸،
۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۸، ۵۱۶، ۵۳۲، ۵۴۳، ۵۴۵،
۵۵۱، ۵۵۸، ۵۶۸، ۵۸۰، ۵۸۲، ۵۹۴، ۶۰۱،
۶۰۳، ۶۱۰، ۶۱۳، ۶۳۹، ۶۵۸، ۶۶۵، ۶۶۶،
۶۶۷، ۶۶۹، ۶۷۵، ۶۷۷، ۶۸۲، ۶۸۷، ۶۹۰،
۶۹۳، ۶۹۵، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴،
۷۰۵، ۷۰۶، ۷۱۲، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۵، ۷۲۶،
۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۲، ۷۴۴، ۷۵۳، ۷۵۷، ۷۶۳،
۷۸۹، ۷۹۵، ۷۹۹، ۸۰۱، ۸۳۰، ۸۴۴، ۸۴۵،
۸۵۷، ۸۶۳، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۹، ۸۷۳، ۸۷۸

آمنہ، حضرت ۷۳، ۷۴، ۲۵۹، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۷، ۳۰۲،
۶۱۰، ۶۶۵، ۶۷۵، ۶۸۷، ۷۳۲، ۷۹۵

آنسہ ۸۶۴

آئی۔اے۔رچرڈز ۷۱۲

﴿ا﴾

ابرار حامد ۵۱۱

ابلیس ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۱۴

ابن معاویہ ۳۱۴

ابن سعد ۳۱۲، ۳۱۴

ابن مظاہر ۳۱۲

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ۱۱۶، ۱۳۰

ابوالقاسم خوئی ۲۳۸

ابوالکلام آزاد ۷۱۳

ابوذر ۲۷۲، ۲۷۳

ابوجہل ۳۱۰، ۳۱۴

ابوطالب ۲۵۹، ۲۶۰

ابوطالب لکھنوی ۷۸۵

ابوطالب نقوی ۷۸۵

اثر ترابی ۲۷۱، ۵۱۹، ۸۳۱

اثر لکھنوی ۱۹۱

اثنا حسن (بیٹی) ۱۰۲، ۸۳۶

اجمل نیازی، ڈاکٹر ۸۰، ۸۸، ۹۲، ۹۳، ۱۰۰، ۱۰۵، ۱۰۷،
۱۸۳، ۲۳۶، ۲۵۴، ۲۶۷، ۲۹۵، ۳۰۶، ۳۵۲،
۳۶۷، ۳۸۴، ۵۳۶، ۶۷۱، ۸۰۱، ۸۱۹، ۸۲۶،
۸۴۴، ۸۶۹، ۸۷۲، ۸۷۳

احتشام حسین ۷۷، ۲۳۴، ۶۵۸، ۷۸۹

احتشام سہیل ۹۸

احمد ۲۸۶، ۷۷۸، ۸۳۵

احمد انجم ۸۱۹

احمد جمال پاشا ۷۸، ۸۸، ۹۲

احمد سعید ۸۱۹، ۸۶۶

احمد شہزاد ۸۵۹، ۸۶۲

احمد عقیل روبی ۸۰، ۸۸، ۹۲، ۹۳، ۲۳۶، ۴۵۶، ۵۵۱،
۸۲۶، ۸۷۸

احمد فراز ۵۸۴، ۵۹۶، ۶۵۷، ۸۲۵، ۸۵۶

احمد ندیم قاسمی ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۲، ۹۳،
۹۶، ۱۰۷، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۷، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶،
۲۳۵، ۲۴۵، ۲۵۴، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۹۴، ۳۱۵، ۳۲۰،
۳۴۴، ۳۴۷، ۳۵۸، ۴۷۶

احمد نذیر ۵۱۹

احسان دانش ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۳۵، ۲۳۶، ۸۴۳

احسن عظیم ۴۴۳

اختر حسین رائے پوری ۱۰۵، ۶۵۶

اختر حسین سندھو ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۵، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۳۶،
۵۳۷، ۵۳۹، ۶۶۷، ۸۴۸

اختر حسین شیخ ۱۷۲، ۱۸۳، ۱۸۹

اختر سعیدی ۴۹۳، ۵۸۲، ۸۵۵، ۸۸۱

اختر شیرانی ۱۹۹، ۲۷۴، ۶۸۳

اختر ہاشمی، منقاد حیدر ۱۰۱، ۱۱۹، ۱۵۶،

۴۱۷، ۴۲۰، ۴۳۱، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۴۵،
۵۰۰، ۵۳۶، ۶۶۷، ۶۸۳، ۷۱۶، ۷۳۸، ۷۴۰،
۷۵۲، ۷۶۳، ۸۳۳، ۸۵۰، ۸۶۱، ۸۷۳

ارسطو ۳۰۸

ارشاد احمد حقانی ۵۳۶

اسد اعوان ۸۶۱

اسد جلیلی ۵۱۹

اسد اریب ۲۵۶، ۲۷۹، ۳۲۲، ۵۴۳، ۷۹۷

اسد عباس ۳۳۱، ۵۱۲

اسد علی ۸۶۰

اسرار زیدی ۱۷۲، ۱۸۳

اسلم قریشی ۴۴۳

اسلم کولسری ۱۰۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱،
۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰،
۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸،
۱۳۹، ۳۲۱، ۳۲۷، ۳۲۸، ۴۷۶

اسیر فیض آبادی ۱۵۶، ۵۱۹

اشرف شریف ۵۳۶

اشفاق احمد ورک ۵۰۹

اشفاق حسین ۳۱۲، ۳۱۹، ۳۲۴، ۳۳۴، ۳۳۶، ۵۳۸،
۵۴۰، ۶۶۷، ۶۸۴، ۷۰۰، ۷۹۵، ۸۴۷

اشفاق سرور ۸۴۳

اشفاق نقوی ۲۳۷

اصغرؒ ۱۱۱، ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۷، ۳۰۷،
۳۱۰

اصغر عباس زیدی ۵۱۹

اصغر گونڈوی ۱۹۱، ۲۷۴، ۵۵۶، ۶۸۳

اصغر ندیم سید ۳۱۵، ۵۰۸

اظہر جاوید ۵۱۲

اظہر غوری ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۸۳، ۸۷۳

اعتبار ساجد ۸۰۹

اعجاز ثقلین بخاری ۸۱، ۴۸۸، ۶۱۷، ۸۶۲، ۸۶۶، ۷۸۰

اعظم کمال ۸۵۶

افتخار احمد بیگ ۳۳۴، ۵۱۰، ۶۱۷، ۸۷۴

افتخار احمد صدیقی ۸۴۳

افتخار امام ۷۸۲، ۷۸۶

افتخار عارف ۱۱۶، ۸۴۲

افتخار مجاز ۲۹۶

افسر ساجد ۸۴۸

افسر عباس ۲۷۱

افضل ثاقب ۸۶۵

افضل صفی ۸۶۰

افضل جعفری ۵۲۴، ۵۳۰، ۵۳۶

افلاطون ۳۰۸، ۳۱۵

اقبال ۲۰۱، ۲۰۶، ۲۱۲، ۲۷۴، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۹۴، ۴۰۲،
۴۰۷، ۴۲۷، ۵۱۱، ۵۵۴، ۵۶۰، ۵۸۶، ۵۹۴،
۶۰۷، ۶۴۰، ۶۵۴، ۷۳۸، ۷۹۵، ۷۹۶، ۸۱۷،
۸۳۴، ۸۴۳، ۸۴۹

اقبال احمد خاں ۸۴۳

اقبال رضوی ۸۶۱

اقبال حسین ۲۰۹، ۲۱۵

اقبال حیدر ۸۵۸

اقبال سرہندی ۱۷۸

اقبال کاظمی ۶۴۰

اکبر الٰہ آبادی ۲۹، ۸۱۷

الطاف حسین حالی ۳۴، ۶۰، ۶۱، ۶۹، ۱۱۶، ۱۹۵، ۱۹۷،
۲۰۴، ۲۰۶، ۲۱۰، ۲۹۵، ۳۹۵، ۶۵۶، ۷۱۷، ۷۱۹،
۷۲۰، ۷۳۸، ۷۴۸، ۷۷۵

الویرا یاسمین علی ۸۵۸

امتیاز حسین ۱۵۴، ۵۰۰، ۸۲۶، ۸۷۰، ۸۷۶

امجد اسلام امجد ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۲۰، ۲۳۶

امجد علی شاکر ۵۵، ۴۸۶، ۸۶۳

امداد امام اللہ ۷۴۸

امداد علی آشوب ۵۳۴

امام بخش ناسخ ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۶۹، ۲۷۵، ۴۳۶

امام حسینؓ ۲۸، ۱۵۷، ۹۷، ۲۱۳، ۸۲۹، ۸۴۲

امام زمانہؑ ۱۹۷

امید فاضلی ۵۱۹

امیر علی جون پوری ۴۴۳، ۵۵۷

انتظام علی ۲۳۵، ۶۷۴

انتظار حسین ۲۲۳، ۲۳۶، ۲۶۴، ۴۴۴، ۵۳۶، ۵۴۴، ۵۶۴، ۶۷۱، ۷۷۵، ۸۷۸

انجم چوہدری ۵۱۵

انجم حسن رضوی ۸۶۶

انجم رومانی ۸۶۰

انشا ۵۹، ۶۹

انور سدید، ڈاکٹر ۸۴، ۱۰۷، ۱۱۳، ۲۳۶، ۲۴۱، ۳۲۷، ۳۴۲، ۴۴۴، ۴۷۴، ۵۰۵، ۵۱۲، ۵۱۴، ۵۴۴، ۵۵۶، ۶۰۷، ۶۱۷، ۶۲۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۸۰۱، ۸۳۶، ۸۵۵، ۸۶۴، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۲، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۷، ۸۷۸

انوار ظہوری، علامہ ۳۹، ۴۴، ۲۴۴، ۴۹۴، ۵۵۷، ۸۶۴

انیس ناگی : ۸۵، ۸۹، ۹۴

انیقہ سلیم : ۲۶۵، ۵۵۱، ۵۵۲، ۶۴۸، ۶۳۱، ۸۷۴

اورنگ زیب عالمگیر ۲۶۵

ایاز (محمود) ۳۱۲

ایس۔ اے۔ رحمان ۵۱

ایف آر لیوس ۷۱۲

ایلن ٹیٹ ۷۱۱

ایلیڈ ۴۰۸

ایما حسن (بیٹی) ۱۰۲، ۷۸۳، ۸۳۶

ایم۔ زیڈ کنول ۸۶۴

﴿ب﴾

باقر حسن زیدی ۲۱۵، ۷۵۴

باقر حسین جعفری ۴۹

باقر علی شاہ ۸۴، ۹۳، ۱۰۱، ۲۴۱، ۲۳۶، ۷۶۴، ۸۶۴، ۸۳۶

بانو قدسیہ ۱۱۶، ۱۳۰، ۵۰۶

بتول ۲۳۷، ۲۵۸، ۳۱۲

بریرہؓ ۳۱۲

بشریٰ رحمان ۵۳۶

بشیر حسن ۱۱۹، ۱۹۱، ۲۱۱، ۶۸۰، ۶۸۶

بشیر قادری ۵۱۵، ۷۰۷

بلالؓ ۲۶۰، ۲۶۴، ۲۶۷

بیدار سرمدی ۱۸۳

بیدم ۳۱۴

بے خود موہانی ۱۹۱

﴿پ﴾

پاسترناک ۲۸۲

پرویز الٰہی، چودھری ۵۹۱، ۵۹۳

پرویز یزدی ۲۴۱

پرویز مشرف ۴۶۱، ۵۹۳

پروین بجل ۸۵۵

پریا تابیتا ۸۵۴، ۸۶۱، ۸۷۶

پریم چند ۶۵۶

پریمی ۴۵۶

﴿ت﴾

تابش دہلوی ۲۳۶

تبسم عابدی ۵۳۸، ۵۴۰، ۸۴۸

تاج سعید ۱۴۰، ۵۰۱، ۶۴۴، ۸۶۷، ۸۷۴

تاراچرن رستوگی ۶۲۱

تبسم زہرا ۸۶۴

تبسم کاشمیری، ڈاکٹر ۳۲۱، ۸۴۴

تحسین گیلانی ۷۱۱، ۷۳۱، ۸۶۹

تحسین یزدانی ۷۳۱، ۷۳۸، ۷۷۴، ۸۱۹

تسنیم عثمان سحر ۸۶۱

تقی عابدی ۲۷۹، ۷۸۸، ۷۹۰
تنویر حسین ۸۵۳
تنویر ظہور ۱۸۳
توفیق فاطمہ ۷۵، ۵۷۸
توفیق الرحمان ۸۶۶

﴿ٹ﴾

ٹی۔ایس۔ایلیٹ ۵۱۳، ۷۱۲

﴿ث﴾

ثاقب ۲۱
ثمریاز ہاشمی ۴۹۱

﴿ج﴾

جان کرورین سم ۷۱۱
جاوید اقبال ۸۴۲
جاوید چودھری ۵۳۶
جاوید صدیق بھٹی ۴۱۷، ۴۲۰، ۴۲۵، ۴۳۱، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۸۹، ۵۳۷، ۵۴۰، ۵۶۴، ۵۶۶، ۶۱۲، ۶۶۷، ۶۸۴، ۷۸۴، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۴۶، ۸۷۲
جبریلؑ ۲۶۰، ۲۶۱، ۳۰۱، ۳۰۷، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۴
جرأت ۳۹۶
جعفر بلوچ ۲۳۶، ۲۵۴، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۰۹، ۵۱۳، ۵۳۸، ۶۴۰، ۶۵۱، ۷۳۸
جعفر شیرازی ۵۰۶
جعفر طاہر ۸۴۳
جعفر علی خان اثر ۸۱، ۸۶، ۸۹، ۹۳
جگر مرادآبادی ۱۹۱
جلال الدین اکبر ۱۹۸
جلال لکھنوی ۴۱، ۴۲، ۵۹، ۶۳، ۳۹۶
جلال نقوی ۵۱۹
جمشید اقبال ۸۷۷
جمیل احمد عدیل ۵۱۰، ۵۳۶، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۵۴، ۸۵۳، ۸۷۰، ۸۷۷، ۸۷۹، ۸۸۱
جمیل الدین عالی ۵۳۶
جمیل جالبی ۵۴، ۳۴۴، ۴۷۸، ۶۵۴، ۶۵۹، ۶۷۱، ۷۰۴، ۸۷۸
جمیل مظہری ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۵۴، ۲۶۴، ۴۴۷، ۴۴۸
جواز جعفری ۵۵۱، ۵۵۴، ۵۶۸، ۸۷۴
جوش ملیح آبادی ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۱۰۶، ۱۷۹، ۱۸۵، ۱۹۱، ۱۹۹، ۲۲۷، ۲۳۴، ۲۴۴، ۲۵۴، ۲۶۴، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۷، ۲۹۸، ۲۹۰، ۳۰۸، ۳۱۳، ۳۱۷، ۴۰۰، ۴۴۴، ۴۴۷، ۴۴۸، ۵۵۱، ۵۵۴، ۵۶۸، ۶۷۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۷۰۴، ۷۲۰، ۷۳۸، ۸۶۰
جون ایلیا ۴۴۴
جوہر نظامی ۷۲۱
جیلانی کامران ۸۳، ۸۹، ۹۲، ۹۳، ۹۵، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۸۴، ۲۹۴، ۷۴۹

﴿چ﴾

چراغ حسن حسرت ۵۳۶
چکبست ۱۹۹

﴿ح﴾

حاجرہؓ ۷۴
حاجی غلام مصطفی ۸۱۹
حامد بیگ ۲۵۴
حامد بریلوی ۵۷۷
حامد حسن قادری ۷۴۹
حامد سراج ۳۴۲، ۵۱۴
حامد علی نقوی ۸۶۱
حامی (تخلص شبیہ الحسن) ۴۵۶
حبیب جالب ۶۵۹، ۶۶۶، ۶۶۹
حبیب جون پوری ۱۰۲، ۱۹۰، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۲۶، ۲۵۵، ۳۴۷، ۴۴۸، ۴۴۵، ۴۸۵، ۵۶۸، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۹۴، ۶۰۳

۶۰۸، ۶۱۰، ۶۸۷، ۷۱۲، ۷۱۶، ۷۱۸، ۷۲۶،
۷۲۹، ۷۳۰، ۷۵۲، ۷۸۸، ۷۸۹، ۸۴۰، ۸۷۳،
۸۷۸
حُرؒ ۲۳۸، ۲۵۸، ۲۶۹، ۳۱۴
حرا نسیم ۸۶۲
حسرت موہانی ۱۶۰، ۱۹۱، ۱۹۹، ۶۶۵، ۶۸۳
حسنؓ ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۳۱، ۱۸۹، ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۳۲،
۲۳۵، ۲۳۷، ۲۶۸، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۶۳،
۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸،
۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۹۱، ۲۹۴، ۳۰۱،
۳۰۷، ۳۰۸، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵،
۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۶، ۳۴۵، ۳۴۸، ۳۵۵،
۳۵۶، ۳۵۷، ۳۶۵، ۴۳۹، ۷۷۳، ۷۷۵
حسن الٰہ آبادی ۳۶۱
حسن رضوی، ڈاکٹر ۷۵، ۲۳۶، ۴۴۳، ۵۳۸، ۸۰۴،
۸۳۶، ۸۵۵، ۸۶۱
حسن عابدی ۷۵، ۶۴۰، ۸۴۳
حسن عباس زیدی ۲۵۴
حسن عسکری ۷۹۵، ۸۸۱
حسن عسکری کاظمی ۱۰۷، ۲۳۶، ۲۴۳، ۲۵۴، ۲۸۹، ۳۴۳،
۳۴۷، ۴۸۲، ۵۱۲، ۵۱۴، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۳۶،
۵۳۸، ۵۴۲، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۵۲، ۵۵۶، ۵۵۷،
۵۷۱، ۵۷۷، ۶۱۴، ۶۱۷، ۶۵۷، ۶۷۱، ۷۴۰،
۷۹۴، ۸۰۰، ۸۳۲، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۳، ۸۵۲،
۸۵۳، ۸۵۴، ۸۶۳، ۸۶۵، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱،
۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰
حسن ہاشمی ۴۷۰
حسن نثار ۵۳۶
حسنینؓ ۵۴، ۱۲۶
حسنین اُلفت بلوچ ۵۱۳
حسنین بخاری ۸۶۰
حسین سحر ۳۹۷، ۶۶۴، ۸۷۲
حسین اعظمی ۲۱۵
حسین مظہر ۳۹۱
حسین نقوی ۴۴۳
حشمت علی قنبر ۵۴۷، ۷۳۸
حشمت علی قیصر ۲۳۶، ۷۷۵، ۷۷۶
حمیر نوری ۷۷۹
حفیظ الرحمان سحابی ۱۸۳
حفیظ الرحمان طاہر ۴۱۱
حفیظ تائب ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۸۳، ۲۹۴، ۸۰۱
حفیظ جالندھری ۳۶، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۳۹، ۳۳۶، ۳۹۷،
۵۰۸، ۶۰۱، ۶۶۵، ۶۸۱، ۷۲۹، ۷۹۵، ۸۴۴
حفیظ صدیقی ۸۴۲
حق نواز ۲۵۴، ۵۴۷
حکیم نبی خان ۹۴
حماد ضیاء ۸۲۶
حماد میر ۴۳۶، ۴۶۹، ۵۱۶، ۸۷۲، ۸۷۴
حمایت علی شاعر ۵۰۷
حمید اختر ۸۲۵، ۸۲۷
حمید کوثر ۲۳۶، ۵۰۵، ۵۰۸، ۵۱۰، ۵۴۷، ۶۴۰، ۶۵۱،
۸۴۳، ۸۴۸، ۸۵۱، ۸۵۴
حمید نظامی ۵۳۶
حنیف اسعدی ۲۳۶
حنیف ترین ۸۶۰
حواؑ ۳۱۴
حیدرؓ ۲۷۷، ۲۸۶، ۳۱۰، ۳۱۴
حیدر علی آتش ۲۷۴، ۳۱۶
حیدر قریشی ۳۲۹

﴿خ﴾

خالد احمد ۱۳۰، ۲۸۱، ۵۸۴، ۵۹۶
خالد اشرف ۸۶، ۹۵
خالد اقبال یاسر ۱۱۶، ۵۰۷، ۵۳۸، ۶۶۱، ۸۵۳، ۸۶۹،
۸۷۱، ۸۷۵

خالد بزمی ۶۱۴

خالد شفیق ۴۶، ۳۴۷، ۶۱۶

خالد محمود امر ۴۲۰، ۴۲۵، ۴۳۱، ۴۳۶، ۵۳۷، ۵۳۹، ۶۶۷، ۶۸۴، ۸۴۶

خالد مقبول ۵۷۳، ۵۷۴

خدیجہؓ ۲۳۷، ۲۹۱، ۳۱۴

خدیجہ قیصر ۵۴۹، ۵۵۱

خدیجہ مستور ۸۱

خلیق ۲۹۷، ۷۴۸

خلیلؒ ۳۱۰

خواجہ احمد فاروق ۵۷۷

خواجہ محمد زکریا ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۳۰، ۱۳۲، ۲۳۶، ۲۸۶، ۳۲۱، ۳۴۳، ۳۵۳، ۶۵۴، ۶۵۹، ۶۷۱، ۶۸۳، ۶۹۷، ۷۱۵، ۷۱۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۱۹، ۸۴۳، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۷۸

خورشید بیگ میلسوی ۱۰۵، ۴۸۵، ۶۰۰، ۶۱۷، ۶۸۰، ۶۸۶، ۷۸۶، ۸۱۹، ۸۶۵، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۵، ۸۷۶

خورشید رضوی، ڈاکٹر ۲۴۱، ۳۴۴، ۳۵۶، ۸۱۶، ۸۳۴

خوشتر علی خوشتر ۲۳۸

خیال امروہوی ۱۰۷، ۲۳۲، ۲۳۶، ۵۰۵، ۵۱۲، ۵۵۶، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۹۸، ۶۵۴، ۶۹۶، ۷۵۴

﴿د﴾

داغ دہلوی ۲۷۴

دبیر، سلامت علی ۱۸، ۵۹، ۱۰۶، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۳۴، ۲۴۲، ۲۴۸، ۲۵۶، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۶، ۲۷۲، ۲۷۵، ۲۷۹، ۲۸۳، ۲۸۹، ۲۹۲، ۲۹۷، ۳۰۷، ۳۱۳، ۳۱۸، ۵۳۱، ۵۴۴، ۵۴۶، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۱، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۸۰، ۵۹۸، ۶۲۱، ۶۴۹، ۶۹۵، ۷۳۱، ۷۴۸، ۷۵۴، ۷۷۴، ۸۴۴، ۸۶۱، ۸۶۹، ۸۷۹

﴿ڈ﴾

ڈبلیو۔ کے وساٹ ۷۱۱

ڈپٹی نذیر احمد ۶۰۷

﴿ذ﴾

ذوق ۶۰، ۶۱، ۷۳۱، ۷۸۸

ذوالفقار ۲۷۶، ۲۸۶، ۳۱۲، ۳۱۴

ذوالفقار حسین رضوی ۱۰۲، ۲۹۴، ۵۷۶

ذوالفقار حسین ہاشمی ۲۱۵، ۶۷۹، ۷۵۲، ۸۷۴

ذوالفقار علی ۲۱۰، ۸۶۷

ذوالفقار علی پرویز ۴۸۹

ذہین شاہ تاجی ۴۸

﴿ر﴾

رابرٹ پین وارن ۷۱۱

رابعہ سرفراز ۴۱۹، ۴۹۹، ۶۱۷، ۸۶۸

رابعہ عرفان ۲۶۴، ۵۰۰، ۸۷۳

راجا رشید محمود ۶۴۰

راحت نقوی ۱۷۸، ۸۳۱

راحت حسین راحت ۸۰۴، ۸۰۵

راشد طفیل ۸۲۵

راغب شکیب ۳۲۹

رام بابو سکسینہ ۴۴۲، ۴۴۳

رانا غلام شبیر ۱۸۳

رائے نوید الحسن ۵۱۴

رباب ۴۸۶

رجب علی بیگ سرور ۴۰۹

رحمان مذنب ۵۳۰، ۵۳۶، ۵۳۹، ۵۴۰، ۸۵۴

رحیم گل ۷۹، ۸۸، ۹۴

رستم ۳۱۴

رشید احمد صدیقی ۴۱۹

رشید امجد، ڈاکٹر ۷۱۹

رشید چوہدری ۸۸۱

رشید حسن خان ۱۵۴، ۱۶۴
رشید کامل ۶۱۴
رشید موسوی ۷۳۹
رفعت خانم ۵۳۸، ۵۴۰، ۸۴۷
رفعت مالک ۸۷۳
رفیع الدین ہاشمی ۳۴۴
رفیق بلوچ ۳۱۵
رفیق خاور ۱۶۱
رضا انتخاب ۲۹۳، ۳۰۶، ۳۴۴، ۵۵۷، ۵۷۸
رضا زیدی ۲۳۶، ۲۶۶، ۳۰۵
رضا شباب ۵۷۸
رضا کاظمی ۲۷۹
رؤف ظفر ۸۸۱
ریاض کامل ۵۱۰
رضی عابدی ۴۸۲، ۸۷۸
ریحان اعظمی ۷۳۸
رعنا زیدی ۱۳۸
ریاض قدیر، ڈاکٹر ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۵۰، ۲۳۶، ۳۱۶، ۴۸۷، ۵۰۸، ۶۱۷، ۸۶۴، ۸۶۷
رئیس امروہوی ۴۸، ۸۷، ۱۸۴، ۱۸۵، ۲۹۴، ۳۴۴، ۵۷۹
رئیس قمر ۹۲، ۹۵

﴿ز﴾

زاہد بخاری ۷۸۵، ۷۸۶
زاہد بشیر ۸۶
زاہد حسین بھٹی ۸۳۶
زاہد شمسی ۸۵۶
زبیر ۲۶۰
زرتاج جمیل ۷۸۲
زرتشت ۲۷۳، ۲۸۷
زرینہ جمیل ۸۷
زوار حسین شاہ ۳۹۵، ۵۲۴، ۷۱۶، ۸۷۲
زیبا ناروی ۸۳۱
زیب النسا ۲۸۱
زینبؑ ۱۴، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۷۰، ۶۸۷
زین العابدینؑ ۲۳۷، ۲۳۸

﴿س﴾

ساجد پال ساجد ۸۵۸
ساحر انصاری ۸۷، ۱۰۷
ساحر لدھیانوی ۷۵، ۶۴۰، ۶۵۴، ۷۹۶، ۸۴۳
ساحر لکھنوی ۲۳۶، ۵۰۸، ۸۶۰
سائرہ بتول ۸۵۹
ساغر صدیقی ۲۳۹
سجادؑ ۲۵۸، ۲۶۱، ۲۶۳، ۷۶۳
سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر ۲۱، ۵۴، ۵۶، ۶۵، ۶۹، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۱، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۳۵، ۲۳۶، ۳۲۱، ۳۴۴، ۳۵۶، ۳۵۸، ۳۹۴، ۴۴۳، ۴۴۵، ۴۷۱، ۴۷۳، ۴۸۱، ۵۷۱، ۵۸۳، ۵۹۵، ۶۱۷، ۶۵۸، ۶۷۰، ۶۹۷، ۸۲۶، ۸۳۹، ۸۴۳، ۸۶۰، ۸۶۷، ۸۷۸
سجاد حارث ۱۰۷، ۲۵۴، ۳۲۱، ۴۸۱، ۵۰۷، ۵۴۷، ۶۹۷، ۸۴۴، ۸۶۷، ۸۷۸
سجاد رضوی ۱۰۷، ۲۵۴، ۲۶۳، ۵۴۷
سجاد ظہیر ۱۰۵، ۶۵۶
سجاد مرزا ۳۳۰، ۴۸۴، ۵۰۲، ۶۱۷، ۸۶۳
سجاد نقوی ۴۴۱
سحر انصاری ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۵
سدرہ ۳۱۳
سردار نقوی ۷۴۹
سرسید احمد خان ۳۲۸، ۵۳۰، ۷۴۸
سرفراز حسین قاضی ۱۰۷، ۱۱۶، ۵۴۷، ۸۷۳
سرفراز سید ۱۶۴، ۱۷۱، ۱۸۴، ۴۹۶

سرفراز فاطمہ ۸۳۶
سرور حسین شاہ ۸۴۴
سرور علی سرور ۸۳۱
سعادت سعید، ڈاکٹر ۱۱۶، ۱۷۲، ۱۷۴، ۱۸۳، ۲۹۵، ۳۱۵،
۵۰۷، ۸۵۷
سعدیہ انور ۵۰۰، ۸۶۸
سعدیہ شفقت ۸۶، ۸۶۲
سعدیہ ہاشمی ۸۶۲
سعید احمد سعید ۴۴۴، ۴۹۲
سعید ظفر ۳۶۱
سعید فاطمہ ۳۰
سعیدہ فاطمہ ۵۵۴
سفیان ۳۱۰
سقراط ۲۱۴، ۲۷۳، ۲۸۷
سکندر ۲۴۴، ۳۱۳
سکینہؑ ۱۱۰، ۲۳۲، ۲۳۷، ۲۳۸
سلامت علی ۸۳۱
سلطان جمیل نسیم ۵۰۸
سلطان رشک ۵۰۸
سلطان محمود ۷۳۸، ۷۴۱، ۷۷۸
سلطانہ مہر ۱۵۸، ۷۰۲
سلمانؓ ۳۱۴
سلمان باقر ۳۰۷
سلمان رضوی ۷۸۳، ۸۳۶
سلمان سعید ۸۵۷
سلیم احسن شیخ ۳۹۹، ۵۸۸
سلیم اختر، ڈاکٹر ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۷، ۸۸، ۹۲، ۱۰۵، ۱۰۶،
۱۰۷، ۲۱۹، ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۵۴، ۲۸۳، ۳۰۶،
۳۴۴، ۳۰۷، ۳۱۸، ۳۳۹، ۳۴۳، ۳۴۹، ۳۶۷،
۵۱۱، ۵۱۳، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۳۷،
۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۶۴، ۵۷۷،
۵۹۸، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۷، ۶۲۷، ۶۴۳،
۶۴۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۷۵۱،
۷۵۴، ۷۹۱، ۷۹۶، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۱۰،
۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۶، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۵، ۸۵۷،
۸۵۸، ۸۶۹، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳،
۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۸
سلیم شاہد ۱۷۴، ۱۸۳، ۲۸۱
سودا، مرزا رفیع ۶۸، ۲۳۴، ۲۶۶، ۲۷۲، ۲۹۷، ۳۱۶،
۷۳۷، ۷۴۷
سہیل احمد خان، ڈاکٹر ۸۷، ۱۰۲، ۱۰۷، ۱۱۵، ۱۷۳، ۲۱۶،
۳۲۱، ۳۳۴، ۳۳۶، ۳۵۴، ۳۵۶، ۴۴۴، ۴۳۶،
۴۸۱، ۶۵۴، ۶۵۸، ۶۹۱، ۶۹۷، ۷۵۲، ۸۰۱،
۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۳۹، ۸۴۳، ۸۶۰، ۸۷۸
سہیل بخاری، ڈاکٹر ۲۳۱
سہیل بلگرامی ۳۵۰
سہیل بنارسی ۵۱۹
سید ثمر حسین نقوی ۸۷۰، ۸۷۱
سید عالم زیدی ۸۳۱
سید عبدالحسن نقوی ۸۶۱
سید عبداللہ، ڈاکٹر ۲۳۶، ۳۴۴، ۵۷۱، ۶۵۸، ۶۹۸
سید فیضی ۱۱۹
سیدہ لطیف النسا ۸۳۳
سیدہ صدیقہ بانو ۸۳۳
سیف الدین سیف ۱۷۴
سیف الرحمان سیفی ۸۳۳، ۸۸۱
سیف اللہ خالد ۸۷۳
سیف زلفی ۱۰۳، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲،
۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹،
۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸،
۱۸۹، ۲۱۴، ۲۴۸، ۲۵۵، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳،
۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰،
۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸،
۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶،

۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۳۰، ۳۳۳، ۳۴۸، ۳۸۳، ۳۸۴، ۴۸۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۳۰، ۵۳۷، ۵۳۶، ۵۵۱، ۵۶۸، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۸۰، ۵۸۲، ۵۹۳، ۶۰۳، ۶۱۱، ۶۱۳، ۶۳۹، ۶۵۹، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۵، ۶۷۹، ۶۹۵، ۷۱۴، ۷۲۶، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۲، ۷۴۴، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۶۳، ۷۸۹، ۷۹۵، ۸۰۰، ۸۲۳، ۸۳۱، ۸۴۰، ۸۴۹، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۷۳، ۸۷۸

شارب ردولوی ۴۴۳، ۷۴۹

شاعر علی شاعر ۸۵۸

شاکر کنڈان ۸۷۷

شان الحق حقی ۴۸

شاہد چوہدری ۸۵۶

شاہد محمود ۸۴۲

شاہد نقوی ۱۰۷، ۲۳۶، ۲۵۶، ۲۶۲، ۲۷۶، ۴۴۴، ۵۱۹، ۸۳۱

شاہدہ لطیف ۸۵۷، ۸۸۲

شاہ نصیر ۲۷۴

شاہین ہارون ۲۳۶، ۵۴۷

شائق زیدی ۵۱۹

شبلی نعمانی ۴۴۲، ۵۵۱، ۷۴۸

شبہ طراز ۵۱۴، ۸۵۸، ۸۶۰، ۸۶۱

شبیر ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۷، ۲۵۷، ۲۸۶، ۳۱۰، ۳۳۵

شبیر احمد قادری ۵۲۹، ۸۶۷، ۸۷۵

شبیر حسن ۲۳۵، ۴۸۵، ۵۶۸، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۹۳

شداد ۲۱۴، ۲۷۵

شریف کنجاہی ۵۰۸، ۷۷۶

شفیق الرحمٰن الہ آبادی ۲۱۴، ۳۶۴، ۴۷۳، ۵۰۲، ۵۳۵، ۵۳۷، ۶۰۹، ۶۵۳، ۷۳۲، ۷۷۵، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۶۶، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۴، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۸۲

شفیع بلوچ ۵۱۳، ۶۷۴، ۶۸۰

شفیع عقیل ۸۷۰

شکیب جلالی ۱۳۲، ۱۸۵، ۳۴۷، ۳۱۶

شیکسپیئر ۱۷۵، ۱۸۶، ۲۸۲

شکیل جاذب ۳۱۶، ۴۲۰، ۴۳۱، ۴۳۵، ۴۳۶، ۶۶۷، ۶۸۴، ۸۳۶

شلوا ہولڈرز ۸۴۴

شمع فاطمہ ۱۰۲، ۳۶۱، ۸۳۶

شمیم انوار الحق ۵۴۷

شور صہبائی ۷۷، ۷۸، ۸۸، ۹۲، ۹۴، ۸۶۱، ۸۶۲

شوکت زریں چغتائی ۵۰۷، ۶۱۸، ۶۴۷، ۷۷۸، ۸۷۴

شوکت سبزواری ۵۷۷

شوکت علی ۸۴۲

شہباز ۲۱۴، ۲۷۵

شہرت بخاری ۲۳۵، ۸۶۰

شہزاد احمد ۱۱۶، ۱۳۰، ۱۸۵، ۲۸۱، ۳۴۴، ۴۴۴، ۴۷۹، ۵۱۳، ۵۴۴، ۵۵۶، ۵۸۴، ۵۹۶، ۶۱۷، ۶۵۴، ۶۵۹، ۷۲۵، ۷۵۳، ۷۹۰، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۱۰، ۸۱۹، ۸۲۵، ۸۴۴، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۴، ۸۷۴، ۸۷۸

شہزادہ قاسم ۷۴۸

شہناز مزمل ۴۹۳

شیام ۸۶۶

شیخ سلیم حسن ۸۸۱

شیدا حسن زیدی ۵۱۹

شیر افضل جعفری ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۳، ۴۰۵، ۴۰۶، ۵۱۸، ۵۴۰، ۶۴۰، ۶۸۳، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۹۶، ۸۴۴، ۸۵۰

﴿ص﴾

صادق جمیل ۴۳۸، ۷۶۹

صالح طاہر ۱۰۷، ۵۱۸، ۵۲۷، ۵۳۶، ۶۶۷، ۶۸۳،

۸۵۶

صالح محمد ۴۲۰، ۴۲۳، ۴۲۵، ۴۳۱، ۴۳۵، ۴۳۶

صبا اکبرآبادی ۳۱۷، ۵۱۹، ۶۴۰، ۸۱۰، ۸۴۳

صبوحی ۴۵۶

صدف چنگیزی ۵۱۶

صدیق اظہر ۵۱۷، ۸۷۴

صدیقہ بانو ۳۶۱

صدیق بھٹی ۴۱۶

صدیق شبلی ۵۰۵، ۶۷۱

صفا اللہ آبادی ۱۰۱، ۱۰۲، ۲۰۵، ۲۱۱، ۲۸۰، ۲۸۶، ۳۵۰،
۴۴۵، ۵۶۸، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۹۴، ۶۷۴، ۷۸۸،
۸۳۶

صفدر حسین ۲۶۴، ۲۷۹، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۸، ۵۱۸، ۵۵۴،
۷۳۹

صفدر شاہد ۱۸۳

صفدر ظہیر ۶۰۳

صفدر علی ۴۴۴، ۶۴۰، ۶۴۲، ۶۵۱، ۷۶۲

صفی لکھنوی ۲۱، ۲۷، ۳۴، ۱۹۱، ۲۷۶

صفدر نعیم ۹۷، ۱۱۹، ۳۹۱، ۸۶۴، ۸۷۴

صلاح الدین احمد ۳۲۸، ۳۳۰

صلاح الدین اولکھ ۸۸۱

صوفیہ بیدار ۸۱۹

صہبا لکھنوی ۳۶، ۶۳۴

﴿ض﴾

ضامن علی جلال ۶۹

ضمیر ۷۴۸

ضمیر اختر نقوی ۱۱۵، ۱۶۴، ۲۲۴، ۲۴۳، ۲۵۴، ۲۷۹، ۳۲۲،
۴۴۳، ۵۴۷، ۶۹۰، ۷۰۲، ۷۳۹، ۸۷۳

ضمیر جعفری ۱۱۶، ۱۳۰، ۲۹۷، ۵۰۴

ضیاء الحسن ۱۰۷، ۱۵۸، ۲۳۶، ۵۱۱، ۵۵۶، ۶۹۰، ۶۹۴،
۸۰۱، ۸۷۴

ضیاء الرحمٰن فاروقی ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۲۰، ۴۲۵، ۴۳۱، ۴۳۵،
۴۳۶، ۵۴۷، ۶۶۷، ۶۸۴، ۸۴۶، ۸۶۰

ضیا حیدر ضیا ۸۳۱

﴿ط﴾

طارق اسماعیل ساگر ۸۲

طارق سلیمی ۱۸۳

طارق عزیز، ڈاکٹر ۷۴، ۸۲، ۹۴، ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۳۷، ۱۸۳،
۱۸۶، ۲۳۶، ۲۵۴، ۲۹۴، ۳۱۵، ۴۱۳، ۴۱۷، ۴۲۰،
۴۲۲، ۴۲۵، ۴۳۰، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷،
۴۵۹، ۴۸۶، ۵۱۸، ۵۲۶، ۵۳۷، ۵۴۷، ۵۵۱،
۵۵۴، ۵۵۶، ۶۸۴، ۶۶۷، ۸۱۹، ۸۲۶، ۸۳۴،
۸۵۶، ۸۶۸

طالب جوہری، علامہ ۸۶۱

طالب چوہدری ۸۰۱

طاہر ارشاد ۸۴۲

طاہر القادری ۸۵۱، ۸۵۵

طاہر تونسوی، ڈاکٹر ۱۰۷، ۲۳۳، ۲۳۶، ۳۰۷، ۳۱۱، ۳۱۴،
۴۱۹، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۴، ۴۳۳، ۴۳۶، ۴۳۷،
۵۱۸، ۵۲۱، ۵۳۷، ۵۳۹، ۵۵۶، ۶۴۰، ۶۶۷،
۶۶۹، ۶۸۴، ۸۵۰، ۸۵۹، ۸۶۱، ۸۷۴

طاہر حسین کاظمی ۴۴۳، ۵۴۷، ۵۴۸

طاہر مسعود ۸۶

طاہر ناصر علی ۲۵۴، ۵۴۷، ۵۳۹، ۷۳۸، ۷۴۰، ۷۶۸،
۸۳۱، ۸۵۶، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۴

طفیل دارا ۶۴۰

طلعت ۹۸

﴿ظ﴾

ظفر ۷۶۷

ظفر اقبال ۱۱۶، ۱۸۵، ۵۳۶، ۵۸۴، ۵۹۶

ظفر الحق چشتی ۱۰۷، ۱۷۹، ۱۸۳، ۲۳۶، ۲۹۴، ۳۳۵،
۵۱۳، ۵۱۵، ۵۵۶، ۶۶۰، ۷۳۸، ۷۴۱، ۷۶۷،

۸۳۴، ۸۴۸، ۸۵۳، ۸۵۵، ۸۷۳

ظفر شارب ۲۵۴، ۲۷۱، ۵۱۹، ۸۳۱

ظفر عابدی ۷۶۷

ظفر علی خان ۲۱۸، ۳۹۷، ۳۹۸، ۵۳۶، ۶۶۵، ۶۸۱،
۷۲۹، ۷۳۰، ۷۹۵، ۸۴۸

ظہور حیدر جارچوی ۱۷۸، ۲۳۶، ۲۵۴، ۲۷۱، ۵۱۹

ظہیر فتح پوری ۸۴۱

ظہیر کاشمیری ۷۵، ۱۷۸، ۱۸۳، ۲۱۶، ۲۹۴، ۴۸۱، ۵۰۴،
۶۴۰، ۶۵۴، ۷۱۴، ۸۱۰، ۸۴۴، ۸۷۸

﴿ع﴾

عابد علی عابد ۵۵، ۱۹۲، ۲۱۰، ۲۳۵، ۳۶۱، ۷۳۹

عابد منہاس ۲۳۴، ۸۷۳

عارف امام ۵۱۹

عارف ثاقب، ڈاکٹر ۶۲، ۶۵، ۱۰۷، ۲۳۶، ۲۴۳، ۲۵۴،
۵۴۷، ۵۵۶، ۶۱۷، ۸۶۳، ۸۷۲

عارف شفیق ۶۴۰

عارف عبدالمتین ۱۱۶

عاشور کاظمی ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۵۴، ۲۷۹، ۵۴۷

عاصم گیلانی ۲۵۴، ۸۳۱

عاصی کرنالی ۱۰۷، ۲۳۶، ۲۴۵، ۲۵۴، ۵۴۷، ۵۵۶، ۶۹۱،
۶۹۶، ۶۱۷، ۸۶۱، ۸۶۷

عاطف خالد بٹ ۲۳۹، ۸۷۹

عاقل کاظمی ۸۳۲

عامر عبداللہ ۵۱۳

عبادت بریلوی، ڈاکٹر ۲۰۳، ۲۱۵، ۲۴۱، ۳۴۴، ۳۵۸،
۳۶۱، ۵۷۱، ۶۷۰، ۸۴۳، ۸۷۸

عباسؔ ۱۱۱، ۲۴۷، ۲۵۱، ۲۵۹، ۲۶۳، ۲۶۹، ۲۷۴، ۲۷۶،
۲۷۷، ۲۸۶، ۳۰۸، ۸۱۰، ۳۱۲، ۳۱۳

عباس اذہر ۵۲۲

عباس تابش ۵۱۲، ۸۲۶

عباس رضا، ڈاکٹر ۲۵۹، ۲۵۵، ۳۰۶، ۵۳۳، ۵۳۸،
۵۳۹، ۵۴۷، ۵۴۹، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۶۲، ۷۳۸،
۷۴۰، ۸۰۱، ۸۱۹، ۸۳۳، ۸۵۴، ۸۷۱

عباس تاسوری ۸۴۲

عبدالجبار لطیفی ۸۳، ۳۱۵

عبداللہ خان ۲۴۳، ۲۵۴، ۳۴۴، ۳۵۸، ۵۳۰، ۵۴۷،
۵۴۰، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۵۶، ۶۹۷، ۸۴۳، ۸۵۲

عبدالرؤف ۵۱۹

عبدالستار نیازی ۱۰۴، ۶۱۷، ۶۵۲، ۶۷۱، ۸۶۳

عبدالسلام ۸۶۰

عبداللطیف بھٹائی ۱۹۸

عبدالکریم خالد، ڈاکٹر ۸۴، ۸۹، ۹۲، ۱۰۷، ۱۱۹، ۱۵۴،
۱۹۰، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۳۶، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۵۴، ۲۶۳،
۲۹۷، ۳۰۰، ۵۱۲، ۵۱۸، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۴۷،
۵۳۹، ۵۴۱، ۵۴۴، ۵۴۷، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۶،
۵۶۴، ۶۱۳، ۶۱۷، ۶۶۰، ۷۹۲، ۸۰۱، ۸۱۸، ۸۱۹،
۸۲۶، ۸۲۷، ۸۳۴، ۸۴۳، ۸۴۹، ۸۶۰، ۸۶۲،
۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲،
۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵

عبدالغفار قائم ۸۶۱

عبدالرحمان بجنوری ۵۲۲، ۶۱۳

عبدالمجید سالک ۵۳۶

عتیق احمد ۱۰۷، ۲۳۶، ۶۷۱، ۸۷۸

عثمان قیصر ۷۸۱، ۷۸۲

عذرا اصغر ۸۶۱

عذرا شوذب ۸۷۱، ۸۷۶

عرفانہ عزیز ۵۴۰، ۸۵۳

عرفی ہاشمی ۱۰۲، ۲۳۶، ۲۸۵، ۵۱۹، ۵۳۳، ۵۳۸،
۵۶۸، ۵۸۳، ۵۸۹، ۵۹۴، ۶۱۹، ۷۳۸، ۷۴۲،
۷۴۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۸۹، ۸۱۹، ۸۳۱، ۸۳۳،
۸۳۶، ۸۴۷، ۸۶۱،

عروج ۵۱۹

عصمت چغتائی ۸۴۱
عطاالحق قاسمی ۱۱۶، ۵۳۶، ۸۱۹
عظمت اللہ خان ۲۱۸
عظیم قریشی ۶۴۰، ۸۴۳
عفت حسین ۱۸۳، ۳۱۵
عفت مریم ۵۷۸
عقیلؑ ۲۳۷، ۲۵۹
عقیلہ ہاشمی ۵۱۰
علیؑ ۱۷۹، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۳۵، ۲۳۷، ۲۵۴، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۹، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۳، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۵۵، ۷۶۴
علی اکبرؑ ۲۳۲، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۴، ۲۶۷، ۳۱۰، ۳۱۲
علی حسین جاوید ۲۲۹، ۵۱۵، ۸۷۳، ۸۷۶
علی حسین رضوی ۲۳۶
علی حسین سید ۸۶۰
علی رضا کاظمی ۲۳۶
علی شیر طور ۶۱۷، ۸۶۵
علی ضیغم ہمدانی ۷۸۰
علی ظہیر منہاس، ڈاکٹر ۲۳۶
علی عباس ۲۳۶
علی محمد خان، ڈاکٹر ۵۰۸
علمدار حسین ۸۰۹
عمر فیضی ۵۰۵، ۵۰۸، ۵۱۱، ۵۱۵، ۶۴۰، ۶۵۱، ۷۹۶، ۸۱۰، ۸۴۳، ۸۵۱
عونؑ ۲۳۸، ۲۵۸، ۲۶۰، ۳۱۱، ۳۱۲
عنبرین خان ۲۳۶
عمران نقوی ۲۳۸، ۸۸۱
عیسیٰؑ ۳۱۰، ۳۱۲

﴿غ﴾

غالب ۲۱، ۲۳، ۳۰، ۱۹۵، ۲۱۴، ۲۳۹، ۲۷۴، ۲۹۴، ۵۳۵، ۵۶۰، ۵۸۵، ۵۹۶، ۷۱۳، ۷۳۷، ۸۱۷
غضنفر عباس ۸۵۷، ۸۶۲
غضنفر علی ندیم ۱۷۵، ۱۸۳
غضنفر کاظمی ۶۰۵
غلام یاسین ۶۳۹، ۶۴۷، ۸۶۸
غلام جیلانی اصغر ۸۳، ۲۳۱
غلام حسین ذوالفقار ۸۴۳، ۸۶۰
غلام حسین ساجد ۵۰۸
غلام رسول مہر ۵۳۶

﴿ف﴾

فاطمہؑ ۲۳۷، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۷۷، ۳۱۰
فخر الحق نوری، ڈاکٹر ۷۳، ۱۰۷، ۱۸۳، ۲۳۶، ۲۵۴، ۳۱۴، ۴۲۰، ۴۲۳، ۴۲۵، ۴۳۱، ۴۳۵، ۴۳۶، ۵۳۶، ۵۴۷، ۵۵۶، ۶۶۷، ۶۸۴، ۸۰۱، ۸۱۹، ۸۴۳، ۸۴۷
فخر الدین صدیق اثر ۸۶۴
فخر حسین بخاری ۸۱۶
فراز فاطمہ، سید، ۳۶۱
فراق گورکھپوری ۴۴۳، ۴۷۷، ۶۱۴، ۶۵۹، ۷۱۴، ۸۶۰
فرح ناز ۱۶۵، ۸۷۳
فرحت اللہ بیگ ۲۱۹، ۲۲۰، ۳۴۷، ۳۹۸، ۵۸۳، ۶۰۸، ۸۵۵
فرخ زہرہ گیلانی ۸۵۷
فردوس انور قاضی ۹۲، ۹۳
فرقان قریشی ۳۶۶، ۴۸۹، ۵۳۷، ۵۳۹، ۶۱۶، ۶۴۰، ۷۳۷، ۸۱۸، ۸۳۴، ۸۴۳، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۶۴، ۸۶۷، ۸۷۱، ۸۷۶
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ۵۴، ۱۵۵، ۳۹۴، ۴۴۳، ۴۷۷، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۷۱، ۶۵۴، ۶۵۹، ۶۷۰، ۷۴۹، ۸۶۰، ۸۷۸
فضل حسن ۳۴۹، ۸۳۶

فضہؓ ۱۶۲، ۲۵۸
فیروز شاہ ۳۴۷، ۵۱۳
فیروز شاہ تغلق ۱۹۱
فیض احمد فیض ۴۵، ۴۶، ۱۸۵، ۲۳۲، ۴۷۷، ۵۱۵، ۶۴۰،
۶۵۳، ۶۵۹، ۷۱۴، ۷۸۹، ۷۹۶، ۸۱۰
فیض الحسن فیضی ۲۷۱
فیض جھنجانوی ۳۰۵، ۳۱۴، ۴۸۶
قاسمؓ ۲۳۸، ۲۶۹، ۳۰۱
قاسم جلال ۵۰۷، ۵۱۸، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۳۶، ۵۳۹،
۶۸۹، ۸۵۳، ۸۶۷
قاضی جاوید ۵۰۶
قاضی سرفراز ۲۳۶
قاضی قادن ۱۹۸
قائداعظم ۴۴، ۳۱۴، ۵۹۴، ۸۴۴
قتیل شفائی ۲۳۵
قدرت اللہ شہزاد ۸۵۹
قرار حسین ۵۰۴
قمر جلالوی ۴۸، ۲۷۵
قیصر بارہوی ۴۳، ۷۴، ۷۵، ۱۰۶، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳،
۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱،
۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳،
۲۶۴، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۵،
۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۲، ۲۹۰، ۲۹۸، ۳۰۸، ۳۱۲،
۳۹۸، ۴۰۳، ۴۲۸، ۴۳۰، ۴۴۲، ۴۴۴، ۴۴۷،
۴۴۸، ۴۵۴، ۴۷۸، ۴۸۳، ۵۱۷، ۵۱۹، ۵۲۰،
۵۳۰، ۵۳۱، ۵۴۴، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹،
۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۶۸، ۵۸۰، ۵۸۲، ۵۹۴،
۶۰۳، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۴۰، ۶۴۹، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۸،
۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۵، ۶۸۴، ۶۹۵، ۷۰۰، ۷۱۴،
۷۱۸، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۹، ۷۲۸، ۷۳۱،
۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۵، ۷۶۰، ۷۶۳،
۷۸۹، ۷۹۰، ۸۳۱، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۳، ۸۵۵،
۸۵۹، ۸۶۱، ۸۶۵، ۸۶۹، ۸۷۱، ۸۷۳، ۸۷۸
قیصر عباس ۵۱۹، ۵۴۷، ۶۷۷

﴿ک﴾

کارل مارکس ۱۰۵، ۲۷۳، ۲۸۷، ۳۱۴
کامران مہدی ۲۵۶
کرامت بخاری ۱۷۲، ۱۸۳، ۶۴۹، ۸۷۲
کرنل تصدق حسین میاں ۸۶۲
کشور ناہید ۱۶۱، ۵۳۶
کاظم رضا ۲۷، ۳۴
کفایت حسین ۵۴۸
کلثوم طارق برنی ۶۹۸، ۸۷۴
کلثوم نواز ۲۳۲
کلینتھ بروکس ۷۱۱
کلیم الدین احمد ۵۵۱، ۷۴۸
کلیم حیدری ۵۵۱، ۵۵۲
کنول فیروز، ڈاکٹر ۱۰۷، ۲۳۶، ۸۵۵
کنزہ ۳۶۰، ۳۶۱
کریم فضلی ۴۸، ۵۱

﴿گ﴾

گریگ ۲۲۰
گلزار بخاری ۱۷۸، ۱۸۳
گلشن آراء طارق ۸۲۲
گل عباس اعوان ۸۷۷
گلناز فاطمہ ۵۷۸
گوتم ۲۷۳، ۲۸۷، ۳۱۴
گوہر نوشاہی ۸۶۰
گہر جلالوی ۸۳۱
گیان چند ۶۴

﴿ل﴾

لطیف ساحل ۱۹۸، ۶۴۰
لینن ۱۰۵، ۲۷۳، ۲۸۷، ۳۱۴

﴿م﴾

ماہرالقادری ۴۸، ۴۹
مجتبیٰ ۲۸۵، ۳۱۰
مجاز لکھنوی ۸۵۹
مجنوں گورکھپوری ۶۱۴
مجید امجد ۱۳۲، ۲۷۴، ۳۱۴، ۶۶۵، ۶۸۳
محسن احسان ۵۰۶
محسن نقوی ۸۱۴
محسن سہیل ۹۸
محمدؐ ۱۳۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۴، ۲۶۷، ۲۷۵، ۲۶۰،
۲۳۸، ۳۰۵، ۳۱۰، ۳۱۶، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲،
۳۵۳، ۳۶۴، ۳۱۱، ۳۱۴، ۶۵۰، ۶۵۵، ۸۰۱، ۸۳۵
محمد اشرف ۲۳۶
محمد اعجاز ۸۸۱، ۸۷۷، ۸۷۶
محمد اصغر انیس ۵۰۲، ۷۴۷
محمد افضل ثاقب ۱۰۵، ۴۹۳، ۴۹۸، ۶۵۲
محمد افضال ۵۱۱
محمد ایوب ساغر ۸۶۱
محمد تقی ۵۷۸
محمد جعفر ۹۷، ۹۸
محمد جون پوری ۱۹۸
محمد حامد سراج ۵۱۳
محمد حسن اصفہانی ۹۷، ۹۸
محمد حسین آزاد ۶۰، ۸۰۹
محمد رفیق بلوچ ۱۸۳
محمد رضا ۴۸، ۱۵۸
محمد رضا زیدی ۴۸۶، ۸۷۴
محمد رضا نقوی ۸۳۶
محمد زکریا ۴۱۸، ۴۴۳، ۴۸۰، ۵۵۶
محمد شفیع بلوچ ۴۹۷، ۸۷۶، ۸۷۴
محمد صادق علی خان ۹۷، ۹۸
محمد ظہیر بدر ۸۰، ۸۸، ۹۲، ۱۰۱، ۱۰۵
محمد عمر ۸۶۶
محمد علی انجم ۸۶۴
محمد علی صدیقی ۸۱، ۷۸، ۸۸، ۹۲، ۱۵۳، ۵۳۸، ۸۵۳،
۸۷۸
محمد فیروز شاہ ۴۸۸، ۸۷۴، ۸۸۰
محمد کامران ۵۱۱
محمود غزنوی ۳۱۴
محبوب الحسن ۱۰۲، ۶۷۴، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۱۰، ۲۱۱
محمود نظامی ۳۹۸، ۴۰۱، ۴۰۳، ۴۰۵، ۵۱۸، ۵۲۵، ۵۳۰،
۸۵۶
مختار ترابی ۵۳۰، ۵۳۷، ۵۴۰، ۸۴۷
مختار علی نیر ۵۶۱، ۳۵۷، ۸۷۴، ۸۷۹
مراتب علی شاہ ۴۳۸، ۷۷۴
مراد جعفری ۵۱۶
مرتضیٰ حسین فاضل ۲۱۴، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۳، ۴۰۶،
۵۱۸، ۵۲۴، ۵۳۰، ۵۳۷، ۸۴۸
مرتضیٰ برلاس ۱۷۲، ۱۷۴، ۲۳۵
مرغوب حسین طاہر ۱۰۷، ۲۳۶، ۵۱۰، ۵۵۶
مرید الیاس ۸۱۹
مرید عباس خاور ۸۶۵، ۴۹۳، ۷۴۴
مزمل حسین ۸۷۷
مریم ۷۴، ۳۱۲، ۳۱۴
مسلم بن عقیل ۱۶۲، ۲۵۷، ۲۵۹
مسرت ۹۸
مسعود سہیل ۹۸
مسعود حسین رضوی ۶۰، ۷۴۹
مسعود حسن خان ۲۷، ۳۱، ۴۴، ۲۷۹، ۶۵۸
مسعود رضا خاکی ۲۴۴، ۲۳۶، ۲۶۴، ۲۷۱، ۵۴۷
مسعود زیدی ۵۱۴
مسعود ظفر ۱۵۶، ۱۷۸
مسیح الزماں ۲۷۹، ۳۹۵

مشتاق احمد ۸۶۵، ۸۷۲، ۳۹۰، ۷۷۶، ۴۷۲
مشفق خواجہ ۱۱۶، ۷۹۲، ۸۶۰
مشکور حسین یاد ۱۰۷، ۲۳۶، ۳۳۳، ۵۵۶، ۸۳۱
مصحفی ۵۹، ۶۹، ۲۷۳
مصدق لاکھانی ۷۴۴، ۳۹۰
مصطفیٰ ۲۳۲، ۲۸۵، ۲۸۷، ۳۱۰
مصطفیٰ زیدی ۲۹۰، ۸۰۱، ۸۵۸
مصطفیٰ جوہر ۳۶۱
مصطفیٰ کاظم ۳۶۰
مصطفیٰ کمال ۳۶۰، ۸۶۶
مطلوب عالم ۱۰۵
مظفر حسن ۷۳۹
مظفر عباس ۱۸۳، ۲۳۶، ۲۵۴، ۲۹۴، ۴۴۳، ۴۸۴،
۵۴۷، ۶۶۶، ۶۷۱، ۷۵۳، ۷۹۵، ۸۰۱، ۸۲۶،
۸۷۸
مظفر علی سید ۵۷۱
مظفر نقوی ۵۱۵، ۷۳۸، ۷۷۰، ۸۶۱
مظفر وارثی ۲۳۵، ۲۸۱
مظہر حسین
مظہر حسین اظہر ۱۰۷، ۷۳۱، ۸۱۹، ۸۴۱، ۸۶۵
معین الرحمان ۳۳۹
مقبول حسین رضوی ۲۹۳
ممتاز حسین ۵۴، ۱۰۵، ۴۷۷، ۵۰۴، ۶۵۹، ۶۷۰، ۷۱۳،
۸۷۸
ممتاز راشد ۸۵۳
منٹو ۸۴۱
منشایاد ۸۲۵، ۸۲۹
منظور حسین اسد ۷۷۲، ۷۳۸، ۷۳۹، ۳۶۴
منو بھائی ۵۳۶
منیر قصوری ۵۰۸
منیر نیازی ۱۳۲، ۱۸۵، ۳۵۴
موسیٰ ۳۱۴
موسیٰ نظامی کلیم ۵۱۲
مولانا ظفر علی خان ۸۳۷، ۸۳۸
مولانا سیّد باقر زیدی ۷۶۴
مومن ۳۹۶
مہدی نظمی ۴۴۳
میاں خالد ۸۲۶
میرا جی ۱۸۵
میر تقی میر ۳۰، ۳۴، ۴۵، ۵۶، ۵۹، ۶۰، ۶۲، ۶۸، ۴۷۴،
۳۱۶، ۵۰۵، ۵۶۰، ۵۹۶، ۷۱۷، ۷۴۷، ۷۰۷
میر حسن ۴۴۷، ۵۸۶
میر درد ۶۸، ۵۶۴، ۵۶۶، ۸۱۷
میرزا ادیب ۳۸، ۸۴، ۹۴، ۱۱۶، ۱۳۰، ۱۷۲، ۱۸۳، ۳۱۵،
۳۲۲، ۳۴۴، ۳۴۲، ۴۷۸، ۵۰۴، ۶۱۷، ۶۳۱،
۶۴۷، ۶۷۱، ۸۳۶، ۸۶۴
میر رضا میری ۵۱۲، ۸۳۱
میر نرگس ۸۴۴
میتھیو آرنلڈ ۷۱۱، ۷۱۲
میمونہ انصاری ۷۴، ۱۰۷، ۲۳۶، ۲۵۴، ۳۴۴، ۵۴۷،
۴۴۳، ۸۷۷
میمن ٹھٹھوی ۱۹۸
مظہر علی جاوید ۸۳۲
مظہر نیازی ۸۷۲
معارف سہیل ۹۸
معاویہ ۲۳۱
معراج خالد ۳۶۱، ۵۰۶
معراج نیر، ڈاکٹر ۱۶۷، ۲۳۶، ۵۱۸، ۵۳۷، ۵۴۴،
۶۰۷، ۶۴۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۸۴۴، ۸۵۰،
۸۷۱، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵
معز لکھنوی ۲۴۲
ناصر بلوچ، ڈاکٹر ۱۰۷، ۲۳۶
ناصر چوہدری ۳۱۵
ناصر زیدی ۵۱۲، ۵۱۸، ۵۳۶، ۵۴۹، ۵۵۱، ۵۵۴،

۷۳۸،۷۳۹،۸۶۹

ناصر عباس نیر، ڈاکٹر ۷۱۱

ناصر علی رضا ۸۲۶،۸۲۸،۸۳۶

ناصر کاظمی ۱۸۵،۲۳۵،۲۸۳،۳۲۷،۶۶۵

ناہید شاہد، ڈاکٹر ۱۰۷،۱۸۳،۲۳۶،۲۹۴،۵۵۶

نثار اکبرآبادی ۱۸۳،۳۱۵

نثار قریشی، ڈاکٹر ۱۵۵

نجم آفندی ۶۷،۷۴،۱۰۶،۲۰۷،۲۲۵،۲۲۷،۲۳۳،۲۴۰،
۲۵۴،۲۶۲،۲۶۷،۲۷۵،۳۳۳،۳۲۷،۳۹۸

نجم احسن ۷۰۲

نجم الحسن رضوی ۳۹۴،۷۲۸،۸۷۹

نجمہ سہیل ۸۵۳،۸۶۱

ندرت ۹۸

ندیم جعفر، ڈاکٹر ۱۸۴

ندیم صدیق بھٹی ۸۸۰

ندیم گیلانی ۳۶،۳۹۵،۵۵۸،۸۵۸،۸۸۰،۸۸۱

نردوش ترابی ۱۰۵،۱۷۸،۲۳۶

نذر محمد نذر ۳۶۴

نزہت فاطمہ ۵۷۸

نذیر اذفر ۷۳۸،۷۷۵

نذیر اے۔ قیصر ۸۵۷،۸۶۱

نسیم الحق زیدی ۵۳۸،۸۵۵

نسیم امروہوی ۹۱، ۱۰۶، ۲۱۴، ۲۲۵، ۲۳۳، ۲۵۲، ۲۵۹،
۲۶۲، ۳۱۷، ۳۵۸، ۳۰۳، ۳۲۳، ۳۳۴، ۳۳۶،
۳۴۷، ۳۷۴، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۳۰،
۵۳۷، ۵۴۰، ۵۶۸، ۶۱۰، ۶۰۳، ۶۶۵، ۶۶۶،
۶۶۹، ۶۷۵، ۶۸۳، ۶۹۵، ۷۳۶، ۷۴۹، ۷۳۹،
۷۵۰، ۷۵۲، ۷۵۳

نسیم سید ۳۱۴، ۳۱۹، ۳۲۵، ۳۳۰، ۳۳۳، ۳۳۶، ۳۳۷،
۵۳۷، ۵۴۰، ۶۶۷، ۶۸۹، ۸۴۷

نسیم لیہ ۵۶۴،۵۶۵

نشاط واسطی ۷۶۸

نصیر الدین ہاشمی ۷۳۹

نصیر عالم زیدی ۱۰۷،۲۳۶

نصرت زیدی ۹۸،۵۳۷

نظیر اکبرآبادی ۱۷۹،۲۰۶

نظیر صدیقی ۵۰۷

نظیر لدھیانوی ۶۴۰

نعیم سلہری ۸۸۲

نعیم ساگر ۸۵۸

نعیم فاطمہ علوی ۳۴۹،۶۱۷،۸۶۸،۸۷۵،۸۷۴

نفیس اقبال ۵۳۸،۸۵۴،۸۶۱،۸۷۱،۸۷۵،۸۷۶

نقاش ہاشمی ۱۰۲،۳۵۱،۳۵۴،۵۳۷،۵۴۰،۵۴۷،۵۸۳،
۵۹۴، ۷۷۶، ۷۸۳، ۷۸۸، ۸۳۱، ۸۳۳،
۸۳۶،۸۴۸،۸۵۰،۸۶۱

نگہت فاطمہ ۵۷۸

ن۔م۔ راشد ۱۸۵،۳۱۴،۶۶۵،۶۸۳

نواب علی ۲۹

نواز حسن زیدی ۶۳، ۱۰۷،۱۱۵،۱۱۹،۱۵۵،۱۸۳،۲۰۴،
۲۳۶،۲۵۰،۳۲۰، ۵۰۹، ۵۳۷، ۵۳۹،۵۴۴،
۵۴۷، ۶۰۷، ۶۱۷، ۸۴۹،۸۳۴،۸۵۶،۸۲۴،
۸۷۵،۸۷۴

نواز شریف ۳۱۴

نوحؔ ۵۸۳

نیاز فتح پوری ۲۳۴،۳۲۴،۶۱۴،۶۱۶

نیساں اکبرآبادی ۲۳۶،۲۵۴،۲۹۶

نیر صدانی ۱۰۷،۲۳۲،۲۳۶،۵۵۶،۷۵۴

﴿و﴾

واجد امیر ۷۳۸،۷۷۴

واصف علی چوہدری ۲۵۶

وجاہت حسین ۲۷۱،۸۴۹،۸۶۱

وجیہہ الحسن (بیٹا) ۱۰۲،۸۳۶

وقار راشدی ۸۳،۹۸،۲۹

ولی دکنی ۶۸
وحید الحسن ہاشمی (والد) ۹۰، ۹۱، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶،
۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۵،
۱۳۶، ۱۴۸، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۷۲، ۱۷۸، ۱۸۳، ۱۹۱،
۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۵، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷،
۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵،
۲۳۶، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۸، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳،
۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۶۲، ۲۶۹، ۲۸۴، ۲۹۲، ۲۹۴،
۲۹۵، ۲۹۸، ۳۰۶، ۳۱۵، ۳۱۷، ۳۲۱، ۳۲۸،
۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹،
۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶،
۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۹۴، ۳۹۸،
۴۰۰، ۴۰۳، ۴۰۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۳۹،
۴۴۰، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۵۱،
۴۵۲، ۴۵۴، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۹،
۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۶، ۴۸۷، ۵۰۵، ۵۱۴، ۵۱۷،
۵۱۹، ۵۲۲، ۵۳۸، ۵۳۶، ۵۵۴، ۵۴۷، ۵۴۸،
۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۶۵، ۵۶۸،
۵۶۹، ۵۷۷، ۵۸۰، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۶، ۵۸۹،
۵۹۴، ۵۷۳، ۶۱۰، ۶۱۳، ۶۱۶، ۶۳۹، ۶۵۰،
۶۵۴، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۴، ۶۵۵، ۶۶۶، ۶۶۷،
۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۸۰،
۶۸۴، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۹۰، ۶۹۴، ۶۹۵،
۶۹۶، ۷۰۲، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۱۲، ۷۱۶، ۷۱۸،
۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۶، ۷۲۹، ۷۳۹، ۷۳۲،
۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۹، ۷۴۹، ۷۵۰،
۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۸،
۷۷۴، ۷۷۶، ۷۸۱، ۷۸۳، ۷۸۶، ۷۸۸،
۷۸۹، ۷۹۱، ۷۹۵، ۷۹۷، ۷۹۹، ۸۰۲، ۸۰۴،
۸۰۵، ۸۰۷، ۸۰۹، ۸۱۴، ۸۲۵، ۸۲۹، ۸۳۱،
۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۶، ۸۴۰، ۸۴۴، ۸۴۷،
۸۴۸، ۸۵۱، ۸۶۱، ۸۶۶، ۸۶۸، ۸۷۳، ۸۷۴،
۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰
وحید عزیز ۱۲۵، ۴۲۶، ۴۹۰، ۵۳۰، ۵۷۱، ۵۷۳، ۵۷۶،
۵۷۹، ۶۲۵، ۶۶۹، ۸۱۵، ۸۱۸، ۸۵۴، ۸۶۱،
۸۶۴، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۴، ۸۷۶، ۸۷۷،
۸۷۹، ۸۸۰
وحید قریشی ۱۰۷، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۶۵، ۱۷۷، ۲۴۳، ۲۵۴،
۲۶۱، ۲۶۴، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۳۵، ۳۵۴،
۳۵۶، ۴۲۳، ۴۳۶، ۴۷۳، ۴۷۹، ۵۵۶، ۵۸۵،
۵۹۶، ۶۵۴، ۶۵۹، ۷۱۹، ۷۲۱، ۸۲۵، ۸۲۶،
۸۴۷، ۸۷۸
وحید عشرت ۸۲، ۸۸، ۹۲
وزیر آغا، ڈاکٹر ۱۰۳، ۱۱۶، ۱۳۰، ۱۷۲، ۱۸۳، ۲۱۹، ۲۹۱،
۴۴۴، ۴۳۰، ۴۷۶، ۷۱۲، ۷۱۳، ۸۷۸
وزیر الحسن عابدی ۳۹۴، ۴۰۲، ۶۸۷
ورڈز ورتھ ۸۸۵
وصی الحسن نقاش ۴۱۵، ۴۲۰، ۴۲۳، ۴۲۵، ۴۳۱، ۴۳۵،
۴۳۶، ۶۶۷، ۶۸۴، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۶۶، ۸۳۶
وقار راشدی ۸۳، ۸۹، ۹۲
وقار رضوی ۸۷۷
وقار عظیم، سید ۳۶۱، ۴۴۳
ولی دکنی ۶۸
ولی کرنالی ۲۳۵
ولیم ایمپسن ۷۱۲
ولی محمد ۲۵۶

﴿ ہ ﴾

ہاجرہ مسرور ۸۲۵، ۸۴۷
ہادی نقوی ۲۳۶
ہارون عثمانی ۱۸۸، ۵۱۳، ۸۷۳

ہارون قادر، ڈاکٹر ۱۰۷، ۲۳۶، ۲۵۲، ۲۵۴، ۳۳۹، ۳۸۸، ۵۳۸، ۶۱۷، ۸۶۱، ۸۶۴، ۸۶۶، ۸۷۴

ہاشم رضا ۲۴، ۲۷، ۴۰، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۸، ۱۵۵، ۱۵۸، ۴۸۲، ۷۵۳

ہامون ۳۱۰

ہلال نقوی، ڈاکٹر ۱۰۷، ۱۵۸، ۲۳۶، ۲۵۴، ۲۶۳، ۲۶۸، ۲۷۹، ۳۱۵، ۳۲۲، ۳۲۳، ۴۸۴، ۷۴۹، ۷۸۹

ہوش عابدی ۸۳۱

ہیمنگ وے ۹۴

﴿ی۔ے﴾

یاس یگانہ چنگیزی ۴۱۶

یاسین ۴۳۵

یاور عباس ۷۰۲

یزید ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۵۵

یعقوب تصور ۴۹۰، ۷۲۵، ۸۶۳

یوسفؑ ۲۶۳، ۲۷۴، ۳۱۲

یوسف کمبل پوش ۹۵

یونس دریام ۸۶۱

◆◆◆

نام: سید شبیہ الحسن
قلمی نام: حسن ہاشمی
ولدیت: سید وحید الحسن ہاشمی
تاریخ پیدائش: ۲۷۔اکتوبر ۱۹۵۸ء
تعلیم: پی ایچ۔ڈی (اردو)
۱۹۹۶ء پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ملازمت: پروفیسر (اردو)
تاریخ وفات (شہادت): بروز ہفتہ ۱۹ مئی ۲۰۱۲ء

تصانیف

مفاہیم (مقالات)
ترجیحات (مقالات) (انعام یافتہ)
اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار (مقالات)
تصریحات (مضامین)
ترغیبات (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
تعینات (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
اُردو شعر واَدب کی معمار خواتین (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
مضافاتی شعر واَدب (تحقیق وتنقید)
اُردو شعر واَدب کے سفیر (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق وتنقید)
جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت وفن)
آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن)
"شام وسحر" کی باتیں (ماہنامہ "شام وسحر" کے اداریے)
کلیاتِ حبیب (حبیب جون پوری کے کلام کی تدوین)
مختصر مرثیے کی روایت اور سیّد وحید الحسن ہاشمی (تحقیق وتنقید)
باقیاتِ آلِ رضا (آلِ رضا لکھنوی کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)
بجھی وہ شمع ...... (نسیم امروہوی کی یاد میں)
بیسویں صدی کا شعری اَدب (انتخاب کلام)
آیاتِ آمنہ (قیصر بارہوی کے مرثیے کی تدوین)
العطش (سیّد وحید الحسن ہاشمی کے چالیس مرثیوں کی تدوین)
منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)
معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)
طاہرین (سیّد وحید الحسن ہاشمی کی نعتیں، منقبتیں اور سلام کی تدوین)
جدید غزل اور اسلم کولسری کا شعری سرمایہ (تحقیق وتنقید)
سیّد وحید الحسن ہاشمی کی شعری جہتیں (نعت منقبت اور سلام کے حوالے سے)
سیف زلفی کے مرثیے (سیف زلفی کے مرثیوں کی تدوین)
قیصر اقلیم مرثیہ: قیصر بارہوی (تحقیق وتنقید)
قیصر بارہوی کے مرثیے (قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کی تدوین)
اَدبی بیٹھک (ادبی کالم)
حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں (تحقیق وتنقید) (انعام یافتہ)
اَدبی چوپال (ادبی کالم)

زیرِ طبع

لکھنؤ کی اُردو شاعری۔ بیسویں صدی میں (تحقیق)
اُردو مرثیہ اور دیگر اصناف (تحقیق وتنقید)
حروفِ بدن (شاعری)

اظہار سنز
19۔ اردو بازار لاہور فون: 37230150
ہیڈ آفس: 9۔ ریٹی گن روڈ لاہور فون: 37220761
E-mail: izharsons_2004@hotmail.com
www.izhar-sons.com